کتاب	مصنف	قیمت
دھنک	عزیز اندوری	۶-۰۰
بادہ وجام	شارق میرٹھی	۲-۵۰
تاروں کی چھاؤں میں	عزیز عالم	۲-۰۰
ضیائے کوکب	کوکب گھرونڈوی	۳-۵۰
بیسویں صدی کے تیرونشتر	خوشتر گرامی	۱۸-۰۰
انوار و تجلیات	مولانا قمر واحدی	۱۰-۰۰
اقبال البم	جگن ناتھ آزاد	۵-۰۰
بہارستان اولیاء	حضرت آرزو	۱۰-۰۰
ظہور قدسی	”	۱۰-۰۰
ہندوستان ہمارا - اول، دوم	جاں نثار اختر	۲۰-۰۰
سٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری	مولانا عبدالحق بابائے اردو	۴۵-۰۰
فیروز اللغات جامع اردو نوترمیم ایڈیشن	مولوی فیروز الدین	۶۰-۰۰
افکار سودا	ڈاکٹر شارب ردولوی	۶-۰۰
مطالعہ ولی	”	۱۰-۰۰
عرض ہنر	ڈاکٹر محمد حسن	۱۲-۰۰
تلاش و توازن	ڈاکٹر قمر رئیس	۱۰-۰۰
فلسفہ اور ادبی تنقید	ڈاکٹر وحید اختر	۲۰-۰۰
بنگال میں اردو	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۷-۰۰
سب رس کا تنقیدی جائزہ		۲-۵۰
۲۰ نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی	۱۲-۰۰
سب سے چھوٹا غم	عابد سہیل	۱۰-۰۰
خالی پٹاریوں کا مداری	اقبال نبی	۱۲-۰۰
بجھا ہوا البم	”	۱۰-۰۰
پہلی آواز	رتن سنگھ	۶-۰۰
پنجرے کا آدمی	”	۱۰-۰۰
کل کی باتیں	رام لعل	۱۰-۰۰
معصوم آنکھوں کا جرم	”	۶-۰۰
ورق ورق زندگی	صبیحہ انور	۶-۰۰
سبزہ بیگانہ	نور پرکار	۱۰-۰۰
رسائی	جوگندر پال	۶-۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
مٹی کا چراغ	سلمیٰ صدیقی	۸-۰۰
آدھا راستہ	کرشن چندر	۱۱-۰۰
آئینے اکیلے ہیں	”	۱۰-۰۰
مشینوں کا شہر	”	۱۲-۰۰
داراشکوہ	قاضی عبدالغفار	۱۰-۰۰
غبار شب	”	۱۰-۰۰
چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۸-۰۰
بے جڑ کے پودے	”	۵-۰۰
چراغ تہ داماں	اقبال نبی	۷-۰۰
تنکے کا سہارا	شکیلہ اختر	۱۰-۰۰
کھلونے	مسعود نقی	۴-۵۰
طوفان حوادث	پروین سرور	۴-۵۰
ایک محبت کی کہانی	صلاح الدین	۴-۵۰
یگانہ	البرٹ	۶-۰۰
شجر صدا	عمیق حنفی	۱۰-۰۰
نژاد سنگ	بلراج کومل	۱۰-۰۰
امیج	بشیر بدر	۱۵-۰۰
عکس ریز	مظفر حنفی	۴-۰۰
لمحوں کا حصار	آفتاب شمسی	۵-۰۰
آتش سیال	ساجدہ زیدی	۱۲-۰۰
خراشیں	سہگل	۱۰-۰۰
تصور (ناول)	راج ہندی	۱۶-۰۰
کلیات اقبال اردو (عکسی) صدی ایڈیشن		۲۰-۰۰
فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۴۰-۰۰
اقبال فن اور فلسفہ	ڈاکٹر نور الحسن نقوی	۷-۵۰
اقبال معاصرین کی نظر میں	وقار عظیم	۳۵-۰۰
تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۵-۰۰
دیوان غالب (عکسی)	نور الحسن نقوی	۱۲-۰۰
غالب تقلید اور اجتہاد	پروفیسر خورشید الاسلام	۲۰-۰۰
غالب: شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۵-۰۰
اطراف غالب	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۰-۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
[illegible]	[illegible]	۴--
بکھرے ہوئے موتی	مبشر علی صدیقی	۷--
فاصلے	مدہوش بلگرامی	۲-۵۰
آبلے		۴--
آج کی سائنس	اندرجیت لال	۴--
گلِ بانگ	علامہ سحر عشق آبادی	۱۰--
اُردو اور تاریخ کیسے پڑھائیں	مبشر علی صدیقی	۳--
نشیب و فراز	نگین قریشی	۵--
پیغامِ حیات	ریحانی لکھنوی	۳--
شامِ میکدہ	یکتا امروہوی	۸--
حیرت کدہ	اودے سنگھ شائق	۵--
نشانہ	شمس بمن گرامی	۲-۵۰
سازِ شکستہ	اکبر جے پوری	۳--
مشاہدات	ڈاکٹر مایا کھنہ راجے بریلوی	۷--
خواب و بیداری	صغریٰ سبزواری	۳--
راج محل	اطہر علی فاروقی	۱-۵۰
یادِ ایام	"	۲-۵۰
عکسِ حیات	(تاریخ اُردو ادب)	۳--
بہارستان	ساحر سنائی	۳--
گلِ صد رنگ	"	۲--
تیر و نشتر	"	۱--
باقیاتِ انیس	ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری	۵--
رعنائیاں	برج لال جگی رعنا	۲-۵۰
ستارے اور سیارے	جلیل عرشی	۳--
ادھورے خاکے	شرف کمالی	۳--
گل افشانیاں	ڈاکٹر خوشتر کھنڈوی	۱--
لحنِ عرفان	منظر تاباں پوری	۲--
آیاتِ نورانی	فضا کوثری	۱--
غالب کی باتیں	شمس بلگرامی	۱-۵۰
ارمغانِ تاشقند	نوبہار صابر	۴-۵۰
نوائے شوق	ناز مانک پوری	۱۵--
[illegible]	[illegible]	۶--
قلم کا سفر	دانش علی گڑھی	۵--
چاند کا زخم	شمس فرخ آبادی	۲--
پتھر کا گلاب	شمع فرخ بانو	۵--
ایلیٹ کے مضامین	ڈاکٹر جمیل جالبی	۲۵--
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	"	۳۰--
متاعِ سخن	ڈاکٹر عبدالحق	۲۰--
سفرنامہ پنجاب	سید احمد خاں	۳۰--
پیروڈیاں	ہیکل اتساہی	۳-۵۰
کورے کھرے ہیکل گیت	"	۱-۵۰
اُردو میں تمثیل نگاری	منظر اعظمی	۲۱--
فکرنامہ	فکر تونسوی	۱۶-۵۰
اقبال کے نثری افکار	عبدالغفار شکیل	۱۰-۵۰
خسرو کا ذہنی سفر	ظ۔ انصاری	۱۰--
نیاز فتحپوری	امیر عارفی	۱۵--
تاریخ ادبیات تاجکستان	کبیر احمد جائسی	۳--
حافظ کی شاعری	کے۔ این۔ پنڈت	۱۰-۵۰
دیوان اثر	ڈاکٹر کامل قریشی	۱۸--
گل کرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	۲۰--
آؤ کہ کوئی خواب بُنیں	ساحر لدھیانوی	۱۶--
عجائب خانہ عشق	ایس سیتاپوری	۱۵--
اندر کا آدمی	"	۱۰--
اللہ والے سیریز ۱	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	۳--
اللہ والے سیریز ۲	ضیا تسنیم بلگرامی	۴--
اللہ والے سیریز ۳	ابوالمنصور سرمدی	۴--
اللہ والے سیریز ۴	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	۴--
اللہ والے سیریز ۵	ابوالمنصور سرمدی	۴--
کالی دنیا	سراج الدین	۷--
نیلی دنیا	"	۶--

دفتر ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ ۵۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

Miss SADHNA KHOTE "TAMNNA"

فخر واحدی، قنوج

مشاعرہ جشنِ شبیر کا ایک منظر (ممتاز شعرا کی ایک جھلک)

جناب حکیم شبیر علی خاں صاحب شبیر کان پوری سامعین و منتظمین مشاعرہ نیز اہلِ کان پور کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

جناب ابراہیم اشرف صاحب رئیس کان پور۔ ڈائریکٹر بینک آف بڑودہ مشاعرہ جشنِ شبیر کا افتتاح فرما رہے ہیں

جناب مطلوب علی خاں صاحب گورنمنٹ کنٹریکٹر بانیٔ جشنِ شبیر میں حکیم صاحب کی گل پوشی فرماتے ہوئے۔

"KAREEM" BEAWARI

کوثر چاندپوری جشن شبیر میں کلام عنایت فرما رہے ہیں

رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۴۳

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ
پندرہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچاس پیسے

شانِ ہند دہلی

جشنِ جمہوریت ایڈیشن

جلد نمبر ۲۴ | جنوری ۱۹۷۹ء | شمارہ اوّل

جشنِ جمہور ۱۹۷۹ء

جناب فیاض گوالیاری

محبت کو سوجھی بہت دُور کی
زباں چوم لی شعلۂ طور کی!!
قسم کھالیں گے عصمتِ حور کی
جگائیں گے تقدیر مزدور کی!!
اُجاڑیں گے جنت نہ مجبور کی
گھڑی آگئی جشنِ جمہور کی!!

محبت کی شمعیں جلاتے چلیں
تمناؤں کے گیت گاتے چلیں
قدم روز آگے بڑھاتے چلیں
مرادوں کی جنت بناتے چلیں!!
نئے سال میں ہے فضا نور کی
گھڑی آگئی جشنِ جمہور کی!!

ہے انساں کا انساں جگانے کا عزم
وطن کو ہے اُونچا اُٹھانے کا عزم!
سبھی رنج و کلفت مٹانے کا عزم
ہے بھارت کو جنت بنانے کا عزم!
محبت نے ظلمت جو کافور کی
گھڑی آگئی جشنِ جمہور کی!

بڑھیں سرخیاں چشمِ مخمور کی
اُجالوں نے ہر تیرگی دُور کی!!
چمک اُٹھی تقدیر رنجور کی
نہ پوچھو خوشی قلبِ مسرور کی
گھڑی آگئی جشنِ مزدور کی!
گھڑی آگئی جشنِ جمہور کی!!

ودیا ساگر سرور تونسوی پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے سرورق کے صفحات خواجہ پریس جامع مسجد دہلی اور سرورق بالسٹ پریس میں چھپوا کر دفتر شانِ ہند ... نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

26 جنوری

مقدس سالگرہ ——— جس کی اہمیت میں تین گنا اضافہ ہوگیا ہے۔
49 سال پہلے آج کے دن ہم نے مکمل سوراج حاصل کرنے کا عزم کیا۔
1950ء میں آج ہی کے دن ہم نے بھارت کو ایک جمہوریت بنانے کا اعلان کیا اور اپنے لئے ایسا آئین بنایا جس میں انصاف، آزادی، مساوات اور بھائی چارے کے اعلیٰ نصب العین کو شامل کیا گیا تھا۔
دو سال پہلے ٹھیک اسی دن ہم نے آئین میں دیئے گئے جمہوری نظام کی طرف دوبارہ سفر شروع کیا۔

اس سالگرہ کے مقدس موقعہ پر ———
آیئے! ہم سب اپنی آزادی کی بحالی کے لئے بھارت کے عوام کا شکریہ ادا کریں۔
آیئے! ہم ان لوگوں کے خوابوں کی تکمیل کے لئے کوشش کریں، جنہوں نے آزادی اور مساوات کے لئے اپنی جانیں قربان کیں۔
آیئے! ہم سب عہد لیں کہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف کے حصول کے لئے تیزی سے کوشش کریں گے۔

davp 78/408

مختلف مذاہب ایک قوم

ہمیں اس پر فخر ہونا چاہیئے

مختلف فرقوں میں اتحاد کی وجہ سے بھارت کو دنیا میں ہمیشہ سے ہی عزت و احترام کا مقام حاصل رہا ہے۔ یہاں پر مختلف عقیدوں کے کروڑوں پیروکار رہے ہیں اور ہمارے آئین میں ان سبھی کو مساوی حقوق اور انفرادی وقار کی ضمانت حاصل ہے۔

مذہب مقدس ہے اور کسی کو بھی مذہب کے نام پر کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانے دیا جانا چاہیئے۔

امن پسند اور اچھے شہری بہت زیادہ عرصے سے جھگڑے فساد اور فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والوں کو برداشت کرتے آئے ہیں۔
جب بھی قانون اور نظم و ضبط میں خلل پڑتا ہے، قانون کی پابندی کرنے والے شہری ہی اس کا شکار بنتے ہیں۔ عام لوگوں کو ان کی ضرورت کی چیزیں نہیں ملتیں، بچوں کی پڑھائی نہیں ہو پاتی۔ مزدوروں اور تاجروں کی روزی روٹی چھن جاتی ہے۔ جو قومی املاک برباد کی جاتی ہیں ان کا نقصان ہم سب کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بے قصوروں کو یہ سب کیوں بھگتنا پڑے؟

وزیر اعظم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ سبھی عقائد مساوی ہیں اور کسی بھی عقیدے میں کی جانے والی مداخلت قطعی برداشت نہیں کی جائے گی۔ جو حکام اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کریں گے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

آیئے! ہم سب امن اور فرقہ وارانہ اتحاد کو بڑھانے کی کوشش کریں۔

فرقہ وارانہ اتحاد کو ختم کرنے والے سماج دشمن عناصر کا مقابلہ کیجئے۔

بُلبُل چہ گُفت گُل چہ شُنید و صبا چہ کرد

جناب رام لال صاحب کا مکتوب گرامی

"شانِ ہند" کی اشاعتِ سابقہ میں غیر مسلم "اردو پرستوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ" اداریہ شذرہ پڑھنے کے بعد غیر مسلم ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اردو پرستوں نے جو خطوط مدیر شانِ ہند کو لکھے ہیں وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ملک بھر کے غیر مسلم اردو پرستوں کی اکثریت کی دلی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے اُن مسلمان بھائیوں نے بھی اس اداریہ کے حرف حرف کو سراہا ہے جو دل و دماغ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اردو ہندو مسلم تہذیب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اور جو ہماری طرح حکومت اور مفاد پرست مسلم اردو دانش وروں کی اردو دشمنانہ چالوں کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب رام لال صاحب کا مکتوب گرامی قارئین کرام کے مطالعہ کے لئے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے جو انھوں نے مدیر شان ہند کو لکھا ہے۔

برادرم سرور تونسوی صاحب، آداب۔

ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ شکریہ۔ چند روز قبل شان ہند کا دسمبر کا شمارہ بھی ملا تھا جس میں آپ نے اردو اور غیر مسلم سرپرستی کے باہمی تعلق سے ایک اداریہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔

۱۰۔۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء میں کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کی جو پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کے سامنے یہ مقصد رکھا گیا تھا کہ ہماری فرقہ پرست سیاسی جماعتوں نے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اور اس کو اس کے جمہوری حقوق سے محروم رکھ کر ناانصافی کی جو مہم چلا رکھی ہے۔ اس کے خلاف غیر مسلم طبقے کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کی جائے اور اردو کے سیکولر کردار کی پوری حمایت و موافقت کی جائے چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے میں یہ کانفرنس نہایت کامیاب رہی تھی جس میں ملک کے چوٹی کے نمائندہ ہندو، سکھ اور عیسائی ادیب و شاعر شریک ہوئے تھے جن میں فراق گورکھپوری، پنڈت آنند نارائن ملا۔ کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، دی شنکر، عرش ملسیانی۔ میلا رام وفا۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ ڈاکٹر نریش، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ بلراج کومل کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ ساحر ہوشیارپوری، جوگندر پال۔ کرشن موہن۔ کرشن مراری، آزاد گلاٹی۔ پریم کمار نظر کرنل ایس پی سنگھ سوز۔ مہر کیرو ثاقب بریلوی۔ اندر موہن مہتہ کیف، ہیرانند سوز، شرون کمار ورما، ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بشیشر پردیپ، راجہ لال راجہ، گیت سہائے شری واستوا۔ کرشن کمار طور، کشمیری لال ذاکر۔ کمل چیٹرجی شبنم، پنڈت دیوی پرشاد مست بریلوی۔ ملک مظفر نگری، سوغیل رامپال۔ ماہر بلگرامی، رانا پرتاپ سنگھ رانا گنوری، اجیر سنگھ سینی۔ کلدیپ تلواڑ۔ ساحر شیامی شوق مرزاپوری، ایس ونت بھن غالب شاہ آبادی۔ پریم نارائن دہال۔ خیام کشن نگم۔ ایس این سنہا۔ ای لاوتیں پی این پانڈے۔ ایم پی۔ جگر جالندھری۔ بسمل کیدر تھلوی اوم پرکاش پوری نسیم نور محل۔ پربھان شنکر سرد شش اناوی، شاطر حیدرآبادی، رگھوبیر سرن دواکر، ماہی پیدان سنگھ مہر، رام لال عبثاری۔ رام رتن مضطر وغیرہ قابل ذکر ہیں جو مشاہیر شریک نہ ہو سکے لیکن انکی ہمدردیاں کانفرنس کو حاصل تھیں ان میں آپ کے علاوہ نوشتر گرامی، مالک رام، راجندر سنگھ بیدی، راما نند ساگر۔ دیوان سنگھ مفتون۔ رنبیر، جمنا داس اختر، دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی، خوشونت سنگھ سنیل دت وغیرہ شامل تھے۔ چونکہ اس سے پیشتر مختلف کانفرنسوں اور سبھاؤں میں اردو زبان اور اردو ادب کے کار...

نے ہندو مسلم قلمکاروں کو دعوتِ شمولیت دی گئی ان میں سے آل احمد سرور، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، کوثر چاندپوری، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، سہیل عظیم آبادی، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، کلام حیدری، رحمٰن نیر، سلامت علی مہدی، لطف الرحمٰن، شعیب الرحمٰن، مظہر امام، خمار بارہ بنکوی، خان الفرید، زاہدی، آذ بارہ بنکوی، خلش دہلوی کے علاوہ مقامی طور پر پانچ سو کے قریب یونیورسٹی کے اساتذہ، شاعر ادیب اور صحافی شریک تھے۔ خواجہ احمد عباس بھی اس کانفرنس کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ لیکن کسی خاص مجبوری کی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔

اسی کانفرنس نے پہلی بار اُترپردیش کے لئے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا کو اُردو کے بارے میں عوام کے سامنے اپنا موقف واضح کرنے کا ایک موقع فراہم کیا تھا اسی کانفرنس نے میٹنگ نے اندر اُردو کے حق میں چند گھنٹے کے لئے ایک خوشگوار فضا بنا دی تھی۔ کانفرنس میں شریک کسی بھی غیر مسلم ادیب نے اُردو کے بارے میں فرقہ وارانہ یا غیر مفاہمانہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اسی کانفرنس نے نہ صرف اردو کے صوبوں کے لئے بلکہ جہاں جہاں ہندی ایک علاقائی زبان کی حیثیت رکھتی ہے وہاں اس کے ساتھ اُردو کو بھی دوسری سرکاری زبان بنا دینے کا متفقہ طور پر ایک قرار داد منظور کی تھی۔ اسی کانفرنس نے اپنے آخری اجلاس میں یہ قرار داد بھی منظور کی تھی کہ غیر مسلم اُردو مصنفین جو بالکل عارضی طور پر محض اُردو کی حمایت کرنے اور اُردو مخالف سیاسی جماعتوں کے جھوٹے پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے کہ یہ صرف ایک فرقے یعنی مسلمانوں کی زبان ہے اس نام کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ اس تنظیم کو مستقل بنانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کرے گی۔

لیکن کانفرنس کی کامیابی کے حاسد اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے لوگ اس کی مخالفت سے باز نہیں آئے تھے اس کانفرنس کے سیکولر کردار پر سب سے پہلا پتھر مسٹر غلام سرور (موجودہ وزیر تعلیم بہار) کے اخبار سنگم کے اس اداریے کے ذریعے پھینکا گیا تھا کہ چونکہ حکومت ہند اردو کو بہت کچھ دیئے جا رہی ہے۔ اس لئے اب اس میں غیر مسلم ادیب بھی کود رہے ہیں۔ دوسرا پتھر سنگم کے نائب مدیر اور صحافی پرکاش ویرشاستری (مرحوم) نے اپنے ہفتہ وار جن جاگرن میں ایک طویل مضمون لکھ کر اترپردیش کو ایک دوسرا پردیش بنایا جا رہا ہے پھینکا تھا۔ ایک اور مضمون اردو کے ایک شاعر عتیق حنفی صاحب نے ہندی کے ہفت روزہ ... میں کانفرنس کی مخالفت میں چھپوایا تھا۔ ایک اور مخالف آواز اردو کے ماہنامہ تحریک کے ذریعے گوپال متل صاحب نے اٹھائی تھی اور ہندی کے اردو مخالف ہفتہ وار دھرم یگ نے تو ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی، کملیشور، ڈاکٹر راہی معصوم رضا وغیرہ کے متعدد مضامین شائع کئے تھے۔ ان تمام مخالف آوازوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فرقہ پرست مسلمان اور ہندو دونوں اُردو کے سیکولر کردار کے حامی نہیں تھے بلکہ وہ اُردو کو ایک ہی فرقہ سے وابستہ کر کے اپنے اپنے بدترین مقاصد کو پورا کرنے کے در پے تھے

میں نے نگراں کمیٹی اور اترپردیش کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر بہوگنا سے درخواست کی تھی کہ وہ قومی سطح پر اردو کے حق میں ایک خوشگوار فضا قائم رکھنے کے لئے شہر بہ شہر دانشوروں اور شہریوں کے سیمینار کرائیں اور اُردو والوں کے دلوں میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے کہ یہ زبان واقعی ایک سیکولر کردار رکھتی ہے حکومت کی مختلف رابطہ کمیٹیوں میں اُردو یونٹ قائم کر کے وہاں مسلم اور غیر مسلم ادیبوں کو جگہ دلائیں جس کے لئے وعدے تو کئے گئے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اُردو کا مسئلہ جو کانگریس کے گذشتہ دور حکومت میں ایک سیاسی کھلونا بنا ہوا تھا وہ موجودہ جنتا حکومت کے لئے بھی اسی حیثیت سے موجود ہے۔ مسٹر غلام سرور بہار حکومت کے وزیر تعلیم ہوتے ہوئے بھی اپنے صوبے میں اردو ... کو اس کا جائزہ مقام دلانے کے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ راہی معصوم رضا ابھی تک اُردو کو ایک زبان ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ جن سنگھیوں کا رویہ بھی ابھی تک نہیں بدلا ہے اور عتیق حنفی اور گوپال متل جو اپنے اپنے خول میں گذشتہ

[illegible] کانفرنس کے انعقاد کے ہی موضوع پر [illegible] جائیں گے

گذشتہ سال لکھنؤ میں اقبال صدی کی تقریبات کے موقعہ پر ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر جگم چند نیر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور چودھری پربھان جشنگر سنر وشن اور ہم نے اردو کی صورتِ حالات کا جائزہ لیا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ نئی حکومت کے دورِ حکومت میں بھی ویسی ہی ایک کانفرنس کرنے کی سخت ضرورت ہے جس نے برسرِ اقتدار آتے ہی اردو کے مسئلے کو پھر سے ۱۹۴۷ء کے زمانے کی طرف دھکیل دیا تھا۔ لیکن دوسری غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے انعقاد سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ پہلی کانفرنس کے مندوبین سے بھی رائے لے لی جائے جن کی موجودگی میں پہلی کانفرنس کے نام کو پھر سے نہ استعمال کرنے کی قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اس مقصد کے تحت میں نے متعدد حضرات کو خطوط لکھے اور قریب قریب سب ہی نے دوسری کانفرنس کی تجویز کی حمایت کی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اسی سلسلے میں ایک رائے عامہ تیار کرنے کے لئے شانِ ہند میں اداریہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں جہاں بھی غیر مسلم اردو ادیب، شاعر، صحافی موجود ہیں ... وہ آپ کے رسالے کے ذریعے دوسری کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے۔ اور پہلے کی طرح اب بھی یہ مقصد پیش نظر رکھیں گے کہ اردو کو اس کے جمہوری حقوق دلانے کے لئے انجمن بدترین قسم کے ہندو اور مسلم فرقہ پرستوں کے ساتھ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ ٹکرایا ہوگا۔ جو نئے سیاسی حالات میں اپنے اپنے مذہبی چغے پہن کر اور ماتھے پر قشقہ لگا کر خود کو زیادہ محفوظ تصور کرنے لگے ہیں۔ اور ان کے لئے مصلحت کوشیاں نہ صرف سیاسی بلکہ ایک تہذیبی حربہ بھی بن چکی ہیں۔

مخلص

رام لعل

مشاعرہ لال قلعہ سیاست کی نذر

اس سال مشاعرہ لال قلعہ (جشن جمہوریت) کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اردو واقعی مسلمانوں کی زبان ہے اور کیا لطف کی بات ہے کہ یار لوگوں نے یہ کام غیر مسلم دانشوروں کے ہاتھوں اس شاطرانہ انداز میں انجام دلایا کہ جناب مہیشور دیال اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایسے مستند غیر فرقہ پرست بھی دھوکا کھا گئے۔

ہندوستان میں ہندو اردو روزناموں پرتاب، ہند سماچار، ملاپ، تیج وغیرہم کی تعداد اشاعت اتنی زیادہ ہے کہ مسلمانوں کے اردو روزنامے ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔ اردو کے ہفت روزے اور ماہنامے بھی وافر تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ جن کا انتظامیہ ... ہندوؤں اور مدیران کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ اردو رسائل صرف "شمع" کو چھوڑ کر باقی ان رسائل سے کسی طرح کم نہیں ہیں جن کا انتظام یا ادارت مسلم حضرات کے قبضے میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "شمع" کی تعداد اشاعت اتنی زیادہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی دوسرا اردو رسالہ اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ "شمع" کو غیر مسلم اردو پرستوں میں بھی اتنی ہی مقبولیت حاصل ہے جتنی کہ مسلمانوں میں جس کا ثبوت شمع معموں میں انعام پانے والے غیر مسلموں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی جب تک ایک ہندو مدیر جناب خوشتر گرامی کی زیرِ ادارت ... شائع ہوتا تھا۔ تو ادبی رسائل میں اس کا ایک مقام تھا اور تعدادِ اشاعت بھی ادبی رسائل میں صفِ اول میں تھی اور جب سے اس کی ادارت اور انتظام مسلمان ... مدیر کے ہاتھ میں آیا ہے بیسویں صدی محض آپ ہی جاتی رہی ہے اور تعداد اشاعت بھی وہ نہ رہی۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار پیش کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہندوستان میں غیر مسلم اردو والوں کی تعداد مسلمانوں سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔ تو پھر جشن جمہوریہ

ہے مشاعرہ کو ہر طرح سے صرف مسلمانوں کی ہی
تقریب بنانے کی ناپاک کوششیں ایک سوچی
سمجھی سازشیں نہیں تو اور کیا ہے جبکہ جشن
جمہوریت ایک ایسا قومی تہوار ہے جس میں
ہر ہندوستانی برابر کا حصہ لیتا ہے [illegible] کی
فرقہ وارانہ انداز میں پیش [illegible]۔

۱۳ دسمبر کو سب کمیٹی کی میٹنگ میں جن شاعروں کو
دعوت نامے جاری کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ ان میں
۴۴ شعرائے کرام مسلمان ہیں اور چار ہندو حضرات کنور
مہندر سنگھ بیدی سحر مشاعرہ کمیٹی کی رکنیت۔ مشاعرہ
لال قلعہ میں بطور شاعر یا [illegible]
انکار فرما چکے ہیں۔ لیکن ان کا نام بطور شاعر دوبارہ فہرست
میں شامل کیا گیا ہے۔ محض اس لئے کہ شعرائے کرام کو دھوکا دیا
جا سکے۔ جناب نو بہار صابر علالت کے باعث مشاعرہ
میں شریک ہونے سے معذوری ظاہر فرما چکے تھے۔ مگر
پھر بھی ان کا نام فہرست میں رکھا گیا۔ باقی رہے دو
نام جناب کرشن موہن اور جناب جگن ناتھ آزاد کا۔ یعنی
۴۴ شعرائے کرام میں صرف دو ہندو رکھے گئے۔ گویا
ہندوستان کی سب سے بڑی اکثریت کو آٹھ فیصدی
نمائندگی دی گئی۔ کہاں ہیں وہ مسلمان لیڈران کرام جو
پولیس سینٹرل ریزرو پولیس اور دوسرے سرکاری
اداروں میں مسلمانوں کے لئے مخصوص تعداد کا مطالبہ
کرتے نہیں تھکتے۔ ان کی زبان اس معاملے میں گنگ کیوں
ہو گئی ہے کہ لال قلعہ کے مشاعرہ میں ہندوؤں کو انکی تعداد کے
مطابق نمائندگی کیوں نہیں دی گئی۔ اس سلسلے میں ہم
مشاعرہ کمیٹی کے جملہ ممبران سے عموماً اور جناب مہیشور دیال
اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے خصوصاً دریافت کرنا چاہتے
ہیں۔ کہ آپ نے جن مسلمان شعرا کو مدعو فرمایا کیا ان سے
بہتر غیر مسلم شاعر نہیں تھے۔ کیا وجہ ہے کہ بمبئی سے ہر سال اختر
الایمان کیفی اعظمی۔ اور مجروح سلطان پوری کے لئے آپ
فرش راہ بنے جاتے ہیں۔ اگر مشاعرہ لال قلعہ کو بغیر فلمی

چاشنی دیئے کام نہیں چل سکتا تو کیا۔ گلزار۔ راجندر کرشن
اور قمر جلال آبادی آپ کی نظروں میں شاعر نہیں ہے بلکہ
حقیقت یہ ہے کہ گلزار صاحب اور راجندر کرشن صاحب
کو محض دیکھنے کے لئے ہی ہزارہا سامعین مشاعرہ میں شریک
ہونا خوش نصیبی سمجھتے اور کلام کے لحاظ سے بھی یہ شاعر کسی
بھی بڑے سے بڑے نا ڈھو خان سے کم نہیں ہیں۔ کیا ڈاکٹر
گوپی چند نارنگ حلفاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن مسلمان شعرائے
کرام کو مدعو کیا گیا ہے۔ ان کے مقابلے میں ملک بھر میں کہیں
بہتر ہندو شاعر موجود نہیں۔ ہم ملک بھر کے ہر پردیش کے
ان نوجوان۔ بزرگ۔ اور بہترین ہندو شعرا کی فہرست
پیش کرتے ہیں جو اب کی مرتبہ مدعو کردہ شعرا سے ہر لحاظ
سے بہتر ہیں۔ مثال کے طور پر جناب سادھو رام آرزو
کلکتہ کے مقابلے میں آپ ہندوستان کے کسی بھی مسلمان
شاعر کو بہتر ثابت نہیں کر سکتے۔ جناب کرشن بہاری نور جو
ہندوستان کا دوسرا فراق ہے وہ آپ کی نظروں میں
کیوں نہیں سمایا جبکہ اس کے تحت اللفظ پر ملک بھر کے
مترنم شاعروں کا ترنم پھیکا پڑ جاتا ہے۔ جناب رگھبیر
داس ساحر سیالکوٹی۔ بہار نالوی۔ عرش ملسیانی۔ ڈاکٹر
نریش ساحر ہوشیار۔ امرت لال عشرت ایسے سینکڑوں
مستند شعرائے کرام کو آپ کیسے بھول گئے۔

اس مشاعرہ کے لئے دو ہزار خصوصی دعوت نامے اور
اور چھ ہزار عوامی دعوت نامے چھپوائے گئے۔ یہ خصوصی
دعوت نامہ کہاں گئے۔ کیا دہلی انتظامیہ کا متعلقہ محکمہ یہ
ثابت کر سکتا ہے کہ ایک بھی ہندو کو یہ دعوت نامہ بھجوایا گیا
اگر نہیں تو کیوں۔ کیا ساری دہلی میں ایک بھی ہندو ایسا
نہیں جو لال قلعہ کا مشاعرہ جشن جمہوریت سننے کی اہلیت رکھتا
ہو۔ گزشتہ اٹھتیس سال سے دہلی ایڈمنسٹریشن سے ہر سرکاری
تقریب کا دعوت نامہ ۔۔۔ مدیر شان ہند کو موصول ہوتا
رہا ہے مگر اب کی مرتبہ اس مشاعرہ کا دعوت نامہ نہیں دیا
گیا۔ مدیر شان ہند ہی کیا کسی بھی ہندو شاعر یا مستحق ہم
کو دعوت نامہ جاری نہیں کیا ۔۔۔ کیا دہلی ایڈمنسٹریشن

[illegible] دعوت نامہ حاصل کرنے کے [illegible] شعرا اور صحافی نیز ان کے اہل خانہ یا ان کے بچوں کی خوشامد کریں گے۔ ہاں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ خصوصی اور عوامی دعوت نامے مسلم علاقوں میں خوب خوب بانٹے گئے۔ بلکہ بغیر ضرورت پھینکے گئے کیونکہ مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت جنتا پارٹی کو بھی تو ہے۔ مگر دہلی کے مسلمانوں نے ضمنی انتخابات میں جنتا پارٹی کے امیدوار کو ہرا کر اپنا فیصلہ دے دیا ہے۔

جناب مہشور دیال اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جشنِ جمہوریت کے مشاعرے میں جس ہندو نواز پالیسی کی حمایت کی ہے وہ نہ صرف قابلِ افسوس ہے بلکہ اس مشاعرے کو سیاست کی نذر کرنے کے گناہ میں شریک ہونے کے بھی مترادف ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مشاعرہ کمیٹی کے کچھ ممبران کی سب کمیٹی بنا دی گئی تھی جس کے ذمہ شعرا کے انتخاب کا کام تھا۔ اس سب کمیٹی میں جناب گوپال متل اپنے گروہ کے شعرا کے لئے [illegible] یہ کہا گیا کہ محمود سعید کی صاحب اور آغا [illegible] کو آپ کے کہنے پر پچھلے سال بھی لال قلعہ کے مشاعرہ میں رکھا گیا تھا۔ اس مرتبہ ان کی جگہ جناب باقی [illegible] کار باقی کو مدعو کیا جائے تو انھوں نے اس تجویز کی بھرپور مخالفت کی گویا ہندو شعرا کو مدعو کرنے کی مخالفت ایک ہندو ممبر نے ہی کی۔ اس ضمن میں یہ کہنا مناسب ہے کہ حکومت میں شریک ایک پارٹی اور گوپال متل صاحب کے نظریے یکساں ہیں اور اس پارٹی کے ہر ممبر کا یہ ایمان رہا ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی ہی زبان سمجھا جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ گوپال متل صاحب نے غیر مسلم اردو رائیٹرز کانفرنس کی [illegible] ہم جناب سکندر بخت صاحب سے یہ دریافت کرنے کی جسارت ضرور کریں گے کہ کیا ان کے خیال میں بھی اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے یا سب کی مشترکہ زبان ہے کیونکہ گوپال متل صاحب کا لال قلعہ کے مشاعرہ کمیٹی میں در و مسعود جناب سکندر بخت صاحب کا ہی مرہون

منت ہے۔

کاش کہ اس خالص قومی مشاعرہ کو سیاست کی غلاظت سے دور رکھا جاتا۔

اردو مجلس نہیں سنیں گے

لال قلعہ کے مشاعرہ جشنِ جمہوریت میں

جب رفعت سروش صاحب کلام سنانے کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔ تو کہا جاتا ہے کہ سامعین نے یک زبان ہو کر ہوٹنگ کرتے ہوئے یہ نعرے لگائے کہ اردو مجلس نہیں سنیں گے۔ اردو مجلس نہیں سنیں گے رفعت سروش عام طور پر مشاعروں میں دوسرے شعرا کو ہوٹ کرانے کی ناپاک کوشش کرتے رہے ہیں اور اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ یہ خود ہر مشاعرہ میں ہوٹ ہونے لگے ہیں۔ اور یہ ہوٹنگ اب آل انڈیا ریڈیو کے ایک مخصوص پروگرام "اردو مجلس" کی ناپسندیدگی تک آ پہنچی ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے اس مخصوص پروگرام کے انچارج رفعت سروش صاحب ہیں۔ اردو مجلس [illegible] مخصوص پروگرام مرحوم مولانا آزاد کی [illegible] کیا گیا تھا۔ مگر یہ پروگرام اب [illegible] پروگراموں میں سب سے گھٹیا پروگرام [illegible] نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ جب اردو مجلس کے پروگرام کا وقت ہوتا ہے تو عوام وودھ بھارتی سننا پسند کرتے ہیں۔ رفعت سروش صاحب کو چاہیے کہ وہ احباب نوازی کو چھوڑ کر اس پروگرام کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر محمد حسن اور ضحاک

عصری ادب جنوری اپریل [illegible] کے

شمارہ میں ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا ڈرامہ ضحاک شائع ہوا تھا۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے یہ [illegible] کیا تھا کہ انھوں نے یہ ڈرامہ ایمرجنسی کے دور میں ہونے والے مظالم سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اور یہ سوچ کر لکھا تھا کہ یہ شائع نہ ہو سکے گا۔

ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد بہت مفاد پرست نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ محترمہ اندرا گاندھی کے دَور ایمرجنسی کے خلاف تھا اور اس ایمرجنسی کے زمانے میں جو مظالم ہوئے وہ ان کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجبوراً چپ رہا۔ کتنی لیڈروں شعرا اور ادیبوں نیز صحافیوں نے اس قسم کے بے تکے دعوے کئے اور تضحیک کا موضوع بنے۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے اس قسم کے خوشامدانہ رویّے کی اُمید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اور ضحاک ان کی اپنی تخلیق تو ہے ہی نہیں۔ کیونکہ [illegible] پورے ایک سو برس پہلے یعنی ۱۸۷۷ء میں سلطان عبدالحمید دوم کے دور استبداد میں سامی بک نے ترکی زبان میں گاوے کے عنوان سے یہی ڈرامہ تحریر کیا تھا۔ اور اختر شیرانی نے ضحاک کے عنوان سے اس ڈرامے کا اُردو ترجمہ کیا تھا اور اختر شیرانی کا یہ ترجمہ کیا ہوا ڈرامہ ۱۹۲۶ء یعنی ۵۲ برس پہلے بالاقساط بہارستان میں شائع ہوتا رہا اور پھر یہ کتابی صورت میں بھی چھپا۔

نہ معلوم پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر محمد حسن ایسے باشعور لوگ یہ یقین کیوں کر لیتے ہیں کہ پاکستان میں ۱۹۶۱ء میں چھپی ڈار صاحب کی انگریزی کتاب یا ۱۹۲۶ء میں بہارستان میں چھپا ڈرامہ ضحاک، کسی ہندوستانی کی نظروں سے گزرے گا ہی نہیں۔ حال ہی میں ایک کتاب بھوپال سے اُردو کا پہلا ڈرامہ شائع ہوئی ہے جس کے مصنف جناب اخلاق اثر نے "ضحاک کا فکری و فنی مطالعہ" کے عنوان سے ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اصل ضحاک کو ایک صدی میں کس کس نے کس کس تبدیلی کے ساتھ پیش کیا۔ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے (یہ کتاب دفتر شان ہند سے دستیاب ہے)

ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن صاحب ایسی باشعور ہستیاں بھی بغیر کسی حوالے کے سو سال پرانی تحریریں کچھ ردوبدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کرائیں تو یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے۔

سا[illegible] تمنا

نام: سا[illegible]

تخلص: تمنّا

تاریخ پیدائش ۵ نومبر ۱۹۵۱ء

وطن: سانگلی (مہاراشٹرا) تعلیم انٹرمیڈیٹ

ذریعہ معاش: اناؤنسر، کیریکٹر آرٹسٹ، ڈبنگ آرٹسٹ

- شاعرہ -

فلمیں: - بے تصویر، آخری خط، بیٹی، فوجی، رنگارا، وہ میں نہیں، دشمنی یار کی، یاری زندہ باد، ہیر رانجھا، دروازہ، ٹیکسی ٹیکسی، میرا، بھابھی (گجراتی) بھنگری (مراٹھی)، بلم پردیسیا (بھوجپوری) وغیرہ وغیرہ

میرے ذاتی اسٹیج شو: داستانِ میناکماری، تجھے میرے گیت بلاتے ہیں، سرتاج گیت مالا، سہانی یادیں پائل کی جھنکار - غزل رنگ

وہ فلمیں جن میں مرحومہ میناکماری کے لیے اپنی آواز دی: البیلا شاہ، بہاروں کی منزل، دشمن، میرے اپنے، گومتی کے کنارے، پاکیزہ اور آنے والی فلم میناکماری کی امر کہانی

آرٹ کی تعلیم: ستار، ڈانس،

زیر ترتیب کتابیں: اُردو مشاعروں کی تاریخ، اُردو شاعری میں خواتین کا حصّہ، شعری مجموعہ، سہانا سپنا (ناول)

رہائش: B/2 سن فلاور
ہل روڈ - باندرہ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰
فون نمبر ۵۴۹۳۲۶

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

میں ۱۹۲۵ء میں چک نمبر ۲۰۶ ہرگوبند پور ضلع لائل پور پاکستان میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ان دنوں ہندو مسلمانوں میں آج کل کی طرح محض دکھاوے کی ہی محبت و خلوص نہ تھا۔ بلکہ دلی خلوص تھا اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ایک ضروری فرض سمجھا جاتا تھا میرا گاؤں سکول سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا اس لئے رومال میں دیسی گھی سے پکے پراٹھے اور آلو گوبھی وغیرہ کی سبزی ساتھ لے جانا ہر روز کا معمول تھا۔ سکول کے برآمدے میں بیرونی طالب علموں نے اپنا اپنا کیل ٹھونک رکھا تھا جس پر کھانے والے رومال کو لٹکا دیا جاتا اور دوپہر کی آدھی چھٹی کے وقت ہر کوئی اپنی اپنی روٹی کا رومال اتارتا اور سکول کے احاطے میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھاتے ان دنوں اگر کسی مسلمان لڑکے نے ہندو لڑکے کی روٹی کے رومال کو ہاتھ لگا دیا تو وہ روٹی بھٹ جاتی تھی اور وہ روٹی یا تو ہاتھ لگانے والے مسلمان لڑکے کو ہی دے دی جاتی یا کتے کو ڈال دی جاتی۔ مگر چھوت چھات کی اس شدت کے باوجود ہندو مسلمان سگے بھائیوں کی طرح رہتے تھے عزیز احمد نور محمد اور کئی مسلمان لڑکے بھی میرے ہم جماعت تھے۔ اور وہ جانتے تھے۔ کہ میری روٹی ہر روز ہی تر مال ہوتی ہے اس لئے اگر آج عزیز احمد نے بھولے پن سے میری روٹی کو ہاتھ لگا دیا تو دوسرے دن نور محمد نے اور دو ایک دن چھوڑ کر پھر سے عزیز احمد نے یہی حرکت کر دی جس سے ہفتہ کے چھ دنوں میں عام طور پر تین یا چار دن مجھے دوپہر کا کھانا نصیب نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر میرے گھر والوں تک پہنچی تو میرے والد صاحب نے جو خود چک [illegible] میں پرائمری سکول کے اول مدرس تھے۔ میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر [illegible] سے کہا کہ [illegible] روٹی کا رومال ان کی الماری میں رکھ دوں۔ جب آدھی چھٹی کی گھنٹی بجی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ پانچویں جماعت کے سارے لڑکے ان کے پاس آ جائیں اور اپنی اپنی روٹی کا رومال بھی لیتے آئیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک چبوترے پر دری بچھا کر بیٹھتے تھے اور طالب علم کمرے کے فرش پر بچھے ٹاٹ پر بیٹھتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے حکم دیا کہ ان کی نشست گاہ کے پاس بچھے ہوئے ٹاٹ پر سب بیٹھ جاؤ۔ اتنے میں۔ ... سکول کا چپراسی ... ہیڈ ماسٹر صاحب کا کھانا بھی لے آیا۔ میں نے بھی اپنا رومال نکالا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے فرمایا۔ دریا پر کاشی کھڑے ہو جاؤ۔ میں نے سمجھا کہ شاید کھانے کی بجائے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی پر کھانے پڑیں گے مگر انھوں نے نہایت سنجیدگی سے فرمانا شروع کیا کہ دیکھو تمہارے بھی دو ہاتھ ہیں۔ اور تمہارے مسلمان ساتھیوں کے بھی دو ہاتھ ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم میں اور مسلمان لڑکوں میں کیا فرق ہے۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اتنے میں انھوں نے عزیز احمد سے کہا کہ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کھانے کو چھوئے وہ ڈرتے ہوئے اور پیچھے ہٹنے لگا۔ تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے تلخی سے کہا کہ تھالی سے ہاتھ لگاؤ عزیز احمد نے خوف زدہ حالت میں کانپتے کانپتے تھالی کو ہاتھ لگایا۔ پھر فرمایا کہ دونوں کو بھی ہاتھ لگاؤ [illegible] نے ایسا ہی کیا۔ تو مجھے کہنے لگے دریا پر کاشی کیا تھالی کی رنگت بدل گئی ہے یا روٹی میں زہر کا اثر آ گیا ہے میں اب بھی چپ رہا تو انھوں نے عزیز احمد کا ہاتھ لگی روٹیوں کو کھانا شروع کر دیا۔ عزیز احمد اور دوسرے مسلمان لڑکوں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے حکم ہوا کہ تم عزیز احمد اور دوسرے تمام مسلمان ہم جماعت لڑکوں کی روٹیوں کو ہاتھ لگاؤ۔ میں نے ایسا

کیا تو فرمانے لگے اب بتاؤ کہ تمہارے ہاتھ لگانے سے ان مسلمانوں
کی روٹیوں کی رنگت بدل گئی ہے یا یہ زیادہ پوتر ہو گئی ہیں۔ میں
خاموش تھا حکم ہوا کہ عزیز احمد اور سارے مسلمان ہم جماعت
طلباء سے کہو کہ وہ تمہاری روٹی سے ایک ایک لقمہ توڑ کر تمہیں
[illegible] کھلائیں میں نے کچھ ہچکچاہٹ کی تو انھوں نے [illegible]
[illegible] باری باری ان کی تھالی میں سے ایک ایک لقمہ اٹھا
کر انھیں کھلائیں۔ مسلمان طلبا کے لئے یہ ایک نئی بلکہ اچنبھے کی
بات تھی انھوں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی تو ہیڈ ماسٹر مجھ سے
مخاطب ہوئے کہ بتاؤ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اب میں اس قدر
نادم ہو چکا تھا کہ چھوت چھات کا بھوت بھی مجھے چھوڑ کر کہیں
بھاگ گیا تھا۔ اور میں نے اپنے مسلمان ہم جماعت طلبا کے
ہاتھ کے لقمے نہایت اطمینان سے کھائے۔ لالہ ڈھالو رام
صاحب ہیڈ ماسٹر نے میرے دل میں مسلمانوں سے چھوت
چھات نہ کرنے کا پہلا بیج اس طرح بویا کہ جس کا اثر اب
تک قائم ہے۔ اور میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کبھی بھی کسی
مسلمان سے اس وجہ سے نفرت نہیں ہوئی کہ وہ مسلمان
ہے۔ کاش ہمارے معلم، پروفیسر، لیکچرار اور ہیڈ ماسٹر
نیز پرنسپل صاحبان اگر لالہ ڈھالو رام صاحب ہیڈ ماسٹر
کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ
طالب علموں کے دلوں میں اس جذبہ کو بھی بٹھانے کی کوشش
کریں۔ کہ ہم سب ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔
اور کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہے۔ تو کچھ سالوں بعد مذہبی نفرت
چھوت چھات وغیرہ از خود ختم ہو جائے گی۔

میرے آبائی گاؤں ہیرو غربی ضلع ڈیرہ غازی خاں
(پاکستان) سے ایک میل کے فاصلہ پر گاؤں ہیرو شرقی
میں میرے سسرال تھے۔ ہیرو شرقی میں ایک بلوچ
غلام رسول خان بڑے دبدبے اور رکھ رکھاؤ کے
زمیندار تھے۔ ایک ہندو لڑکی کنوئیں سے پانی کا مٹکا سر پر
رکھے اپنے گھر جا رہی تھی کہ غلام رسول خان کے جوان
سال لڑکے نے شرارتاً غلیل سے ایسا نشانہ لگایا کہ
پانی بھرا مٹکا پھوٹ گیا اور لڑکی کے کپڑے بھیگ گئے

ان دنوں گاؤں کی لڑکیاں موٹا لباس پہنتی تھیں چنانچہ
کپڑے بھیگنے کے باوجود لڑکی کے جسم سے نہیں چپکے اور
وہ اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھی غلام رسول خان کے
گھر چلی گئی اور جاتے ہی روتے ہوئے غلام رسول خان
کی بیوی سے فریادی لہجہ میں کہا چاچی محمد خان نے یہ شرارت
کی ہے۔ محمد خان کی ماں نے لڑکی کے منہ پہ ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا کہ چپ ہو جا۔ اس کا باپ گھر پہ ہے اگر اس
نے سن لیا تو محمد خان کو جان سے مار دے گا۔ لڑکی
تو چپ ہو گئی۔ مگر غلام رسول خان نے یہ بات سن لی تھی
وہ کمرے سے باہر آئے اور گرجدار آواز میں کہا بیٹی
ٹھیک ٹھیک بات بغیر کسی ڈر کے کہو لڑکی نے تمام واقعہ
من و عن سنایا تو غلام رسول خان اندر گئے اور
بندوق اٹھا لائے۔ اپنی بیوی کو حکم دیا کہ اس بچی کو
اور کپڑے پہناؤ جب اس کے گیلے کپڑے سوکھ جائیں تو
اسے نوکرانی کے ساتھ اس کے گھر بھیج دینا اور باندی
سے کہو کہ لالہ ... کے گھر جا کر کہہ آئے کہ اس کی بیٹی
ہمارے گھر میں بیٹھی ہے کوئی فکر نہ کریں۔ یہ کہتے ہوئے
بندوق لے کر باہر نکل گئے۔ محمد خاں نے اپنے باپ کو آتے
ہوئے دور سے دیکھا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ باپ نے بیٹے
پر گولی چلا دی نشانہ خطا گیا۔ اور محمد خاں بھاگنے میں
کامیاب ہو گیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء تک محمد خاں
گھر واپس نہیں آیا تھا۔ یہ تھے میرے وطن ڈیرہ غازی خاں
کے مسلمان جو ہندو لڑکیوں کو بھی اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔

ضلع ڈیرہ غازی خاں میں اس وقت ۴ فیصدی
آبادی ہندوؤں کی تھی اور ۹۶ فیصدی مسلمانی آبادی
۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں تونسہ شریف کے خواجہ نظام
الدین صاحب نے تمام علاقہ میں اطلاعات بھجوائیں
کہ تمام ہندو معہ اہل و عیال اور ضروری سامان کے تونسہ
شریف کی سرائے جن میں دو چار ہزار افراد بیک وقت
قیام کر سکتے ہیں، میں آجائیں۔ ان کے جانی اور مالی کی
حفاظت ان کے ذمہ ہوگی۔ پولیس اور فوج کی نگرانی بھی تونسہ

ریف میں ہندوؤں کی حفاظت کے لئے بھیج چکی تھی۔
ری تحصیل سنگھڑ (تونسہ شریف) کے ہندو گھرانے تونسہ
ریف میں آگئے جن لوگوں کے رشتہ دار وہاں تھے وہ تو ان
ہاں قیام پذیر ہوتے اور باقی کے لوگ تونسہ شریف کی
رائے میں مقیم ہو گئے۔ آٹا۔ گھی نمک مرچ چائے کی پتی۔ دودھ
نے کی لکڑی سب خواجہ نظام الدین صاحب کی طرف سے
یا کئے جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اور منادی کرائی گئی کہ ہندو
رئیس آزادانہ طور پر جہاں آنا چاہیں آجا سکتے ہیں کسی کا
سان نہیں ہوگا۔ پولیس اور فوج کے افسران سے خواجہ
ام الدین صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگ واپس چلے
ئیں یہ میری رعایا ہے ان کی جان اور ان مال ومتاع
حفاظت میرے فرائض میں ہے اور اگر کسی ہندو کی
بڑ بھی چھوٹے گی تو اس کا میں ذمہ دار ہونگا چنانچہ سب
ہندوؤں نے از خود پولیس اور فوج سے کہا کہ ہمیں خواجہ
حب کی سرپرستی درکار ہے۔ آپ کی مدد نہیں چاہئے
نچہ پولیس اور فوج واپس چلی گئی مگر دکھ شرقی کے سیٹھ
وا رام ایک رات کو نقد روپیہ اور زیورات وغیرہ اپنی
ڑیں رکھ چکے سے تونسہ شریف سے ڈیرہ غازی خاں کی
ف روانہ ہوئے تونسہ سے چند گز کے فاصلے پر ہی نالہ سنگھڑ
اس وقت ایک میل پاٹ رکھتا تھا کے عین درمیان صبح کے
ت سیٹھ ملاوا رام قتل ہوئے پڑے تھے اور روپیہ زیورات
ٹ چکے تھے۔ کاران کی بدبختی اور خواجہ صاحب پر اعتماد نہ
نے کے افسوس ناک نتیجہ کی خاموش تصویر بنی ایک طرف
ت میں کھڑی تھی سیٹھ ملاوا رام کے تین دیگر ساتھی بھی قتل
ہو گئے تھے اس واقعہ پر خواجہ نظام الدین کو جو افسوس ہوا
سی طرح بھی سیٹھ ملاوا رام کے رشتہ داروں سے کم نہ تھا۔ کچھ
ن بعد جب خواجہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ ان ہندوؤں
وہ دوبارہ اپنے اپنے گھروں میں آباد نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ
نت ہی ایسے ہو چکے تھے تو انھوں نے افسران کو لکھا کہ موٹر
یلوں کا انتظام کیا جائے اور دو چار دنوں کے بعد سرکاری
لاریوں کا قافلہ قریباً چار ہزار ہندوؤں کو لے کر ڈیرہ

غازیخان روانہ ہوا اور وہاں سے نہایت [illegible]
کرنے کے بعد غازی گھاٹ کے اسٹیشن پر پہنچا۔ خواجہ
نظام الدین صاحب کی کار اس قافلے کے آگے آگے چل
رہی تھی۔ غازی گھاٹ پر سپیشل گاڑی ان تارکان وطن کو
لے جانے کے لئے کھڑی تھی۔ اور خواجہ صاحب سے ساتھی
یہ ہندو رعایا رو رو کر الوداع لے رہی تھی۔ میرے بوڑھے
ماں باپ۔ میرا بھائی۔ اور میرے سینکڑوں رشتہ دار
اسی قافلہ میں تھے میں ملتان سے دہلی ایک ماہ پہلے آچکا
تھا۔ جب کئی ماہ بعد میرے ماں باپ کرنال میں ملے تو
وہ خواجہ نظام الدین صاحب کو یاد کرتے ہوئے آنکھوں
میں آنسو بھر لائے اور کہنے لگے کہ یہ خواجہ نظام الدین کی
مہربانی اور خواجہ شاہ سلیمان تونسویؒ کا کرم نیز خدا کا احسان
ہے کہ آج تم ہمیں دیکھ رہے ہو۔ کچھ سال بعد خواجہ نظام الدین
اجمیر شریف جاتے ہوئے دہلی سے گوڑ گاؤں وغیرہ سے
گذرے تو تونسہ شریف کے ان تارکان وطن نے اپنے
محسن خواجہ نظام الدین صاحب کو کندھوں پر اٹھا کر گوڑگاؤں
ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جلوس نکالا۔ بچوں
اور لوگوں کے بار روش نے خواجہ صاحب سے اپنی دلی
عقیدت کا اظہار کیا۔ اور کوئی بھی ان میں ایسا نہ تھا کہ جو
رو رو کر خواجہ صاحب کی قدم بوسی نہیں کر رہا تھا۔ اور
خواجہ صاحب بھی اپنی رعایا کو گلے لگا لگا کر دعائیں دے
رہے تھے۔ یہ تھے خواجہ شاہ سلیمان تونسویؒ کے [illegible]
خواجہ نظام الدین صاحب جنہوں نے [illegible] کے ایسے
بڑے وقت میں چار ہزار ہندوؤں کو اپنی پناہ میں رکھا
اور اسلام کو اصلی روپ کو جہان کے مسلمانوں اور
ان مہاجروں کو دکھایا۔ اب خواجہ نظام الدین صاحب
اس دنیا میں نہیں رہے۔ مگر تونسہ شریف (تحصیل سنگھڑ)
کا ہر مہاجر ہندو ان کا ممنون احسان ہے۔ اور ان کو دل
سے یاد کرتا ہے۔ اور دہلی میں مسلمانوں کو اپنے خواجہ
کی رعایا پروری کے واقعات بڑے فخر سے سناتا ہے۔ اور
ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے وطن کو یاد کرتا ہے جہاں خواجہ

وسلم دونوں سگے بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔

عالیجناب راجہ نریندر ناتھ رئیس اعظم لاہور پہلے ہندوستانی تھے جو انگریزی حکومت میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر تعینات ہوئے۔ مگر جب انگریزی حکومت نے ایک جونیئر انگریز کو کمشنر بنا کر راجہ صاحب کو پھر ڈپٹی کمشنر بنا دیا تو انھوں نے اسے توہین سمجھا اور انگریزی حکومت کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

جناب راجہ صاحب ملتان میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انھوں نے عدل و قانون کا جو مظاہرہ فرمایا وہ اہل ملتان کے لئے نئی بات تھی کیونکہ انگریز ڈپٹی کمشنر کا ان دنوں دبدبہ ایسا ہوتا تھا کہ اس زمانے میں وزیر اعظم کا بھی نہیں۔ پہلی بار ایک ہندوستانی ڈپٹی کمشنر بنایا گیا تھا۔ اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کو جو اپنے خدا کو حاضر ناظر سمجھتی تھی اور جس سے ناانصافی کی امید ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہر فریادی کو فریاد براہ راست ڈپٹی کمشنر کے حضور کرنے کا موقع پہلی بار ملا تھا لہذا راجہ صاحب نے اہل ملتان کے دلوں [illegible] کر لیا۔ راجہ صاحب کا معمول تھا کہ علی الصبح باغ لانگے خاں میں سیر کے لئے جاتے۔ ایک بوڑھا ہر روز ان کے انتظار میں کھڑا ہوتا۔ جونہی راجہ صاحب تشریف لاتے وہ بوڑھا نہایت عاجزی سے سلام کرتا اور چپ چاپ چل دیتا۔ کچھ دنوں کے بعد حسب معمول بوڑھا سلام کر کے جانے لگا۔ تو راجہ صاحب نے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور کہا کہ تمہیں کیا چاہیئے۔ بوڑھے نے دست بستہ عرض کی کہ حضور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو ہر روز آپ کا دیدار کرنے اس لئے آتا ہوں کہ۔ راجہ [illegible] نے آنے میں سو سال لگا دیئے۔ یہ کہہ کر بڈھا حسب معمول چلا گیا۔ اور راجہ صاحب اسے حیرت سے دیکھتے رہے۔

باغ لانگے خاں ملتان کا ذکر آیا ہے تو ایک واقعہ اور بھی سن لیجئے۔ [illegible] ۱۹۴۲ء کی انگریز ہندوستان [illegible] کا آغاز ہو چکا تھا۔ باغ لانگے خاں [illegible] جلسہ ہو رہا تھا۔ آغا شورش کاشمیری تقریر [illegible] سامعین کا غضب تھا۔ کہ ملتان کے سیاسی جلسوں میں ایسی نظیر مشکل سے ملتی تھی۔ آغا شورش کشمیری انگریزی حکومت کے خلاف تقریر کیا آگ اگل رہے تھے۔ کہ اتنے میں پولیس کا ایک دستہ سٹیج پر چڑھ گیا۔ اور آغا صاحب کو گھسیٹتے ہوئے پولیس کی گاڑی تک لے گیا۔ اور دو چار پولیس مینوں نے آغا صاحب کو اٹھا کر پولیس وین میں ڈالدیا اور یہ جا وہ جا سامعین آغا شورش کشمیری زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد نہ معلوم کیا کیا نعرے لگا رہے تھے۔ کہ پولیس نے ڈنڈے برسانا شروع کیا۔ اور لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ میں بڑی مشکل سے ملتان چھاؤنی اپنے مکان پر پہنچا۔ تو صبح آٹھ بجے ہی ملتان چھاؤنی تھانے کے انگریز انچارج مسٹر لوئیس نے بلوایا اور۔ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا کہ تم رات کو جلسے میں تھا۔ جواب ہاں میں تھا۔ کیوں مسٹر لوئیس نے پوچھا تو بتایا گیا کہ میں روزنامہ احسان لاہور کو ملتان کی خبریں بھجواتا ہوں۔ اس لئے جلسہ کی کارروائی سننے گیا تھا۔ خبردار اگر کوئی خبر بھجوائی تو ورنہ بند کر دوں گا۔ یہ کہنے کے بعد مسٹر لوئیس نے میرا ایک خط مجھے دکھایا۔ تین دن پہلے اخبار احسان لاہور کے دفتر کو بھجوایا گیا تھا جس میں ملتان کے سیاسی حالات اور انتظامی معاملات پر نہایت محتاط الفاظ میں تبصرہ کیا گیا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس خط میں تو مسٹر لوئیس کی خوش انتظامی کی تعریف کی گئی ہے۔ اس پر مسٹر لوئیس نے کہا کہ بے شک تم نے میری تعریف کی ہے مگر میری قوم کے خلاف لکھا ہے۔ یاد رکھو کہ انگریز قوم پہلے ہے اور مسٹر لوئیس بعد میں۔ کاش کہ ہم ہندوستانیوں نے انگریز سے یہ بھی سیکھا ہوتا کہ ملک اور قوم پہلے اور ہندو مسلمان بعد میں۔

کُل ہند مشاعرہ جشنِ شبیر کانپور

جناب حکیم شبیر علی خاں کانپوری نے اپنے آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اہلِ کانپور اور ملک بھر کے ادیبوں شاعروں اور باذوق دانشوروں کی نظروں میں جو اعلیٰ مقام حاصل کیا اور جو عزت و احترام آپ کا کیا جاتا ہے اس کے پیشِ نظر ۶ نومبر ۱۹۷۸ء کو اہلِ کانپور نے جشنِ شبیر منا کر جس دلی عقیدت سے حکیم صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ یقیناً قابلِ مبارکباد ہے۔ دُنیا خواہ کتنی ہی بے راہ روی پر اتر آئے۔ انسانی اقدار بدل کیوں نہ جائیں۔ خلوص و اخلاق، وضعداری اور رواداری کو بے وقوفوں کی جنت کیوں نہ کہا جائے۔ مگر جب تک روئے زمین پر سورج کی چمک باقی ہے۔ شرافت انسانیت اور سچائی معدوم نہیں ہو سکتی اور انسان خواہ بگڑتے بگڑتے شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ جائے مگر وہ ان اوصاف کی قدر و منزلت سے بیگانہ نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا کانپور میں اگر کسی ناحق نے حق کا لبادہ اوڑھ لیا ہے یا کسی دوست نے حسد کی آگ میں جل جل کر جہنم کا راستہ ہی اپنا لیا ہے تو کیا ہوا مگر کانپور کے ہر شریف اور ابنِ شریف نے جس خضوع و خشوع کے ساتھ جشنِ شبیر منایا ہے وہ اس امر کا مظہر تھا کہ حکیم شبیر علی خاں صاحب شبیر اہلِ کانپور کے دلوں میں بستے ہیں اور حکیم صاحب نے اپنی زندگی کے ہر ہر قدم پر یہ ثابت کیا ہے کہ خلقِ خدا کی بے لوث خدمت، دوستوں کے مشکل وقت میں کام آنا۔ دشمنوں کو ایسے نوازنا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ملک بھر کے شعراء، ادیبوں اور صحافیوں کی آمد پر کانپور میں اُن کی شایانِ شان خدمت کرنا اور ملک، قوم اور عزت کی خاطر جان تک کی پروا نہ کرنا اُن کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے۔

شاعری ۔ جسے اب "کارِ بیکاراں است" کہا جاتا ہے بے شک حق کانپوری اور دیگر اسی قماش کے لوگوں کے باعث قعرِ مذلت میں گرتی جائے مگر یاد رکھئے کہ شاعر وہی ہو سکتا ہے جو سب سے پہلے ایک اچھا انسان ہو۔ بے شک آج کی شاعری شراب۔ مجرا۔ غیبت اور شعر چوری نیز دیگر خباثت کی آئینہ دار بنتی جا رہی ہے۔ مگر ابھی ہمارے ہاں ایسے شعرا کی کمی نہیں ہے جو حقیقتاً شاعر کہلائے جانے کے مستحق ہیں اور جن کی اخلاقی قدروں کے جھلک اُن کی شاعری میں ملتی ہے اور جن پر شاعری ناز کر سکتی ہے۔ ایسے ہی قابلِ قدر اور شرافت و اخلاق کے امین شعراء میں جناب حکیم شبیر علی خاں صاحب شبیر کا نام نامی بھی آتا ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایسے فرشتہ سیرت انسان اور قابلِ عزت شاعر کے جشن کو ناکام کرنے کے لئے یار لوگوں نے کس کس کمینگی کا مظاہرہ کیا اور قابلِ نفریں تو یہ حقیقت ہے کہ کچھ نام نہاد شعراء نے ہی جشنِ شبیر کو تارپیڈو کرنے کی کوشش کی۔ راقم الحروف کو کانپور کے معززین نے بتایا کہ جشنِ شبیر کو حق کانپوری نے جن غیر شاعرانہ طریقوں سے ناکام بنانے کی کوشش کی اُن کی مذمت کی جانی چاہیئے۔ حالانکہ امرِ واقع یہ ہے کہ جن دنوں شانِ ہند میں حق کانپوری پر گوالیار کے نابینا شاعر کے اشعار چوری کرنے کا الزام لگایا گیا تھا تو اس وقت یہی حکیم شبیر علی صاحب ہی تھے جنھوں نے راقم الحروف کو لکھا تھا کہ حق صاحب کے بارے میں مزید نہ لکھا جائے اور کیا ستم ظریفی ہے کہ وہی حق کانپوری اپنے محسن حکیم شبیر صاحب کے جشن کو ناکام کرانے کے لئے آخری حدوں تک گئے مگر خدا کو پھر خدا کون کہتا اگر وہ اپنے نیک بندوں کی عزت و توقیر قائم نہ رکھے اور انہی حاسدوں نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے خود دیکھ لیا کہ جشنِ شبیر ایسا کامیاب رہا کہ شاید ہی کانپور میں ایسی کوئی تقریب (ادبی) ہوئی ہو۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ تخلص حق اور قدم قدم پہ ناحق کا مظاہرہ۔ آخر لغات میں "نام نہاد" زندگی کا فورہ

یونہی تو نہیں لکھ دیا گیا

خیر جب تک دنیا قائم ہے۔ خیر کے ساتھ شر، وفاداری کے ساتھ غداری۔ دوستی کے ساتھ دشمنی۔ شاعر کے ساتھ متشاعر۔ خیرخواہ کے ساتھ بدخواہ اور اسی طرح رقابت حسد۔ جلن اور بغض جیسے اوصاف رکھنے والے لوگ بھی موجود رہیں گے۔ لہٰذا ان پر لعنت بھیجئے اور آئیے دیکھئے

جشنِ شبیر کے کل ہند مشاعرہ کی ایک جھلک

آج ۵ر نومبر ۱۹۷۸ء اتوار ہے۔ "انجمن نگارِ ادب" نالہ روڈ چمن گنج کانپور کے اہتمام سے جشنِ شبیر کے سلسلے میں کل ہند مشاعرہ ہو رہا ہے۔ مشاعرہ کا پنڈال کم از کم ½ کلومیٹر لمبا ہے۔ پنڈال کا صدر گیٹ امپیریل تمباکو کمپنی کے مالک جناب حاجی شفیق الرحمٰن صاحب کی طرف سے بنوایا گیا ہے اور انھوں نے جشنِ شبیر کے مشاعرے کے تقادم دو ہزار پوسٹر چھپوا کر کانپور کے کوچہ و بازار کے علاوہ دیگر قریبی اضلاع میں چسپاں کرائے اور اس طرح حکیم شبیر صاحب کے تئیں اپنے دلی عقیدت کا اظہار فرمایا۔ جناب اشفاق صاحب رحمانی سجادہ سجارتی اور مفتی رمضان علی نے جس اعلیٰ انتظامی کا مظاہرہ فرمایا وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

اس وقت رات کے دس بجکر ۲۵ منٹ ہوئے ہیں۔ سامعین کا جمِ غفیر ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہا۔ لہٰذا یار لوگوں نے قناتیں ہٹا کر اپنے لئے جگہ بنالی ہے۔ سامعین میں ہر قوم نیز مذہب و ملت کے حضرات شریک ہیں۔ جناب کمال جائسی نے مشاعرہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بعد کنوینر مشاعرہ سید رضاء اللہ صاحب نے آج کے مشاعرہ کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ دس بجکر ۵۰ منٹ پر جناب الحاج ابراہیم اشرف صاحب ڈائرکٹر سنٹرل بورڈ بنک آف بڑودہ نے مشاعرہ کا افتتاح ایک ریشمی فیتہ کاٹ کر فرمایا ہے اور فرما رہے ہیں کہ میں دیر سے آنے کے لئے آپ حضرات سے معافی خواہ ہوں اور انجمن نگارِ ادب کا شکریہ ادا کیا کہ انہیں اس خدمت کے لئے یہ عزت بخشی گئی۔ الحاج ابراہیم اشرف صاحب نے فرمایا کہ اس پیاری زبان کو مٹانے کے لئے اس لئے کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک مذہب کا سب کچھ اس میں ہے۔ اس کے مٹنے سے اس مذہب کا سب کچھ مٹ جائے گا۔ مگر یہ غلط ہے۔ اُردو نہ تو پڑوسی ملک کی زبان ہے اور نہ یہ کسی خاص مذہب کی زبان ہے۔ جناب الحاج ابراہیم اشرف کی افتتاحی تقریر ختم ہوئی تو جناب حکیم شبیر صاحب کی غزل جس کا مطلع ہے

ضرورت آج ہے بزمِ عمل سجانے کی
اٹھو اور اٹھ کے بدل دو فضا زمانے کی

جناب شفیق صاحب نے بڑے اچھے ترنم سے سنائی ہے اور غزل پر حکیم صاحب کو خوب خوب داد ملی ہے۔ اس کے بعد جناب عبدالصمد صاحب۔ انصاری الٰہ آباد، جناب مطلوب علی خاں آف باندہ چیئرمین حج کمیٹی اور دیگر حضرات نے حکیم صاحب کی گل پوشی کی ہے۔ جناب انور حسین صاحب نے سپاسنامہ پڑھا ہے اور جناب شاداں بارہ بنکوی نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ جناب حکیم شبیر علی خاں صاحب نے اس عزت افزائی پر جملہ حضرات کا شکریہ نہایت عاجزانہ انداز میں فرمایا ہے۔ چونکہ اس جشن کو کامیاب بنانے میں جناب کمال جائسی نے بہت زیادہ محنت کی ہے۔ لہٰذا کمال صاحب کو پھولوں سے لاد کر انہیں مبارکباد دی جا رہی ہے۔ اس وقت ۱۱ بجکر ۲۵ منٹ ہوئے ہیں۔ مشاعرے کے صدر مجوزہ جناب ڈی۔ این۔ آر۔ صاحب انکم ٹیکس آفیسر الٰہ آباد مسندِ صدارت پر تشریف لائے ہیں۔ ان کا خیر مقدم گل پوشی سے کیا گیا ہے۔ جناب شاہ آفتاب احمد صاحب جنرل سکریٹری روحِ ادب الٰہ آباد نے حکیم شبیر علی خاں صاحب کے مجموعہ کلام "رنگوں کا صحرا" کا اجرا فرمایا ہے اور ہدیہ تہنیت جو مطبوعہ ہے پڑھ کر سنایا ہے اور یہ مطبوعہ ہدیۂ تہنیت سامعین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہدیہ تہنیت خوب ہے اور شاہ آفتاب احمد صاحب نے کسی شعری مجموعہ کی رسم اجرا پر نہایت مناسب رویہ اختیار فرمایا ہے۔

خورشید افسر بسوانی جن کی آواز بیٹھی ہوئی ہے۔

ادا کانپوری کو جس اندازِ تخاطب سے کلام سنانے کو کہا ہے وہ قطعاً
نامناسب ہے۔ لیجئے ادا کانپوری اس مشاعرہ کا شاعرانہ افتتاح
کس قدر اچھے مطلع سے کر رہی ہیں ؎

ہنسے تھے ہم تو فقط اپنا غم مٹانے کو
زمانہ پیار سمجھ بیٹھا مسکرانے کو

داد خوب دی گئی ہے اور ادا صاحبہ ادائے کافرانہ کا مظاہرہ
یوں فرما رہی ہیں ؎

میں اس کو دوستی سمجھوں کہ دشمنی سمجھوں
بڑھا چڑھا کے سنایا مرے فسانے کو
کھنک رہی ہے ہر سمت پاؤں کی زنجیر
مرے چمن کو ہوا لگ گئی زمانے کو
بہت دنوں سے تمنا ہے اے بہارِ چمن
نواز دے کبھی میرے غریب خانے کو

آواز آئی ہے کہ کس وقت آؤں۔ ادا سنی ان سنی کرکے
نغمہ سرا ہے ؎

وہ مجھ کو بھول گئے خیر کوئی بات نہیں
کہاں سے لاؤں میں دل اُن کو بھول جانے کو
کہاں کی دوستی کیسا خلوص کیسی وفا
حیات پائی ہے ہم نے فریب کھانے کو
بھری بہار میں بجلی نے گلستاں والوں
جلا کے خاک کیا میرے آشیانے کو
سنبھل ادا کہ یہی وقتِ آزمائش ہے
اُٹھے ہیں لوگ نرا ظرف آزمانے کو

کانپور کے سامعین نے اس غزل پر داد دل سے نہیں دی یا تو
گھر کی مرغی دال برابر والا معاملہ ہے اور یا پھر ادا صاحبہ
کے شاعرانہ حدود اربعہ سے واقف ہونے کے باعث ایسا ہوا
ہے۔ اب مشاعرہ کی نظامت کمال جائسی صاحب نے سنبھال
لی ہے اور بہت اچھے تعارف سے جناب پرویز کاکوروی
کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ پرویز صاحب کا مطلع
اور مقطع سن لیجئے کیونکہ گھر کے بھاگ ڈیوڑھی سے ہی عیاں
ہو جاتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

اے دوست طبیعت نظم سے ہی بہلتی ہے
مدھم ہی سہی لیکن اک شمع تو جلتی ہے
اب جام و سبو دے کر بہلا نہ اُسے ساقی
پرویز پیئے جا مست آنکھوں سے جو ملتی ہے

پرویز صاحب کے بعد جناب چاند بدایونی تشریف لائے ہیں
اور چار مصرعے مزاح میں سناتے ہیں۔ اگر مزاح یہی ہے
تو پھر رطب و یابس یا پھکڑ بازی کسے کہا جائے گا۔ اب کمال
جائسی نے حفیظ سامانی صاحب سے کلام سنانے کی گزارش
کی ہے۔ حفیظ صاحب کے دو قطعات سنئے ؎

جو زخم دل ہے صورتِ گل مسکرائے ہے
جینے کا زندگی کو قرینہ سکھائے ہے
انسان رنگ و بو [illegible] ہے مایوس اس قدر
کاغذ کے پھول کمرے میں اپنے سجائے ہے

اچھی داد ملی ہے۔ دوسرا قطع سنئے

پھول سمجھا تھا جنہیں ہائے وہ پتھر نکلے
غم تو اس کا ہے کہ احباب ستم گر نکلے
دورِ جمہور ہو یا دورِ شہنشاہی ہو
حق کی میزان میں تولا تو برابر نکلے

قطعات کے بعد غزل شروع کی ؎

بے ارادہ جو کبھی آپ سے ہم ملتے ہیں
اک تبسم کے سوا سینکڑوں غم ملتے ہیں
یہ الگ بات کہ دل میں کئی غم پلتے ہیں
مسکراتے ہوئے ہر ایک سے ہم ملتے ہیں
یاد آ جاتی ہیں کچھ ہم کو پرانی باتیں
تم جو ملتے ہو تو بچھڑے ہوئے غم ملتے ہیں

داد ہے کہ ان اشعار کا حق ہے۔ مقطع بھی سن لیجئے ؎

ایک تہذیب کی تاریخ سناتے ہیں حفیظ
ہم کو جب بھی کہیں پتھر کے صنم ملتے ہیں

حفیظ صاحب کے بعد جناب شاعر فتحپوری مائک پر تشریف
لائے ہیں اور ناقابلِ تعریف شاعرانہ ترنم سے غزل سرا
ہیں:—

عشق کو حُسن کے جلوؤں سے سجا ہی لوں گا
ایک دن ذرّے کو خورشید بنا ہی لوں گا
حکم ساقی ہے تو انکار نہیں کر سکتا
ہاتھ کانپے گا مگر جام اٹھا ہی لوں گا

داد ہے کہ سامعین کے اہلِ ذوق ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔ شاعر صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

منزلِ یار بہت دُور بہت دُور سہی
ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو بڑھا ہی لوں گا
میری قسمت میں سویرا جو نہیں ہے نہ سہی
شمعِ اُمید اندھیرے میں جلا ہی لوں گا
عشق کی راہ میں کانٹے ہیں تو ہوں اے شاعر
کسی صورت سے میں دامن کو بچا ہی لوں گا

حضرت شاعر داد سے نہاتے ہوئے اپنی جگہ تشریف لے گئے تو جناب عارف عظمی مائیک پر آکر یوں حالِ دل سنا رہے ہیں ؎

میری تقدیر میں شاید تری ٹھوکر بھی نہیں
اب یہ ہستی تری راہ کا پتھر بھی نہیں
توڑ سکتا تھا دعنش بھی تری خاطر لیکن
آج کے دَور میں تو رسمِ سوئمبر بھی نہیں
زہر کا جام جو پی جائے زمانے کے لئے
آج کے دَور میں ایسا کوئی شنکر بھی نہیں

عارف صاحب کو داد مناسب دی گئی ہے۔ اہلِ کانپور کی یہ ادا پسند آئی کہ یہاں مقامی شعرا کو بھی نہایت عزت و احترام سے سُنا جاتا ہے اور اچھے اشعار پر خوب داد دی جاتی ہے۔ اعلان ہوا ہے کہ حق کانپوری کلام سنا رہے ہیں خیال تھا کہ اپنے شہر میں بھی حق صاحب وہی غزل سنائیں گے جس میں گوالیار کے نابینا شاعر کے کچھ اشعار مالِ غنیمت کے طور پر شامل کر لئے گئے ہیں مگر حق صاحب نے کوئی دوسری غزل شروع کی ہے ؎

کس قدر توہینِ آدابِ فغاں کرتے رہے
ہم دلوں کی بات نظروں سے بیاں کرتے رہے
یہ عنایت بھی ہمارے مہرباں کرتے رہے
کچھ نہیں تو دوستوں کو بدگماں کرتے رہے

حق صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے مہرباں حکیم شبیر علی خاں صاحب نے تو مجھے لکھا تھا کہ حق صاحب کی شعر چوری کا تذکرہ شانِ ہند میں بند کر دیا جائے۔ اور آپ فرما رہے ہیں کہ آپ کے مہرباں دوستوں کو بدگماں کرتے رہے۔ سنئے حق صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

اُس کے پائے ناز تک پہنچے تو یہ عقدہ کھلا
ہم نہ جانے عمر بھر سجدے کہاں کرتے رہے

داد ہے کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ میں نے بھی اس شعر پر حق صاحب کو جی بھر کر داد دی ہے اور ان سے یہ شعر دوبارہ پڑھوایا ہے۔ یہ شعر ان کا اپنا ہے تو مرحبا اگر کسی کا ہے تو شعر کہنے والے کو ہزار آفریں۔ ویسے حرام کی اولاد ہوتی خوبصورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حق صاحب کا ترنم خوب ہے۔ ایسے منتظمین مشاعرہ جو محض ترنم کے بل بوتے پر اپنے مشاعرے کی کامیابی کے متمنی ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے مشاعرے میں حق صاحب کو ضرور مدعو کرنا چاہیے۔ اب کوئی صاحب انتخاب سید مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کچھ مختلف اشعار سنائے ہیں ایک شعر آپ بھی سنئے ؎

کسے خبر تھی وہ اتنی بڑی سزا دے گا
ندی میں ڈوب کے گہرائی کا پتہ دے گا

اب غزل شروع کی ہے فرماتے ہیں

ذرا سی دیر میں طوفان آنے والا ہے
مجھے سمجھ مرے چہرے کو دیکھتا کیا ہے
نہ جانے کون کہاں کس طرف سے آجائے
مرے قریب ہی رہنا بہت اندھیرا ہے
یہ کائنات کا باقی ہے غور سے دیکھو
ہتھیلیوں پہ مقدّر تلاش کرتا ہے
ترس نہ جائے کہیں یہ بھی آسماں کی طرح
زمیں کو پیروں کے نیچے دبائے رکھتا ہے
مرے بدن میں خدا جانے کون سی شے ہے
لہو کا رنگ تو سنتے ہیں سُرخ ہوتا ہے

یہ صاحب اچھی داد وصول کر گئے۔ اب جام صاحب مائیک پر آتے ہیں اور غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جو خوشی ہے اُن کی ہے جو الم ہے میرا ہے
اک طرف اُجالا ہے اک طرف اندھیرا ہے
رندِ میکدے میں بس منتظر ہیں ساقی کے
جام بھی لبالب ہیں ابر بھی گھنیرا ہے
کس طرح پہنچتے ہیں دیکھئے یہ منزل تک
رہبروں کو رستے میں رہزنوں کے گھیرا ہے

جیسی غزل ویسی داد یعنی عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ اب جناب معراج کانپوری کو بلایا گیا ہے۔ انہوں نے اس تیز رفتاری سے کلام سنایا ہے کہ آپ کے لئے صرف ایک شعر ہی حاضر کر سکا ہوں ؎

اُس کی تصویر میں بھرنے کے لئے رنگِ وفا
غنچۂ زخمِ تمنّا کو نچوڑا جائے

"غنچۂ زخمِ تمنا" بظاہر بھاری بھرکم الفاظ کا مجموعہ ہے مگر ہے مہمل۔ اب اعلان ہوا ہے کہ ذکیہ خانم الہ آبادی سے کلام سنئے۔ خانم صاحبہ اس سردی میں بھی بغیر بازو کا قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عورتوں خصوصاً جوان لڑکیوں کو سردی نہیں لگتی مگر بغیر بازووں کے قمیص پہننے کے لئے کچھ خاص جسم ہوتے ہیں۔ ہر لڑکی سلیب لیس قمیص پہن کر نیتو سنگھ یا ہیما مالنی نظر نہیں آسکتی۔ خیر اِن کا کلام سنیئے ؎

اک لمحہ کو بھی زندہ دلی دے نہ سکے گی
یہ زیست تمہیں کوئی خوشی دے نہ سکے گی
میں شوق کی وادی کا پر وزہ مسافر ہوں
اب کوئی بھی شے تشنہ لبی دے نہ سکے گی

ایسی شاعرات کو غزلیں کہہ کر دینے والے شعرا بھی نرے گاودی ہیں۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ شعر زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ اٹھے گا کہ میں کسی مرد کا کہا ہوا ہوں بہر کیف ایک اچھی آواز والی لڑکی کو داد نہیں ملے گی۔ آیئے جناب نجم سیتاپوری کے بھی چند شعر سن لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

قدم بڑھے تو کہیں رہگزر میں کچھ بھی نہ تھا
سوائے گردِ تعلق سفر میں کچھ بھی نہ تھا
مرا وجود ہی بکھرا پڑا تھا چاروں طرف
فلک میں کچھ بھی نہ تھا بحر و بر میں کچھ بھی نہ تھا
صدائے شیشہ تھی جو نقش جاوداں ٹھہری
وگرنہ دامنِ سنگ و شرر میں کچھ بھی نہ تھا
ہمیں تھے عکس تماشا ہر اک [illegible]
اُٹھے تو آئینۂ دشت و در میں کچھ بھی نہ تھا

جنابِ نجم کو بہت اچھی داد ملی ہے۔ آپ حضرتِ قتیل باندوی بڑے اچھے تعارف کے ساتھ مائیک پر تشریف لائے اور قطعہ ارشاد فرمایا ؎

تم صرف مفکر ہو اور بات بناتے ہو
ہم گیت بناتے ہیں ہم نغمہ سناتے ہیں
تم اہلِ سیاست ہو ہم اہلِ محبت ہیں
تم آگ لگاتے ہو، ہم آگ بجھاتے ہیں

اب غزل شروع فرما رہے ہیں ؎

مگر تم نے محبت کا گریباں چاک کر ڈالا
جلا کر دامنِ دل، دوستی کو خاک کر ڈالا
نہتوں پر تو سینہ تان کر تم وار کرتے ہو
بہادر مردِ میداں ہو کے اک عورت سے ڈرتے ہو
سیاست کی ذرا سی ایک کروٹ سے ہو گھبرائے
تمہیں ڈر ہے کہ پھر بن باس سے سیتا نہ آجائے

محترمہ اندرا گاندھی کی حمایت میں قتیل صاحب کچھ حقائق کو نظر انداز کر گئے ہیں یا ہو سکتا ہے ترکمان گیٹ دہلی مظفر نگر کے کھالا پار محلہ اور دوسرے مقامات پر اندرا جی کی حکومت میں مسلمانوں پر جو گذری شاید وہ مظلوم مسلمان مسلمان نہیں تھے۔ کیا ستم ظریفی ہے مظفر نگر کے محلہ کھالا پار میں جو قتلِ عام ہوا تھا اسی محلہ کھالا پار کے مسلمانوں نے اندرا گاندھی کا جلوس نکالا۔ بیچارے قتیل باندوی کا کیا قصور ہے۔ اعلان ہوا ہے کہ قبلہ نمر سلیمانی کانپوری کلام عنایت فرما رہے ہیں۔ نمر صاحب نے نظم "کشمکش" سنائی آپ بھی پوری نظم سنیں۔

وفورِ غم سے رو آنسو بہائیں تو بغاوت ہے
ستمگارِ جہاں کو بھول جائیں تو بغاوت ہے
وفاداری کا افسانہ سنائیں تو بغاوت ہے
اگر لفظِ محبت لب پہ لائیں تو بغاوت ہے
کسی کافر ادا سے دل لگائیں تو بغاوت ہے
حرم کی سرزمیں پر سر جھکائیں تو بغاوت ہے
زمانہ شادماں ہو، قہقہے گونجیں فضاؤں میں
اگر ہم اتفاقاً مسکرائیں تو بغاوت ہے
فسانے غیر کے ہو جائیں وجہِ گرمیٔ محفل
ہم اپنی داستانِ غم سنائیں تو بغاوت ہے
جلا دیں آشیانے وہ تو ہے عینِ کرم ان کا
خود اپنے ہی چمن کو ہم سجائیں تو بغاوت ہے
کمالِ ہوش پہ دیتے ہیں الزامِ ریاکاری
مئے احساس پی کے لڑکھڑائیں تو بغاوت ہے
چمن کا تذکرہ چھیڑیں تو غمّازِ چمن ٹھہریں
قفس کو آشیاں کہہ کر سجائیں تو بغاوت ہے
کریں ہم ان کی جرأت تو حلقے دام کے لاکھوں
سمیٹیں اپنے بازو بیٹھ جائیں تو بغاوت ہے
سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ چھیڑیں داستاں کیسے
ہنسائیں تو بغاوت ہے رلائیں تو بغاوت ہے
حریفانِ عمل کے تلخ نعرے مژدۂ راحت
قمر اپنی غزل بھی گنگنائیں تو بغاوت ہے

نظم پر ایسی بے مثال داد ملی ہے کہ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے اہلِ کانپور مقامی شاعروں کو بھی اسی طرح داد سے نواز رہے ہیں جیسے کہ بیرونی شعراء کو داد دی جا رہی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقامی شعراء کی اکثریت بیرونی شعراء پر بہر نوع بھاری ہے۔

جناب قمر داد سے جھولیاں بھرے واپس لوٹے تو اعلان ہوا ہے کہ نسیم نکہت صاحبہ لکھنؤ کی کلام سنا رہی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

کلیوں کا تبسم ہے لبِ گل کی ہنسی ہے
سب کچھ ہے گلستاں میں مگر تیری کمی ہے

زلفیں بکھرے ہوئے مدت ہوئی لیکن
ماحول میں خوشبو ترے بالوں کی بسی ہے

ایمانداری سے کہیے کہ کیا کوئی عورت یہ شعر کہہ سکتی ہے معلوم ہوتا ہے نسیم نکہت صاحبہ ہم جنسی کی دلدادہ ایسا تبھی تو ان کے محبوب کی زلفیں بکھری ہیں۔ یہ شعر کوئی مرد تو کہہ سکتا ہے مگر عورت نہیں۔ خیر کچھ اشعار انکے اور بھی سن لیجیے جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اسے کسی شاعر نے کہا شاعرہ نے نہیں

رفتار میں لغزش ہے تو بے ربط ہیں باتیں
انداز بتاتے ہیں کہ واعظ نے بھی پی ہے
کونین کی ہر شئے پہ ہے چھائی ہوئی سرخی
مہندی ترے ہاتھوں میں قیامت کی لگی ہے
کیوں آپ کی پلکوں پہ ہیں ٹھہرے ہوئے آنسو
کیا آپ کے دل پر بھی کوئی چوٹ لگی ہے

اس شعر پر خوب داد دی گئی ہے۔ اب شمیم الہ آبادی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

نہ باغوں میں ہے اور نہ صحراؤں میں ہے
نگاہوں کی جنت ترے گاؤں میں ہے
نہ مل پائی مغرب کی شہزادیوں کو
وہ شوخی جو مشرق کی لیلاؤں میں ہے
گھنیرے درختوں کو حاصل نہیں ہے
جو نرمی تری زلف کی چھاؤں میں ہے
اُن آنکھوں کو جام اور ساغر نہ کہیے
شمار اُن کا خاموش دریاؤں میں ہے
یقیناً کوئی خار پیاسا ہے اب تک
ابھی ایک چھالا مرے پاؤں میں ہے

شمیم صاحب کو ہر شعر پہ جی بھر کر داد ملی ہے۔
اب تشریف لائے ہیں جناب چندر پرکاش [illegible] ہر بجنوری انہوں نے ایک بہت پرانی غزل جو کہ میں نے ان کے جوانی کے زمانے میں سنی تھی شروع کی ہے۔ آپ بھی کچھ اشعار ملاحظہ فرما لیجیے ؎

فضائے لالہ و گل میں بہاروں کا بھروسہ کیا ہے
نظر میں حسن پیدا کر نظاروں کا بھروسہ کیا ہے

نہ جانے کب مجھی کو موردِ الزام ٹھیرا دیں
تری معصوم نظروں کے اشاروں کا بھروسہ کیا ہے
نہ جانے جلتے جلتے کب چراغِ اشک بجھ جائیں
شبِ فرقت میں یارو ان ستاروں کا بھروسہ کیا ہے

جوہر صاحب بھی گئے اور اب جناب یزدانی صدیقی کانپوری مائیک پر آئے ہیں اور ایک قطعہ سنانے کے بعد یہاں تک گیت سنایا ہے اور خوب داد پائی ہے۔ یزدانی صاحب نے گیت کا ایک بند شمع زیدی کی نذر کیا ہے۔ میں نے شمع زیدی سے کہا کہ یہ صاحب شاید آپ کو جانتے نہیں ورنہ یہ حماقت نہ کرتے۔ اناؤنسر نے یزدانی صاحب کے بعد شمع زیدی کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے شمع زیدی نے مائیک پر آتے ہی یزدانی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی نذر ہے ؎

مجھے سمجھنے کی کوشش نہ کیجیے ورنہ
سمجھ کے آپ مجھے خود کو بھول جائیں گے

ایک ہنگامہ ہے کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ یہ شور کچھ تھما تو شمع زیدی نے تحت اللفظ ایک نظم سنانے کے بعد غزل کے کچھ اشعار سنائے ہیں ؎

جانے غم کے ماروں کی کس طرح سحر ہوگی
شام کی کہانی ہے آنسوؤں سے تر ہوگی
عمر بیت جائے گی دل کی بات کہنے میں
پھر بھی کہہ نہ پائیں گے عمر مختصر ہوگی
کس کی آرزو لے کر کون جاں سے گزرے ہے
بے خبر زمانے میں کس کو یہ خبر ہوگی
سانس ٹوٹ جانے پر ختم یہ سفر ہوگا
اب جہاں بھی دم نکلا تری رہ گزر ہوگی

شمع صاحبہ اچھی داد پاکر اپنی جگہ تشریف لے گئی ہیں اور رکمال صاحب نے کانپور کے ایک بہت ہی سلجھے اور استاد شاعر جناب حق بنارسی سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ میں ان کا کلام نقل نہ کر سکا۔ حق صاحب کو کلام پر خوب داد ملی ہے۔ اب قبلہ علامہ کوثر جائسی کی خدمت میں مودبانہ گزارش کی گئی ہے کہ کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں لیجیے قبلہ کوثر جائسی عطا فرما رہے ہیں۔

سن لو غمِ دل یہ وقت آئے کہ نہ آئے
پھر ایسی گھٹا درد کی چھائے کہ نہ چھائے
ہم آئینے اشکوں کے رکھ آئے چمن میں
اس سمت نظر حسن کی جائے کہ نہ جائے
طے کر دیں ہر اک مرحلہ ہم دار و رسن کا
یہ سیلِ جنوں پھر کبھی آئے کہ نہ آئے
اڑنے ہوئے ذروں کی زباں میں نے سمجھ لی
خط اس کا بہار اب کوئی لائے کہ نہ لائے
بے فیض نہیں ہے کبھی دریائے محبت
اب ڈوب کے موتی کوئی پائے کہ نہ پائے

خوب خوب داد پانے کے بعد قبلہ کوثر مائیک سے ہٹنے لگے تو سامعین نے ایک اور ایک اور کا مطالبہ کیا ہے۔ لیجیے کوثر صاحب سے دوسری غزل سنیے:

میں چپ ہوں مگر حسن سے نفرت تو نہیں ہے
اظہارِ محبت ہی محبت تو نہیں ہے
دل ٹوٹنے کا اس سے صلہ مانگنے والے
یہ عشق کا سودا ہے تجارت تو نہیں ہے
بے ذوقِ عمل ہیچ ہیں شمشیر و قلم بھی
سب کچھ تجھے حاصل سہی ہمت تو نہیں ہے
لکھی ہے جو قسمت کی طرح لوحِ غزل پر
اتنی ہی غمِ دل کی حقیقت نہیں ہے
بدنام ہوئے جاتے ہیں کوثر مرے اشعار
در پردہ ان آنکھوں کی شرارت تو نہیں ہے

قبلہ کوثر داد سے نہائے اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور اب مائیک پر سردار گوربخش سنگھ بہار تشریف لائے ہیں فرما رہے ہیں ؎

چل دیا وقت بھی اب مجھ کو مٹا کر کیسا
ہنس رہا ہے مرے رونے پہ مقدر کیسا
مانگتا بھی ہے تو غنچے سے تو بس زخم کی بھیک
دل مرا اس کی جفاؤں کا ہے خوگر کیسا

موج تو خود ہی بتادے گی پتہ ساحل کا
ڈوب کر پھر جو اُبھرے وہ شناور کیا
ڈھونڈتا ہے مجھے اب اپنے شناساؤں میں
مضطرب ہے مری خاطر ترا خنجر کیا

سردار صاحب کو غزل پر داد بہت اچھی ملی ہے۔ اب کوئی اقبال دانش الہ آبادی مائیک پر آئے ہیں اور وسیم بریلوی کے ترنم کی نقل فرماتے ہوئے ایک گیت سُنا رہے ہیں۔

ع منوا تڑپت ہے دن رات

ترنم کی داد بھی نہ مل سکی۔ آخر نقل نقل ہے۔ اب جناب خورشید اختر سیوانی سے کچھ قطعات سنئے

میں نہ مل پاؤں گا تم کو میرا پیچھا نہ کرو
میں تو پرچھائیں ہوں گرتی ہوئی دیواروں کی
اکثر اس وقت مجھے فن کے خریدار ملے
قیمتیں گر گئیں جب شہر کے بازاروں کی

اُسی طرح سے ابھی تک ستائے جاتا ہے
وہ بے وفا ہی سہی پھر بھی یاد آتا ہے
ہمارے عہد سے واقف نہیں ہے وہ شاید
جو ہم کو واقعۂ کربلا سناتا ہے

اب ان کے دو شعر اور بھی سن لیجئے

کیسے یہ سمجھوں دنیا بے تعلق ہو گئی
میں تو جب گزرا اُدھر سے کوئی پتھر آ گیا
ہر عدالت مسکرا دی میرا دامن دیکھ کر
ہر جگہ میں اپنا قاتل آپ ٹھہرایا گیا

خورشید اختر صاحب کو بھی مناسب داد ملی ہے۔
اب تشریف لائے ہیں جناب حکیم جوہر وارثی۔ ارشاد ہوا ہے

جو نورِ زندگی ہے مری زندگی کے ساتھ
ایمان ہے کہ حشر بھی ہوگا اسی کے ساتھ
دار و رسن پہ قید ملاقات ہے اگر
یہ شرط بھی قبول تری بندگی کے ساتھ
تم سامنے نہ آؤ تو یہ اور بات ہے
پردہ کہیں روا نہیں جلوہ گری کے ساتھ

حکیم صاحب اپنی حکمت سے اچھی داد لے گئے ہیں اور کنوینر صاحب نے جناب شاداں بارہ بنکوی سے کلام سُنانے درخواست کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سب دُکھی ہیں دُنیا میں پھر بھی جو ہنستے ہونگے
آہ روک لی ہوگی اشک پی گئے ہوں گے
آج اک محل دیکھا تو یہ دیر تک سوچا
ایک گھر بنانے میں کتنے گھر مٹے ہوں گے
آج میکدے ہی میں رات کاٹ دوں لیکن
اب تو وہ بھی دروازے بند ہو چکے ہوں گے

شاداں صاحب کو داد بہتر انداز میں دی گئی ہے۔ اب کوئی اعجاز شمسی آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ اپنے دوستوں کی فرمائش پر آنکھوں کی تعریف میں شعر سنئے ؎

ہیں بے مثال وہ آنکھیں مشابہت کیسی
کنول سے جھیل سے ساغر سے چشمِ آہو سے

ہو سکتا ہے کہ اعجاز شمسی کے لئے یہ شعر دیوان غالب پر بھی! ہو مگر اس میں نیا پن تو کچھ بھی نہیں۔ اب ان سے دو شعر سُنئے ؎

ع ہمارا ہو کے ہے باہر ہمارے قابو سے

اس مصرع کو یہ صاحب بار بار دُہرا رہے ہیں اور بار بار داد پر داد دیئے جا رہے ہیں۔ اعجاز شمسی کو یہ پتہ ہی نہ کہ ان کا یہ مصرع تضحیک کا موجب بن کر ان کی حماقت سامعین کے لئے تفریح کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ جب چار پانچ بار مصرع دہرا چکے تو ایک آواز آئی ہے کہ اپنے باپ کو بلا لو۔ یہ مصرع سننے کے بعد ان کا کلام نقل کرنا ہی حماقت تھی۔
اب جناب اسرار الہ آبادی فرما رہے ہیں ؎

میں فرشتہ تو نہیں کہ قدم نہ ڈگمگائیں
مری زندگی مالک مری آبرو بچانا
ابھی آنکھ نم نہیں ہے ابھی غم اس کم نہیں ہے
تجھے گردشِ زمانہ ابھی اور آزمانا
یہ چمن کو لوٹنے کا طریقہ صرف بدلا
وہ ادا تھی ساحرانہ یہ ادا ہے تاجرانہ

اسرار صاحب کو بہت اچھی داد دی گئی ہے۔ اب جناب کمال جائسی صاحب نے غزل سنا کر خوب داد لوٹی ہے ان کی غزل میں نوٹ نہ کر سکا۔ ان کے بعد ڈاکٹر متین نیازی کا یہ شعر سنئے ؎

قبول کی جو ترے غم کی رہبری میں نے
خدا کا شکر سکوں کی جو سانس لی میں نے

قیصر پرتاب گڑھی نے چار مصرعے سنانے کے بعد غزل شروع کی ہے

زندگی کے مری جس وقت کہ لالے ہوں گے
چند چہرے ہی مرے گھر کے اُجالے ہوں گے
ہوش جب تیری محبت نے سنبھالے ہوں گے
پاؤں کے خار بھی پلکوں سے نکالے ہوں گے

قیصر صاحب مناسب پا کر اپنی جگہ پر آئے تو صبح کے چار بجے نسیم شاہجہانپوری مائک پر تشریف لائے ہیں۔ نسیم صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں اور صاحب دیوان ہیں۔ مطلع تو ان کا نوٹ نہ ہو سکا غزل کے کچھ اشعار سنئے

لوٹے گئے دانستہ ہمارے ہی نشیمن
گلشن کے نگہبان ہمیں یاد رہیں گے
یارب تری دنیا میں زر و سیم کے بدلے
بکتے ہوئے ایمان ہمیں یاد رہیں گے
ساحل پہ جب آئے ہیں تو ڈوبا ہے سفینہ
یہ وقت کے طوفان ہمیں یاد رہیں گے

نسیم صاحب داد سے جھولیاں بھرے اپنی جگہ گئے تو کوئی صاحب انوار حسین کانپوری نے نہ معلوم کیا سنانا شروع کیا جس سے بور ہو کر ایک نوجوان نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر بٹھا دیا ہے اور اب تشریف لائے ہیں وقار قریشی گوالیاری اور بڑے وقار کے ساتھ ارشاد ہوا ہے

آدمی کل پتھروں کی زد میں آ کر بچ گیا
آئینہ ٹوٹا مگر تقدیر سے ہی بچ گیا
ہاں اُسے پہچانتے تھے لوگ اس میں شک نہیں
وہ بڑا چالاک ہے چہرہ بدل کر بچ گیا
نرم پلکوں پہ گذرے آنسوؤں کی آنچ تک
جل گئی تصویر لیکن ایک منظر بچ گیا

وقار پھر وقار داد کے ساتھ مائک سے الگ ہوئے تو اعلان ہوا ہے کہ جناب پروفیسر وسیم بریلوی مائک پر تشریف لا رہے ہیں۔ طویل تالیوں سے وسیم صاحب کا خیر مقدم کیا گیا ہے صبح کے ساڑھے چار بج رہے ہیں اور وسیم صاحب فرما رہے ہیں ؎

آج اُن راہوں میں لئے تیرا غم جائے ہے
غم گساری کو جہاں قافلہ تھم جائے ہے
جبر سہہ جاؤں تو جینے کی ادا مجرم ہو
مسکراؤں تو ترے غم کا بھرم جائے ہے
کون جانے کسی راہی کی یہ کیسی منزل ہو
پاؤں اٹھتا ہے تو اک نقشِ قدم جائے ہے
لاکھ خوشیوں کی ضمانت دئے جائے امید
پھر بھی دل سے کہیں اندیشۂ غم جائے ہے
آج حالات اک ایسی جگہ لے آئے وسیم
اپنے بارے میں جہاں سوچا بھی کم جائے ہے

تین غزلیں، ایک گیت اور مختلف اشعار سننے کے باوجود بھی سامعین وسیم صاحب کے کلام سے سیر نہیں ہوئے مگر وہ فرمائشوں کے ہجوم میں پیچھا چھڑا کر مائک سے داد تحسین کے نعروں میں اپنی جگہ آ گئے ہیں اور اب اشفاق علی خاں ارشاد فرما رہے ہیں

جو سجدہ گزیں سجدہ گزیں سجدہ گزیں ہے
وہ میری جبیں میری جبیں میری جبیں ہے
بس تجھ پہ یقیں تجھ پہ یقیں تجھ پہ یقیں ہے
تو میرا امیں، میرا امیں، میرا امیں ہے
تو کتنا قریں کتنا قریں کتنا قریں ہے
تو دل میں مکیں، دل میں مکیں دل میں مکیں ہے
تجھ سا بھی کہیں اور کہیں اور کہیں ہے
اُف کتنا حسیں، کتنا حسیں، کتنا حسیں ہے

اس غزل پر داد کا کیا عالم رہا الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردوپیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں، اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گردوپیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپکے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ صرف آپ کی خدمت کے لیے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے اِدھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام نہیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

جشنِ جمہور

غازی سکروڈوی

(۱) یومِ جمہور کی جو کچھ ہے ، حقیقت مت پوچھ!
جشنِ جمہور ہے ، بعنوانِ سیاست ، مت پوچھ
جس کے پہلو میں سسکتی ہیں ہزاروں لاشیں
کیوں ہے ، اس شادیِ گیتی ، سے محبت مت پوچھ

(۲) دوستو ، ملک کی عظمت کے ترانے گاؤ
جشنِ جمہور ہے ۔ کچھ اپنا لہو گرماؤ
دورِ حاضر کے خداؤں سے بغاوت کر کے
یہ بھی ممکن ہے ، وفادارِ وطن کہلاؤ

(۳) ایک ہنگامہ ہے سلطانیِ جمہور کی بات
ایک افسانہ ہے ، آئین کی دستور کی بات
آتشِ گل ، خس و خاشاک تک آپہنچی ہے
تم سمجھتے ہو اسے اب بھی بہت دور کی بات

(۴) جلوۂ طور ، یہی ہے تو الٰہی توبہ
صبح کا نور ہے تو الٰہی توبہ
تم نے ساغر میں انڈھیلا ہے غریبوں کا لہو
جشنِ جمہور یہی ہے ، تو الٰہی توبہ

(۵) جشنِ جمہور تو ، اک نعرۂ بیداری ہے
جشنِ جمہور تو اک جذبۂ خودداری ہے
جشنِ جمہور نہیں ، طرفہ تماشا ، یارو
جشنِ جمہور ، تو اخلاص و وفاداری ہے

(۶) تم سے ممکن ہی نہیں ۔ درد کا درماں ہوتا
تم نے سیکھا ہے ، فقط ، دست و گریباں ہونا
فکرِ جمہور کا ، انداز بدلنے والو !
آنہ جائے کہیں ، ذرّوں کو بیاباں ہونا

(۷) یہ زمیں خون سے گلرنگ بھی ہو سکتی ہے
ایک شیشہ ہے ۔ تو گر سنگ بھی ہو سکتی ہے
جشنِ جمہور کے منظر بھی بدل سکتے ہیں
آمریت ، سے نئی جنگ بھی ہو سکتی ہے

(۸) درد کی جوت جگاؤ تو کوئی بات بنے
پیار کے دیپ جلاؤ تو کوئی بات بنے
صرف الفاظ کے جادو سے خوشی ناممکن !
جشن مل جل کے مناؤ تو کوئی بات بنے

غزل

غازی سکروڈوی

جلوت ، میں جو غیروں کے ہر عیب کو کھولو ہو
خلوت ، میں ، کبھی اپنے دل کو بھی ٹٹولو ہو

یہ بات الگ ٹھہری ، خاموش ہیں ہم ، لیکن
سمجھا ہے ، کبھی تم نے ، کیا سوچ کے ، بولو ہو

ہمت کے منافی ہے ۔ یہ مصلحت اندیشی
کیوں ، وقت کی نبضوں کو رہ رہ کے ٹٹولو ہو

ہنگامۂ دنیا ہے ، محشر تو نہیں ، یارو ،
کیوں میری خطاؤں کو میزان میں تولو ہو

سو رنگ بکھرتے ہیں جنبش سے نگاہوں کی
سو پھول مہکتے ہیں ، ہونٹوں کو جو کھولو ہو

گفتار کی شیرینی ، الفاظ کا جادو ہے
یہ تلخ حقیقت ہے ، کہ زہر بھی گھولو ہو

ہم ، جان گنواتے ہیں ، اس لفظ کی عظمت پہ
تم ، لفظ محبت کو کیا سوچ کے بولو ہو

جب ، کوئی غزل اپنی ، میں ، تم کو سناتا ہوں
کچھ سوچ کے ، پلکوں پر موتی سے پرولو ہو

دل پھر بھی پرایا ہے ، تم اپنا ہے اسے غازی
اپنوں کی حقیقت کیوں ، اغیار یہ کھولو ہو

جناب ساقی سکروڈوی مرحوم کا مجموعۂ کلام اور اُن کے مکتوبات کا مجموعہ بہت جلد منصۂ شہود پر آ رہا ہے ۔
دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں ۔

آج کے دن

[illegible] عاصی بی۔ اے کیرانوی

اڑ گیا چھائی تھی تقدیرِ وطن آج کے دن
رشکِ جنت تھا بنا میرا چمن آج کے دن

جس کی صدیوں ہی رہی ایک زمانہ پہ گرفت
ہم نے توڑی تھی۔ وہ زنجیرِ کہن آج کے دن

ملک کو اپنے شہیدوں نے بھرا تھا خوں سے
جبکہ آزادی ہو آئی تھی دلہن آج کے دن

ملک میں ڈوبی رہی جبکے اندھیروں میں حیات
اس شبِ تار نے اوڑھا تھا کفن آج کے دن

ایک سویرے نے دنیا کو اجالے بخشے
پھوٹ نکلے کہ جو پھوٹی تھی کرن آج کے دن

وہ ہے دنیا میں محبت کا نرالا سنگم
پیار کے جس میں ملے گنگ و جمن آج کے دن

ڈگمگائیں نہ قدم راہِ وفا میں اے دوست!
ہم نے سیکھا تھا محبت کا چلن آج کے دن

کتنے دل کتنے جگر اس پہ ہوئے تھے قرباں
خواب کی دلبری پہ آئی تھی پھبن آج کے دن

اس طرح بانٹیے دنیا کو سکوں کی دولت!
[illegible] آج کے دن

حسنِ عالم کو مسرت کے اجالے دے کر
دور ہر دل سے کر درد و رنج و محن آج کے دن

جس نے ساحل پہ لگایا ہے سفینہ اپنا
زندہ کرتی ہے وہی دل کی لگن آج کے دن

غم کے ماروں کو بھی مل جائیں خوشی کے لمحے
اس طرح عام کر دو جشنِ وطن آج کے دن

پھر بہاروں پہ ملے ان میں نیا آئے نکھار
[illegible] کی قسم [illegible] آج کے دن

جن سے قوموں کی سنورتی ہے ہمیشہ تاریخ
آؤ وہ یاد کریں دار و رسن آج کے دن

جن سے دنیا کو نئی صبح ملی ہے عاصی!
پھر دکھائیں وہ ستاروں کا چمن آج کے دن

غزل

نور کوثر اکبرآبادی

کب اور ملی کس سے نظر یاد نہیں ہے۔
کب زخمی ہوئے قلب و جگر یاد نہیں ہے

الجھا رہا خوابوں میں ترے ایسا میں شب بھر
کب دن ہوا کب پھوٹی سحر یاد نہیں ہے

پائی ہے نہ پائیگا کبھی منزلِ مقصود
الفت کی جسے راہ گزر یاد نہیں ہے

اک نقشِ کفِ پا مجھے رستے میں ملا تھا!
کیوں اس پہ جھکا تھا مرا سر یاد نہیں ہے

اپنائی ہے کیوں راہ عداوت کی بتاؤ
کیا مسلکِ محبت کی ڈگر یاد نہیں ہے

آئی ہیں تو آئیں رہِ الفت میں بلائیں!
عاشق کو یہی راہِ سفر یاد نہیں ہے

انعام محبت کی قسم تیرِ نظر سے
دل زخمی ہوا تھا کہ جگر یاد نہیں ہے

مجھ سا بھی بھلا ہوگا کوئی راہ میں بھٹکا
بھولا ہوں کہاں رختِ سفر یاد نہیں ہے

وہ پہلے پہل جس نے مرے بربطِ دل کو!
چھیڑا تھا وہ تھی کس کی نظر یاد نہیں ہے

کیوں ترکِ محبت کی قسم کھائی تھی میں نے۔
کہنے کو تو ہے یاد مگر یاد نہیں ہے

مارا ہوا الفت کا ہوں یہ یاد ہے اے نور
ہوں کب سے پڑا خاک بسر یاد نہیں ہے

گوتم کی سرزمیں ہوں در بار چشتیا ہوں
تلسی نے مجھ کو پوجا نانک سے کب جدا ہوں
جو چاہو مجھ سے لے لو سب کچھ تب تم کو دے دوں
تم پیار مجھ کو دے دو سب کچھ میں تم کو دے دوں
جھولی ہے میری خالی گھر گھر پھروں بھٹکتی
بس مانگتی ہوں سب سے بھکشا محبتوں کی
دل میں اتر گئی ہے ایسی صدا دی اس نے !
آنکھوں میں بھر کے پانی پھر یہ دعا دی اس نے
چھبیس جنوری کا یہ جشن ہو مبارک
ہر سال زندگی کا یہ جشن ہو مبارک ۔

غزل

ذکاؤالدین شایاں

قریب جاں نہ اب آؤ بہت اندھیرا ہے
سسک رہے ہیں الاؤ بہت اندھیرا ہے
بس ایک برق سر راہ محشر تنویر !
اور اس کے بعد، گھٹاؤ بہت اندھیرا ہے
وہ درد اگر حقیقت میں ہیں سحر کے خواب
کوئی کہانی سناؤ بہت اندھیرا ہے
شگفتہ آتش لب، سرخ و زرد موج خیال
کہیں سے رنگ چرالاؤ بہت اندھیرا ہے
"بدن کے زاویے ٹوٹے۔ نفس نفس زخمی
لہو میں تیرتے جاؤ بہت اندھیرا ہے
کسی کرن، کسی نکہت کو قید کر لاؤ !
سلگتی، جلتی ہواؤ بہت اندھیرا ہے

عزیز ربانی عزیزؔ

دو غزلیں

اب نہ وہ حُسن کے پندار کی افواہیں ہیں
نہ مرے عشقِ پرستار کی افواہیں ہیں!

منزلِ عشق ہے آسان بہ تصدیقِ جنوں
دہر میں وادیٔ پرخار کی افواہیں ہیں

حق پرستی ہے زمانے میں نہ منصور کوئی
صرف رسمِ رسن و دار کی افواہیں ہیں

کون آیا سرِ بالیں کہ بڑا چرچا ہے
پھر شفا یابیٔ بیمار کی افواہیں ہیں!

میرا ہی کیا سوال ہے اس بزمِ عام میں
کوئی بچا ہے آپ کی غارت گری کے بعد

فطرت ضعیف ہو تو جراثیم کیا مریں
جمہوریت بھی روگ ہے شاہنشہی کے بعد

تم نے نئے چراغ جلائے تو ہیں مگر
ظلمت بھی آ رہی ہے اسی روشنی کے بعد

اس رزم گاہِ زیست میں کیوں فکرِ زیست ہو
اک زندگی ہے اور بھی اس زندگی کے بعد

ہنگامۂ نشاط میں واعظ کہاں چلے
تشریف لایئے گا ذرا میکشی کے بعد

زلفوں کی نرم چھاؤں تھی گردش میں جام تھا
پھر کیا ہوا پتہ نہیں اس بےخودی کے بعد

یہ فرشِ میکدہ یہ ستاروں کی سرزمیں
جلتے گئے چراغ مری میکشی کے بعد

تاریکیٔ حیات کا کچھ غم نہیں عزیزؔ!
آئے گی روشنی بھی اسی تیرگی کے بعد

رام پرشاد شرما مہرؔ بھرت پور

غزل

ہم اپنے دل کی سفارش بھی تو کر سکتے ہیں
آپ سے ایک گزارش بھی تو کر سکتے ہیں

ہم اسی آس پہ بیٹھے ہوئے ہیں برسوں سے
وہ کبھی ہم پہ نوازش بھی تو کر سکتے ہیں

یہ شرر آگ ہی برسائیں ضروری تو نہیں
بے ضرر نور کی بارش بھی تو کر سکتے ہیں

آخر اندھے تو نہیں ہیں ترے بندے خالق
تیرے دیدار کی خواہش بھی تو کر سکتے ہیں

اپنا پن اتنا جتاتے ہیں جو تم سے مہرؔ شش
غیر سے مل کے وہ سازش بھی تو کر سکتے ہیں

کریم بیاوری

ریاست بیروہی کے ایک قصبہ شیو گنج میں ۲۱ جنوری ۱۹۳۲ء کی صبح کو ایک متوسط خاندان میں آنکھ کھولی تو والدین کی خوشی کی انتہا نہ تھی کیونکہ میں پہلا لڑکا تھا جو ان کی گود میں آیا، عبدالکریم کے نام سے پکارا جانے لگا۔ مارواڑ ہونے کی وجہ سے اردو پڑھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے ہمارے محلے میں ہی ایک بزرگ کے پاس مجھے بٹھا دیا گیا اور ایک سرکاری اسکول میں بھی داخلہ دلوا دیا۔ جہاں مجھے ہندی میں تعلیم ملتی رہی دونوں زبانیں میں بڑے شوق سے پڑھتا رہا ابھی میری عمر صرف دس برس کی ہوئی تھی کہ ایک انقلاب آیا زندگی نے ایسی کروٹ لی کہ شیو گنج چھوڑ کر بیاور آنا پڑا یہاں بھی سرکاری اسکول میں داخلہ لیا جو کہ مڈل تک تھا مڈل پاس کرنے کے بعد پھر میں آگے نہ پڑھ سکا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں پڑھنا نہیں چاہتا تھا یا میں آگے پڑھنے کے قابل نہیں تھا وجہ صرف یہ تھی کہ والد صاحب کافی بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ اس لئے گھر کا کاروبار سنبھالنے کے لئے واحد میں ہی تھا۔ لیکن پڑھائی کا سلسلہ میں نے قائم رکھا شعر و شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ بلکہ شاعرانہ فطرت پائی تھی اور شعر کہتا تھا۔ لیکن شعر برائے شعر نہیں کہتا جب تک کہ میری ذات کسی خاص واقعے سے متاثر نہیں ہوتی۔ ایک مشاعرے میں میری ملاقات علامہ جناب انور بھوپالی صاحب سے ہوئی جو کہ بیاور ہی میں محمد علی اسکول میں ہیڈ مولوی تھے ان کی شاگردی قبول کرنے کے بعد میری شاعری میں نکھار آ گیا۔ در اصل میری شاعری آپ کی ہی مرہونِ منت ہے میں نے بیسیوں آل انڈیا مشاعرے پڑھے خدا کے فضل و کرم سے کسی بھی مشاعرے میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ میری شادی رانی مارواڑہ میں ایک مالدار خاندان میں ہوئی دو غزلیں پیش کرتا ہوں

رسمِ کہن

ہر ذرۂ وطن کو کرن کر سکے تو کر
بھارت کو اک نئی دُلہن کر سکے تو کر

نفرت سے پاک اپنا وطن کر سکے تو کر
یعنی گلوں کی زیبِ چمن کر سکے تو کر

غیروں کے غیر حال کو مت دیکھ ہمنشیں
اپنا درست چال چلن کر سکے تو کر

تو درد بن کے دل میں سما جا ہر ایک کے
اور اپنے دل کو ایک رتن کر سکے تو کر

اب توڑ بھی دے ساغر و مینا کو ساقیا
نظروں سے اپنی ہم کو مگن کر سکے تو کر

گل ہی کی شاخ پر تو قناعت نہ کر ندیم
ہاں زندگی کو وقفِ چمن کر سکے تو کر!

اہلِ خرد تو ہوش ہی سب کھو چکے تمام
تو ہی مددِ جو عظمتِ فن کر سکے تو کر

باز آ کریم دیکھ سنبھل جا کہ وقت ہے
اب بھی جو ترکِ رسمِ کہن کر سکے تو کر

غزل

کریم بیاوری

ہمارے دوست ہی نکلے نہ وہ اہلِ کرم نکلے
جنھیں ہم مہرباں سمجھا کئے اہلِ ستم نکلے

بہت ہی بے وفا نکلے بڑے اہلِ ستم نکلے
پڑا جب وقت ہم پر دوستوں کے سب بھرم نکلے

محبت ہی سے تو آباد ہے دنیائے دل میری
خدا نخواستہ کیوں میرے دل سے اُن کا غم نکلے

ہوئی جب آرزو پیدا بڑھے ہم جانبِ منزل
ہمارے دل کے ارماں یوں [illegible] نکلے

ہم اپنی جان دے کر بھی بچا لیتے نشیمن کو!
مگر بجلی گری اُس وقت جب گلشن سے ہم نکلے

ہزاروں انقلاب آئے زمانے میں مگر پھر بھی
نہ وہ بدلے نہ اُن کی زلف کے ہی پیچ و خم نکلے

ہزاروں بار طوفاں [illegible] ناخدائی کی ◆ وہی حق [illegible]
ہزاروں خواہشیں لیکر کریم آیا ہوں [illegible] ◆ تو [illegible]

فیملی پلاننگ مہینہ ہے

جنوری ۱۹۷۹ء

"میں فیملی پلاننگ کو ملک کی عام ترقی اور خوشحالی کے لئے بیحد اہم اور ضروری پروگرام سمجھتا ہوں۔"

—— جے پرکاش نارائن

اپنے کنبے کو منصوبہ بند کیجئے

ماں، بچے
اور کنبے
کی صحت اور
خوشحالی کے لئے

پہلا جلدی
نہیں
دوسرا ابھی
نہیں
تیسرا کبھی
نہیں

اگلا بچہ تب —— آپ چاہیں جب

DAVP 78/450

دلی انتظامیہ کی نمایاں کامیابیاں

تعلیم

(۱) مفید اور ہمہ گیر تعلیم کا انتظام۔

(۲) پچھلے سال ۵۴ مڈل اور ۲۲ ہائر سیکنڈری اسکول کھولے گئے۔

۳۔ ۲۴ اسکولوں اور ۳ بالغوں کے اسکولوں میں ۱۲ دیں جماعت تک پڑھائی کا بندوبست۔

۴۔ دن میں نہ پڑھ سکنے والے بچوں کے لئے ۴۸ نئے قلیل مدت والے اسکول کھولے گئے ہیں۔

۵۔ بالغوں کو حروف شناس بنانے اور کام دھندوں میں ہنرمند بنانے کے لئے گاندھی جینتی سے خصوصی مہم شروع۔

۶۔ ۱۳ نئی اسکولی عمارتوں کی تعمیر مکمل، اور ۱۸ اسکول زیر تعمیر۔

۷۔ بچوں کو سنسکرت، پنجابی اور اردو پڑھانے کا اسکولوں میں خاص انتظام۔

چھوٹی صنعتیں

۱۔ [illegible] لوگوں کو روزگار دینے کے لئے گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ترقیاتی اسکیم پر عمل شروع۔

۲۔ نریلا۔ رانی جھانسی روڈ، پٹ پڑگنج، وزیر پور کی صنعتی بستیوں اور بنکر کالونی بھارت نگر کی تعمیر کا کام شروع۔

ہمہ جہت دیہی ترقی

(۱) گاؤں کی ہمہ جہت ترقی کے لئے ۱/۵ ۶ کروڑ روپئے

(۲) آئندہ چار برسوں میں تمام گاؤں کیلئے پینے کا پانی اور آبپاشی کی سہولیات بہم پہنچانے کا مکمل بندوبست۔

۳۔ خصوصی ترقیاتی اسکیم کے تحت علی پور، کنجھاولہ اور نجف گڑھ ترقیاتی بلاکوں کی ترقی کیلئے ۱۵ لاکھ روپئے کی رقم مخصوص۔

سماجی بہبود و ہریجن بہبود

(۱) بچوں کے عالمی سال میں بھی بے سہارا بچوں کو سماجی تحفظ مہیا کرنیکا تہیہ۔

۲۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے مقابلے میں ہریجن بہبود کیلئے بجٹ میں ڈھائی گنا اضافہ۔

۳۔ بوڑھوں اور بیوہ عورتوں کو پنشن دینے کی اسکیم نافذ۔

۴۔ گاؤں میں ہریجنوں اور بے زمینوں کو تقریباً ۲۳۰۰ رہائشی پلاٹوں کی تقسیم۔

تعمیر رہائشات

۱۔ دلی میں پہلی مرتبہ مکانوں کی تعمیر کے لئے ہاؤسنگ فائنانس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہے۔

۲۔ اس سال دلی میں ۱۱ ہزار مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ۔

۳۔ ۶۷ فیصد مکانات کم آمدنی اور کمزور طبقوں کے لوگوں کے لئے۔

نشہ بندی

۱۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک مرحلہ وار مکمل نشہ بندی نافذ کرنے کا پروگرام۔

۲۔ خشک دنوں کی تعداد میں دوگنا اضافہ اور شراب کی دکانوں میں بھاری کمی۔

جاری کردہ **محکمہ اطلاعات و اشاعت دلی انتظامیہ دلی**

فخر واحدی

اصل نام تو فخر الحسن ہے۔ لیکن ادبی حلقوں میں فخر واحدی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ تاریخ پیدائش یکم جون ۱۹۴۲ء ہے اور مقام پیدائش شہر قنوج۔ آج بھی قنوج میں سکونت پذیر ہوں۔ والد صاحب کا اسم گرامی منشی محمد حسن صاحب ہے جن کی دائمی جدائی نے مجھے کم عمری ہی میں ذمہ دار انسان بنا دیا اور کیونکہ میں اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اس لئے گھر کا تمام بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر آگیا۔ مجبوراً ۱۹۵۷ء میں ہائر سیکنڈری کر کے قنوج کے ویٹرنری ہاسپٹل میں کمپاؤنڈر ہو گیا اور آج بھی یہی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ ۱۹۶۲ء میں مولوی اقرار حیدر صاحب ساکن قصبہ تالگرام ضلع فرخ آباد کی صاحبزادی دُردانہ بیگم سے رشتۂ ازدواج قائم ہوا۔

شاعری کی ابتدا ۱۹۶۰ء سے ہوئی اور ایک مقامی استاد سے مشورۂ سخن کرتا رہا۔ لیکن جب شعری نزاکتوں کو سمجھنے کا شعور بیدار ہوا اور فنی رہبری حاصل کرنے کی خواہش جاگی تو ۱۹۷۵ء میں ملک کے مشہور فن کار حضرت واحد پریمی کو اپنا رہبر جادۂ سخن بنا لیا۔ یہ موصوف کی صحیح رہنمائی کا ہی نتیجہ ہے کہ میں نے تین چار سال کے قلیل وقفہ میں اتنی ساری منزلیں طے کر لی ہیں جن پر پہنچنے کے لئے دوسرے شعرا کو ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ مجھے اپنے مشفق استاد حضرت واحد پریمی کی رہنمائی پر فخر ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں۔ میں آج جو کچھ ہوں وہ استادِ محترم کی عنایتوں کے طفیل ہے۔ ۱۹۷۰ء سے میرا کلام ملک کے بیشتر رسائل میں شائع ہو رہا ہے اور اب پہلا مجموعۂ کلام "نگارِ زندگی" جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے۔ غزل میری محبوب صنفِ سخن ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً دیگر اصنافِ سخن کو بھی ذریعۂ اظہارِ فکر بناتا رہا ہوں۔ مسائل حیات و کائنات کی عکاسی میرا خاص موضوعِ سخن ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی شہادت دیں گے۔

جو حق و صداقت کے پرستار ملیں گے
وہ ایک نہ اک روز سرِ دار ملیں گے

ضائع شعورِ غم کی امانت نہ کیجئے
آلامِ روزگار سے نفرت نہ کیجئے

چاہے گلے پہ تیغ برہنہ ہی کیوں نہ ہو
لیکن ستم گروں کی حمایت نہ کیجئے

ہر سمت نفرتوں کی فضا جس سے عام ہو
اس طرح ملک و قوم کی خدمت نہ کیجئے

اے فخر بزمِ شعر میں جدت کے نام پر
برباد فکر و فن کی لطافت نہ کیجئے

اتفاقاً جو کوئی ہمارا ہوا
مصلحت پر محبت کا دھوکا ہوا

شامِ غم وہ بھی لمحات آئے کہ جب
نالۂ دل ... تو شعلہ ہوا

کوئی پیمانہ ... اگر
ہم نے دیکھا زمانے کو ہنستا ہوا

جب بھی محنت کشوں کا پسینہ بہا
شل گلزار ہر ایک صحرا ہوا

نہ جانے کس کا یہ جلوہ دکھائی دیتا ہے
ہر ایک سمت اُجالا دکھائی دیتا ہے

مری طرح جو تڑپتا دکھائی دیتا ہے
وہ غیر شخص بھی اپنا دکھائی دیتا ہے

زمانہ فخر کے کیا ظرفِ دل کو سمجھے گا
ہجومِ غم میں بھی ہنستا دکھائی دیتا ہے

جوشِ جنوں کا فیض ہے جو اپنے خون سے
ہم نے قفس کو ڈھال لیا لالہ زار میں
اس طرح ہم حصارِ غمِ دہر میں ہیں قید
جس طرح کوئی دفن ہو زندہ مزار میں
ہر چند فخرؔ اپنا چمن ہے حسین مگر
پژمردہ کتنے پھول ہیں اب بھی بہار میں

ہر لمحہ یاد دل میں تو جلوہ نظر میں ہے
کتنی کشش وہ حُسنِ سراپا اثر میں ہے
چاہوں تو میں قفس کو بھی ہمراہ لے اڑوں
اتنی تو اب بھی جان مرے بال و پر میں ہے
شاید بجھا ہے دل کسی بیمارِ ہجر کا
پھیکی سی روشنی جو چراغِ سحر میں ہے
جو سرخرو ہے اب بھی سرِ بزمِ انتظار
میرے لہو کا رنگ چراغِ سحر میں ہے

قرآن کی خوشبو آتی ہے

مقبول نصیر آبادی

عرفان کی خوشبو آتی ہے، ایقان کی خوشبو آتی ہے
محبوبِ خدا میں سرتاپا قرآن کی خوشبو آتی ہے

ہر سمت سے باغِ وحدت میں سرکارؐ تمہارے ہی دم سے
جاں بخش بہارِ فیضانِ ایمان کی خوشبو آتی ہے

کہتے تھے فرشتے جھوم کے سب یہ عرشِ علیٰ معراج کی شب
اللہ غنی اللہ کے اک مہمانؐ کی خوشبو آتی ہے

یہ جوشِ عقیدت کیا کہیئے، یہ داغِ محبت کیا کہیئے
پہلو سے مجھے تو فردوسی گلدان کی خوشبو آتی ہے

سب پوچھتے تھے اس دلہن سے بخشا تھا پسینہ ہی جس کو
یہ گھر سے ترے لے خوش قسمت کس شان کی خوشبو آتی ہے

پابوسیٔ پائے اقدس کا حاصل تھا شرف جن راہوں کو
امروز بھی ان سے بطحیٰ کے سلطانؐ کی خوشبو آتی ہے

اب محفلِ امکاں کے چپے چپے سے شہِ لولاک لما
واللہ تمہارے الطاف و احسان کی خوشبو آتی ہے

جس وقت ستاتے ہیں آ کر آلامِ جہاں تو فوراً ہی
اے رحمتِ عالمؐ آپ ہی کے دامان کی خوشبو آتی ہے

جب بزمِ تصور پر سایہ وہ زلف دوتا کر لیتی ہے
مقبولؔ مجھے مشک و عنبر لوبان کی خوشبو آتی ہے

معیار کی کسوٹی پر

(ادارہ)

...نا کے بہمنی سلاطین

مصنف جناب ہارون خاں شروانی

...جناب رحم علی ہاشمی۔ صفحات ۳۸۰ سائز $\frac{23 \times 36}{16}$
چھپا۔ لکھائی چھپائی نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی کی
...ت کے مطابق بہترین۔ قیمت پندرہ روپے پچاس پیسے
پتہ ناشر یا دفتر شان ہند نئی دہلی ۲
وزارت تعلیم و سماجی بہبود حکومت ہند کے ادارہ
اردو بورڈ نے ہارون خاں شیروانی کی انگریزی کتاب
BAHAMAN IS OF DEC کا بہترین ترجمہ شائع کیا ہے
...، تاریخ قرون وسطی کی تاریخ کا نہایت اہم حصہ ہے جو متحدہ
...کے عہد کا ہم عصر بھی ہے۔ بہمنیوں کے پہلے کا قرون وسطی
...من صرف نصف صدی تک رہا جب کہ اس ملک پر
...ین دہلی کی متزلزل حکومت تھی اور بہمنیوں کے سقوط کے
...سے لے کر آصف جاہی حکومت کے قیام تک کا زمانہ
...، انتشار کا زمانہ تھا۔ بہمنی حکومت کی دو صدیوں کی
...مل تاریخ کے سلسلے میں شیروانی کی پہلی کوششیں ان کی
...ہی تصنیف "محمود گاواں" "دی گریٹ بہمنی وزیر"
...۔ زیر نظر کتاب قرون وسطی کے دکھن کے ابتدائی حصہ
...ل اور نیز پولیٹیکل تاریخ پر مشتمل ہے اور ہر باب کو دو
...ل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک میں عموماً اس عہد کے
...یا حالات کا ذکر ہے اور دوسرے میں پولیٹیکل حالات کا
...پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے اور پوری پوری صحت
...سل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔
...ر اول میں چھ ابواب ہیں جو جغرافیائی حالات، خانوادہ
...ی کا قیام، حالات ماقبل، سلطنت کی تنظیم، تغیرات
...ر، اور بہمنی تمدن کے امتزاج عنوانات پر مشتمل ہے
...حصہ دوم حسب ذیل نو ابواب پر پھیلا ہوا ہے۔ تیا...

ماحول، پارٹی بازی اور بڑھ گئی، مزید شکر رنجیاں، محلیہ...
ولایت کی حکومت، محمود گاواں کا عہد، سلطنت کی حالت...
نزع، آخری منزل، لسانی رجحانات، اسناد۔ تاریخ...
فیروز شاہی اور آخر میں خانوادہ بہمنی کا شجرہ نسب دیا گیا...

آزادی

ناشر ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی۔ ضخامت
$\frac{23 \times 36}{16}$ سائز کے ۱۸۴ صفحات۔ چھپائی آفسٹ...
کاغذ اور کتابت بہترین۔ جان اسٹورات مل کی کتاب "لبرٹی" کا یہ
اردو ترجمہ جناب سعید انصاری صاحب کا مرہون منت ہے۔
شروع میں پروفیسر محمد مجیب صاحب کا مقدمہ ہے جو ۳۰ صفحے
پر پھیلا ہوا ہے۔ کسی کتاب کا مقدمہ کیسے لکھا جاتا ہے اس کا
احساس یہ مقدمہ پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب دیباچہ،
آزادیٔ خیال و مباحثہ، یا انفرادیت بہبود کا ایک ذریعہ ہے۔
فرد پر جماعت کے اختیارات کی حدود اور مثالیں پانچ ابواب
پر مشتمل ہیں۔ جان اسٹورات مل نے اپنی اس تصنیف کو
اپنی مرحوم بیوی کے نام منسوب کیا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے
کہ مصنف نے جن الفاظ میں یہ انتساب کیا ہے انہیں
پڑھ کر ہی کتاب کی قیمت وصول ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد
کے ترجمان القرآن کے انتساب کے بعد یہ دوسرا انتساب
ہے جو راقم الحروف کو پسند آیا ہے۔
مصنف نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ "اس مقالے
کا موضوع بحث وہ مسئلہ نہیں ہے جسے آزادیٔ ارادہ
(مسئلہ قدر) کہتے ہیں جو بدقسمتی سے اس کا مخالف سمجھا جاتا
ہے جسے غلط طور پر مسئلہ جبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے
بلکہ اس کا اصل موضوع سول یا جماعتی آزادی ہے۔ یعنی یہ
کہ جماعت کو افراد پر جائز طور سے کسی قسم کے اور کہاں تک
اختیارات حاصل ہیں۔"
اور واقعی اس موضوع پر مصنف نے جس عالمانہ

اندازسے کھلے طور پر بحث فرمائی ہے وہ اپنی جگہ پر اپنی نظیر آپ ہے۔ تقریباً ستر سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ جناب راجہ نریندر ناتھ صاحب لاہور نے کیا تھا۔ راجہ صاحب نے ایم اے پاس کرنے کے بعد "لبرٹی" کا ترجمہ کیا اور اس کتاب کا نام "اظہار رائے اور آزادی اظہار رائے" رکھا تھا جو آزادی سے ترجمہ نام ہے "آزادی"۔ زیر نظر کتاب کی قیمت سات روپے پچیس پیسے ہے ناشر سے یا دفتر شان ہند نئی دہلی ۵۵ سے مل سکتی ہے۔

نفسیاتِ جنوں

برنارڈ ہارٹ کی مشہور کتاب (THE PSYGHOLO GY OF INSANITY) کے چار ایڈیشن چھپ چکے ہیں "نفسیاتِ جنوں" اس کتاب کا ترجمہ اردو میں پہلی بار وزارتِ تعلیم حکومت ہند کے ادارے اردو ترقی بورڈ نے شائع کیا ہے۔ محترمہ عبیدہ زمان نے قابلِ تعریف حد تک اس مشکل ترین موضوع کی کتاب کا ترجمہ کرکے اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔ ایک سو صفحات کی اس کتاب میں اصل مصنف نے یہ اعتراف کیا ہے کہ دیوانگی کے موضوع پر مفصل طور پر بحث نہیں ہو سکی۔ تاہم ایسی راہیں متعین کردی گئی ہیں کہ جن پر چل کر "دیوانگی" کے بارے میں مختلف آزاد مکاتیبِ فکر کی موجودگی اور تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں ان کے نظریات اور طریقوں کے درمیان بنیادی اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پیچیدہ موضوع پر مفصل لکھا جا سکتا ہے۔ جن کتابوں سے اصل مصنف نے استفادہ کیا ہے اس کی فہرست دی گئی ہے۔ دیوانگی کے بارے میں مختلف اصطلاحات واقعی اردو داں طبقہ کے لئے کام کی چیز ہیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اور کاغذ سب بہترین۔ قیمت پانچ روپے پچیس پیسے۔ ناشر یا دفتر شان ہند نئی دہلی ۵۵ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

شعریات

جناب شمس الرحمان فاروقی اردو ادب میں معیاری اور بامقصد تحریروں کے لئے اپنا مقام رکھتے ہیں خصوصاً شعری عروض میں انہیں خاص دلچسپی ہے مگر "شعریات" (جو انہوں نے ارسطو کی "بوطیقا" اردو ترجمہ کیا ہے) ان کی ایک مزید ادبی کاوش کی مظہر ہے۔ یعنی آپ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔ فاروقی صاحب نے تعارف کے عنوان سے ۲۵ صفحات میں ارسطو کی پیدائش اور یونانی فلاسفی وغیرہ پر جو تشریحی اور توضیحی نوٹ تحریر فرمایا ہے۔ وہ ارسطو کی زندگی پر پوری طرح تو نہیں مگر بہت حد تک محیط ہے مگر یقیناً مطالعہ کی چیز ہے۔ بوطیقا کا یہ ترجمہ ایس۔ ایچ بچر کے انگریزی ترجمہ کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ لیکن فاروقی صاحب نے سینٹبری، ٹوئننگ، ٹی۔ آر۔ ایس۔ ڈورش، جان وارنگٹن۔ نیز ڈی۔ ڈبلیو لیوکس سے خصوصاً استفادہ کیا ہے اور اس کے علاوہ عزیز احمد اور محمد حسین کے ترجمے بھی ان کے سامنے رہے ہیں جس سے ترجمہ میں اور بھی جان آگئی ہے۔ کتاب کا حجم ۹۹ صفحات ہے اور قیمت پانچ روپے پچیس پیسے۔ آفسٹ چھپائی۔ کاغذ بہتر کتابت خوب۔ ناشر ترقی اردو بورڈ ویسٹ بلاک ۸ راما کرشنا پورم نئی دہلی۔ دفتر شان ہند نئی دہلی ۵۵ سے بھی یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے۔

امریکی ادب کا مختصر جائزہ

جناب سلامت اللہ خان علی گڑھ یونیورسٹی میں امریکی ادب کے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ امریکی ادب کی تاریخ لکھیں۔ ان کی یہ دیرینہ خواہش ترقی اردو بورڈ کے توسط سے تکمیل پا سکی ہے اور ان کی یہ تصنیف اردو ادب کے آسمان پر ایک روشن ستارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلے باب "امریکی ثقافتی ورثہ" میں تیس امریکی مصنفین، دوسرے باب "بدیع امریکی ادب اور رومانیت" میں گیارہ، تیسرے باب "روایت [illegible] اور تجدید فن" میں [illegible] چوتھے باب "اخلاقی حقیقت [illegible]" اور ادبی و اخلاقی قدروں کی تجدید [illegible]

"رومانیت کا انحطاط اور فیچریت کی ابتدا" میں چھ۔ چھٹے باب "ہزیمت خوردہ نسل کے پیش رو" میں نو۔ ساتویں باب "ہزیمت خوردہ نسل" (دونوں جنگ عظیم کے درمیانی وقفے) میں تیرہ اور آٹھویں باب "جدید امریکی ادب کے رجحانات" جسے تین ضمنی بابوں شاعری ناول اور ڈرامہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ میں سولہ مصنفین کے رشحاتِ قلم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے تمہید میں تحریر فرمایا ہے "چونکہ امریکی ادب انگریزی زبان میں ہے، اس لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی امریکی ادب کو برطانوی ادب کی توسیع خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس غلط فہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے نصاب میں امریکی ادب پارے بغیر کسی امتیاز کے برطانوی تخلیقات کے ساتھ ہمیشہ اور ابتدائی درجوں میں شامل ۔ اور اب بھی ہیں۔ لیکن ہر ادب کی اپنی علیحدہ نسلی اور ثقافتی ساخت ہوتی ہے اور اسے اس کے ادبی تاریخ کے وقت اور مقام کے باہمی رشتوں میں رکھ کر ہی مکمل طور سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادبی تاریخ کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے ملک میں امریکی ادب سے گہری دلچسپی پائی جاتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے تھورو سے استفادہ کیا تھا۔ وزیر اعظم نہرو کے پسندیدہ شاعر رابرٹ فراسٹ ہی تھے جن کی نظم کا ایک حصہ وفات کے بعد ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ان کی میز پر پایا گیا تھا۔ ہماری بیشتر یونیورسٹیوں میں امریکی ادب کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے اور عام سطح پر بھی بے شمار امریکی تصانیف ہندوستان میں پڑھی جاتی ہیں۔ امریکی ادب کی مستند تاریخیں انگریزی زبان میں ہیں۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی تاریخ نہیں تھی۔ یہ مختصر جائزہ اس کمی کو پورا کرنے کی پہلی کوشش ہے۔"

اس [illegible] کوئی شک نہیں کہ سلامت اللہ خان کی یہ اردو میں پہلی کوشش ہر طرح سے قابل تعریف ہے امریکی لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والے اردو داں حضرات کیلئے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت نو روپیہ پچاس پیسے۔ اردو ترقی بورڈ نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی یا دفتر شان ہند نئی دہلی ۵ سے دستیاب ہے۔

ای۔ اے جی رابنسن کی مشہور زمانہ تصنیف

اجارہ "MONOPOLY" کا اردو ترجمہ

"اجارہ" ایم۔ اے گیلانی کی محنتِ شاقہ کی ایک زندہ جاوید تخلیق جسے حکومت ہند کے محکمہ تعلیم کے ادارے ترقی اردو بورڈ نے اپنی قابلِ تقلید روایات کے مطابق شائع کیا ہے۔ یہ کتاب انتہائی خشک، غیر دلچسپ مگر انتہائی ضروری مسئلے اور موضوع پر اپنا جواب آپ ہے۔ مقدمہ کیمبرج کے سی۔ ڈبلیو۔ جی کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں [illegible] معیشت پر بڑے اچھے انداز میں ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ "پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی کہ معاشیات پر چند ایسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جائے جن کو پڑھ کر ایک آدمی اور مبتدی طالب علم بھی اس بات کا کچھ اندازہ کر سکیں کہ آج کل ماہرین معاشیات اپنے علمی اصولوں کی روشنی میں کس ڈھنگ سے معاشی مسائل پر سوچ بچار کر سکتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء کے بعد حالات اور خیالات میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند اہم اسباب یہ ہیں:۔

۱۔ ملک کے پس ماندہ علاقوں میں رہنے والوں کی بظاہر کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبت۔ [illegible] تجارت کے میدان میں انگلستان کی پوزیشن کا کمزور ہو جانا۔ سنہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء والے معاشی بحران کی شدت۔ ان اسباب نے دو اہم نتائج پیدا کئے ایک یہ کہ قلیل المدتی مسائل لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے دوسرے یہ کہ لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات [illegible] ہو گئی کہ نظام معیشت میں اگر کبھی [illegible] کیفیت جنگ جیسے غیر معمولی حالات کے [illegible] ہو جائے تو وہ آگے چل کر خود بخود ٹھیک ہو جائے گی [illegible]

انیسویں صدی کے تجربے سے بھی اس خیال کی توثیق ہوتی تھی مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد نظام عالم میں ایسی بنیادی تبدیلیاں آگئیں کہ اب نظام معیشت کے خود بخود ٹھیک ہونے پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس زمانے میں سب سے زیادہ جو بات لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کئے ہوئے تھی وہ یہ کہ کس طرح موثر طلب کو ایک ایسی سطح پر برقرار رکھا جائے کہ بار بار واقع ہونے والی کساد بازاری اور بے روزگاری سے نجات مل جائے۔ اس طویل مدت میں معاشیات کی طرف سے لوگوں میں بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ ان ساری باتوں کے نتیجہ کے طور پر خیالات اور افکار میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ پرانی قدامت پرستیوں کو لوگ چیلنج کرنے لگے۔ معاشیات کے ماہرین کے درمیان اختلاف رائے میں شدت پیدا ہوگئی۔ خیالات و افکار میں یہ تبدیلی ابھی چل ہی رہی تھی کہ دوسری جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کے نتیجے کے طور پر اب زمانۂ امن کے معمولی حالات میں بھی نظام معیشت میں حکومت کا عمل دخل اتنا بڑھ گیا ہے کہ آج کی مثال پہلی جنگ عظیم کے آخری دنوں میں بھی نہیں ملتی۔ اب آئندہ کے بارے میں جس حد تک پیشین بینی ممکن ہے اس کی مدد سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشی معاملات میں سرکاری مداخلت کی ضرورت بڑھتی ہی جائے گی۔" کتاب بارہ باب پر مشتمل ہے جو ۳۵۱ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ علم معاشیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ قیمت ساڑھے سترہ روپیہ۔ ناشر سے یا دفتر شان ہند نئی دہلی نمبر ۲ سے طلب کی جاسکتی ہے۔

فلسفہ کے بنیادی مسائل

زیر نظر یہ کتاب بھی ایک خشک البتہ دلچسپ موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ کتاب کے اصل مصنف اے سی ایونگ کا دیباچہ ملاحظہ فرمائیے" زیر نظر کتاب خصوصاً دو قسم کے قارئین کے لیے لکھی گئی ہے۔ پہلی قسم تو ان طلبہ کی ہے جو کسی جامعہ میں تعلیم پا رہے ہیں اور انہوں نے پہلی مرتبہ فلسفہ پڑھنا شروع کیا ہے۔ دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے کسی جامعہ میں تو تعلیم نہیں پائی ہے لیکن خانگی مطالعے سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ فلسفہ کیا ہے اور وہ کن مسائل سے بحث کرتا ہے۔ میں نے اس کتاب میں بڑی کوشش کی ہے کہ یہ ان دونوں کے لئے صاف اور آسان ہو۔ لیکن ابتدا ہی میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کسی شخص کے لئے فلسفہ کا مطالعہ بغیر سخت ذہنی جدوجہد کے ممکن نہیں۔ گو اس کو آسان بنانے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کی جائیں۔ بہت سارے فلسفی (اور مجھے امید ہے کہ میں ان کی صف میں شامل نہیں ہوں) مورد الزام قرار دیئے جاسکتے ہیں کہ انہوں نے اس مضمون کو اپنے طرز بیان کی وجہ سے غیر واضح و معلق بنا دیا ہے۔ لیکن فلسفے کا مضمون ہی کچھ ایسا ہے کہ اس کو کسی ناول کی طرح بھی بغیر ذہنی کاوش کے سمجھا نہیں جاسکتا۔

آپ مندرجہ بالا ہر دو قسم کے قارئین کی صف میں ہوں یا نہ اگر آپ فلسفہ اور اس کے بنیادی مسائل کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو اے سی ایونگ کی اس بیش قیمت کتاب کا اردو ترجمہ ضرور پڑھئے جسے میر ولی الدین نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ایسی بیش بہا کتاب کے ترجمہ کی ذمہ داری میر ولی الدین صاحب کو سونپ کر ترقی اردو بورڈ نے اپنی بیدار مغزی کا ثبوت دیا ہے۔ ۴۱۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت پندرہ روپے پچھتر پیسے ہے جو ناشر یا ترقی اردو بورڈ یا دفتر شان ہند نئی دہلی نمبر ۲ سے طلب کی جاسکتی ہے۔

کسی بھی بچے کی جسمانی و دماغی نشوونما کے لئے پہلے تین سال بہت اہم ہیں۔ بچے کو آپ کے بھرپور پیار اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔

اسی عرصے میں ایک اور بچہ پیدا کر کے اس کو اس سے محروم نہ کیجئے۔

ساتھ ہی، ماں کی صحت کی حفاظت کے لئے از حد ضروری ہے کہ دو بچوں کی پیدائش میں تین سال کا وقفہ ہو۔

مفت مشورے اور خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے قریب ترین صحت مرکز میں تشریف لایئے

davp78/160

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

آکاش وانی کا سیکولرازم

آکاشوانی سیکولرازم کا پرچار کرنے میں دن رات ایک کئے ہوئے ہے۔ مگر اردو کے سلسلے میں یہ خالص فرقہ پرست یعنی ہندو مسلم ذہنیت کا مظاہرہ کرنے میں کسی بدترین مسلم لیگی سے کم نہیں ہے۔ مسلمانوں کی خاصی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ اردو ہندو مسلم تہذیب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مسلم دانشور جنہیں سرکاری مفاد حاصل ہے وہ سرکار کے ہم نوا ہیں اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان ثابت کرنے کے لئے کوشاں ہیں ہم صاف الفاظ میں کئی بار یہ کہہ چکے ہیں کہ حکومت کی پالیسی انگریز کے نقش قدم پر چل رہی ہے یعنی ہندو مسلمان بٹے رہیں۔ کانگریس دور حکومت میں یہ پالیسی کھلے بندوں عمل پیرا تھی اور موجودہ حکومت کسی وقت تعلق سے کام لے رہی ہے۔ ویسے یہ حکومت کانگریس سے زیادہ خطرناک طور پر اردو کو زہر سے نہیں بلکہ گڑ دے کر مارنا چاہتی ہے۔ لیجئے آج آکاش وانی کی کچھ کارفرمائیوں کی ایک جھلک دیکھئے۔

۱۔ جشن جمہوریت کے مبارک موقع پر ہر سال ۲۵ جنوری کی رات کو آکاش وانی ایک خاص پروگرام سرو بھاشا کوی سمیلن نشر کرتا ہے۔ اس پروگرام میں ہر ہندوستانی زبان کا ایک قابل ذکر شاعر اپنی زبان میں اپنا کلام سناتا ہے اور کچھ زبانوں کے شعراء کے کلام کا ترجمہ بھی سنوایا جاتا ہے۔ یہ پروگرام گزشتہ تیس سال سے جاری ہے۔ مگر آج تک کسی غیر مسلم اردو شاعر کو اردو کے نمائندہ شاعر کے طور پر اس پروگرام میں پیش نہیں کیا گیا۔

آپ نے رگھوپتی سہائے فراق۔ جناب [illegible] پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی (مرحوم) [illegible] منشی چاند بہاری لال صبا جے پوری، [illegible] عقور لکھنوی (مرحوم)، منشی گوپی ناتھ امن [illegible] ملسیانی۔ منشی تلوک چند محروم (مرحوم)، رام پرکاش ساحر ہوشیارپوری۔ گوپال متل صاحب۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ امر چند قیس جالندھری۔ جناب ساحر [illegible] جناب بہار [illegible]، جگن ناتھ آزاد۔ [illegible] برج موہن دتاتریہ کیفی (مرحوم)، جناب آنند نرائن ملا کے اسمائے گرامی تو سنے ہی ہوں گے۔ اور یہ سب حضرات [illegible] کی کرپا سے ہندو ہیں۔ اور ان کی اردو شاعری کو حکومت نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح اگر آپ چاہیں تو ہم ایک صد اور ایسے ہندو شعرائے کرام کے اسمائے گرامی گنوائے جاسکتے ہیں۔ جن کی اردو شاعری اکثر ان مسلم شعرائے کہیں بہتر ہے جن مسلم شعراء کو اس ریڈیائی خصوصی پروگرام میں اردو کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے منتخب کیا جاتا رہا ہے۔ مگر کس قدر ماتم زدگی ہے کہ مندرجہ بالا اسمائے گرامی میں سے آج تک کبھی کسی اردو کے ہندو شاعر کو اس خصوصی پروگرام میں اردو شاعری کی نمائندگی کے طور پر منتخب نہیں کیا گیا۔

۲۔ آکاش وانی نے "اردو سروس" نام سے ایک خصوصی پروگرام جاری کر رکھا ہے۔ اس پروگرام کا اصل مقصد یہ ہے کہ خصوصی طور پر پاکستانی عوام کو یہ بتلایا جائے کہ ہندوستانی ریڈیو اردو سروس کے ذریعہ

[illegible] پروگرام نشر کرتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے
کہ اس پروگرام سے خود پاکستانی ریڈیو کے پروگرام
کہیں بہتر ہوتے ہیں۔ ان میں نعت بے شک بہت
ہی اچھے سنوائے جاتے ہیں۔ جناب علامہ ساحو
رام آرزو سہارن پوری نعت اور منقبت کہنے میں اپنا
ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "ظہورِ قدسی"
اور مناقبت کا مجموعہ "بہارستانِ اولیاء" یقیناً ایسے
مجموعے ہیں کہ ہند و پاکستان میں ان اصنافِ شاعری
پر ایسی کتابیں ملنا ناممکن ہے۔ ادارہ شانِ ہند اس
سے پہلے بھی اعلان کر چکا ہے کہ ان اصنافِ شاعری پر
ان دونوں مجموعوں سے بہتر مجموعے پیش کرنے والے
کو پانچ صد روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ پاکستان
کے روزنامے اور ہفت روزے سالم سالم صفحات پر
آرزو صاحب کی نعتیں اور مناقبت شائع کرکے خراجِ
تحسین پیش کرتے ہیں اور ہماری یہ اردو سروس ہے
کہ جس میں مبتدی شعرا کی نعتیں اور مناقب تو پیش
کی جاتی ہیں۔ مگر آج تک اس سروس کے ناخداؤں
کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی کہ ساحو رام آرزو
سہارن پوری یا کسی دوسرے ہندو شاعر کی نعت
یا منقبت اردو سروس میں پیش کرکے ہمارے پاکستانی
بھائیوں کو بتلاتے کہ ہندوستان کے غیر مسلم شعرا
حضور رسولِ اکرم اور اولیائے کرام سے عقیدت رکھتے
ہیں۔

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال پر ان کی یادگار
کے طور پر ایک شخص دانش نے آدھے گھنٹے کا پروگرام
"اردو مجلس" شروع کیا۔ یہ پروگرام جب تک
[illegible] صاحب کے ہاتھوں میں رہا تو پھر بھی
کسی حد تک مناسب تھا گو ہمیں حکومت کی پالیسی
[illegible] ہو گیا تو سے فیصد پروگرام مسلمان حضرات
[illegible] مگر وہ صاف جانتے [illegible] غیر مسلم
ادیبوں اور شاعروں میں بھی مقبول رہے۔ مگر جب سے
رفعت سروش صاحب کے ہاتھوں میں یہ پروگرام آیا
ہے۔ اول تو اردو مجلس "ہندی کا سماں" بن کر رہ گیا
ہے۔ اور اگر اعداد و شمار رفعت سروش صاحب
لکھ کر ہمیں بھجوا دیں کہ انہوں نے کس کس ہندو شاعر،
ادیب یا صحافی کو اس پروگرام میں مدعو کیا۔ تو ہم ان
اعداد و شمار کو قارئین "شانِ ہند" کے لیے شائع
کر دیں گے۔ تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ رفعت سروش
صاحب کس قدر مجبور ہیں کہ صرف اور صرف مسلمان
ادیبوں، شعرا اور صحافیوں کو ہی اس پروگرام میں بلایا جائے۔
جناب رام نرائن فکر تونسوی کو اگر کبھی کبھار پروگرام دیا
جاتا ہے۔ تو وہ اس لیے کہ اس وقت برصغیر ہند و پاک
میں فکر تونسوی اپنی نظیر آپ ہیں۔ اس کے علاوہ اردو
پروگراموں میں قطعاً نا اہل مسلم لڑکیوں کو کسی نہ کسی طرح
کس بیٹھکے انداز میں پروگرام دیے جاتے ہیں۔ اگر
اس کی وجوہ پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تو ہماری حق گوئی
ایسے ایسے رازِ درونِ پردہ کے انکشافات پر مجبور ہو جائے گی
کہ جسے شاید طبعِ سلیم پر گراں محسوس کیا جائے۔

یہ سب کچھ لکھنے کا خاص مقصد یہ ہے کہ اردو داں حضرات
یہ ذہن نشین کر لیں کہ حکومت اور مفاد اٹھانے والے
مسلم دانش ور اس کوشش میں ہیں کہ اردو کو صرف مسلمانوں
کی زبان قرار دے دیا جائے۔ اور یہ اردو کش پالیسی کتنی
خطرناک ہے کہ اگر اس کا مقابلہ ہم سب نے مل کر نہ کیا تو
[illegible] آگے چل کر اردو کا جو حال ہوگا اس کا اندازہ ابھی
سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس وقت جنتا پارٹی کی حکومت
بھی اردو کو کانگریس کی طرح مسلمانوں کے ووٹوں کے
حصول کے لیے مسلم دانشوروں کو لقمۂ تر دے کر اسی
پالیسی سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے جدا کرکے ووٹ
حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ اگر کچھ سالوں بعد
کانگریس اور جنتا ایسی سیاسی پارٹیوں کے ہاتھوں سے حکومت
جاتی رہے تو پھر جو بھی پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی اس کے
بارے میں ابھی سے سوچنا ہوگا کہ وہ "اردو" کے ساتھ کیسا سلوک

کیسے گی۔

اسی لئے وہ مسلمانوں، حکومت اور مفاد پرست مسلم دانشوروں کے جھانسے میں نہ آئے۔ اور اسے مجبور کر بھی تسلیم نہ کرنا کہ اُردو محض مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہر وہ مسلمان اور غیر مسلم جو اُردو کو ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا آئینہ دار سمجھتا ہے یقیناً اُردو پرست ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ کے ناخداؤں سے ایک اہم گزارش

نیشنل بک ٹرسٹ کی اُردو مطبوعات کی تقسیم کاری کے حقوق مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ہاتھوں میں ہیں۔ جس کا ہیڈ آفس جامعہ نگر میں ہے۔ باہر کے بک سیلرز جو دہلی میں کتابیں خریدنے آتے ہیں اُن کو جامعہ نگر جانے کی بجائے نیشنل بک ٹرسٹ کے صدر دفتر میں جانا زیادہ آسان ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مکتبہ جامعہ کی شاخ جامع مسجد اُردو بازار میں موجود ہے۔ بیرونی اور مقامی دوکاندار اس شاخ سے نیشنل بک ٹرسٹ کی مطبوعات خرید سکتے ہیں۔ مگر اس شاخ کی یہ حالت ہے کہ کبھی بھی پوری کتابیں یہاں سے دستیاب نہیں ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ کتابیں صدر دفتر میں موجود ہوتی ہیں مگر دوکاندار سے کہہ دیا جاتا ہے کہ کتاب ختم ہو گئی ہے۔
نیشنل بک ٹرسٹ پر جو روپیہ لگ رہا ہے وہ ہر ہندوستانی کا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ نیشنل بک ٹرسٹ صرف مکتبہ جامعہ کو ہی پچاس فیصدی کمیشن پر اُردو مطبوعات دیکر اسکی منافع خوری میں اضافہ کر رہا ہے کیونکہ مکتبہ جامعہ نیشنل بک ٹرسٹ کی کتابوں پر دوکانداروں کو صرف ۲۵ فیصدی کمیشن دیتا ہے جبکہ اُردو ترقی بورڈ نے اپنا سیل ڈپو کھول کر دوکانداروں کیلئے چالیس فیصدی کمیشن مقرر کر رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُردو ترقی بورڈ کی اُردو کتابوں کی فروختگی میں دن دن اضافہ ہو رہا ہے اور دوکاندار محض اس خیال سے کہ نیشنل بک ٹرسٹ کی اُردو مطبوعات پر مکتبہ جامعہ والے کمیشن کم دیتے ہیں۔ اور خود منافع خوری کا زیادہ کرتے ہیں۔ یہ کتابیں فروخت کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

حکومت جو کتابیں خود چھاپتی ہے اس کی قیمت لاگت سے دوگنا زیادہ رکھی جاتی ہے۔ اور اُسے بغیر کچھ کمائے فروخت کرنا ہی حکومت کا مقصد ہوتا ہے۔ اُردو ترقی بورڈ نے دس فیصدی اپنے سیل ڈپو کے اخراجات نکال کر باقی چالیس فیصدی کمیشن دوکانداروں کو دینا منظور کیا اور آج حالت یہ ہے کہ اُردو ترقی بورڈ کی کتابوں کی فروختگی میں کئی گنا زیادہ فرق آ گیا ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ نیشنل بک ٹرسٹ بھی اپنا سیل ڈپو کھول کر ہر دوکاندار کے لئے چالیس فیصدی کمیشن دینا منظور کرے اس سے یقیناً نیشنل بک ٹرسٹ کی کتابوں (اُردو) کی فروختگی موجودہ سیل سے کہیں زائد ہو جائے گی۔ نہ معلوم یہ سرکاری ادارہ مکتبہ جامعہ کو اپنی اُردو مطبوعات پر ۲۵ فیصدی منافع خوری کی اجازت دیکر اپنی مطبوعات کو ایک حد میں کیوں مقید کئے ہوئے ہے۔ کیا نیشنل بک ٹرسٹ کے ناخدا اس گزارش پر دھیان دیں گے۔

خضر برنی کی "علامگی"

دلی انتظامیہ سہ ماہی دلی شائع کرتا ہے اس کے تازہ شمارہ (اپریل تا جون ۱۹۷۸ء) میں علامہ خضر برنی کا کلام بلاغت نظام شائع ہوا ہے۔ چونکہ خضر برنی صاحب دلی ایڈمنسٹریشن کے درباری شاعر ہیں اور انہیں ڈھائی صد روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ اس لئے ان کا کلام "دلی" میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انہیں معاوضہ بھی صفِ اوّل کے شعراء کا دیا جاتا ہے۔ خضر برنی کا مقطع ہے۔

جام چھلکنے کا ماحصل خضرؔ ہے معلوم
چند لمحوں سے بغاوت کے سوا کچھ بھی نہیں

"دلی" کے ایڈیٹر صاحب یقیناً رموزِ شعر سے واقف نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں اُردو الفاظ کا صحیح تلفظ معلوم ہے مگر حیرت تو یہ ہے کہ خود خضر برنی بھی اس معاملے میں حماقت کی حد تک کورے ہیں۔ اور انہیں کسی حرف کے ساکن یا متحرک ہونے تک کا

علم نہیں۔ "دلی" ایک سرکاری آرگن ہے اور اس میں چھپنے والے مضامین کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے اور معاوضے کا یہ روپیہ دلی کے عوام کا ہوتا ہے اس لئے دلی پرساشن کا فرض ہے کہ وہ عوام کا روپیہ اس طرح برباد نہ کرے۔

ایڈیٹر "دلی" اور علامہ عنقریب کسی پڑھے لکھے ادیب یا شاعر سے اصل کے بارے میں دریافت کریں تو یقیناً اُن کی علمی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔

ایک مہمان ایک دوست (مضمون ہے آگے)

ایک کہانی "مسیحا ادار" نے بھی رام لعل کی ادبی شہرت کو چار چاند لگائے ہیں۔ یہ کہانی بھی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ ایک غریب سردار جو کام کی تلاش میں شہر آیا ہے اپنے جوتے کھو بیٹھتا ہے آخر وہ ایک جوڑا ایک گوردوارے سے چرا لانے کے ارادے سے وہاں پہنچتا ہے مگر دوسرے سیواداروں کو اتنی بے غرضی اور بے لوث خدمت کرتے لوگوں کے پاؤں میں بیٹھے دیکھ کر خود بھی ایک سیوادار (خدمت گار) بن جاتا ہے۔ یہ بہت ہی دل کو چھونے والی کہانی ہے۔

"نئی دھرتی پرانے گیت"

پاکستان سے آئے دو مہاجر خاندانوں کی کہانی ہے جن کے بیچ اپنی اپنی مصلحتوں اور اختلافات کی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں مگر اُن میں سے ایک گھر میں شادی کے موقع پر گائے جانے والے پرانے گیتوں نے نئی دھرتی پر بھی تمام دیواروں کو منٹوں میں ڈھا کر پھر سے اُن کے پرانے رشتوں کو استوار کر دیا ہے۔ کتنی سیدھی اور سمجھ آنے والی بات ہے مگر دیکھنے کے لئے رام لعل صاحب کی نظر چاہیئے۔ ان کے ایک افسانے "چتا" نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ایک بے وفا بیوی جس نے زندگی بھر خاوند کو بدنامی کے علاوہ خوشی کا کوئی پل نہیں دیا ہے۔ اب مر چکی ہے اور سامنے ہی اس کی چتا جل رہی ہے جب کبھی کوئی لکڑی آگ سے ادھر اُدھر باہر آ گرتی ہے تو قریب بیٹھا خاوند اسے چن کر پھر آگ میں ڈال دیتا ہے۔ یہ اس کی اندرونی کیفیت کی کتنی اچھی تصویر ہے کہ وہ ایک آوارہ اور بدچلن بیوی کا کوئی بھی ذرہ زندہ نہیں رہنے دینا چاہتا۔ پھر وہ حسب رواج کنوئیں پر نہانے آتا ہے تو وہاں ایک آدمی پہلے سے موجود کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچ رہا ہے۔ نہلانے کے لئے وہ اس پر پانی کا ڈول اٹھا کر پھر پے چھلکے۔ "پانی اور ڈالوں"

خاوند کہتا ہے۔ "ٹھنڈا تو بہت ہے پر نجانے کیوں اچھا لگ رہا ہے۔ ہاں اور ڈالو۔" میرا خیال ہے ایک بے وفا بیوی کے خاوند کی دلی حالت اور داخلی انتشار کا اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں تجزیہ کسی اور طریقے سے ہو ہی نہیں سکتا۔

ملبہ، کن گمبیرا، اماں اور دیوں اور ایسے افسانے ہیں جو ہماری زندگی کے آس پاس اس طرح بکھرے پڑے ہیں جیسے راستے کے کانٹے جنہیں اٹھانے کی بجائے ہم اُن سے دامن بچا کر کنی کاٹ کر ادھر اُدھر سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ سماج کے کوڑے کو ڈھانپ کر ہم خوش ہو لیتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ بہت ہی پاک صاف اور پوتر ہے۔ جب کوئی ادیب انگلی اشارہ کر دیتا ہے تو ہم اس کے قلم کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس پر مقدمے چلاتے ہیں۔ ہم اپنی ناکوں کے آس پاس خوشبوؤں کے پھوہے لگا کر اپنے ذہن کے دروازے اُن بدبوؤں پر بند کر لیتے ہیں۔ کچھوے کی طرح اپنے ہی خول میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں اور جب باہر نکلتے ہیں تو زمانہ قیامت کی چال سے بہت آگے جا چکا ہوتا ہے۔ پھر ہم اسی ادیب کو الزام دیتے ہیں کہ اُس نے اپنی ڈیوٹی ٹھیک سے نہیں نبھائی۔

میں اب زیادہ دیر رام لعل صاحب اور آپ کے درمیان دیوار نہیں بننا چاہتا۔ آپ کو بھی تو ان سے بہت کچھ سننا ہوگا۔ سنانا ہوگا، پوچھنا ہوگا۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

میرا مکان چاندنی محل میں تھا اور سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کا پھاٹک مفتی والاں میں جاتا ہی محل اور پھاٹک مفتی والاں میں بڑی مشکل سے ایک فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ اس لئے دن میں دو چار مرتبہ سردار صاحب کے ہاں جانا ہوتا تھا۔ ایک دن سردار صاحب کا ملازم شام کے وقت آیا۔ اور کہنے لگا کہ سردار صاحب نے کہا ہے کہ اسی وقت آجایئے بڑا ضروری کام ہے۔ تعمیلِ حکم میں ملازم کے ساتھ ہی ہو لیا۔ سردار صاحب اور ماسٹر امیر چند کھنہ مجھے دیکھتے ہی خلافِ معمول اُٹھ کھڑے ہوئے اور یک زبان ہو کر کہنے لگے، آیئے ڈائرکٹر صاحب۔ اس خلافِ معمول استقبال سے میں سمجھ گیا کہ کسی کو اُلّو بنانا ہوگا۔ دیکھا تو ایک سکھ نوجوان نے بھی مجھے بڑے احترام اور انکساری سے ست سری اکال کہا۔ مجھے بڑے احترام سے کرسی پیش کی گئی اور سردار صاحب نے چائے کا گلاس اور کریم کیریکر بسکٹ پیش کئے۔ اس اہتمام نے مجھے اور بھی یقین دلایا کہ معاملہ کافی دلچسپ ہے۔

چائے پینے کے بعد سردار صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا ڈائرکٹر صاحب آج کل بیرونی ممالک کے وزرائے اعظم اور مہمانانِ خصوصی اکثر نئی دہلی آرہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی سمادھی پر یہ بیرونی حضرات جب پھول مالائیں چڑھانے آتے ہیں تو انہیں یہ دکھانے کے لئے کہ ہندوستان مہاتما گاندھی کا غم کس شدت سے رو رو کر منا رہے ہیں۔ اور یہ رونے والے اُجرت پر رکھے جاتے ہیں۔ میں نے آپ کو تکلیف اس لئے دی ہے کہ ہمارے یہ سردار صاحب بے کار ہیں اگر آپ انہیں بھی ان اُجرت پر رونے والوں میں ملازم رکھ لیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔ میں نے بڑی مشکل سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے سردار صاحب سے کہا سردار صاحب اس نوجوان کو انٹرویو دینا ہوگا تب ہی اندازہ ہو سکے گا کہ یہ اس ڈیوٹی کے لئے فٹ ہیں بھی کہ نہیں۔ سردار صاحب نے بھی اپنی ہنسی کو نہ معلوم کس طرح ضبط میں رکھا اور کہا کہ وہ انٹرویو کیا ہوگا۔ گزارش کی گئی کہ وہاں تو ایسے پیشہ ورانہ قابلیت رکھنے والے لوگوں کی ضرورت ہے کہ جونہی کسی بیرونی ملک کے معزز مہمان کی کار راج گھاٹ پر کھڑی ہوئی اور ان رونے والے ملازمین نے رونا شروع کر دیا۔ اس لئے اگر یہ نوجوان ابھی ہم سب کے سامنے رو کر دکھا سکتا ہے تو سمجھئے کہ یہ ملازم ہو گئے۔ اب سردار صاحب نے قہقہوں اور سنجیدگی دونوں کا درمیانی راستہ اپناتے ہوئے اس سکھ نوجوان سے کہا کہ وہ رو کر دکھلائے۔ اس سکھ نوجوان نے اپنے خاندان میں سب مرنے والوں کو باری باری یاد کیا اور کئی بار اس کے چہرے پر رقت طاری ہونے کے بھی آثار نظر آئے مگر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوئے۔ نصف گھنٹے تک ہم سب بھی ماتمی فضا طاری کئے بیٹھے رہے مگر یہ سکھ نوجوان انٹرویو میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر طے پایا کہ اب دوسرے روز اس کے بارے میں کچھ سوچا جائے گا سردار صاحب نے ہم سب کو کھانا کھلایا اور رات کے دس بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔

دوسرے دن ہم سب پھر اکٹھے ہوئے سردار صاحب نے اس سکھ نوجوان سے کہا کہ دیکھو بھئی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے سفارش کر کے تمہیں کسی ملک میں ہندوستان کا سفیر بنوا سکتا ہوں مگر کسی بھی سفیر کیلئے

یہ ضروری ہے کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت ہونی چاہیئے اور وہ یہ اہلیت رکھتی ہو کہ وہ ایک سفیر کی بیوی ہونے کی حیثیت سے دوسرے ملک کی حکومت کے ممبروں سے بہت اچھے رکھ رکھاؤ کا برتاؤ کر سکے۔ اس پر اس سکھ لڑکے نے کہا کہ اس کی بیوی میٹرک پاس ہے مگر بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ اور وہ خود انگریزی روانی سے نہیں بول سکتا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ یہ امیدوار اس آسامی کے لئے بھی ان فٹ ہے۔

اگلے روز انٹرویو بورڈ میں مضطر ہاشمی (آل انڈیا ریڈیو) لالہ جگجیت لال ایڈووکیٹ کا اضافہ ہو چکا تھا اور اس سکھ نوجوان کا معاملہ بڑی شدّ و مد سے پیش ہوا۔ لالہ جگجیت لال ایڈووکیٹ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ وہ دہلی میں کس کے ہاں قیام پذیر ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بیچارا رات کو گوردوارہ سیس گنج میں سوتا ہے رات کا کھانا تو سردار صاحب کے ہاں کھا لیتا ہے اور دن کا کھانا کبھی گوردوارے سے ہی مل جاتا ہے اور کبھی یہ بازار سے کھا لیتا ہے اور اب اس کے پاس صرف ایک روپیہ باقی رہ گیا ہے۔ سردار دیوان سنگھ نے اپنے کیش بکس میں سے [illegible] کے ڈبے میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس سکھ نوجوان کو دیا کہ وہ اسے اپنے اخراجات میں لائے اور دن کا کھانا بھی سردار صاحب کے ہاں کھا لیا کرے۔ (حالانکہ سردار صاحب عام طور پر دن کا کھانا کھاتے ہی نہیں تھے مگر مہمانوں کو بازار سے منگا دیا کرتے تھے) سردار صاحب نے انتہائی سنجیدگی سے ممبران انٹرویو بورڈ سے کہا کہ اس نوجوان کے لئے کوئی موزوں ملازمت کا جلد از جلد انتظام کیا جائے۔ اس پر مضطر ہاشمی نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا سردار جی آپ اتنے بڑے اخبار کے ایڈیٹر ہیں آپ سے ساری حکومت کانپتی ہے۔ مگر آپ نے کبھی سکھوں کے حقوق کا خیال ہی نہیں کیا۔ کیا وجہ ہے کہ اگر ہندوستان کا وزیر اعظم ہندو ہے تو پریذیڈنٹ سکھ کیوں نہ ہو لہٰذا اس نوجوان کو ہندوستان کا پریذیڈنٹ بنایا جائے اور محترم ڈاکٹر راجندر پرشاد سے گزارش کی جائے کہ وہ گاندھی جی کے پیروکار ہونے کی حیثیت سے از خود صدر کے عہدہ جلیلہ کو چھوڑ کر صداقت آشرم پٹنہ تشریف لے جائیں اور اپنی جگہ ان سردار صاحب کو ہندوستان کا صدر "نامزد" کر دیں۔ ہاشمی کی تجویز بڑی زوردار اور اس سلسلہ کو کئی دنوں تک جاری رکھنے میں بات ہو سکتی تھی لہٰذا ہم سب نے اس تجویز کی پسندیدگی پر تالیاں بجائیں اور کھانا کھانے کے بعد دوسرے دن شام کو پھر اکٹھے ہونے کا پروگرام بنا کر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اگلی شام کو ایرانین ایمبیسی کے مرزا صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ ممتاز مرزا بھی شریک محفل ہوئے اور اس سکھ نوجوان کو ہندوستان کا صدر بنانے کی تجویز پر بڑی شدّ و مد سے غور ہوا۔ سردار صاحب نے کئی بار اس نوجوان سے کہا کہ دیکھو پریذیڈنٹ بن جانے کے بعد ہم کو بھول جاؤ گے دنیا بڑی مطلب پرست ہے مطلب نکل جانے کے بعد تم بھی ہم کو نہیں پوچھو گے اور یہ نوجوان ہاتھ جوڑ کر بار بار کہتا نہیں جی میں تمہارا داس رہوں گا۔ بہرکیف دو چار دنوں کے بعد ایک درخواست کا مسودہ تیار کیا گیا۔ درخواست کیا تھی صدر مملکت کو کرسی صدارت خالی کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا تاکہ ان کی جگہ ایک بہتر صدر ہندوستان کو مل سکے جو ملک کی خدمت بہتر انداز میں کر سکے۔ یہ محضر نامہ جس پر ہم سب کے دستخط ثبت تھے لفافہ میں بند کر کے میرے حوالے کیا گیا کہ صبح بذریعہ رجسٹری صدر مملکت کے نام بھجوا دیا جائے۔ میں نے یہ محضر نامہ تو سپرد آتش کیا اور دوسری شام ڈاکخانہ کی ایک رسید جو کسی دوسرے رجسٹرڈ لیٹر کی تھی حاضرین محفل کو دکھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ ایک ہفتہ تک ہر روز اس سکھ نوجوان کی حماقتوں سے لطف اندوز

ہونے کے بعد ایک ٹائپ شدہ خط (جو سردار صاحب نے اپنے ٹائپسٹ سے ٹائپ کرایا تھا) ممبران انٹرویو بورڈ کو دکھایا گیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ آپ کا اپائنٹمنٹ میمورنڈم موصول ہوا مگر افسوس ہے کہ اس پر عمل کرنا میرے حیطۂ اختیار میں نہیں ہے۔ چند منٹ اس خط پر ہر ممبر نے اظہار ناراضگی کیا اور اس سکھ نوجوان ایسے موزوں اور مناسب امیدوارِ صدارت کی حق تلفی پر اظہارِ افسوس کرنے کے بعد پھر غور و خوض شروع ہوا اور یہ طے پایا کہ اس نوجوان کے لئے کسی ملک کی سفارت ہی موزوں رہے گی اگر یہ اپنے حلیے کو ٹھیک کرے۔ اور بن ٹھن کر رہے اور کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرلے تو سفارت کا ملنا کوئی مشکل نہیں رہے گا۔ دوسری شام کو ہم تو موجود تھے مگر یہ سکھ نوجوان غیر حاضر تھا۔ اور اس کی غیر حاضری کئی دنوں تک مسلسل رہی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ اسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے لہٰذا وہ یا تو اپنے گاؤں چلا گیا ہے اور یا کہیں چھوٹی موٹی نوکری کرلی ہوگی۔ مگر تین ہفتوں بعد ہم نے دیکھا کہ شام کے وقت ایک نوجوان بہترین سوٹ میں ملبوس اوپر آیا تو سردار صاحب نے غصے سے کہا کہ نیچے ٹھہرو تم بغیر اجازت کیسے اوپر آگئے۔ تو نوجوان مسکرایا اور کہنے لگا آہو جی تسیں سانوں کیوں پہچانو گے۔ اس کی آواز سے ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ تم اتنے دن کہاں تھے اور تم نے یہ کیا کیا ہے۔ کیونکہ یہ نوجوان بال اور ڈاڑھی صفا کرکے کلین شیو تھا۔ اور سوٹ میں واقعی آدمی۔۔۔ نظر آرہا تھا۔ ہم سب دم بخود ہوگئے کہ اس نے یہ کیا کیا ہے۔ ماسٹر امیر چند کھنہ فرمانے لگے دیوان سنگھ تم دیکھ لینا کہ تمہارے دروازے پر گوردوارہ پربندھک کمیٹی والے دھرنا دیں گے کہ تیری وجہ سے ایک سکھ پتت ہو گیا ہے۔ مگر دیوان سنگھ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اُستاد تو واقعی گریٹ ہے۔ اور تجھے سفیر نہ بنانا ہندوستان کی بدقسمتی ہے۔ اچھا اب یہ بتا کہ کسی خوبصورت لڑکی سے تم نے شادی بھی کی ہے یا نہیں۔ اس پر یہ نوجوان سنجیدہ ہو کر کہنے لگا میں نے کوشش تو کی مگر میرے سالے اور سسر نے کہا ہے کہ اگر تو نے دوسری شادی کی تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے خیر یہ شام تو اس نوجوان سے بات چیت میں ہی کٹ گئی اور دوسری شام کو پھر اس مسئلہ پر غور کرنا ملتوی کیا گیا۔

دوسرے دن ہم سب تو وقت مقررہ ۷ بجے شام کو سردار صاحب کے ہاں پہنچے مگر یہ نوجوان پانچ بجے کے بعد ہی سردار صاحب کے در دولت پر حاضر ہو گیا تو اتفاق سے بیگم شاہدہ نکہت سردار صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائی ہوئی تھیں۔ چپڑاسی نے اس نوجوان کو نیچے برآمدے میں بٹھا دیا جب بیگم صاحبہ واپس جانے کے لئے نیچے آئیں تو انہوں نے ایک بھرپور نظر اس نوجوان پر بھی ڈالی۔ کچھ دیر بعد سردار صاحب نے چپڑاسی کو آواز دیکر کہا کہ اس نوجوان کو اوپر بھیج دے۔ دو چار اِدھر اُدھر کے کام سردار صاحب نے اس نوجوان کو بتائے اور جونہی ماسٹر امیر چند کھنہ، میں اور مضطر ہاشمی سردار صاحب کے ہاں پہنچے تو انہوں نے ہم سب کو تمام واقعہ سنایا کہ انہوں نے بیگم شاہدہ نکہت سے کہہ دیا تھا کہ نیچے جاتے ہوئے برآمدے میں بیٹھے نوجوان کو کچھ ایسی نگاہِ ناز سے دیکھیں کہ اس کو حماقت کی آخری حدوں تک غلط فہمی ہو جائے۔ چند منٹ بعد یہ نوجوان بھی سردار صاحب کے کام کرکے واپس آگیا سردار صاحب گوشت بھونتے بھونتے فرمانے لگے کہ صاحبان میں نے آج اس لڑکے کی سب سے بڑی پرابلم حل کردی ہے اور تفصیل بتاتے ہوئے فرمانے لگے کہ آج بیگم شاہدہ نکہت تشریف لائی تھیں تو میں نے ان سے کہا کہ ایک بہت ہی خوبصورت اور نوجوان لڑکا نیچے برآمدہ میں بیٹھا ہے اسے ذرا بہت جلد [illegible] لا ہے لہٰذا

اگر تم اس سے شادی کر لو تو مزے میں رہو گی۔ تم نیچے جاتے ہوئے برآمدہ میں لڑکے کو دیکھتی جانا اور اگر یہ تجویز پسند ہو اور لڑکا بھی پسند ہو تو فون کر دینا تاکہ شام کو میں لڑکے سے بات پکی کر دوں۔

یہ سُننا تھا کہ اس لڑکے کے دل و دماغ میں زلزلہ آ گیا۔ بیگم صاحبہ نے واقعی جاتے ہوئے عجب انداز سے دیکھا تھا اور اس زمانے میں تو بڑے بڑے دانش ور یہ حسرت دلوں میں دبائے پھرتے تھے کہ بیگم صاحبہ ایک بار انہیں پلک اُٹھا کر دیکھ ہی لیں تاکہ ان بیچاروں کی عاقبت سدھر جائے چہ جائیکہ بیگم صاحبہ نے نگاہِ غلط انداز کا بھرپور وار اس نوجوان پر کیا تھا۔ خوشی کی فراوانی سے لُکنت زدہ لہجہ میں یہ نوجوان کہنے لگا مہاراج جے اوبی بی میرے نال ویاہ کرن نوں تیار ہو دے تاں میں پنڈ جا کے اپنے حصے دی زمین ویچ کے دھوم دھام نال آنند کارج کراں گا۔ سردار صاحب گوشت پکاتے پکاتے کبھی ملازم کو کسی فروگذاشت پر بھاری بھرکم گالی دیتے تو کبھی اس نوجوان کو کوئی چیز لانے کے بہانے نیچے بھیج کر ہم سب سے کہتے کہ اس مذاق کا انجام کیا ہو گا۔ نیز اس سٹوری کو آگے کس طرح بڑھایا جائے۔ سردار صاحب اس مذاق کے THE END کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی سردار صاحب نے ریسور اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ فون بیگم صاحبہ کا ہے۔ اور انہوں نے قہقہوں کی بارش میں اس نوجوان سے شادی کرنا منظور فرمایا تھا۔ بس پھر کیا تھا سب نے اس نوجوان کو مبارکباد دی سردار صاحب نے پانچ روپیہ کا نوٹ ڈبے سے نکال کر اس نوجوان کو دیا کہ مٹھائی لا کر بانٹے۔ رات کا کھانا کھا کر خوشی خوشی ہم سب اپنے اپنے گھروں کو اور نوجوان گوردوارہ سیس گنج کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک شادی کی تیاریوں کی بات چیت چلتی رہی کہ انتظامات کی ذمہ داری کون لے۔ شادی کے اخراجات کا اندازہ کئی ہزار روپیہ کا تھا۔ اور یہ تخمینہ ایسا تھا کہ اس نوجوان کے اپنے حصے کی تو کیا اگر وہ اپنے خاندان کی بھی زمین فروخت کرے تو بھی کم رہے۔

سردار صاحب کا ملازم ریاست بہاول پور کا ایک شرنارتھی تھا وہ یہ ڈرامہ روزانہ دیکھتا تھا۔ ایک دن اس نے اس نوجوان کو رازدارانہ انداز میں بتایا کہ تجھے بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ نہ معلوم کتنے بے وقوفوں کو یہاں ایمبسڈر۔ صدر اور نائب صدر بنایا گیا ہے۔ تم یا تو اپنے گاؤں لوٹ جاؤ یا کہیں نوکری کر لو۔ ایک دن صبح سویرے یہ نوجوان میرے مکان پر آیا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگا سردار صاحب سچ سچ بتا کہ میرے ساتھ مذاق ہو رہا ہے یا واقعی میری شادی اس بی بی کے ساتھ ہو جائے گی اور میں ایمبسڈر بن جاؤں گا۔ میں نے اُسے بڑے پیار سے کرسی پر بٹھایا بیوی سے چائے لانے کو کہا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں یہ شک کیوں کر ہوا ہے تو اس نے بتایا کہ سردار صاحب کے نوکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میری بیوی بھی اس کی باتیں سُن کر مسکرا رہی تھی میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آج شام کو اس سلسلہ میں سردار صاحب کے نوکر کے سامنے سب باتیں ہوں گی۔ شام کو میں نے "ریاست کلب" کے جملہ اعزازی اراکین کے سامنے یہ معاملہ رکھا تو سردار صاحب نے اپنے ملازم کو ایسی ایسی گالیاں دیں کہ لغات میں ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکیں گی! اور پھر قہقہوں کا سیلاب تھا کہ تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔ اب جب یہ معاملہ ختم ہی ہو گیا تھا تو سردار صاحب نے اس نوجوان کو سردار سردول سنگھ کویشر کے ہاں ملازم کرا دیا۔ اور ہم لوگ کسی نئے شکار کا انتظار کرنے لگے۔

"ایک مہمان ایک دوست"

ہرچرن چاولہ

(ادبی سنگت۔ اوسلو (ناروے) میں ۱۸ ستمبر ۱۹۸۱ء کو پڑھا گیا)

یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ آج اُردو اور ہندی کے عظیم ادیب جناب رام لعل صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان سے میری دوستی عرصہ بیس سال پُرانی ہے مگر میری ان سے واقفیت کی عمر دوستی کی عمر سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ ایک مشہور و مقبول ادیب کی واقفیت کی حدیں دوستی سے کہیں آگے بڑی اور پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ آپ میں سے تقریباً سب چاہے ان کے دوست ہوں یا نہ ہوں ان سے، اور ان کے قلم سے واقف ضرور ہیں۔ ادیب کے قلم کی شہرت پر نہ سرحدیں اور نہ ہی جگلیں اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ خوشبوؤں کو کون باندھ سکا ہے۔ خود ادیب بھی ایک فاتح کی طرح اپنی مقبولیت کی سرحدوں کو بڑھاتا ہی رہتا ہے۔

رام لعل صاحب نے میدان افسانہ نگاری میں تب قدم رکھا تھا جب کرشن، بیدی اور منٹو جیسے بڑے بڑے قلم کار ان کے آگے آگے دوڑ رہے تھے۔ تب چاہے رام لعل صاحب کے قدم آہستہ رہے ہوں مگر قلم پر جوانی آتے ہی وہ ان سے آگے نکل گئے۔ میں رام لعل صاحب کا ان تین بڑوں سے موازنہ نہیں کر رہا ہوں۔ اُن بڑوں کی قلم کی جولانیاں تسلیم مگر جب وہ تھک چکے تھے تو رام لعل جوان ہو رہے تھے اس لئے رام لعل نے اُن دنوں بہت سے قابل توجہ، قابلِ ذکر اور چونکانے والے افسانے لکھے جن کو خود انِ ادیبوں اور نقادوں نے لبیک کہا اور تسلیم کیا۔

رام لعل نے میانوالی، جو کہ اب پاکستان کا ایک ضلعی شہر ہے میں سنہ ۱۹۲۳ء جنم لیا۔ پروفیسر تلوک چند محروم کے متعلق سر عبدالقادر نے لکھا تھا کہ میں حیران ہوں کہ میانوالی کے ریگستانوں نے ایک ایسا خوشبودار پھول بھی پیدا کیا۔ یہ دوسرا پھول بھی اُن ہی ریگستانوں کی پیداوار ہے جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ کے گلستانوں میں بھی اپنی ایک الگ پہچان اور مقام بنا چکی ہے اور اب یہ خوشبو برصغیر کی حدیں پھلانگ کر سات سمندر پار ادھر بھی آ پہنچی ہے۔ آج لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا رام لعل کی کتابیں اوسلو لائبریری میں دستیاب ہیں۔

رام لعل یہاں کے کئی ادیبوں سے بھی مل چکے ہیں۔ ان کے انٹرویو بھی لے چکے ہیں۔ انہوں نے بھی رام لعل صاحب کے اتنے SHORT STAY کے دوران میں بھی اِن سے بہت کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ روزنامہ "آربائیڈر بلادے" نے ان کے آنے کے ساتویں دن ہی ان کا انٹرویو چھاپ دیا تھا۔ پھر ان کے پہلے دس دن کے ناروے کے بارے میں تاثرات کو بھی اسی اخبار نے پانچ اقساط میں شائع کیا۔ اب عنقریب ان کا ایک انٹرویو "آفتن پوستن" میں آنے والا ہے۔

اسی ماہ کی ۲۱، ۲۲، اور ۲۳، ۲۴ تواریخ کو یہاں کی رائٹرز ایسوسی ایشن نے انہیں خاص طور پر مدعو کر کے اپنے "ادب میں اظہار کی آزادی" پر ہونے والے سیمینار میں شرکت کرنے، مضمون پڑھنے اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہاں کے ادیبوں کی انجمن نے انہیں ایک قابل قدر اور قابل ذکر مالی امداد بھی دی ہے مگر اپنے جو اُردو کے نام پر بڑے بڑے فائدے اٹھا رہے ہیں ایک اردو ادیب کے معاملے میں گہری نیند میں گم ہیں۔ خیر چھوڑیئے اس ذکر کو۔ رام لعل

یہاں اپنوں کے جنگل میں اکیلے ہی ہم کچھ لوگ انہیں اکیلا یا بے سہارا محسوس نہیں ہونے دیں گے۔

میں رام لعل صاحب کے بارے میں عرض کر رہا تھا رام لعل ایک متوسط طبقے کے فرد ہیں۔ انہوں نے اس طبقے کو دفتروں، ریلوے پلیٹ فارموں، گھروں، سڑکوں اور گلیوں میں اپنے آس پاس اور کافی قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ان کے ساتھ اُٹھے بیٹھے اور رہے ہیں۔ اس لئے اپنے افسانوں کا مواد انہوں نے ان ہی لوگوں کی زندگیوں سے حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ایک شہری پاکستان کا۔ ملبہ۔ چتا۔ نئی دھرتی پرانے گیت۔ اوسی۔ تیرے بچے جیتے رہیں۔ غریب پرور اماں۔ داماد۔ سیوادار وغیرہ ایک عام قاری کو خود اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوتے ہیں۔ خود اپنے آس پاس ہانپتے کانپتے، محنت کا پسینہ بہاتے اور سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ آزادی کے بعد لکھنے والوں کی ایک کھیپ کی کھیپ سامنے آئی تھی۔ انہوں نے کچھ اچھے افسانے تخلیق کر کے اپنی طرف متوجہ بھی کیا تھا مگر ان میں سے کئی جلد ہی تھک کر گوشۂ گمنامی میں چلے گئے مگر رام لعل صاحب کی لکھنے اور پڑھتے رہنے کی رفتار بدستور قائم رہی۔ اب بھی لکھنے لکھانے کے معاملے میں وہ نوجوانوں سے زیادہ تازہ دم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہند و پاک کا ہر ادبی رسالہ اپنے سیپ میں رام لعل جیسے دُرِ آبدار بھی ضرور لئے ہوتا ہے۔

میں نے رام لعل صاحب کو کسی نئے لکھنے والے کا راستہ روکتے کبھی نہیں دیکھا بلکہ ہر نئے ادیب کی حوصلہ افزائی ہمیشہ انہوں نے اپنا شعار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ڈاک میں ان سے سینئر ادبا کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کے خطوط بھی کسی طرح تعداد میں کم نہیں ہوتے۔ رام لعل ہر نئے ادیب کے خط کا جواب ضرور دیتے ہیں اور کوئی رائے پوچھے تو اسے مخلص رائے سے بھی کسی کو محروم نہیں رکھتے۔ اکثر یہ نفیس نفیس بھی لوگوں تک پہنچتے اور انہیں مل کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کے بعد ایوانِ اُردو ادب میں اندھیرا نہ ہو۔ اُجالا رہے۔

آج کے کئی اُردو ادیب، جنہوں نے رام لعل کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ کبھی کبھی تھکے ہوئے محسوس ہوتے ہیں تب رام لعل کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھ کر حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا افسانوں کے بعد کچھ لوگوں نے کہا اور خود رام لعل کے افسانوں نے بھی یہی تاثر دیا کہ رام لعل عورت کے بدن کے بہترین ثابت ہو رہے ہیں لیکن ہم اگر محبوبہ کے علاوہ عورت کے دوسرے رُوپ ماں، بہن، بیٹی، بیوی کو اپنے سماجی ڈھانچے کے شیشے سے دیکھیں تو ہمیں عورت کے بدن کے جنگل میں بے شمار خار دار جھاڑ جھنکار ملیں گے جو خود ہمارے ساتھ زندگی بسر کرنے والی ہماری قریب ترین عورت بیوی کو بھی ہم تک نہیں پہنچنے دیتے۔ تب یہ مشکل کام ادیب اپنے سر لے کر قاری کو بتاتا ہے کہ تمہارے اپنے گھر کا چین اور دل کا قرار ان حدود میں ہی قید ہے۔ اب اسے کوئی کیسا نام دے یہ خود پڑھنے والے کی اپنی سوچوں پر منحصر ہے کہ وہ نسخے کی کن حدوں تک ادیب کے ساتھ چل پاتا ہے۔ یہی چیز غالب کے ساتھ گذرتی رہی ہے۔ ناروے کا مشہور معروف ادیب اور ڈرامہ نگار ہنرک ابسن بھی کئی بار اپنے وقتوں میں خود اپنے ہی تار دیکھیں لوگوں کو نہیں سمجھا جا سکا اور وہی ڈرامے جو اس کے وقت میں BAN ہوئے اب بڑے فخر سے دکھلائے جاتے ہیں۔

کچھ وقت پہلے بیچ میں اُردو ادب اور خاص طور پر افسانوی ادب پر جمود کا شور اُٹھا تھا۔ میرا خیال ہے ان ہی دنوں رام لعل صاحب نے کافی اچھے اور قابلِ ذکر افسانے تخلیق کر کے ثابت کر دیا کہ زمانے میں حالات اور واقعات ضرور بدلتے رہتے ہیں مگر ادب کا

دھارا رک نہیں جاتا۔ یہ نہیں کہ ہندوستان کی آزادی کی جنگ جاری ہے تو ادب بھی ضرورت کے مطابق سکھوں کی طرح دبا دب ڈھالا جا رہا ہے۔ یہ مشکلات صرف ان لوگوں کو درپیش آتی ہیں جو اپنی کشتی دریا کے ایک ہی دھارے پر چلانے کے عادی رہے ہوں مگر دریا نے جب کبھی اپنا رُخ بدلا ہو یا موڑ کاٹا ہو تو بوکھلا کر اور گھبرا کر انہوں نے اپنے ہاتھ چپوؤں سے اٹھا لئے ہوں اور کشتی اور اس کے سواروں کو خدا پر چھوڑ دیا ہو۔

رام لعل کے ہاں شروع شروع میں ریلوے انجن کی چھک چھک اور سٹیشنوں کا ہلہ گلہ، مختلف تہذیبی اتصال کا سنگم ہی ان کی تخلیقات کی مٹی رہا ہے جس سے انہوں نے بڑے ہی خوبصورت تاج محل بنائے ہیں۔ ریلوے رام لعل کے لئے ایسی وسیع و عریض دنیا و استگئے بیٹھی رہی ہے کہ تب ان کے افسانوں کو پڑھ کر لگتا تھا جیسے جو کچھ ریلوے یارڈ کے بارے سمجھا ہے وہی کچھ ساری دنیا کی سچائی کا بھی عکس ہے۔ ریلوے رام لعل کے سامنے یوں وا رہی ہے جیسے پریم چند کے سامنے بیلوں کی جوڑی، کرشن چندر کے سامنے کشمیر، منٹو کے سامنے کسبی عورتیں اور تھامس ہارڈی کے سامنے WESSEX۔

اُن دنوں رام لعل پر کچھ کارٹون ایسے بنائے جانے لگے تھے۔ جیسے پلیٹ فارم پر کھڑے رام لعل اور جاتی ہوئی ٹرین کی لال بتی۔ سگنل پر بیٹھے رام لعل اور نیچے لائنوں پر دھڑ دھڑاتی اور گذرتی ہوئی گاڑیاں۔ تب رام لعل کے بارے کہا جاتا تھا کوئی بھی ان کا ذکر آتے ہی "ارے بھئی وہی رام لعل جن کا ہر افسانہ ریلوے پلیٹ فارم سے شروع ہوتا ہے۔"

آگے چل کر رام لعل نے یہ ثابت کر دیا کہ زندگی کی سب سے بڑی علامت ہی ریلوے انجن کی سیٹی ہے اور اس میں شک کی گنجائش ہی کہاں ہے۔

آپ کسی آدم خوروں سے بھرے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے کسی انسان کا تصور کیجئے اور اُسے پھر دور کسی ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز سنا دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ اس مردہ اور زندگی سے مایوس انسان کی ٹانگوں میں کتنی پھرتی اور آنکھوں میں زندگی کی چمک پیدا ہوتی ہے اور کس طرح ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ وہ زندگی کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ یہ بھی رام لعل صاحب کے ایک افسانے کا ہی پلاٹ تھا۔ جو میں نے بیان کیا ہے۔

جب ریلوے اور رام لعل کو لازم اور ملزوم کہا جا رہا تھا۔ اُن ہی دنوں ایک لطیفہ بھی ہوا۔

خواجہ احمد عباس۔ ساحر لدھیانوی۔ کرشن چندر۔ رام لعل اور کچھ دوسرے ادیب بہار میں آئے طوفان اور طغیانیوں سے تباہ شدہ لوگوں کے لئے جب جگہ جگہ، شہر شہر گھوم کر PRIME MINISTER DRAUGHT RELIEF FUND اکٹھا کر رہے تھے۔ تب جب یہ چاروں ادیب کسی سٹیشن پر چائے پینے کے لئے REFRESHMENT ROOM میں پہنچے تو عباس ساحر اور کرشن آپس میں باتیں کرنے کھڑے ہو گئے مگر رام لعل پیاسے تھے۔ اس لئے انہوں نے جا کر ایک میز پر پڑے پانی سے بھرے تین چار گلاس یکے بعد دیگرے پی گئے۔ اسی بیچ خواجہ احمد عباس نے انہیں اپنے درمیان نہ پا کر کرشن چندر سے پوچھا۔ "ارے بھائی۔ رام لعل کہاں گئے۔"؟ کرشن چندر نے دور پانی کا چوتھا گلاس پیتے ہوئے رام لعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انجن پانی لے رہا ہے۔"

رام لعل صاحب کے ادب۔ افسانوں اور تخلیقات پر کافی بحثیں ہوئی ہیں۔ کافی شور بھی مچا ہے۔ خود انہیں بھی میرا جی کی طرح لوگوں کو چھیڑنے میں مزہ آتا رہا ہے۔ اس طرح انہوں نے تنقید نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور انہیں مجبور کیا ہے کہ بھلے لوگو، آواز تو پہچانو۔"

وقت نے ان کی الگ پہچان کی ہے۔ خود انہوں نے
مضامین بھی لکھے ہیں۔ رسالے بھی نکالے ہیں۔ افسانے
بھی انتخاب کیے ہیں۔ آگے آنے کے حقداروں کو آگے
بھی کیا ہے مگر لوگوں کی [illegible] برداشت
نہیں کیا۔ منٹو نے ایک [illegible] جیسے [illegible]
گالی دیں مگر ڈھنگ [illegible] ڈھنگ
چیز پسند نہیں تھی۔ رام لعل [illegible]
ہے۔ سونے والوں سے ڈھنگ کی چیز کی بھی امید نہیں
کی جاسکتی۔ اور ڈھنگ کی چیزوں کی پہچان کیلئے
بے ڈھنگ چیزوں کا وجود ضروری ہے۔ سفید چاک
کی لکھائی بلیک بورڈ پر صاف اور نکھر کر آسکتی ہے
رام لعل صاحب نے تقریباً ۲۵ کتابیں لکھی ہیں۔
جن سے شاید سترہ یا اٹھارہ افسانوی مجموعے ہیں۔
ان میں سے چھ افسانوی مجموعے اور ایک ناول اب
یہاں کی بڑی لائبریری میں مل سکیں گے۔ اگر مل سکے
تو باقی بھی منگوانے کی کوشش کی جائے گی۔ آئیے اب
ان کے خاص خاص افسانوں کا بھی ایک طائرانہ نظر
سے جائزہ لے لیں۔

ان کا بہت ہی بڑا افسانہ "[illegible]"
(OFFICER COACH) جو ادبی محفلوں کا
اکثر موضوع رہا ہے۔ ایک ریلوے آفیسر بلکہ
بابو ازم کی کالی پیٹھ کو قلم کی نوک سے ننگا کرنے والا
ایک بہت ہی چبھتا ہوا طنز ہے۔ آفیسر مذکور کی
خالی کوچ ایک چھوٹے سے سٹیشن پر آکر جب
رکتی ہے تو سٹیشن کی زندگی میں جھیل میں پڑنے
والے پتھر کی طرح ہل چل پیدا کر دیتی ہے۔ کچھ ملازمین
کو اپنی تکالیف آفسر تک پہنچانی ہیں۔ کچھ کے اپنے
دفتری دکھڑے ہیں۔ کچھ کے پاس دوسروں کی
شکایتیں ہیں۔ کچھ خوشامدی بھی آگے بڑھ رہے ہیں۔
ان میں سٹیشن ماسٹر سب سے آگے ہے۔ اسی
بیچ میں سے ایک بچہ باہر آتا ہے۔ سٹیشن ماسٹر
اُسے گود میں اُٹھا لیتا ہے۔ سٹال سے بسکٹوں کا پیکٹ
دلاتا ہے اور صاحب کے باہر آنے کے انتظار میں اُسے
گود میں لیے لیے پھرتا ہے تاکہ جب وہ باہر آئیں تو اپنے
بچے کو ان کی گود میں بسکٹ کھاتا دیکھیں مگر بہت دیر
بعد جب ایک چپڑاسی کوچ سے باہر آکر بتاتا ہے کہ
صاحب تو میل ٹرین سے آگے اپنے گھر چلے گئے ہیں
اور ۷۵ یہاں صرف بھتہ بنانے کے لئے رکی گئی ہے
تو سٹیشن ماسٹر اور دوسرے اسٹاف کو بہت بڑا
شاک لگتا ہے اور قاری کو بھی مگر اس سے بڑا شاک
رام لعل کے پاس ایک اور چیز میں موجود ہے۔
سٹیشن ماسٹر چپڑاسی سے پوچھتا ہے۔ "شاید
صاحب چلے گئے مگر بچے یہاں اوسی میں چھوڑ گئے
ہیں۔" تو جواب ملتا ہے "حضور آپ کی گود میں آپ
ہی کا بچہ ہے۔"

ظاہر ہے۔ یہ بچہ اسی چپڑاسی کا ہے۔
اس کہانی نے ہوسکتا ہے ان کے کئی ریلوے
افسروں کو ان سے ناراض کیا ہو۔ مگر ادب میں ان کی
خاص جگہ بنائی ہے۔ یہ کہانی جرمن، رشین اور
ہندوستان کی تقریباً سب زبانوں میں ترجمہ ہو کر
شائع ہو چکی ہے۔

"ایک شہری پاکستان کا۔"

ایک پاکستانی شہری کی کہانی ہے جو بڑی مشکل سے
تلاش کرتا ہوا اپنی بیوی تک ہندوستان پہنچا ہے۔
یہ شاک پانے کے لئے کہ وہ اب اس کے ہی ایک
رقیب کی بیوی اور دو بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ پاکستانی
شہری واپس اپنے وطن لوٹ جاتا ہے مگر اس موضوع
کو لکھنے کے لئے چننا اور اس پر قلم اٹھانا بڑے
دل گردے کا کام ہے۔ یہ بہت تپتے ہوئے موضوع
ہیں۔ ان کے لکھنے سے انگلیاں اور پڑھنے سے ذہن
جل اُٹھتے ہیں مگر لکھنے والوں نے ذہن اور ہاتھوں کی
جلن کو نہیں دیکھا حقائق کو مدنظر رکھا ہے۔ (باقی صفحہ [illegible])

مُشاعرہ لال قلعہ جشنِ جمہوریت

کرمی الاحسانی

۲۴ جنوری کا سُنتے ہی معاً نظریں اور دل ودماغ لال قلعہ کے مشاعرہ کی طرف لوٹ جاتا ہے یار لوگ اب ۲۴ جنوری کے ذکر پر مسکرا دیتے ہیں یہ اُردو کی بدقسمتی ہے کہ ہر سال حکومت لال قلعہ میں ایک عظیم مشاعرہ منعقد کرانے پر زرِ کثیر صرف کرتی ہے لیکن وہ ہر سال بُری طرح سے ناکام ہو کر رہ جاتا ہے یہ ضرور ہے کہ امسال یہ مشاعرہ سیاست کی لپیٹ میں کم آیا پھر بھی مجموعی طور پر اس مشاعرہ کو نمائندہ یا آل انڈیا مشاعرہ نہیں کہا جا سکتا گذشتہ سال کی طرح گو اس مشاعرہ میں وہ ہلڑ بازی نہیں تھی پھر بھی ایک مرحلہ پر جناب ملک زادہ منظور صاحب نے تالیوں سیٹیوں اور ہلڑ بازی پر صحیح فرمایا:-

"جب مشاعرہ کا آغاز ہوا تو میں سمجھ رہا
تھا کہ زرہ دلان دلی ابھی نہیں آئے
لیکن اب محسوس کر رہا ہوں حالانکہ آپ
سُن اور دیکھ بھی رہے ہیں کہ اب
آگئے ہیں۔"

اب آپ اس بات ہی سے اندازہ فرمالیجئے کہ مشاعرہ کیسا رہا ہوگا کیونکہ ع

ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

ہمارے لئے یہ بات باعثِ شرم وندامت ہے کہ پاکستان کے ہائی کمشنر کی موجودگی میں یار لوگ ہلڑ بازی کرتے رہے کم از کم امسال یہ تفریح نہ ہونی چاہیئے تھی اس بدنظمی اور بیہودگی سے وہ کیا اثر لیکر گئے ہوں گے یہی تاکہ بھارت کے علم دوست اور اہلِ ذوق ایسے بیہودہ اور بدذوق ہوتے ہیں آخر اس مسئلہ کا کوئی حل ہے کہ نہیں ——؟ کچھ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان بھی سیاست کے شکار ہو جاتے ہیں اب دیکھیے نا میں جس طرح امسال لال قلعہ کے اس مشاعرہ میں پہونچا ہوں وہ میں ہی جانتا ہوں دفتر شانِ ہند میں مشاعرہ کمیٹی کی جانب سے دعوت نامہ یا پاس ہی نہیں پہونچا۔ ایک عوامی پاس حاصل کر کے میں لال قلعہ میں داخل ہوا ملک زادہ منظور صاحب اور ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کے ہمراہ پنڈال تک گیا وہاں جاکر رفعت سروش صاحب سے علیک سلیک ہوئی تو ان سے میں نے شکایت کی انہوں نے فوراً ہی مجھے ایک پاس خصوصی عنایت فرمایا اب خصوصی پاس کا کیا مصرف رہا۔ اگر مجھے پنڈال میں نہ جانے دیا جاتا تو میں بطور احتجاج پلٹ آتا اور اس مشاعرہ سے محروم رہ جاتے صرف آپ کے ذوق وشوق اور ادب نوازی کی وجہ سے یہ توہین گوارا کی ——!

اس مشاعرہ کے آغاز کا اعلان پوسٹروں میں آٹھ بجے کا درج تھا لیکن ایک ذمہ دار سرکاری مشاعرہ پونے نو بجے شروع ہو کر ۱۱ بجے تک پہلا دور چلا اس مشاعرہ پر قوم کا کتنا سرمایہ برباد کیا گیا یہ اللہ ہی جانے اس سے کہیں اچھے۔ کامیاب اور تاریخی مشاعرے تو آج قصبات اور چھوٹی جگہوں پر ہو رہے ہیں۔ جنہیں سامعین دلجمعی اور سکون سے سُن کر کامیاب کرتے ہیں ان میں کبھی قسم کی کوئی بدمزگی نہیں ہوتی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کنوینر

شاعرہ صلاح کار کمیٹی دیہ حقیقت ہے کہ محترم نارنگ صاحب نے ایک نیا کام یہ کیا کہ پاکستان کے ہائی کمشنر اور وہاں کے ایک شاعر کو بلے ہی آئے) اس مشاعرہ کی صدارت کے لئے شری کیدار ناتھ ساہنی چیف ایگزیکٹیو کونسلر دلی کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں رفعت سروش صاحب تائید فرما کر ساہنی صاحب کی گلپوشی کے لئے مائک پر آنے کی درخواست کر رہے ہیں ساہنی صاحب کی گلپوشی کے بعد نارنگ صاحب مہمان خصوصی شری لال کرشن ایڈوانی جی مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات سے افتتاح کے لئے درخواست کر رہے ہیں آپ کو بھی پھولوں سے لادا جا رہا ہے ساتھ ہی فوٹو گرافر اپنی کارگزاری میں مصروف ہیں اور ساہنی جی فرما رہے ہیں:-

بیگم قدوائی صاحبہ۔ شعراء کرام جی میں سب کو مشاعرہ جشن جمہوریت کی سب سے پہلے بدھائی دینا چاہتا ہوں اس سال بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے چوٹی کے شعرا کو اس مشاعرہ میں بلا لیا ہے ——— اور ایڑی کے شاعر جنہیں ہند و پاک کے اہل علم جانتے پہچانتے اور پسند کرتے ہیں او ندارد اور غائب ——— کیا رگھوپتی سہائے فراق، علامہ سادھو رام آرزو سہارنپوری تا زش پرتابگڈھی، گوپی ناتھ امن لکھنوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ساحر ہوشیار پوری، میلا رام وفا۔ جمیل مظہری۔ نور لکھنوی، کیف بھوپالی راحت اندوری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی راجندر کرشن، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری شعری بھوپالی، علامہ انور صابری۔ ناظم انصاری، بوگس حیدر آبادی، وسیم بریلوی، شمسی مینائی وغیرہ ہم چوٹی کے شاعر نہیں ہیں؟ بہر حال اس مشاعرہ کو کسی طرح بھی نمائندہ مشاعرہ نہیں کہا جاسکتا ویسے ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ساہنی جی جا رہے ہیں اور محترم ایڈوانی جی فرما رہے ہیں:-

محترم بزرگو۔ میں اس بات کے لئے شکر گزار ہوں کہ آج کے مشاعرہ کے لئے مجھے بلایا گیا میں ادگھاٹن سے پہلے ایک شکایت ضرور کروں گا کہ یہ طریقہ دلی ایڈمنسٹریشن ضرور بدلے کہ ایسے موقع پر ایسے لوگوں کو بلایا جائے جو اس قسم کا شعور رکھتا ہو ——— تالیاں ——— چاولہ جی کو بلایا جاتا ——— گذشتہ سال ان کی جو عزت افزائی ہوئی وہ سب پر عیاں ہے ——— یہ صحیح ہے کہ وہ کوی ہیں کیونکہ میں اردو نہیں جانتا ——— وزیر اطلاعات و نشریات اور اردو سے نابلد۔ کم از کم ہر وزیر کو تین زبانوں کا جاننا از حد ضروری اور لازمی ہے ——— آپ بھی ایک شعر پڑھ دیجئے ——— نارنگ جی۔ ایک قہقہہ ——— انگریزی اور ہندی کے بعد اردو کے اخبارات کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس زبان کی کسمپرسی سے آپ لاعلم تو نہیں ہوں گے اس کو کون سا درجہ اور مقام عنایت فرمایا حضور والا ——— ؟ ذرا یہ بھی بتلاتے چلئے ——— (اب تالیوں والے چپ ہیں) اردو سب صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ——— اور آپ اسے پھر بھی تسلیم نہیں کرتے یہ سراسر زیادتی اور ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے آپ کی حکومت اردو کی حقیقت اور حیثیت کو تسلیم بھی کرتی ہے لیکن اسے کوئی درجہ دینے کو تیار نہیں۔ یہ پالیسی پہلے کی وضع کردہ ہے آپ ہی کیا کر سکتے ہیں جناب والا ——— اردو کے اخبارات بھی سب ہی صوبوں سے نکلتے ہیں میں اس مشاعرہ کے کنوینر اور ان کے سب ساتھیوں کا دھنیاواد دیتا ہوں اور میں اس مشاعرہ کا ادگھاٹن کرتا ہوں ——— تالیاں ——— آپ ایک

شمع روشن کر رہے ہیں ایڈوانی جی اپنی جگہ آ رہے ہیں اور ساہنی صاحب فرما رہے ہیں اب پروانوں کو آنے دیجئے ——— ایک قہقہہ ——— نارنگ جی ایڈوانی جی کا شکریہ ادا کر کے ملک زادہ منظور احمد صاحب سے نظامت کی درخواست کر رہے ہیں منظور صاحب نے مائک سنبھال کر شروع کیا ہے :-

جناب صدر معزز محترم شعرائے کرام و خواتین۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ایسے دن آتے ہیں کہ جب تفریق کے بغیر اس جشن میں سب ہی شامل ہوتے ہیں پھر مختصر سی تقریر کے بعد فرما رہے ہیں ——— کئی دوستوں نے یہ بات مجھ سے خاص طور سے کہی کہ جہاں وزیر اور کوئی سرکاری حکام کسی مشاعرہ کی صدارت کریں گے وہ اس مشاعرہ کی نظامت قبول نہیں کریں گے لیکن آج آپ نظامت کے فرائض کیسے انجام دیں گے یہ تو سرکاری ہی مشاعرہ ہے ہو سکتا ہے کہ یہ خبر غلط ہو ——— دیدہ وری کا تعلق بصیرت سے ہوتا ہے اور اب آپ عنبر دہلوی سے ان کی غزل سنئے۔ عنبر صاحب کو مائک پر لایا جا رہا ہے اور آپ دلکشی سے اس مشاعرہ کا یوں آغاز فرما رہے ہیں ؎

کہاں کے پھول شگفتہ کوئی کلی بھی نہیں
بہاریں ایسی لٹی ہوں کبھی کبھی بھی نہیں
خدا کرے کہ اندھیرے ہی راس آ جائیں
ہمیں کچھ اتنی تمنائے روشنی بھی نہیں
رہ خیال میں غم زندگی کے نوحہ گر د
جو غم نہیں تو کوئی لطف زندگی بھی نہیں

عنبر صاحب ان المیہ اشعار سے جشن جمہوریت کی ابتدا کر کے چلتے بنے یہی غزل اسی جگہ گذشتہ سال بھی یہ سنا چکے ہیں اس غزل پر قوم کے کم از کم دو صد روپے برباد کر دئے گئے ——— یہ اردو کی خدمت ہے یا پیچارے عنبر صاحب کی امداد ——

مجھے نارنگ کہتے ہیں نارنگ صاحب نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ آپ کا شبھ نام ہے شبھ نام پر ہنسی بھی آئی میں نے عرض کیا مجھے کریمی الانصاری کہتے ہیں پھر سرور صاحب کے بارے میں دریافت کرتے رہے دیر تک مشاعرہ کے سلسلے میں جملہ حالات بتلاتے اور سمجھاتے رہے دیکھا تو منظور صاحب فرما رہے ہیں مشاعرہ میں تقدیم و تاخیر کی روایت کا میں قائل نہیں لیکن آج چونکہ شمع روشن کر کے ایک روایتی انداز میں شروع کیا گیا ہے میں بڑی دیانت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کئی اچھے اور معتبر کہنے والے ہیں ——— یہ بجا۔ لیکن حضور والا کوئی سننے کا بھی ——— ہے اور اب آپ مسعودہ حیات سے ان کی غزل سنئے۔ حیات صاحبہ غزل سرا ہیں ؎

خالی شراب عشق سے ساغر کبھی نہ تھے
اتنے تو خشک دل کے سمندر کبھی نہ تھے
جو سنگ احتساب یگانوں کے پاس ہیں
دشمن کے ہاتھ میں بھی وہ پتھر کبھی نہ تھے
کس سمت جا رہے ہیں انہیں کچھ پتہ نہیں
یوں بے خبر تو راہ سے راہبر کبھی نہ تھے

حیات صاحبہ تالیوں کی جھنکار میں کامراں پلٹ رہی ہیں اور منظور صاحب بہار برنی سے درخواست کلام کر رہے ہیں بہار صاحب متانت سے فرما رہے ہیں ؎

شہر میں آئے گا ایک دور خوش انجام ابھی
منتظر ہے نئے دور کی مری شام ابھی
کوئی منزل ہو سمجھ لیتے ہیں منزل اپنی
رہنما ہیں کہ بھٹکتے ہیں بہر گام ابھی
یہی وہ شخص تھا کہتے ہیں جسے لوگ بہار
باندھ کر آیا تھا بتخانے میں احرام ابھی

اچھا ہوا کہ انہوں نے شروع شروع میں پڑھ دیا اب منظور صاحب ایک خوشگوار اعلان فرما رہے ہیں کچھ تو بانیان مشاعرہ اور اداراکین کے علمی ذوق

پیش نظر مسٹر عبدالستار صاحب ہائی کمشنر پاکستان تشریف لے آئے ہیں اس پر تالیوں سے اظہار خوشنودی کیا جا رہا ہے بیگم خورشیدہ صاحبہ ان کا شکریہ ادا کر رہی ہیں اور فرما رہی ہیں کہ یہ پہلا مشاعرہ ہے کہ پاکستان کے ہائی کمشنر کسی مشاعرہ میں تشریف لائے ہوں ــــ تالیاں ــــ چیمسفورڈ کلب میں انڈو پاک مشاعرہ ہو رہا تھا اور باہر چند سرپھرے پاکستانی شعراء کے خلاف مظاہرہ کر رہے اور نعرہ لگا رہے تھے ایک یہ بھی دور تھا اگر کل یہ منظر ہوتا تو کیا اسے برداشت کر لیا جاتا یقیناً نہیں یہ ایک حقیقت ہے اور اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا بہرحال اس قسم کی تقریبات زیادہ سے زیادہ ہونی چاہئے کم از کم اس طرح آپسی تعلقات نہایت ہی خوشگوار ہو سکتے ہیں دیکھا تو حکیم منظور کشمیری فرما رہے ہیں ؎

اڑان کی ہے ضد اگر تو پھر اڑان کس لئے
لکھی گئی ہے وسعتوں کی داستان کس لئے
یہ ہاتھ کس لئے اگر نہ لکھ سکوں جو چاہوں میں
پڑھوں وہی جو تو کہے پھر زبان کس لئے
پرند منتظر اپنے وقت کے سوال کا
ہے خوش خیالیوں کے ہاتھ میں کمان کس لئے

منظور صاحب رواں دواں سنا کر چلتے بنے دیکھا تو کامل قریشی دہلوی اپنے مخصوص ترنم سے یوں الاپ رہے ہیں ؎

لیتا ہے سر آنکھوں پر اوروں کے جو غم تنہا
دیکھا ہے اسے اکثر با دیدۂ نم تنہا
خلوت میں کبھی جلوت ہے جلوت میں کبھی خلوت ہے
تنہا تو نہیں ہوتے ہیں جو ہم تنہا
خواہش نہ رہبر کی حسرت نہ ہے منزل کی
مل جائے اگر ان کا اک نقش قدم تنہا

کامل صاحب محفل کو گرما کر جو لوٹے تو ڈاکٹر خلیق انجم فرما رہے ہیں بیس روپے دلائیے میں نے جو داد دی ہے ــ میں نے عرض کیا یہ بیس روپے والی داد نہیں تھی البتہ کل چاء ضرور چل سکتی ہے اسی ہنسی مذاق میں رفعت سروش پُر وقار انداز سے فرما رہے ہیں ؎

بجلی کا رقص دیکھ کے کالی گھٹاؤں میں
تصویر کھینچتا ہوں جنوں کی فضاؤں میں
یہ چاند کے کھنڈر ہیں وہ مریخ و مشتری
بکھرے پڑے ہیں درد کے منظر خلاؤں میں
اس شہر سنگ و خشت میں کیلیجی لگے مرا
گذری تمام عشرت رفتہ گاؤں میں
رشتہ ہے آندھیوں سے رقابت کا لے سروش
کب سے بنا رہا ہوں نشیمن ہواؤں میں

سروش صاحب کا نام اناؤنس ہوتے ہی یار لوگ ذرا تفریح کے موڈ میں ہیں اسی لئے منظور صاحب فرما رہے ہیں جب مشاعرہ کا آغاز ہوا تو میں سمجھ رہا تھا کہ زندہ دلان دلی ابھی نہیں آئے لیکن اب محسوس کر رہا ہوں کہ اب آ گئے ہیں اگر آپ کو پسند آئے تو داد دیجئے ورنہ چپ چاپ سنیئے اس پر بن چلے بھر گئے اور نعرے بازی ــ ہیلے بھیا تر آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں اردو مجلس نہیں سنیں گے اردو مجلس نہیں سنیں گے۔ اسی عالم میں آغا قزلباش دہلوی رواں دواں سنا رہے ہیں ؎

ایک پرندہ ابھی اڑان میں ہے
تیر ہر شخص کی کمان میں ہے
زندگی سنگدلی سہی لیکن
آئینہ بھی اسی چٹان میں ہے

ہاں کبھی مجھ کو یہ توفیق خدا دیتا تھا
نیکیاں کر کے میں دریا میں بہا دیتا تھا
اسکی نظروں میں تھا جلتا ہوا منظر کیا
خود جلائی ہوئی شمعوں کو بجھا دیتا تھا

بھئی صاحب یہ ہے دو سو روپے کا مقامی شاعر اور
اس شعر سنا کر یہ تاثر کہ کچھ ہونے والا ہے۔
وہ خلاصی کرکے چلتے بنے اور اسی ہنگامۂ شور و غل
میں غریب کرشن موہن جی بھکارن پیش کرکے یہ جا
وہ جا۔ اب اس ہلڑ بازی اور شور و غل کو دوآتشہ
کرنے کے لئے قبلہ شہباز امروہوی فرما رہے ہیں ؎

حکمت میں سیاست کے خطابت بھی گئی
حاصل تھی جو منبر پہ وہ عظمت بھی گئی
کونسل کی صدارت تو انہیں کیا ملتی
مولانا سے مسجد کی امامت بھی گئی

ذرا شور و غل کم ہوا تو عطا کر رہے ہیں ؎

دی کسی خانۂ شاعر پہ یہ سائل نے صدا
بابا کچھ بھیک بھکاری کو سخن کے در سے
سمجھا شاعر نے کہ شاید متشاعر ہے کوئی
بدلے روٹی کے غزل لیکے وہ نکلا گھر سے

ہلڑ بازی کا وہی عالم ہے قبلہ شہباز صاحب خوب خوب
جھوم جھوم کر سنا کر ایک اور ایک اور کے شور میں لائے
جا رہے ہیں ادھر فتنۂ غزل جیسے سنبل علیگڑھی
پہلو بدل رہی ہے غزل سرا ہیں ؎

میں اپنی وفاؤں کا اور اس سے صلہ مانگوں
جب تجھ سے نہیں مانگا انسان سے کیا مانگوں
آتا ہے مرے آگے ہر لمحہ تقضا بنکر
اس حوصلۂ دل پر جینے کی دعا مانگوں
سنتے ہیں قیامت میں بچھڑوں سے ملن ہوگا
آئے گی قیامت کب کب تک میں دعا مانگوں

داد کا عالم نہ پوچھئے امسال من چلے داد تالیوں اور
سیٹیوں سے دے رہے ہیں آپ کی تصویر لی جا رہی
ہے ——— وہ سیدھی کھڑی ہو گئی ———
کمال ——— وہ مسکرائی ——— خلیق انجم اور آپ لہک
رہی ہیں ؎

یوں تو تری رحمت کی کچھ حد ہی نہیں لیکن
مجرم ہوں اگر تجھ سے دامن سے سوا مانگوں

سنبل صاحبہ تالیوں اور ایک اور ایک اور کے
ہنگامہ میں مائک سے خراماں خراماں محفل شعر و سخن
کو لوٹنے کامراں پلٹ رہی ہیں اور اس عالم کمکی
میں مخمور سعیدی نہایت پُر وقار اور اعتماد کے ساتھ
فرما رہے ہیں ؎

جانب کوچہ و بازار نہ دیکھا جائے
غور سے شہر کا کردار نہ دیکھا جائے
کھڑکیاں بند کریں چھپ کے گھروں میں بیٹھیں
کیا سماں ہے پس دیوار نہ دیکھا جائے
سرخیاں خون میں ڈوبی ہیں سب اخباروں کی
آج کے دن کوئی اخبار نہ دیکھا جائے
شہر کا شہر گنہگار رہے یہ ہو سکتا ہے
جب کہیں کوئی گنہگار نہ دیکھا جائے

اس شعر پر آہ اور واہ کا ایک دھماکہ ہوا ہے
یوں تو آپ کو ہر شعر پر داد دی جا رہی ہے لیکن
اس شعر پر داد کا اور ہی عالم ہے مخمور صاحب
محفل کو گرما کر لوٹے لیتے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

کچھ چراغوں میں لہو دل کا جلا کر دیکھیں
رات ہے کتنی دھواں دھار نہ دیکھا جائے

مخمور صاحب تالیوں کے شور میں شاداں اپنی جگہ
آ رہے ہیں اور آپ پاکستان کے شاعر اقبال ساجد
سے کلام سنیئے ؎

فطرت نے جو لکھے ہیں وہ کتبے پڑھا کرو
مہنگی ہیں گر کتابیں تو چہرے پڑھا کرو
تعریف کو بھی لوگ خوشامد کہیں تو پھر
خود اپنی شان میں ہی قصیدے پڑھا کرو

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

مطلع منفرد۔ طرزِ ادائیگی بڑی سنجیدگی لیئے لہٰذا کئی بار دہرا کر عطا کر رہے ہیں ؎

تاریخ کربلائے سخن دیکھنا کہ میں
خونِ جگر سے لکھ کے ورق چھوڑ جاؤں گا
اک روشنی کی موت مروں گا زمین پر
جینے کا اس جہان میں حق چھوڑ جاؤں گا
گذروں گا شہرِ سنگ سے جب آئینہ لئے
چہرے کھلے دریچوں میں فق چھوڑ جاؤں گا

داد پلٹتے ہوئے کئی بار دہرا کر ارشاد ہوا ہے ؎

وہ اوس کے درخت [illegible] گا ہر جگہ
ہر بوند میں لہو کی رمق [illegible] ں گا

ساجد صاحب پھر فرمائش [illegible] م کرتے فرمارہے ہیں ؎

پھینک یوں پتھر کہ سطحِ آب بھی بوجھل نہ ہو
نقش بھی بن جائے اور دریا میں بھی ہلچل نہ ہو
کھول یوں مٹھی کہ اک جگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ ایسے جھپک لمحہ کوئی اوجھل نہ ہو
گرم کر ساجد لہو کو دھیمی دھیمی آنچ سے
وقت سے پہلے ترے جذبات میں ہلچل نہ ہو

ساجد صاحب تالیوں کے شور میں کامراں و شاداں پلٹ رہے ہیں اور فرمارہے ہیں دہلی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کرکٹ کا میچ دیکھنے والے آگئے ہیں —— اس پر یار لوگ —— پھر برہم ہو رہے ہیں حالانکہ داد میں فرق ہوتا ہے ایک داد ساجد صاحب کو دی گئی ہے جس سے سخن فہمی اور علمیت جھانکتی تھی اس سے پہلے بھی کئی شعراء کو اسی داد میں اڑا دیا گیا ہے یہ کرکٹ کا میچ بھی تو اس کے ذمہ دار اور مشاعرہ کمیٹی کے ارکان ہی دکھلاتے ہیں اگر آپ کا ایسا خیال ہے تو پھر مشاعرہ کرائیے نا آپ اسی بات سے اندازہ فرمائیے کہ مشاعرہ چل رہا ہے میں کسی گروپ بندی کا شکار نہیں ہوں بلکہ ایک حقیقتِ حال کا صحیح اظہار ہے اب اس پر بھی اگر چند پیشانیوں پر شکن پڑتی ہیں تو پڑا کریں ع

ہماری تلخ نوائی کا احترام کرو

لیجئے تالیوں کے شور میں مینا قاضی شمسی سنائی ایک پرانی غزل دلکشی سے سنا رہی ہیں ؎

غمِ حیات کی عظمت کو کوئی کیا جانے
بہار دیکھے خریدے گئے ہیں ویرانے
مری تباہی کا باعث جہاں میں کوئی نہیں
مجھے فریب دیا خود مری [illegible] نے
یہ انتہائے محبت نہیں تو پھر [illegible] ہے
کئی چراغ بجھا کر جلے ہیں پروانے

میناؔ صاحبہ بمبئی سے آپ کو یہ غزل سنانے کے لئے آئی ہیں کیا خوب انتخاب ہے ماشاءاللہ۔ دوسری غزل کے دو تین شعر اور بھی سنائے ہیں اور بات بنتی آپ جا رہی ہیں اور ہلال سیوہاروی کنتوں کی کانفرنس سے محفل کو قہقہہ زار بنا کر جا رہے ہیں اس اثناء میں میں نے احباب کو ریوڑیاں لانے تو اصحم کی دیکھا تو منظور صاحب فرمارہے ہیں آپ نے ہمارے شعراء کے ساتھ تعاون فرمایا —— جھوٹ آوازیں —— قہقہے —— اب جس طرح مزاحیہ کلام کو آپ سن سکتے ہیں اسی طرح سنجیدہ کلام کو بھی سنیئے گا اور اب آپ جگن ناتھ آزاد سے ان کا کلام سنیئے ؎

کس متاعِ شوق کی ہم جستجو کرتے رہے
زندگی بھر زندگی کی آرزو کرتے رہے
اور ہوں گے جن کو ہوگا چاکِ دامانی پہ ناز
ہم جنونِ شوقِ داماں کو رفو کرتے رہے
پینے والوں کا جب اوروں کے لہو پر تھا مدار
ہم شریکِ جام اپنا ہی لہو کرتے رہے

آزاد صاحب مائک سے واپس آکر فرما رہے ہیں آبرو رہ گئی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آج پھر من چلے تفریح کے موڈ میں ہیں لیجئے ڈاکٹر شہریار علیگڈھی فرمارہے ہیں ؎

سفر یہ ختم ہو جائے نہیں ایسا نہیں ہوگا
بہت ہوگا کہ ان اشجار کا سایہ نہیں ہوگا
تمہیں اس درجہ کیوں ہوتی کسی سیلاب کی خواہش
تمہارے شہر کے اطراف میں دریا نہیں ہوگا
رگوں میں سب کی ایک برف کی تہ جم چکی ہوگی
خدا کا شکر ہم میں کوئی بھی رسوا نہیں ہوگا

سامنے والے پھر ہائے ہو اور شور و غل پہ اتر آئے ہیں اکثر صاحب جا رہے ہیں اور منظور صاحب حسنی سرور کے نام کا اعلان کر رہے ہیں ابھی میں چلے کچھ نہیں سن رہے وہی تفریح کا موڈ ہے اور حسنی اُس عالم میں مائک پہ آنے سے کترا رہی ہے اس صلیب پر تو چڑھنا ہی پڑے گا زادِ راہ اور مطالبہ کا سوال ہے تا بابا — ؟ یوں بھولی سے گلو خلاصی کرا رہی ہے

کس کو یاد رکھتا ہے کس کو بھول جاتا ہے
اک طرف خلوصِ دل اک طرف زمانہ ہے

طارق بدایونی کی یاد تازہ کرا دی لیجئے تالیاں ہولے ہولے مدھم مدھم ہلکی ہلکی شروع ہو گئی ہیں منظور درخواست کر رہے ہیں لیکن بیسود آپ فرما رہی ہیں —

گزرے موسموں کی یاد روز آتی ہے لوگو
یاد ہی کے جھونکوں سے زخمِ دل سلانا ہے
تم بھی توڑ جاؤ گے شیشۂ یقیں اک دن
خوب جانتے ہیں ہم پھر فریب کھانا ہے

سیٹیاں شباب پر ہیں اس ہنگامہ کی تاب نہ لا کر پلٹ رہی ہیں ع

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اب منظور صاحب فرما رہے ہیں میں اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے خود کو ہی پیش کرتا ہوں — تخلص بتاؤ — آوازیں — اور اسی ہنسی مذاق میں آپ فرما رہے ہیں —

ضیائے صبح بھی ہے دامانِ صبا بھی ہے
سوال یہ ہے کہ غنچہ کوئی کھلا بھی ہے

تمازتِ غمِ دوراں سے وہ بھی بچ نہ سکے
وہ جن کے شانوں پہ زلفوں کی اک گھٹا بھی ہے

منظور صاحب گلو خلاصی کر کے جو پلٹے تو فرما رہے ہیں قربانی بے عیب جانور کی ہوتی ہے اور میں بے عیب ہوں — ماشاءاللہ — ایک آواز آئی ہے جبھی اپنی ایک طالبہ علم سے شادی کر لی ہے۔ اب آپ محمد علوی سے ان کا یہ کلام سُنیئے —

نیند راتوں کی اڑا دیتے ہیں — ہم ستاروں کو دُعا دیتے ہیں
روز اچھے نہیں لگتے آنسو — خاص موقعوں پہ مزا دیتے ہیں
دی ہے خیرات اسی در سے کبھی — اب اسی در پہ صدا دیتے ہیں

علوی صاحب بھی رواں دواں سُنا کر آ رہے ہیں کیا بچگانہ غزل سُنائی ہے کیا کہنا۔ یہ ملک کا نمائندہ مشاعرہ اور یہ ریل آتی ہے ریل جاتی ہے والی غزل۔ داد دیجئے مشاعرہ کمیٹی — زندہ باد — کئی شاعر تو ایسے بلا لئے گئے جو مشاعروں میں جاتے ہی نہیں ہیں نہ وہ مشاعروں کے شاعر ہیں بہر کیف یہ تو مشاعرہ کمیٹی جانے میں کون۔ وہ دیکھئے تالیوں کے شور میں ڈاکٹر بشیر بدر مائک پہ آ کر بانکپن سے غزل سرا ہیں —

دل کی بستی پرانی دلی ہے
جو بھی گذرا ہے اس نے لوٹا ہے

نکل آئے ادھر جناب کہاں
رات کے وقت آفتاب کہاں

داد و تحسین کے شور میں جھوم کر لہرا رہے ہیں —

مرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے
چھو سکے گی انہیں شراب کہاں
میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

بدر صاحب مائک سے جدا ہوا چاہتے ہیں کہ فرمائشوں کے شور میں پھر محفل کا جائزہ لے رہے ہیں اور بیگم صاحب

مسکرا کر فرما رہے ہیں ع

مُڑ کے آخر چلے جناب کہاں

اور بدر صاحب فاتحِ محفل بنے [illegible] غزل

[illegible] سے

ملے بے گھروں کا یوں مسئلہ ہو گیا
جو پُرانا تھا پھر سے نیا ہو گیا
دو بدن دُوریاں کاٹ کر آ ملے
پھر دلوں میں عجب فاصلہ ہو گیا
آنگ کے سرخ لب چومنے کی ہوس
کاغذوں کا بڑا حوصلہ ہو گیا
بے گھروں کے لئے بادلوں کی چھتیں
سر چھپانے کا اک آسرا ہو گیا
میں وہ پتھر ہوں جس کو ترے پیار نے
دیوتا کہہ دیا دیوتا ہو گیا

بدر صاحب تالیوں کے شور میں محفل کو گرما کر شاداں پلٹ رہے ہیں منظور صاحب فرما رہے ہیں بیکل اتساہی کا تعارف کرانا اپنی حماقت سمجھتا ہوں لہذا اب آپ بیکل صاحب سے ان کا کلام سنیئے۔ بیکل صاحب یوں نغمگی بکھیرنے چلے ہیں سے

چھاؤں میں سسکیوں کی سلگتے ہوئے اُن سے گیت میں گنگناتا رہا
ساتھ ہی دورِ حاضر کی تصویر بھی ریت پر انگلیوں سے بناتا رہا
لوگ ساحل پہ روتے بلکتے رہے مجھ کو منجدھار میں ڈوبتے دیکھ کر
اپنے ہاتھوں میں کاغذ کی کشتی لئے ایک بچہ مگر مسکراتا رہا

دادنے ہٹر بونگ کا روپ دھار لیا ہے اور بیکل صاحب اسی بانکپن سے محفل کو لوٹنے کی ٹھان رہے ہیں سے

میں ہی صدیوں پُرانا ہوں ہندوستاں میرے کردار کی بس یہی داستاں
میں تو ساون کو سمجھا کیا مہرباں اور ساون مرا گھر جلاتا رہا

قبلہ بیکل صاحب تالیوں اور ایک اور ایک اور کے ہنگامہ میں [illegible] کرتے ہوئے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور [illegible] سنبل تھا اس قربان گاہ پر چڑھادی گئی ہے اس [illegible] کو اب کون سنتا لہذا آپ دو

ایک شعر سنا کر صاف جا رہی ہیں اور آپ کے ساتھ ہی جشنِ جمہوریت کا یہ قومی، تاریخی اور نمائندہ مشاعرہ [illegible] توڑ رہا ہے دوسرے دور میں فرمائشوں کا [illegible] کیا گیا لیکن جب پہلے دور ہی میں مشاعرہ کو ہیں [illegible] گیا تو [illegible] دور میں تفریح کی بات اور شعراء کو بلانے کی سازش نہیں تھی تو اور کیا تھا مشاعرہ کمیٹی نے امسال واقعی اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں کافی جد و جہد کی اور بڑی دلچسپی بھی لی لیکن یہ مشاعرہ کئی سال سے پٹتا اور ناکام ہوتا آرہا ہے اس پہلو پر سوچا جائے اور اس کمی کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کی جائے ورنہ ہر سال قوم کا یہ زرِ کثیر خواہ مخواہ برباد کیا جاتا ہے اس سے لال قلعہ کی عظمت اور حکومت کا وقار مجروح ہوتا ہے اگلے برس اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ وہ کیا وجوہات ہیں جن سے باذوق حضرات اس مشاعرہ سے کتراتے اور شرکت نہیں کرتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ اس کو تفریح میں اڑا دیتے ہیں اب اس مسئلہ پر غور کرنے اور سوچنے کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے ع

صدائے عام ہے یارانِ میکدہ کیلئے

حضرت سیماب اکبرآبادی کی اصلاحیں

نزارِ علامی

حضرت اثر سرہندی ایک کہنہ مشق پختہ گو اور باوقار شاعر ہیں۔ رموزِ فصاحت و بلاغت اور ٹکسالی محاوروں سے خوب آشنا ہیں۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ محاکات اور پختگیٔ تخیل کے آثار ملتے ہیں۔ انہیں حضرت سیماب اکبرآبادی کے معتمد اور فارغ الاصلاح شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ شاعری کو محض تفریحِ طبع تک محدود رکھنے کے سبب ہی آج تک گمنام ہیں۔ ورنہ انہیں صفِ اوّل کے شعرا میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

میں نے ان کے ابتدائی کلام پر حضرت سیماب اکبرآبادی کی اصلاحیں دیکھی ہیں۔

اصلاح دینا کس قدر مشکل ہے یہ صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو اس پُرخار وادی سے گزرے ہیں ایک مصلح کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شعر کے ہر زاویہ پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ شاعر کے مزاج سے بھی آشنا ہو اور زبان و بیان کے علاوہ فن پر بھی کماحقہ نظر رکھتا ہو۔

حضرت سیماب اکبرآبادی چونکہ اثر صاحب کی ذہانت اور شاعرانہ استعداد کو بھانپ چکے تھے لہٰذا انہوں نے کہیں بھی اپنی اصلاح کے مقابل توجیہہ لکھنے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ انہیں پر چھوڑ دیا گیا کہ وجہِ اصلاح وہ خود سمجھیں کہیں کہیں یہ ضرور لکھ دیا گیا کہ جہاں سمجھنے کی ضرورت محسوس کریں لکھ کر دریافت کرلیں۔

میں نے اثر صاحب کی اجازت سے کچھ اصلاحوں پر توجیہہ لکھنے کی جسارت صرف اس لئے کی ہے کہ دوسرے لوگ بھی مستفید ہو سکیں۔

شعرِ اثر ؎

تقدیر کی گردش کا تجھے علم نہیں ہے
مائل بہ ستم اتنا کہاں چرخِ بریں ہے

اصلاحِ سیماب ؎

تقدیر کی گردش کا تجھے علم نہیں ہے
مائل بہ ستم صرف کہیں چرخِ بریں ہے

توجیہہ:- اتنا کہاں کے یہ معنی تھے کہ چرخِ بریں مائل بہ ستم تو ہے مگر اتنا نہیں جتنا اسے ہونا چاہیئے تھا یا اتنا نہیں کہ اس کا ستم ناقابلِ برداشت ہو۔ اس کے علاوہ یہ صورت ابھی نکلتی ہے کہ چرخ کا ستم ہر مقام پر اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ ناقابلِ برداشت ہو جائے یا اور کسی مقام پر اس قدر مائلِ ستم نہیں جتنا یہاں ہے۔ جملہ صورتوں میں چرخ کی ستم گری کی شان باقی نہیں رہتی۔

اصلاح میں "صرف کہیں" کے ٹکڑے نے چرخ کی عادتِ ستم گری کو واضح اور اجاگر کر دیا۔ یعنی چرخ جہاں بھی مائلِ ستم ہوتا ہے وہاں مکمل طور پہ تباہی ہی تباہی ہوتی ہے۔

شعرِ اثر ؎

لے لوٹ چلا زندگیٔ دل کا فسوں بھی
امیدوں میں انداز دمِ بازپسیں ہے

اصلاحِ سیماب ؎

لے لوٹ چلا زندگیٔ دل کا فسوں بھی
ہر سانس میں اندازِ دمِ بازپسیں ہے

توجیہہ:- بات تو اثرؔ صاحب کی بھی درست تھی۔ چونکہ انسان امیدوں کے سہارے ہی پر زندہ ہے اور اس کا ہر فعل امید کی فسوں کاری پر مبنی ہے۔ جب امید ہی رخصت ہو رہی ہے تو زندگی دل کے فسوں کا ٹوٹنا قدرتی ہے۔ مگر قابل استاد نے "ہر سانس میں" کہہ کر شعر کی کئی ضروریات کو پورا کر دیا۔

"انداز دم باز پسیں" کا ٹکڑا اس امر کا مقتضی تھا کہ اس سے پہلے کا ٹکڑا "ہر سانس" ہی ہو۔ 'دم' کی رعایت سے سانس کا لانا زیادہ مناسب ہے۔ نیز شعر حقیقت کے نزدیک بھی ہو گیا۔ زندگی دل سانس کے سبب ہے سانس آ گئی تو زندگی ورنہ موت۔ اس کے علاوہ "فسوں" دم کیا جاتا ہے اور دم کئے جانے کا تعلق بھی سانس سے ہے۔ لہٰذا اصلاح برمحل اور نہایت مناسب ہے۔

شعر اثرؔ ؎

کیا جانیے کیا گزری ہے کمبخت کے دل پر
کہتے ہیں کہ مدت سے اثرؔ گوشہ نشیں ہے

اصلاح سیمابؔ ؎

کیا جانیے کیا گزری ہے بے چارے کے دل پر
کہتے ہیں کہ مدت سے اثرؔ گوشہ نشیں ہے

توجیہہ:- 'کیا گزری' کے ٹکڑے ہی نے سیماب صاحب کو اصلاح پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک ایسا ٹکڑا ہے جس میں استعجاب کا پہلو ہے۔ کسی کمبخت پر اگر کوئی سانحہ گزر بھی جائے تو استعجاب کا پہلو نہیں نکلتا چونکہ کم بخت پر تو آئے دن آفات کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں۔ بیچارے کے لفظ نے جہاں استعجاب کا پہلو پیدا کیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی نازک دلی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اس کے علاوہ کم بختگی کے سبب کوئی شخص گوشہ نشینی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ بے چارے کے ٹکڑے نے شرم کا پہلو بھی نکالا ہے۔ یعنی جب اہل عزت پر کوئی ایسی واردات گزرتی ہے جو اُن کی شان کے شایاں نہیں ہوتی تو بیچارے شرم کے مارے اپنا منہ چھپانے کے لئے گوشہ نشیں ہو جاتے ہیں نہایت عمدہ اصلاح ہے۔ سبحان اللہ

شعر اثرؔ ؎

بزم مجاز ہے اگر عالم تو کیا ہوا
پہچانتا ہوں چشم حقیقت نگر کو میں

اصلاح سیمابؔ ؎

بزم مجاز ہے جو یہ دنیا تو کیا ہوا
لایا ہوں ساتھ چشم حقیقت نگر کو میں

توجیہہ:- 'اگر عالم' یہاں عالم کی 'ع' ساقط ہو جاتی ہے۔ اثرؔ صاحب نے غلطی سے 'ع' کو الف وصل سمجھ لیا تھا۔ اکثر شعرا کے یہاں یہ غلطی پائی جاتی ہے کچھ لوگ تو 'ہ' کو بھی الف وصل بنا لیتے ہیں۔ چشم حقیقت نگر کو پہچاننا بے معنی بات تھی۔ 'لایا ہوں ساتھ' ایک جامع ٹکڑا ہے۔ اور اس نے چشم حقیقت نگر کی منزلت اجاگر کر دی۔

شعر اثرؔ ؎

بٹھا کر پاس تڑپایا گیا ہوں
لب کوثر ہی ترسایا گیا ہوں

اصلاح سیمابؔ ؎

بٹھا کر پاس تڑپایا گیا ہوں
لب کوثر بھی ترسایا گیا ہوں

توجیہہ:- اثرؔ صاحب کے اصل مصرع میں 'ہی' موجود تھا جس کے یہ معنی ہوئے کہ میں صرف لب کوثر ہی ترسایا گیا ہوں اور اس کے علاوہ کہیں نہیں۔ 'بھی' نے شعر کا مزاج ہی بدل دیا یعنی جس جگہ ہر شخص کی پیاس بجھتی ہے میں وہاں بھی ترسایا گیا ہوں۔

(نوٹ) مطلع میں ایطائے جلی کا عیب بھی موجود ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ حضرت سیماب صاحب کی

اس طرف نظر نہیں گئی ہوگی۔ میرے خیال میں انہوں
نے اپنے تلامذہ کو اس کی اجازت دے دی ہوگی۔

شعرِ ابد:

حسرتِ دیدار بر آئی تو کیا ـــــ سینکڑوں ارمان دل میں رہ گئے

اصلاحِ سیماب:

ایک حسرت ہو گئی پوری تو کیا ـــــ سینکڑوں ارمان دل میں رہ گئے

توجیہہ:۔ حسرتِ دیدار بر آنے کے بعد اگر کوئی
'ارمان' باقی رہتا ہے تو اسے ہوس کاری کہیں گے
اور یہ عاشقی کی توہین ہے۔ علامہ سیماب نے اس
نقص کو برداشت نہ کیا۔ اصلاح میں ایک حسرت
کہہ کر پردہ داری کی گئی ہے۔

شعرِ ابد:

عرش کے وا مجھ پہ ہو جاتے ہیں در
آستاں پر جب جھکا دیتا ہوں سر

اصلاحِ سیماب:

عرش کے بھی مجھ پہ کھل جاتے ہیں در
آستاں پر جب جھکا دیتا ہوں سر

توجیہہ:۔ اصل شعر میں یوں تو بظاہر کوئی [illegible] نہ تھی
مگر اصلاح نے ان خامیوں کو نمایاں کر دیا جو در پردہ
موجود تھیں۔

۱۔ اصل مصرع میں عیبِ فاصلہ موجود تھا۔
۲۔ دوسرے اسرار کے ساتھ عرش کے اسرار
بھی (جن کا کھلنا آسان نہیں) مجھ پر کھل جاتے ہیں۔
یہاں لفظ 'بھی' کی بلاغت قابلِ داد ہے۔ جس نے
شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

شعرِ ابد:

ڈھونڈتے ہیں خانقاہ و دیر میں
ہوش والے بھی ہیں کتنے بے خبر

اصلاحِ سیماب:

ڈھونڈتے ہیں دیر و کعبہ میں اُسے
ہوش والے بھی ہیں کتنے بے خبر

توجیہہ:۔ قطع نظر اس سے کہ خانقاہ و دیر کی
ترکیب غزل کے مزاج پر بوجھل ہے کہ [illegible]
اصل شعر میں کہیں یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کس کو ڈھونڈا
جا رہا ہے۔ اصلاح سے یہ خامی دور ہو گئی۔

شعرِ ابد:

وجدانِ محبت میں ایسا نظر آیا ہے
ہر ذرّے میں صحرا ہے ہر قطرے میں دریا ہے

اصلاحِ سیماب:

وجدانِ محبت میں ایسا نظر آتا ہے
ہر ذرّے میں صحرا ہے ہر قطرے میں دریا ہے

توجیہہ:۔ بظاہر شعر میں کوئی نقص نہیں۔ اصلاح
نے شعر کو جو ارفع بخشا ہے وہ قابلِ داد ہے۔
'ایسا نظر آیا ہے' میں شبہ کا پہلو ہے۔ بخلاف
'ایسا نظر آتا ہے' میں تعین کا پہلو ہے۔ اس کے
علاوہ قافیہ میں جو قید لازم ہو جاتی تھی وہ بھی نہ رہی۔

شعرِ ابد:

جلووں کی حقیقت کو کیا قیس نظر سمجھے
لیلیٰ کے اشاروں کو مجنوں ہی سمجھتا ہے

اصلاحِ سیماب:

جلووں کی حقیقت کو کیا تنگ نظر سمجھے
لیلیٰ کے اشاروں کو مجنوں ہی سمجھتا ہے

توجیہہ:۔ قیس نظر کی ترکیب بے معنی تھی۔ تنگ نظر
کہہ کر شعر کو جو رفعت ملی ہے وہ قابلِ داد ہے۔
مجنوں کو وسیع النظر بنا دیا گیا۔

شعرِ ابد:

ترسوں نہ روشنی کو تاریکیٔ لحد میں
رکھ دینا چند جگنو لا کر مرے کفن میں

اصلاحِ سیماب:

تاریکیٔ لحد میں ترسوں نہ روشنی کو
رکھ دینا چند جگنو لا کر مرے کفن میں

توجیہہ:۔ اس وزن میں (مفعول فاعلاتن مفعول

فاع لاتن) ہر مصرع کے دو ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ قابلِ اُستاد نے مصرع اولیٰ کے پہلے ٹکڑے کو دوسرا اور دوسرے ٹکڑے کو پہلا ٹکڑا بنا دیا ہے۔ اصل مصرع میں تقابلِ ردیفین کا عیب تھا۔ اب دُور ہوگیا۔ اس قسم کی اصلاح اُستاد کی بالغ النظری کا پتہ دیتی ہے۔

شعرِ ابتدا ؎

سجدے قدم قدم پر کیوں نہ کروں آبد میں
میرے لیے حرم ہے ہر ذرّۂ وطن میں

اصلاحِ سیماب ؎

کیوں اسے ابتدا ادا ہوں سجدے نہ ہر قدم پر
ہے سجدہ گاہِ فطرت ہر ذرّہ وطن میں

توجیہہ:۔ نہ (ن) یک حرفی لکھنا چاہیئے۔ دوحرفی (نا) لکھنا غلط ہے۔ سجدہ گاہِ فطرت بنا کر شعر کو بلیغ کر دیا گیا۔

شعرِ ابتدا ؎

تو صرف رو رہا ہے پروانوں کی اجل پر
رہ جائیں گی نہ جلتی شمعیں بھی انجمن میں

اصلاحِ سیماب ؎

تو صرف رو رہا ہے پروانوں کی اجل پر
اک رات کی ہیں مہماں شمعیں بھی انجمن میں

توجیہہ:۔ ’رہ جائیں گی نہ جلتی‘ اہلِ زباں اس طرح نہیں بولتے۔ ”ایک رات کی ہیں مہماں“ بنا کر مصرع حقیقت کے قریب کر دیا گیا ہے۔

شعرِ ابتدا ؎

تمنا شادمانی کی دلِ ناشاد تک ہے
وجودِ منزلِ مقصود سعیِ رائگاں تک ہے

اصلاحِ سیماب ؎

تمنا شادمانی کی دلِ ناشاد تک ہے
خیالِ منزلِ مقصود سعیِ رائگاں تک ہے

توجیہہ:۔ دوسرے مصرع میں معنوی تعقید ہے۔ خیال نے معنی میں وسعت بھی پیدا کر دی اور حقیقت کے نزدیک بھی کر دیا۔ (باقی پھر)

ناردن ریلوے

عزیز طلباء، زائرین اور سیاحو!

ہندوستان دیکھئے سہل طریقے سے

مُلک کے گرد سرکلر ٹور کے لئے پہلے اور دوسرے درجے کے سرکلر ٹور ٹکٹ مقررہ ریلوے اسٹیشنوں سے خرید یئے۔ میل ایکسپریس کے کرایوں میں ۱۵ فیصد رعایت کے ساتھ یہ ٹکٹ ۳۰-۶۰ یا ۹۰ دن کی مدت کے اندر قابلِ استعمال ہوں گے۔ مدت کا انحصار طے کئے جانے والے سفر کے کُل فاصلے پر ہے۔ سفر کے دوران آپ جب چاہیں، جتنی بار چاہیں اور جتنے عرصے کے لئے چاہیں گے آگے کا سفر ملتوی کر کے کہیں بھی قیام کر سکتے ہیں شرط یہ ہے کہ ٹکٹ کی کُل مقررہ معیادِ استعمال نہیں بڑھ سکے گی۔

آپ کی سہولت اور ضرورت کی مناسبت سے ہم نے ایسے تیس سرکلر ٹورز کا بندوبست کیا ہے۔ ان کے ذریعے اس سارے عظیم الشان نظارے کا احاطہ ہو سکے گا جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ ان ٹورز میں سے کسی کا انتخاب کر لیجئے۔

اور اگر آپ کا کوئی ایسا پروگرام ہے جو آپ کی انفرادی ضرورت کے مطابق ہو تو اس کے لئے ہم سے خود ملئے یا ہمیں اپنا پروگرام لکھ کر بھیجئے۔ ہم آپ ہی کے ٹور پروگرام کے لحاظ سے کرائے کا دھیان بھی رعایتی شرح پر لگا کر.... آپ کو مطلع کر دیں گے۔

یہ ٹور سرکلر ہونا چاہیئے اور اس کا فاصلہ ۲۴۰۰ کلو میٹر سے کم نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ وہ فاصلہ جس کا کرایہ چارج کیا جا رہا ہے ٹور پروگرام کے آغاز کے اسٹیشن سے پروگرام کے آخر تک کے اسٹیشن تک ان اسٹیشنوں کے درمیان براہِ راست مسافت کے فاصلے کے مقابلے میں کم از کم تین گنا سے زیادہ ہونا چاہیئے۔

مزید معلومات کے لئے براہِ کرم اپنے قریب ترین ریلوے اسٹیشن ماسٹر یا متعلقہ ڈویژن کمرشیل سپرنٹنڈنٹ سے ملئے یا پھر ہم سے براہِ راست رابطہ قائم کیجئے۔

چیف کمرشیل سپرنٹنڈنٹ
ناردن ریلوے نئی دہلی

ٹیلیفون ۳۸-۲۲۲۶
۳۸-۷۵۰۵

مختار شمیم

اسماعیل ذبیح (سرونج)

زندگی کے سفر میں جب پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ روشنی کے وہ مینار گر چکے ہیں جن سے سرونج کی ادبی محفلیں روشن تھیں۔ ناطق، بہادر، عنبر، دلکش یہ وہ لوگ تھے جو ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ جو ایک دوسرے کے ہم دم اور ساتھی تھے۔ ان لوگوں کے بغیر سرونج کے کسی مشاعرہ کا تصور ممکن ہی نہ تھا۔

ناطق کے جانے کے بعد میر جو جانِ محفل تھے نہ رہے تو ہر شخص نے محسوس کیا۔

"تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے"

سرونج کے لوگ ابھی انہیں رو رہے تھے کہ ایک اور غزل گو شاعر دلکش ساگری یہ شعر پڑھتے ہوئے چلے گئے ؎

کچھ دور اور آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں
شاید کہ راستہ میں کہیں زندگی ملے

لیکن سرونج جو شاعری کی تحریک کا جنم داتا ہے اس میدان کا خاموش تماشائی نہ رہا۔ اور ان شعرا کے بعد نئے ابھرتے ہوئے شعرا نے جنم لیا۔ شاہد میر، خالد محمود، وقار فاطمی اور مختار شمیم جیسے شعرا ابھرے۔ ان کی شاعری میں جو شگفتگی، انفرادیت اور تنقید حیات کے ساتھ ساتھ، امید، ولولے اور جذبات کی کارفرمائی ہے۔ ان شعرا کے کلام میں دعوتِ کام و دہن، ہیجان اور اضطراب کم، دعوتِ فکر اور والہانہ انداز زیادہ نظر آتا ہے۔

قدرت اگر کنجوسی سے کام لیتی تو صرف چند ہی شاعر پیدا ہوتے لیکن غنیمت ہے کہ اس معاملہ میں قدرت نے بخیلی نہیں رزاقی سے کام لیا ہے۔ اور وقفے وقفے سے کئی شاعر پیدا کئے ہیں۔ مختار شمیم بھی قدرت کے ان پیدا کردہ شاعروں میں سے ایک ہے۔ مختار شمیم ابھی عمر کی اس منزل میں ہے جس میں زندگی کے ولولے جوان رہتے ہیں۔ وہ سرونج میں پیدا ہوا اور آجکل گورنمنٹ گرلز کالج اندور میں لیکچرار ہے۔ وہ دو کتابوں کا مصنف ہے۔ ایک کتاب "ریاست ٹونک میں اردو شاعری" نثر کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ٹونک اور سرونج کے شعرا کے متعلق تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست ٹونک کے زمانہ کے شعرا بہت صالح اور رچا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ امید کی جاتی ہے کہ آگے چل کر یہ تنقیدی اشارے تذکروں میں برگ و بار لائیں گے۔

دوسری کتاب نامۂ گل موصوف کی پہلی شعری تصنیف ہے۔ یہ ان کی جدید شاعری کا مجموعہ ہے اور بہ حیثیت شاعر ان کو قاری سے روشناس کراتا ہے۔ اس مجموعہ کی خاص خوبی یہ ہے کہ عام باشعور قاری سے ترسیلی رشتہ قائم رہتا ہے۔

اردو شاعری میں جو نئے رجحانات برآمد کئے گئے ہیں مختار شمیم کو ان کا احساس بھی ہے اور عرفان بھی ہے وہ روایت کی لکیر پیٹنے والوں میں نہیں ہے۔ بلکہ اس نے [illegible] ساتھ

اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات پر رکھی ہے
وہ خوش فکر شاعر ہے اس نے اپنے قلبی واردات
کا اظہار سلیقے کے ساتھ کیا ہے۔ لب و لہجہ غزل کا
ہے جس میں کلاسیکی رچاؤ ملتا ہے۔ زیادہ تر ایسے
اشعار مل جاتے ہیں جنھیں احساس کی ہلکی سی
تھرتھراہٹ ہوتی ہے ؎

رات کی رانی مہک رہی ہے بستی میں ناگن لہرائے
زہر نہ اترے تنہائی کا اب تو یہ منظر ڈس جائے
رنگ، شفق، گل، نغمے، تارے یادوں کی البم کتنے رنگ
اس سے بچھڑے مدت گزری لیکن اسکو بھول نہ پائے
رنگین سپنے لہراتے ہیں کھلتے ہیں آشا کے پھول
اسکا خط آیا تو جیسے بیتے لمحے بھی لوٹ آئے

مظفر حنفی صاحب نے اس مجموعہ پر اپنے
مقدمے میں روشنی ڈالی ہے۔ جس میں نہایت
بے تکلفی اور اپناپن پایا جاتا ہے۔

اس مجموعہ سے قطع نظر بھی جس میں اس
کی بہت تھوڑی سی غزلیں اور چند نظمیں ہیں اور جس
کے انتخاب میں اس نے زیادہ سختی برتی ہے
اس کا اور بھی اچھا کلام موجود ہے۔ اس کلام کے
بعض اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
شاعر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے موزونیٔ
طبع کا سہارا لیتا ہے اور اس کی شاعری سطحی
ردِ عمل کی شاعری ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر
پتہ چلتا ہے کہ موضوع اور اسلوب دونوں کے
اعتبار سے اس کی شاعری ایک خاص رنگ و
آہنگ کی حامل ہے۔ اس نے اپنے دور کے
مسائل اور قیمتی قدروں کو نہایت خوبصورت
انداز میں پیش کیا ہے ؎

میں حدودِ لفظ و معنی سے گزر گیا ہوں
میرے خواب جاوداں ہیں مرا خیال لامکاں ہے
لفظ لفظ پھیلا تھا لفظ لفظ سمٹا ہوں
کس قدر پریشاں ہوں داستاں سنا کر میں
کبھی یہ غم ہے کوئی دھوپ دھوپ جھلسا ہے
کبھی یہ فکر کوئی سایہ سایہ چلتا ہے
اک نہ اک آسیب چپکے سے ابھی در آئے گا
بند کر گھر کے دریچے لاکھ دروازہ لگا

ایک بات جو اس زمانے میں ترقی پسندی
کے لئے عام ہے کہ اکثر احباب اس غلط فہمی میں مبتلا
ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ ہر ترقی پسند شاعر
لازمی طور پر کمیونسٹ ہوتا ہے اور ہر کمیونسٹ
ادیب اور شاعر لازمی طور پر ترقی پسند۔ لیکن یہ
مفروضہ صحیح نہیں ہے۔ حسرت موہانی آخری دم
تک کمیونسٹ رہے لیکن ان کے کلام میں ترقی پسند
کے عناصر بہت کم ملتے ہیں۔ اس کے برخلاف
ایسے ادیب اور شاعر موجود ہیں جن کی تصانیف
میں ترقی پسند نظریات کثرت سے موجود ہیں
لیکن سیاسی اعتبار سے وہ کمیونسٹ نہیں ہیں۔
مختار شمیم نے بھی ترقی پسند نظریہ کو قبول کیا
ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ ترقی پسند رجحان
اس کا اوڑھنا بچھونا بن جائے۔

اس کے ہاں انسانی اقدار کی پشت پناہی،
جذبات و احساس کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ
پائی جاتی ہے۔ استحصال اور استعماریت کے خلاف
بھی جھلکیاں اس کے کلام میں نظر آتی ہیں اور اس
طرح کہ اظہارِ نفرت کے باوجود رومانی ماحول برقرار
رہتا ہے ؎

چہرے جھلس رہے ہیں حوادث کی دھوپ میں
پھر بھی الم نصیب ہزاروں میں جگمگائیں
دشت ہے جنکا مقدر دیکھئے ۔۔۔ ان کی آنکھوں میں [illegible]
خود غرض لوگوں سے یارو کوئی امید فضول
یہ شجر دیں گے نہ سایہ نہ کوئی پھول نہ پھل

یہ ہانپتی گلیاں یہ رینگتی سڑکیں۔ شمیم موڑ پر ایک بوڑھا بھی لگا ہوا
مختار شمیم ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے۔ واضح
نہ سہی تاہم اس کی بھی ایک عام ہندوستانی کی
طرح ایک منزل ہے ؎

ہزاروں لوگ ہیں لیکن اُجاڑ بستی ہے
وہ ایک شخص لیکن بستیاں بسائے گا
دل کی ویرانیاں اب رشک کریں کیوں نہ شمیم
میری آنکھوں میں ہیں آباد وہ خوابوں کے محل

کسی نے بجا کہا ہے کہ لفظوں کے ملبے کے نیچے
جو شعر دبے پڑے ہیں انہیں باہر لانا اور شاعری
کی عمارت کھڑی کرنا ہی شاعر کا کام ہے۔ ورنہ
یوں تو کوئی حلوائی جلیبیاں توڑتے توڑتے غزل
کہہ لیتا ہے۔ اور اس میں زبان کا خوب چٹخارہ
ہوتا ہے۔ زبان کے چٹخارے اور زبان کے تخلیقی عمل
میں درجے کا نہیں صفت کا فرق ہے۔ شمیم کی
شاعری میں ایسے نقوش موجود ہیں جو اس تخلیقی
عمل کی طرف اشارا کرتے ہیں ؎

میرے بدن میں کوئی ٹوٹتا ہی رہتا ہے
نہ جانے کون ہے لیکن وہ اپنا ہے
تمہارے طرزِ تکلم پہ ہم نثار ہوئے
بڑے پیارے دیتے ہو گالیاں لوگو
تم زندگی کے تلخ حقائق سے بے خبر
تم کو حیات کیوں نہ سہانی دکھائی دے
اجنبی سمجھیں اسے جو ہے رگ جاں سے قریب
ذکر جس کا ہر نفس ہے نام بھی اس کا نہ لیں

غزل نے ہر دور کے حالات کی مطابقت میں
اپنے میں تبدیلی کی ہے اور اپنے دور کے تقاضوں
سے ہم آہنگ رہی ہے۔ شمیم نے جہاں غزل
کی کلاسیکی قدروں کو اپنی غزل میں جذب کر لیا
ہے تو اسی کے ساتھ اس کی غزل میں عصرِ جدید
کی تبدیلیوں اور نئی قدروں کا ادراک بھی ملتا ہے۔

سید متین کے الفاظ میں مختار شمیم غزل کے نئے لہجہ
سے متاثر ہونے کے باوجود وہ اس کے طریقۂ راسخہ
سے منسلک رہنا بطورِ خاص پسند کرتا ہے۔ اس کی
شعری فکر ایک بڑی تبدیلی کے دور سے گزر رہی ہے
اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری اپنی بدلی ہوئی
شخصیت کے ذریعہ ان دونوں اسالیب کو اک نئے
اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہر بوند سے لہو کی ہے نقشِ آرزو
زخموں سے اپنے دل کے مکاں کو سجائیں ہم
شعورِ غم کے دریچے تو وا کرو یارو
فصیلِ شب پہ اُجالا دکھائی دیتا ہے

اگر ہم رومانیت کے اس مفہوم کو مان لیں کہ
رومانیت فطرت سے اخذ و اکتساب کرتی ہے اور
رومانیت کا تعلق جذبات، احساسات اور تخیلات
سے ہے تو شمیم کی نظموں میں بھی رومانیت اضطراری
اور لاشعوری طور پر موجود ہے۔ اس کی نظمیں اس کے
اپنے جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات کی
ترجمان ہیں۔ اس کی فطرت پسندی اور حقیقت پسندی
نے ان کو بلند تخیل کی بلندی عطا کی ہے۔

کرفیو کے سائے میں
شہر کی فصیلوں پر
خاموشی کا پہرا ہے
خوف کے دریچوں سے جھانکتا ہے سناٹا
ہر مکاں سہما ہے
کس قدر اندھیرا ہے روشنی نہیں ملتی
دُور تک کہیں یارو زندگی نہیں ملتی

اس کی نظموں میں ایہام نہیں ہے۔ اشارات
قطعی عام فہم ہیں۔ کسی قسم کی تشریح یا وضاحت کی
ضرورت نہیں۔ اس نے سیدھے سادے لفظوں
میں ایک بات کہہ دی ہے اور یہی چیز شاعرانہ حسن کو
افزوں کر دیتی ہے۔ غرض مجموعی طور پر مختار شمیم کی
[illegible]

ایس ایم عابدی (لندن)

فرض کی ادائیگی

کیا آپ کے سینے میں ایک انسانی دل ہے ؟ یا گوشت کا بے جس ٹکڑا ہے ؟ آپ اپنا فرض کس طرح ادا کرتے ہیں ؟

یہ کہانی انتظار کے جان لیوا آخری لمحات کی ہے۔

بستر مرگ پر پڑے ہوئے بوڑھے کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں اپنے جگر گوشہ کا عکس جھلملا رہا تھا۔

یہ طربیہ بروکلین امریکہ کی ایک بارونق سڑک پر شروع ہوا۔

ایک ضعیف شخص سڑک پار کرتے ہوئے اچانک چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ سڑک پر تمام ٹریفک ایک دم رک گیا۔ دل کے دورے نے اس شخص کو اچانک موت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا تھا۔ پولیس کی بروقت امداد نے اسے ایمبولنس کے ذریعے کنگس کاؤنٹی ہسپتال پہنچا دیا۔ اور اس کے ورثا اور فیملی کی نشاندہی کے لئے اس کی تلاشی لی گئی۔ بوڑھا نیم بے ہوشی کی حالت میں کبھی کبھی اپنے بیٹے کو پکارتا اور پھر تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو جاتا۔ اس کی سانسیں اکھڑتی جا رہی تھیں۔

— ورثا کی نشاندہی کے سلسلے میں پولیس کی ہر کوشش رائیگاں جا رہی تھی۔

.... اچانک ایک پرانے مڑے تڑے خط نے یہ سراغ مٹی مٹی سی تحریر سے ملا کہ بوڑھے مریض کا بیٹا بحری فوج میں ملازم ہے اور شمالی کوریلیا میں مقیم ہے۔

بروکلین کے علاقے میں اس کے کسی بھی رشتہ دار کا پتہ نہ چل سکا لہذا ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ شمالی کوریلیا میں اس کے فوجی بیٹے کو اطلاع دی جائے۔ مسئلہ "ریڈ کراس" کے سپرد کیا گیا۔ اور ان لوگوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر کوریلیا کے علاقے کے "ریڈ کراس" کے مرکز سے رابطہ قائم کر کے انہیں ہدایت کی کہ وہ بحری فوجی مرکز میں مطلوبہ شخص کو اس کے باپ کی علالت کی اطلاع دیں ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ اگر بیٹے کو فوری طور پر بروکلین پہنچایا جا سکے تو دیر نہ کریں کیونکہ اس کا باپ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اس کا انتظار کر رہا ہے۔

کوریلیا میں ریڈ کراس والوں کو جب یہ پیغام ملا تو ایک جیپ میں دو آفیسر مطلوبہ شخص کی تلاش میں نکل پڑے اور فوجی علاقہ میں پہنچ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے تلاش کر لیا۔ وہ نوجوان کسی اہم کام میں مشغول تھا اور اسی سلسلے میں اسے کسی سے ملاقات کے لئے جانا تھا۔ لیکن اچانک یہ خبر سنتے ہی وہ سب کام چھوڑ کر اسی لمحے روانگی کے لئے ریڈ کراس والوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا اور ان لوگوں نے اس فوجی نوجوان کو اسی وقت ایرپورٹ لیجا کر ایک خاص طیارے میں سوار کرا دیا۔

شام کے دھندلکے گہرے ہونے لگے تھے جس وقت وہ فوجی تیز تیز قدموں سے کنگس کاؤنٹی ہسپتال کے دالان میں داخل ہو کر امرجنسی وارڈ کی طرف

بڑھ رہا تھا اس کے دل و دماغ میں عجیب سے جذبات
اُبھر رہے تھے۔ ایک نرس نے اس کو دیکھتے ہی
اپنے ساتھ لیجا کر بوڑھے کے بستر تک پہنچا دیا۔
اور بوڑھے کے کان میں یہ خوشخبری سنائی۔
"آپ کا بیٹا آگیا ہے۔"
بوڑھے کے آنکھ کھولنے تک نرس نے کئی بار
یہ الفاظ دہرائے تھے۔
بوڑھے کی آنکھیں تھکی اور درد سے سوجی ہوئی تھیں
آکسیجن کے ٹینٹ کے باہر اس نے آدھی آنکھیں
کھول کر دیکھنے کی کوشش کی...

ایک دھندلا سا سایہ فوجی یونیفارم میں کھڑا
نظر آیا بوڑھے نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ اٹھانے
کی کوشش کی فوجی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے
ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اس
کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ایک لمحہ
کے لئے ظاہر ہوئی۔ پھر کرب و بے چینی کے آثار
اس پر حاوی ہوگئے۔ فوجی نے اپنے مضبوط ہاتھوں
میں بوڑھے کے ہاتھ لیکر سہلانے شروع کئے۔
بوڑھے کو کچھ ڈھارس بندھی اور اس نے پھر آنکھیں
کھول دیں۔

نرس نے ایک کرسی قریب کردی اور فوجی
کو بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود بھی اپنے فرائض کی
ادائیگی میں مصروف ہوگئی۔
ہسپتال کی راتیں کافی طویل ہوتی ہیں.....
لیکن یہ رات فوجی نے بوڑھے کے قریب بیٹھ کر
آنکھوں میں گذار دی۔ وہ تمام رات اس کے ہاتھوں
کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے سہلاتا رہا اور تسلی کے
الفاظ بھی ادا کرتا رہا....

موت و حیات کی کشمکش میں بوڑھے کو اپنے فوجی
بیٹے کا وجود ایک سحر انگیز قوت پہنچا رہا تھا۔ نرس
نے کئی بار فوجی سے کچھ دیر آرام کرلینے یا باہر ٹہل آنے
کی فرمائش کی لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ نرس
آتی جاتی رہتی تھی۔ اس نے ہر مرتبہ اسے ایک
جیسی محویت کے عالم میں بوڑھے کو حوصلہ دیتے
ہوئے پایا۔ اس منظر پر کبھی نرس بھی کچھ دیر
کے لئے سب کچھ بھول کر دونوں کو دیکھتی رہتی
اس کی آنکھوں میں موتی کی طرح آنسو چھلک آتے
اور پھر رومال سے وہ انہیں صاف کرتی ہوئی وارڈ
میں داخل ہوجاتی اور دوسرے مریضوں کی جانب
متوجہ ہوجاتی۔

مریضوں کی کراہٹ اور آکسیجن سلنڈر کے
ادھر سے اُدھر آنے جانے کی آوازیں۔ اور اسٹاف
کی خوش گپیوں سے... وہ فوجی بے نیاز.....
بوڑھے مریض کی دلجوئی اور مسلسل تیمارداری میں مصروف
رہا۔

بوڑھے کی قوت حیات اور انسانی تدبیریں موت
کی ضد پر غالب نہ آسکیں... اور آخر بوڑھے نے
صبح طلوع ہونے سے قبل ہی دم توڑ دیا...
فوجی نے اس کا بے جان ہاتھ آہستہ سے بستر
پر رکھا اور نرس کو اطلاع دینے چلا گیا۔ نرس
اپنے کمرے میں بیٹھی دفتری کام کر رہی تھی۔ اُٹھ کر
کھڑی ہوگئی.... اور فوجی کھوئی کھوئی بوجھل آنکھوں
سے باہر کی طرف فضا کا جائزہ لیتے ہوئے جیب میں
سگریٹ کا پیکٹ ٹٹولنے لگا... اس نے پیکٹ
سے سگریٹ نکالی اور دھیرے دھیرے جلا کر کش
لیتے ہوئے خیالوں میں کھو گیا... اس کے چہرے
کے تاثرات ایک گہرے سمندر کی مانند تھے.....
جس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔
نرس کچھ دیر بعد واپس آگئی اور فوجی کے
قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہمدردانہ الفاظ
سے اس کے زخم پر پھایا رکھنے لگی... فوجی نے ان
الفاظ سے یکسر بے نیاز ہو کر نرس سے سوال کیا...

"وہ آدمی کون تھا"۔؟

"وہ تمہارا باپ تھا" نرس نے حیران کن انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ میرا باپ نہیں تھا"۔۔ آج سے قبل میں نے اس بوڑھے مریض کو کبھی نہیں دیکھا تھا"

"تو تم نے اس وقت ۔۔۔۔۔۔ یہ بات کیوں نہیں بتائی جب تمہیں ڈھونڈ کر یہاں پہنچایا گیا اور میں تم کو لیکر اس کے پاس گئی تھی۔"؟

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی غلطی ہو گئی ہے ۔ لیکن یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اسے اپنے بیٹے کی ضرورت ہے جو یہاں موجود نہیں ہے۔۔۔ اس کی تکلیف کی وہ کیفیت جبکہ وہ اپنے بیٹے کو پہچاننے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ میرے لئے ایک اَن دیکھی غیبی پکار بن چکی تھی کہ اس کو لبیک کہنا میرا انسانی فرض تھا۔۔ اس کو زندگی دلانے کے لئے میں اس کا بیٹا بنا رہا۔۔۔ اچھا اب مجھے اجازت ملیگی ؟۔

نرس دیر تک ہسپتال سے باہر جاتے ہوئے اس فوجی کو عقیدت بھری نظر سے دیکھتی رہی جس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔

صفحہ ۳۲ سے آگے

جائزہ لیں تو قنوطیت اور فراریت ہی نہیں عزم و ایقان بھی نظر آئے گا۔ اس کی شاعری میں حُسن و عشق میں کھو جانے کا جنون بھی ہے اور میدانِ کارزار میں مجاہد کا کردار ادا کرنے کا حوصلہ بھی۔

میں نے اس مضمون میں شمیم کی شاعری کے بارے میں اپنے فوری تاثر کا اظہار کیا ہے۔ اس کی شاعری کے اور بھی پہلو ہیں۔ میں بہت سی اچھی باتیں چھوڑ بھی گیا ہوں۔ بہر حال شاعر کے کارنامہ میں خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن کوئی دوست کسی دوست کی بُرائیوں یا کمزوریوں کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا۔ تاہم الفاظ کے غلط استعمال کے لئے کچھ نہ کہنا ادبی دیانت داری کے خلاف ہوگا۔ ادب میں دیانت داری سے کام نہ لے کر اگر کسی شاعر یا ادیب کے اچھے پہلوؤں کو ہی اُجاگر کیا جائے اور کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ادب کے صحت مند رجحان کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ شمیم کے اس شعر میں "وضع داری" کا غلط استعمال اُبھرتا ہے۔ ؎

کوئی تو ہے جو وضعداریوں کا قائل ہے
تمام شہر میں ڈھونڈو گلی گلی دیکھو

ایک اور بات جو بُری طرح کھلتی ہے یہ ہے کہ "گفتگو" جیسے معیاری جریدے میں اس کی ایک غزل کے دو شعر مختلف بحروں میں تا دمِ تحریر موجود ہیں۔ ایک ایسے پرچہ میں جس کے ایڈیٹر جناب سردار جعفری صاحب اُردو کے مایہ ناز شاعر ہوں اُردو غزل کے ساتھ ایسی ناانصافی۔ بھارت میں اُردو کے گرتے ہوئے معیار کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔

اک تجسس اک تڑپ اک آرزو
زندگی کو اور اب اسکے سوا کیا نام دیں

پھول، نغمہ چاند تارے حسن و عشق
ایک شیشہ ٹوٹ کر بکھرا ہے اب جو کہیں

دونوں اشعار کے مصرع ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ آپ بھی غور فرما لیجئے۔ شاید میں نے ہی غلط سمجھا ہو۔

ایس۔ایم۔عابد نقوی کا افسانوی مجموعہ
کا انتظار کیجئے جو زیرِ اشاعت ہے

آندھی کا چراغ

صابر دہلوی، چنچولی گیٹ، ملاڈ۔ بمبئی

جلنے والے سیاسی شطرنج کی بازی میں وہ ہار گئی — ایک طرف والدہ کا انتقال اور دوسری طرف جائداد کا خاتمہ، اس پر عربی کا یہ محاورہ صادق آیا۔ کہ " الاقارب العقارب" (قریبی رشتہ دار بچھوؤں سے کم نہیں ہوتے کہ ہر وقت ڈنک مارتے رہتے ہیں) نتیجتہً لکھنؤ سے بمبئی ہجرت پہ آمادہ ہو گئی۔ حالات نے پھولوں کی سیج پر بسر ہونے والی زندگی کو کانٹوں کے بستر پر لا ڈالا تھا۔ یہ تھی رضیہ کی کہانی، جو داس کی زبانی۔ دنیا کی بے انصافی نے رضیہ کے ذہن کو جلا بخشی، اس لئے زندگی کا مشاہدہ .... سمجھنے کا اندازہ، اس کا اپنا تھا۔ بلاشک وشبہ اس کی ذات تک صحیح تھا۔ ارشد کے معاملہ میں رضیہ کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ کیونکہ ارشد بھی صحرائے زندگی کا ایک ایسا خودرو پھول تھا جو ویرانی کو بہار میں بدلنے کی کوشش میں کھلتا ہے۔ اس کی زندگی اعتماد سے بھرپور تھی۔ لیکن زندگی کی یکسانیت نے جو بے کیفی پیدا کر دی تھی اس سے وہ اکتا چلا تھا اُسے اب محبت کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو رضیہ نے محسوس کیا لیکن نسوانی شرم وحیا مانع آئی۔ اس سے پہلے کہ دونوں کے تعلقات افسانہ بنیں۔ ارشد نے رضیہ کو حالِ دل سنا دیا۔ اور یوں وہ بڑی سادگی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دونوں کی زندگی بڑی پُرمسرت اور پُربہار گزر رہی تھی۔ شادی کے بعد ارشد نے رضیہ کو بیحد متاثر کیا۔

ارشد رضیہ سے متاثر تھا اور اس پر ہی کیا موقوف ہے؟ آفس کی عورتیں اور فرد سب ہی اس کے عقیدت مند تھے۔ وقت کی پابندی اور محنت یہ اس کی زندگی کا اصول تھا۔ سوئے اتفاق کہ رضیہ کی نگاہوں کا ہدف ارشد ہی بنا۔ اور وہ جلد ہی ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ مختصر ملاقاتوں کے دوران جیسے جیسے رضیہ کے حالاتِ زندگی ارشد کو معلوم ہوتے گئے، اس کی عقیدت گہری ہوتی گئی۔ رضیہ کا تعلق لکھنؤ کے نواب خاندان سے تھا۔ اس کہانی کا مختصر خلاصہ یوں ہے۔

نواب ایاز خاں شادی کے کئی سال بعد تک اولاد سے محروم رہے۔ لیکن وہ خدا کی ذات سے ناامید نہ تھے۔ آخر ایک روز خدا نے ان کا دامن تہی اُمنگوں اور مرادوں سے بھر دیا۔ رضیہ ان کی پہلی اور آخری نشانی تھی۔ اسی لئے مادرِ آغوش کی تربیت اور باپ کے بھرپور پیار نے رضیہ کو ایک بے بہا اور قیمتی موتی میں تبدیل کر دیا۔ لیکن افسوس کہ یہ ذرِ بے بہا صدف توڑ کر اپنے بے عیب ذات کے جوہر بھی نہ دکھا پایا تھا۔ کہ قرطاسِ وقت پر کاتبِ تقدیر کی تحریر دھندلی پڑ گئی۔ ایاز خاں اچانک گردشِ ایام کا شکار ہو گئے۔

اس انقلاب نے آخر رضیہ کو باپ کے سائے سے محروم کر دیا۔ تمام جائداد چونکہ رضیہ کے نام تھی۔ اس لئے جائداد کا انتظام رشتہ داروں کے سپرد کر دیا گیا بیمار ماں کو سینی ٹوریم میں داخل کر دیا۔ اور خود مزید تعلیم کے لئے رجوع ہوئی۔ اپنی اس سعی میں وہ کامیاب بھی ہوئی لیکن اس قسم کے گھروں میں کھیلے

وہ ایک مثالی شوہر ثابت ہوا۔ ایک بار پھر چرخِ اخضری نے نگاہیں بدلیں اور جس طرح شمع ایک دم بھڑک کر بجھ جاتی ہے ٹھیک اسی طرح رضیہ کی مسرتوں کا دور عارضی ثابت ہوا۔ فلکِ کج رفتار کی ایک خفیف سی جنبش نے رضیہ سے اُس کا ارشد چھین لیا۔ صرف ایک ہی سال کی بہار کے بعد اب وہ اس دُنیا میں پھر اکیلی تھی مایوسی کے گھٹا ٹوپ سیاہ سمندر میں اس خالی کشتی کی طرح تھی جس کا کوئی ملاح نہیں ہوتا۔ وہ سماج کی بے رحم موجوں اور آوارہ ہواؤں کے رحم و کرم پر تھی۔ لیکن وہ رضیہ تھی جس کی زندگی طوفانوں کے ہنگاموں سے پھر آشنا رہی، اور شبنم و نسیم کی سبک آفرینیوں سے بھی، لہٰذا وہ ہمت سے وظیفۂ حیات ادا کرنے کی تگ و دو میں لگی رہی۔ پھر بھی وہ عورت تھی۔ ایک صنفِ نازک تنہائی کے اندھیروں میں شوہر کی یاد کے ساتھ دن گزرتے رہے۔ ہر وقت اپنے آپ کو حرماں نصیب سمجھنے کا احساس اتنا غالب ہوا کہ وہ اپنے آپ سے بیزار ہو گئی۔ کبھی کام میں اس کا من نہیں لگتا۔ لباس اور امورِ خانہ سے لاپرواہ رہنے لگی۔ وہ کسی محفل کسی تقریب میں اس لئے شریک نہیں ہوتی کہ اس کا خیال تھا۔ اس کی وجہ سے رنگ میں بھنگ پڑ جائے گا۔ آخر ایک روز وہ مرنے کے ارادے سے گھر سے نکلی اور نئی زندگی پالی!

وہ عید کی چاند رات تھی۔ عید سعید کی بھرپور خوشیوں کا پیغام لے کر یہی چاند رات اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہ تھی۔ کیسی خوشی؟ کون تھا اس کا اس دُنیا میں؟ دفتر سے واپسی پر وہ تھک کر نڈھال ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر ارشد کی تصویر دیکھ کر بے اختیار رو پڑی۔

ارشد ــــ اب میں تھک گئی ہوں۔ آج کی رات اور کل کا دن کیا میں گزار سکوں گی؟ نہیں ارشد نہیں تمہارے بغیر اب میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھی۔ گھر میں تالا لگایا۔ بیگ ہاتھ میں لیا۔ اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ گئی رات تک وہ یوں ہی بلامقصد ادھر اُدھر گھومتی رہی پھر ایک بس میں سوار ہوئی اور آخری اسٹاپ تک ٹکٹ لیا۔ بس لبِ ساحل خالی ہو گئی تھی۔ کل آٹھ یا نو افراد تھے وہ اُتر کر مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ اور رضیہ ساحل کی طرف بڑھ گئی۔ ساحل ہمیشہ کی طرح اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا بپھری ہوئی موجوں کا شور اس سکوت کو توڑ رہا تھا۔ ساحل کے کنارے کچھ بنچیں بچھی ہوئی تھیں۔ جو زیادہ رات ہونے سے خالی تھیں یہ سنسان گوشہ کی طرف بڑھی۔ ذرا دُور ہی چلی ہو گی کہ ایک بنچ پر ایک بچے کو سکڑا سمٹا دیکھا جو بلک بلک کر رو رہا تھا۔ رضیہ رُک گئی وہ ایک یتیم و یسیر بچہ تھا جسے یتیم خانہ کے مہتمم نے نکال دیا تھا۔ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے دل پر ایک چوٹ لگی۔

چھ سال کی معصوم جان اور اتنی بڑی دُنیا میں زندگی کا لمبا سفر، رضیہ کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ رضیہ تم اپنے گھر سے اتنی دُور اپنی جان دینے آئی تھیں اور یہ بچہ موت کے سائے میں رہ کر زندگی کی خواہش کر رہا ہے۔ یہ بھوکا ہے۔ پیٹ کا بھی اور پیار کا بھی۔ اس کا بھوک مٹا دو رضیہ۔ اس کی حالت تم سے بھی زیادہ قابلِ رحم اور گئی گزری ہے۔ اور اسی ذہنی آندھی میں ایک ایسا چراغ جلا جو کبھی نہیں بجھتا وہ چراغ عزم کا تھا۔ مستقل مزاجی کا تھا۔ رضیہ نے بچے کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے سے اُجالے کی طرف چل پڑی۔

نغمۂ جمہور

آپ کے جانے پہچانے خادمِ اُردو
کریمی الاحسانی کا مجموعۂ کلام
قیمت آٹھ روپے علاوہ محصول ڈاک
دفتر شانِ ہند ــ نئی دہلی ۲

دِلّی انتظامیہ کی نمایاں کامیابیاں

تعلیم

۱۔ مفید اور ہمہ گیر تعلیم کا انتظام۔
۲۔ پچھلے سال ۴۵ مڈل اور ۲۳ ہائر سیکنڈری اسکول کھولے گئے۔
۳۔ ۴۴ اسکولوں اور ۳ بالغوں کے اسکولوں میں ۱۲ ویں جماعت تک پڑھائی کا بندوبست۔
۴۔ دن میں نہ پڑھ سکنے والے بچّوں کے لئے ۸۴ نئے قلیل مدت والے اسکول کھولے گئے۔
۵۔ بالغوں کو حروف شناس بنانے اور کام دھندوں میں ہنرمند بنانے کیلئے گاندھی جینتی سے خصوصی مہم شروع۔
۶۔ ۱۳ نئی اسکولی عمارتوں کی تعمیر مکمل، اور ۱۸ زیرِ تعمیر۔
۷۔ بچوں کو سنسکرت، پنجابی اور اردو پڑھانے کا اسکولوں میں خاص انتظام۔

چھوٹی صنعتیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار دینے کے لئے گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ترقیاتی اسکیم پر عمل شروع۔
۲۔ نریلا، بدانی جھانسی روڈ، پٹ پڑ گنج، وزیرپور کی صنعتی بستیوں اور بنکر کالونی بھارت نگر کی تعمیر کا کام شروع۔

ہمہ جہت دیہی ترقی۔ گاؤں کی ہمہ جہت ترقی کے لئے ۱۶.۷۵ کروڑ روپے۔
۲۔ آئندہ چار برسوں میں تمام گاؤں کے لئے پینے کا پانی اور آبپاشی کی سہولیات بہم پہنچانے کا مکمل بندوبست۔
۳۔ خصوصی ترقیاتی اسکیم کے تحت علی پور، کنجھاولہ اور نجف گڑھ ترقیاتی بلاکوں کی ترقی کیلئے ۱۵ لاکھ [illegible] کی رقم مخصوص۔

سماجی بہبود و ہریجن بہبود۔ بچوں کے عالمی سال میں سبھی بے سہارا بچوں کو سماجی تحفظ مہیا کرنے کا تہیّہ۔
۲۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے مقابلے میں ہریجن بہبود کے لئے بجٹ میں ڈھائی گنا اضافہ۔
۳۔ بوڑھوں اور بیوہ عورتوں کو پنشن دینے کی اسکیم نافذ۔
۴۔ گاؤں میں ہریجنوں اور بے زمینوں کو تقریباً ۳۳۰۰ رہائشی پلاٹوں کی تقسیم۔

تعمیرِ رہائشات۔ دلّی میں پہلی مرتبہ مکانوں کی تعمیر کیلئے ہاؤسنگ فائنانس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہے۔
۲۔ اس سال دلّی میں ۱۱ ہزار مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ۔
۳۔ ۶۷ فیصد مکانات کم آمدنی اور کمزور طبقوں کے لوگوں کے لئے۔

نشہ بندی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک مرحلہ وار مکمل نشہ بندی نافذ کرنے کا پروگرام۔
۲۔ خشک دنوں کی تعداد میں دو گنا اضافہ اور شراب کی دکانوں میں بھاری کمی۔

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلّی انتظامیہ
دِلّی

دیال سنگھ کالج

کرنال

مُشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ دیال سنگھ کالج کرنال میں طلبا کو ہمیشہ ڈسپلن، قومی یکجہتی اور مُلک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہلِ کرنال اور گرد و نواح کے طلباء کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے۔ اپنے بچّوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

اراکین منتظمہ کمیٹی

کھانا کھایا اور ڈکاروں کے لئے
اگر آپ کے جسم میں
قیمت : چھ روپے
لال کنواں ، دہلی

ٹیلیفون نمبر [illegible]		رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا رجسٹریشن نمبر ۶۳۳/۵۷		[illegible]

قیمت سالانہ
پندرہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچاس پیسے

شانِ ہند
دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

جلد ۱۴		مارچ ۱۹۷۹ء		شمارہ ۳

غزل

سر سے در دُور نہیں، سنگ سے سر دُور نہیں		صاف ظاہر ہے کہ سامانِ سفر دُور نہیں

دل میں اُتری چلی جاتی ہے ستارے کی اَنی		ہو نہ ہو اب شبِ وعدہ کی سحر دُور نہیں

کتنا خوش ہوں در و دیوار کی ویرانی سے		اس کا مطلب ہے یہاں سے مرا گھر دُور نہیں

عجز اچھا، مگر اس کی کوئی حد ہوتی ہے		تم دُعا رُوٹھ کے مانگو تو اثر دُور نہیں

نوعِ انساں کی محبّت میں سہولت ہے ندیم
دُور رہتا ہے خدا، اور بشر دُور نہیں

احمد ندیم قاسمی		(پلک)

مدیر پرکاشک سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چتلی قبر [illegible] جامع مسجد دہلی اور سرورق [illegible] پریس میں چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۳ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد

کیا شہوانی خواہش بداخلاقی ہے؟

آپ نے اکثر دیکھا اور محسوس کیا ہوگا کہ جن لوگوں کی بیویاں نہیں ہوتیں (خواہ اس کی وجہ شادی شدہ نہ ہونا یا رفیقہ حیات کا انتقال کر جانا ہو) وہ جنسی بھوک کا مظاہرہ کسی نہ کسی ڈھنگ سے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عمر کے لحاظ سے خواہ وہ جوانی کی حدیں پار کر چکے ہوں یا ستر اسی کے لپیٹے میں ہوں۔ بلکہ بوڑھے اس زمرے میں نوجوانوں سے زیادہ تیز رو ہوتے ہیں۔

عوام یہ سمجھتے ہیں کہ بوڑھوں میں جنسی خواہشات نہیں ہوتی ہیں۔ اس لئے اگر بوڑھا اپنی جنسی بھوک کے باعث کم عمر عورت سے شادی کر لیتا ہے یا کسی دوسرے طریقے سے اپنی تسکین چاہتا ہے تو سماج میں اُسے اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اُسے نفرت اور مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اخبارات میں بڑی بڑی سرخیاں نظر سے گزرتی ہیں کہ فلاں بوڑھے نے اپنی عمر سے آدھی عمر والی عورت سے شادی کر لی۔ ان وجوہات کے باعث بوڑھوں میں جنسیات کو "گناہ" سمجھنے کا خیال مضبوط ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بوڑھوں کو تنہائی میسر نہیں ہوتی کیونکہ انہیں اپنے بیٹوں۔ پوتوں کے ساتھ رہنا ہوتا ہے۔ نیز بوڑھے ہو جانے کے باعث پنشن ہو جانے یا کم آمدن ہو جانے کی وجہ سے حضرات دوبارہ شادی کرنے سے کتراتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۷۵ اور ۸۰ سال کی درمیانی عمر والے آدمی اور عورتیں بھی جنسی لحاظ سے پوری طرح توانا ہوتے ہیں لیکن بوڑھوں کو اپنے جذبات کو دبا کر اس لئے رکھنا پڑتا ہے کہ سماج کا رویہ بہت زیادہ حد تک راہبانہ ہوتا ہے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ برہمچاری کوئی رہ ہی نہیں سکتا بجز حضرت یوسفؑ، مسیحؑ کا ذکر عام اور ہم آپ سے مستثنیٰ ہے۔ شاہ اکبر نے درباریوں سے سوال کیا "شہوت مرد اور عورت میں کب تک باقی رہتی ہے؟"

نورتنوں نے مختلف جوابات دیئے جو ایک نے بات کہی اُس کی دوسرے نے تردید تاریخی واقعات سے کی۔ جب اکبر نے بیربل سے کہا کہ تم بالکل خاموش ہو، بولتے کیوں نہیں! بیربل نے کہا۔ حضور سوچ کر جواب دے سکوں گا۔

اگلے روز بیربل نے جواب دیا "انسان (مرد ہو یا عورت) جب تک ایک دانہ گیہوں کا کھا کر ہضم کر سکتا ہے شہوت باقی رہتی ہے!"

یہ جواب اکبر کو پسند آیا اور جواب بھی بالکل صحیح تھا اس موضوع پر مرحوم علامہ عشق آبادی سے ایک مرتبہ ذکر آیا تو یہ شعر فرمایا ؎

وصل کی خواہش سے برگشتہ دلِ دیوانہ ہے
کیا ہماری عمر کا لبریز اب پیمانہ ہے

اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ قوتِ شہوانی زندگی بھر قائم رہتی ہے لیکن عمر کے ساتھ علم تجربے اور مشاہدے بھی بڑھتے ہیں۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے علامہ مرحوم نے فرمایا کہ روح کی عمر اس خاکی جسم کی عمر سے کہیں زیادہ ہے۔ بعض پلید روحوں کو میں نے حسن پیکروں سے لپٹے ہوئے دیکھا ہے جسے عام طور پر آسیب یا اوپری اثر کہا جاتا ہے ؎

بعد مرنے کے بھی خواہش وصل کی باقی رہی
رنگ و بوئے حسن کی یہ آشنا پیاسی رہی
جسم خاکی تھا تو آخر خاک ہی میں مل گیا
حیف کیوں روحِ یقین گرویدۂ خاکی رہی (حضرت علامہ)

حضرت علامہ مرحوم کا زمانہ تھا کہ عوام ایسا طریقہ نہیں جانتے کہ جس سے ستر اسی برس کی عمر تک انسان میں وہ طاقت دوبارہ پیدا ہوتی رہے جو جنسی لذت میں خرچ ہو گئی ہو۔ یہ احتیاط بوڑھوں ہی کو نہیں جوانوں کو بھی چاہیے۔

جنسی لذت حاصل کرنے سے پہلے کسی قابل وید طبیب یا ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ ممسک اور ملذذ دواؤں کے ساتھ ایسی دوا یا غذا بھی تجویز کرے جس سے وہ طاقت جو برباد ہوئی

ہے دوبارہ پیدا ہو جاتے۔ ایساکر ناؔ بوڑھوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ جہاں تک میرا (حضرت علامؔ) کا تجربہ ہے وہ میں پیش کرتا ہوں۔

جان صاحب میرٹھ کے ایک نامی طبیب تھے۔ خدا نے اُن کے ہاتھ میں شفا بخشی تھی۔ خود سڈول بدن رکھتے تھے۔ بارہ مہینے سفید لباس پہنتے تھے۔ بہت خوبصورت۔ صحیح قد ہونے کے ساتھ بے حد شیریں گفتار اور ملنسار تھے۔ خود تو وہ شاعری کی علت سے پاک تھے لیکن مشاعروں کی صدارت کا فرض بخوشی ادا کرتے تھے اس لئے شعرا انہیں صدر الشعرا کہتے تھے۔ مجھ سے بحیثیت شاعر بیحد مانوس تھے۔ نباض اور قیافہ شناس ایسے تھے کہ میں نے اُن جیسا کوئی دیکھا ہی نہیں (میں) کبھی کبھی اُن کے مطب میں چلا جاتا تھا۔ بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے)۔

ایک مرتبہ فرمایا یہ نسخہ دوبارہ استعمال کیجئے (جو پہلے سے لکھ کر تکئے کے نیچے رکھ لیا تھا) کیونکہ آپ شاعر ہیں اور حُسن پرست بھی۔ ایک بار صبح ناشتہ اور دوبارہ سونے سے قبل۔ اس سے گئی ہوئی طاقت تین گھنٹے بعد پھر پیدا ہو جائے گی۔ نسخہ یہ تھا۔

مُرغی کا انڈا (جو خاکی نہ ہو) صرف زردی ململ کے چھننے میں کانچ یا چینی کی پلیٹ میں چھان لو۔ پھر اندازے سے اتنا ہی چھوٹی مکھی کا شہد اور زردی کے برابر ملائی ملا کر تینوں کو چمچے سے ملا کر کھا لیا کیجئے۔ (یعنی زردی۔ شہد اور ملائی تینوں ہم وزن) زردی کو چھاننے کی وجہ اور چھوٹی مکھی کے شہد کی پہچان بھی انہوں نے بتائی۔

لیکن جو لوگ انڈا نہیں کھاتے وہ دو دھائی خوب پکا کر چھوارے یا پھر دودھ اور ڈیڑھ تولہ شہد استعمال کر سکتے ہیں۔ چھواروں کی جگہ پنڈ کھجور بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر دانت نرم چھوارے یا کھجور کھانے کے قابل نہ ہوں تو سل پر باریک پسوا کر کھائیں۔ لیکن پہلے کسی قابل طبیب یا ڈاکٹر سے مشورہ ضروری ہے۔ کیونکہ ممکن ہے آپ کسی بیماری میں مبتلا ہوں اور اوپر والے نسخے اس بیماری میں مناسب نہ ہوں۔

سیف وقلم

"ناقابلِ فراموش" اور "جذبات مشرق" کے بعد سردار دیوان سنگھ مفتون نے ایک قابل قدر کتاب "سیف وقلم" ترتیب دی جو "ناقابلِ فراموش" کا دوسرا حصہ تھا اور اس کتاب کے مسودہ میں اُنہوں نے یقیناً ناقابلِ فراموش سے کہیں بہتر اپنے مضامین کو ترتیب دیا تھا۔ دہلی کے اعلیٰ پریس میں اس کتاب کی کتابت شدہ کاپیاں اور پچاس ایلومینیم کی پلیٹیں اور کاغذ نیز چھ سو روپیہ نقد پیشگی دیا گیا تاکہ یہ کتاب جلد از جلد چھپ سکے۔ مگر اعلیٰ پریس کے مالک اور اُن کے صاحبزادے نے پلیٹیں بیچ کھائیں چھ فرمے چھاپ دیئے۔ کچھ کاغذ خرد بُرد کر دیا اور کہا کہ اٹھارہ پلیٹیں چوری ہو گئی ہیں۔ لہٰذا ان اٹھارہ پلیٹوں پر جمی ہوئی کتابت شدہ کاپیوں کا میٹر برائے کتابت دیا گیا۔ مگر اس مسلمان مالک پریس نے نہ تو اپنے خدا کا ڈر محسوس کیا اور نہ اسے یہ خیال آیا کہ مرنے کے بعد قبر میں اس کی لاش کو سانپ اور بچھو کھائیں گے۔ اور سب کچھ ڈکار گیا۔ ایڈیٹر شان ہند کی تمام کوششیں بیکار گئیں اور اس پیر فرتوت نے دنیائے اُردو کو ایک یادگار کتاب سے محروم کر دیا۔ سیف وقلم کی اشاعت کی خواہش دل میں ہی لے کر سردار دیوان سنگھ مفتون اس جہاں سے چل دیئے۔ ایک سکھ اخبار نویس نے اعلیٰ پریس والوں سے چھپے ہوئے فرمے کچھ بچی ہوئی پلیٹیں اور کچھ کاغذ کسی طرح وصول کیا (نقد روپیہ خرد بُرد کیا ہوا کاغذ اور مفروضہ چوری شدہ پلیٹیں آج تک واپس نہیں کیں) اور چالیس رم کاغذ محترمہ ممتاز مرزا نے بھی اس سکھ اخبار نویس کے حوالے کر دیا۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس سکھ ایڈیٹر نے نہ تو اس کتاب کو شائع

کیا (جس قدر مسودہ بچ رہا تھا) اور نہ ہی یہ تمام چیزیں سردار صاحب کے لڑکوں کے حوالے کیں تاکہ وہی اس کتاب کے بچے کچھے مسودہ کو شائع کراتے۔

کیا کوئی اخلاقی ضابطہ ایسا ہے جس سے اعلیٰ پریس کے مالک اور اس سکھ اخبار نویس کی موجودہ روش میں تبدیلی آسکے اور انہیں یہ احساس ہو سکے کہ انہوں نے اس کتاب کو منصۂ شہود پر نہ لانے کی جو غیر ادبی کوشش کی ہے وہ تا حشر ان کو دلی چین نہ لینے دے گی۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے اپنی زندگی میں تو اس قسم کے بدعہد۔ بددیانت اور بدخواہوں کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ نہ معلوم اُن کی رُوح نے اب تک ان ادب دشمن لوگوں کو کیوں معاف کر رکھا ہے؟

علامہ عشق آبادی کی عروضی تصنیفات

بلا شک و شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علمِ عروض میں جو مقام علامہ عشق آبادی (جناب بی سی بھٹناگر) کو خدا نے عطا کیا تھا اسکی نظیر روئے زمین پر نہیں مل سکتی۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اُن کی ایک بھی تصنیف عروض پر شائع نہ ہو سکی۔

حالانکہ ذاکر عثمانی راویری ایسے متبدی شعرا نے علامہ سے عروضی سوالات کے جوابات حاصل کر کے آپنے آپ کو ماہرِ عروض سمجھ لیا ہے جناب آمر اسورتی نے بھی علامہ سے خط و کتابت کے ذریعہ عروضی معاملات پر واقفیت حاصل کر کے ایک کتاب ترتیب دے لی۔ اس طرح کچھ اور حضرات نے بھی مانگے کے اجالے سے اپنے گھر کے بام و در روشن کرنے کی کوشش کی مگر ایڈیٹر شان ہند کی طرف سے یہ اعلان شائع ہونے پر کہ علامہ کے جس قدر عروضی مضامین شان ہند میں شائع ہوئے ہیں اُن کے جملہ حقوق شان ہند کے لئے مخصوص ہیں لہٰذا کسی نے بھی ان مضامین کو کلاً یا جزواً اپنے نام سے استعمال یا شائع کیا تو انہیں دہلی کی عدالت میں جواب دہی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ان حضرات نے ابھی اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل نہیں کی ایڈیٹر شان ہند کے علم میں ہے کہ جناب عظیم صاحب کے پاس علامہ کی عروضی تصنیف و تالیف کے کچھ مسودے موجود ہیں اور علامہ نے عظیم صاحب کو ان مسودات کو شائع کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لہٰذا عظیم صاحب سے گذارش ہے کہ وہ کسی بھی طرح اس علمی دولت سے دنیائے ادب و شائقینِ عروض کو محروم نہ رہنے دیں اور ان مسودات کو شائع کرائیں۔ ایڈیٹر شانِ ہند اس سلسلے میں ہر خدمت کے لئے تیار ہے۔

یادوں کا جشن

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اپنی زندگی کے قابلِ ذکر واقعات لکھ رہے ہیں جو بہت جلد "یادوں کا جشن" نام سے کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ جناب سحرؔ صاحب کی خواہش ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی بھی اہم اور دلچسپ واقعہ اگر اُن کے کسی دوست یا شناسا کو یاد ہو تو وہ انہیں اس واقعہ سے مطلع فرمائیں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ واقعہ خود سحرؔ صاحب کو یاد نہ رہا ہو۔

مصنفین کی خدمت میں ایک اہم گزارش

جب بھی آپ کی کوئی تصنیف خواہ وہ کسی موضوع پر ہو۔ (ترجمہ نہیں)، شائع ہونے والی ہو تو ہمیں اسکی تفصیلات سے آگاہ کیجئے۔ ہم اس کی پچاس جلدیں نقد خرید لیں گے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ کتاب مُلک بھر میں سب سے پہلے ہمیں بھجوائی جائے اور کم از کم ایک ہفتہ بعد کسی دوسرے دوکاندار یا خریدار کو دی جائے۔ کتاب کی تفصیل کے ساتھ یہ بھی لکھئے کہ آپ زیادہ سے زیادہ تاجرانہ کمیشن کیا دیں گے۔ خاص خاص موضوعات پر بہترین کتابیں ایک سو کی تعداد میں بھی خریدی جا سکتی ہیں مگر اس صورت میں آپ دہلی کے کسی دوسرے کتب فروش کو کتاب کم از کم چھ ماہ تک نہ بھجوا سکیں گے۔ اگر آپ کی کوئی کتاب شائع ہو چکی ہو تو اسکی ایک جلد بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ہمیں بھجوایئے اور آپ جو زیادہ سے زیادہ تاجرانہ کمیشن دے سکتے ہیں وہ بھی لکھئے۔ اگر آپ کی کتاب کی کھپت ہمارے ہاں ممکن ہوگی تو کم از کم پچیس جلدیں ضرور خریدی جائیں گی وگرنہ آپ کی کتاب واپس بھیجدی جائیگی۔ اگر آپ کی کوئی تصنیف اشاعت کے لئے تیار ہے اور آپ کسی وجہ سے اُسے شائع نہیں کرا سکتے تو اس سلسلے میں آپ ہم سے رجوع کر سکتے ہیں۔ (مین

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

آئینِ محبت

توصیف علوی عاصی بی اے کیرانوی

آؤ ہم عہد کریں اُلفتِ باہم کے لئے
آؤ ہم عہد کریں راحتِ عالم کے لئے
آؤ ہم عہد کریں عزمِ مصمم کے لئے
آؤ انساں کو مساوات و اخوت دیدیں
آؤ اس دور کو آئینِ محبت دیدیں

آؤ ہر دل سے محبت کی قسم کھا کے اُٹھیں
آؤ آدابِ رفاقت کی قسم کھا کے اُٹھیں
آؤ انسان کی عظمت کی قسم کھا کے اُٹھیں
زندگی کو نئے شہپاروں کی دولت دیدیں
آؤ اس دور کو آئینِ محبت دیدیں

آؤ عالم کو محبت کا گلستاں کر دیں
آؤ ہر گوشہ کو گلزار بداماں کر دیں
آؤ ہر سمت نیا رنگِ بہاراں کر دیں
ذرّہ ذرّہ کو نیا نورِ حقیقت دیدیں
آؤ اس دور کو آئینِ محبت دیدیں

آؤ ہر غنچہ کو راحت کا تبسم بخشیں
آؤ ہر ساز کو خوشبوں کا ترنم بخشیں
آؤ ہر لب کو صداقت کا تکلم بخشیں
آؤ دُنیا کو نئی صبحِ مسرت دے دیں
آؤ اس دور کو آئینِ محبت دیدیں

آؤ رنگین کریں اُنس و محبت کا چمن
آؤ سکھلائیں زمانہ کو اخوت کا چلن
آؤ اُلفت کے بہائیں نئے ہم گنگ و جمن
آؤ انسان کو اخلاص کی دولت دیدیں
آؤ اس دور کو آئینِ محبت دیدیں

آؤ ہر اِک کنھیا کا جگا کر دیکھیں
آؤ چشتی کے ترانوں کو سُنا کر دیکھیں
آؤ نانک کا [illegible] پڑھا کر دیکھیں
آؤ دُنیا کو نئے فکر کی دعوت دیدیں
آؤ اس دور کو آئینِ محبت دیدیں

آؤ ہم ایک کریں ایک کریں نقشِ قدم
آؤ ہم ایک کریں ایک کریں لوح و قلم
آؤ ہم ایک کریں ایک کریں دیر و حرم
آؤ ناقوس و اذاں کو نئی رنگت دیدیں
آؤ اس دور کو آئینِ محبت دیدیں

ظہورِ قدسی کا ایک ورق

حضرت علامہ آرزو سہارنپوری

محمدؐ سے مل کر نہ کیا مل گیا
خدا کی طلب تھی خدا مل گیا

محمدؐ کا کیا نقشِ پا مل گیا
مجھے عرش کا راستا مل گیا

نظر سبز گنبد سے کیا لڑ گئی
مقاماتِ دل کا پتا مل گیا

مجسّم محبت، سراپا کرم
عجیب ایک مردِ خدا مل گیا

طریقِ محبت میں کس سے کہیں
کہ کیا کھو گیا اور کیا مل گیا

کرم اور رسولِ خدا کا کرم
جو مانگا تھا اُس سے سوا مل گیا

کہاں اُن کے گیسو کہاں آرزو
کہاں سے کہاں سلسلہ مل گیا

سرور تونسوی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

ایک روز ازرشِ مولوی صاحب کو مولوی سمیع اللہ صاحب قاسمی (مرحوم) مالک مکتبہ خانہ عزیزیہ اردو بازار دہلی نے سردار دیوان سنگھ مفتوں کے ہاں بھجوایا اور تعارفی خط میں لکھا کہ مولوی صاحب فارسی کے عالم ہیں۔ چونکہ شاہِ ایران (افسوس کہ شاہ اب سابق شاہ ہوکر رہ گئے ہیں) مع ملکہ فریا (افسوس کہ اس ملکہ نے اس قابلِ احترام اعزاز کو پلید کر دیا) ہندوستان تشریف لا رہے ہیں۔ چونکہ آپ کے تعلقات سفارت خانہ ایران کے سکریٹری جناب اخلاق مرزا سے دوستانہ ہیں۔ اُن سے کہہ کر مولوی صاحب کا منظوم نذرانۂ عقیدت شہنشاہ ایران کی خدمت میں پیش کرا دیجئے۔

سردار صاحب نے مولوی سمیع اللہ صاحب کا یہ خط پڑھا تو ایک بھرپور نگاہ مولوی صاحب پر ڈالی۔ سردار دیوان سنگھ مفتون کی بھی حسِ مزاح نے چٹکی لی اور سردار صاحب نے فاتحانہ قہقہہ لگاتے ہوئے چپراسی کو آواز دی اور حکم دیا کہ سرور صاحب کے یہاں جاؤ اور اسی وقت اپنے ساتھ لے کر آؤ۔

بے وقت، سردار صاحب کی طرف سے بلاوا آنے کے دو ہی مقصد ہوا کرتے تھے۔ مالی پریشانی یا کوئی ایسا مزاح پھنس گیا ہے جس سے کچھ شامیں پُرلطف گزر سکیں گی۔ چپراسی سے پوچھا کہ سردار صاحب اکیلے تھے یا کوئی اور بھی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک مولوی اُن کے پاس بیٹھے ہیں اور سردار صاحب زور زور سے ہنس رہے تھے (حالانکہ سردار صاحب نے زندگی بھر آہستگی سے نہیں ہنسا) چپراسی کی اس نشان دہی نے واضح کر دیا تھا کہ معاملہ گھمبیر نہیں بلکہ پُرلطف ہے۔ سردار صاحب کے حکم کی تعمیل فوری کی گئی۔ دیکھا تو سردار صاحب اور مولوی صاحب جوب میں تھے۔ ... سردار صاحب نے میرا تعارف مولوی صاحب سے اس انداز سے

کرایا کہ جیسے شاہ آریہ مہر میرے مشورہ سے مولوی صاحب کو لاکھوں روپے انعام کے طور پر بخش دیں گے۔ سردار صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ وہ اپنا فارسی میں کہا ہوا منظوم عقیدت نامہ مجھے دکھائیں۔ مولوی صاحب نے جھٹ تھیلے معمولی سے فریم میں جڑا ہوا منظوم عقیدت نامہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے بظاہر بڑے غور کے ساتھ اس عقیدت نامہ کو پڑھا۔ اشعار بے وزن، فارسی اس قدر غلط کہ مجھ ایسا غیر فارسی داں بھی مولوی صاحب کی اس "فارسی دانی" پر زیرِ لب مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں نے سردار صاحب سے مخاطب ہوکر گزارش کی کہ سردار صاحب اول تو اس عقیدت نامہ کا فریم سیاہ رنگ کا ہے جو بدشگونی ہے۔ اس لیے فریم سنہری اور قیمتی ہونا چاہیئے۔ دوسرے مولوی صاحب نے جو فارسی لکھی ہے کوئی بھی ایرانی نژاد سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ اس لئے اگر منظوم کی بجائے نثر میں عقیدت نامہ پیش کیا جائے تو بہتر رہے گا اور نثری عقیدت نامہ جناب مرزا صاحب یا اُن کی بیگم ممتاز مرزا صاحبہ سے لکھوایا جائے کیونکہ وہ جدید فارسی میں ہوگا۔ جسے اعلیحضرت اور ملکۂ عالیہ پسند فرمائیں گے۔ سردار صاحب نے فرمایا کہ مرزا صاحب کو فون کرو۔ آج شام کو مرزا صاحب مع مرزائی (ممتاز مرزا) سے معافی کے ساتھ تشریف لائیں اور سخت تاکید کر دو کہ ضرور آئیں اور کھانا بھی یہیں کھائیں۔ مرزا صاحب کو فون کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ مولوی صاحب شام کو سات بجے تشریف لے آئیں تاکہ اس معاملے پر پوری کیبنٹ غور کر سکے۔

شام کو کلب کے سب ممبران جمع ہوئے تو مولوی صاحب کا معاملہ زیرِ غور آیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ نذرانۂ عقیدت میں ردّ و بدل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو مولوی صاحب کے

جذباتِ دلی کا اظہار ہے۔ اس میں اصلاح کیسے ہو سکتی ہے شاہ مولوی صاحب کی دلی عقیدت کو دیکھیں گے نا کہ زبان دانی یا فریم کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ شاہ پرسوں تشریف لا رہے ہیں۔ اگلے روز جمعیتہ العلماء ہند اُنہیں عصرانہ دے رہی ہے۔ بہتر ہے کہ مولوی صاحب اس تقریب میں عقیدت نامہ پیش کریں۔ اس پر سردار صاحب نے کہا کہ مرزا جی کیا غضب فرما رہے ہیں آپ۔ وہ کانگریسی مولوی انعام کا سارا روپیہ خود کھا جائیں گے اور ان مولوی صاحب کو کچھ نہیں دیں گے۔ ان کا تو الگ سے معاملہ کرائیے۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ اچھا نماز جمعہ کے بعد اعلیٰ حضرت سفارت خانہ ایران تشریف لائیں گے۔ ان کو وہاں بھجوا دیجیے گا تو کوشش کی جائے گی کہ مولوی صاحب اعلیٰحضرت کی خدمت عالیہ میں اپنا نذرانہ عقیدت پیش کر سکیں۔ چار دنوں تک مولوی صاحب کو خوب خوب تفریح طبع کا نشانہ بنایا گیا۔ آخر جمعہ کے دن مولوی صاحب ایرانی سفارت خانہ پر تشریف لے گئے تو وہاں پولیس والوں نے اُنھیں سفارت خانہ کے نزدیک نہ آنے دیا۔ مولوی صاحب چلاتے رہے اور فریم شدہ نذرانۂ عقیدت پولیس والوں کو دکھاتے رہے۔ مگر پولیس والوں نے مولوی صاحب کو پاگل سمجھ کر سفارت خانہ سے دو سو گز تک دُور رکھا۔ شام کو جب ہم سردار صاحب کے یہاں پہنچے تو مولوی صاحب کی بدحواسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ نیز مرزا صاحب پر سخت برہم تھے اور یہ راز افشا فرما رہے تھے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا فائدہ ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔ مرزا صاحب کو حسد ہو گیا کہ اس مولوی کو اعلیٰ حضرت انعام و اکرام سے نوازیں گے۔ اس پر سردار صاحب نے چٹکی لی اور کہنے لگے مولوی صاحب آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ ابھی مرزا صاحب آتے ہی ہوں گے۔ آج اُن سے یہ بات کریں گے کہ وہ انعام دلا دیں۔ پچیس فیصد ان کو کمیشن دے دیا جائیگا مسٹر امیر چند کھنہ فرمانے لگے سردار جی پچیس فیصدی کم ہے نصف رکھیے تو مرزا صاحب لالچ کے زیرِ اثر انعام دلائیں گے بھی اور انعام کی رقم بھی زیادہ سے زیادہ کرانے کی کوشش فرمائیں گے۔ اس تجویز کو ہم سب نے پسند کیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مرزا صاحب مع ممتاز مرزا صاحب کے تشریف لائے تو سردار صاحب نے اُنہیں پہلے تو بناوٹی طور پر غصّہ سے کہا کہ دیکھیے مرزا صاحب آپ نے ہمارا بھی خیال نہیں رکھا۔ مولوی صاحب سفارت خانہ پر گئے اور آپ ان کو باہر لینے تک نہیں آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والوں نے انہیں سفارت خانہ سے ایک فرلانگ تک دور رکھا اور یہ دھکے کھا کر واپس آ گئے

مرزا صاحب نے پہلے تو رواں دواں فارسی بولتے ہوئے مولوی صاحب پر اپنی فارسی دانی کا سکّہ جما لیا اور پھر کہنے لگے کہ ہم اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری کے انتظامات میں مصروف تھے۔ وہاں مولوی صاحب کا کسے ہوش تھا۔ خیر اب فرمائیے کیا حکم ہے کیونکہ اعلیٰحضرت کل صبح آگرے تشریف لے جا رہے ہیں اور پرسوں بمبئی تشریف لے جائینگے۔

سردار صاحب نے فرمایا ہم کچھ نہیں جانتے آپ تو یہ کیجیے کہ مولوی صاحب کا نذرانۂ عقیدت لے جائیے اور اعلیٰ حضرت کو پیش کر دیجیے اور جو بھی وہ انعام دیں نصف آپ کا اور نصف مولوی صاحب کا۔ اس پر ایک نعرہ پسندیدگی لگا اور مرزا صاحب نے یہ پیشکش اس انداز میں قبول فرمائی کہ نصف انعام مولوی صاحب کا اور نصف رقم مشترکہ طور پر کھانے پینے کے پروگرام میں صرف ہوگی۔

مولوی صاحب نے فریم شدہ نذرانہ عقیدت مرزا صاحب کو تھمایا تو مضطر ہاشمی صاحب فرمانے لگے ع
سپردم بتو مایۂ خویش را۔ اعلیٰحضرت واپس ایران بھی پہنچ گئے۔ مولوی صاحب ہر شام کو سردار صاحب کے ہاں حاضر باش شاگرد کی طرح عین وقتِ مقررہ پر آ جاتے اور مطالبہ کرتے کہ مرزا صاحب کو بُلائیے مگر مرزا صاحب کا کہیں پتہ نہیں۔ سب نے بڑے رازدارانہ طور پر مولوی صاحب کو بتایا کہ مرزا صاحب نے اعلیٰحضرت سے انعام کی رقم تو لے لی

اور اب وہ آپ کو کچھ دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے مُنہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ جب چار پانچ روز تک مرزا صاحب تشریف نہیں لائے تو سردار صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ مرزا صاحب کے مکان پر چلے جائیے۔ مرزا صاحب کی رہائش سفارت خانہ میں ہی تھی۔ دوسرے دن مولوی صاحب مرزا صاحب کے یہاں گئے تو انہوں نے اُن سے وعدہ کیا کہ آج شام کو وہ ضرور سردار صاحب کے ہاں آئیں گے۔ شام کو مرزا جی آئے تو مولوی صاحب کا نذرانہ عقیدت اُن کے ہاتھ میں تھماتے انہوں نے واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ اعلیٰحضرت سے بات ہی نہ ہو سکی۔ اس لئے اب یہ ہی طریقہ مناسب رہے گا کہ یہ عقیدت نامہ بذریعہ ڈاک اعلیٰحضرت کو بھجوا دیا جائے۔ مولوی صاحب کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا اور وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں تھے۔ سردار صاحب نے فوراً اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے مجھے حکم دیا کہ یہ عقیدت نامہ کل بذریعہ رجسٹرڈ پارسل اعلیٰحضرت کو ایران بھجوا دیا جائے۔ میں نے جملہ حاضرینِ محفل کی خدمت میں گذارش کی کہ فریم شدہ عقیدت نامہ پارسل کرنے میں دقت آئے گی۔ صرف کاغذ پر لکھا ہوا عقیدت نامہ لفافہ میں رجسٹرڈ پوسٹ ایر میل سے بھجوا دیا جائے۔ مرزا صاحب نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور فریم میں سے نذرانہ عقیدت جو مولوی صاحب نے خود کتابت کیا ہوا تھا نکالا گیا اور اسی وقت ایک لفافہ میں بند کر کے سردار صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا کہ کل دفتر کھلنے پر پوسٹ کر دیا جائے گا۔

مولوی صاحب ایک ماہ تک مزید تفریح کا سامان بنتے رہے۔ آخر جب اُن کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا تو سردار صاحب نے مولوی صاحب سے رازدارانہ انداز میں کہا کہ میرے خیال میں شاہ ایران نے روپیہ بھجوا دیا ہے مگر مرزا صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا ہوگا۔ دو چار دنوں تک مولوی صاحب کے دل میں یہ بات بٹھاتے رہے۔ مولوی صاحب اچھی طرح سے مرزا صاحب سے بدظن ہو چکے تھے۔ لہٰذا ایک شام کو جونہی مرزا صاحب تشریف لائے تو انہوں نے مرزا صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ دیکھیے صاحب میرا انعام تو شاہ ایران نے بھجوا دیا ہے مگر آپ نے اُسے دبا رکھا ہے۔ کیونکہ شاہ ایران نے تو اپنے سفیر ہی کو لکھا ہوگا کہ مولوی صاحب کو اتنی رقم انعام میں دیدیجئے۔

اب مرزا صاحب جس قدر اپنی صاف نیتی کا ثبوت دے رہے ہیں مولوی صاحب کو اُن کی بددیانتی کا اُتنا ہی زیادہ یقین ہو رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولوی صاحب ایک دم جلال میں آ گئے اور کُرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ میں پولیس میں رپورٹ درج کراؤں گا اور سفیر ایران کے پاس جاؤں گا اور مرزا صاحب کی شکایت کروں گا کہ انہوں نے میرا انعام کھا لیا ہے۔ بس پھر کیا تھا سردار صاحب کے قہقہے تھے کہ سارا محلہ سُن رہا تھا اور مرزا صاحب کہہ رہے تھے۔ سردار صاحب اس بیچارے کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اب اُسے مزید اُلّو نہ بنائیے۔ جب سردار صاحب مقوی دل و دماغ قہقہے لگا چکے تو مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے معاف کیجئے مولوی صاحب یہ سارا ڈرامہ تھا۔ مرزا صاحب ایسے معزز دوست پر تو فخر کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ میں نے اس مذاق کو جاری رکھنے کے لئے آپ کو مرزا صاحب کے بارے میں مشکوک نظریہ قائم کرنے کی رائے دی۔ سردار صاحب نے ایک سو روپیہ مولوی صاحب کو نذر کئے اور کہا کہ آپ بھی معاف فرمائیے گا۔ یہ ایک سو روپیہ میری طرف سے انعام لیجئے۔ پھر مولوی صاحب سردار صاحب کے ہاں تشریف نہیں لائے اور ہم سب کسی نئے شکار کے انتظار میں رہے۔

بہ کوئے یار . . . .

یہ مضامین کتابی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں اپنی فرمائش بھجوائیے۔ نیز اپنی رائے گرامی سے بھی مطلع فرمائیے۔

ڈاکٹر آہ کا فلسفۂ حیات

زرینہ ثانی

ڈاکٹر صفدر آہ کی علمی و ادبی تصانیف شائع ہوکر اہلِ ذوق و نظر سے خراج وصول کر چکی ہیں، مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہو چکی ہیں اور ان پر انعامات بھی ملے ہیں۔ "ہندوستانی ڈراما" ڈاکٹر آہ کی مایۂ ناز تصنیف ہے اور اردو ادب میں گراں قدر اضافہ۔ اس کتاب میں فنِ ڈراما کے لوازمات اور ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی باریکیوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر انعام مل چکا ہے "فردوسئ ہند" بمبئی یونیورسٹی کے ایم۔اے اُردو کے نصاب میں شامل رہی ہے یہ ایک بصیرت افروز کتاب ہے جس میں مرثیہ نگاری کے فن پر فاضلانہ تنقید کی گئی ہے اور فردوسئ ہند فارغ شاگردِ انیس کے مرثیہ کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب پر یو۔پی گورنمنٹ اور مہاراشٹر ایوارڈ کمیٹی کے انعامات مل چکے ہیں "گلبن" آہ کی ترقی پسند نظموں کا مجموعہ ہے۔ "زمزمہ" میں اُن کی رباعیات ہیں۔ آہ کی رباعیات پر میں نے ایک مقالہ لکھا جو "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہوا۔ بعد میں میرے تنقیدی مضامین کے مجموعہ میں شامل ہوا۔ "نو بہ نو" مثنوی ہیں فلسفہ الٰہیات پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے بقول صفدر آہ "نو بہ نو" نے معتقدات اور روایات پر ایک ضربِ شدید لگائی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں وہ واضح حقیقتیں ہیں جن کے سامنے قوتِ انکار ماؤف اور معطل ہو جاتی ہے۔ "امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر" میں خسرو کی ہندی شاعری پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے "میرا اور میریات" تحقیقی اور تنقیدی ادب میں شاندار اضافہ ہے۔ ان کا حالیہ ناول "لال قلعہ" ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۶ء تک حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ فلسفۂ میر، تکمیل ہماقومی زبان۔ تعلیم بالغان۔ انجام محبت، گناہ کی دھار، آہِ رسا، آہ کے سو شعر وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر آہ ہمارے ادب میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں اور بلند مقام پر فائز۔ ان کے کلام سے ہمیں روشنی اور توانائی ملتی ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ گلبن کا انتساب "بنامِ زندگی" ہے اور اسی سے ان کا نظریۂ زندگی نمایاں ہوتا ہے۔ وہ مریضانہ ذہن کی طرح زندگی سے فراریت اور پناہ کے خواہاں نہیں۔ بلکہ مردانہ وار زندگی کو جھیلنے کے لئے ہمیں بھی راغب کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی ہمہ گیری اور ازل تا ابد اس کی حکمرانی پر یقین رکھتے ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک ایک مصباحِ ابد اور نورِ ازل ہے شعر و فن میں نکھار اور جلا زندگی کی جلوہ ریزیوں سے پیدا ہوتی ہے۔

نظم "انسان کبھی نہیں مرتا" میں انہوں نے زندگی پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ نظم کی ابتدا میں انسانی نفسیات اور فطرت کو واضح کیا ہے۔ انسان کو سدا موت کا خوف رہتا ہے مگر موت بے حقیقت ہے۔ موت اور زیست حبابوں کا گرنا اُٹھنا ہے۔ فنا کی کوئی حقیقت نہیں، زندگی کا خط کہیں شکستہ نہیں۔ وہ تواتر اور تسلسل سے آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہمیں عالمِ موجودات میں بکھری ہوئی ملیں گی۔ حیات جزو کو نہیں سمجھتے۔ یہ ایک عمل مسلسل ہے حال ہی ماضی و مستقبل کے درمیان کا ربط ہے۔ اس ربط کو عملِ پیہم سے مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ حال میں رنگ بھر کر فردا کی وضاحت ممکن ہے۔

ڈاکٹر آہ ادب میں ایک مجتہدانہ حیثیت

رکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ دُور رس ہے۔ انہوں نے اپنی عمر کے طویل حصے میں بے شمار تجربے کئے ہیں۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ بے حد وسیع ہے اور اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو فنی جلا دے کر نظموں میں سمویا ہے۔ اور زندگی کی عظمت و بلندی کی نشاندہی کی ہے۔ زندگی صرف قدیم ہی سے عبارت نہیں۔ زمانے کے تقاضے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ سماج کے رجحانات بدلتے ہیں۔ فرد کے احساسات اور جذبات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آہ ان تبدیلیوں سے گریزاں نہیں اور نہ ان کی اہمیت سے منکر ہیں۔ بلکہ زیست کے بدلتے ہوئے صالح اقدار کو انہوں نے سراہا ہے۔

ان کی مختلف نظموں سے انسانی زندگی کی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ اسپننک انسان کبھی نہیں مرتا۔ نئی قدریں ابن آدم کا عزم۔ پیش رو پیش نظر وغیرہ نظمیں ان کے فلسفۂ زندگی کو واضح کرتی ہیں موت زندگی ہی کا پیش خیمہ ہے اور ہستی کا انجام عدم عالم موجودات میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں بیج اس کے بعد نئی کونپل، برگ و بار سے لدا پھندا درخت اور درخت کے عدم کے بعد پھر بیج۔ یہ سلسلہ عدم و وجود تواتر کے ساتھ جاری اور ساری ہے۔ فنا حقیقتاً حیات تازہ کا نکتۂ آغاز ہے مفقود بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اصل سے حقیقت ہے جس کے دو رنگ ہیں۔ عدم و وجود۔ زندگی مٹتی ہے اور نہ ہی فنا ہوتی ہے۔ حیات بعد ممات کا فلسفہ کسی نہ کسی صورت میں ہر مذہب میں پایا جاتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی تو اناعناصر سے پُر ہے۔ زندگی ..... سے مٹ نہیں سکتی۔ یہ ازل سے ابد تک جاری ہے۔

آہ زندگی کی اعلیٰ قدر پر یقین رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ قدروں میں زمانے کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوتی ہیں کیونکہ قدروں کے جمود و خمود سے زندگی میں بھی سکوت و سکون پیدا ہو سکتا ہے جو موت کا مترادف ہے۔ اسی لئے آہ نے زندگی کی نئی قدروں کو خوش آمدید کہا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ان کی شاعری انسانی تہذیب و فراست کی نمائندگی کرتی ہے اور جذبہ و حکمت کے توازن کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے خود آگہی کا درس دیا ہے اور حقیقت یہ ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

انسان کی طاقت اور صلاحیت بے پناہ ہے اسی صلاحیت کے اظہار سے وہ زندہ جاوید ہو سکتا ہے اور تکمیل کے مراحل نہ صرف طے کر سکتا ہے بلکہ کر رہا ہے۔ چاند کی سرزمین پر انسان کا قدم رکھنا، دوسرے سیاروں کی طرف بڑھنا، فضا کو زیرِ نگیں لانا یہ سب اسی کی صلاحیت اور عظمت کے مظہر ہیں۔ زندگی کی سرخروئی اسی میں مضمر ہے اور یہی ہے عبارت زندگی۔

زندگی کی توانائیوں پر ایمان رکھنے والا رجائی ہوتا ہے اور آہ بھی ایک رجائی انسان ہیں۔ انہوں نے اکابِ حیات کو ملحوظ رکھا ہے اور دوسروں کو بھی صبح کی روشنی پر نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ انسانی عظمت و بلندی کے یہاں تک حامی ہیں کہ تسخیرِ انسان کے سلسلے میں کہہ اُٹھتے ہیں ؎

اب خداؤں کی حکومت چھین لی انسان نے
واہمہ کے گر پڑے اصنام باعجز و نیاز

اور یہ نظریہ اُن کی مشہور و معروف فلسفیانہ مثنوی توبہ نو میں زیادہ وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے جب وہ کہتے ہیں

ہے خدا کی یہ ہستیٔ مبہم
ظنِ انساں کا وضع کردہ صنم

فی الحال شریعت اور اس عقیدے کے تصادم کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے۔

بھارت کے سیکولر نظام میں مُطالعۂ اقبال

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی - پرنسپل ایس ایس کالج ہیلا کاندی آسام

ہندوستان کے آئین کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سابق وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں منعقد (کل ہند سوشلزم اور جمہوریت کی مجلس معلمین) کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

" آج کل ہمارے آئین کی بنیادی خصوصیات سے متعلق بڑی بحث وتمحیص جاری ہے .... ہم نے اس آئین کو ترتیب دی ہے - ہم یوں ہی لڑھکتے ہوئے از خود اس سمت کو نہیں پہنچے - آزادی کیلئے لڑنے والے اور جان دے دینے والے .... ہمارے لیڈروں نے آج کے ہندوستان کی تعمیر کی اور بڑے غور و خوض کے بعد اس سمت میں گامزن ہوئے - اس آئین کے سوا کوئی اور نعم البدل ممکن ہی نہ تھا ہندوستان جیسے بڑے اور رنگا رنگ ملک میں اتحاد و ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے اسی آئین کو آئندہ ترقی و خوشحالی کی اساس بنایا جا سکتا تھا .... پہلی خصوصیت سیکولرازم تھی کیونکہ سیکولرازم میں تمام مذاہب کو ایک آنکھ دیکھنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے - اس کے یہ معنی کبھی نہیں ہوئے کہ ہم نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا ہے ، اور یہ تصور یعنی سیکولرازم کا تصور کوئی نیا تصور تو ہے نہیں - یہ تصور ہمارے ملک کا قدیم تصور ہے - ہندوستانی فلسفہ ہمیشہ سے اسی پر زور دیتا رہا ہے کہ حقیقت کی طرف جانے والے بے شمار راستے ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں ... سیکولرازم محض ایک نظریہ نہیں ہے - یہ ایک عملی ضرورت ہے ..."

(۱۹ ستمبر ۱۹۷۵ء)

اسی عملی ضرورت کے پیش نظر ہمیں ہر شعبۂ زندگی کی تنظیم کا بغور جائزہ لینا چاہیے - چونکہ زبان و ادب میں فرقہ وارانہ ذہنیت کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمت افزائی کی جا سکتی ہے - لہذا ہمیں اپنے مطالعات کی بھی تادیب کرنا چاہیے ہماری سیاسی اور سماجی تنظیم سیکولر اصولوں پر استوار رہے ، یہ ایک ایسی ضرورت ہے کہ اس سے کسی قسم کی چشم پوشی قومی استحکام کو متزلزل ہی نہیں تباہ و برباد بھی کر سکتی ہے - حکومتی سطح پر مذہبی غیر وابستگی کی پالیسی ہی ہندوستان کو اس منزل کی طرف لے جا سکتی ہے - جہاں بلا امتیاز مذہب و ملت ، رنگ و نسل ، یہاں کے شہریوں کو سماجی انصاف ، مساویانہ مواقع ، بلند معیارِ زندگی وغیرہ کی برکات حاصل ہوں گی کچھ مفاد پرست لوگ اور وطن دشمن تنظیمیں فضا کو مسموم کرنے پر کمربستہ تھیں جن کے پیش نظر سرکار کو ایمرجنسی کا نفاذ کرنا پڑا - ایمرجنسی ایک تادیبی کارروائی ہے - اگر ہماری طرزِ حیات اور فکر و فعل کے انداز سیکولر نہ ہوتے تو بقول شاعر - ع

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

جشنِ اقبال کی تیاریوں کی مصروفیات میں سیکولر نظام کی بات طاقِ نسیاں کی زینت ہی نہ بن جائے - اس کا ہمیں لحاظ رکھنا ہوگا - کیونکہ مطالعۂ اقبال میں کہیں کہیں ایسی بات آجاتی ہے جو محض تو وقتی بات - مگر کچھ لوگوں نے ان باتوں کی بنا پر غلط جذبات کی پرورش کرنے پر اپنا تمام تر وقت صرف کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا - شعرِ اقبال اور اقبال کی دو معروف انگریزی تصنیفات

(1) DEVELOPMENT OF METAPHYSION IN PERSIA

(2) THE RECONOTMCTIN OF RELIGIONS THOUGHT IN ISLAM

میں موٹے طور پر کہیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو سیکولر

نظام سے متصادم ہوتی نظر آتے۔ مگر کچھ لوگ حضرات
ذہنی کے پیش نظر اقبال کے وہ ملفوظات اور مقالات کو
مطالعۂ اقبال میں گھسیٹ لاتے ہیں جو اقبال نے عصری
سیاسیات سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔ اگر اقبال کا مسلم لیگ
سے تعلق نہ ہوتا اور اگر پاکستان معرض وجود میں نہ آیا
ہوتا تو غالباً ہندوستانی سیکولر نظام حیات کے منافی
کوئی ایسا خروش جو آہنگ کو برباد کر کے رکھ دے نہ ملتا ع

گا ہے گا ہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے خروش　　(اقبال)

اچھا یہی ہے کہ ہم ایسے غلط آہنگ کو سماعت پذیر نہ ہونے
دیں۔ شعر و فکر اقبال ایک ایسی کلیت ہے جو فلسفہ،
شعر اور اسلام سے تشکیل ہوئی ہے۔ لہٰذا اقبال کی ہمہ
جہتی شاعری میں وسعت بھی ہے، رنگا رنگی بھی۔
اقبالیات پر بے شمار موضوعات دعوت غور و فکر دے
چکے ہیں اور دے بھی رہے ہیں۔ اقبال کی رحلت پر
مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو کا سب سے بڑا شاعر
بتاتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا تھا اور یہ بات
آج تک مسلّم ہے کہ اقبال سے بڑا شاعر عالم اسلام نے ابھی
تک پیدا نہیں کیا۔

عالم اسلام کے اس عظیم شاعر کے یہاں موضوعات
کا قحط نہیں ہے۔ متعدد موضوعات اتنے وقیع ہیں
کہ ان پر ریسرچ کی جا سکتی ہے۔ جبکہ بہتیرے موضوعات
پر ریسرچ کی جا چکی ہے۔ اسلام سے متعلق تشکیل نو
جو بڑا اہم پہلو مثبت بحث کی حامل ہے۔ اگر کچھ کہا
جاتا ہے تو وہ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں غیر مسلموں
کیلئے بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مگر اسلام و سیاست کو خلط ملط
کر کے کسی موضوع سے رجوع کرتے ہی ایک ایسا آہنگ
ابھرنے لگتا ہے۔ اس پہلو کو دبانے کی اشد ضرورت ہے
یہاں یہ اعادہ کرنا ضروری ہے کہ اقبال کے یہاں یہ آہنگ
اس عصری سیاسی تنگ نظری نے جو ہندو مہا سبھا اور
مسلم لیگ جیسی فرقہ واریت کو ہوا دینے والی جماعتوں
نے عام کی پیدا کیا۔ مثال کے لئے اس قسم کے خیالات
جو درج ذیل اشعار میں ملتے ہیں مستحسن نہیں کہے جا سکتے ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

شکوہ خسروی این است این است
ہمیں ملک است کو توام بہ دین است

آن چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند
نوع انسان و قبائل ساختند

این شجر جنت ز عالم بردہ است
تلخیٔ پیکار بار آوردہ است

فرنگ آئین جمہوری نہاد است
رسن از گردن دیوے کشاد است

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

غرضیکہ جمہوریت اور مذہبی غیر وابستگی کے منافی کسی
آہنگ کو سماعت پذیر نہ کیا جائے۔ خالص اسلامی شاعری
جمہوریت و غیر وابستگی پر ضرب کاری نہیں ہوتی۔ مثلاً

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

جیسے اشعار اسلامی نوعیت کے ہونے بھی عام اپیل کے حامل ہیں۔ شکوہ، جوابِ شکوہ جیسی نظمیں ہمیشہ، اور ہر جگہ پسند کی جائیں گی۔

وطن دوستی کے منافی شاعری پر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تصنیف "تلاشِ ہند" میں جو روشنی ڈالی ہے وہ اقبال کے مضمرات کو پردہ خفا سے نکال کر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

"جاگیر دار طبقہ کی قیادت عوام کی تحریک خلافت کے سیلاب میں بہ گئی تھی لیکن خود یہ تحریک سماجی اور معاشی حالات کی ٹھوس بنیادوں یعنی عوام کی ضرورتوں پر قائم نہ تھی۔ اس کا مرکز ملک کے باہر تھا۔ جب اتاترک نے اس مرکز ہی کو ختم کر دیا تو تحریکِ خلافت کی ساری عمارت ایک دم سے بیٹھ گئی.... پرانے جاگیردار قسم کے لیڈر تو اس موقع کے انتظار ہی میں تھے۔ وہ برطانوی پالیسی کی مدد سے جس نے ہمیشہ ان کی دست گیری کی تھی۔ پھر میدان میں آ گئے.... اگرچہ در اصل مسلمان عوام اور نئے طبقے کی ذہنیت کی تشکیل واقعات نے کی تھی، لیکن موخر الذکر طبقہ خصوصاً اس کے نوجوانوں کو متاثر کرنے میں سر محمد اقبال کا اہم حصہ ہے۔ ابتدا میں اقبال نے اردو میں پُرزور نظمیں لکھیں.... جنگ بلقان کے دوران انہوں نے اسلامی موضوع اختیار کئے، وہ اپنے زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے عام جذبات سے متاثر ہوئے اور خود انہوں نے ان حالات اور مسلمانوں کے عام جذبات پر اثر ڈالا۔ لیکن وہ عوام کی قیادت نہیں کر سکتے تھے وہ ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیرداری نظام سے وابستہ تھے.... انہوں نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے ذریعہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے ایک فلسفیانہ نظریہ مہیا کر دیا.... یوں تو ہر دلعزیزی، ان کے کمال شاعری کی وجہ سے تھی لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ مسلم ذہن کی اس ضرورت کو پورا کر رہے تھے کہ اسے اپنے لیے ایک لنگر مل جائے۔ قدیم اتحادِ اسلامی کا خیال اب بے معنی ہو چکا تھا، خلافت ختم ہو چکی تھی۔ سب اسلامی ملکوں میں خصوصاً ترکی میں قومیت پرستی کا زور تھا.. قومیت کا تصور ایشیا پر یورپ اور امریکہ کی طرح چھا چکا تھا۔ ہندوستان قومی تحریک زور پکڑ چکی تھی... آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے حصہ لیا لیکن ہندوستان کی اس قومی تحریک میں ہندوؤں کا غلبہ تھا... بہت سے مسلمانوں نے.... تعزلیت کا راستہ اختیار کیا جس کی طرف اقبال کے فلسفے اور شاعری نے ان کی رہنمائی کی تھی.." "تلاشِ ہند"

درج بالا اقتباس میں اقبال کے اثر سے متعلق استدلال حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ یہاں یہ بتانا غالباً نامناسب نہیں کہ قومیت پر اقبال کے خیالات دو رُخے سے ہو گئے تھے۔ قومیت کو سیاسی اعتبار سے غلط بھی بتایا اور صحیح بھی، مثلاً

"اسلام اینڈ احمدی ازم" میں اقبال نے ISLAM AND AHMEDISM میں کہا۔

"... قومیت کا انحصار مذہب پر بتایا لیکن کبھی کبھی لاشعور طور پر حقیقت شعر میں منعکس ہوئی ہے۔

گر قبول کرے دینِ مصطفےٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

جیسے بیس میں کہیں کہیں تو اقبال نے تعصب کو سراہا ہے اقبال کی انگریزی لکھی ڈائری کا اندراج اردو ترجمہ میں ملاحظہ ہو۔

"حب الوطنی ملک کے تعصب کو کہتے ہیں اور قوم کے لئے تعصب حب الوطن سا ہوتا ہے۔"

اسلامی مسائل سے دلچسپی رکھنے کے سبب کسی کو موردِ الزام نہیں کیا جا سکتا ۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ نو ، اسلامی ممالک سے ہمدردی ، مسلمانانِ عالم سے ہم سوزی جیسے محرکات کو کبھی مذموم قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اعتراض کے قابل پہلو وہاں دکھائی دینے لگتا ہے ۔ جہاں کوئی اپنے وطن سے چشم پوشی کرنے لگے ۔ اقبال کی مسلم لیگ میں شمولیت ، جناح سے مراسلت ، مسلم ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت وغیرہ اس قسم کی باتیں ہیں کہ جو سوشلزم جمہوریت ، مذہبی غیر وابستگی جیسی اقدار کو راس نہیں آتیں ۔

شاعر میں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے اور عصری جذبات سے اوپر اٹھ کر معمولی بات نہیں کہی جا سکتی ۔ علاوہ بریں سہو و خطا کا کون مورد نہیں ہوتا ؟ اقبال کے یہاں یہ باتیں اس لئے بھی سامنے آتی ہیں کہ دینے والے [illegible] اقبال کو مخصوص زاویہ دیتے آئے ہیں ۔ پاکستان کی نظریاتی اساس کی ضرورت کو سمجھا جا سکتا ہے ، اگر وہاں اقبال کے ان پہلوؤں کو ابھارا نہ جائے تو تمام نہاد پاکستانی تہذیب کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ جائے کیونکہ در اصل ہندوستان اور پاکستان کی تہذیب و تمدن میں بنیادی طور پر کوئی فرق ہے ہی نہیں ۔ پاکستان میں بھی اب یہ لے اتنی بلند آہنگ نہیں رہی ہے جتنی ایوب و یحییٰ کے زمانے میں تھی ۔ ہاں ہمارے اقبال پر ہمارے یہاں سے بہتر کام ہوا ہے مثال کیلئے میاں محمد شریف نے اپنے ایک آرٹیکل میں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کو "کم رتبے کی مالک" بتایا ہے (فلسفہ اقبال ص ۲۶)

ہندوستان میں اقبال پر جو کام ہوا ہے ۔ وہ صرف مضمراتِ ذہنی کی ترجمانی معلوم ہوتا ہے ۔ روحِ اقبال میں متعدد جگہ یہی بتایا گیا ہے کہ اسلام کو بودھ مت پر یہ فوقیت حاصل ہے اور ہندو دھرم پر وہ برتری حاصل ہے ۔ جناب عبدالمالک آروی نے اپنی تصنیف اقبال کی شاعری (نظامی پریس بدایوں) میں ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کو نوبل پرائز ونر بتایا ہے ۔

(صفحہ ۳۸۱) جو محض از قبیلِ لغویات ہے ۔ ہمارے ملک میں ہوتا یہ ہے کہ دو چار دفعہ علامہ علامہ کہا اور بس سمجھ لیا کہ تنقید سے عہدہ برآ ہو گئے ۔ اسلام کو کسی مذہب پر فوقیت و برتری حاصل ہو یا نہ ہو ، سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اقبالیات سے متعلق تنقید میں اس مسئلہ کو گھسیٹنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

اقبال بہ حیثیت شاعر اسلامی دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔ فکر و نظر ، مشرق و مغرب کو شعر کی اساس بنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور اس اعلیٰ و ارفع سطحِ شاعری پر پہنچنے کے لئے کون کون سے ہفت خواں طے کرنے پڑے ہوں گے ۔ باعث غور و توجہ ہے ۔ اقبال سا دیدہ ور شاعر قرن ہا قرن بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شعرِ اقبال میں پیغامِ انسانیت بھی سمویا ہوا ہے ۔ کاش گوشِ شنوا پیدا ہو ۔ اور اگر صرف ذہنی مضمرات کی کارفرمائی سے اقبال کو پیش کیا جاتا رہا تو اس مذموم رویہ کا سدِ باب کرنا غالباً ایک فرض کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے گا ۔ ٭

مشاعرہ میلہ چھڑیاں کیرانہ

(کریمی الاحسانی)

خرابیِ طبع کے باعث کسی مشاعرے کی رُوداد نہ لکھ سکا اور یہی وجہ ہے کہ شانِ ہند بھی پچھلے دو ماہ سے وقت پر شائع نہیں ہو سکا۔ تاہم مارچ ۱۹۷۹ء کا شمارہ صرف ایک ہفتہ دیر سے شائع ہوا ہے۔ انشاء اللہ اپریل ۱۹۷۹ء کا شمارہ وقت مقررہ پر شائع ہوگا اور آپ اپریل کے شمارے میں کچھ اور دلچسپ مستقل عنوانات کا اضافہ پائیں گے۔ کریمی الاحسانی صاحب نے میلہ چھڑیاں کیرانہ کا مشاعرہ قلم ہند کر کے وقت پر بھجوا دیا تھا مگر اسے اب شائع کیا جا رہا ہے۔ تاہم آپ کے لئے یہ مشاعرہ اس وقت بھی تازہ ہی ہے۔ انشاء اللہ اپریل کے شانِ ہند میں جے پور کے جشن اڑھائی صد سالہ کی اختتامی تقریب کے کل ہند مشاعرہ کی روداد پیش کر سکوں گا۔

ہر سال میلہ چھڑیاں کیرانہ (مظفر نگر) کی تقریبات کے سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے۔ ۳۱ مئی ۱۹۷۸ء کو رات کے سوا گیارہ بجے میلہ ہی کے ایک پنڈال میں یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ چونکہ مجوزہ صدر صاحب ابھی تک تشریف نہیں لا سکے اس لئے مشاعرہ کسی قدر دیر سے شروع ہو رہا ہے۔ لیجئے مشاعرہ کے روحِ رواں مظفر رزمی صاحب صدارت کے لئے محترم عالم فتحپوری کا اسمِ گرامی پیش کر رہے ہیں۔ جناب شمیم جے پوری تائید فرما رہے ہیں تالیوں کا ایک شور ہے اور رزمی صاحب مشاعرہ کی نظامت کے لئے جناب محمد علی موج رامپوری کا نام پیش کر رہے ہیں۔ موج صاحب اس مشاعرہ کے بارے میں کچھ فرما کر سلیم کھتولوی کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ سلیم صاحب ایک تازہ غزل سے مشاعرہ کا آغاز کر رہے ہیں سنئے ۔

برباد ہو کے پیکرِ ایثار بن گیا
تو بیوفا بنا میں وفادار بن گیا

داد مطلع ہی سے شباب پر ہے اور سلیم صاحب آج سنانے کے موڈ میں ہیں۔

تم تو اجاڑ دیجئے اور بستیاں
وہ تو مرا خلوص ہی دیوار بن گیا

(سرور تونسوی)

موقع شناس وقت پہ معصوم ہو گئے
میں اپنی سادگی میں گنہگار بن گیا

اے رہروانِ راہِ وفا ہوشیار باش
رہزن سنا ہے قافلہ سالار بن گیا

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ محفل کو گرما رہے ہیں

کیا غم جو ہم نے دولتِ اخلاص بانٹ دی
اک بوالہوس تو صاحبِ کردار بن گیا

سلیم صاحب محفل کو گرما کر کامراں اپنی جگہ لائے جا رہے ہیں اور موج صاحب نے زحمتِ سخن دی ہے ڈاکٹر [illegible] کو۔ ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ سال کی نظم رواں دواں سنا کر خوب داد پائی ہے۔ ان کے بعد کیرانہ کے بزرگ شاعر جگدیش پرشاد درشن فرما رہے ہیں ۔

عاشق کے دلِ نازک کی وہ کیا خاک عبادت کرتے ہیں
پتھر کی مورت کا بیمار رکھتے ہیں شیشے کی تجارت کرتے ہیں

وہ اور نئے انداز سے جب محفل میں سنور کر آتے ہیں
اک اور قیامت سے پہلے پیدا وہ قیامت کرتے ہیں

درشن صاحب جا رہے ہیں دیکھا تو مسٹر [illegible] سنگھ ساقی چیرمین شاملی اپنے دوستوں کے ساتھ تشریف لا کر شعراء کی صف میں ہی بیٹھ گئے ہیں اور موج صاحب فرما رہے ہیں

ملک کے مشہور مترنم اور صاحب کردار شاعر تمنا جمالی سے غزل سنئے۔ اس پر میرے پاس بیٹھے ہوئے ڈاکٹر شمیم احمد صاحب جو کہ اپنی پارٹی کے ساتھ منظر نگر سے آئے ہیں فرما رہے ہیں۔ یہ صاحب کردار کی کیا بات ہوئی میں نے عرض کیا۔ اس راز پر آپ ہی روشنی ڈال سکتے ہیں دیکھا تو تمنا صاحب یوں مشاعرہ لوٹنے چلے ہیں ؎

یوں تو ہر ایک سانس میرے دل پہ بار تھا
پھر بھی نفس نفس کو ترا انتظار تھا
تم نے مزاج پوچھ کے تڑپا دیا مجھے
ورنہ غم فراق بہت سازگار تھا

بہت سازگار تھا، پر داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ یوں قیامت ڈھا رہے ہیں۔

اس طرح موت مجھ سے بغلگیر ہو گئی
جیسے بہت دنوں سے مرا انتظار تھا

اب داد والے بے حال ہو چلے ہیں اور تمنا صاحب اس پر یوں نازیانہ لگا رہے ہیں

ساقی کی دلدہی کے علاوہ بھی محتسب
ہم کو خیالِ رحمتِ پروردگار تھا

تمنا صاحب داد اور تالیوں کے شور میں شاداں مائک سے پلٹ رہے ہیں اور موج صاحب ڈاکٹر ساغر ہنلمی کو دعوتِ کلام و ترنم دے رہے ہیں۔ ساغر صاحب محفل کو یوں سرشار کرنے چلے ہیں۔

کیا میری خطائیں ہیں اتنا تو بتا دیجئے
پھر آپ کی مرضی ہے جو چاہے سزا دیجئے
کیوں قتل ہمیں کیجئے مر جائیں گے ہم خود ہی
بس ہم پہ محبت کا الزام لگا دیجئے
بدنام نہ ہو جائے میخانے کا میخانہ
کم ظرف ہیں جو اُن کو محفل سے اٹھا دیجئے
تھا ناز جنہیں ساغر کل اپنی جوانی پر
آج اُن کو ذرا چل کر آئینہ دکھا دیجئے

ساغر صاحب ترنم کے باعث تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں

اور موج صاحب مظفر زخمی کیرانوی کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ زخمی صاحب یوں بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

ابتدائے عشق کی رسوائیاں دیجئے
مجھ کو میری گم شدہ پرچھائیاں دیدیجئے
مسکرا کر پھول کو رعنائیاں دیدیجئے
شاخِ گل کو جھوم کر انگڑائیاں دیدیجئے

آہ اور واہ کا [illegible] اور آپ اسی سج دھج سے [illegible]

ایک مدت سے مزاجِ زندگی مغموم ہے
اب ذرا [illegible] شہنائیاں دیدیجئے
توبہ توڑ [illegible]
ہو سکے تو پھر مجھے تنہائیاں دیدیجئے

زخمی صاحب محفل کو گرما کر شاداں پلٹ رہے ہیں اور محمد علی موج رامپوری ایک شگفتہ غزل سے محفل کو چونکا رہے ہیں

طلوعِ مہر کا منظر کہاں سے لاؤ گے
ہماری طرح مقدر کہاں سے لاؤ گے
ستم کرو گے مگر بھول جیسے چہرے پر
ستمگروں کے سے تیور کہاں سے لاؤ گے
ان آئینوں کی اداکاریاں بجا ہیں مگر
جہاں میں روز سکندر کہاں سے لاؤ گے
تمام شہر گنہگار ہے مگر اے موج
سبھی کے واسطے پتھر کہاں سے لاؤ گے

موج صاحب خوب خوب تحسین وصول کئے اپنی جگہ آ کر ایک ابھرتی ہوئی مجسم غزل خوش گلو، خوش پوش خوش رو شاعرہ تاجور سلطانہ تاج الٰہ آبادی کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں تاج صاحبہ غزل سرا ہیں ؎

نگاہیں اُن کے تصور میں تھک گئیں لیکن
ہم انتظار کے عالم میں بیقرار چلے
عدا فنوں کی امانت ہی لٹ گئی شاید
رہِ وفا کے مسافر بھی سوئے دار چلے

تری نگاہ کے آگے یہ خونِ دل کیا ہے
چلے جو تیر تو پھر دل پہ بار بار چلے

تاج صاحب رنگِ محفل بدل کر مشاعرہ کو لوٹ کر شاداں آرہی ہیں اور موج صاحب زحمتِ سخن دے رہے ہیں راحت اندوری کو۔ راحت صاحب فرما رہے ہیں۔ تاج صاحبہ کے بعد مجھے حکم دیا گیا ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے غزل کے بعد مرثیہ --- قہقہہ ——— اسی ہنسی مذاق میں پھر آپ (یوں) گرج اور برس رہے ہیں ؎

طوفانوں کی بستی ہو یا انگاروں پر پاؤں پڑے
ہم کو تو چلتے رہنا ہے دھوپ پڑے یا چھاؤں پڑے
بستی بستی ہاتھ پسارے پھرنے سے کیا ہوتا ہے
ایسا کوئی کام کرو ساری بستی پاؤں پڑے

راحت صاحب نے پرانے قطعات بھی سنائے ہیں اور محفل میں ہنگامہ بپا کر کے کامراں اپنی جگہ آرہے ہیں موج صاحب ہلال سیوہاروی سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ ہلال صاحب تالیوں کے شور میں آکر فرما رہے ہیں ؎

جاڑوں کی سرد رات میں کیا چیز ہے لحاف
واللہ اس اصول کے قربان جائیے
بستر سے رات کو نکلئے نہ بار بار
بھیا مرارجی کا کہا مان جائیے

ہاؤ ہو اور غل غپاڑہ کا شور کم ہوا تو ایک طویل نظم سنا کر داد وصول کئے پلٹ رہے ہیں اور موج صاحب یاد فرما رہے ہیں چندر پرکاش جوہر بجنوری کو سنئے جناب جوہر صاحب اپنی غزل اور ترنم کے جوہر یوں دکھا رہے ہیں ؎

نہ امیدوں سے وابستہ نہ ارمانوں سے وابستہ
ہماری زندگی ہے غم کے طوفانوں سے وابستہ
ہجومِ یاس، دردِ شوق، شامِ تنہائی
نہ جانے زندگی ہے کتنے عنوانوں سے وابستہ

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

وہی غم اصل میں صد حاصلِ کونین ہوتا ہے
حقیقت میں جو غم ہوتا ہے انسانوں سے وابستہ

جوہر صاحب داد پاکر اپنی جگہ آرہے ہیں اور موج صاحب کیرانہ کے جلیل ایڈوکیٹ کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں جلیل صاحب غزل سرا ہیں ؎

رہبر بھی پریشاں ہے رہزن بھی سوالی ہے
کیا جانئے راہی نے کیا بات چھپالی ہے
حالات سے گھبرا کر بھرپور بہاروں میں
گلشن کے نگہباں نے خود آگ لگالی ہے
ہر گھر کی تباہی میں شامل ہے وہ در پردہ
کس کس کو بتاؤں میں ہر آنکھ سوالی ہے

جلیل صاحب داد لوٹے پلٹ رہے ہیں اور موج صاحب قمر رڑکوی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ قمر صاحب فرما رہے ہیں ؎

ترکِ دعا کرے وہ جسے آسرا نہیں
مایوس ہو تو وہ ہو جس کا خدا نہیں
میں اور تم سے ترکِ وفا باخدا نہیں
میرا تو اور کوئی تمہارے سوا نہیں
ہر ذرّہ بولتا ہے ابھی کائنات کا
کہنے کو چاہے کوئی کہہ دے خدا نہیں

قمر صاحب بھی داد وصول کئے جا رہے ہیں اور اب موج صاحب دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں شمیم جے پوری کو۔ شمیم صاحب تالیوں کے شور میں آکر غزل سرا ہیں

راہزن روئے راہبر روئے
کارواں کس کے حال پر روئے
کیسے گزری شبِ فراق نہ پوچھ
مختصر یہ کہ رات بھر روئے

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ موسیقی سے بھرپور ترنم سے فرما رہے ہیں

مجھ کو بیساختہ ہنسی آئی
دوست میرے حال پر رو دیئے
اس سے ہنسنے کی بات کرتے ہو
جس کا دل بات بات پر روئے

شمیم صاحب تالیوں کی جھنکار میں مائک سے جُدا ہو رہے
اور اس عالمِ نغمگی میں اب موج صاحب مجھے حکم فرما رہے ہیں
لیجئے بہ تعمیلِ حکم میں تازہ اشعار پیش خدمت کر رہا ہوں ؎

امیر ہو تو طوائف بھی سب کی سالی ہے
وگرنہ مفلسی گندی سی ایک گالی ہے
کیا ہے آج کے شاعر نے جس یہ دل قرباں
وہ ایک زہرہ جبیں ہے مگر خیالی ہے
غریب خانہ بھی عشرت کدہ کو کہتے ہیں
یہ اصطلاح مرے یار کس نے ڈھالی ہے
سکون مانگتا پھرتا ہے دربدر تنہا
رئیسِ شہر بھی یارو عجب سوالی ہے
شبِ عروس وہ خود بن کے رہ گیا مفتوح
نپولین نے آخر عورت سے مات کھالی ہے

آیئے اب ایک منفرد انداز میں ایک شگفتہ غزل جناب
مشیر جھنجھانوی سے سماعت فرمایئے گا ؎

نظروں کے سامنے وہ اچانک جب آئے ہیں
گھبرا کے ہم نے اشکِ مسرت چھپائے ہیں
ہر سانس دل میں برقِ صورت اُتر گیا
ہم نے قریب آکے بہت زخم کھائے ہیں
میں تیرے دوستوں سے تو واقف نہیں مگر
کچھ لوگ میرے ساتھ ترے گھر تک آئے ہیں

داد کا سابقہ ریکارڈ بھی اس ہنگامہ پر جھوم رہا ہے کیا
یہ شعر حاصل مشاعرہ تو نہیں ہو کر رہ جائے گا۔ کئی بار
دہرا کر عطا کر رہے ہیں ؎

تو رحمتِ تمام ہے یہ مانتا ہوں میں
پھر کس کے واسطے یہ جہنم بنائے ہیں

پھر داد پر کسی ہٹ ہوٹنگ کا گماں ہو رہا ہے اور آپ اسی
پُر وقار انداز ـــ کرم فرما رہے ہیں ؎

گزرا ہوں سر جھکائے باندازِ احترام
پتھر انگلی کے بہت کام آئے ہیں

قبلہ مشیر صاحب محفل کو گرما کر تالیوں کے شور میں مائک سے
جُدا ہو رہے ہیں اور موج صاحب درخواستِ کلام بلاغت نظام
فرما رہے ہیں محترم عالم فتحپوری صاحب سے۔ قبلہ عالم صاحب
یوں گرج اور برس رہے ہیں ؎

چھپا لیا کبھی تو پھولوں میں سر تو پاؤں جلے
نہ جانے کتنے جہنم ہیں اس چمن کے تلے

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے اور آپ محفل کو گرما رہے ہیں

ہر ایک موڑ پہ کھایا فریب منزل کا
ہزار بار رکے ہم ہزار بار چلے
بہ رنگِ چمن ہے چمن ہے ننگِ بہار
اگر نہ جیب و گریباں پہ اختیار چلے

قبلہ عالم صاحب خوب خوب پُرانا کلام سُنا کر داد و
تحسین وصول کئے مائک چھوڑ رہے ہیں اور آپ کے
ساتھ ہی دو بجے پہلا دَور ختم ہو رہا ہے۔ دوسرے دَور
میں تقریباً سب ہی شعراء کرام کو سن کر خوب خوب داد
دی گئی۔ یہ دَور بھی دیر تک جاری رہا اور اس مشاعرہ کی
کامیابی کا سہرا صرف جناب رزمی صاحب کے سر جاتا ہے جنہوں نے
امسال اس مشاعرہ کو منعقد کرانے اور کامیاب بنانے
میں خصوصی توجہ فرمائی اور ساتھ ہی شری پٹول صاحب
ایگزیکٹیو آفیسر میونسپل بورڈ کیرانہ بھی مشاعرہ اور شعراء کرام
کی مہمان نوازی میں دلچسپی لیتے رہے۔ اس طرح میونسپل بورڈ
کے دیگر ارکان بھی مہمان شعراء کی خاطر مدارات میں مصروف
رہے۔ امسال (۱۹۷۸ء) زیادہ سے زیادہ مشاعرے
ناکامیاب اور بُری طرح پٹے ہیں۔ یہ مشاعرہ واقعی کامیاب
ہوا اور مشاعرہ کمیٹی قابلِ داد اور لائقِ تحسین ہے کہ اس کی
سعی سے یہ مشاعرہ سُنا گیا اور اہلِ کیرانہ کے حسبِ روایت
اسے کامیاب بھی بنایا۔ خدا حافظ

پھر ملوں گا ذرا سا دم لے کر

اخلاق کی تشکیل و تعمیر

بیدل سرحدی بی اے ۔ ادیب کامل

صدیوں سے انسانی زندگی کم وکاست ایک ہی ڈھرّے پر چلی آتی ہے ۔ یعنی بچہ پیدا ہوتا ہے، چار پانچ سال کھلونوں سے کھیلتا ہے ۔ تعلیم حاصل کرتا ہے اُس کے بعد کوئی ذریعۂ روزگار اپنا لیتا ہے، شادی کر لیتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے اور بالآخر مر جاتا ہے ۔ میرے خیال سے انسانی زندگی کی اس ... مختصر تعریف کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کیونکہ پیشِ نظر موضوع کا تعلق براہ راست انسانی زندگی سے ہے ۔ انسان کی زندگی میں اخلاق کو مرکزی اہمیت حاصل ہے ۔ انسان کے اخلاق کا تعین اُس کی عادات و خصائل اور مزاج و اطوار پر ہی کیا جا سکتا ہے ۔ لغوی اعتبار سے تو اخلاق لفظِ خلق کی جمع ہے جس کے معنی عادت خصلت، مروّت، فطرت، مزاج یا سبھاؤ کے ہیں مگر مجموعی اعتبار سے ہم شخصی اوصاف کو بھی اخلاق کہہ سکتے ہیں ۔ کسی قوم کا بہترین سرمایہ اُس کے افراد ہوتے ہیں اور افراد کی بہترین قوت اُن کا اخلاق ہے ۔ یعنی اخلاقی قوت کے بغیر افراد اور اقوام کی وقعت نہیں ہوتی ۔ اس لئے ملک و قوم کی عظمت کے حصول کے لئے باقی افادی پہلوؤں کے مقابلہ میں اخلاقی تربیت کو فوقیت دینی چاہیئے ۔ یوں تو اخلاق کی تشکیل و تعمیر بے شمار بنیادوں پر استوار ہوتی ہے مگر بالخصوص انسان کی اعلیٰ تخیلی، عقلی، عملی اور تحقیقاتی تحصیلات مرکزی اہمیت رکھتی ہیں اور چونکہ انسان کے اخلاق یا کردار کی بنیاد اُس کے ابتدائی دَور یعنی بچپن سے شروع ہو جاتی ہے ۔ اس لئے بچوں کو ابتدائی عمر سے ہی اخلاقی اصولوں سے روشناس کرنا شروع کر دینا چاہیئے ۔ کسی ملک یا قوم کا بہتر مستقبل وہاں کے بچوں کے نیک اخلاق سے براہِ راست وابستگی رکھتا ہے لہٰذا بچوں کی اخلاقی تربیت نہایت ضروری ہے ۔ بچوں کی اخلاقی تربیت سے غافل ہو کر انہیں قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا صرف اُن کے نیک بننے کے لئے امکانات کو کم کرنا ہی نہیں بلکہ انہیں بد اخلاق بنانے یا جرائم کی دُنیا میں بھٹکنے کے مواقع فراہم کرنا ہے اور معاشرہ کے لئے پیچیدہ مسائل کو جنم دینا ہے ۔

بچوں کے اخلاق کی تشکیل و تعمیر کا تعلق بالترتیب گھر، مدرسہ، اور معاشرہ سے قائم کیا جا سکتا ہے ۔ گھر بچے کی بہترین تربیت گاہ ہے ۔ بچہ سب سے پہلے گھر کے لوگوں ماں باپ اور بعد میں دوسرے لوگوں کو جانتا یا پہچانتا ہے اور اُن سے تجربات حاصل کرتا ہے ۔ حاصل کردہ تجربات کے نقوش اُس کی آئندہ زندگی میں تا دیر قائم رہتے ہیں ۔ یہاں فرائیڈ کی اس تحقیق کا ذکر غیر ضروری نہ سمجھا جائے گا کہ "بالغ انسان کی بیشتر تکالیف اور بیماریوں کی اصل جڑ بچپن کے ناگوار حوادث میں موجود ہوتی ہے ۔" اب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بالغ کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اُن کے بچپن کا مطالعہ بے حد ضروری ہے ۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق بچہ پانچ سال کی عمر تک تقریباً ڈھائی ہزار الفاظ سیکھ لیتا ہے اور جو باتیں وہ اس دوران سیکھ لیتا ہے وہ اس کی بعد کی حاصل کی ہوئی باتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں ۔ اِسی عمر میں وہ مجبوری، مخالفت، ہمدردی اور جذبۂ محبت سے روشناس ہوتا ہے ۔ عمر کے ساتھ ساتھ اُسے بھلائی، بُرائی، نیکی اور بدی کے ابتدائی فرق اور کھوٹے کھرے کی پہچان ہونا شروع ہو جاتی ہے ۔ بچے کے اخلاق کی تشکیل و تعمیر میں والدین کا بڑا اثر پڑتا ہے ۔ بچہ اپنے آپ کو والدین کے رُوپ میں دیکھتا ہے اور بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو اپنے خاندان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے

والدین کا کردار، اُن کے سوچنے کا انداز بچّے پر گہرا اثر ڈال لیتے ہیں۔ والدین کی نیک سیرت، اُن کی نیک معاشرتی سرگرمیاں سچ بولنے کی عادت، معقول رجائیت، جذبۂ ہمدردی اور تعاون جہاں بچے کے لئے قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے ہیں وہاں والدین کا اپنے روزمرّہ کے عمل میں اخلاق کے بنیادوں اصولوں کو ملحوظِ خاطر نہ رکھنا بچے کو بداخلاق اور آوارہ بھی بنا سکتا ہے۔ ابتدائی عمر میں بچّے نہایت حسّاس ہوتے ہیں اور اُن میں کم و بیش نخرو ناز کا تاثر بھی پایا جاتا ہے۔ اس عمر میں اُن کے چند افعال عموماً عارضی یا وقتی مسرّت کے تحت ہوتے ہیں کیونکہ انہیں دائمی اور عارضی مسرت کے امتیاز کی اہلیت نہیں ہوتی۔ اس لئے بچوں کی خامیوں کو سدھارنے کے لئے نکتہ چینی سے کام لینے کی بجائے والدین کو ہمدردی اور محبت سے کام لینا چاہیئے تاکہ اُن کا دل ٹوٹنے کی بجائے اچھائی کی طرف خود راغب ہو۔ بچوں کو بات بے بات جھڑکتے رہنا، اُن کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بہت زیادہ اچھالنا اور اُنھیں بیوقوف، احمق، نالائق، بدتمیز وغیرہ جیسے الفاظ سے خطاب کرنا نہایت نامناسب ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے وہ ڈھیٹ، ضدی اور بے شرم بن جاتے ہیں اور ذرا سی ٹھیس اُن میں بزدلی پیدا کر دیتی ہے۔ الغرض والدین کو بچوں کی اخلاقی تربیت کے سلسلے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی اخلاقی تربیت پر اتنا زور بھی نہ دیا جائے کہ وہ اپنے بیجا خیالات کو تہذیب و اخلاق اور نیک کرداری کی راہ بنا اپنے آپ کو سہولت کے مطابق چلانے میں دشواری محسوس کریں ورنہ وہ ایک اخلاقی مشین بن جائیں گے۔

اخلاقی تربیت کے سلسلے میں گھر کے بعد مکتب کا درجہ ہے۔ مدرسہ بھی بچوں کی اخلاقی تشکیل میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ دراصل مدرسہ بھی ایک چھوٹا سا سماج ہے جہاں سے طلبہ کو آپسی لین دین، کام کاج اور کھیل کود کے تمام معاملوں میں دیانت داری، راست گوئی، اصول پرستی اور ملنساری کی عملی تربیت اور ترغیب حاصل ہوتی ہے

مدرسہ میں طلبہ ایک گروپ میں رہ کر مختلف کھیلوں سے قوتِ ارادی، تمیزِ خودی، انصاف، فرمانبرداری اور شجاعت جیسی خوبیوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ درسی تعلیم کے ساتھ ساتھ تفریحی مشاغل میں بھی اُنہیں بہتر انسان بنانے کے لئے مناسب رہنمائی مدرسہ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ مدرسہ کے خوشگوار ماحول سے ہی بچوں کی سالم، متوازن اور با اخلاق شخصیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے اور اُن میں ایک دوسرے کو سمجھنے کا اخلاقی شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کو واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ سے متعلق دیگر امور مثلاً مدرسہ کی عمارت، اس میں درسی اور غیر درسی مشاغل کے مناسب انتظامات، مدرّسِ اعلیٰ کے فرائض اور اساتذہ کی ذمہ داریوں وغیرہ کے ذکر کو نظر انداز کر دینا اس لئے مناسب سمجھا گیا ہے کیونکہ میری دانست میں ایسا کرنا صرف موضوع کو غیر ضروری طول دینے کے مترادف ہی نہیں بلکہ زیرِ بحث موضوع کے تعین کردہ عنوانات کے حدود سے تجاوز کرنا ہے۔

بہرحال گھر اور مدرسہ کے بعد بچوں کے اخلاق کی تشکیل و تعمیر میں معاشرتی طبقہ اثر انداز ہوتا ہے اس عمر میں بچے سماج اور کلچر کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں وہ اُن خصوصیات اور صلاحیتوں کو اپنے آپ میں پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اُن کی سوسائٹی اور کلچر میں مقبول ہوں۔ یہاں معاشرتی طبقہ کی مختصر وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے عام طور سے معاشرتی طبقہ میں بچوں کے قریبی پڑوسی شامل کئے جاتے ہیں جن کے ساتھ اُن کا قریبی تعلق ایک فطری امر ہے۔ اقتصادی اور معاشی فرق کے باوجود اس طبقہ میں قریب قریب سب ہی لوگوں کا رہنا سہن، تہذیب و تمدّن اور اُن کے رسم و رواج کم و بیش ایک سے ہوتے ہیں اور انہیں مختلف لوگوں سے مل کر ایک مکمل معاشرتی طبقہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ہمارے ملک ... یہاں مختلف مذاہب، خیالات

اور نسل کے لوگ ایک محلہ گاؤں یا شہر میں شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں ۔ وہاں ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں جس میں باہمی اتحاد کی بنیاد صرف مذہب نسل، ذات یا پیشہ پر انحصار کرتی ہے حالانکہ یہ چیز ایک صحیح معاشرتی تخیل کے خلاف ہے اور اس کے تباہ کن اثرات ہوتے ہیں ۔۔۔۔

۔۔۔ بہر نوع بچے کے اخلاق کی تشکیل و تعمیر میں جہاں گھر مدرسہ اور معاشرتی ماحول اثر انداز ہوتا ہے ۔ وہاں بچے کی اپنی جسمانی اور ذہنی ساخت بھی اس کے اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انسانی زندگی میں اخلاق کی تشکیل و تعمیر کا عمل پیدائش تا مرگ جاری رہتا ہے ۔ ابتدا میں عمل کی رفتار نہایت تیز ہوتی ہے اور بعد میں اس کی رفتار بتدریج کم ہوتی جاتی ہے ۔

مزید وضاحت کے لئے یا یوں کہئے کہ موضوع کو گنج دینے کیلئے انسیکافون ہیور کا یہ قول میرے خیال سے کافی ہوگا کہ زندگی کے ابتدائی چالیس سال ہمیں ایک نصاب عطا کرتے اور اس کے بعد کے تیس سال عطا کردہ نصاب پر تبصرہ کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں ۔"

فارم IV

دیکھو رول ۸

۱۔ مقام اشاعت : فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

۲۔ نوعیت اشاعت : ماہنامہ

۳۔ نام پرنٹر : ودیا پرکاش سرور

قومیت : ہندوستانی

پتہ : فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۲

۴۔ نام پبلشر : ودیا پرکاش سرور

قومیت : ہندوستانی

پتہ : فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج نئی دہلی ۲

۵۔ نام ایڈیٹر : ودیا پرکاش سرور

قومیت : ہندوستانی

پتہ : فلیٹ ۸۔ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج دہلی ۲

۶۔ نام پتہ مالک اخبار : ودیا پرکاش سرور فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں ودیا پرکاش سرور تصدیق کرتا کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں ۔

یکم مارچ ۱۹۷۹ء

ودیا پرکاش سرور

غزلیں

فاروق روکھڑی - کُندیاں (پاکستان)

انجام جانتا ہوں، بلاؤں کی زد میں ہوں
تنہا دیا ہوں، تیز ہواؤں کی زد میں ہوں

اتنا ہوا بلند، اماں اب کہیں نہیں
روٹھا زمین سے تو خلاؤں کی زد میں ہوں

احساس کے فریب نے منظر بدل دیا
جلتی ہوئی مہیب چتاؤں کی زد میں ہوں

توبہ کا در کھلا ہے روایت بجا سہی
مجبور ہوں سیاہ گھٹاؤں کی زد میں ہوں

ابلیس اُلجھ کو ایک خدا بھی نہیں قبول
مجھ کو بھی دیکھ کتنے خداؤں کی زد میں ہوں

آبادیوں نے دی ہیں فقط نفرتیں مجھے
فاروق بے خلوص اداؤں کی زد میں ہوں

اخلاق سہسوانی

کوششِ ضبط بھی ناکام ہوئی جاتی ہے
خامشی بھی مری بدنام ہوئی جاتی ہے

رُوئے انور پہ یہ بکھری ہوئی زلفیں توبہ
جیسے ہنگامِ سحر شام ہوئی جاتی ہے

غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ عقبیٰ، غمِ دل
زندگی جیسے اک الزام ہوئی جاتی ہے

کس کی یاد آئی دمِ نزع یہ میرے دل میں
موت بھی لرزہ بر اندام ہوئی جاتی ہے

آؤ اب حُسن کے معیار کو اونچا کر لیں
نعمتِ عشق بہت عام ہوئی جاتی ہے

تیری مخمور نگاہوں میں یہ کیا تھا اے دوست
توبہ خود عرفِ مے و جام ہوئی جاتی ہے

ہے خطا کس کی، کسی کو نہیں معلوم اخلاق
صرف الفت مری بدنام ہوئی جاتی ہے

چنگ و رباب

عبدالوہاب ساغر ساگری

اُن کو مستِ شباب ہونا تھا
آپ اپنا جواب ہونا تھا

طورِ موسیٰ کا لُطف آجاتا
آپ کو بے نقاب ہونا تھا

برکتیں عشق کی معاذ اللہ
ہم کو خانہ خراب ہونا تھا

داغ ہائے جگر دیئے کتنے
کچھ تو آخر حساب ہونا تھا

کم ہے جتنی بھی ہے یہ بیتابی
اور کچھ اضطراب ہونا تھا

میرے گریہ کے وقت ہی تم کو
مستِ چنگ و رباب ہونا تھا

اُن کو ہونا تھا ہمسفر ساغر
ورنہ جامِ شراب ہوتا تھا

شفیع دستگیر سری نگر (بمبئی)

گُل کے معیار تک نہیں پہنچا
ہاتھ جو خار تک نہیں پہنچا

اُن کے نقشِ قدم جو بھول گیا
وہ دریار تک نہیں پہنچا

شاخِ گُل پر جو مسکرا نہ سکا
پھول بازار تک نہیں پہنچا

گھُٹ گیا دل میں رازِ اُلفت کا
لبِ اظہار تک نہیں پہنچا

کارواں گُم غبارِ راہ میں ہے
منزلِ یار تک نہیں پہنچا

ہاتھ اُٹھا تو ہے مسیحا کا
نبضِ بیمار تک نہیں پہنچا

چاند تاروں کو چھو لیا دستگیر
آدمی پیار تک نہیں پہنچا

گوشۂ عقیل صدیقی

کیتھرین برش　　ترجمہ: اختر جمال

ایک رات

مسٹر ونٹر نگر (چھٹی) کے دن تفریح کر کے واپس آرہے تھے کہ الینوئس کے راستے میں ان کی کار حادثہ کا شکار ہوگئی اور وہ ایک چھوٹے سے قصبے کے اسپتال میں داخل کر دیئے گئے اس قصبہ میں وہ کسی سے واقف نہ تھے۔ یا شاید وہ ایسا سمجھتے تھے کہ قصبے کا کوئی شخص انہیں جانتا نہیں۔

دوسرے دن صبح اس حادثہ کی خبر ایک مقامی اخبار میں شائع ہوئی اور اسی دن سہ پہر کے وقت مسز مالکوم کوروِن مسٹر ونٹر نگر سے ملنے کے لئے اسپتال آ پہنچیں مسٹر ونٹر نگر نے نام سُن کر ان کو نہیں پہچانا۔ انہوں نے پوچھا: "کیا واقعی ان صاحبہ نے میرے متعلق دریافت کیا ہے؟ میں تو اس جگہ کسی بھی شخص سے واقف نہیں ہوں" لیکن اسپتال میں بتایا گیا ایک خاتون مسٹر ونٹر نگر سے ملاقات کرنے آئی ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ انہیں اندر لے آئے۔ ان کے ساتھ ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ انہوں نے آہستہ لہجے میں فخر کے ساتھ تعارف کرایا "یہ میرا بیٹا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ اس سے ملنا پسند کریں گے اور نرس نے بھی بغیر کسی اعتراض کے اسے آنے کی اجازت دے دی۔ آپ اسے پہچانے ——؟" مسز کوروِن نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "آپ تو مجھ کو اچھی طرح سے یاد ہیں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ نیویارک میں جنگ کے زمانہ کی اس رات آپ نے مالکوم اور میرے ساتھ جو مہربانی کا برتاؤ کیا تھا اس کو ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ وہ ہوٹل میں۔ آپ کو یاد آیا؟"

اور مسٹر ونٹر نگر کو ایک دم سب کچھ یاد آگیا۔ اول اول تو آنے والی خاتون کا دُبلا جان، نیلی آنکھوں والا چہرہ اس لئے جانا پہچانا معلوم ہوا تھا کہ وہ ایسے ہی ہزاروں چہروں سے ملتا جلتا تھا لیکن اب وہ اس چہرے کو واقعی پہچان گئے تھے۔۔۔۔ اس کے ساتھ انہیں لوگوں سے کھچا کھچ ہوٹل بھی یاد آگیا۔۔۔ ایک نوجوان لیفٹیننٹ کا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم گیا جو رجسٹریشن ڈیسک کے سامنے لوگوں کی قطار کے اندر کھڑا تھا

مسٹر ونٹر نگر آخر سہ پہر کو اس ہوٹل میں پہنچے تھے انہیں کمرہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ وہ اکثر اس ہوٹل میں ٹھہرا کرتے تھے۔ اوپر کمرے میں سامان رکھنے کے بعد وہ برآمدے میں آگئے۔ ایک اخبار خریدا اور سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگے حسبِ معمول رجسٹریشن ڈیسک کے سامنے لوگوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ جنگ کا زمانہ تھا اور ہوٹلوں میں کمرے نہیں ملتے تھے۔ مسٹر ونٹر نگر نے کئی بار قطار کی طرف دیکھا۔ اس میں کئی فوجی افسر تھے۔ مسٹر ونٹر نگر کو ان میں سب سے کم عمر لیفٹیننٹ سے کچھ دلچسپی ہوگئی۔ اس کی عمر کوئی انیس برس کے قریب ہوگی۔ وہ غریب سینئر افسروں کو قطار میں آگے کی جگہ دے کر خود پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ "بیچارہ بچہ" مسٹر ونٹر نگر نے سوچا "شاید وہ کبھی بھی ڈیسک کے نزدیک نہیں پہنچ سکے گا۔" لیکن جوان لیفٹیننٹ آخرکار ڈیسک کے نزدیک پہنچ گیا اور مسٹر ونٹر نگر نے کلرک کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ اب کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ یہ جواب سُن کر لیفٹیننٹ کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے پتھر کی طرح غیر حساس کلرک سے کہا "آپ کے سینے میں دل ہے تو کچھ مہربانی کیجئے۔ میں آج صبح نو بجے سے کمرے کے لئے کھڑا ہوں۔" لیکن کلرک کا جواب اب بھی نفی میں تھا لیفٹیننٹ مایوس و نامراد واپس جانے لگا۔

مسٹر ونٹر نگر سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا وہ لیفٹیننٹ کے پاس گئے اور کہا "میرے پاس دو بستروں والا ایک بڑا کمرہ ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میرے پاس

ٹھہر جائیں ۔" لیفٹیننٹ نے جواب دیا "لیکن میرے ساتھ میری بیوی بھی ہے ۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک دُبلی پتلی نیلی آنکھوں والی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی ۔ مسٹر ونٹر نگر نے فوراً منیجر کے دفتر میں جاکر اس معصوم بیاہے جوڑے کی طرف سے وکالت کی ۔ منیجر نے کہا کہ آج کل اس قسم کے جوڑے درجنوں کی تعداد میں آتے رہتے ہیں ۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب کوئی کمرہ خالی نہیں ہے تو پھر ۔۔ میرے کمرے میں ایک چار پائی اور ڈال دو ۔" مسٹر ونٹر نگر نے کہا " اور وہ میرے کمرے میں ٹھہر سکتے ہیں ۔ تمہارے پاس ایک فالتو چارپائی تو ہوگی ۔ اور ہاں کمرے کو تقسیم کرنے کے لئے ایک پردے کی بھی ضرورت ہوگی ۔"

منیجر نے اس غیر معمولی تجویز پر اخلاقی خلاف ورزی کے ڈر کا اظہار کیا ۔ یہ بات کیونکہ اخلاقی قدروں کے خلاف تھی اس لئے منیجر اس کی تعمیل سے معذور تھا ۔ منیجر کے اس رویہ سے مسٹر ونٹر نگر جیسے سرد مزاج اور سنجیدہ شخص کو بھی غصہ آگیا اور انہوں نے اپنی پوری آواز سے چیخ کر پوچھا کہ کیا یہ انکار اخلاقی بنیاد پر کیا جا رہا ہے ۔ خدا کی قسم اگر یہ اخلاق کا معاملہ ہے تو یہ ہوٹل ایک سفیدی کی ہوئی قبر ہے اور میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں ۔ مجھے اس ہوٹل کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ . . . . وغیرہ ۔

مسٹر ونٹر نگر نے ایسا شور مچایا کہ منیجر گھبرا گیا اور اب وہ انہیں کسی بھی قیمت پر خاموش کرنا چاہتا تھا ۔ اس نے یکا یک بنا وٹی لہجے میں کہا " اوہ ۔ لیکن مسٹر ونٹر نگر آپ یہ کہئے نا کہ یہ خاتون آپ کی دختر ہیں (مسٹر ونٹر نگر نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی) اچھا ، اچھا ایسی صورت میں غالباً بطورِ خاص ہم انتظام کر سکتے ہیں ۔ مجھے سخت افسوس ہے آخر آپ نے یہ بات پہلے ہی کیوں نہیں بتائی ۔"

اس کے فوراً بعد انتظام کیا گیا ۔ لیفٹیننٹ اور اس کی دُلہن کو اُوپر مسٹر ونٹر نگر کا کمرہ دکھایا گیا ۔ مسٹر ونٹر نگر اس وقت وہاں ٹھہرے رہے جب تک کہ ایک چار پائی اور پردے کا انتظام نہ کر دیا گیا ۔ اس کے بعد انہوں نے لیفٹیننٹ مالکوم کو کمرے کی کنجی دیتے ہوئے کہا " میں ایک ڈنر میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں ۔ اس کے بعد تھیٹر جاؤں گا اور آدھی رات کے بعد تک واپس نہیں آؤں گا ۔ آپ اطمینان سے رہیں ۔ میں چپ چاپ آکر اپنی چار پائی پر سو جاؤں گا ۔"

دوسرے دن صبح مسٹر ونٹر نگر جب جاگے تو لیفٹیننٹ اور اس کی بیوی جا چکے تھے ۔ وہ یقیناً ایک ہی چار پائی پر سوئے تھے ۔ گو دوسری چار پائی کو بھی انہوں نے ایک کونے میں بچھا دیا تھا ۔ تکیئے پر ایک پرچہ رکھا تھا جس میں انہوں نے مسٹر ونٹر نگر کا شکریہ . . . . بلکہ بہت زیادہ شکریہ ادا کیا تھا ۔

اور اب سات سال بعد وہی لڑکی اجنبی بستی کے سیاہ دیواروں والے اسپتال میں کھڑی ہوئی مسٹر ونٹر نگر کو ممنون آنکھوں سے دیکھ رہی تھی ۔ وہ ان کے لئے اپنے گھر کے پھولوں کا گلدستہ لائی تھی اور یہ گلدستہ اس کا بچہ اپنے ہاتھوں میں فخر کے ساتھ لئے ہوئے تھا ۔ لڑکے کی آنکھیں بھوری اور بال گھنگھریالے تھے ۔ مسٹر ونٹر نگر نے مسکرا کر کہا " تم بالکل اپنے باپ پر گئے ہو ۔"

" ہاں ، ہے نا !" لڑکی نے خوش ہو کر کہا " سب یہی کہتے ہیں ۔"

" اچھا تمہارے شوہر کیسے ہیں ؟ میرے خیال میں اب وہ لیفٹیننٹ کے عہدہ سے ترقی کر گئے ہوں گے ۔"

اُس نے دیکھا کہ لڑکی کی آنکھوں کی چمک یکایک غائب ہو گئی لیکن شاید طویل مشق کی وجہ سے اس کی آواز میں کوئی لرزش پیدا نہیں ۔ اس نے سپاٹ لہجے اور سادہ الفاظ میں کہا وہ واپس نہیں آئے ۔ ہرٹگین فارلیسٹ میں مارے گئے ۔ میں اس وجہ سے بھی آپ کے احسان کو کبھی نہیں بھولوں گی ۔ میں اس احسان کو تا زندگی نہیں بھول سکتی ۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ وہ دوسرے دن ہی جانے والے تھے اور اسی دن اُن سے میری آخری ملاقات تھی ۔

(ماہِ نو)

مسٹر برڈ

مترجم : طاہر قریشی

شاطِر

میرا نام برڈ ہے اور میں اپنے نام کی طرح بہت شریف آدمی ہوں۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ میں باربر کی دکان میں شیو بنوا رہا تھا مجھے کرسی پر بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک غنڈہ دکان میں داخل ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ میں دستانے پہن رکھے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے اپنے منہ پر ایک ٹاٹ کا تھیلا چڑھا رکھا تھا۔ تھیلے میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے

"آل رائٹ!" وہ غرایا "جلدی سے کیش بکس خالی کر کے رقم میرے حوالے کر دو۔ اور کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا!"

خوش قسمتی سے باربر نے ابھی میری شیو بنانا شروع نہیں کی تھی ورنہ وہ اب تک میرے گال پر ایک آدھ گھاؤ لگا چکا ہوتا جیسا کہ عام طور پر ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ باربر بھی خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں استرا پکڑا ہوا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں استرا رکھنے کے لئے پلٹا۔

غنڈا یہ سمجھا کہ باربر اس پر استرے کے ذریعہ حملہ کرنا چاہتا ہے اس نے [illegible] وارننگ دیئے بغیر لگاتار دو فائر اس کے سینے پر کئے باربر فوراً ہی مر گیا۔ پھر وہ تیزی سے کیش بکس کی طرف بڑھا اور سارا کیش اپنی جیب میں ٹھونسنے لگا۔ اس وقت دکان میں ایک گاہک اور بھی تھا۔ وہ اپنی باری کا منتظر تھا۔ غنڈے نے پستول کا رخ ہم دونوں کی جانب کیا ہوا تھا۔ کیش بکس خالی کرنے کے بعد وہ الٹے پاؤں دروازے کی جانب بڑھا اور دکان سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔

"اس پوری کارروائی میں تیس سیکنڈ بھی نہیں لگے"۔ گاہک نے ایک پولیس افسر کو بتایا "میرا مطلب ہے کہ وہ شخص دکان میں داخل ہوا پستول سے دو فائر کئے۔ کیش بکس خالی کیا اور چلا گیا۔ یہ بہت خوفناک منظر تھا۔

"کیا تم نے اس کا حلیہ نوٹ کیا؟"

گاہک نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "حلیہ کیسے دیکھتا۔ اس نے اپنے منہ پر تھیلا چڑھا رکھا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا"

آفیسر نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

"ہا..." گاہک نے کہا "یہ شخص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا چہرہ گرم تولئے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اگر کوئی چیز قابلِ دید ہوتی تب بھی یہ شخص کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا"

اسی اثنا میں ایمبولینس بھی آ پہنچی۔ اس کے آدمی باربر کی لاش اٹھا کر لے گئے۔ دونوں پولیس افسروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک افسر بولا "چلو۔ چل کر اپنی رپورٹ تیار کرتے ہیں۔ اس شخص سے دماغ لڑانا بے سود ہوگا"

... اور اسی موقع پر میں نے پہلی مرتبہ زبان کھولی "جنٹلمین" میں نے کہا "میرا نام برڈ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو معلومات میرے پاس ہیں ان کی مدد سے تمہیں اس سفاکانہ قتل کے معمّے کو حل کرنے میں کافی مدد ملے گی"

افسروں نے میری جانب شک و شبہے کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"یہ بے حد نازک کلیو ہے" میں نے کہا "میں یہ کلیو بذاتِ خود پولیس ہیڈ کوارٹر میں چیف ہومی سائیڈ ڈیٹیکیٹو کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں تمہارے ساتھ چلوں؟"

کچھ دیر ہچکچاہٹ کے بعد انہوں نے حامی بھر لی۔

"میری پوزیشن کچھ عجیب سی ہے" میں نے افسروں سے کہا۔ ہم اس وقت پولیس کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کار کا رخ پولیس ہیڈ کوارٹر کی جانب تھا۔ "میں چاہ رہا تھا کہ ان [illegible] کو اعتماد میں لوں۔" لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے وہ بات... ابھی تم لوگوں کو بتا دی تو تم مجھ پر اتنا اعتماد کبھی نہیں کرو گے، جتنا اس وقت کر رہے ہو۔ بہرحال تمہیں پتہ ہے کہ میں پرندے کی ایک عجیب قسم سے تعلق رکھتا ہوں"

"تم یہ بات پہلے کہہ چکے!" ایک افسر نے کہا۔

میں مسکرا دیا "مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے مذاق کی داد نہیں دی۔ یہ حقیقت ہے کہ میرا نام اور میرا مشغلہ ایک ہی ہے۔ میں نے کچھ پرندوں کے بارے میں خاص طور پر مطالعہ کیا ہے۔ میں نے کئی سال تک اُن کی عادات و اطوار کا بڑی باریکی سے جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر طوطا اور مینا میرے پسندیدہ پرندے تھے۔ اتنے طویل اور قریبی تعلق کی وجہ سے میرے اندر بھی چند وہ خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں جو اِن پرندوں میں طرۂ امتیاز ہیں؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم اُڑ سکتے ہو؟"

"نہیں یہ مطلب نہیں بلکہ چند مخصوص حالات میں اُن کی آواز کی بہترین نقل اُتار سکتا ہوں۔ یہی بات میں چیف ڈیٹیکیٹو کو بتانا چاہتا تھوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اِس مدد سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

جب ہم پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچے تو میں نے دیکھا کہ دونوں افسران، چیف کو میرے بارے میں بتلاتے وقت اُنگلی سر کی جانب گھماتے ہوئے اشارے سے کچھ سمجھا رہے تھے۔ غالباً وہ مجھے پاگل یا سرپھرا سمجھ رہے تھے اور اُس وقت اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ چیف نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے میرا استقبال اس طرح کیا تھا جیسے میں اُس کا بہت پرانا دوست ہوں۔

"مسٹر برڈ!" چیف نے کہا "تم سے دوبارہ مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہماری پچھلی ملاقات کو غالباً دو سال ہو چکے ہیں۔"

"اگر تم اپنے ریکارڈ کا جائزہ لو تو اسکوائر ایڈی کو سزا دلاتے ہوئے تمہیں ٹھیک انیس ماہ ہو چکے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تم اس آدمی کو جانتے ہو؟" ایک پولیس افسر نے چیف سے پوچھا

چیف نے اپنا پائپ جلایا اور بیتے ہوئے دن یاد کر کے مسکرایا۔

"مشہور مجرم اسکوائر ایڈی کو سزا دلانے میں مسٹر برڈ نے ہماری سب سے زیادہ مدد کی تھی۔" چیف نے کہا "یہ منفرد شخصیت کا مالک ہے۔ پرندے پالنے کے شوق سے اس کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے، جو میڈیکل سائنس کے اصولوں کے قطعی برعکس ہے اور جس کے تحت۔۔"

"مجھے زیادہ شرمسار نہ کرو۔" میں نے چیف کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں پرندوں کی طرح بول سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کی طرح آواز کی نقل اُتار سکتا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے لیکن وہ بھی چند مخصوص حالات میں۔"

"ہاں چند مخصوص حالات میں۔" چیف نے تائید کرتے ہوئے کہا "ایک کلائمنٹ اسٹور میں ڈکیتی اور قتل کے فوراً بعد ہم نے اسکوائر ایڈی کو جا گھیرا تھا۔ اگر مسٹر برڈ موجود نہ ہوتے تو ایڈی صاف صاف بچ نکلتا۔ اس لئے کہ اِس واردات کا کوئی عینی گواہ موجود نہیں تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" ایک افسر نے کہا۔

"تم سمجھ بھی نہیں سکتے۔" چیف نے کہا۔ "پہلے تمہیں یہ بات سمجھنی پڑے گی کہ مسٹر برڈ ایک غیر معمولی آدمی ہیں۔ اُس واردات کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا، البتہ کانوں سے سُنا تھا۔ جس وقت اسکوائر ایڈی نے کلائمنٹ اسٹور کے مالک کو قتل کیا تو برڈ بھی اسٹور میں موجود تھا لیکن ایڈی کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اس لئے برڈ ڈریسنگ روم میں تھا اور ایک سوٹ ٹرائی کر رہا تھا۔

"ٹرائی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" میں نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہو گا کہ ڈریسنگ روم کا بلب فیوز ہو چکا تھا اور میں اُس وقت مکمل اندھیرے میں تھا۔ جب اسکوائر ایڈی نے اسٹور کے مالک سے رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ اُس روز پہلی مرتبہ مجھے اپنی اس صلاحیت کا پتہ چلا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے کان میری آنکھوں کا کام دے رہے ہوں۔"

"دوسرے لفظوں میں۔۔" چیف نے کہا۔ "۔۔برڈ نے اُس ڈاکو کی آواز کی ہو بہو نقل اُتاری تھی اور ہم نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا تھا کہ وہ اسکوائر ایڈی کی آواز ہے۔"

"آج بھی، جناب!" میں نے چیف سے کہا۔ "مجھے بالکل وہی محسوس ہوا تھا۔"

چیف کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی "جس شخص نے باربر کو قتل کیا ہے، تم نے اُس کی آواز سنی ہے؟"

"جی ہاں سُنی تھی۔ بالکل صاف آواز تھی چونکہ میرے چہرے کے گرد گرم گرم تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ اس لئے میری آنکھوں کے سامنے مکمل اندھیرا تھا اور یہی حالت میری اس وقت بھی تھی جب میں اسٹور میں سوٹ ٹرائی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہر حال، میں اس شخص کی آواز کی نقل اُتار سکتا ہوں۔"

"جنٹلمین!" چیف نے پولیس افسروں سے مخاطب ہو کر کہا "تمہارے سامنے ایک حیرت انگیز چیز پیش کی جانے والی ہے بشرطیکہ

مسٹر برڈ! اچھے موڈ میں ہوں۔ پلیز، بیٹھ جاؤ، برڈ!"

"شکریہ" میں نے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔" مجھے موڈ بنانے کے لئے صرف چند لمحات کی مہلت درکار ہے۔"

"یہ خود تنویم قسم کی ایک چیز ہے۔ چیف نے افسران کو سمجھاتے ہوئے کہا۔" خود مسٹر برڈ کو بھی نہیں معلوم کہ یہ کس طرح ہوتا ہے۔"

"میں تیار ہوں" میں نے کہا "کیا تم سننے کے لئے تیار ہو؟"

چیف اور پولیس افسران نے اثبات میں جواب دیا۔

"او کے۔ تو پھر سنو" میں نے کہا اور اُس شخص کے الفاظ دہرانے لگا "آل رائٹ۔ جلدی سے کیش بکس خالی کر کے رقم میرے حوالے کردو۔ اور کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا۔"

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چیف اور پولیس افسران کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

"لیفٹی ملر" چیف نے کہا۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں" ایک پولیس افسر نے چیف کی تائید کی۔ "لیفٹی ملر لفظ "ٹی" کی ادائیگی بالکل اسی انداز سے کرتا ہے۔"

دوسرے افسر نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیفٹی ملر سے پولیس اچھی طرح واقف ہے" چیف نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا "اس مرتبہ بھی تم کامیاب رہے ہو مسٹر برڈ!"

"کیا تم اُسے سزا دلوا دو گے؟"

"اب ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ یہ حرکت کس کی ہے" چیف نے سخت لہجے میں کہا "ہم ثبوت حاصل کرلیں گے۔"

"گڈ، مجھے یہ خدمت انجام دے کر بے حد خوشی ہورہی ہے۔"

چیف، میری طرف تحسین آمیز انداز میں دیکھ کر مسکرانے لگا" کیا تم اب بھی اس بات کے خلاف ہو کہ تمہاری اس صلاحیت کا ذکر اخبارات میں کیا جائے؟"

"جی ہاں" میں نے تیزی سے کہا "پہلے کی طرح اب بھی میں کسی شہرت کا خواہشمند نہیں۔"

"تم واقعی حیرت انگیز ہو۔"

پولیس افسران بھی تائید میں سر ہلانے لگے "ہم نے اس سے قبل ایسی صلاحیت کسی میں نہیں دیکھی۔"

میں نے ان سے اجازت چاہی اور ہاتھ ملا کر رخصت ہولیا

پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکل کر میں سیدھا اُس شخص کے پاس پہنچا جس نے حقیقت میں باربر کو قتل کیا تھا۔ اس شخص کا نام اسمتھ فرض کر لیں میں اُس سے اپنا معاوضہ لینے گیا تھا۔"

"انہوں نے تمہاری بات پر یقین کر لیا؟"

"یقیناً"

اسمتھ خوشی کے مارے اپنے ہاتھ ملنے لگا "پہلے اسکوائر اینڈ اور اب لیفٹی ملر" وہ چہچہایا "بہت جلد میں شہر کے تمام گروہوں کو اپنے قابو میں کرلوں گا۔"

"پلیز" میں نے کہا "مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں"

"واقعی؟" اسمتھ نے پوچھا۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے جگمگا رہی تھیں "کیا تم یہ جاننا بھی پسند نہیں کرو گے کہ میں نے کس طرح وہ پستول اور باربر کی دکان سے حاصل ہونے والی رقم لیفٹی کے ٹھکانے پر پہنچا دی ہے۔ کیا تم یہ بھی جاننا نہیں چاہتے کہ تم کس بہترین طریقے پر میری مدد کر رہے ہو۔"

"نہیں" میں نے کہا۔ اس دوران میں اپنے معاوضے کی رقم کی گنتی کر چکا تھا۔ رقم پوری تھی۔ "مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی جب کبھی تمہیں میری خدمات کی ضرورت ہوئی مجھے یاد رکھو گے؟"

"ہاں" اسمتھ نے کہا۔ "ساؤتھ سائڈ کے علاقہ میں ایک نوجوان نے میرے گروہوں کے درمیان گڑبڑ کرانے کی کوشش کی تھی میں نے اُس کی آواز ٹیپ کرانے کا انتظام کر لیا۔ میں بہت جلد وہ ٹیپ تمہیں پہنچا دوں گا۔ تاکہ تم اُس کی آواز کی نقل اتارنے کی کوشش شروع کردو۔ لیکن کیا تم اپنی رفتار تیز کر سکتے ہو؟"

"میں ایک فنکار ہوں۔ طوطا نہیں ہوں" میں نے کہا "مجھے کسی کی آواز کی ہوبہو نقل اتارنے میں ایک سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے مجھے خود پر حیرت ہے کہ میں یہ کام کیسے کر لیتا ہوں۔"

میں نے اسمتھ سے اجازت چاہی۔ میری جیب میں پانچ ہزار ڈالر کی گڈی موجود تھی۔ میرا نام برڈ ہے اور میں اپنے نام کی طرح بے حد شریف ہوں لیکن مجھے پیسہ پسند ہے . . . اور پانچ ہزار ڈالر سے تو آدمی لاتعداد پرندوں کا دانہ خرید سکتا ہے۔

"نئے افق"

عابد نقوی

لندن (انگلینڈ)
یکم فروری ۱۹۷۹ء

من کہ مکتوب الیہ

برادرم سرور صاحب

آداب ۔ آپ کا خط کل ملا ۔ کافی دیر اور انتظار کے بعد اب اپنی پہلی فرصت میں پہلے آپ کو تحریر کر رہا ہوں ۔

آج کل یہاں کی حالت دگرگوں ہے ۔ انسان کو جتنی زیادہ آزادی دی جائے وہ اور مانگتا ہے ۔ اس آزاد ملک کے باشندے بھی اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی آزاد ہیں ۔ حکومت کچھ نہیں کر سکتی یہ ترقی پسند ملک کی تباہی نہیں تو اور کیا ہے ۔

پہلے حالات سن لیجیے ۔ ہسپتال والوں نے اسٹرائک کی ہوئی ہے ۔ امبولنس کے ڈرائیورز اسٹرائک پر ہیں ۔ مرنا ہے تو سڑک پر دم توڑنا ہوگا ۔ ہسپتال نہیں پہنچ سکتے ۔

مرنے کے بعد قبرستان نہیں جا سکتے ۔ قبر کھودنے دفن کرنے والوں کی اسٹرائک ہے ۔ لہذا مرنے کے بعد بھی برف خانہ میں پڑے رہیے ۔ ٹرانسپورٹ ، ریل وغیرہ کی اسٹرائک کہیں آجا نہیں سکتے ۔

لاری ڈرائیور ۔ جو کھانے پینے کا ساز و سامان دکانوں میں سپلائی کرتے ہیں ۔ اسٹرائک پر ہیں ۔ دکانیں ، اسٹور خالی پڑے ہیں ۔

جب زمین کے رہنے والوں نے اُدھم مچا دیا ۔ تو اللہ تعالیٰ کیوں خاموش بیٹھتا ۔ اس نے عرش (فلک) پر اُدھم مچا دیا اور بارش ، سردی ۔ برف باری کردی یعنی (ایمرجنسی لگادی) ۔ بارہ بارہ انچ برف سڑکوں پر جمع ہے اس کی صفائی کرنے والے ۔ کارپوریشن والے کیوں خاموش بیٹھتے اُنہوں نے بھی اسٹرائک کردی ۔ ان سب کو تنخواہ زیادہ چاہیے ۔ میرے خیال میں ان سب کو اندرا گاندھی کی ضرورت ہے (یعنی ایمرجنسی کی) زندگی کا سارا کام معطل پڑا ہیں اتنی سردی کبھی ۲۰ سال میں ریکارڈ کے مطابق نہیں پڑی ۔ خطوط کا آنا جانا دیر میں کبھی مل جائے تو غنیمت ہے ابھی

کل خط کراچی سے آیا ہے ۔ لکھا ہے وہاں پوسٹ آفس میں ہڑتال ہے ۸۰ لاکھ خط پڑے ہیں ۔

میری کتاب کے متعلق عرض ہے خدا کو منظور ہوگا تو چھپ سکے گی ۔ چاند گل کو ۲ بار فون کیا نہیں ملیں ۔ شاید نوکری شروع کر دی ہے ۔ ایسا لگتا ہے ۔ مجھ سے کہہ رہی تھیں ۔ نوکری شروع کرنے والی ہوں ۔ انشاء اللہ حالاتِ زندگی معمول پر آتے ہی یہ کام انجام دوں گا ۔ مسودہ ان سے حاصل کر کے روانہ کر دوں گا ۔

آپ ۶۴ سال کے ہوگئے ہیں تو کیا ہوا ۔ ارے قبلہ اس وقت تو نوجوانی شروع ہوتی ہے ۔ اس عمر میں تو آدمی جوان کہلاتا ہے ۔ یہاں پر اکثر ۷۰ سال کی عورتیں اور ۸۰ سال کے نوجوانوں کے درمیان شادیاں ہوتی ہیں ۔

وشوا ناتھ طاؤس جرنلسٹ
کوٹھی نمبر ۳۶ سیکٹر ۸ ۔ اے
چنڈی گڑھ

۱۶ / دسمبر ۱۹۷۸ء

برادر محترم سرور صاحب

تسلیم شانِ ہند ماہ نومبر نظر انداز ہوا

مشاعرہ عید دسہرہ ملن سوائی مادھو پور کی روداد پڑھ کر ۱۹۵۰ کے اُن ایام کی یاد تازہ ہوگئی ۔ جب آپ نے سردار دیوان سنگھ مفتون کی فرمائش پر "ریاست" میں دِلّی کے مشاعروں کی کومنٹری لکھنی شروع کی تھی ۔ اُردو ادب میں یہ ایک نئی صنعت تھی اور آپ کے بے لاگ انداز بیان اور بے باک جملوں کے باعث ان کومنٹریوں کی دھاک ساری اُردو دنیا میں بیٹھ گئی تھی ۔ کئی سال پہلے آپ نے ان کومنٹریوں کو "دِلّی کے مشاعرے" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کرنے کا اعلان فرمایا تھا ۔ کاش ایسا ہو جاتا تو اردو

کے خزانے میں ایک قیمتی گوہر کا اضافہ ہوجاتا۔

گوشۂ عقیدت، صدیقی کے تحت شعرائے کرام کے بارے میں مضمون بے حد پسند آیا۔ ایک طویل مدت کے بعد اس قدر پُرمزاح اور دلچسپ مضمون پڑھنے کو ملا ہے۔ میں نے اسے ایک مزاحیہ کہانی کے طور پر بچوں کو سُنایا اور وہ بڑے محظوظ ہوئے۔ صاحبِ مضمون کا نام البتہ درج نہیں ہے۔ جو حیران کُن بات ہے۔ مصنف نے اگر اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا تو بھی آپ جان گئے ہوں گے کہ پس پردہ کون ہے کیونکہ کوچۂ ادب وصحافت سے آپ کی پُرانی شناسائی ہے۔

۲۴، ۲۵، اور ۲۶ نومبر کو پٹنہ میں ہونے والی آل انڈیا اُردو کانفرنس میں انجمن ترقی اُردو چنڈی گڑھ شاخ کے کنوینر کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ڈاکٹر خلیق انجم سے دریافت کیا کہ جناب سرور تونسوی اور جناب جمنا داس اختر کو کانفرنس میں شمولیت کے لئے دعوت نامے بھجوائے گئے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ مصروفیات اور گہما گہمی کے باعث کچھ اُردو دوست حضرات کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کرنے کی بات ان کے ذہن ہی سے نکل گئی ورنہ آپ دونوں حضرات کی موجودگی سے کانفرنس کی اہمیت و رونق میں اضافہ ہوتا۔ خلیق انجم صاحب بہت افسوس ظاہر کر رہے تھے کہ یہ بات میں نے انہیں پہلے کیوں یاد نہیں دلائی۔ میں نے کہا کہ تجویز میں نے آپ کو لکھ بھیج دی تھی لیکن شاید میرا خط انجمن کے دفتر میں آپ کی دلّی سے روانگی کے بعد پہنچا ہو۔

پٹنہ میں کئی ادبی ہستیوں سے ملاقات ہوئی اور کئی بار آپ کا ذکر آیا۔ کیونکہ جب وہ اُردو زبان سے میری بے پناہ محبت اور عقیدت کے بارے میں دریافت کرتے تھے تو میں یہی جواب دیتا تھا کہ یہ سب سرور صاحب کی دین ہے۔ ممتاز افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی کو جب میں نے بتایا کہ میں آپ کا شاگرد ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے "سرور شیر مسلمان ہے کیونکہ مسلمانوں کی حمایت میں وہ کئی بار مسلمانوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے"۔

ہفت روزہ "عظیم آباد ایکسپریس" کے مدیر رضوان احمد صاحب نے بھی آپ کا نام بڑے احترام سے لیا۔ وہ دریافت کر رہے تھے کہ یکجہتی کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی آپ ہندو اور مسلم کا سوال لے کر کیوں لکھتے ہیں، میں نے جواب دیا کہ وہ تکلّف سے کام لئے بغیر صاف بات کہنے پر یقین رکھتے ہیں تاکہ حقیقت منظرِ عام پر آسکے اور غلط فہمیاں دُور ہو جائیں میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میرا ذہن جو سیکولر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے تو یہ سب سرور صاحب کی تربیت کا اثر ہے۔ اردو کانفرنس کی روداد آپ نے اخبارات میں پڑھ لی ہوگی۔ کانفرنس کی مطبوعہ رپورٹیں میں نے محمد کفایت اللہ صاحب سکریٹری اقبال میموریل ٹرسٹ پنجاب کے ہاتھ آپ کو بھجوائی تھیں۔ وہ واپسی پر دلّی میں آپ سے ملنے گئے تھے۔ آپ قیام گاہ پر نہیں ملے اس لئے وہ رپورٹیں آپ کے دفتر میں چھوڑ آئے تھے۔

شورش کاشمیری کی تمام تصنیفات پڑھنے کی بڑی تمنّا ہے۔ جناب محمد کفایت اللہ صاحب کی عنایت سے بوئے گل نالۂ دل (حصہ اول)، موت سے واپسی، تمغۂ خدمت اور یورپ کا سفر پڑھنے کو مل گئی ہیں۔ کتابیں آپ کی جانب سے ملنے کا منتظر ہوں۔ یہ کتابیں پڑھے بغیر مر گیا تو بخدا میری رُوح کو قرار نصیب نہ ہوگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور آغا شورش کاشمیری برصغیر کی یہی دو ہستیاں تو تھیں جن کا ثانی نہ کوئی تھا اور نہ ہوگا۔

آپ کی مکمل صحت یابی اور درازیٔ عمر کے لئے ہمیشہ بارگاہِ اقدس میں دعا کرتا رہتا ہوں۔

مخلص

وشوا ناتھ طاؤس

غزلیات

شمس پمن گرامی کشن گنج پورنیہ

ہم اُبھرے ہیں طلسمِ کُن فکاں سے
گہر نکلا ہے بحرِ بیکراں سے
ابھی دم تو نہیں توڑا کسی نے
دھواں کیوں اُٹھ رہا ہے ہر مکاں سے
ہوا کے دوش پر خبریں اُڑیں گی
لہو رستا ہے پتھر کی زباں سے
ترا آنا قیامت ہی نہ کیوں ہو
ہم اُٹھنے کو نہیں اِس آستاں سے
بیابانو! مجھے بھی جذب کر لو
نکل بھاگا ہوں اپنے کارواں سے
تذبذب کی گھٹا ہے اور میں ہوں
رہا ہوتا ہوں کب قیدِ زماں سے
لپک اٹھا مرے اندر کا شعلہ
شرارے پھوٹ نکلے کہکشاں سے
کہے دیتی ہے ان کی لغزشِ پا
کہ شمسؔ اس وقت آتے ہیں کہاں سے

اُمید ادیبی شیرالکوپہ ضلع شیموگہ

ہائے اُلفت کا ہماری ایک ہی انعام تھا
آہ لب پر ہاتھ دل پر، بس یہی انجام تھا
دل لیا، آنکھیں لڑائیں، اور جنوں کر دیا
بے وفائی کا مرے سر پر بھی اک الزام تھا
جب نہ تھا منظور تم کو رسمِ الفت کا نباہ
آنکھوں آنکھوں میں ہی کیوں پہلے دیا پیغام تھا
ہم کو ہر ہر گام پر مایوسیاں آئیں نظر
اور ہر نالہ ہمارا شورِ بے ہنگام تھا
میری رسوائی تمہارے عشق میں بھی کُو بہ کُو
پھر بھی عفت کا تمہاری ہر جگہ پر نام تھا
روئے زیبا کاش تم مجھ کو دکھاتے ایک بار
آخری حسرت تھی میری آخری پیغام تھا
بعد مُردن قبر پہ میری وہ آئے چل دیے
کتنا حسرت خیز الفت کا مری انجام تھا
یاد آتے ہیں وہ ایامِ جوانی اے اُمیدؔ
عشق کا چرچا تمہارے جبکہ صبح و شام تھا

حکیم شبیر علی خاں شبیرؔ کانپوری

یوں دکھا جلوہ مجھے دنیا تماشائی نہ ہو
میں بھی تجھ کو دیکھ لوں تیری بھی رسوائی نہ ہو
وہ جنوں ہے خام جو محرومِ دانائی نہ ہو
غیر ممکن ہے محبت کر کے رسوائی نہ ہو
چھیڑتی کیوں ہے مری نظروں کو اے فصلِ بہار
کیا کروں وہ پھول لیکر جس میں رعنائی نہ ہو
لاکھ ہو محرومِ نظارہ نگاہِ کائنات
کون ایسا دل ہے جو تیرا تمنائی نہ ہو
دیکھ کر مجھ کو پریشان کوئی مجھ سے کہہ گیا
وہ محبت ہی نہیں جس میں کہ رسوائی نہ ہو
اس قدر کر لے تصور میں اُنہیں اپنے قریب
تجھ کو تنہائی میں بھی احساسِ تنہائی نہ ہو
چاند پر شبیرؔ جا کر کیوں ہو بارِ زمیں
کاش انسانوں میں یہ حکمت یہ دانائی نہ ہو

اصلاح کاریِ ادب

اور حضرت داغ دہلوی مرحوم کے چند اصلاحی نمونے

حاجی نعمت اللہ نعمت جلال آباد ضلع مظفر نگر

(قسط اول ماہ اگست ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی)

(دوسری قسط)

(ب)

(جاں بلب ہوں ہجر میں وہ پاس تک) آتا نہیں
مار ڈالے گی مجھے اس سرو قامت کی طلب

(باغ میں سامانِ مے ہے اور وہ) آتا نہیں
مار ڈالے گی مجھے اس سرو قامت کی طلب

سرو قامت کی رعایت کے لئے پہلے مصرع میں کوئی شے نہ تھی "باغ" نے جامۂ سرو قامتی جسمِ معشوق پر قطع کر دیا جس قدر الجھنیں اور گرانیاں تھیں سب رفع کر دیں، شعر کی روانی کو بڑھا دیا اور فطرت جھلکنے لگی۔

آپ کے جور و جفا سے ہوگیا ہے پائمال
آب دلِ مضطر کو ہے (دستِ شفقت) کی طلب

آپ کے جور و جفا سے ہوگیا ہے پائمال
اب دلِ مضطر کو ہے (چشمِ عنایت) کی طلب

ایک تو "شفقت" "کا" "ق" مشدد تھا جو لغوی غلطی تھی۔ دوسرے "دستِ شفقت) بزرگوں کے لئے آتا ہے یا پھر چوٹ کے طور پر بدمعاشوں کے لئے جیسے لفظ "حضرت" اور یہ دونوں سخت عیب تھے "چشمِ عنایت" نے تمام کوتاہیاں رفع دفع کر دیں اور شعر کو تاثیر سے بھر دیا۔ غور کیجئے نظر کام کر سکتی ہے ہاتھ کیا ساتھ دے گا

× × × دیکھ کر ٹھنڈی ہوائیں دیکھ کر کالی گھٹا
ہے دلِ سوزان کو بادہ عشرت کی طلب

شعر کو غزل سے خارج کرتے ہوئے فصاحت رقم حضرت نواب مرزا داغ مرحوم نے یہ ریمارک تحریر فرمایا ہے۔

"بادۂ عشرت چاہیے۔ اضافت کے بغیر بے معنی ہے۔"

جنتی ہوتے بلا شک خُلد میں ہوتا مکاں
(کوئے جاناں چھوڑ جو کرتے عبادت) کی طلب

جنتی ہوتے بلا شک، خُلد میں ہوتا مکاں
(طاعتی بندے جو کرتے اس کی رحمت) کی طلب

"جو کرتے عبادت کی طلب" ایک بھدا اور مہمل سا جملہ تھا عبادت ادا کی جاتی ہے نہ کہ طلب۔ پھر عبادت کرنے پر بھی جنتی ہونا اور خلد مکیں بننا لازم نہیں۔ اصلاح نے شعر کو اغلاط و مجاز کے دائرے سے نکال کر صحت و حقیقت کی منزل پر پہنچا دیا "جو کرتے عبادت" کے مقابلہ میں "طاعتی بندے" کی سبکی و خوبی و فصاحت قابلِ صد داد ہے اور "طلبِ رحمت" پر پہلے مصرعہ کا نتیجہ بننا اب بالائے داد۔ بہت ہی خوب اصلاح "چھوڑ کر" کی جگہ مائل نے "چھوڑ" استعمال کیا تھا جو متروک ہو چکا۔ یہ عیب بھی نکل گیا۔

× × × بے غرض کعبہ نہ جاتے ہم کبھی اے شیخ جی!
ایک مدت سے ہے ہم کو دل سے اُس بُت کی طلب × × ×

اُستاد مرحوم نے یہ شعر اِس ریمارک کے ساتھ غزل سے خارج کر دیا کہ :-

"بُت اور عشرت کا قافیہ کیونکر ہوگا؟ کیا بُت لفظ بے معنی نکالا ہے !!!"

جب کمندِ عشق میں عاصی بُتوں کی پھنس گیا
پھر کہاں فرحت (جو؟ ہے تو) فرحت کی طلب

جب کمندِ عشق میں عاصی بُتوں کی پھنس گیا
پھر کہاں فرحت (جو تو کرتا ہے) فرحت کی طلب

مائل صاحب کے مصرعے میں اچھی خاصی تعقید اور سخت اُلجھن تھی۔ ذرا سے ردّ و بدل نے شعر کو کس قدر رواں اور موثر بنا دیا ہے۔ کسی قدیم اُستاد (غالباً اُستاد ذوق مرحوم) کا بھی ایک شعر ہے۔ شعر مائل کے دوسرے مصرع میں اس کی جو جھلک نمایاں ہے ملاحظہ ہو ؎

بطنِ مادر ہی سے جب پیدا ہوا تکلیف سے
یاں کہاں راحت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب

غالباً مائل صاحب کے دوسرے مصرع کا ماخذ اسی شعر کا مصرع ثانی ہے۔

(ج) ۳۱ ۱۲/۹۲ ء

ملا ہم کو اُس بُت کا دیدار آج ۔ مِٹا ہجر کا دل سے آزار آج
(ہوا) " " " " " " " " " " " "

"دیدار ہونا" محاورہ ہے، نہ کہ "دیدار ملنا" اس بنا پر اصلاح دی گئی اور شعر کو محاورے کے سانچہ میں ڈھال دیا گیا۔

کسی دل کا خون، آج ہوگا ضرور ۔ (بنی خوب ہے) زلفِ بلدار آج
" " " " ۔ (رکہ مہندی لگاتا ہے دلدار) آج

زلف کی بلداری، اور "دِل خون ہونے" کے مابین کوئی نسبت واسطہ اور رعایت نہ تھی اور "زلف بلدار" میں عدم سلاست کی گرہ بھی تھی۔ مگر اُستاد مرحوم کی اصلاح نے "مہندی لگانے" کے قدم بقدم "خون ہونے" کی رعایت کے ساتھ صفائی بھی پیدا کر دی اور "بلدار" کی غلطی کا "بل" بھی نکل گیا

کہوں کس سے افسوس میں حالِ دِل ؟
نہیں کوئی (رہے) میرا غمخوار آج
" کہوں کس سے افسوس میں حالِ دل ؟
نہیں کوئی (بھی) میرا غمخوار آج

"بھی" حرف تاکید انتہائی بیکسی کی کیفیت پیدا کر دی "ہے" علاوہ روانی میں روڑا اٹکانے کے بھدا بھی معلوم ہوتا تھا۔

(اگر ملنا ہو وے تو) ملجائیے ۔ میں مرنے کو بیٹھا ہوں تیار آج
(جو ملنا ہو منظور) ملجائیے ۔ میں مرنے کو بیٹھا ہوں تیار آج

اوّل تو خود "نواب فصیح الملک بہادر" مرحوم نے "ہو وے" پر ریمارک

اس شعر پر دیا ہے "ہو وے" متروک، پھر ذرا غور کیا جائے تو اصلاح سے سلاست و صفائی کا دریا موجیں مارتا نظر آئے گا۔

(ح) خط پر تاریخ نہیں۔ ڈاک خانہ کی مہر پر ، ر نومبر ہے سنہ ندارد

× × ×

ملتا نہیں ہے وہ پری رخسار اے مسیح
یاں نیم جاں ہے طالب دیدار اے مسیح

پورا شعر اس ریمارک کے ساتھ کاٹ دیا ہے "پری رخسار کی (ی) گرتی ہے" اور شعر بھی کوئی شعر میں شعر نہیں ہے

(ہم کو) دیا نہ شربتِ دیدار اے مسیح!
آب جاں بلب ہے عاشقِ دیدار اے مسیح!
(تو نے) دیا نہ شربتِ دیدار اے مسیح!
آب جاں بلب ہے عاشقِ دیدار اے مسیح!

ندا اور منادیٰ کے ساتھ "ضمیر مخاطب فاعلی" نے بجائے "ضمیر مفعولی" کے لطف زیادہ پیدا کر دیا اور پھر ایک قسم کی تخصیص اور ہو گئی۔

سمجھوں میں مجھ کو تختِ سلیماں ہوا نصیب
مل جائے ہجر میں جو دریار اے مسیح

پورے شعر کو اُستاد مرحوم نے اس ریمارک کے ساتھ قلمزد کر دیا "یہاں مسیح کا کیا کام ہے"۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ "واقعات سلیمانی" اور "معجزات مسیحی" میں کوئی واسطہ بھی نہیں۔ یہ شعر ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے تحت میں تھا۔ اس لئے اس کا غزل سے نکال دینا ہی بہتر تھا

سچ تو یہ ہے کہ شربتِ دیدار کے سوا
(چنگا) نہ ہوگا عاشقِ بیمار اے مسیح!
سچ تو یہ ہے کہ شربتِ دیدار کے سوا
(اچھا) نہ ہوگا عاشقِ بیمار اے مسیح!

اس شعر پر اُستاد مرحوم کا یہ ریمارک بھی ہے "اکیلا "چنگا" متروک ہے بھلا کے ساتھ مناسب ہے۔ واقعی محض "چنگا" تو پنجابی زبان ہے نہ کہ اردو۔

تم کہتے ہو کہ مرض کوئی نام کو نہیں"
× × × × × × × × × ×
کہتے ہیں ہم کہ [illegible] "آزاد" اے مسیح!

یہ شعر اِس ریمارک کے ساتھ خارج غزل کر دیا گیا ہے ۔
"مرض بر وزن غرض" درحقیقت اِس طرح عروضی عیب شعر
میں موجود تھا اور پھر شعر میں کوئی شعریت بھی نہ تھی ۔

ہوش و حواس (کس طرح میرے بجا) رہیں؟
عشقِ بُتاں میں دل ہے گرفتار اے مسیح!

ہوش و حواس (میرے بجا کس طرح) رہیں ؟
عشقِ بُتاں میں دل ہے گرفتار اے مسیح!

اِس شعر پر یہ ریمارک ہے "۔ اس مقام پر کس طرح کی
(ح) گرتی ہے"

لطیفہ: اس غزل کی اصلاح کے بعد آخر میں ایک پُرلطف اور
شوخی آمیز فقرہ بھی تحریر فرمایا ہے جو حضرت داغ مرحوم کی
زندہ دلی اور شوخی مزاجی پر دال ہے اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ
وہ اپنے تلامذہ کے ساتھ مساوات برتتے اور آزادانہ پیش
آتے تھے وہ فقرہ یہ ہے ۔
" یہ غزل آپ کی عیسائی ہوگئی ۔ گرجا گھر میں بھیجئے میرے
پاس کیوں بھیجی ؟"
ملاحظہ فرمایا آپ نے ؟ ردیف کی رعایت سے کیا خوب
فرما گئے ۔

(خ) ۱۵/۹۵ء

ہزار حیف کہ فصلِ بہار میں (تو نے)
(چھڑا یا بلبلِ شیدا سے آشیاں) اے شوخ!

ہزار حیف کہ فصلِ بہار میں (بھی تو)
(نہ میرے ساتھ چلا سوئے گلستاں) اے شوخ!

علاوہ گرانی اور ثقالت کے شعر اِس قدر پیچیدہ
ہوگیا تھا اور اتنے بیہودے استعارات کے پڑ گئے تھے کہ اچھا
خاصا ایک گورکھ دھندا بن گیا تھا مگر اُستاد مرحوم کی
اصلاح نے شعر میں سلجھاؤ اور صفائی فصاحت وغیرہ بھی
پیدا کر دی ۔

(رہی ہے کس پہ ہمیشہ یہ حُسن کی دولت)
(عبث جمال پہ کرتا ہے تو گماں اے شوخ!)

یہ چار دن کی جوانی ہے ایسی دولت پر)
(تجھے غرور ہے اس درجہ الاماں اے شوخ!)

"رہی ہے کس پہ" اور "گماں ہونا" بہت ہی عامیانہ و
سوقیانہ زبان تھی اور طرزِ ادا پورے شعر کا اچھا نہ تھا ۔
اس لئے مکمل شعر کو بدل دیا ۔ مفہوم وہی رہا لیکن الفاظ کے
تغیر نے ایک لطف پیدا کر دیا "الاماں" کا زور تو ملاحظہ فرمایئے ۔

تو جلد آ کہ تری (فرقت) جُدائی میں
پڑی ہے ہائے کشاکش میں میری جاں اے شوخ!

تو جلد آ کہ تری (صدمہ) جُدائی میں
پڑی ہے ہائے کشاکش میں میری جاں اے شوخ!

"فرقتِ جُدائی" گویا "شب لیلۃ القدر کی رات" اور مہملیت کا
ایک پشتارہ تھی ۔ اصلاح نے معنویت پیدا کر دی ۔

ہوئی تمام (مری) زندگی حسینوں میں
ملا نہ کوئی بھی عاصی کا قدر داں اے شوخ!

ہوئی تمام (یوں ہی) زندگی حسینوں میں
ملا نہ کوئی بھی عاصی کا قدر داں اے شوخ!

"یوں ہی" نے کیفیات و حالتِ واردہ کا نقشہ کھینچ
دیا اور دونوں مصرعے ایک دوسرے سے دست و گریباں
ہوگئے پہلے باہم کوئی ربط نہ تھا ۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ صفحہ) ممکن ہے کہ آپ کی اس تصنیف کی اشاعت کا کوئی ذریعہ نکل
آئے اور آپ کے خواب پورے ہوسکیں ۔

آپ کے نام

ہم معذرت خواہ ہیں کہ ایڈیٹر شانِ ہند کی علالت کے باعث جنوری
فروری کے شمارے دیر سے چھپ سکے ۔ مارچ کا شمارہ ۱۶ مارچ کو روانہ
کیا جا رہا ہے ۔ خدا نے چاہا تو اپریل کا شمارہ یکم اپریل کو حوالۂ ڈاک
کر دیا جائیگا اور کوشش کی جائے گی کہ اب شانِ ہند ہر ماہ یکم تاریخ
روانہ ہوسکے ۔ اگر آپ کو ۱۰ تاریخ تک رسالہ نہ ملے تو
ہمیں اطلاع دیجئے تاکہ رسالہ دوبارہ بھجوایا جا سکے
لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے ڈاک خانہ کے صدر دفتر میں شکایت
ضرور کیجئے کہ آپ کا رسالہ گم ہوتا ہے ۔

عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان کی جانب سے کُل ہند اُردو کانفرنس کے مندوبین کا خیر مقدم اور ڈائرکٹر شوکت علیخاں کو سپاس نامہ!

۴ دسمبر ۱۹۷۸ء کی رات کو ۹ بجے عربی فارسی کے محققین و اسکالرس کی جانب سے "سنہری کوٹھی ٹونک" میں ایک شاندار تقریبِ تہنیت بہ اعزاز جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب منعقد ہوئی جس میں شوکت علی خاں کو حکومتِ راجستھان کی طرف سے عربی فارسی ادارہ کے ڈائرکٹر بنائے جانے پر سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ (جامعہ ملیہ دہلی) نے فرمائی جو انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند کی کُل ہند کانفرنس میں شرکت کرنے ٹونک تشریف لائے ہوئے تھے۔ تقریب میں نارنگ صاحب کے علاوہ دوسرے ادبا و اساتذہ کرام میں جناب ڈاکٹر قمر رئیس، جناب ڈاکٹر عنوان چشتی، جناب ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر عبد الحق، ڈاکٹر محمد علی زیدی، محترمہ کلثوم بانو، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، عشاد جہاں رضوی، ریاست حسین فاروقی، مختار احمد تسیم نے خصوصیت سے شرکت فرمائی۔

استقبالیہ کی تقریب کا آغاز مولانا سید قاضی الاسلام صاحب نے اپنی مختصر تقریر سے فرمایا۔ بعد ازاں صاحبزادہ شوکت علیخاں صاحب نے باہر سے تشریف لانے والے معزز ادبا کی خدمت میں خطبہ استقبالیہ ارشاد فرمایا اور ادارہ تحقیقات عربی فارسی میں تشریف آوری کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی خدمات ادب و شعر کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ شوکت صاحب کے مقالہ کے بعد مولانا سید منظور الحسن صاحب برکاتی نے ایک سپاسنامہ پڑھا جو شوکت علی خاں کے ڈائرکٹر منتخب ہونے پر ان کی ادبی و عملی و علمی خدمات کے اعتراف پر مشتمل تھا اور انسٹی ٹیوٹ کے اسکالرس کی جانب سے لکھا گیا تھا۔ سپاسنامہ کی عبارت نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی۔ برکاتی صاحب نے سپاسنامہ پڑھنے کے بعد شوکت صاحب کی خدمت میں خلوص و محبت پیش کیا تو سنہری کوٹھی کا ہال احسنت مرحبا کی آواز سے گونج اُٹھا! اور پھول مالاؤں کی کثرت نے شوکت صاحب کی گردن کو شاخِ ثمردار بنا دیا۔ تحسین و آفریں اور مبارک سلامت کی آوازوں میں جب دھیما پن آیا تو شوکت علی صاحب نے کھڑے ہو کر بڑے عجز و انکسار کے ساتھ اپنے احباب رفقائے کار کے اس خلوص و محبت کا شکریہ ادا کیا اور سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے عربی، فارسی زبان و ادب کی خدمت کے عزم و عہد کو پھر سے دہرایا اور اپنے آپ کو اس اہم منصب کے لائق بنانے کے لئے اپنے دوستوں سے مدد کی درخواست کی۔ آخر میں صدرِ جلسہ جناب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی صدارتی تقریر میں برکاتی صاحب کے ایڈریس کی حرفاً حرفاً اور لفظاً لفظاً تائید کرتے ہوئے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور سنہری کوٹھی دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار بڑے ہی دل نشیں انداز میں فرمایا۔ آپ نے اپنی تقریر میں ٹونک کی علمی خدمات کو بھی سراہا اور ٹونک آنے پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ نیز اہلِ ٹونک کے خلوص و محبت کی بھی ستائش کی۔ نارنگ صاحب نے فرمایا کہ یہ قلمی نایاب اور نادر ذخیرۂ کتب ہندوستان کے چیدہ چیدہ ذخیرہ کتب سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور ہماری نظروں میں اس کی اہمیت و قدر و قیمت خدا بخش لائبریری پٹنہ، حیدر آباد کے سالار جنگ میوزیم، اور رام پور کی رضا لائبریری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یہاں جو کتابیں ہیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ صحیح معنوں میں اب تک ہو ہی نہیں سکا۔ حکومت راجستھان نے اسکو عربی فارسی کا ڈائرکٹریٹ بنا کر اہلِ علم کو اس کا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اس علمی ذخیرہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ حکومت راجستھان کے وزیر اعلیٰ بھیروں سنگھ شیخاوت نیز جی کے بھانوٹ چیف سکریٹری گورنمنٹ راجستھان جے پور اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شوکت علی خاں اور ان کے رفقا یقیناً مبارکباد اور لائق تحسین ہیں۔ پروفیسر صاحب کی شگفتہ اور دلچسپ تقریر کے بعد جناب حمید اللہ خاں صاحب نے مہمانانِ گرامی اور حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں معزز مہمانوں کی مع چائے مٹھائی سے تواضع کی گئی۔ اس تقریب کے انتظام و اہتمام ادارے کی سر و [illegible] محترمہ انوار النسا [illegible] تقریب [illegible] شاندار انداز میں اپنی یاد سنہری کوٹھی [illegible] چھوڑ کر رات کے ۱۰ بجے اختتام پذیر ہوئی۔

(نامہ نگار خصوصی)

معیار کی کسوٹی پر

خسرو کا ذہنی سفر

پچھلے دنوں امیر خسرو پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ظ انصاری کی کتاب "خسرو شناسی" اس ضمن میں ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ یہ مقالہ جسے "خسرو شناسی کا دیباچہ ہونا چاہیئے تھا اور کچھ وہ مسودہ جو خسرو شناسی میں جابجا کتر دیا گیا تھا اور وہ بے ربط ہو گیا تھا۔ اب ملا کر اس نئے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے یعنی ظ انصاری صاحب کی تصانیف متعلقہ خسرو میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ "خسرو شناسی" کے تیسرے سے ساتویں باب کو بھی اصل حالت میں اس مقالے میں شامل کیا گیا ہے۔ آخر کے ساٹھ صفحات میں کلام خسرو کا انتخاب معہ ترجمہ دیا گیا ہے جو قابلِ قدر ہے۔ "خسرو کا ذہنی سفر" انجمن ترقی اردو (ہند) ، نئی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کاغذ اتنا بہترین لگایا ہے کہ اُردو کتابوں کو کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ کتابت، طباعت قابلِ تعریف۔ ۱۸ × ۲۲ سائز کے ۳۴۳ صفحات کی اس خوبصورت کتاب کی قیمت دس روپے ہے جو انجمن ترقی اردو ہند اُردو گھر نئی دہلی ۲ یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے طلب فرمائیے۔

نیاز فتحپوری

مصنف امیر عارفی۔ ناشر: انجمن ترقی اُردو ہند۔ اُردو گھر راوز ایونیو۔ نئی دہلی ۲۔ ضخامت ۴۰۶ صفحات جن میں ۱۹۸ کتابیات کی فہرست جو ۱۷ صفحات پر مشتمل ہے بھی شامل ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ بنگلہ دیش کا ساختہ ہے جو معمولی قسم کا ہے۔ قیمت پندرہ روپے جو مناسب ہے۔ امیر عارفی صاحب نے ایک چالاک شوہر ہونے کا ثبوت دیا ہے کہ کتاب کا انتساب اپنی شریکِ حیات محترمہ رشید صلاح صاحبہ کے نام امیر خسرو کے اس شعر کے ساتھ کیا ہے ؎

آفاق ہا گردیدہ ام، مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

"ڈاکٹر امیر عارفی نے یہ تحقیقی مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے لکھا تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری اُن کے نگراں تھے۔ اس لئے یہ مقالہ ہر طرح سے جاندار ہے۔ جسے عارفی صاحب نے بڑی جانفشانی سے لکھا ہے۔ نیاز فتحپوری سے عارفی صاحب کو والہانہ محبّت اور عقیدت ہے مگر یہ محبت اور عقیدت اُنہیں جانب دار نہیں بنا سکی اور اُنہوں نے نیاز صاحب کے فن اور علمی، ادبی اور تنقیدی کارناموں کو معیار کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اُنہوں نے کہیں بھی حق اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ عارفی صاحب کا یہ خراجِ عقیدت ہر لحاظ سے نیاز جیسی دیوقامت شخصیت کے شایانِ شان ہے" جناب خلیق انجم صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی یہ تحریر حرف حرف صداقت پر مبنی ہے۔

حافظ کی شاعری

جناب کے این پنڈت فارسی کے اُستاد ہیں (غالباً کشمیر یونیورسٹی میں) آپ نے تہران میں رہ کر حافظ پر کام کیا ہے۔ انہوں نے حافظ کے سوانح کے بارے میں اوّلین ماخذوں اور ایرانیوں کی تحریروں سے براہ راست استفادہ کیا ہے اور اس سلسلے میں اُنہیں ایرانی علمار سے صلاح و مشورے بھی ملتے رہے۔ چنانچہ پنڈت صاحب حافظ کی شخصیت کو ایران کے تاریخی۔ تہذیبی۔ سماجی اور سیاسی حالات کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں

حافظ کے سوانح کے متعلق اہم اور مستند تذکروں کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور دیوانِ حافظ کے قدیم ترین مخطوطات کی بھی فہرست دی گئی ہے۔

انجمن ترقی اُردو ہند راوز ایونیو نئی دہلی ۲ نے یہ کتاب شائع کر کے حافظ اور ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے کلام حافظ کو پسند کرنے والوں کے لئے آسانی پیدا کر دی ہے۔ کتاب ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۲۶۴ صفحات پر شائع کی گئی ہے کاغذ اور کتابت نیز چھپائی درمیانی درجہ کے۔ قیمت ساڑھے دس روپے۔ یہ کتاب دفتر شان ہند نئی دہلی ۲ سے بھی دستیاب ہے۔

دیوانِ اثر

مرتبہ: ڈاکٹر فضلِ حق کامل قریشی۔ ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) راوز ایونیو۔ اُردو گھر۔ نئی دہلی ۲

سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۳۰۷ صفحات۔ کاغذ بہترین لکھائی چھپائی روشن۔ قیمت اٹھارہ روپیہ جو قدرے زیادہ ہے ناشر یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے دستیاب ہے۔

دیوانِ اثر (خواجہ محمد میر اثرؔ دہلوی) مع حیات و شاعری اس مقالے پر دہلی یونیورسٹی نے فضلِ حق کامل قریشی صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ خواجہ محمد میر اثرؔ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی تھے اور مشہور و معروف مثنوی "خواب وخیال" ان کی مرہونِ منت تھی۔ مگر کئی وجوہات کے باعث اثرؔ صاحب کو وہ شہرت نہ ملی جس کے وہ حق دار تھے۔ جب حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ مرزا شوق لکھنوی نے اپنی مثنوی "بہارِ عشق" میں نہ صرف اثرؔ کی "خواب وخیال" کو نمونہ بنایا ہے بلکہ اس کے کئی شعر بھی معمولی تبدیلی کے ساتھ اپنی مثنوی میں شامل کر لئے ہیں تو کچھ عرصے بعد گلشنِ ہند کا حاشیہ لکھتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے حالی کے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی۔ تو ان [illegible]ات کے انکشاف اور ادبی مباحثہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اہلِ ذوق نے مثنوی "خواب وخیال" کی تلاش شروع کی۔ یہ مثنوی اور اثرؔ کا دیوان دونوں ابھی تک غیر مطبوعہ تھے۔ ڈاکٹر عبد الحق نے مثنوی کے دو مخطوطات فراہم کر کے اسے مرتب کیا اور اسے شائع کیا۔ مثنوی کے شائع ہونے کے بعد اہلِ اُردو کو اثرؔ کے ادبی مرتبے کا احساس ہوا اور اب کلامِ اثرؔ کی تلاش ہوئی۔ تقی الدین احمد کو دیوانِ اثرؔ کا ایک مخطوطہ دستیاب ہوا۔ انھوں نے اسے مرتب کر کے ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد میں شائع کیا۔ ڈاکٹر عبد الحق نے دو مخطوطات کی مدد سے دیوانِ اثرؔ مرتب کر کے ۱۹۳۰ء میں انجمن سے شائع کیا۔ مندرجہ بالا تحریر جناب ڈاکٹر خلیق انجم کے پیش لفظ سے لی گئی ہے۔ تاکہ آپ خواجہ محمد میر اثرؔ اور ان کی شاعری سے واقف ہو سکیں۔ ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی صدر شعبۂ اردو کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی نے میر اثرؔ کو پی ایچ ڈی کے لئے اپنا موضوع بنایا اور انھوں نے تھیسس لکھنے کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں اثرؔ مرحوم کی حیات پر بارہ اور ان کی شاعری پر چھ ابواب عالمانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اثرؔ مرحوم کے تلامذہ بیدارؔ، المؔ اور رنجؔ کا مفصل ذکر بھی اسی حصہ میں کیا گیا ہے۔ حصہ دوم میں ترتیب و تدوین کے سلسلے میں دیوانِ اثرؔ۔ مثنوی بیان واقع (ضمیمہ) دیوانِ اثرؔ ایک نظر میں۔ فرہنگ کتابیات اور اشاریہ کے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ بہر کیف دیوانِ اثرؔ ایک بہت اچھی اور تحقیقی کتاب ہے جو اچھے ذوق کے حامل حضرات کی لائبریری کی زینت ہونے کے قابل ہے۔

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردو پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گردو پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمے کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑادان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

نار درن ریلوے

Janab Dinkar Rao
Deshmukh "Dinkar"
Advocate
Hyderabad
Author of : "Anwar-e-Sehar"

Shafiq Ahmed Siddiqi (Bombay)
Author of : "Triya Cheitra"

ٹیلیفون نمبر ۲۷۸۸۸۰

رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۔ ۳۷ ۔ ۵

نئی دہلی

شانِ ہند

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ
پندرہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچاس پیسے

جلد ۱۴ | اپریل سنہ ۱۹۷۹ء | شمارہ ۴

جناب گوپال متل مدیر تحریک کا گرامی نامہ

ماہنامہ تحریک۔ نئی دہلی ۱۰ / مارچ

مکرمی سرور تونسوی صاحب۔ آداب

"شان ہند" کے جنوری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں آپ کا نوٹ "مشاعرہ لال قلعہ سیاست کی نذر" پڑھا۔ سلیکشن کمیٹی کا فیصلہ تھا کہ جو گفتگو کمیٹی کی نشستوں میں ہو، وہ باہر نہیں جانی چاہیے لہٰذا اپنے دفاع میں کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے لیکن آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں نے کملا، ہاشمی اور بانی کو مدعو کئے جانے کی مخالفت کی تھی؟ یہ بیان حقیقت کے منافی ہے۔

اسی شمارے میں آپ نے جناب رام لال کا مکتوب گرامی بھی شائع کیا ہے جو کافی طویل ہے انکے افسانوں کی طرح ان کے اس خط کو بھی میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا لیکن اردو زبان کو صرف مسلمانوں کی جاگیر میں نے کبھی قرار دیا ہو یہ مجھے یاد نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اردو کے ہندو ادیبوں کی کانفرنس یا مسلم ادیبوں کی کانفرنس ایسی باتیں ہیں جن کا کوئی جواز مجھے نظر نہیں آتا۔ ادیب صرف ادیب ہوتا ہے۔ اردو کے ہندو ادیبوں کی کانفرنس میں یہ امکان ہمیشہ رہتا ہے کہ وہاں ہندو ادیبوں کے ساتھ بے انصافی کا ذکر ضرور چھڑے گا۔ میرے خیال میں اس قسم کی شکایتیں احساسِ کمتری کا نتیجہ ہیں۔ اگر کسی ادیب کی تحریروں میں جان ہے تو وہ ہندو ہو یا مسلمان، اُسے نظر انداز کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اردو کا ایک شاعر ایسا ہے جسے اس کے صرف ایک شعر کی بنا پر شہرت دوام حاصل ہوئی ہے۔ اس کا نام رام نریش موزوں ہے۔

شعر حسب ذیل ہے۔

غزالاں! تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

پھر دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست اور فراق بھی تو ہندو ہیں، انھیں کس مسلمان ادیب یا شاعر کے مقابلہ میں کم شہرت ملی ہے؟ فرقہ وارانہ تناسب ادب میں البتہ نہیں چل سکتا۔ میں کسی ہندو متشاعر کو صرف اس خیال سے شاعر کیسے مان لوں کہ اردو کو مسلم اور غیر مسلم دونوں کی زبان ثابت کرنا ضروری ہے۔

امید ہے کہ آپ یہ خط "شان ہند" میں شائع فرمادیں گے۔

نیازمند
گوپال متل

ودیا پرکاش سرور نے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر [illegible] سے چھپوا کر دفتر شان ہند [illegible] دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے شائع کیا۔

دلّی انتظامیہ کی نمایاں کامیابیاں

تعلیم

۱ - مفید اور ہمہ گیر تعلیم کا انتظام۔
۲ - پچھلے سال ۴۵ مڈل اور ۲۳ ہائر سیکنڈری اسکول کھولے گئے۔
۳ - ۴۳ اسکولوں اور ۳ بالغوں کے اسکولوں میں ۱۱ ویں جماعت تک پڑھائی کا بندوبست۔
۴ - دن میں نہ پڑھ سکنے والے بچوں کے لئے ۸۴ نئے قلیل مدت والے اسکول کھولے گئے۔
۵ - بالغوں کو حروف شناس بنانے اور کام دھندوں میں ہنرمند بنانے کیلئے گاندھی جینتی سے خصوصی مہم شروع۔
۶ - ۱۳ نئی اسکولی عمارتوں کی تعمیر مکمل، اور ۱۸ زیر تعمیر۔
۷ - بچوں کو سنسکرت، پنجابی اور اردو پڑھانے کا اسکولوں میں خاص انتظام۔

چھوٹی صنعتیں

۱ - زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار دینے کے لئے گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ترقیاتی اسکیم پر عمل شروع۔
۲ - نریلہ، رانی جھانسی روڈ، پٹ پڑ گنج، ونے پور کی صنعتی بستیوں اور بنکر کالونی بھارت نگر کی تعمیر کا کام شروع۔

ہمہ جہت دیہی ترقی

۱ - گاؤں کی ہمہ جہت ترقی کیلئے ۵۶ء۶ کروڑ روپے۔
۲ - آئندہ چار برسوں میں تمام گاؤں کے لئے پینے کا پانی اور آبپاشی کی سہولیات بہم پہنچانے کا مکمل بندوبست۔
۳ - خصوصی ترقیاتی اسکیم کے تحت علی پور، کنجھاولہ اور نجف گڑھ ترقیاتی بلاکوں کی ترقی کیلئے ۱۵ لاکھ روپے کی رقم مخصوص۔

سماجی بہبود و ہریجن بہبود

۱ - بچوں کے عالمی سال میں سبھی بے سہارا بچوں کو سماجی تحفظ مہیا کرنے کا تہیہ۔
۲ - سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے مقابلے میں ہریجن بہبود کے لئے بجٹ میں ڈھائی گنا اضافہ۔
۳ - بوڑھوں اور بیوہ عورتوں کو پنشن دینے کی اسکیم نافذ۔
۴ - گاؤں میں ہریجنوں اور بے زمینوں کو تقریباً ۳۳۰۰ رہائشی پلاٹوں کی تقسیم۔

تعمیر رہائشات

۱ - دلی میں پہلی مرتبہ مکانوں کی تعمیر کیلئے ہاؤسنگ فائنانس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہے۔
۲ - اس سال دلی میں ۱۱ ہزار مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ۔
۳ - ۶۷ فیصد مکانات کم آمدنی اور کمزور طبقوں کے لئے۔

نشہ بندی

۱ - ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک مرحلہ وار مکمل نشہ بندی نافذ کرنے کا پروگرام۔
۲ - خشک دنوں کی تعداد میں دوگنا اضافہ اور شراب کی دکانوں میں بھاری کمی۔

جاری کردہ:- محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلّی انتظامیہ، دلّی

پہلا
جلدی نہیں
دوسرا
ابھی نہیں
تیسرا
کبھی نہیں
مستقبل میں
ماں اور باپ بننے
والوں کے لیے
نیک مشورہ
اپنے نزدیکی فیملی پلاننگ سینٹر، پرائمری ہیلتھ سینٹر
یا گرام سواستھ سہائک سے جو آپ کو ضروری
صلاح اور ساز و سامان فراہم کرسکتے ہیں
آج ہی رابطہ قائم کیجیے
davp 78/495

بُلبل چہ گُفت، گُل چہ شُنید و صبا چہ کرد

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی "حُبّ الوطنی" اور سیکولرازم

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اس مرتبہ ۷۲۔ اُردو کتب پر ایک لاکھ بارہ ہزار روپیہ کے انعامات تقسیم کئے ہیں۔ دس ہزار روپیہ دو شاعروں کو اُردو زبان کے لئے ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں اور پانچ ہزار روپیہ چار اُردو کے اشاعتی اداروں کو دیا گیا ہے۔ ان انعامات کی فہرست میں سات غیر مسلم مصنفین کو چودہ ہزار روپیہ کی "خطیر رقم" دیئے جانے کی بھی تردید جا نفرادی گئی ہے۔ کیونکہ ہر اُردو اکاڈمی کو یہ سرکاری روپیہ صرف مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اُتر پردیش اردو اکاڈمی کی یہ حب الوطنی اور سیکولرازم کا مُنہ بولتا ثبوت ہے کہ اس نے ۷۸ انعام پانے والوں میں سے سات اپنے برادرانِ وطن کی جھولی میں بھی چودہ ہزار روپیہ کا خالص اسلامی سرمایہ ڈال کر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اور ہم اُردو اکاڈمی اُتر پردیش کے ناخداؤں کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اپنے سات غیر اسلامی برادرانِ وطن کو چودہ ہزار کا خالص اسلامی سرمایہ بطورِ خیرات دیکر بھائی چارے کی ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔

پہلی مرتبہ اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس بار ایسی کتابیں بڑی تعداد میں موصول ہوئیں جو اعلیٰ اور معیاری ہیں اور جن کے لئے مصنفین لائقِ مبارکباد ہیں۔ لیکن اکاڈمی اپنے محدود مالی وسائل کی بناء پر جتنی رقم کا انعام ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی تھی، پیش نہیں کر سکی اور بہت سی ایسی کتابیں انعام نہ پا سکی جو انعام کی مستحق تھیں"۔

اگر اردو اکاڈمی اُتر پردیش کے ذمہ دار حضرات تھوڑی سی صاف گوئی کا مظاہرہ اور بھی فرما دیتے تو ان کی صداقت اور دیانت کا اعتراف ہندوستان سے باہر بھی کیا جاتا اور یہ اعتراف یوں کیا جا سکتا تھا۔

۱۔ ایسے بدنصیب مصنفین اس جوڑ توڑ کے قطعاً نا اہل تھے کہ انعامی کمیٹی کے ممبران تک رسائی کر سکتے۔

۲۔ اور انھیں دنیاداری کا یہ دکھاوا کرنا بھی نہیں آتا تھا کہ اپنی تصنیف کو اتر پردیش اُردو اکاڈمی کے صدر کے نام منسوب کر دیتے یا اپنی تصانیف میں انعامی کمیٹی کے ممبران کی علمی۔ ادبی۔ شعری اور دیگر کئی قسم کی خدماتِ مفروضہ کی جی بھر کر تعریف کر دیتے۔ کیونکہ انعام پانے والی کتابوں میں سات ایسی کتابیں ہیں جن کا انتساب صدر اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے نام کیا گیا ہے اور ان کتابوں کے مصنفین نے ایسا کر کے ثوابِ دارین حاصل کیا ہے۔

۳۔ ایسے مسلم مصنفین جو جھوٹوں بھی یہ یقین دلانے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے کہ وہ شیعہ فرقہ کی تعریف کرتے ہیں اور یہ کہہ سکتے کہ ایران میں خمینی جس اسلامی حکومت کا نمونہ پیش کر رہا ہے ہم اس سے پوری طرح متفق ہیں۔

اس کے علاوہ بھی کچھ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جو ایڈیٹر "شانِ ہند" جانتے ہوئے بھی لکھ نہیں سکتا۔ مگر اُردو اکاڈمی والے یہ تو کر سکتے تھے کہ مثال کے طور پر سعید انصاری صاحب کو ان کی کتاب "آزادی" پر تین ہزار روپیہ سے کم کا انعام دیا جاتا کیونکہ یہ "جان اسٹوارٹ مل" کی مشہور کتاب لبرٹی کا ترجمہ ہے۔ اور ترجمہ طبعزاد نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ سعید انصاری کے اس ترجمہ سے ستر برس پہلے "لبرٹی" کا ترجمہ "اظہار رائے اور آزادی اظہارِ رائے" کے نام سے جناب راجہ نریندر ناتھ (مرحوم) فرما گئے ہیں۔ جو "آزادی" کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر ترجمہ ہے اسی طرح کئی ترجموں پر انعامی رقوم کم کی جا سکتی تھیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس جو کہ اکاڈمی کے ممبر ہیں اور جنہوں نے محض اپنی کتاب تنقیدی تناظر پر انعام پانے کے لئے انعامی کمیٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ جس کے صاف اور واضح معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ انھیں یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ اول درجہ کا انعام ان کی جھولی میں پڑا ہوا ہے اس لئے تو انھوں نے استعفیٰ دیا۔

کیا انعامی کمیٹی کے ممبران کی اکثریت ایمانداری سے یہ کہہ سکتی ہے کہ "دراسات" کے لغوی معنی معلوم تھے (یقیناً انھیں اس وقت تک بھی "دراسات" کے معنی معلوم نہیں ہیں (ہاں اس تحریر کے بعد وہ فرہنگ آصفیہ میں دیکھ سکتے ہیں) ویسے دراسات اور تنقیدی مناظر" انعام کے حق دار تھیں یا نہیں۔ یہ الگ بات ہے "خضر بیدی" کے "رقص لہو" پر انعام دیا گیا ہے۔ اول تو کتاب کا نام ہی بے معنی ہے اس کے علاوہ انعامی کمیٹی کے ممبران اگر چاہیں تو ہم "رقص لہو" کے فنی عیوب کی طویل فہرست ان کی خدمت میں بھیج سکتے ہیں تاکہ انہیں اپنے اس انتخاب پر شرم محسوس ہو سکے (ویسے کسی کمیٹی کا ممبر بن جانے پر شرم۔ سچائی۔ دیانت وغیرہ الفاظ مہمل دکھائی دینے لگتے ہیں)

اسی طرح اگر اُردو اکاڈمی کے ذمہ دار حضرات دیانت داری سے کام لیتے تو کئی انعامی رقوم کو کم کیا جا سکتا تھا۔ اور کچھ مزید حقداروں کی اشک شوئی ہو سکتی تھی مگر انعامات کے حصول کا طریق کار یہ ہو گیا ہے کہ جس کی سفارش زوردار ہو یا جس کی واقفیت کا دائرہ وسیع ہو یا جس کے ہاتھ میں جوتا ہو۔ وہ ہی اس خیراتی نعمت کو پا سکتا ہے۔

جن سات غیر مسلم حضرات کو چودہ ہزار روپیہ کے "گرانقدر" انعامات دیئے گئے ہیں وہ سب کی سب بھگوان کی کرپا سے کھاتے پیتے اور بڑی معقول آمدنی رکھنے والے ہیں۔ اگر وہ ہماری درخواست پر غور فرما سکیں تو یہ عرض کرنے میں کوئی برائی نہیں کہ وہ لوگ اپنے اس لقمہ تر کو علی گڑھ کے فساد زدہ مستحق مصیبت زدگان کو تقسیم کر دیں۔ اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ یہ رقوم صرف مسلمان مصیبت زدگان کو ہی تقسیم کی جائیں۔ ایڈیٹر شان ہند کو اپنی کم مائیگی پر افسوس ہے اگر وہ مالی طور پر اس قدر بھی آسودہ ہوتا کہ چودہ ہزار کی یہ رقم ادا کر سکتا تو ان سات غیر مسلم انعام یافتہ مصنفین کو اپنی طرف سے یہ انعامی رقم ادا کر دیتا اور اُردو اکاڈمی کا پھینکا ہوا یہ لقمہ تر واپس کر دینے کی عملی تحریک کرتا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اُردو اکاڈمیوں (جو کہ دراصل مسلم اکاڈمیاں ہیں) کو کوئی بھی غیر مسلم اپنی تصنیف انعام کی غرض سے نہ بھجوائے۔ کیونکہ بے عزتی کے لقمہ تر سے عزت کا نان خشک کہیں بہتر ہے۔

جناب گوپال متل اور جناب کرشن موہن انعام یافتگان میں

ریڈیو پر سنا گیا کہ غالب اکاڈمی نے کچھ دیگر حضرات کے ساتھ جناب گوپال متل صاحب کو بھی پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا ہے۔ اور اخبارات میں پڑھا کہ دہلی انتظامیہ نے جناب کرشن موہن کو اکیس سو روپیہ کا انعام مرحمت فرمایا ہے۔ ہمیں یہ مسرت ضرور ہوئی کہ کہیں سے تو غیر مسلم شعراء کی اُردو خدمات کا اعتراف ہوا۔ خواہ وہ دوست نوازی یا سفارش کے بل بوتے پر ہی ہوا۔ غالب اکاڈمی کے سربراہ حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ سے گوپال متل صاحب کے تعلقات کافی حد تک خوشگوار ہیں اور جناب کرشن موہن صاحب کو دہلی انتظامیہ نے جو انعام دیا ہے۔ اس کے لئے بھی جن اُردو پرستوں نے زور لگایا ہے۔ وہ بھی ہمیں علم ہے۔ بہرکیف ہم ان دونوں غیر سرکاری اور سرکاری انعام یافتگان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو گوپال متل صاحب کو پانچ ہزار روپیہ کی ضرورت تھی اور نہ کرشن موہن صاحب کو اکیس صد روپیہ کی۔ گوپال متل ادبی علمی۔ ادبی خدمات کے باعث مالی آسودگی رکھتے ہیں۔ اور کرشن موہن انکم ٹیکس کے اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ مگر یہ اتفاق قابل عجیب ہے کہ گوپال متل صاحب اور کرشن موہن صاحب کا ویسے بھی قارورہ ملتا ہے اور انعام بھی دونوں کو ملا ہے۔ لہذا دونوں حضرات ایک مشہور مصرع کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ گنگنا سکتے ہیں۔ ؎

آ عندلیب مل کے کریں ثنا خوانیاں

ہو سکتا ہے کہ اس مصرع میں تصرف نے کچھ بے وزنی پیدا کر دی ہو جس کے لئے ہم معافی خواہ ہیں۔ آخر پانچ ہزار اور اکیس سو میں بھی تو فرق ہے۔

گولی مُغل اعظم

"بیسویں صدی" جب تک خوشتر گرامی صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا رہا کیا مجال کہ رسالہ میں کوئی فحش لفظ بھی چھپ سکتا اور تو اور جناب کشمیری لال ذاکر کی تصویر اس لئے شائع نہ کی گئی کہ وہ تصویر میں سگرٹ کے کش لگا رہے تھے خوشتر صاحب نے اپنے دوست ذاکر صاحب سے صاف الفاظ میں یہ کہہ کر تصویر شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ آپ کی یہ تصویر چھاپ کر میں بیسویں صدی پڑھنے والے

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

سرور تونسوی

جون ۱۹۵۷ء کی کوئی تاریخ تھی کہ صبح سات بجے ایک نوجوان آیا اور خالص جن سنگھی انداز میں نمسکار کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ انکل مجھے پہچانا۔ میں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے اسے بغور دیکھا تو شکل جانی پہچانی لگی۔ مگر میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ برخوردار میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تو مسکراتے ہوئے اس نوجوان نے کہا کہ قنوج میں سیٹھ چندر گپت صاحب چیرمین میونسپل بورڈ کے ہاں آپ کی اور آنٹی کی سیوا کو میں کرتا تھا۔ فوراً اپنا عزیز دوست سیٹھ چندر گپت اور ان کی دونوں بیویاں (جو سگی بہنیں ہیں) اور ان کی طویل و عریض کوٹھی اور اس نوجوان کا خیال آیا اور میں نے خضوع و خشوع سے اس نوجوان کو گلے لگایا۔ اور روحی کو آواز دی کہ دیکھو سیٹھ چندر گپت جی کے عزیز آئے ہیں روحی نے فوراً ناشتہ تیار کیا اور ہم سب نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں ناشتہ کیا اور ادھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں مگر میں نے نوجوان سے پوچھا کہ تمہارا سامان کہاں ہے۔ انکل میرے ساتھ کچھ دوست تھے اس لئے لکھنؤ سے صبح دہلی پہنچتے ہی مہاراجہ ہوٹل میں ہم نے کمرہ لے لیا ہے۔ وہ لوگ تو وہیں ہیں اور میں اپنے انکل اور آنٹی سے ملنے چلا آیا۔ سیٹھ چندر گپت صاحب سے میرے تعلقات سگے بھائی جیسے ہیں اس لئے میں نے اس نوجوان کو کہا کہ سیٹھ جی کو جب یہ معلوم ہوگا کہ تو دہلی میں ہوٹل میں رہا تو وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ تمہارے ساتھ دوست تھے تو کیا ہوا ان کو بھی ساتھ لے آتا اور یہیں قیام کرتے۔ مگر نوجوان نے ٹال مٹول کر کے بات آئی گئی کر دی۔

قنوج میں ۱۹۵۶ء میں ایک کل ہند مشاعرہ میں میں نے اور روحی نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد منتظمین نے چند منٹ میں ہی شامیانے اور دریاں لپیٹ کر ایسی چپ سادھی کہ بیچارے شعراء حضرات زادِ راہ کے لئے بھی ترس گئے تھے یہ واقعہ غالباً شانِ ہند میں لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت یہ نوجوان ہمیں قنوج میں ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ آپ دونوں کو میرے بہنوئی سیٹھ چندر گپت نے بلایا ہے اور یہ نوجوان ہمیں سیٹھ صاحب کی کوٹھی پر لے گیا تھا۔ سیٹھ صاحب نے بتایا تھا کہ یہ نوجوان ان کا دُور سے رشتے میں سالا لگتا ہے۔ اور لکھنؤ میں رہتا ہے۔ ہمیں سیٹھ جی نے ایک ہفتہ تک اپنا مہمان رکھا اور یہ نوجوان ہر وقت ہماری خدمت کے لئے حاضر رہتا۔ اس لئے ہم پر اس صاحبزادے کی خاطر مدارات لازم تھی۔

چند منٹ بعد یہ نوجوان کہنے لگا انکل آپ سے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے۔ کپڑے پہن لیجئے اور ذرا میرے ساتھ نیچے چلئے۔ میں نہا دھو کر آدھ گھنٹہ بعد اس نوجوان کو نیچے گولچہ سینما کے عنبر ریسٹورنٹ میں لے گیا اور کہا کہ یہاں کافی بھی پیو اور پرائیویٹ بات بھی کرو۔ میرا خیال تھا کہ اسے کچھ روپیہ کی ضرورت ہوگی اور میں بخوشی دے سکتا ہوں۔ مگر اس نوجوان نے جب یہ بتایا کہ ان کے ساتھ دو مسلمان لڑکیاں بھی ہیں جنہیں یہ اغوا کر کے لائے ہیں تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان دنوں ... مہاراجہ ہوٹل کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان حضرات کے پاس ہوٹل کے کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ اور ایسے بھوکے عاشقوں کی بے وقوف معشوقاؤں کے تو انتظار میں رہتے ہیں یہ ہوٹل والے۔ کافی کا پیالہ جلدی جلدی انڈیلتے ہوئے میں نے اس نوجوان سے کہا کہ میرے ساتھ فوراً مہاراجہ ہوٹل چلو۔ گولچہ سینما کی سیڑھیاں اتر کر میں اپنے گھر فلیٹ نمبر 8 انصاری مارکیٹ پر آیا۔ کچھ روپیہ بیوی سے لئے اور سائیکل رکشا پر ہم دونوں ناولٹی سینما کے پاس مہاراجہ ہوٹل پہنچے۔ راستہ میں یہ لڑکا بڑے فخر سے کہتا رہا کہ میں نے اپنی جاتی کے لئے یہ کام کیا ہے کہ ایک مسلمان لڑکی کی شادی ایک ہندو لڑکے سے کرا رہا ہوں۔ مگر میں سوچ رہا تھا

کہ جاتی کا یہ رکھوالا کہیں جیل کی ہوا نہ کھائے۔ جونہی ہم ہوٹل پہنچے تو ہوٹل کے ملازمین نے مجھے جن مشکوک نگاہوں سے دیکھا وہ میرے لئے پہلا موقع تھا۔ جونہی میں جاتی کے رکھوالے کے کمرے میں داخل ہوا تو دونوں لڑکیوں اور دو [illegible] نوجوانوں نے بڑے احترام سے نمسکار کیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا چھوٹی لڑکی جو حسن و شباب میں اپنا جواب آپ تھی ایک نوجوان کے کندھے سے اپنا گال لگا کر بیٹھی اور دوسری بڑی [illegible] جو عمر میں چھوٹی لڑکی سے پانچ چھ برس بڑی تھی اور معمولی شکل و شباہت کی تھی وہ دوسرے نوجوان کے پاس بیٹھ گئی۔ مگر اس کے بیٹھنے کے انداز میں کچھ لکھنوی شرم و حیا تھی۔ میں نے اپنے واقف نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا کہ کہئے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ اس پر بڑی لڑکی کہنے لگی چچا میں نے تو صبح سے چائے بھی نہیں پی۔ میرا تو سر گھوم رہا ہے۔ میں نے بیرے کو آواز دی اور کہا کہ فوراً ایک سیٹ چائے اور ناشتہ لائے۔ جب دونوں لڑکیوں اور دوسرے دونوں نوجوانوں نے ناشتہ کر لیا تو میں نے بڑی لڑکی سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ تم سچائی سے کام لوگی اس لئے تمام کہانی سچ سچ بتاؤ تاکہ تم لوگوں کے بارے میں سوچا جائے۔ لڑکی نے نہایت متانت سے سلسلۂ گفتگو جاری کرتے ہوئے بتایا کہ ہم دونوں سگی بہنیں ہیں میری شادی ہو چکی ہے۔ مگر میرا خاوند مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر چکا ہے اور میری چھوٹی بہن [illegible] کلاس کی طالبہ علم ہے۔ یہ مسلمان لڑکا ہمارے پڑوس میں رہتا ہے اس نے کئی دنوں سے مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ مجھے چاہتا ہے اور میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس نے ہی یہ بھی بتایا کہ یہ دوسرا لڑکا جو کہ ہندو ہے میری اس چھوٹی بہن کو چاہتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسی مسلمان لڑکے نے میری موجودگی میں اپنے گھر پر اس ہندو لڑکے سے میری بہن کی کئی ملاقاتیں کرائیں اور دونوں نے شادی کرنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ اس ہندو نوجوان کا گھر ہمارے گھر سے ساتواں مکان ہے۔ میری بہن بخوشی ہندو بننے کو تیار ہے۔ اس ہندو لڑکے نے ہم سے کہا کہ لکھنؤ میں تو میرے ماں باپ یہ شادی ہونے نہیں دیں گے۔ دہلی میں میرے رشتہ دار ہیں وہ بخوشی یہ شادی کرا دیں گے۔ لہٰذا ہم سب نے دہلی آنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس لڑکی نے اب میرے [illegible] نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بھائی صاحب [illegible] بھائی صاحب کے دوست ہیں اور انہوں نے ہم سب کو یقین دلایا تھا کہ دہلی میں [illegible] صاحب ایک اخبار کے ایڈیٹر ہیں وہ ان سے کہہ کر سب انتظام کرا دوں گا۔ [illegible] ہوٹل میں ٹھہرا کر آپ کو لینے گئے اور آپ آ گئے ہیں۔ اب جیسا آپ مناسب سمجھیں اس طرح سے ہم دونوں بہنوں کی شادی کرا دیجئے اور اب ہم کسی طرح بھی لوٹ کر گھر نہیں جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ہمارے گھر والے ہم کو قتل کر دیں گے۔ میں نے ساری داستان سن کر دوسری لڑکی سے جو ابھی تک اس ہندو نوجوان سے چپکی بیٹھی تھی دریافت کیا کہ کیا تم ہندو بننے کو تیار ہو۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا کہ کیا ہندو خدا کے بندے نہیں ہوتے نہ مسلمان جھگڑتے ہیں۔ ذات برادری کی بات کرتے ہیں۔ کوئی لڑکا غریب مسلمان لڑکی سے شادی کرنا نہیں چاہتا تو ایسی حالت میں اگر مجھے ایک ہندو لڑکا ملتا ہے جو نوجوان ہے لاکھوں میں ایک ہے۔ اچھے گھر کا ہے۔ جہیز نہیں چاہتا صرف مجھے چاہتا ہے تو مجھے ہندو ہونے میں کیا خدشہ ہے۔ اب میں نے اس ہندو لڑکے سے پوچھا کہ برخوردار تمہارا کیا ارادہ ہے۔ جھینپتے ہوئے یہ کہنے لگا انکل جی آپ کی مہربانی ہو گی اگر ہمارا کلیان کرا دیجئے اور میری شادی اس لڑکی سے کرا دیجئے (لڑکیوں اور نوجوانوں کے نام دانستہ طور پر نہیں لکھے گئے) میں نے اس لڑکے کو یقین دلایا کہ یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم ایک مسلمان لڑکی کو اپنی جیون ساتھی بنا رہے ہو اور اس سے شادی کر رہے ہو۔ میرے گھر کے سامنے ہی [illegible] ہے وہاں اس لڑکی کو شدھ کر کے آپ سے شادی کرا دیں۔ مگر شادی کے وقت کوئی بڑے بھی ہونے ضروری ہیں اس لڑکی کی تو بڑی بہن موجود ہے۔ تمہارے جو رشتہ دار دہلی میں ہیں ان کا نام پتہ بتائیے میں ان کو لے آؤں۔ لڑکے نے بتایا میرے ماموں [illegible] گنج میں گولچہ سینما کے پاس انصاری مارگ میں دوکان کرتے ہیں اور ان کا نام یہ ہے۔ میں نے کہا کہ

پاسکتا کا کارخانہ ہے۔ لڑکا حیران رہ گیا کہ میں ان سے کیسے واقف
ہوں۔ لڑکے کی حیرانی دور کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ میں بھی انصاری
مارکیٹ میں رہتا ہوں اور تمہارے ماموں کا فلیٹ مارکیٹ کے ایک
طرف ہے اور میرا دوسری طرف۔ یہ لوگ صبح سے چائے کے بغیر
بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی مالی بدحالی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا تھا
میں نے ہوٹل منیجر کو کمرے میں بلایا اور کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں میرا
یہ نام ہے یہ پتہ ہے اور یہ ٹیلیفون نمبر ہے۔ انھیں کوئی تکلیف
نہ ہونے پائے ان کو چائے کھانا وغیرہ ان کے حسب منشا دیجئے۔ منیجر
جی بہت اچھا کہکر واپس چلا گیا تو میں نے ان سب فلمی عاشقان
کو تسلی دی کہ آج آپ سب کا معاملہ ٹھیک کر دیا جائیگا۔ اور یہ
کہکر میں نے دوپہر کے کھانے کے بعد پھر آنیکا وعدہ کیا اور دریا گنج
آ [illegible] سیدھا ہندو نوجوان کے ماموں کے ہاں پہنچا اور تمام معاملہ
ان کے گوش گذار کیا تو اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا بابو جی آپ کا
بھلا ہو لکھنؤ سے صبح ہی تار آیا ہے کہ ..... دہلی پہنچا ہو تو تار
سے اطلاع دو۔ میں نے لالہ جی کو سب اونچ نیچ سمجھائی کہ اگر لڑکیوں
کے اغوا کا کیس پولیس نے رجسٹر کر لیا ہوگا تو چھوٹی لڑکی جسے آپ
کا بھانجا بہو بنا کر شادی کرنا چاہتا ہے نابالغ ہے اور یہ
معاملہ اگر بدترین صورت اختیار کر گیا تو ہندو مسلم مسئلہ بھی
بن سکتا ہے۔ لالہ جی کے ہاتھ کانپنے لگے اور زبان میں لکنت
آگئی۔ میں نے انھیں حوصلہ دلاتے ہوئے کہا کہ آپ اسی وقت
میرے ساتھ چلئے اور اپنے بھانجے کو جوتے مارتے ہوئے اپنے
ساتھ لے آئیے۔ لالہ جی نے اپنے دو نوجوان لڑکوں کو بھی
بلا لیا اور میرے ساتھ مہاراجہ ہوٹل میں آ گئے۔ ان سب کو
تو میں نے ناولٹی سینما کے پاس کھڑا کر دیا اور خود ہوٹل میں
جا کر اس نوجوان کو بلا لایا۔ بس پھر کیا تھا ماموں اور اس کے
دونوں جوان بیٹوں نے اس عاشق کا جوتوں اور مکوں سے جو
سواگت کیا ہے وہ منظر اب بھی میرے آنکھوں کے سامنے ہے
فوراً ٹیکسی لیکر ماموں صاحب اپنے دونوں بیٹوں اور بھانجے
کو لیکر رفو چکر ہو گئے اور میں نے ہوٹل جا کر اس صورت
حال سے قافلے کے باقی ماندہ لوگوں کو آگاہ کیا۔ اور لکھنؤ
سے جو تار اس لڑکے کے ماموں کو آیا تھا دکھایا کہ پتہ نہیں [illegible]

ماموں اسے اسٹیشن کے آس پاس کے ہوٹلوں میں ڈھونڈ رہا تھا
کہ مجھے مل گئے اور میں نے سوچا کہ اگر وہ لوگ ہوٹل میں
آکر اپنے بھانجے کی سراغ رسانی کرتے تو تم سب ہوٹل والوں کی
نظروں میں مشکوک ہو جاتے اور معاملہ پولیس تک پہنچ جاتا
اور سب راز کھلنے پر جو حال تمہارا ہوتا اس کا اندازہ خود لگا لو
اچھا ہوا کہ میں ..... کو باہر بلا کر لے گیا اور اسے وہیں جوتے
پڑے۔ یہ سنتے ہی چھوٹی لڑکی زار و قطار رونے لگی مگر بڑی بہن
نے اسے سمجھا بجھا کر چپ کرایا اور بڑی لڑکی سنجیدگی سے کہنے لگی
انکل جی اب پردیس میں آپ ہی ہمارے سب کچھ ہیں جب میں نے
معاملہ راہ پر آتے دیکھا تو میں نے دونوں بہنوں سے کہا کہ وہ .....
تو اب آنے کا نہیں نہ اسے آپ لوگ لکھنؤ میں دیکھیں گے اور دہلی
میں تو اس کے ملنے کا سوال ہی نہیں رہا یہ مسلمان لڑکا تو اس سے
یہ تو ممکن ہے کہ یہ تم دونوں بہنوں کو فروخت کر کے کسی کوٹھے
کی زینت بنا دے یا خود پیشہ کرا کے زندگی بسر کرے [illegible]
بھاگ کو بڑھانے والے آپ کو ایک وقت کی چائے بھی نہیں پلا سکتے
جب سیٹھ چندر گپت کو خبر لگے گی تو وہ لوگ لکھنؤ بھی نہیں رہنے
دیں گے۔ ان باتوں نے ان سب پر اثر کیا۔ تو میں نے ان سے کہا
کہ اب آپ سب میرے ساتھ میرے گھر چلیے ہوٹل کا بل ادا کر دیا
مسلمان لڑکے کو میں نے اپنے مکان کے نیچے بھارت ٹی اسٹال
میں بٹھا دیا اور ٹی اسٹال کے مالک مرحوم بابو لال سے کہہ دیا کہ اسے کھانا
وغیرہ کھلا دیں اور چائے بھی جتنی بار چاہے پلا دیجئے۔ دونوں
لڑکیوں اور جانکی کے رکھوالے اپنے [illegible] جوان کو میں اپنے
مکان میں لے آیا۔ رودی [illegible] سے میں نے کہا کہ وہ ان بچیوں کے ساتھ
اچھا برتاؤ کرے اور انہیں تین [illegible] دکھائے [illegible]
[illegible] کہا کہ اب تم یہ سمجھو کہ اپنے باپ کے گھر میں ہو اور تمہیں اپنے
خدا رسول کی قسم ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرو گی
اور جو کہا مانو گی۔ لڑکیوں کے چہرے کھل اٹھے۔ رودی [illegible]
گولچہ میں تین بجے کا شو دکھانے لے گئی۔ اور جانکی کے رکھوالے جوان
کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ لکھنؤ کا کرایہ ان کو دیا گیا اور کہا کہ
تمہارا لکھنؤ سے غیر حاضر رہنا تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو
سکتا ہے۔ ممکن ہے وہاں ان دونوں کی رپورٹ درج ہو گئی ہو لہذا تم فوراً

لکھنؤ اپنے گھر چلے جاؤ باقی معاملہ میں نپٹ لوں گا سینما کا شو
ختم ہونے سے پہلے پہلے میں نے ارادہ کر لیا کہ ان لڑکیوں کو آج
رات ہی لکھنؤ لے جایا جائے سوا چھ بجے روحی اور لڑکیاں سینما
دیکھ کر لوٹیں تو میں نے کچن میں جا کر روحی سے کہا کہ آج رات کو
لکھنؤ چلنا ہے اور ان لڑکیوں کو ساتھ لے جانا ہے روحی نے
بتایا کہ لڑکیاں لکھنؤ جانے سے مر جانا بہتر سمجھتی ہیں۔ اس لئے
جو بھی قدم اٹھایا جائے وہ سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔ سات
بجے ..... کے ماموں آگئے میں انھیں دیکھتے ہی سیڑھیوں میں
ہی روک لیا اور نیچے لے گیا اور انھیں بتایا کہ دونوں لڑکیاں
اوپر ہیں۔ لالہ جی بہت گھبرائے کہنے لگے بابوجی یہ آپ نے کیا
کیا کہ اغوا شدہ لڑکیوں کو گھر لے آئے آپ پر کوئی مصیبت آگئی
تو کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ وہ تو دیکھا جائے گا۔ میں تو ان لڑکیوں
کو لکھنؤ لے جا رہا ہوں تاکہ ان کے وارثوں کے سپرد کر کے آؤں
اگر وہاں اغوا کا کیس درج بھی ہوگا تو مجھے کیا ڈر ہے اور چونکہ
دو لڑکیوں کا ساتھ ہے اس لئے میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے
جا رہا ہوں۔ دو لڑکیاں ایک وہ مسلمان لڑکا اور دو ہم میاں بیوی کا
پانچ آدمیوں کا لکھنؤ جانا اور دو کا واپس آنا۔ ان دنوں میری
مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ان اخراجات کا متحمل ہو سکتا۔ مگر
آدمی کی نیت نیک ہو تو سب انتظام اوپر والا کر دیتا ہے۔ نصف
گھنٹے بعد لالہ جی (..... کے ماموں) آئے اور سو سو روپے کے کچھ
نوٹ دیتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ بابوجی آپ کے آنے
جانے کا خرچ میں دے رہا ہوں اسے قبول کیجئے اور اس معاملہ
کو جیسے بھی ہو ختم کرائیے۔ میں نے رسماً روپیہ لینے سے انکار کیا
مگر لالہ جی نے زبردستی دو صد روپیہ میری جیب میں ٹھونس دیا۔ اور
میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور نیچے بھارت ٹی سٹال
سے مسلمان لڑکے کو ساتھ لیکر دہلی سٹیشن کی راہ لی۔ آئی۔ سی
سکسینہ (ریلوے افسر) کی مہربانی سے لکھنؤ میل میں پانچ بیٹھنے
کی سیٹیں ریزرو ہو گئیں۔ مسلمان لڑکا کہنے لگا انکل بڑی لڑکی
تو مان سکتی ہے لیکن چھوٹی لڑکی راستے میں ریل سے چھلانگ لگا
سکتی ہے۔ مگر لکھنؤ نہیں جائے گی۔ ٹکٹ ریزرو کرانے کے
بعد میں نے آٹھ بجے گھر آیا۔ روحی اور یہ لڑکیاں ملکر کھانا

تیار کر چکی تھیں میں نے روحی سے کہا کہ کھانا ساتھ رکھ لو۔
راستے میں کھا لیں گے۔ اور خود ان دونوں لڑکیوں کو اوپر چھت
پر لے گیا۔ سلسلہ گفتگو شروع کرنے سے پہلے میں نے ان لڑکیوں
سے کہا کہ میں تمہیں لکھنؤ لے جانے کا سب انتظام کر چکا ہوں
ٹکٹ خرید لئے ہیں۔ یہ میرا ذمہ ہے کہ تمہارے ماں باپ یا
بھائی تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ اگر وہاں رپورٹ درج ہو چکی
ہوگی تو تم پولیس سے کہہ دینا کہ ہمیں کسی نے اغوا نہیں کیا ہم دونوں
بہنوں نے دہلی دیکھنے کے ارادے سے اپنے گھر والوں کو بتائے
بغیر دہلی جانے کا پروگرام بنایا اور وہاں سرور انکل کے ہاں
رہے اور اب انھیں بھی لکھنؤ آنا تھا لہذا ان کے ساتھ
واپس آگئی ہیں خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہوا کہ یہ تجویز لڑکیوں
کو پسند آئی اور انھوں نے کہا تو اتنی جلدی کیا ہے دو چار
دن بعد چلیں گے۔ اب انھیں سمجھایا کہ بیٹی جتنی دیر ہوگی
تمہارے گھر والے زیادہ پریشان ہوں گے۔ اس لئے جلد
سے جلد لکھنؤ پہنچنا ضروری ہے۔ خدا خدا کر کے ہم سب
دہلی مین اسٹیشن سے لکھنؤ میل میں بیٹھے۔ حرام ہے جو ساری
رات میری یا روحی کی آنکھ بھی لگی ہو ان دنوں ریل کی کھڑکیوں
میں سلاخیں بھی نہیں لگی تھیں۔ اور ڈر تھا کہ کہیں کوئی لڑکی
کسی اسٹیشن پر کھڑکی سے نہ کود جائے دونوں طرف کھڑکیوں
کے پاس میں اور روحی بیٹھے اور اپنے ساتھ ایک ایک لڑکی
کو بٹھایا۔ مسلمان لڑکے کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ بھی
پوری طرح سے چوکنا رہے۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ اس
مسلمان لڑکے نے پوری ایمانداری کے ساتھ ہمارا ساتھ
دیا خدا خدا کر کے صبح چار باغ ریلوے اسٹیشن آیا۔ زنانہ
مسافر خانہ میں جا کر لڑکیوں نے برقعے اوڑھے اور ابھی
ہم تانگے میں سوار ہوئے ہی تھے کہ لڑکیوں کے بھائیوں نے
اپنی بہنوں کے برقعوں کو ہی پہچان کر تانگے کو گھیر لیا اور
لڑکیوں کے نام لے کر گالی دیتے ہوئے کہا کہ تم کہاں مر گئی
تھیں۔ میں نے حوصلہ سے کام لیتے ہوئے تانگے والے سے کہا
کہ تانگہ نزدیک ترین پولیس اسٹیشن لے چلو یہ کون غنڈے
ہیں جو لڑکیوں کو دھمکا رہے ہیں اور گالیاں دے رہے

ہیں۔ تو لڑکیوں نے کہا انکل یہ ہمارے بھائی صاحب ہیں اب میں نے خندہ پیشانی سے ان دونوں لڑکوں سے سلام دعا کی اور کہا کہ بھئی یہ تو ہماری بیٹیاں ہیں ہم سے ملنے دہلی آگئی تھیں۔ کئی سال سے یہ ہمارا رسالہ پڑھتی ہیں اس طرح ان سے قلمی واقفیت ہوگئی تھی اب ہم کچھ بھی لکھنؤ آنا تھا اس لئے ان کو بھی ساتھ لیتے آئے ہیں۔ لڑکے خاموش ہوگئے تانگہ سیدھا ان کے گھر پہنچا۔ مسلمان لڑکا تو لڑکیوں کے بھائیوں کو دیکھتے ہی اسٹیشن سے ہی گم ہوگیا تھا۔ لڑکیوں کی ماں اور بھائیوں نے اپنی بساط کے مطابق ہمیں چائے ناشتہ کرایا اور" دانشور محل" امین آباد پارک کے اوپر ہوٹل میں ہم دونوں میاں بیوی چلے آئے۔ دن بھر ہوٹل میں رہے اور لکھنؤ سے گزرتے وغیرہ خریدے۔ رات کا کھانا اس ہندو نوجوان کے گھر کھایا جو چھوٹا ایک سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لڑکے کی ماں ہم دونوں پر قربان ہوئی جا رہی تھی کہ کس خوبی سے معاملہ سلجھایا گیا تھا۔ اسی رات میں اور زوجی نے لکھنؤ سے کانپور کی گاڑی پکڑی اور صبح قنوج میں سیٹھ چندر گپت صاحب کے وہاں پہنچ گئے۔ تمام حالات ان کو سنائے سیٹھ صاحب اور ان کی دونوں بیویوں نے معاملہ کو بخیر و خوبی نپٹانے کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اب اگر وہ صاحب دہلی پہنچیں تو گھر میں قدم نہ رکھنے دیجئے گا۔

صفحہ ۲۸ کا بقیہ

ہو کے خوش جاتے ہیں ہر روز وہ اغیار کے پاس

(اور آتے نہیں) عاشق بیمار کے پاس

ہو کے خوش جاتے ہیں ہر روز وہ اغیار کے پاس

(کب پھٹکتے ہیں بھلا) عاشق بیمار کے پاس

"اور آتے نہیں" میں شاعری نہ تھی۔ اصلاح نے شعر کو حسرت و اندوہ کا مجسمہ بنا دیا، روح شعریت پھونک دی "اور آتے" کے مقابلہ میں "پھٹکتے" کی سحر کاری قابل داد ہے۔

(دیکھتے وقت ہی ہو جائے ابھی چنگا بیمار

(جو کہیں آئے) مسیحا ترے بیمار کے پاس

(دیکھ کر نبض کو ہو جائیں وہ خود بھی) بیمار

(اگر آجائیں) مسیحا ترے بیمار کے پاس

زبان بہت بھدی تھی مضمون اچھا تھا اصلاح نے قرار واقعی درستی کر دی اور اچھا مضمون اچھے الفاظ میں ادا ہو گیا۔

مومن خاں مرحوم اور غالب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پہلو بدل بدل کر اس مضمون کو ادا کیا ہے۔ مگر کیا کہتے ہیں وہ استاد تھے اور ان کے شعر استادوں کے کہے ہوئے شعر ہیں اور شعر شاگرد کا کہا اور استاد کا بنایا ہوا شعر ہے ملاحظہ ہوں ان دونوں اساتذہ کے اشعار۔

دیکھو اپنا حال زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا (مومنؔ)

حسن اس پر پرسش کا اور پھر بیاں اپنا — ہوگیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا (غالبؔ)

تاہم نواب فصیح الملک مرزا داغؔ مرحوم کی اصلاح نے ایک نیا پہلو نکالا ہے جس نے شاہراہ بیان الگ کر دی ہے

غیر کو آنکھ لڑانے کا مزہ مل جائے — ہو جو زنبور کا گھر (پاس کی) دیوار کے پاس

" " " " " " " " (روزن) " " "

آنکھ لڑانے کا کوئی محل شعر میں موجود نہ تھا دیوار کے پاس اگر زنبور کا گھر ہو بھی تو کیا ضرور کہ وہ کاٹ ہی کھائے اور وہ بھی آنکھ ہی میں (جس کی جانب پردہ بہ پردہ اشارہ ہے) "روزن" نے تاک جھانک کے طریقوں پر بھی روشنی ڈال دی اور دیدہ بازی کا محل بھی تیار کر دیا۔

اپنے دل میں وہ بھلا ظلِ ہما کیا سمجھیں

(جو کہ) رہتے ہیں ترے سایۂ دیوار کے پاس

اپنے دل میں وہ بھلا ظلِ ہما کیا سمجھیں

(جتنے) رہتے ہیں ترے سایۂ دیوار کے پاس

ایک تو "جو کہ" ہی بہت بھدا ٹکڑا تھا۔ پھر اس کے ساتھ فعل جمع کا لانا۔ ان امور نے شعر کو اچھا خاصا مجموعہ خرافات بنا دیا تھا۔ "جتنے" فعل کی مطابقت اور صفائی روانی کے ساتھ معنی میں ایک وسعت اور پیدا کر دی۔

(باقی آئندہ - تیسری قسط)

مضمراتِ اقبال

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

دگیان بھون نئی دہلی میں نومبر ۱۹۷۷ء میں منعقدہ اقبال عالمی سمینار کی ایک نشست میں ایک صاحب نے جب اقبال کو فسطائیت (FASCISM) کا علمبردار بتایا تو بعض حضرات آگ بگولہ ہو کر رہ گئے حالانکہ یہ جرأت کسی میں نظر نہ آئی کہ وہ استدلال سے اعتراض کا جواب دیتا۔ جناب صدر نے بیچ میں دوسری باتوں کو سامنے لاتے ہوئے اعتراض ہذا کو ادھر اُدھر کی باتوں کے ملبے میں داب دیا۔ اقبال کی شاعری پر بحث و تحقیق کے وقت اپنے مضمرات ذہنی کو بروئے کار لانا ادبیات کے فروغ میں کیا پارٹ ادا کر سکتا ہے اس کو سمجھنا محض دشوار ہے۔ حقیقت، بلکہ تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو اسلام، پاکستان اور قائد اعظم وغیرہ کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا ہے۔ اگر اقبال بھی اسکالر ان کے تحت آتے ہیں تو ان کی تخلیقات کو مدرسوں اور رابطۂ اسلامی وغیرہ ہی میں جگہ دی جانی چاہیے۔ بعد باقی بکر کو دکا فاما مسئلہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ابھرتا نظر آئے گا اور یہ حقیقت ہے کہ خود اقبال بھی ایسی حرکات کو جو بلاشبہ فسطائی تھیں ہوا دیتا رہا۔ فسطائیت کا تجزیہ درج ذیل اقتباسات کے بعد زیر بحث لایا جائے گا۔

" حال ہی میں لاہور کے ایک ہفت روزہ اخبار میں جوش ملیح آبادی کا وہ ریڈیو انٹرویو جو ۱۹۷۴ء میں ریکارڈ ہوا تھا، شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے علامہ اقبالؒ، حضرت قائد اعظمؒ دو قومی نظریہ، ہندوستان کی تقسیم بلکہ قرآن اور اسلام کے بارے میں ایسی باتیں کی ہیں جس کی تاب سماعت کسی مسلمان ... کو نہیں ہو سکتی ... کیا محاسبہ کے اس دور میں ایسے افراد کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جا سکتی جو اسلام، قرآن، اقبال اور قائد اعظم اور نظریۂ پاکستان اور قیام پاکستان کے خلاف اپنی معاندانہ سرگرمیوں میں بدستور مصروف ہیں۔" (ہفت روزہ ... [illegible] ... جمہوریہ نمبر ۷۹ء عنوان مضمون "جوش ملیح آبادی اور ریڈیو پاکستان)

"... جوش ملیح آبادی "یادوں کی برات" میں بالکل ننگا ہے اس ننگِ ملت شاعر اور ادیب کا ایک انٹرویو ریڈیو پاکستان نے بظاہر اس مقصد کے لئے ریکارڈ کیا کہ اس کی وفات کے بعد نشر کیا جائے گا۔ انٹرویو کا ٹیپ اور متن "زندگی" کے ہاتھ لگا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ جوش نے خالقِ پاکستان حضرت قائد اعظمؒ، شاعر مشرق علامہ اقبال،... پاکستان اور اسلامی نظریۂ حیات کے بارے میں دریدہ دہنی کا رسوا کن مظاہرہ کیا..." (یہ انٹرویو رہنمائے دکن حیدرآباد سے ہماری زبان، شمارہ ۱۵ جنوری ۷۹ء میں نقل کیا گیا ہے)

"... اقبال اور غالب یا شیکسپئر یا اور کسی ادیب کا نام اکٹھا نہیں لیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال تصورِ پاکستان کے خالق ہیں وہ روایتی معنوں میں شاعر نہ تھے بلکہ وہ کچھ آئیڈیل لے کر آئے تھے ایسے آئیڈیل جو پاکستان کی صورت میں معجزہ فکر تابندہ تھے اسی لئے علامہ نے خود کو کبھی معاصر شعراء کی صف میں دیکھنا پسند نہ کیا تھا۔ علامہ اقبال نے تو صرف اپنے "مقاصدِ خاص" کے ابلاغ کے لئے شاعری کا مقبولِ عام ذریعہ اپنایا ... فراق گورکھپوری کی تحریریں ہمیں بتاتی ہیں کہ اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اندر سے متعصب ہندو ہیں جس کا مظاہرہ وہ عرصہ دراز سے ... کرتے آ رہے ہیں۔ آج سے چالیس برس قبل جب "اردو کا جنم" (مطبوعہ ادبی دنیا ۱۹۳۸ء) ایسے اہم موضوع پر لکھتے ہیں تو وہاں بھی اردو کے حوالے سے اپنے متعصبانہ خیالات کا اظہار کیا۔ اثر لکھنوی کے ساتھ ان کا جو قلمی مناظرہ شروع ہوا تو اس کی بنیادی وجہ بھی یہ تھی کہ عربی فارسی الفاظ کو مسلمانوں کے الفاظ سمجھتے ہوئے اردو میں ان کے خلاف تھے اور ان کے برعکس سنسکرت اور ہندی داخل کرنے کا پرچار کرتے تھے" (شاعر بمبئی شمارہ ۱۲، ۱۹۷۸ء "اقبال سے متعلق خوش فہمیاں" مضمون کے بارے میں سلیم الدین کا مضمون)

اقبال سے متعلق ذہنی تحفظات و قلبی مضمرات پر محولات
.ق تمامی روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر اقبال پاکستان کے خالق تھے اس
ے پاکستانیوں کے علاوہ کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اقبال کو
.اصل آج ایک استعارہ بنا لیا گیا ہے جس کے مشمولات میں
فادپرستی، فرقہ واریت، ملوثاتِ قلبی وغیرہ جیسی لعنتیں کروٹ
روٹ دکھائی دیتی ہیں۔ یہ استعارہ سازی غالباً سر نہ اٹھاتی اگر
.د اقبال نے فسطائی رجحانات اور عقابی میلانات کو ہوا نہ
.ا ہوتی۔ مندرجہ ذیل باتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور
.ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو ان سے اُبھرنے والا تیور وہی
،، جو ہر فسطائی کردار کا جزوِ مزاج و انداز ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو
بال کی ڈائری کے وہ اندراجات جن میں ہلالی عسکریت و جارحیتکا
جواز پیش کیا گیا ہے۔

" تمام قومیں ہم پر تعصب کا الزام لگاتی ہیں۔ میں اس الزام
.قبول کرتا ہوں بلکہ قدرے آگے بڑھتے ہوئے کہتا ہوں کہ ہمارا
عصب مقدس ہے۔ تعصب حبِ مذہب کو کہتے ہیں اور
حب الوطنی ملک کے لئے تعصب کو کہتے ہیں (ص ۲۳-۲۵

STRAY REFLECTIONS

اورنگ زیب کی سیاسی ذہانت کا دائرہ بہت وسیع تھا
... گذشتہ مسلم حکمرانوں کی تاریخ نے اورنگ زیب کو یہ سکھایا
تھا کہ ہندوستان میں اسلام کی قوت کا انحصار، اپنے جدامجد
.ر کے خیال کے برعکس، عوام کی خیر سگالی پر اتنا نہ تھا جتنا حکمرا
م کی طاقت پر تھا، تاہم ایسی گہری سیاسی بصیرت کا حامل ہو
ے باوجود وہ اپنے بزرگوں کی غلط کاریوں کا ازالہ نہ کر سکا
.یں ہم اس کو ہندوستان میں مسلمان قومیت کی داغ بیل ڈالنے
الا تصور کرنا چاہیے (ص ۴۳-۴۴)

" مسیحت کے نزدیک خدا صداقت ہے جبکہ اسلام اس
.بحیثیت طاقت تصور کرتا ہے ... میری رائے میں ...
.یا تاریخ میں محبت سے زیادہ بحیثیت طاقت منکشف ہوتا ہے ... تاریخی تجربہ
.کی میں خدا کو زیادہ تر بحیثیت طاقت ہی سمجھا جانا چاہیے ..." (ص ۱۰)

" فلسفہ منطق حق کو کہتے ہیں اور تاریخ منطق قوت کو
وخر الذکر منطق کے اصول زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں" (ص ۱۵

ڈائری کے پیش لفظ کے تحت جاوید اقبال (فرزند اقبال)
نے منجملہ دیگر لکھا کہ "... اقبال اگر اپنے تجریدی و بے پیکر سیاسی
نظریہ اور نصب العین کی تکمیل ہونے تک یعنی قیام پاکستان
تک زندہ رہتے تو یقینی ہے کہ انھوں نے اس کو ترقی دے
کر ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا ہوتا جس سے پاکستان قومیت
کی داغ بیل پڑتی ... اقبال نے علاقائی قومیت یا وطن پرستی
کی تردید کے لئے مذہبی اور فلسفیانہ جواز پیش .... کرنے کے
لئے سرگرم کوشش کی حالانکہ انھوں نے مشرقِ وسطیٰ کے
ممالک میں قومیت اور وطن پرستی کے فروغ کو درست قرار
دیا۔ اقبال کے الفاظ میں مسلمانوں کے لئے ان ملکوں میں جہاں
وہ اقلیت میں ہوں، قومیت ایک مسئلہ بن جاتی ہے .....
مسلم اکثریتی ملکوں میں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی ہو جاتے ہیں
اقلیتی ملکوں میں ایک تہذیبی اکائی کی حیثیت سے خود ارادیت کی
تلاش درست ہے (STRAY REFLECIONS LA-

(HORE), 1961

جناب یوسف سلیم چشتی سے روایت ہے کہ اقبال نے مجھ سے ایک مرتبہ یہ
کہا تھا کہ انسان اور مسلم ہم معنی الفاظ ہیں جو مسلمان نہیں وہ انسان نہیں
... (شرح پیام مشرق لاہور، ص ۳۶۵)

محولات فوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے غلام ربانی عزیز کی رائے کی جانب
رجوع فرمائیں۔ اقبال پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "... اگر
اقبال کی نفسیات کا بہ وقتِ نظر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا
ہے عوام کا نمائندہ ہونے کے باوجود وہ شاہ پرست اور شاہانہ
جاہ و جلال کا پرستار ہے، وہ سلاطین کو خدا کا سایہ جانتا اور
انھیں اعلیٰ حضرت کے جلیل القدر خطاب سے مخاطب کرتا ہے
اورنگ زیب کو وہ مجدد اور اسلامی ترکش کا آخری تیر شمار
کرتے ہوئے اس کی برادر کشی اور پدر آزاری کو یکسر بھول
جاتا ہے اسی عقیدت مندی کا نتیجہ تھا کہ اس نے "پیام مشرق"
جیسی زندۂ جاوید کتاب کو امیر امان اللہ خاں کے نام معنون
کرکے اس کی شان میں (ایسے) اشعار کہے ہیں جن کا وہ کسی
طرح بھی مستحق نہیں تھا۔ سابق شاہ افغانستان نے ایک بار
کابل آنے کی دعوت دی تھی۔ اس موقع پر بادشاہ نے اقبال
کو علیحدگی میں ملاقات کا موقع دیا۔ اس کی کیفیت (سے متعلق)

نظم پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اقبال بھی پچھلے زمانے میں پیدا ہوتا تو یقیناً اس کے یہاں بھی غیر مستحق بادشاہوں کی مدح سرائی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ان اشعار میں جو منظر بیان کیا گیا ہے سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ سین ہے۔ جب مشرق کا یہ مفکرِ اعظم امان شاہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے۔ اقبال کی [illegible] کیفیت کسان کی اقتصادی بدحالی نے زیادہ ابھارا وہ فکرِ معاش کے ہاتھوں ہمیشہ پریشان رہے ۔۔۔۔ ڈاکٹر راس مسعود ۔۔۔ اور اقبال ۔۔۔ کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ چنانچہ ان کی سفارش سے دربار بھوپال نے اقبال کو پانچسو روپے ماہوار وظیفہ دینا منظور کر لیا۔ اقبال اس بندہ نوازی سے اتنے مسرور ہوئے کہ اس فرمان کو جو انگریزی میں تھا فریم کرا کر رکھ دیا تاکہ آنے جانے والے اس کا مطالعہ کر سکیں۔ انھوں نے ضربِ کلیم کو نواب حمید اللہ خاں کے نام معنون کیا۔ انھیں اعلیٰ حضرت کے بھاری بھر کم الفاظ سے مخاطب کیا اور ان کی مدح میں ۔۔۔ غلو سے کام لیا۔ اب اشتراکیت کو لیجئے اس [illegible] اصول یہ ہے کہ مختلف طبقوں کے اشتراکِ عمل سے معاشرے [illegible] سانچے میں ڈھالا جائے کہ دولت کی تقسیم مساوی ہو ۔۔۔ آغازِ اسلام [illegible] اسلامی معاشرہ اس طرح کے سانچے میں ڈھل چکا تھا اور یہ حالات کم و بیش، خلافتِ راشدہ کے اختتام تک قائم رہے ۔۔۔۔ دولت کی تقسیم ایسی تھی کہ اہلِ ثروت کو زکوٰۃ اور صدقہ بھور کرنے والا نہ ملتا تھا۔ اقبالؔ اسی تمدن کی طرف دعوتِ فکر دیتا ہے۔ بلاشبہ اسلامی معاشرے کے اس دور کی حیثیت معیاری ہے لیکن اس کا اتنی جلدی مٹ جانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ انسانی سوسائٹی میں اس نظام کا کوئی مقام نہیں تھا۔ جب ہم اس عہد کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری افتخار کی گردن تن جاتی ہے لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر قوم کا معاشرہ جغرافیائی اور اقتصادی حالات کا پیداوار ہوتا ہے اس وقت ملک کی آبادی چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہ تھی، ضروریاتِ زندگی مختصر تھے لیکن جب ایسی سوسائٹی کو اقوامِ عالم سے واسطہ پڑا تو طور طریقے بدل گئے۔ جھونپڑیوں کی جگہ محلات نے، کمبل کی جگہ ریشم نے اور پانی کی جگہ شراب نے لے لی اور وہی سماں نظر آنے لگا جو دولت و ثروت کا منطقی نتیجہ ہے۔ ہٹلر نے بھی اپنے زمانۂ اقتدار میں ایک ایسے ہی مثالی معاشرے کے قیام کی کوشش کی تھی، جس کا نام قومی اشتراکیت تھا۔ غریب [illegible] سے حکومت ضروریاتِ زندگی [illegible] اپنی کرسی اور امرا بڑی فیاضی سے اس کارِ ثواب میں ہر دل عزیزی، نازی پارٹی کا اقتدار، اور سب سے زیادہ روس کی ہمسائیگی تھی۔ اقبال اس نظام کو دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ "پیامِ مشرق" میں امیر امان اللہ خاں کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

اے ترا فطرت ضمیرِ پاک داد
از غمِ دیں سینۂ صد چاک داد
تازہ کن آئینِ صدیق و عمر
چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر

(نگار لکھنؤ جنوری۔ فروری ۱۹۶۲ء)

احتشام حسین مرحوم کی رائے بھی ملاحظہ ہو:-

"۔۔۔۔ اقبال کے طوفان بدوش خیالات ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دیتے ہیں۔ لیکن عمل کی راہ نہیں بتاتے۔ ان کا فقر غیور ہونے کے باوجود امان اللہ نادر شاہ اور ظاہر شاہ کے سامنے جھک جاتا ہے اور ان میں یہ روحانی صفات ڈھونڈ نکالتا ہے جس سے وہ عاری نہیں ۔۔۔۔ اقبال کا انسان تعمیر و تخلیق کا پیکر ہونے، محنت کش اور کم آزار ہونے کے باوجود خون ریز بھی ہے اور اس تصور میں سرمایہ دارانہ انسان کی تصویر نظر آتی ہے ۔۔۔۔ اگر انھوں نے سماجی زندگی کی کشمکش کو طبقاتی لوٹ کھسوٹ اور سامراج اور سرمایہ داری کے استحصال کی روشنی میں دیکھا ہوتا، اگر عوام کی معمولی مطالبات پر نگاہ ڈالی ہوتی تو وہ ہمیں واضح طور پر بتا سکتے کہ روحانی ارتقا سے پہلے زندہ رہنے کے لئے اپنے ہی سماجی نظام میں شدید کشمکش کی ضرورت ہے اور اس وقت ان پر اشاروں کے اثباتی عملی پہلو نمایاں ہو کر یہ بھی بتاتے کہ انسان اپنی عظمت کے اظہار کے لئے کونسی راہیں اختیار کرے

سکتا، اور ایک غیر متوازن، غیر منصفانہ سماجی زندگی کے بندھن کو کس طرح توڑ سکتا ہے .... (اقبال کی شاعری عملی نقطہ نظر سے، نیا دور لکھنؤ، جنوری، فروری ۱۹۶۲ء)

آگے ہاتھوں ولفریڈ کینٹول سمتھ کی رائے پر نظر ڈالئے:

"..... ۱۹ویں صدی کے اوائل سے ٹھنڈے پڑے مسلم معاشرے میں ۲۰ویں صدی سے ابال آنے لگا تھا ..... اقبال نے اس جھنجھلاہٹ اور ابال کو بہ تمام ترغیب و اشتعال اور وجدانی جارحیت کے ساتھ اپنی شاعری میں ڈھالا .... اس نے عشق کو اچھالا اور عقل پر دعا و ابطال دیا ....مسلم تشدد اور ۱۹۴۷ء کے قتل عام کی روشنی میں اقبال کے روک ٹوک اسلامی جذبہ سے بھرپور نظموں کو پڑھ کر پریشان کن اور پراگندہ کاسے مملو تجربات کا احساس کروٹ لینے لگتا ہے .. ... "

(P. 85 W. CANTWEL SMITH: ISLAM IN MODERN HISTORY NEW YORK - 1963

جمہوریت سے متعلق اقبال کے منظوم خیالات بھی پیش نظر رکھئے:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

چہ شمشیرے کہ جاں ہا می ستاند
تمیزِ مسلم و کافر نہ داند

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطا است

دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا روا است

خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

غرض کہ کلامِ اقبال سے متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، یعنی ایسی مثالیں جس میں جمہوریت پر یلغار، دیوپرستی روا رکھی گئی ہے اور ایک مخصوص قوم کو حاکمیت کا جائز حقدار بنا کر پیش کیا ہے۔ کلامِ اقبال میں اشتراکی اور ترقی پسند خیالات بھی ملتے ہیں مگر ایسے خیالات بالعموم نعروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اشتراکیت میں خدا کو شامل کر لینے سے اس کو اسلامی معاشرتی نظام کے مترادف سمجھنے والے شخص کو اشتراکیت کے مبادیات سے ناواقفِ محض ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کلامِ اقبال کو اقبال کی مسلم لیگ سے وابستگی کے پس منظر میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ غالباً یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اقبال اور لیاقت علی خاں کی کوششوں سے محمد علی جناح کو مسلم لیگ کی سربراہی کے لئے تیار کیا جا سکا تھا لہٰذا وہ لوگ جو اقبال کو بانیٔ پاکستان یا کم از کم پاکستان کی تحریک کا محرک سمجھتے ہیں، غلط خیالی کا شکار نہیں کہا جا سکتا۔ مجنوں گورکھپوری نے نادرست نہیں کہا ہے کہ "..... اقبال کی فرقہ واریت اور لاوطنیت نے ایک دوسرا نا گوار عنوان اختیار کر لیا یعنی وہ قوم پرستی اور وطنیت کے تنگ دائرے سے نکل کر مذہب و ملت کے تنگ دائرے میں پھنس گئے جو حجازیت ہے جو زیادہ خطرناک ہے اور جس کو ہم قابلِ نہیں کہ جو فاشیت FASCISM ہے جس طرح اقبال کے تصور میں حجاز نے اپنا تسلط جما لیا تھا اسی طرح عقاب، شاہین، شہباز اور ایسے سفاک جانوروں نے بھی ان کی فکر و بصیرت میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ انسان میں بھی بالخصوص مردِ مومن میں انھیں پھاڑ کھانے والے جانوروں کی خصلت دیکھنا چاہتے ہیں... اقبال نے .... یہ بھی نہ سوچا کہ اگر تہذیبِ انسانی کی آخری تخیل یہی ہوتی تو اس کو ہلاکو اور چنگیز کے دور سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں تھی ... " (اقبال مصنفہ مجنوں گورکھپوری ص ۳۶ - ۳۹ دہلی ۱۹۵۵ء)

فراق گورکھپوری مذمت ہی فرماتے ہیں کہ "... اقبال کی ملت زدگی یا جنونِ ملت یا ملیت اور اسی کے ساتھ انسان

دوستی کا دعویٰ دو دلی پن کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اقبال کی فکری شخصیت باہم متصادم قوتوں کا شکار ہو کر رہ گئی ہے جسے انگریزی میں (SPLIT PERSONALITY) کہتے ہیں۔۔۔
(آج کل اردو، نومبر ۷۷ء)

خالد لطیف گابا (حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے پیشتر کنہیا لال گابا) نے اپنی سوانح عمری (FRIENDS AND FOES NEW DELHI, 1974) میں اقبال سے متعلق کچھ ذکر کیا ہے جو مطالعہ اقبال کے لئے قدرے نفسیاتی مواد ضرور فراہم کرتا ہے کتاب ہذا میں دو تین جگہ اقبال کا ذکر ہے۔۔
"۔۔۔۔ مملکت پاکستان کو اقبال کا حقیقتاً مقبرہ سمجھنا چاہئے وہ ایک مایوس اور برداشتہ خاطر شخص تھے کیوں کہ ان کی خانگی زندگی خوشگوار نہ تھی اپنے بڑے لڑکے سے ان کے خاصے سنجیدہ اختلاف تھے ۔۔۔۔ اقبال نے ۔۔۔ بہت کم عمر لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے دوسرے ۔۔۔ ان بیدا ہو گئے تھے ۔۔۔۔ ان کی موت ایک اکیلے اور مایوس آدمی کی موت تھی ۔۔۔۔ ۔۔۔ دلیل کی بہ نسبت اقبال کو بہ حیثیت شاعر ہی سمجھنا چاہئے ۔۔۔۔" (ص، ۱۶۵، ترجمہ انگریزی سے)
گابا سے اقبال کے خاصے تعلقات تھے اور ان کا اسلامی نام بھی اقبال ہی کا مجوزہ تھا۔ اس رائے سے اقبال کے متعلق بہت سی باتوں سے پردہ اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کی جارحیت پسندی ان کی مایوس زندگی سے عبارت تھی اور وہ جارحیت بلاشبہ ایک فاشسٹ کی جارحیت تھی جس کا اثر پاکستان پر یہاں تک پڑا کہ وہ ان کے خیالات کا مقبرہ ہی بن کر رہ گیا "نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر" اسلامی اتحاد کا اقبالی خیال صرف خواب پریشاں ہی ہو کر رہ گیا۔ کیوں کہ پاکستان کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ بنگلہ دیش معرضِ وجود میں آ چکا ہے۔ پاکستان میں چونکہ جمہوریت کا گلا شروع ہی سے گھونٹ دیا گیا تھا۔ لہٰذا شکست و ریخت کا سلسلہ جنبانی ہنوز ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ بلوچستان کے سرکردہ لیڈر بزنجو اور ان کے ہم خیال علانیہ کہتے رہے ہیں کہ پاکستان کو اسلامی مملکت کہنا غلط بھی ہے اور گمراہ کن بھی ہے کیوں کہ کسی دوسری مملکت کے مسلمانوں کو مراعات و حقوق کیونکر دیئے جا سکتے ہیں جس کا بین ثبوت یہ بھی ہے کہ پاکستان بنگلہ دیش کے بہاریوں کو بھی قبول نہیں کر رہا خیر یہ تو پاکستان کا اپنا مسئلہ ہے جس کا حل خود پاکستانیوں ہی کو تلاش کرنا ہے مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اقبال کے خیالات کا تابکارانہ اثر پاکستان پر یہاں تک پڑا ہے کہ وہاں جمہوریت پنپتی دکھائی نہیں دیتی۔

من کہ مکتوب الیہ

آل انڈیا پونم کلچرل سوسائٹی کانپور ۳ مارچ

بھائی سرور صاحب!

سلام و رحمت

"شان ہند" کا ماہ جنوری کا شمارہ نظروں سے گذرا۔ مشاعرہ جشن حکیم شبیر علی خاں کی تفصیلی روداد پڑھی۔ روداد میں کانپوری کے بارے میں جو لکھا گیا ہے (اس سلسلے میں نہ جانے شاعر حق کانپوری کی طرح دوسرے شاعر دل کا کلام پڑھتے ہیں۔ جو الٹا سیدھا وہ نظر آتا ہے۔ حق کانپوری کے استادِ محترم خود عارفی کے مشہور شعر محفلِ شعر و سخن میں لہک لہک پڑھتے اور داد و تحسین حاصل کرتے ہیں ایک نشست میں حق کے استاد اسیر مچھلی شہری نے اس شعر پر خوب داد حاصل کی

کسی امیر کی بیٹی کسی غریب کے ساتھ
نکاح عیب سمجھتی ہے بھاگ سکتی ہے

یہ شعر رشاد عارفی کا ہے۔ اب آپ کس کس کو کہئے حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔!

حق صاحب استاد محترم کی تقلید کرتے ہیں تو کوئی عیب نہیں۔

نیاز مند
اکمل ادیب
جنرل سیکریٹری

کیا آپ نے کمپنی حصص میں تھوڑا بھی سرمایہ صرف کیا ہے؟

اگر ہاں! تو آپ کسی قسم کی ٹیکس کی کٹوتی کے بغیر ہی اپنا ڈیویڈنڈ حاصل کر سکتے ہیں

اگر آپ کوئی کمپنی نہیں ہیں اور ڈیویڈنڈ کو ملا کر آپ کی مجموعی آمدنی، آمدنی ٹیکس کی ادائیگی کے قابل کم از کم رقم (جو فی الوقت واحد فرد، غیر منقسم ہندو کنبوں کی فرموں، انجمن اشخاص، چند افراد پر مشتمل تنظیم اور مجموعی قانونی اداروں سے متعلق افراد کی صورت میں ۱۰۰۰ روپے ہے) سے کم ہے تو آپ کمپنی کی جانب سے اعلان کئے گئے منافع میں اپنے حصے کی پوری رقم ماخذ پر بغیر کسی ٹیکس کی کٹوتی کے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کو کیا کرنا ہے؟

آپ اپنے انکم ٹیکس افسر کے پاس فارم نمبر 14 اپر درخواست دیجئے تاکہ مذکورہ افسر اپنی طرف سے سند جاری کر کے اس کمپنی کو جس کے حصص کے آپ حامل ہیں یہ اختیار دے سکے جس سے کہ وہ کمپنی آپ کو ماخذ پر کسی ٹیکس کی کٹوتی کے بغیر ہی آپ کا ڈیویڈنڈ (منافع میں آپ کا حصہ) ادا کر دے۔

یا

اگر کسی بھی کمپنی سے حاصل ہونے والا ڈیویڈنڈ 250 روپے سے کم ہے تو ایسی ہر کمپنی کے پاس مقررہ فارم نمبر 14 بی پر (دو نقول میں) اعلان نامہ ارسال کیجئے۔

اس سہولت سے فائدہ اٹھائیے اور انکم ٹیکس دفتر سے ری فنڈ کی ادائیگی کے سردرد سے نجات پائیے

جاری کردہ:-

ڈائرکٹر آف انسپکشن

(ریسرچ اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن)

محکمہ انکم ٹیکس، نئی دہلی 110001

DAVP. 78/600

۲۵۰ سالہ جشنِ جے پور کی اختتامی تقریب پر
کُل ہند مشاعرہ

سرور تونسوی

آج ۲۳ر نومبر ۱۹۷۸ء ہے۔ ایک سال پہلے جے پور کے جشنِ اڑھائی صد سالہ کا آغاز ہوا تھا۔ اور آج کا کل ہند مشاعرہ جے پور کے اس جشنِ اڑھائی صد سالہ کی آخری تقریب ہے۔ یہ مشاعرہ رام نواس باغ میوزیم کے سامنے منعقد ہو رہا ہے پنڈال دیدہ زیب بنایا گیا ہے۔ نو بجے شب جناب پارسا کوثری کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں پہنچا تو طوطیِ راجستھان قبلہ منشی چند بہاری لال صبا جے پوری اور اردو اکاڈمی کے صدر جناب مولانا قمر واحدی صاحب سٹیج پر تشریف فرما ہیں۔ راہی شہابی صاحب شعرا کے انتظار میں برہمی کی حد تک منتظر ہیں مشاعرے کا وقت ساڑھے سات بجے کا ہونے کے باوجود اب تک شعرا حضرات ...... تشریف نہیں لائے۔ جناب ہوش مدان بھی تشریف لے آئے ہیں۔ راہی شہابی فرمانے لگے سرور صاحب آپ بھی سٹیج پر آجایئے تاکہ مشاعرہ شروع کرایا جائے۔ نو بجکر دس منٹ پر راہی صاحب نے قبلہ صبا جے پوری کا اسم گرامی صدارت کے لئے پیش کیا۔ جس کی تائید پُر زور تالیوں سے کی گئی ہے اور روایات کے خلاف راہی صاحب نے پارسا کوثری سے گذارش کی ہے کہ وہ اپنے کلام سے مشاعرہ کا افتتاح فرمائیں۔

لیجئے پارسا اپنی شانِ قلندرانہ کی جملہ رعنائیوں کے ساتھ مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں ؎

گردن جھکائے گو وہ ادھر سے اُدھر گئے
نیچی نظر سے کام ہمارا تو کر گئے
یہ سُن رہا ہوں آج وہ دُشمن کے گھر گئے
آہیں کدھر گئیں مرے نالے کدھر گئے
اپنی نظر سے تو نے ہمیں کیا گرا دیا
سارے جہاں کے دل سے نظر سے اتر گئے

داد ہے کہ پارسا اپنی سابقہ روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے ؎

جب تو نہ تھا تو تیرا تصور تھا ہم کنار
اپنے بُرے بھی دن بہت اچھے گزر گئے

مقطع فرما رہے ہیں ؎

کیا پیتے ہم شراب بغیر اُن کے پارسا
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

پارسا داد و ستائش کے شور میں اپنی جگہ گئے تو راہی نے نواب شیدائی سے کلام سنانے کی گذارش کی ہے۔ شیدائی نے بڑے اچھے ترنم سے غزل شروع کی ہے ؎

گئی شامِ الم چمکی کرن وہ آفتاب آیا
میرا محبوب میرے سامنے جب بے نقاب آیا
نہ کیسے ٹوٹتی توبہ نہ ہم کیوں توڑتے توبہ
اُنہی کے ہاتھ سے محفل میں جب جامِ شراب آیا
بھلا بیٹھے وہیں نواب ہم اپنے سبھی شکوے
عجب انداز سے وہ مہ جبیں وہ ماہتاب آیا

نواب شیدائی کو اچھے اشعار اور اچھے ترنم پر خوب داد دی گئی ہے۔ اب کوئی صاحب خوشتر سہارنپوری تشریف لا فرمانے لگے چار مصرعے ملاحظہ فرمایئے۔ جو شاعر رباعی یا قطعہ کو چار مصرعے کہے۔ سمجھئے کہ رباعی او قطعہ کے اوزان سے ناواقف ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کئی حضرات کے خطوط ملے ہیں کہ رباعی یا قطعہ کو چار مصرعے کہنے میں کیا قباحت ہے حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ التماس ہے کہ پھر غزل کو مصرعے یا دس مصرعے یا اٹھارہ مصرعے کہنے میں کیا دشوار اگر آپ کی نظم چوبیس اشعار کی ہے تو اسے اڑتالیس مصرعے میں کیا برائی ہے۔ بہر حال چار مصرعے کہے جانے کے حق میں جو خطوط لکھتے ہیں وہ خود بھی اسی برادری میں شامل ہیں جیسے

اور رباعی کا فرق معلوم نہیں۔
اب قمر منظر ٹونکی مائک پر آئے ہیں اور غزل شروع کر رہے ہیں ؎

دلِ حزیں پہ جو اک واردات گزری ہے
اسی کی یاد میں میری حیات گزری ہے
وہ رات جس میں نہ آئے ہو تم تصور میں
وہ رات ایک قیامت کی رات گزری ہے
مرا فسانۂ غم سن کے آپ کیوں رو دیے
کیا آپ پر بھی یہی واردات گزری ہے

اس شعر کا دوسرا مصرعہ منظر صاحب کی شاعری کے حدود اربعہ کی جو منظر کشی کر رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بھی معاملاتی ہیں۔ بیری کمیشن کے سربراہ عالی جناب جسٹس بیری صاحب اور راجستھان کے وزیر زراعت تشریف لائے ہیں۔ بیری صاحب جس طرح قانونی موشگافیوں میں اپنا جواب آپ ہیں۔ اسی طرح اردو ادب اور شاعری میں بھی خوب دسترس رکھتے ہیں۔ میں نے بیری صاحب کو شان ہند کا تازہ شمارہ پیش کیا تو فرمایا میرا پتہ نوٹ کر لو شان ہند ہر ماہ بھجوا دیجیے۔ دیکھا تو جناب بسمل رحمانی فرما رہے تھے ؎

غمِ حیات یقیناً خوشی کا نام نہ لے　　دلِ تباہ اگر حوصلوں سے کام نہ لے
چمن سے جیسے بہاروں نے انتقام لیا　　خزاں کا دور بھی شاید وہ انتقام نہ لے
میری وفا کو دیکھ اور میرے خلوص کو دیکھ　　مرے عزیز غلط فہمیوں سے کام نہ لے

بسمل رحمانی صاحب داد پاتے ہوئے اپنی جگہ تشریف لے گئے تو راہی صاحب نے بڑے اچھے تعارف سے جناب قمری فائزی ٹونکی سے کلام عطا فرمانے کی گزارش کی ہے۔ قمری صاحب نے دو قطعات کے بعد غزل کا مقطع ارشاد فرمایا ہے ؎

نہ کھیں جنوں میں بھی دامن کی دھجیاں میں نے
مقامِ عشق کو پہنچا دیا کہاں میں نے

گو مطلع داد نہ لے سکا مگر قمری صاحب اپنے قوی حوصلے سے فرما رہے ہیں ؎

خیال تک نہیں آتا جہاں تلاطم کا
وہاں بھی ڈوبتی دیکھی ہیں کشتیاں میں نے

تیرے کرم کی ضرورت نہیں رہی صیاد
سمجھ لیا ہے قفس کو ہی آشیاں میں نے

قمری صاحب کسی مطلع پہ داد وصول ہی کر گئے۔ اب جناب جوش خلیقی مائیک پر آگئے ہیں۔ بڑی اچھی ادا سے مطلع فرمایا ہے ؎

بچایا تھا بڑی مشکل سے میں نے آشیانے کو
نہ جانے تم کہاں سے آگئے بجلی گرانے کو

اچھا مطلع اچھا ترنم داد پاتے ہوئے جوش صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

قرینہ زندگی کا میں نے بخشا ہے زمانے کو
زمانہ کس لیے کوشاں ہے میری ہستی مٹانے کو
محبت کے صلے میں مجھ کو اتنے غم دیئے تم نے
میسر ایک لمحہ بھی نہیں اب مسکرانے کو

مقطع بھی سن لیجیے جوش صاحب کا عطا ہوا ہے ؎

محبت کو زمانہ ایک افسانہ سمجھتا ہے
محبت کی حقیقت کون سمجھائے زمانے کو

جوش صاحب داد پاکر اپنی جگہ گئے تو راہی صاحب نے جناب گل خلیقی سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ گل صاحب مائیک پر آئے تو کچھ احباب نے فرمائش کی ہے کہ وہ اپنی ایک مشہور غزل سنائیں۔ گل صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں اس فرمائشی غزل کا مطلع سنایا ہے ؎

زندگی ہے وہی معتبر　　جو تری یاد میں ہو بسر

یہ غزل شان ہند میں اکثر شائع ہو چکی ہے۔ اب اعلان ہوا کہ جناب ہوش سرحدی کلام عنایت فرمائیں گے۔ سنئے ہوش صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہم فقیروں سے کہاں دامن بچالے جائیگی
زندگی کب تک وفاداروں کو ٹالے جائیگی
ایک تنکا ہوں میں باد زندگی کے دوش پر
جا رہا ہوں میں جہاں مجھ کو ہوا لے جائیگی
میں وہ گل ہوں جو بکھر جائے گا تھوڑی دیر میں
پتیاں خاک چمن خوشبو ہوا لے جائیگی

ہوش سرحدی صاحب خوب خوب داد پاتے ہوئے مقطع فرما رہے ہیں ؎

زندگی سے کیا ملا ہے ہوش ہم کو آج تک
موت آئیگی تو آخر ہم سے کیا لے جائیگی

ہوش صاحب اپنی جگہ تشریف لے گئے تو مرزا احمید بیگ مائیک پر تشریف لائے ہیں. فرماتے ہیں ؎

میرے ساقی ترے ہوتے یہ کیسا انقلاب آیا
کہیں تو بوند کو ترسیں کہیں جام شراب آیا

آواز آئی ہے "پیشاب آیا" اب اس کے بعد مرزا احمید بیگ کافی حد تک ماند پڑ گئے ہیں۔

اب شری تریمبت جی پالی وال سیکریٹری راجستھان اسمبلی مائیک پر آگئے ہیں اور انھوں نے راجستھانی زبان میں ایک کویتا سنائی ہے جس کا ٹیپ کا مصرع ہے "یہ جاچن ماں کو اور بیر کھائی کو" راجستھانی الفاظ کا لکھنا مشکل ہے مگر سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کویتا خوب ہے اور داد بھی اتنی ملی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے. پالی وال جی مائیک سے ہٹنے لگے تو سامعین نے پُرزور اور طویل تالیوں سے ایک اور ایک اور کا مطالبہ کیا. اس کے پالیوال جی نے ہندی کویتا کے "دل کی دھڑکن سے کہو پیار کا درد بھی نرالا ہے" سنائی ہے اور حسب سابق داد پائی ہے. راہی صاحب نے ہندی شاعری کی مقبولیت دیکھی تو جھٹ منظر کے پریس ایجی بھائی میگھراج مکل کو کویتا سنانے کی دعوت دی ہے. مکل صاحب بھی کوی دربار وں کے مانے ہوئے کوی ہیں ان کی کویتا سننے بھی جی بھر کر داد لوٹی ہے۔ اب راہی صاحب نے پیر اپیلا ہے اور ہندی کویتاؤں کے بعد کلام سنانے کی دعوت دی ہے جناب کرشن بہاری نور لکھنوی کو جو خود اردو ہندی کا ایک ایسا سنگم ہیں کہ جن پر دونوں زبانیں ناز کرتی ہیں. اب نور لکھنوی اپنے مخصوص انداز میں ارشاد فرما رہے ہیں ؎

کتنے اوتار ہوئے کتنے پیمبر آئے — تو نہ آیا تیرے پیغام برابر آئے

داد کا دادیلا ختم ہوا تو عطا ہوا ہے ؎

میں تو غزل سنا کر اکیلا کھڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے

داد کا ریلا ہے کہ مشاعرہ گاہ کے قریب کے چرند پرند اور گھر کے جانور بھی سوچ رہے ہوں گے کہ آج رات گئے بھی انھیں انسانی آوازیں کیوں سنائی دے رہی ہیں. سنئے نور صاحب کیا غضب ڈھا رہے ہیں ؎

میں تو اپنے کمرے میں تیرے دھیان میں گم تھا
گھر کے لوگ کہتے ہیں سارا گھر مہکتا تھا

داد کا یہ عالم ہے کہ تصور یار کی خوشبو گھر تو گھر اب مشاعرہ گاہ میں بھی محسوس ہونے لگی ہے. اب نور لکھنوی غزل عنایت فرما رہے ہیں ؎

لاکھ تم سینے سے لپٹے رہے ناگن کی طرح
پیار سچا تھا مہکتا رہا چندن کی طرح

کوئی تحریر نہیں ہے جسے پڑھ لے کوئی
زندگی ہو گئی بے نام کی الجھن کی طرح

اب کوئی کیسے پہنچ جائے گا تیرے غم تک
مسکراہٹ کی ردا ڈال دی چلمن کی طرح

شام جب رات کی محفل میں قدم رکھتی ہے
بھرتی ہے مانگ میں سیندور سہاگن کی طرح

مسکراتے ہو مگر سوچ لو اتنا اے نور
سود لیتی ہے محبت بھی مہاجن کی طرح

داد ہے کہ اہل جے پور اپنے سخن فہم ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں مگر کی کا تقاضا ہے کہ نور صاحب ابھی کچھ اور عنایت فرمائیں. نور صاحب جس گھن گرج کے ساتھ پڑھتے ہیں. اس کی وجہ سے نومبر کی آخری راتوں کی خنکی کے باوجود پسینے میں شرابور ہو گئے ہیں. راہی صاحب نے سامعین کو یقین دلایا ہے کہ نور صاحب سے ابھی دوبارہ پھر سنا جائے گا

صفحہ ۶ کا بقیہ

کو سگریٹ نوشی کی بدعت کی دعوت نہیں دے سکتا۔

مگر اب وہی بیسوی صدی جناب خوشتر گرامی کی ملکیت اور ادارت سے نکل کر کچھ کلمہ گو مسلم حضرات کے ہاتھوں میں آگیا ہے. اتفاقاً بیسوی صدی کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا تو اس میں بیسوی صدی کے دوا خانہ کی طرف سے "گولی مغل اعظم" کے اشتہار کی اشاعت پر افسوس ہوا. جس ماہنامہ کے پردے میں یہ دعوے کیا جاتا ہو کہ وہ خالص ادبی علمی ہے. اس میں اس قسم کا فحش اشتہار شائع کرنا قطعاً زیب نہیں دیتا. کیا بیسوی صدی کے مالکان اسے پسند کریں گے کہ ان کی بیٹیاں بیٹے یا بہنیں یہ اشتہار پڑھیں. دلیپ مغل اعظم شہنشاہ اکبر کو مرحوم کو جانتے ہیں کہ اکبر بادشاہ جنسی طور پر ایسا بے راہ رو تھا کہ ایسے عظیم بادشاہ کے نام نامی کے ساتھ ایسی گندی اور ذلیل جنسی ادویات کا نام منسوب کیا جائے. کیا بیسویں صدی کے مسلمان قارئین اتنے بے حس اور بے ذوق ہیں کہ وہ اس قسم کی بدذوقی کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے۔

انجام

شفیق احمد صدیقی

ولٹو کو جب یہ پتہ چلا کہ اس کا بڑا بھائی منگو گاؤں کے چوکیدار فتو کی لڑکی پھولو سے اپنا بیاہ رچانے کے سندر سپنے دیکھ رہا ہے تو اس کے غم اور غصہ کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے پھولو سے پیار تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی ذرا سی زمین کی لڑائی دونوں بھائیوں میں دشمنی کی اس انتہا تک پہنچ چکی تھی کہ ولٹو اپنے بڑے بھائی منگو کو مار ڈالنے تک کا ارادہ کر چکا تھا۔ منگو اور پھولو کے پیار کی خبر کو سن کر وہ لال پیلا ہو گیا۔ اب وہ اپنے پہلے ارادے کو جلد از جلد پورا کر لینا چاہتا تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ بھائی کی شادی کے بعد آدھی زمین کی حقدار پھولو بن جائے اور اس کا پوری زمین کو ہتھیانے کا سپنا ادھورا رہ جائے۔

باپ کے مرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے زمین کا بٹوارہ کرنا چاہا۔ دونوں ہی بھائی کھیت کا وہ حصہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے جو سڑک کے نزدیک تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی چھوٹے باپ کا بننے کو تیار نہ تھا۔ پہلے تو دونوں بھائیوں میں تُو تُو مَیں مَیں چلتی رہی پھر ہاتھا پائی جھگڑے ہوئے۔ بعد میں لٹھ بازی بھی ہوئی۔ پھر مقدمہ گاؤں کی پنچایت میں آیا۔ گاؤں کی پنچایت نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ بڑے بھائی کو ہر طرح سے برتری حاصل ہوتی ہے باپ کے مرنے کے بعد بڑے بھائی کو ہی چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ چھوٹے بھائی کی بہ نسبت بڑا بھائی ہی سمجھدار سمجھا جاتا ہے اسی لئے راجاؤں مہاراجاؤں اور بادشاہوں کے بڑے لڑکے کو ہی گدی پر بٹھایا گیا ہے۔ پنچایت فیصلہ دیتی ہے کہ سڑک کے نزدیک والا کھیت کا حصہ منگو کے پاس رہے گا اور جنگل کی طرف والا حصہ ولٹو کے پاس۔

گاؤں کی پنچایت کے فیصلے کے آگے ولٹو ہار گیا کیونکہ پنچایت کے فیصلے کو ماننا گاؤں کا ہر آدمی اپنا فرض سمجھتا تھا چاہے اُسے یہ محسوس ہو کہ اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے یہی وجہ تھی کہ اس گاؤں میں بھائی جھگڑے ضرور ہوتے تھے لیکن پولس کبھی نہیں آتی تھی کیونکہ پولس کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ لوگ اپنے فائدہ اور نقصان کو نظر انداز کرتے ہوئے معاملہ کو بڑے بوڑھوں کے سامنے رکھ دیتے تھے اور ان کے فیصلے کو ہی تسلیم کر لیتے تھے۔ جو آدمی گاؤں کی پنچایت کا فیصلہ نہیں مانتا تھا اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا تھا اُسے نہ کوئی اپنی لڑکی دیتا تھا اور نہ ہی اس کی لڑکی لیتا تھا۔

پنچایت کے فیصلے کو سن کر ولٹو خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا حالانکہ اس وقت اس نے پنچایت کے فیصلے کی تردید نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ جنگل سے ملا ہوا کھیت کا حصہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ بھلے ہی اسے اپنے بڑے بھائی منگو کو موت کے گھاٹ ہی کیوں نہ اتارنا پڑے۔ لیکن منگو کو مارنا اس کے لئے آسان ہو نہ ہو لیکن قتل کر کے بچ نکلنا اس کے لئے آسان نہیں تھا کہ دونوں بھائیوں میں دشمنی ہے اس لئے قاتل وہی سمجھا جائے گا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر منگو کی کسی حادثہ میں خود ہی موت ہو جائے تو بھی گاؤں والے یہی سمجھیں گے کہ ولٹو نے ہی منگو کو مارا ہے اس لئے وہ ہر وقت ایسے منصوبے تراشتا رہتا تھا۔ جس سے کہ وہ منگو کا قتل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے اور قتل کے الزام سے بھی بچ جائے گویا سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ان کی سوتیلی بہن کمو کو دونوں بھائیوں کی دشمنی اور لڑائی جھگڑوں کا علم تھا پھر بھی وہ ان کے پاس نہیں آئی تھی۔ دونوں بھائی اپنی سوتیلی بہن سے اس وقت سے جلتے تھے جب وہ گاؤں میں آئے ہوئے ایک مہمان چھوکرے کالو کو دل دے بیٹھی تھی اور اسی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس مسئلے پر بھی تینوں بہن بھائیوں میں لڑائی ہوئی تھی بات پنچایت تک پہنچی تھی پنچایت نے اپنا فیصلہ کمو کے حق میں دیا تھا کمو کی شادی کالو سے ہو گئی تھی جو غریب لیکن محنتی تھا۔ دوسرے گاؤں میں رہتا تھا کھیتوں میں مزدوری کر کے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا تھا اور اپنی گرہستی قائم کئے ہوئے تھے۔

ولٹو کے شب و روز منگو کو قتل کرنے کی ترکیبیں سوچتے

میں ہی گن رہے تھے۔ آخیر کار اس کے دماغ میں وہ ترکیب آہی گئی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ان کے گاؤں میں جو ایک پہاڑی علاقہ پر جنگل کے پاس واقع تھا ایک چیتا اتر آیا تھا۔ جو گاؤں میں کئی آدمیوں عورتوں اور بچوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ اس چیتے کے حملے سے گاؤں والے پریشان ہو گئے تھے۔ پنچایت نے چیتے کے ظلم و ستم کی داستانوں کی اطلاع سرکاری حکام تک پہنچا دی تھی لیکن آدم خور چیتے کو مارنے کے لئے سرکاری حکام نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تھا گاؤں کے کچھ شکاری چیتے کو مار سکتے تھے۔ لیکن وہ اس کام کیلئے اس لئے آگے نہیں آئے کہ ایسا نہ ہو کہ وائلڈ لائف ایکٹ کے تحت ان پر چیتے کا شکار کرنے کا الزام عائد ہو کر انھیں سزا ہو جائے۔

اس چیتے کے قاتلانہ حملوں سے گاؤں والے خوف زدہ تھے لیکن دلّو کو اس چیتے کی بدولت منگو کو مارنا آسان نظر آرہا تھا۔ اس کے لئے اس کے ذہن نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ منگو کو کھیت میں کام کرتے وقت گلا گھونٹ کر مار... دیا جائے اور پھر گلے کو کھرچ کر خون نکال دیا جائے اور اس کے اردگرد چیتے کے پنجوں کے نشان بنا دئے جائیں تاکہ گاؤں والے یہ سمجھیں کہ منگو کو چیتے نے ہلاک کر دیا ہے دلّو نے اپنی اس ترکیب کو تکمیل کا جامہ پہنانے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے کچھ تار اکٹھے کئے۔ ان کو اس طرح جوڑا کہ اگر تاروں کے اس گچھے کو ریتیلی زمین پر رکھ کر اٹھا لیا جائے تو وہ چیتے کے پیر کے نشان لگنے لگیں۔ آخر کار وہ چیتے کا مصنوعی پنجہ بنانے میں کامیاب ہو گیا اور قدرت نے اسے وہ موقعہ بھی فراہم کر دیا جس کا وہ منتظر تھا یعنی کہ اسکا بھائی منگو شام کو کھیت پر کام کر رہا تھا کھیت کے آس پاس کوئی نہیں تھا بلکہ دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔

دلّو دبے پاؤں منگو کی طرف بڑھا اور پیچھے سے کوئی بھرپور منگو نے..... ہاتھ پیر ہلائے ہی تھے کہ دلّو اسے زمین پر گرا کر اس کی چھاتی پر بیٹھ گیا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دیا تھا۔ دلّو نے منگو کے گلے کو اس وقت تک پوری طاقت سے دبائے رکھا جب تک منگو کی آنکھیں باہر نہ آگئیں اور اسے یہ یقین نہیں ہو گیا کہ منگو مر چکا ہے۔ منگو کے دم نکل جانے کا یقین ہو کر وہ اس کی چھاتی پر سے اٹھا اور چیتے کے مصنوعی پنجے سے منگو کی گردن اور پیروں کو کھرچ ڈالا اور اس کی گردن میں ایک نوکیلی چیز دے کر خون نکال دیا جس سے کہ یہ محسوس ہو کہ چیتے نے منگو کو ہلاک کر دیا ہے۔ پھر دلّو نے منگو کے کپڑے اس طرح سے پھاڑے جو یہ ظاہر کریں کہ منگو نے چیتے سے چھٹکارا پانے کے لئے جد و جہد تو بہت کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے بعد دلّو نے منگو کی لاش کے اردگرد چیتے کے مصنوعی پنجے سے زمین پر چیتے کے پیر کے نشان بنائے اور ان نشانوں کو جنگل کی طرف تک بناتا گیا جس سے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ چیتا منگو کو ہلاک کر کے جنگل کی طرف کو گیا ہے اس نے یہ بھی چالاکی کی کہ اپنے پیروں کے نشان کو کپڑے سے جھاڑتا گیا۔

جنگل کے کنارے آکر اسے اطمینان سا ہوا کہ اس نے اپنا کام بخوبی انجام دے دیا ہے۔ وہ اس بات سے بھی مطمئن تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ اب تو وہ تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ دو قدم ہی چل پایا تھا کہ ایک خونخوار چیتے کو اپنے سامنے دیکھ کر دھک سے رہ گیا اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ پیچھے مڑ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ چیتا دلّو پر اچھل پڑا۔ چیتے نے اپنے نوکیلے پنجوں سے دلّو کو دبوچ کر اپنے تیز دانت اس کے گلے میں گاڑ دیئے۔ اور اس کا خون پی گیا۔ اپنا کام تمام کر کے چیتا جنگل کی طرف چلا گیا۔ منگو اور دلّو کی لاشیں وہیں پڑی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک خارش زدہ کتا وہاں آیا جس نے دلّو کی لاش کو سونگھا پھر ٹانگ اٹھا کر اس پر پیشاب کر کے چلا گیا۔

دلّو اور منگو کی شادیاں تو ہوئی نہیں تھیں اس لئے بعد کو پنچایت نے انکی سوتیلی بہن کو ان کی زمین کا وارث قرار دیا۔ •••

بابِ تنقید

(ادارہ)

انوارِ سحر | مجموعۂ کلام جناب دنکر راؤ دلیپ مکو دنکر۔ حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۸ا صفحات۔ کاغذ کتابت طباعت بہترین۔ قیمت مجلد دس روپیہ۔ ناشر: ہشالیمار پبلی کیشنز ملنے کا پتہ:۔ دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲۔

دنکر صاحب حیدر آباد (دکن) میں ایڈوکیٹ ہیں۔ مادری زبان مرہٹی۔ کاروباری زبان انگریزی مگر ان کی اُردو شاعری تصوف کا سرچشمہ۔ حقائق و معارف کا گنجینہ۔ عشق کا پیغام اور روحانیت کا لبریز جام۔ ادبی اور معیاری لحاظ سے پرانی تہذیب و روایات کی یادگار کے ساتھ ساتھ نئے نئے عناصر اور نئے نئے موضوعات کا ایک دلکش سنگم۔ سوز و گداز میں تر کا مستغنی! ادبی مذاق رکھنے والے اصحاب کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے تراکیب استعارات۔ تشبیہات اور صنائع لفظی کا وہ پُرلطف موقع کہ آنکھ دیکھکر سیر نہیں ہوتی۔ ہر لفظ سے زبان چٹخارے لیتی ہے اور روح وجد میں آجاتی ہے۔

انوارِ سحر کا پیش لفظ جناب علی احمد جلیلی صاحب نے لکھا ہے۔ جو ایک مطالعہ کی چیز ہے۔ حکومت ہند ہر سال ایسی کتابوں کے مصنفین کو نیشنل ایوارڈ دیتی ہے جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں بہترین ادبی معیار کی ہوں۔ غالباً دنکر صاحب نے یا پبلشر نے "انوارِ سحر" کو اس ادبی مقابلہ میں نہیں بھجوایا۔ مگر نہ کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ یہ کتاب نیشنل ایوارڈ حاصل نہ کرتی۔ کیونکہ یہ کتاب دسمبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی ہے اس لئے اب وقت نہیں رہا کہ اس مقابلہ میں شرکت کے لئے بھجوائی جا سکے۔ دنکر صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام زیرِ اشاعت ہے ہم ان سے گزارش کرینگے کہ وہ اپنا دوسرا مجموعہ اس مقابلہ میں ضرور بھجوائیں۔

اس مجموعہ میں ایک حمد۔ ایک نعت۔ دو سلام اور ۱۱۱ غزلیات ہیں۔ دنکر صاحب کے چند اشعار سنئے ؎

کچھ ذرا سوچ کر ستم کیجئے واقعہ یادگار ہوتا ہے

آشیانہ کو یاد کرتا تھا قفس میں روز و شب
جانے اب کیوں آشیانے میں قفس کی یاد ہے

آپ آئے گھر کی رونق بڑھ گئی کیا مقدر ہیں در و دیوار کے

• رقص کرتا ہے جنوں جب کسی پروانے میں
وصلِ جاناں کا مزہ آتا ہے جل جلنے میں

• درست یہ ہے کہ منزل مری تلاش میں ہے
غلط یہ بات کہ منزل تلاش کرتا ہوں

• مجھے غم دے اور اتنا دے کہ میں سرشار ہو جاؤں
تصدق تجھ پہ کر ڈالی ہے اپنی ہر خوشی میں نے

دورِ جمہور سے شاہی کا ہوا منہ کالا ۔ تاج بغلوں میں دبائے ہوئے سلطان چلے

• دل میں رہ کر بھی نظر آتے نہیں وہ کیا کریں
اس کے بدلے کیوں نہ اپنے آپ کو سجدہ کریں

• دنیا سمجھ رہی ہے کہ مشتِ غبار ہوں
زورِ خودی سے نائبِ پروردگار ہوں

• حائل ہے اگر راہ میں دیوار خودی کی
ٹھوکر سے یہ دیوار گرا کیوں نہیں دیتے

چھپ گیا پردۂ وحدت میں تو تنہا ہوں میں
آ گیا لوٹ کے کثرت میں تو دُنیا ہوں میں

روتا ہوں پھوٹ پھوٹ کے میں بات بات پر
پختہ نہیں ہوا ہے شعورِ الم ابھی

زمانے بھر سے ناحق مول لی ہے دشمنی میں نے
نشیمن کی بنا ڈالی خطا بس اتنی کی میں نے

اس قسم کے سینکڑوں اشعار انوارِ سحر اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے "انوارِ سحر" ایسا مجموعہ کلام ہے جو ہر صاحب ذوق کی ذاتی لائبریری میں ایک خوبصورت اور بہترین اضافے کا موجب بن سکتا ہے۔ • • •

اصلاح کاری ادب

اور حضرت داغ دھلوی مرحوم کے چند اصلاحی نمونے

حاجی نعمت اللہ نعمتؔ جلال آباد ضلع مظفر نگر

(بقیہ دوسری قسط)

لے کے جائے وہ چمن میں اپنے جو رخسار سرخ
سرخیٔ رخسار سے (ہو جائے سب گلزار) سرخ
" " " " - " (سب ہوں درودیوار) سرخ

"گلزار" تو "سرخ" ہوتا ہے۔ رخسارِ معشوق بجز اس کے کہ اس کی سرخی میں اضافہ کر دے اور کیا کر سکتا ہے۔ بہرحال ایک بے تکی سی بات تھی اصلاح نے "درودیوار" کو لگا ہے جو ایک امکانی شکل ہے اور اس طرح شعر "فطرت نما" بن گیا۔

(پھر نہ دعوی حسن کا ہرگز کریں شمس و قمر)
(اے مری جاں دیکھ پائیں جو) ترے رخسار سرخ
(کون دیکھے پھر چمن میں لالہ و گل کی بہار ـــ)
(دیکھ پائے جو تماشائی) " " " "

سورج میں تو خیر وقتی سرخی ہوتی بھی ہے لیکن چاند میں اس کے وجود کا کوئی احتمال نہیں اور دونوں کی اصل صفت نورانیت ہے۔ اس لئے "سرخیٔ رخسارِ معشوق" سے شمس و قمر کی خجالت کے لئے کوئی قرینہ نہ تھا۔ اور شعر شعریت کے تحت میں مطلق نہ آتا تھا۔ اور بعد اصلاح "بیشک "لالہ و گل کی بہار" نے ایک قرینہ پیدا کر دیا۔ اور "جو تماشائی" نے حسنِ محبوب کو عالمگیر بنا دیا اور ایک مہمل و لغو مجموعہ الفاظ ایک دلکش شعر بن گیا۔ بحر زبان سست۔ مذاق سنجیدہ۔ طرزِ بیان پاکیزہ۔ محاورے کی خوبی جدا۔ اور ان سب نے زمینِ شعر کو آسمان بنا دیا۔ کلمہ استفہام (کون) نے اور ایک خاص مستانہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ

چشم ترسے جو بجائے اشک (کے، ٹپکا تھا خون)
ہو گئے اک دم میں میرے سب درودیوار سرخ
چشم ترسے جو بجائے اشک (×) " (لہو)
" " " " " "

"بجائے اشک" کے ساتھ علامت اضافت (کے) لانا ایک فاش غلطی تھی "خون" یہاں کریہہ اور غیر فصیح تھا۔ اصلاح نے شعر کو ان عیوب سے پاک کر کے فصیح، برجستہ سلیس اور چست بنا دیا۔

غالباً مرزا صاحب نے اس شعر کو وقتِ اصلاح بخوبی نہیں دیکھا ورنہ "میرے درودیوار" کیا معنی؟

کل پلائی وہ شراب (وصل) مجھ کو یار نے
پیتے پیتے ہو گئی (جو) چشمِ میخوار سرخ
" " " (تند) " "
" " " (یہ) " " " "

"شرابِ وصل" میں ایک ابتذال اور عامیانہ پن تھا۔ پھر پیتے پیتے آنکھیں سرخ ہو جانے کے لئے کوئی خاص وجہ بھی نہ تھی "شراب تند" نے دراصل مصرعہ کو ایک سحر تاثیر والا بنا دیا اور بیحد جامعیت پیدا کر دی جس میں شرابِ وصل کا پہلو بھی موجود ہے۔ لفظ (جو) بالکل بے موقع تھا لیکن "یہ" نے ایک خاص خوبی پیدا کر دی۔ جس سے شعر میں ایک اثر، زور اور روانی بڑھ گئی شعر درجۂ رکاکت سے گزر کر حسن و خوبی کی منزل پہ جا پہنچا۔

قتل قاتل نے کیا جس وقت مجھ کو دوستا
(خون کی مانند اس کی) ہو گئی تلوار سرخ
" " " " "
(شاخِ گلبن کی طرح سے) " " "

قتل کرنے پر قاتل کی تلوار کے "خون کی طرح سُرخ ہو جاتے" ہیں کوئی ضرورت بیان نہیں کی اور یہ تشبیہ بھی ایک بھدی اور عامیانہ تشبیہ ہے "شاخِ گلبن" نے واقعی حُسنِ کلام کے خوب گل کھلائے ہیں اور لطفِ تشبیہ میں ایک خاص اور موثر اضافہ کر دیا۔

(عاشق ہو جاتے ہیں اک دم میں خجل) شمس قمر
دیکھتے ہیں اُس پری کے جبکہ وہ رخسار سُرخ
(منفعل ہوتے ہیں عاشق چرخ پر) شمس وقمر
دیکھتے ہیں اس پری کے جبکہ وہ رخسار سُرخ

شمس وقمر کی اک دم (بیک وقت) موجودگی، قیاس مع الفارق اگر سائل صاحب کا مطلب یہی تھا ورنہ پھر "اک دم میں" قطعی بیکار و غلط ہو جاتے ہیں" کا اس قدر تقدم اور شمس وقمر کا اسقدر فصل و تاخر بہت تھا اور ایک فنی نقص بھی تھی جسے "تعقید" کہتے ہیں "منفعل چرخ پر" بہت ہی واضح صاف اور سادہ اسلوبِ بیان ہے جس نے شعر کو الجھنوں سے نکال دیا پھر "چرخ" کے مقابلہ میں "زمیں" کی وقعت کا اندازہ کیجئے "ہو جاتے ہیں" کے ہم پایہ "ہوتے ہیں" کی سبکی اور ہمیشگی اور دوام پر نظر ڈالئے۔ درحقیقت اصلاح نے شعر کو بہت بلند کر دیا۔

(د)

ہو کے خوش (ہم نے) پڑھا اور لگایا (سر) سے
اُس نے بھیجا جو میرے واسطے لکھ کر کاغذ
ہوئے خوش (میں نے) پڑھا اور لگایا (دل) سے
اُس نے بھیجا جو میرے واسطے لکھ کر کاغذ

پہلے مصرعہ میں "ہم نے" اور دوسرے میں "میرے واسطے" اچھا خاصا شترگربہ تھا۔ جو نقائصِ کلام سے ہے پھر "ہم نے" میں "شاعرانہ" ناز اور "میں نے" میں "عاشقانہ نیاز" ہے ادھر خط کو "سر سے لگانے" میں کیا خاک بات تھی "دل سے لگانے" میں البتہ وہ دل کی دھڑکن اور بے چینی کا تعویذ بن گیا۔ دو لفظوں کے ردوبدل نے شعر میں جان ڈال اور عیوب وظاہری و باطنی سے پاک کر دیا۔

(وقت لکھنے کے مری جان جو ٹپکے آنسو
بن گیا صاف وہیں معدنِ گوہر کاغذ
(دمِ تحریر جو ٹپکے مری) ٹپکے تم نفسو
بن گیا صاف وہیں معدن گوہر کاغذ

"وقت لکھنے کے" کی گرانی و ثقالت اور "میری جان" کے چھچھورے پن نے شعر کی مٹی پلید کر دی تھی۔ "دمِ تحریر" کی سُبکی و لطافت "تم میں" کی پاکیزگی و معنویت اور "جو کچھ" کی وسعت نے شعر کو مجلا و مصفا کر کے لولوئے شاہوار بنا دیا۔

(س)

نجاؤ چاندنی میں (بر) لبِ بام
قمر چھٹ کر پڑے گا تھر تھرا کر
" " " (تم) " " " " " "

"بر لبِ بام" "لبِ دریا" کے کنارے سے کم نہ تھا ضمیر مخاطب کے اضافہ نے زور بھی پیدا کر دیا اور یہ عیب بھی جاتا رہا کہ جس کی وجہ سے شعر میں بھدا پن پیدا ہو گیا تھا۔

(الٰہی) عشق کی آتش نے افسوس
مجھے تو خاک کر ڈالا جلا کر
(کسی کے) عشق کی آتش نے افسوس
مجھے تو خاک کر ڈالا جلا کر

"الٰہی" دعا یا استعجاب کے موقع پر آتا ہے۔ یہاں بے محل تھا۔ "کسی کے عشق" نے پردے پردے میں دل تڑپا دیا اور شعر بہت ہی عالی پایہ ہو گیا۔

نہ ہو گی شاعری کیا اب بھی عاشق
جنابِ داغ (سے) اُستاد پاکر
نہ ہو گی شاعری کیا اب بھی عاشق
جنابِ داغ (سا) استاد پاکر

"سے" میں اعزاز ضرور مگر محاورے کے خلاف تھا "سا" نے عین محاورے کے مطابق شعر بنا دیا۔

(۲)

نہ جا میرے پہلو سے اے دل نکل کر
(تو) پچھتائے گا دیکھ پھر ہاتھ مَل کر
نہ جا میرے پہلو سے اے دل نکل کر
(کہ) پچھتائے گا دیکھ پھر ہاتھ مل کر

دونوں مصرعوں کو منشور و مسلسل کرنے میں "حرفِ بیان" (کہ) کی بہر حال ضرورت پیش آتی اور ایسی صورت میں اس کو محذوف مان کر نمایاں کرتے تو بھدا پن بدرجۂ مد ہوتا لیکن حضرت فصیح الملک بہادر مرحوم نے "تو" کو "کہ" سے بدل دیا کہ اس کے حذف سے وہ صنعت بہتر اور شعر کو سبک بنانے والا تھا۔ اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ شعر میں "کہ" نے کتنی خوبی

پیدا کر دی۔

(کسی کے آپ دھوکے نہ رہنا)
میں ہوں سخت جاں قتل کرنا سنبھل کر
(یہ نازک کلائی کہیں دکھ نہ جائے)
میں ہوں سخت جاں قتل کرنا سنبھل کر

پہلا مصرعہ حقیقت تو یہ ہے کہ گنوار کا لٹھ تھا یا سنگِ خارا کی چٹان بھرہ "قتل کرنا سنبھل کر" کے لئے کوئی خاص پہلو نہ تھا۔ اب مصرعہ کے تغیر نے دل کی مخصوص کسک معشوق کی نزاکت اور عاشق کی سخت جانی کا ایک عالم برپا کر دیا کہ جس سے ہر شخص کا دل بیساختہ ہو کر واہ واہ واہ !!! کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(خدا خیر کرنا جگر اور دل کی) مجھے دیکھتے ہیں وہ تیور بدل کر
(الٰہی رہے خیر دل کی جگر کی) مجھے دیکھتے ہیں وہ تیور بدل کر

"خدا خیر کرنا" زبان نہیں۔ یہاں "خدا" کے بعد "حرف ندا" اور فعل واحد (کیجیو) کا لانا ضروری تھا۔ تاہم یہ مصرعہ "مصرعہ تو کچھ نہیں ہے فقط ٹھونس ٹھانس ہے" کا ہی مصداق رہتا اور دوسرے مصرعے کی بے ساختگی و لطافت کا کسی طور سے مقابلہ نہ کر سکتا۔ اب استاد مرحوم نے جو مصرعہ لگایا اس کے کیا کہنے ہیں کہ جس سے شعر میں وہ بانکپن پیدا ہو گیا کہ باید و شاید صرف ایک لفظ "خدا" کے تبدل اور دوسرے لفظوں کی الٹ پھیر نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُدھر کسی کے تیور بدلے اور اِدھر کوئی کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دعائیں مانگنے لگا۔

(۳) ۲۰ ۹/۵ ۹ء

(اے صنم! ترشربتِ دیدار سے میرا جگر
توکبھی کرتا نہیں، کرتا ہے تو اقرار روز)
(وعدۂ دیدار سے آنکھیں ترستی ہیں مری
مجھ سے تو کرتا ہے جھوٹا اے صنم اقرار روز)

"جگر تر کرنا" محاورہ نہیں "جگر ٹھنڈا کرنا" البتہ محاورہ ہے "کرتا نہیں" اور (کرتا ہے روز) یہ نفی و اثبات کا قرب فعل (کرتا نہیں) سے مفعول (تر) کی اتنی دوری، بندش کی سستی اور ترکیب و محاورہ کی خرابی یہ تو سقم، عیب ظاہری جن میں معنًا بھی کوئی لطافت نہ تھی اُستاد مرحوم کی اصلاح کے تغیر نے الفاظ کے ساتھ معانی بھی پر لطف کر دیئے "وعدۂ دیدار" کر کے ایفا نہ کرنا عاشق کو جس اُلجھن، حسرت و یاس کا اور معشوق کی جس سنگدلی، بیوفائی و بے التفاتی کا مرقع پیش کرتا ہے۔ وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

دل فدا ہم کر چکے اور جان دے سے منکر نہیں
تو بھی ناخوش ہم سے رہتا ہے ہمارا یار روز
دل فدا ہم کر چکے اور جان (ابھی دینے کو ہیں)
تو بھی ناخوش ہم سے رہتا ہے ہمارا یار روز

"جان سے منکر نہیں" میں صفائی اور فصاحت نہیں بلکہ ثقل، گرانی اور اُلجھن ہے۔ "ابھی" کی تاکید زورِ کلام اور اولوالعزمی عشق پیدا کرتی، عالی ہمتی کی تصویر کھینچتی ہے اور "دینے کو" کی اصلاح نے شعر کی روانی اور صفائی کو بڑھایا ہی نہیں بلکہ کانِ فصاحت بنا دیا ہے۔ جس سے شعر میں ایک ایک خوبی پیدا ہو گئی۔

خوب پیتے ہیں شرابِ وصل بزمِ یار میں
مست رہتی ہے ہماری چشم (دریا بار) روز
خوب پیتے ہیں شرابِ وصل بزمِ یار میں
مست رہتی ہے ہماری چشم (نرگس وار) روز

چشمِ دریا بار کو مستی سے کوئی واسطہ نہیں لیکن استاد مرحوم نے "صفت" کو تبدیل کر کے "نرگس وار" کی تشبیہ کا مستی کے ساتھ علاقہ پیدا کر دیا۔

کیا کروں عاقلی! مجھے دھوکا شبِ دیجور کا
دید یا کرتی ہے (مجھکو کاکلِ خمدار) روز
کیا کروں عاقلی! مجھے دھوکا شبِ دیجور کا
دید یا کرتی ہے (وہ زلفِ سیاہ ہر بار) روز

کاکل کی صفت "خمدار" نہیں آتی اور "کاکلِ خمدار" "زلفِ پیچ پیچ" کو "شبِ دیجور" سے کوئی مناسبت نہیں۔ استاد نے "زلفِ سیاہ" سے "شبِ دیجور" کے ساتھ تشبیہ قائم کی اور "ہر بار" نے "زلفِ سیاہ" کی پرکاری دیکھیے

کی تصویر کھینچ دی، پھر پہلے مصرعہ میں "مجھے" اور دوسرے میں "مجھکو" کی تکرار برگزشتہ کیفیت بھی جاتی رہی۔

(۴)

۱۹ر شوال سنہ ندارد ڈاکخانہ کی مہر میں بھی صاف نہیں
(اصلاح تعلیم تشنہ بلند شہری)

پھوٹی قسمت کے بہت (آن) ملیں گے تجھکو
میری تربت پہ نہ رو لے شبِ ہجراں ہرگز
پھوٹی قسمت کے بہت (لوگ) ملیں گے تجھکو
میری تربت پہ نہ رو لے شبِ ہجراں ہرگز

اس شعر پر نواب فصیح الملک بہادر مرحوم نے یہ ریمارک دیا ہے۔ "آن متروک" لفظ "لوگ" نے علاوہ صفائی زبان کے ایک عجیب حسرت، جامعیت، وضاحت و فصاحت شعر میں پیدا کر دی ہے۔

ہجر میں جان بھی جائے تو نہیں غم مجھ کو
(کیونکہ) عاشق نہیں ہوتے ہیں پریشاں ہرگز
ہجر میں جان بھی جائے تو نہیں غم مجھ کو
(غم میں) عاشق نہیں ہوتے ہیں پریشاں ہرگز

حرف علت (کیونکہ) کے اظہار کے مقابلہ میں اس کا مقدر کرنا ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اور کلام میں زور پیدا ہوتا تھا اس لئے قلم سے کاٹا گیا اور "غم میں" کے ٹکڑے نے جان سے بیزاری، بے نیازی اور عاشقانہ عالی ہمتی کی روح پھونک دی۔ اور حسن و عشق کے اس نازک و لطیف مسئلہ کی جانب اشارہ کر دیا کہ حقیقی عاشق کو غم محبوب سے پریشان ... جا سکے ... لِ محبوب ہی عشرتیں اس کے لئے صعب ترین ہوتی ہیں۔

سخت جاں ہوں تو مجھے قتل سنبھل کر کرنا
(تاکہ) شمشیر میں الجھے نہ رگِ جاں ہرگز
سخت جاں ہوں تو مجھے قتل سنبھل کر کرنا
(دیکھو) شمشیر میں الجھے نہ رگِ جاں ہرگز

"تاکہ" کی کیفیت اس شعر میں بھی شعر بالا کے "کیونکہ" کی سی تھی اس لئے وہی عمل کیا گیا۔ "دیکھو" کے انتباہ نے

خوبی کے ساتھ دردِ دل جھلکا دیا۔ اور "نظر ترحم" کی بڑی لطافت سے خواستگاری کی سبحان اللہ!! استاد مرحوم کی اصلاح نے عجیب طور پر انتباہ دیا کہ جو وصل محبوب کے لئے راستہ صاف کرتا چلا گیا۔

(آپ کی بزم کی دیکھیں کبھی) پریاں جو بہار
پھر نہ ہو مدِ نظر اُن کو پرستاں ہرگز
(آکے محفل کی کبھی دیکھ لیں) پریاں جو بہار
پھر نہ ہو مدِ نظر اُن کو پرستاں ہرگز
"تیری" محفل کی کبھی دیکھ لیں) پریاں جو بہار
پھر نہ ہو مدِ نظر اُن کو پرستاں ہرگز

اُستاد مرحوم نے اس شعر پر دو اصلاحیں کی ہیں۔ پہلے "آکے ..... دیکھ لیں" اور اس کے بعد "آکے" کو کاٹ کر "تیری" لکھا گیا ہے گویا کہ نواب مرزا داغ صاحب مرحوم کی رائے میں مصرع دراصل یہ ہونا چاہئے۔

"تیری محفل کی کبھی دیکھ لیں پریاں جو بہار"

"آپ" کے تکلف کو تو "تیری" سے برطرف کیا گیا "بزم" کے مقابلہ میں "محفل" پرستاں کے لئے زیادہ مناسب لفظ تھا۔ کیونکہ پرستاں کی خاص چیز "رقص و سرود" ہے جس کے لئے راجہ اندر کا اکھاڑہ شہرت خاص رکھتا ہے اور ناچ رنگ یا رقص و سرود کے ساتھ لفظ "محفل" ہی استعمال کرتے ہیں "دیکھیں" کی بجائے "دیکھ لیں" (فعل مفاجاتی) کی ناگہانی و اتفاقیہ کیفیات اور محض ذرا سے رد و بدل نے شعر کو شعر بنا دیا۔

(۵)

۲۷ ۹۹ ء
تیری آمد کی انتظاری میں　　دلِ عاشق ہے بے قرار افسوس

یہ ریمارک لکھ کر اس مقطع کو چھوڑ دیا ہے "انتظاری بمعنی انتظار غلط ہے" اور مطلب یہ ہوگا کہ طبیعت پر زور دیکر خود ہی درست کر دیا۔ دوسرا مقطع کہو۔

ہائے افسوس صد ہزار افسوس　　وقت رخصت ملا نہ یار افسوس

پہلے مصرعہ پر "م" اور دوسرے پر "خ" بنا دیا ہے جس سے بظاہر "مقدم" و "موخر" سمجھ میں آتا ہے اور غور کیا جائے تو اس طرح شعر کا زور بھی بڑھ جاتا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

آشم مرزا

آئینے کا جھوٹ

آئینہ کے سامنے وہ کتنی ہی دیر سے کھڑی تھی اس کی نظریں اپنے ہی سراپا کے آرپار ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر نقش ہوشربا دکھائی دے رہا تھا۔ ہر زاویہ دیدہ زیب بن گیا تھا۔ اپنی اہمیت کا احساس اس کی روح کی گہرائیوں میں مدہوش کن نغمہ کی تخلیق کر رہا تھا۔ اپنے وہم کو یقین میں بدلنے کی خاطر اس کا جی آئینہ کے سامنے سے ہٹنے کو نہ چاہ رہا تھا، بیگم ریحانہ اشفاق کی آواز دور دھندلکوں میں روشنی کی کرن بن کر ابھری اور وہ خود کو سمیٹتے ہوئے جواد کے کمرے سے نکل کر بیگم ریحانہ کے پاس آ گئی ... بیگم ریحانہ نے اس کا بھرپور جائزہ لیا اور معنی خیز تبسم اس کے ہونٹوں پر ابھر آیا اس نے ساڑی کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔

"شاذی، کھانے کی میز پر تمہارا انتظار ہو رہا ہے میں مسز احسان کے پاس جا رہی ہوں۔ کھانا وہیں کھاؤں گی۔"

اس کا جی چاہا۔ کہ وفور مسرت سے ناچنے لگے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا۔ جذبات کی تند لہریں شعور کی سرحدوں کو ڈھانپ رہی تھیں۔ نظریں جھکائے وہ ڈائننگ روم کی طرف قدم اٹھانے لگی " تو۔ اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ میری حیثیت اب ایک ملازمہ کی نہیں رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوں۔ بیگم صاحبہ کی چاہت۔ ہر روز نیا رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ میں تو ان کی برابری کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔"

جواد کے سامنے کھانوں کی ڈشیں پڑی تھیں۔ اور وہ دروازہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ شاذی کو دیکھ کر وہ کھل اٹھا "میں نے کہا تھا کہ کھانا سب ایک ساتھ کھایا کریں گے۔ مگر تم نے اسے مذاق ہی سمجھا ہے" اس کے لہجہ میں نسوانیت کا رچاؤ تھا۔ شاذی اس کے قریب آکر حیرت اور خوشی کے ملے جلے لہجہ میں بولی "چھوٹے صاحب میں ایک ملازمہ ہوں۔ آپ کے برابر کیسے بیٹھ سکتی ہوں" "بھلا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ اس نے آنکھ مٹکاتے ہوئے کہا " ممی کی طرف سے جب اجازت مل چکی ہے۔ تو پھر ....."

شاذی نے بات کاٹ کر کہا " آپ کھانا تناول فرمائیں میں خدمت کروں گی۔" جواد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا " ہم اکیلے نہیں کھائیں گے" شاذی اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی " چھوٹے صاحب! میں اپنی حیثیت کو پہچانتی ہوں" جواد نے مچلتے ہوئے بازو اس کے شانے پر رکھ دیئے "ہم ناراض ہو جائیں گے" "جیسے آپ کی مرضی۔ ملازم کا کام حکم ماننا ہے۔" کھانے سے فارغ ہو کر جواد نے کہا " ہم تمہارے ساتھ فلم دیکھنے جائیں گے۔ ممی دیر سے آئے گی۔"

شاذی کی آنکھوں میں اپنی آمد کے پہلے دن کی کارروائی ستاروں کی طرح ابھرنے لگی۔ میں اس وقت تو یہی سمجھی تھی کہ جواد کوئی ننھا منا لڑکا ہوگا۔ کیونکہ اس کی نگہداشت کے لئے ہی تو مجھے ملازم رکھا گیا تھا اور جب جواد پر پہلی نظر پڑی تو استعجاب کے دائرے حواس کے گرد اپنا حلقہ تنگ کرنے لگے یقین نہ آتا تھا کہ جواد میں کون سی کمی ہے۔ جس کو دور کرنے کی خاطر مجھے پانچ سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھا گیا تھا۔ میں تو اس سے بات کرتے ہوئے جھینپ جاتی تھی۔ کوئی کام بھی میرے سپرد نہ کیا گیا تھا بیگم صاحبہ کی یہی کوشش ہوتی تھی میں زیادہ دیر تک جواد کے قریب ہی رہوں۔ اسے اداس نہ ہونے دوں۔ یہ منطق تو میری سمجھ سے بعید تھی۔ اور اب تو بات یہاں تک آ گئی ہے کہ بغیر میرے وہ اب لقمہ تک نہیں اٹھاتا۔

جواد نے نخریلے انداز میں حکم دیا " نیا لباس پہن لو وقت کم ہے میک اپ پر زیادہ وقت صرف مت کرنا" استعجاب کے دائرے شاذی کی آنکھوں میں اور گہرے ہو گئے۔ اس کے لہجہ میں عجیب سی چاشنی پیدا ہو گئی ہے جیسے تنگ گلی میں گزرتے ہوئے مسحور کن خوشبو کی شریر لہر ایک ہی لمحہ میں زندگی

کے ہر گوشہ میں پھیل جائے۔ کیا میری ملازمت کا مقصد یہ تو نہیں کہ .... اور ان جانی لذت کی گرانباری سے اس کی ذات کے خول پر خود بخود سنہری بیل بوٹے بننے لگے تھے۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں رنگین تتلیوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ خالہ صوفیہ بیگم ہی نے مجھے اس ملازمت کا مژدہ سنایا تھا۔ لیکن ریحانہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے انھوں ہی نے اس ملازمت پر اکسایا تھا۔ درمیانے طبقہ کی بیوہ عورت کے نزدیک پانچ سو روپوں کی بڑی وقعت تھی۔ خالہ صوفیہ سے پہلے تو بڑے قریبی تعلقات تھے۔ پھر ان کے شوہر درآمد برآمد کے کاروبار میں اتنا منافع کمانے لگے کہ خالہ ہم سے دور ہونے لگیں۔ کاروبار میں وسعت پیدا ہوئی اپنے سے کم تر رشتہ داروں کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ابا جان کی وفات پر بھی وہ تعزیت کے لئے نہ آسکی تھیں۔ کئی سال گزر گئے ابا جان کی انشورنس کی جو رقم ملی تھی۔ اسی پر گذارا چل رہا تھا میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا تو ایک دن اچانک امی سے خالہ صوفیہ کی ملاقات ہوگئی۔ ایک تقریب میں خالہ مہمانِ خصوصی تھیں ایک رفاہی ادارے کا افتتاح ہو رہا تھا۔ خالہ اب بہت بڑی سوشل لیڈر بن چکی تھیں۔ اس اجلاس کے اختتام پر امی سے نہ رہا گیا۔ وہ خود ان کے سامنے آگئی تھیں۔ میں بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ خالہ پہلے تو بغور ہمارا مطالعہ کرتی رہیں پھر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ "ارے! نعیمہ یہ تم ہو۔ خدا کی قسم۔ آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ امی نے میرا تعارف کرایا۔ تو وہ حیران کن لہجہ میں بولیں۔ " اچھا! یہ وہی ننھی شاذیہ ہے جو خود بخود میرے گود میں آجایا کرتی تھی" مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک مجھے قطعی طور پر خیال نہ گذرا تھا کہ واقعی میں بہت حسین ہوں دو چار ملاقاتوں ہی میں خالہ یوں پیش آتی رہی تھیں۔ جیسے ان سے بڑھ کر اس دنیا میں ہمارا اور کوئی ہمدرد نہ ہو۔ اور پھر جب انھوں نے ملازمت کا مژدہ سنایا تو امی کا رواں رواں جھوم اٹھا تھا۔ مجھے اگرچہ ان کی اس ہمدردی نے متاثر نہ کیا تھا مگر امی تو مجھے ہر حال میں ریحانہ کی کوٹھی میں بھیجنے پر بضد تھیں

خالہ کی سفارش تھی اس لئے بیگم ریحانہ بڑے تپاک سے ملی تھیں ان کا برتاؤ مشفقانہ تھا۔ اور اب وہ ایسا کردار ادا کر رہی ہیں جیسے انھوں نے جواد کے لئے میرا انتخاب کر لیا ہو۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ خالہ صوفیہ سے بھی زیادہ بیگم ریحانہ مالدار ہے شوہر کی وفات کے بعد کاروبار اس کے کنٹرول میں ہے۔ جواد اس معاملہ میں نااہل ثابت ہوا ہے۔ جواد نے دروازہ کا ایک پٹ زور سے کھول کر کہا " ذرا جلدی کرو۔ فلم انٹرول کے بعد شروع ہو گی۔ وقت بہت کم ہے۔"

نیلے رنگ کی قمیص اور زرد رنگ کی جینز میں اس کا حسن تابناک بن گیا تھا۔ جواد تو اسے دیکھ کر ساکت ہو کر رہ گیا تھا شاذیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک سا پڑا اس رات شادی کے خوابوں میں خوشبوؤں اور رنگوں کا میلا لگا رہا تھا سب مناظر اس کی توقع کے برعکس سامنے آ رہے تھے۔ خالہ صوفیہ جب بھی بیگم ریحانہ سے ملاقات کے لئے آتیں۔ شاذیہ کی کارکردگی کی یوں تعریف کیا کرتیں۔ جیسے اس نے جان جوکھوں میں ڈال کر خالہ کو کسی خفیہ خزانے کے دروازے تک پہنچا دیا ہو شاذیہ کے یقین میں پختگی پیدا ہوتی جا رہی تھی کہ ملازمت کا تو صرف بہانہ ہے۔ ورنہ انھوں نے تو یقیناً اسے جواد کے لئے منتخب کر لیا ہے .... وہ زیادہ لگن اور محبت کے ساتھ جواد کو زندگی گزارنے کے گر سکھانے لگی تھی پہلے وہ بے حد شرمیلا اور ڈرپوک تھا۔ اور اب وہ خود اعتمادی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا تھا.... اپنی دونوں ملوں کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔ شاذیہ اس کا سایہ بن چکی تھی۔ دلفریب مسحور کن سایہ۔

تین ماہ بعد جواد کی بڑی بہن طلعت سسرال سے آگئی شاذیہ سے مل کر اس نے اسے یوں سینے سے لگا لیا تھا۔ جیسے دو پیاری سہیلیاں طویل جدائی کے بعد ملی ہوں۔ جواد کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے کر اس نے شاذیہ کے فنکارانہ رویہ کی بے حد تعریف کی تھی۔ اس کا تین سال کا بیٹا تحسین تو دو ہی دن میں اس سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ گھر کے سب افراد شاذیہ کے اور زیادہ گرویدہ ہو گئے تھے۔ جواد کی سالگرہ کے موقع پر کوٹھی کو دلہن کے مانند سجایا گیا۔ ہال کمرہ میں پلاسٹک

کی بیلیں اور پھول چھت کو ڈھانپ رہے تھے۔ ان کے ساتھ رنگین کاغذ کی فانوس اور غبارے بندھے ہوئے جھوم رہے تھے۔ شاذیہ نے بڑا شوخ لباس پہن رکھا تھا۔ ہر ایک کی نظریں اس کا طواف کر رہی تھیں۔ خالہ صوفیہ کی سج دھج بھی فتنہ پرور تھی بڑے کیک پر روشن موم بتیوں کو پھونکیں مار کر سبھی مہمان ہیپی برتھ ڈے، ٹو، یو گانے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں۔ شاذیہ اپنے اندر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ جواد کی سالگرہ کی تقریب نہ ہو۔ بلکہ اس کی سگائی کا اعلان ہوا ہو۔ بہت دیر تک ہنگامہ بپا رہا۔ مہمان رخصت ہونے لگے جواد شاذیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر جھومتا ہوا باہر لان میں آگیا جواد نے بید کی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "میں تو بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ کھا بھی نہ سکا۔ پیاس محسوس ہو رہی ہے۔" "میں ابھی مٹھائی اور کوک لے آتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا اپنے لئے بھی لیتی آؤ۔" شاذیہ کوٹھی میں داخل ہوئی ڈرائنگ روم میں خالہ صوفیہ کا قہقہہ اچھلا۔ اور شاذیہ کے قدم رک گئے۔ بیگم ریحانہ نے مسرورانہ لہجہ میں کہا۔ "صوفیہ۔ ڈارلنگ میں تمہاری بے حد ممنون ہوں،" شاذیہ دروازہ پر آ گئی طلعت نے کہا "میں نے ہی ممی کو مجبور کیا تھا۔ جواد بے چارا ڈیپار کی وجہ سے اس قابل نہ رہا کہ کاروبار پر توجہ دے سکے شادی کے فرائض نبھا سکے۔" خالہ صوفیہ بولی "میرا انتخاب کیسا رہا میں شاذیہ کی صلاحیتوں کی معترف تھی۔ میرا کام تو اب ختم ہوا" بیگم ریحانہ نے کہا۔ "میں شاذی کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ انعام کے طور پر اسے پانچ ہزار روپے دیئے جائیں گے۔" طلعت بولی۔ "اب سیٹھ ایاز کی بیٹی کا رشتہ منظور کر لینا چاہیئے۔" شاذیہ کے ٹانگوں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ اور آنکھوں میں اندھیرا اچھل گیا۔ تو۔ کیا! میں صرف کھلونا تھی! "چیخ کو حلق میں دبا کر وہ باہر نکلی اور آنسو رخساروں پر لکیریں بنانے لگے۔ سارے جذبے منجمد ہو گئے تھے۔ نہیں مجھے انعام کی ضرورت نہیں اسے یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف پتھر برسنے لگے ہوں۔ بازوؤں سے سر کو ڈھانک کر وہ دوسری طرف بڑھ گئی بیکراں بھاگنے لگی جواد شاذی کی طرف دیکھے مٹھائی کا انتظار کر رہا تھا۔

(ماہ نو)

من کہ مکتوب الیہ

سہیل عظیم آبادی، نور منزل، سلطان گنج۔ پٹنہ بہار

برادرم سرور۔ محبت اور سلام

"شان ہند" پابندی کے ساتھ مل رہا ہے اور میں پابندی کے ساتھ ایک ایک لفظ پڑھتا ہوں اور لطف اندوز ہوتا ہوں۔ شان ہند کی اپنی ایک شان ہے۔ خاص کر تمہارے مضامین بے حد شوق سے پڑھتا ہوں۔ تمہارے دل و دماغ کی صفائی سے روشنی ملتی ہے۔ اور تم کو اپنے آپ سے بے حد قریب پاتا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس عظیم ملک میں ایک تو ہندوستانی ہے۔ کاش اس ملک کا ہر باشندہ ہم دونوں کی طرح سوچتا ہندو ہوتا یا مسلمان، لیکن پہلے خود کو ہندوستانی کہتا اور محسوس کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہمیں یہ دن نہیں دیکھنے پڑتے۔

اس شمارے میں تم نے تونسہ شریف کے پیر نظام الدین کا جن لفظوں میں ذکر کیا ہے اسے پڑھ کر اپنی روح میں نئی تقویت اور بالیدگی محسوس کی اگر اس ملک میں جہاں کروڑوں آباد ہیں، چند ہزار پیر نظام الدین اور ماسٹر ڈھالو رام ہوتے تو ملک تقسیم نہ ہوتا اور آج ہندوستان کچھ اور ہوتا ؎

خدا رحمت کند ایں بندگان نیک طینت را

برادرم رام لال کا خط پڑھا۔ کام کی باتیں انھوں نے کہی ہیں انھوں نے جس مستعدی اور حوصلے کے ساتھ اُردو کی حمایت میں آواز بلند کی تھی، اور غیر مسلم ادیبوں کی کانفرنس بلا کر متعصب اور اُردو دشمن افراد کو خوبصورت جواب دیا تھا اس کی یاد اب تک زندہ ہے۔ میں رام لال کی اردو دوستی کا صرف قائل ہی نہیں بلکہ مداح بھی ہوں شاید وہ پھر ایسی کانفرنس بلانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ خدا انھیں کامیاب بنائے۔ آمین۔ میں اس دن کا انتظار کروں گا۔ جب یہ کانفرنس ہو۔ جی تو بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے۔ لیکن مجبوری ہے۔ ڈاکٹر کی تاکید ہے کہ ابھی آنکھوں سے زیادہ کام نہ لوں۔ میں نے ہم رفرمانکو موتیا بند کے لئے دائیں آنکھ کا آپریشن کرایا ہے۔ امید ہے کہ ہم ہفتے کو عینک کے لئے نمبر مل جائے گا۔ پھر لکھنا پڑھنا شروع ہوگا ابھی بہت کم پڑھتا لکھتا ہوں۔

خدا تمہیں مع متعلقین بخیر رکھے

مخلص ... سہیل

تنہائی کی ساتھی کتابیں ہوتی ہیں
سچی یونیورسٹی لائبریری ہوتی ہے
اس کے لئے عوامی
لائبریری
دیال سنگھ پبلک لائبریری
میں ہر قسم کی کتابیں
موجود ہیں۔
اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں ہر موضوع پر ذوق مطالعہ کی سیری کے لئے بغیر کسی نقد معاوضہ کے آپ ہر صبح دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک اپنی پسند کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اخبار، ماہنامے اور ہفت روزے بھی ہیں۔
اتوار اور دوسری تعطیلات کو لائبریری بند رہتی ہے

گوشۂ عقیل صدیقی

(پاکستانی رسائل سے اخذ کئے گئے ادبی شہ پارے)

ایک چینی کہانی

چمپون

ترجمہ :۔ نصر اللہ گیلانہ

یہ نوجوان مریض اس سپیشل وارڈ میں بنایا گیا تھا۔ عمر بھی کوئی چھبیس ستائیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ لمبے قد کا ایک خوبصورت نوجوان تھا جس کے چہرے سے ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ جب ہم اُس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے بڑی شائستگی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اُس کی طرزِ گفتار سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی مہذب سوسائٹی سے تعلق رکھ چکا ہے۔ رسمی تعارف کے بعد نہ جانے اس کی نگاہیں میرے چہرے پر کیوں گڑ گئیں۔ اس وقت کمرے میں مکمل سکوت تھا اور اس کی معنی خیز خاموشی سے میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ چنانچہ میں نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا "میرے خیال میں آپ نے زندگی کا کچھ عرصہ ہانگ کانگ میں بسر کیا ہے؟"

"کچھ زیادہ عرصہ نہیں۔ البتہ یانگ ناگا میں "ائی میانگ" کے مقام پر میں نے کافی عرصہ گزارا ہے۔"

"ائی میانگ بہت سے معدنی اضلاع کا صدر مقام ہے۔ اور ایک آدمی کے وہاں پر مصروفیت کے کافی مشاغل میسر ہیں۔ اس جگہ پر آپ کا وقت یقیناً خوب گزرا ہوگا۔"

"بالکل نہیں! بلکہ یہ جگہ تو میرے لئے جہنم کدہ ثابت ہوئی۔"

میں اس کے اس غیر متوقع جواب پر چونک پڑا: "وہ کیسے؟ کیا اس جگہ آپ کو کوئی خاص واقعہ پیش آیا۔"

"بد چالی اور دہشت ہے ایک انسان کے بھلا دینے کے لئے زرخیز و خوبرو عورتیں ہیں۔ شراب بکثرت مل جاتی ہے۔ اور جوئے بازی کے بے شمار اڈے ہیں لیکن اس کے برعکس ائی میانگ میں چمپون ہیں۔ گرجے ہیں اور فولادی زنجیریں ہیں۔"

"کیا مطلب؟ چمپون، گرجوں اور فولادی اور فولادی زنجیروں کو اس مقام سے کوئی خاص مناسبت ہے؟"

ابھی یہ وہ چُپ سا ہو گیا۔ بالآخر میرے استفسار پر وہ اپنی داستان بیان کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس دوران میں اس کا چہرہ جذبات سے یکسر خالی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دور خلا میں یوں جمی ہوئی تھیں گویا اسی کو تک رہی ہیں۔ اُس کے اکتائے ہوئے اندازِ بیان سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یہ داستان بار بار بیان کر کے تھک چکا ہے۔ وہ دورانِ گفتگو کبھی کبھی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اس کا سانس بار بار پھول جاتا۔ اس نے داستان کا آغاز اس طرح کیا۔

"میرا باپ یانگ ناگا کا گورنر تھا۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہانگ کانگ کے ایک اعلیٰ اور جدید قسم کے سکول میں داخل کرایا گیا۔ جہاں میں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ جب میں سولہ برس کو پہنچا تو کچھ آزاد سا ہو گیا اور میرا دل عیش و عشرت کی طرف مائل ہونے لگا۔ جس کی خبر میرے باپ کو بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ انھوں نے بذریعہ تار مجھے جلد واپس چلے آنے کا حکم دیا۔ واپسی پر مجھے چیانگ کے ایک سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ چیانگ آنے کے پانچ سال بعد میں تعلیم سے فارغ ہو گیا ان ہی دنوں میرے والد ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بہت پہلے سے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم نے خود غیر ملکی معاشی تسلط سے آزاد ہونے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئیے۔ میرے متعلق ان کی دلی خواہش تھی کہ میں ملازمت اختیار کرنے کے بجائے کوئی کاروبار شروع کروں۔ میں بھی ان کے اس خیال سے متفق تھا۔ جب میرے والد ریٹائر ہو کر واپس ہانگ کانگ چلے آئے تو اس کے کچھ ہی عرصہ بعد مجھے چند مجبوریوں کی بنا پر ان سے علیحدہ ہونا پڑا۔ انہی دنوں میں نے یانگ ناگا میں معدنیات کی ایک آئرن تیل کمپنی میں ملازمت کر لی چونکہ میں طلائی ہر لعین۔ جیلام، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بخوبی بول سکتا تھا اس لئے کمپنی میں میری بڑی عزت و قدر تھی۔ میری تنخواہ ایک معقول رقم تھی اور یہ ایک ایسی رقم تھی جو ہانگ کانگ میں اپنے باپ کے خواب میں کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں صرف دو برس تک اس کمپنی سے منسلک رہا۔ ان ہی دنوں ائی میانگ کے قریب ہی ایک امریکن کمپنی جس کا نام "دی یونین گولڈ مائننگ کارپوریشن" تھا کھل گئی۔ کمپنی والوں کو ایک

ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس کے ایشیائی مزدوروں کی نگرانی کر سکے نیز سرکاری حکام سے بھی رابطہ رکھ سکے۔ میں نے اس آسامی کے لئے درخواست دے دی اور مجھے ملازمت مل گئی۔ چار سو باہٹ ماہانہ میری تنخواہ مقرر ہوئی۔ کمپنی کے منیجر نے ایک ہفتہ بعد مجھے مارکیٹنگ منیجر مقرر کر دیا۔ یعنی میں کمپنی کی تمام عمارات اور ٹھیکوں وغیرہ کا انتظام بھی اپنے ہاتھوں میں لے لوں۔ جلد ہی میری تنخواہ چار سو باہٹ ماہانہ سے بڑھا کر آٹھ سو باہٹ کر دی گئی۔

مجھ جیسے اکیلے آدمی کے لئے یہ ایک کثیر تنخواہ تھی لیکن حالت یہ تھی کہ مہینہ کے آخری دنوں میں، میں بالکل تہی دست ہو چکا ہوتا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ علاقہ کی تمام برائیاں اور عیوب میرے اندر پیدا ہو چکے تھے جس سے میری شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ جہاں کہیں خوبصورت عورتوں اور شراب، جوئے کی محفلوں کا انتظام ہوتا، میں ان سب محفلوں میں پیش پیش ہوتا۔ سوسائٹی میں ہر موقع اور ہر مقام پر سب سے آگے رہنے کی کوشش کرتا۔ میری خودستائی اور غرور کا یہ حال تھا کہ اس معاملہ میں کسی کو اپنے سے اونچا دیکھنا میری برداشت سے باہر تھا۔ میں ہر محفل اور ہر بزم عیش و عشرت کا روحِ رواں تھا۔ خواہ یہ محفل تھائی ہوتی یا غیر ملکی، میں ہر جگہ موجود ہوتا۔ میری جیبوں کے منہ ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ غرض اس طرح میں دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہا تھا۔ میرے وقت کا بیشتر حصہ تھائی میانگ کے شبینہ کلبوں اور قحبہ خانوں میں بسر ہوتا۔" یہ کہتے کہتے مریض تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ جیسے اپنے دلفریب ماضی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

" دریا کے اس کنارے جہاں پر ہماری کمپنی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ تھائی میانگ کو دو راستے جاتے تھے۔ ایک راستہ وہ تھا جو قریبی ندی کے اوپر سے کشتی کے ذریعے کرنا پڑتا تھا دوسرے کنارے پہنچ کر سامنے "تاکو آپاسنگما پرو روڈ" آ جاتی تھی۔ وہاں سے بس پکڑنا پڑتی تھی جو پچھلے گھاٹ سے ہوتی ہوئی تائی میانگ پہنچاتی تھی۔ اس راستہ میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ پہلے پانچ گھنٹے کشتی کا کٹھن اور اکتا دینے والا سفر ہوتا۔ پھر کنارے پہنچ کر بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ تائی میانگ کے لئے بس بھی مل جائے گی یا نہیں، کیونکہ بعض اوقات بس کے آنے کا طویل انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دوسرا راستہ تین گھنٹے کا تھا۔ پہلے کشتی میں سوار ہو کر دریا کے آخری سرے تک جانا پڑتا تھا اور پھر جہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا وہاں سے دریا عبور کرنا پڑتا تھا۔ اس سے آگے جنگل پڑتا تھا جنگل کو عبور کرنے کے بعد تائی میانگ آتا تھا۔ اس راستے پر سفر کرنا انتہا خطرناک تھا جنگل کے تمام راستوں سے واقف آدمی ہی اسے عبور کر سکتا تھا ورنہ انجان آدمی کے راستہ بھول جانے کا خدشہ تھا۔

خطرناک بات یہ تھی کہ دریا کا کنارہ قریب ہونے کی وجہ سے یہ جنگل خونخوار مگرمچھوں کا مسکن تھا۔ ان جیسے خونخوار مگرمچھ، میں نے زندگی بھر نہیں دیکھے۔ جن دنوں میرا بیسنا کا رن مرتیمارانج کے قصبہ کا گورنر تھا ہم لوگ اکثر وہاں سے قریبی ضلع پاک پایو میں مگرمچھوں کے شکار کو جاتے تھے۔ پاک پایو کا علاقہ مگرمچھوں کی کثرت کی وجہ سے بہت مشہور تھا لیکن دریا کا وہ کنارہ جہاں ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا وہ اس لحاظ سے پاک پایو کو بھی مات کرتا تھا۔ یہاں یہ حال تھا کہ اکثر اوقات مگرمچھ کشتی میں سفر کرتے ہوئے آدمیوں پر کود پڑتے۔

جب کبھی مجھے دریا کا سفر کرنا ہوتا تو میں کمپنی کی مضبوط کشتی استعمال کرتا تھا۔ مجھے ایک آدھ مرتبہ جنگل کو بھی عبور کرنے کا اتفاق ہوا۔ اور اگرچہ میں اس کے تمام راستوں سے واقف تھا لیکن میری کوشش ہمیشہ یہی ہوتی کہ شام کی تاریکی پھیلنے سے پہلے ہی جنگل سے نکل جاؤں۔ کیونکہ وہاں چیتے کے قدموں کے نشان بھی اکثر دیکھے گئے تھے۔

جلد ہی تائی میانگ میں، میں ہر دلعزیز ہو گیا اور مجھے وہاں کی ایک امتیازی شخصیت سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں کی ایک اہم شخصیت جو کہ بوکٹ قوم کا تھا اس سے میری رقابت ہو گئی یہ شخص "تاؤ کی سان" تھا جو کہ ایک متمول اور دولت مند چینی سوداگر تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے با اثر آدمی تھا "تاؤ کی سان" "بڑے بھائی سان" کے نام سے مشہور تھا جس کی شہرت کا ڈنکا بوکٹ اور اردگرد کے تمام علاقے میں بجتا تھا۔ خاص کر تاکو آپا، پانگ نگا، کوک لائے اور ٹکمپاؤ کے علاقوں میں اس کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہاں کا ہر مقدمہ عدالت میں پہنچنے سے پہلے بھائی کے ہاں جاتا تھا۔ تمام بڑے بڑے سرکاری حکام اور افسر اسی کے ہاں آکر ٹھہرتے تھے۔ وی۔ آئی۔ پی۔ بڑے بھائی کی کاروں کے ذریعے ہی سفر کرتے تھے۔ اس علاقہ میں تمام لوگوں کے دلوں پر "تاؤ کی سان" کا بڑا رعب تھا۔ میں کسی سے خواہ مخواہ مرعوب ہونے والا آدمی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگرچہ میں اس کے صوبے میں ملازمت کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی کبھی خوشامد یا پروا نہیں کی تھی۔"

یہ کہتے کہتے مریض کچھ دیر سانس لینے کے لئے رکا۔ پھر بولا۔

مجھے یہ لینے کے بجائے اسے ہلاک کرنے پر زیادہ خوش ہوگا۔ چمپون کی محبت بڑی گہری اور شدید تھی جسے وہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی۔ میری طرح اسے بھی اپنی محبت کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہ تھی اس کے باوجود بھی اس نے میرے ساتھ فرار ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہ اس کی اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ تھا جہاں تک میرا تعلق تھا میں بھی اس سے سچی اور پاک محبت کرتا تھا اور میں نے اس کی محبت سے کبھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ ہماری محبت سماجی روایات کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی مجھے فکر تھی تو چمپون کی۔ کیونکہ اس نرم و نازک لڑکی نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ کانٹوں سے پُر تھا جہاں قدم قدم پر رنج و آلام اور مصائب کا سامنا تھا۔ تائی پیانگ کا علاقہ محدود سا تھا جہاں پر کسی راز کا چھپے رہنا مشکل تھا اور ہمارا واقعہ کوئی معمولی نہیں تھا۔ اس لئے جلد ہی ہمارے معاشقے کی خبر سارے قصبے میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ اس کی خبر چمپون کے باپ کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔

ہماری چوری چھپے کی ملاقاتیں اچانک بند ہوگئیں۔ دوبارہ چمپون کی صرف ایک جھلک دیکھنا میرے لئے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس سے ملاقات کی غرض کے لئے میں نے قصبہ میں ہر طرف اپنے آدمی پھیلا رکھے تھے جو مجھے دم دم کی اطلاعیں دیتے رہتے تھے۔ انہی میں سے ایک کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ چمپون کو گھر میں مقید کر دیا گیا ہے اور اسے باہر نکلنے کی سخت ممانعت کر دی گئی ہے۔ میں نے اپنے وسائل کے مطابق ہر ممکن طریقہ سے چمپون سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ اس سے ملاقات ہو جائے میں نے اس تک خط پہنچانے کے لئے تین سو بھاٹ اور جواب لانے کے لئے پانچ سو بھاٹ کا انعام مقرر کیا۔ اگرچہ اس لالچ میں بہتوں نے سلسلہ جنبانی کی کوشش کی لیکن کوئی بھی کامیاب ہو سکا۔ بلکہ ان میں سے اکثر بیچاروں کو الٹا مصیبت میں پھنسنا پڑا۔ اس واقعہ نے تائی پیانگ کا قصبہ میں پہلے کا سا رعب و وقار نہیں رہا تھا وہ اور میں اگرچہ بنیادی معاملات میں اب بھی ایک دوسرے کے انفرادی جذبات ہم خوب جانتے تھے۔ چمپون اب اپنے باپ کے قید خانہ میں ایک قیدی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ جہاں اسے زد و کوب کیا جاتا تھا اور طرح طرح کی جسمانی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں۔

اگلے دن مجھے میری منشا کے خلاف گھومنے پھرنے سے ایک بے حد

کے لئے بوکٹ سے باہر چھوڑ گیا بوکٹ سے میری اچانک عدم موجودگی اور اس کے ارد گرد کے حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنی ہوئی۔ اس نے وہاں میرے دوستوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا۔ یہ لوگ میرے غم کو ہلکا کرنے کے لئے ایک محفل عیش و عشرت بپا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ یہ ایک یادگار پارٹی تھی جیسی کی بوکٹ کی پارٹیاں اپنی روایتی شان و شوکت کے لئے مشہور ہیں۔ جن میں خوبرو دوشیزاؤں کی مختلف انواع و اقسام اور اعلیٰ شراب محفل کی جان ہوتی ہیں۔ اس پارٹی میں ہر ایک آدمی کے لئے ایک ایک خوبصورت عورت مہیا کی گئی تھی۔ لڑکی میرے پاس لائی گئی وہ ایک جاپانی لڑکی تھی جس کے نقوش میں بنگالی خون کی آمیزش صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا نام انیتا تھا وہ کسی سفید فام تھائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی حرکات و ادا بڑی دلکش اور باسلیقہ تھیں۔ جوانی کا خون اس کے رخساروں سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔ میرے دوست تین دن اور تین راتیں بسر کرنے کے بعد روانہ ہوئے وہ آگے رینانگ جا رہے تھے اور مجھے بھی ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن ضروری مصروفیات کی وجہ سے میں ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ وہ تو عیش و طرب کی محفلیں جما کر چلے گئے مگر انیتا کو میرے پاس چھوڑ گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ وہ پانچ چھ روز بعد واپسی پر انیتا کو بھی ساتھ لے کر رینانگ چلے جائیں گے۔ میں نے انیتا کو رائے دی کہ تم دوستوں کے ساتھ ہی رینانگ تک ہو آئے۔ لیکن اس نے یہ چھ دن یہاں ٹھہرنے کو پسند کیا۔ دوستوں کی روانگی کے بعد میں اور انیتا اپنی رہائش گاہ پر آگئے۔ میری زندگی کے چند دن بڑے پُر لطف اور خوشی میں گزرے۔ جس دن میرے دوستوں کو واپس لوٹنا تھا اس سے ایک شام پیشتر ہماری کمپنی کے بحری شاخ کے دو انجینئروں کی طرف سے ڈنر کا دعوت نامہ پہنچا۔ ڈنر ان کی رہائش گاہ پر تھا ڈنر کے بعد ڈانس کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس رات وہ انجینئر بڑے مسرور تھے اور اسی خوشی میں ہم لوگ رات گئے تک ڈانس میں مصروف رہے۔ ڈانس کرتے کرتے صبح صادق کا وقت ہو گیا اور ہم واپس اپنے گھر لوٹے۔ جب میں اپنے بستر میں پہنچا تو پو پھٹ رہی تھی۔ میں فطری طور پر سونے کا عادی نہیں ہوں یہ عادت ہے کہ ہمیشہ بستر پر پڑنے کے بعد دیر تک جاگتا رہتا ہوں لیکن اس رات میں تکیہ پر سر رکھتے ہی سو گیا۔ صبح کسی وقت کمرے کے ساتھ والے دروازے کی اچانک چرچراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی

آنکھیں ملنے لگا۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی ابتدائی کرنیں روشندان
میں سے چھن چھن کر میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ مجھے باہر دروازے
کے درمیان کسی پیکرِ خاکی کی دھندلی سی تصویر نظر آئی۔ میں آنے والے
کو اچھی طرح نہیں پہچان سکا تھا اس لئے میں نے تکیے سے سر اٹھا کر کے
ذرا آگے جھانکنے کی کوشش کی۔

یا خدا! کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا
رہی تھیں یہ محض میرا وہم و خیال تو نہیں تھا۔ اب بھی جب کبھی میں اس واقعہ
کو یاد کر کے اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہ میری آنکھوں کے سامنے آموجود
ہوتی ہے۔ آہ! میرے سامنے چمپون کھڑی تھی۔ اس کے برہنہ جسم پر کپڑے کا
ایک تار نہ تھی۔ اس کے لانبے سیاہ بال جو گیلے دکھائی دیتے تھے اس کے شانوں
پر بکھرے ہوئے تھے۔ تقریباً آدھ انچ موٹی فولادی زنجیر اس کے ایک گٹّے
سے بندھی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا اس کی کمر کے گرد کسا ہوا تھا۔ یہ پیکرِ وفا
و محبت میری آنکھوں کے سامنے چند منٹ تک کھڑا رہا۔ ہم ایک دوسرے کو بغیر کوئی
لفظ کہے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ چمپون کی نگاہیں
آہستگی سے مجھ سے ہٹ کر انگشتا پر گر گئیں۔

میں منتظر تھا کہ چمپون اب ضرور کچھ کہے گی لیکن وہ محبت کی دیوی
اب بھی خاموش کھڑی تھی۔ میں اس انتظار میں پتہ نہیں کہاں پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی
دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ کافی وقت گزر چکا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے منتشر
حواس کو مجتمع کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے زور سے ملا اور
اٹھنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے چمپون میری نظروں سے
اوجھل ہو چکی تھی۔

یہاں تک پہنچ کر مریض نے ایک گہرا سانس لیا اور تھکے ہوئے
لہجے میں بولا:۔

چمپون نے اپنے باپ کے سامنے صاف الفاظ میں اعتراف کر لیا
تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور مجھ سے چوری چھپے کئی بار مل بھی چکی تھی ساتھ
ہی اس نے باپ کو یقین دلایا کہ اس کے محبوب نے ہمیشہ اور ہر موقع پر
اس کی عزت و عصمت کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ سان جیسے کرخت آدمی پر ان
باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس کے نزدیک عورت کا
کسی غیر مرد سے چھپ چھپ کر ملنا صرف ایک ہی معنی رکھتا تھا۔ سان گھر
میں چمپون سمجھتا تھا قتل کی مستحق تھی اس کے دل میں یہ بات پوری طرح بیٹھ
چکی تھی کہ [illegible] سے دشمنی ہی) اس کا دشمن ہے۔ صرف ناگی ایموتے ہی

وہ آدمی تھا جس نے اس علاقہ میں جہاں کی سالہا سال سے سان کے
ظلمت و سطوت کا سکہ چل رہا تھا۔ سان کے منشاء کے خلاف اس کے
راستے میں مزاحم ہونے کی جرأت کی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنی لڑکی کو غدار اور
مارِ آستین سمجھنے لگا کیونکہ چمپون اس آدمی سے اپنی محبت کا اقرار کر بیٹھی تھی
جس سے اس کے باپ کو سخت نفرت تھی۔ وہ اپنی لڑکی سے اس طرح کی باتیں
سن کر برداشت نہ کر سکا اور اسے اپنی توہین خیال کیا اور اس کی تمام پدرانہ
شفقت انتقام میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ اس نے غصہ میں آکر اسی وقت
ایک بڑی سی جلتی ہوئی لکڑی لے کر چمپون پر ایک کاری ضرب لگانے کی
کوشش کی۔ چمپون ایکدم ایک طرف ہٹ گئی اور وار خالی گیا۔ اب تو سان
غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے چمپون کو اس قدر بری طرح پیٹا کہ مار مار
کر ادھ موا کر دیا۔ چمپون بیچاری چپکے سے تمام مار پیٹ برداشت کر رہی تھی
اور رونے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی۔ کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس طرح کا شور و غل
سن کر پڑوسی تمام حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جائیں گے۔ جب درد کی
ٹیسیں زیادہ اٹھتیں جو اس کی برداشت سے باہر ہوتیں تو وہ ہلکی ہلکی آہیں
بھر کر رہ جاتی۔ جب ناگی سان اسے مارتے مارتے تھک گیا اور اپنے دل
کی بھڑاس پوری طرح نکال چکا تو وہ فرشِ خاک سے کپڑے جھاڑتے ہوئے
اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ موقع ملتے ہی راہِ فرار
اختیار کرے گی اور ناگی ایموتے کے پاس چلی جائے گی۔

اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد اس نے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی۔
ایک چینی کہنے کے مطابق خاندان کے فردِ اعلیٰ کا ایک ایک لفظ سارے کنبے کے
لئے ایک قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ اور پھر ناگی سان جیسی سخت طبیعت
کا آدمی تو گھر میں مطلق العنان حاکم تھا جس کی طاقت و جبروت سے سارا
کنبہ کانپتا تھا۔ سان نے گھر میں ہر ایک سے یعنی بیویوں، بیٹوں اور خادموں
کو دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر چمپون نے گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی تو
تمام کو جان سے مار دے گا۔ چنانچہ جب چمپون گھر سے نکل بھاگی تو سارے
کا سارا کنبہ اس کے تعاقب میں نکل پڑا اور تھوڑی ہی دور جا کر انہوں نے
چمپون کو پکڑ لیا۔ وہ اسے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے گھر لے آئے اور ایک
دوڑ کر سان کو بلا لایا جو اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ چمپون کو اس
پاداش میں بہت بری طرح پیٹا گیا۔ چمپون نے اس کے بعد بھی متعدد بار
کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکام رہی۔ بالآخر سان نے تنگ آکر حکم دے دیا کہ
اسے مکان کے کمرے میں ایک کونے میں زنجیر سے باندھ دیا جائے۔

اس زنجیر کا ایک سرا زمین میں گڑا ہوا تھا اور دوسرے سے چھپن کو باندھ دیا گیا تھا۔ ساتن نے حکم دے رکھا تھا کہ رات کو سہولت کے لئے زنجیر کے زمین والے سرے کو ڈھیلا کر دیا جائے مگر اس کا دوسرا سرا بدستور چھپن کے گھٹنے سے بندھا رہتا تھا۔ جب شاد کی ساتن کو پتہ چلا کہ چھپن نے اس حالت میں بھی بھاگنے کی ناکام کوشش کی ہے تو اس نے ایک اور طریقہ برتا۔ اس نے چھپن کی ایک سوتیلی والدہ کو اس پر مامور کر دیا جو ہر رات چھپن کے کمرے میں جا کر اس کے سونے سے پہلے اس کے بدن کے تمام کپڑے اتار لیتی تھی اور اسے بالکل برہنہ کر دیتی تھی۔ اس آخری حربہ پر ساتن کو مکمل یقین تھا کہ اب چھپن فرار کی کبھی کوشش نہیں کرے گی ساتھ ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اب بھی اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ اس کی زندگی ختم کر دے گا۔ ایک صبح جب اس نے چھپن کے دروازے کا تالا کھولا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ کمرہ خالی ہے اور چھپن فرار ہو چکی ہے۔

ہاں تو یہ چھپن ہی تھی جسے میں نے اپنے دروازے کے درمیان کھڑا دیکھا تھا۔ دروازے کھلنے کی آواز نے مجھے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ جب میں نے چھپن کو دروازے کے سامنے سے غائب ہوتے دیکھا تو مجھے پورا اطمینان تھا کہ وہ کہیں آس پاس ہی ہوگی۔ چنانچہ میں بستر سے کود کر دوسرے ہی لمحہ باہر برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔ مگر وہاں پر چھپن کا کوئی نشان نظر نہ آیا تھا۔ میں نے اس کا نام لے کر اسے آوازیں دینا شروع کیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اب میں نے ندی کی سمت دوڑنا شروع کیا۔ میں بھاگتا جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اسے پکارتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دریا کا کنارا آ گیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی کبھی ایک سمت بھاگتا تھا کبھی دوسری سمت۔ اس اثناء میں شور کافی بڑھ آیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ چھپن اپنے آپ کو مجھ سے چھپا رہی ہے۔ میں بھاگا بھاگا مزدوروں کے کوارٹروں کی طرف آیا۔ وہاں سے بیس آدمی اکٹھے کئے اور ایک بار پھر چھپن کی تلاش کو روانہ ہو گیا۔ جنگل کے قریب پہنچ کر میں نے ان تمام آدمیوں کو ایک منظم طریقے سے سارے جنگل میں پھیلا دیا کچھ آدمی دریا کے کنارے پر متعین کر دیئے۔ میرے آدمی سارا جنگل عبور کر کے بہت اوپر ندی تک جا پہنچے لیکن چھپن کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اب شام کی تاریکی پھیلنی شروع ہو گئی تھی اور ہم چھپن کا سراغ لگانے میں بالکل ناکام رہے تھے۔ چنانچہ میں غروب آفتاب کے وقت واپس کوارٹروں کی طرف لوٹ آیا۔ میں واپس اپنے بنگلے تک پہنچے بغیر ہی "تائی میانگ" کے ارادے سے چل پڑا۔ میں چاہتا تھا کہ تائی میانگ پہنچ کر چھپن کا اس کے گھر سے پتہ کیا جائے کیونکہ ممکن ہے وہ واپس چلی گئی ہو۔ میں اس وقت چھپن کے باپ شاد کی ساتن کے پاؤں پر گر کر بھی چھپن کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا جب میں رات کے وقت تائی میانگ پہنچا تو وہاں اپنے ایک کارندے کی زبانی معلوم ہوا کہ چھپن "تائی میانگ" واپس نہیں پہنچی۔ میں نے پھر بھی جی کڑا کیا اور ساتن کے مکان کی سمت چل پڑا۔ جب میں اس کے ہاں پہنچا تو وہ ظالم اور خونخوار آدمی ایک وحشی جانور کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے قہقہے بڑے خوفناک تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ آیا چھپن واپس گھر تو نہیں پہنچی تو کہنے لگا کہ "اگر چھپن نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے واپس آنے کی جرأت کی تو اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ اور اس کا تابوت تیرے ہاں بھیج دوں گا۔"

یہاں سے ناامید ہو کر میں واپس چلا آیا۔ میں چھپن کی روپوشی سے بہت متفکر تھا میں نے وہاں سے تیس آدمی لئے اور انہیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا اور دوبارہ انہیں دریا کے دونوں کناروں پر آگے کی طرف پھیلا دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چھپن ان دو راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اس نے ضرور دریا کو اس کے تنگ پاٹ سے عبور کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ ہم لوگ تقریباً نو بجے رات روانہ ہوئے۔ میں ان دونوں گروہوں کے پیچھے پیچھے کشتی میں سوار چھپن کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پچھلے چوبیس گھنٹوں سے دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ اور اس دوران میں مجھے کھانے پینے کا ہوش تک نہ رہا تھا اور اس عرصہ میں میں نے صرف برانڈی کے چند گھونٹ بدقت تمام حلق سے اتارے تھے۔ تھکان کی وجہ سے مجھ پر غنودگی سی کیفیت طاری ہونے لگی اسی اثناء میں میری کشتی کا سرا زور سے دوسرے کنارے کے ساتھ ٹکرایا۔ اور میں ایک دفعہ پھر تازہ دم ہو گیا کنارے پر چند ملاحوں کو دیکھ کر میں نے ان سے بھی چھپن کے متعلق پوچھا کہ آیا انہیں اس کا کچھ پتہ ہے یا نہیں۔ ان میں سے ایک ملاح مجھ سے کہنے لگا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کے مگرمچھ کس طریقے سے انسانوں کو اپنی خوراک بناتے ہیں؟"

میں نے کہا: "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

ملاح کہنے لگا۔ "خواہ ایک مگرمچھ جسامت میں کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ ایک ہی دفعہ سالم انسانی جسم کو نہیں نگل سکتا۔ اگرچہ مگرمچھ کا منہ کافی چوڑا ہوتا ہے لیکن اس سے یہ انسانی جسم کے ٹکڑے نہیں کر سکتا اور اس کی ٹانگیں اس قدر چھوٹی ہوتی ہیں کہ اس معاملہ میں اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں جب وہ

بقیہ صفحہ

از شوکت تھانوی

لتا منگیشکر کے نام

گڑھی شاہو لاہور

(جو آج سے چند سال پیشتر لکھا گیا)

عالمہ محترمہ!

آپ کے نام یہ خط اس ذیل میں ہرگز نہیں آتا کہ ع

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

اس لئے کہ جس حد تک ملاقات ضروری ہے وہ ہوتی ہی رہتی ہے ؎

تو نہیں تو کیا ہوا کون سی کمی رہی

ہم ترے بغیر بھی تجھ سے ہم کلام ہیں

آپ کی نواؤں سے جو دنیا آج گونج رہی ہے اس دنیا کے بسنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ آپ کی یہ دنیا صرف بھارت و پاکستان تک محدود نہیں بلکہ آپ کے نغموں کی گونج میں تو افغانستان، سیلون، ایران، برما، انڈونیشیا بھی بستے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی نشرگاہیں بھی آپ کی آواز فضا میں منتشر کرتی ہیں۔ اور یہ آفت ہوش و ایمان آواز تو در در اور گھر گھر پہنچی ہوئی ہے۔ کون سا خطہ ہے جہاں یہ ابر نہ برستی ہو۔ ان نغموں کی زبان کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ گیت گنگنانے والے وہاں بھی مل جاتے ہیں جہاں اردو ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ میں نے اردو کے سب سے بڑے مبلغ مولانا عبدالحق مرحوم کے نام جو خط لکھا ہے اس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا ہے کہ بھارت کی سب سے بڑی مولانا عبدالحق لتا منگیشکر ہے جس کے گانے اس ہندوستان کے گوشے گوشے میں رچے ہوئے ہیں جو اردو سے اپنا دامن بچانے کا دعویدار ہے مگر اردو ہے کہ لتا کے گانوں کی شکل میں اپنے گن گوا رہی ہے۔ اور خدا جانے ان گانوں کے بھیس میں کن کن ممالک میں پہنچ چکی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو کی جتنی تبلیغ فرما دی ہے طور پر آپ نے کی ہے اردو کے کسی مبلغ یا اردو کے کسی تبلیغی ادارے سے ممکن نہ ہو سکی۔ ہندوستان میں تو خیر گنگناؤں سے پرہیز کرنے والے بھی یہ گڑ کھاتے ہی رہتے ہیں مگر ہندوستان اور پاکستان سے باہر بھی اردو نہ سمجھنے والے بھی یہ گنگناتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ ؎

شمع پہ آ کر گھومتے ہیں کیوں جل جل کر پروانے

مر کر جینا جی کر مرنا، پگلے تو کیا جانے

بلما جا جا جا

آپ کی آواز کی ایک ہی موج بڑے بڑے فرشتہ صورت بزرگوں کو کچے دھاگے میں باندھ کر ریڈیو سیٹ کے قریب لے آتی ہے۔ خواہ وہ اپنے زہد و تقدس کے اعتبار سے کتنے دور کیوں نہ ہو جائیں وہ کشاں کشاں آتے ہیں اور عمر رفتہ کو آواز دیتے ہوئے آتے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

آواز کا یہ جادو اور موسیقی کا یہ تاثر ہی تو ہے کہ ہندوستان سے اردو کو فنا کیا جا رہا ہے۔ مگر لتا کے گانوں میں جو اردو سنائی ہوتی ہے۔ وہ سر آنکھوں پر قبول ہے۔ اردو کے لئے بھارت کے دل کو جتنا تنگ کیا جا رہا ہے آپ کی آواز اتنا ہی کشود پیدا کرتی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ ؎

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل

تیرا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود

مگر جب تک آپ کے نغموں کی گونج باقی ہے کم سے کم اس وقت تک اردو آپ کے ملک میں زندہ رہے گی یوں تو آپ کے پردھان منتری بھی اردو کا دم بھرتے رہتے اور ان کے ملک میں اردو کا جو خون ناحق ہو رہا ہے اس

اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ خون اُن کے دامن پر نہ سہی اُن کی حکومت کے دامن پر بہرحال نظر آ رہا ہے ؎

لہو بسمل کا مقتل کی زمیں پر
نہ دامن پر نہ اُن کی آستیں پر

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے نغمتوں کی شکل میں جو اُردو ہندوستان میں اب تک قابلِ قبول بنی ہوئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دُنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گانے سے جانور تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ تو اُردو کے لاکھ دشمن سہی مگر انسان تو ہیں ہی۔ کرشن جی کی بانسری سن کر سنتے ہیں اگر گئو ماتا چرنا چھوڑ دیتی تھیں تو اُن کے گانے کی دُھن میں اس امتیاز کا ہوش کس کو ہو سکتا ہے کہ اس آواز کے پردے میں اُردو ہے جو رُوح میں سمائی چلی جاتی ہے اگر یہی ہوش آ جائے تو وہ بقیع الضمیر کہ ؎

اگر تو اس میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نانِ دجنگ در باب

بہرصورت اُردو کی جو نشر و اشاعت آپ کی حسین آواز کے ساتھ ہوئی ہے اس نے اُردو کو ہندوستان میں امر بنا دیا ہے۔ کوشش کی گئی تھی اُردو کے باب میں ایک ہندوستان گیر سناٹا پیدا کرنے کی، مگر آپ کے نغموں نے اُردو کی ایسی گونج پیدا کی ہے کہ اس نقارخانہ اُردو میں ہندی کے طوطی کی آواز بمشکل سنی جا سکتی ہے۔ مانگی جا رہی تھی اُردو کے لئے علاقائی حیثیت مگر آپ کے گانوں نے ملک گیر حیثیت خود بخود دے دی۔

مکتوب یہیں تک پہنچا تھا کہ ریڈیو سے آپ کا نغمہ اُبھر کر فضا پر چھا گیا۔ لہٰذا اب میں بھی ایک تازہ پان کھا کر آپ سے باتیں کرنے کے بجائے آپ کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں آپ پان کھاتی ہیں یا نہیں، مگر میں بغیر پان کھائے آپ کا گانا سُننا ایک قسم کی گستاخی سمجھتا ہوں۔ ایک معطر گلوری منہ میں ہو اور کانوں میں آپ کی آواز کا رس اُنڈیل رہا ہو تو اس دو آتشہ کا کیف مجھ کو واقعی گم کر دیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ کو ڈھونڈھے

بقیہ صفحہ نمبر ۱۸ کا:-

ایک انسان کو دبوچ لیتا ہے تو پھر اُسے کنارے پر لاتا ہے وہ انسان کو اس کے کسی عضو کے ذریعے پکڑتا ہے۔ کنارے پر پہونچکر وہ اس جسم کو درخت کے ساتھ ٹکراتا ہے۔ اس طرح جو ٹکڑا انسانی جسم سے علیحدہ ہو کر نیچے گرتا ہے ہڑپ کر جاتا ہے۔ اور ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے کہ ہے۔ اس طرح جسم کو درخت کے ساتھ مارتا رہتا ہے اور کھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام جسم ٹکڑے ٹکڑے اور پرزے پرزے ہو جاتا ہے۔"

یہاں تک پہنچ کر مریض خاموش ہو گیا۔ وہ دُور خلا میں گھور رہا تھا۔ جیسے ان گنت خیالات میں کھو گیا ہو۔

میں اس کی اس طرح خاموشی سے تنگ آ گیا۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔

"کیا ملاحوں نے چمپون کو ڈھونڈھ لیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔"

نائی ایمبوئے نے آہستگی سے کہا۔

"جو کچھ اس ملاح نے دیکھا وہ زنجیر کا ایک ٹکڑا تھا۔ ایک انسانی ٹانگ کے گرد بندھا ہوا تھا اور ٹانگ گھٹنے سے الگ کی ہوئی لگتی تھی۔"

یہ ایک نسوانی ٹانگ تھی جو ایک دریا کے کنارے ایک درخت کی نچلی ٹہنی پر لٹک رہی تھی۔

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲
رجسٹرار آف نیوز پیپرز برائے انڈیا رجسٹریشن نمبر ۷۴۴۲/۵۷
رجسٹرڈ نمبر ڈی ۔ ۳۷۰۰

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ
۱۵/ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے

جلد ۔ ۴۱ | مئی سنہ ۱۹۷۹ء | شمارہ ۔ ۵

آپ کے نام

ضروری اطلاع

(۱) دفتر شانِ ہند کا ٹیلیفون نمبر تبدیل ہو گیا ہے۔ نیا نمبر ۲۶۰۲... ہے۔

۲۔ میری ذہنی پریشانیوں کے باعث شانِ ہند کی اشاعت پابندیٔ وقت سے نہیں ہو رہی ہے۔ گذشتہ تین ماہ سے شانِ ہند دیر سے چھپ رہا ہے۔ خدا کے کرم سے یہ ذہنی پریشانیاں کم ہو رہی ہیں اور خدا کے ہی کرم سے اب شانِ ہند کا اگلا شمارہ بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے اور جولائی کا شانِ ہند خدا نے چاہا تو یکم جولائی کو حوالۂ ڈاک ہو جائے گا۔

۳ ۔ شعرائے کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ ہماری ذمہ داریوں اور شانِ ہند کی ضخامت کی کمی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے کلام کی اشاعت کیلئے فوری احکامات جاری نہ فرمائیں۔ آپ کا قابلِ اشاعت کلام ضرور چھپے گا مگر اس کے لئے انتظار شرط ہے۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ آج آپ نے اپنا کلام بھیجا اور زیرِ ترتیب شمارہ میں ہی اس کی اشاعت بھی چاہیں۔

۴۔ اگست کا شمارہ "آزادی نمبر" ہوگا۔ اس خاص اشاعت میں ہر صاحبِ مضمون کی تصویر بھی شائع کی جائے گی۔ ملتمس دیدہ تعاون خاص نمبر کے لئے مضامین نظم و نثر بھجوانے کیلئے اکثر حضرات سے بذریعہ خطوط استدعا کی ہے۔ براہ کرم آپ مضامین اور کلام مع تصاویر جلد از جلد بھجوائیے تاکہ خاص نمبر ۱۵ اگست کو شائع ہو سکے۔

۵ ۔ آپ سے بارہا گذارش کی گئی ہے کہ آپ جب کبھی ہمیں خط لکھئے یا منی آرڈر بھجوائیے تو اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے۔ مگر نہ معلوم آپ اپنا خریداری نمبر کیوں نہیں لکھتے۔ حالانکہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے میں آپ تعاون فرمائیں گے۔ بعض حضرات خریداری نمبر نہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا پورا پتہ بھی نہیں لکھتے اور دستخط یوں فرماتے ہیں کہ جیسے ان کے نمونہ دستخط ہمارے یہاں موجود رکھے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے خطوط کا جواب دیا جانا ممکن نہیں۔ براہ کرم اپنا پتہ ہر خط میں لکھئے اور اپنا نام بھی اس قدر صاف تو لکھئے کہ وہ پڑھا جا سکے۔

۶ ۔ جواب طلب امور کے لئے اگر آپ جوابی پوسٹ کارڈ فرمائیں تو بہتر رہے گا۔ اور آپ کو واپسی ڈاک جواب موصول بھی ہوگا۔

۷ ۔ آپ کے ذمہ اگر شانِ ہند کی کوئی رقم ہے تو اسے پہلی فرصت میں ادا کیجئے۔

[illegible] ہند فلیٹ [illegible] نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

مستقبل میں

اپنے نزدیکی فیملی پلاننگ سینٹر، پرائمری ہیلتھ سینٹر
یا گرام سواستھ سہائک سے جو آپ کو ضروری
صلاح اور ساز و سامان فراہم کرسکتے ہیں
آج ہی رابطہ قائم کیجیے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید و صبا چہ کرد

منسٹری آف ایجوکیشن کا سیکولرازم

حکومت ہند کی وزارت تعلیم کا ایک شعبہ "لینگویج سیل" ہے جو مختلف زبانوں کی کتابوں کی تھوک ([illegible]) خریداری کرتا ہے اس شعبے کے کارکنان [illegible] کتابوں کو عجیب وغریب احمقانہ بہانوں کے سہارے نامنظور کر دیں اور ایسی تمام جنہیں کباڑیا بھی پچاس پیسے کا خریدنے کو تیار نہ ہو انھیں خرید لیں۔ اس سلسلے میں اکثر مصنفین اور ناشرین شکایت کریں بھی تو انھیں یہ سزا دی جاتی ہے کہ آئندہ ان کی کوئی کتاب یہ ادارہ خریدتا ہی نہیں۔ یعنی شکایت کرنے والوں کو بلیک لسٹ کر دیا جاتا ہے۔

ذیل کا واقعہ پڑھئے اور جنتا پارٹی حکومت کے محکمہ تعلیم کے ان ذمہ دار ارکان کو مبارک باد کے تار بھجوائیے کیونکہ جب تک ہماری حکومت میں سیکولرازم کے ایسے عیار محافظ براجمان ہیں "فرقہ پرستی" کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ دلی سے ایک منتشر اخبار "حقیقت بیانی" شائع ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر اور مالک نیز پرنٹر پبلشر شری مہتہ درد بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ درد صاحب یہ سمجھتے ہیں بلکہ اوروں کو یہ سمجھنے کے لئے مجبور کرتے ہیں کہ اگر ان کا وجود مسعود نہ ہوتا تو ہندوستان کو آزادی نہ ملتی۔ ان کی قوم پرستانہ اور حب الوطنی کی نظموں کے باعث ہندوستانیوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبہ پیدا ہوا۔ اور آخرکار انگریز اسی لئے ہندوستان چھوڑ گیا۔ حالانکہ شعر کہنا انھیں ابھی تک نہیں آیا۔ اندرا گاندھی کا عروج ان کے خیال میں اسی لئے جاتا رہا کہ انھوں نے ان کے لئے سرکاری خزانے کا منہ نہ کھولا۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک بھر میں سب سے بڑے فریڈم فائٹر "یہی" ہیں حالانکہ انھوں نے جیل کی چہار دیواری کم از کم پانچ کلومیٹر کی مسافت سے بھی نہیں دیکھی۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا اخبار "حقیقت بیانی" اردو کا ملک بھر میں واحد ایسا اخبار ہے جو اپنی نوعیت کا واحد اخبار ہے۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ یہ اخبار واقعی اپنی نوعیت کا واحد اخبار ہے کیونکہ یہ کبھی پچاس سے زائد نہیں چھپا۔ اس کا کوئی مسلک نہیں، کوئی ایجنٹ نہیں۔ کوئی خریدار نہیں۔ منت سماجت سے اور کہیں سیاسی لیڈروں کے سہارے کچھ اشتہارات حاصل کر لینا یہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

درد صاحب کو شاعری کا ہیضہ اس زور سے ہوا ہے کہ تین چار کتابوں کے مصنف بھی ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب "اردو کے ہندو شعراء" شائع کی ہے۔ جس میں کاکوری والے نوالہ کو بھی ہندو شاعر لکھا ہے حالانکہ کاکوری والے مسلمان ہیں اور ان کا نام انور جہاں ہے۔ شاعری بیچاری کیا جانے مگر نوالہ لینے ڈھنگ کی خوب ہے۔ اس لئے مہتہ درد سے کہیں بہتر سخن فہم اور سخن شناس ہے۔ یہ کتاب موضوع کے لحاظ سے اتنی بوگس ہے کہ شاید ہی آج تک کوئی ایسی بے معنی کتاب چھپی ہو۔ شاعر کا نام اس کے باپ کا نام معلوم ہو سکا تو بہتر ورنہ یہ لکھ دیا کہ ولد نامعلوم۔ سکونت شاہجہانپور لکھ دی خواہ شاعر موضع تلہر ضلع شاہجہانپور کا رہنے والا ہو۔

درد صاحب میں یہ خوبی اس بلا کی ہے کہ وہ سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں کھدر کا پاجامہ اور کرتا پہن کر گھس جاتے ہیں۔ رعب سے۔ دھمکانے سے۔ اخبار کے رعب سے یا پھر منت سماجت اور یہاں تک کہ پاؤں کو ہاتھ لگا کر اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا مقابلہ [illegible] ایڈیشن "[illegible]" اور مرحوم لالہ ہنس راج "اتالیق" بھی نہیں کر سکتے۔

مہتہ درد اپنی اس تالیف کو لے کر وزارت تعلیم کے لینگویج سیل میں دو تین سال ہوئے پہنچے اور ارباب متعلقہ سے کہا کہ [illegible] ہوتے گئے میں [illegible] کہ آپ کی کتاب [illegible] حکومت ہند کی پالیسی سیکولرازم [illegible]

خلاف ورزی کر رہا ہے یعنی اس میں "ہندو" لفظ آرہا ہے اس لئے ہم یہ کتاب خریدنے سے معذور ہیں۔ مہتہ وردؔ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے کہاں تھے اس شعبہ کے کارکنان کو یہ چیلنج دیا کہ اگر ان کی یہ کتاب نہ خریدی گئی تو وہ اس محکمہ کے سب پول کھول دیں گے۔ کہتے ہیں کہ چھوٹے چوروں نے بڑے چوروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور یہ راستہ سمجھایا گیا کہ اس کتاب کا کچھ ایسا نام رکھا جائے جس سے "ہندو" اڑ جائے۔ چنانچہ وردؔ صاحب نے اشارہ پاتے ہی کتاب کا پہلا فرمہ ہی بدل ڈالا۔ نئے نام سے آٹھ یا سولہ صفحات چھپوا کر (صرف کتاب کا نام بدلا گیا باقی سب کچھ ویسے ہی رکھا گیا) لگوا دیئے گئے اور محکمہ والوں نے یہ ردی میں بھی فروخت نہ ہونے والی کتاب بیس روپیہ فی جلد کے حساب سے کثرت سے خرید لی۔ حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم میں اندھیر نگری چوپٹ راجہ کی منہ بولتی تصویر یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ حکومتِ ہند کے کسی محکمہ میں ایک سرکاری افسر جو آپ کو انگریزی کا مضمون نگار سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ کتابوں کے ریویو لکھ کر اپنے آپ کو انگریزی کا ادیب سمجھتے ہوں۔ اردو کی بدنصیبی کہ انھوں نے اردو میں بھی اپنی جولانیاں دکھانی شروع کیں۔ انگریزی کی کتابوں سے کچھ مضامین ترجمہ کر کے الٹی سیدھی اردو میں لکھ کر نصف درجن کے قریب کتابیں شائع کر دیں اور محکمہ تعلیم بھی تو آخر یہ بیچارہ سا بنا رہا ہے۔ ان حضرت نے سرکاری افسری کے رابطہ ضابطہ کے تحت محکمہ تعلیم کے افسران سے اپنی ہر کتاب پر انعام پایا اور سرکاری انعام یافتہ ہوتے ہی اردو کے مسلّمہ ادیب تسلیم کر لئے گئے جانا نا۔ بیچاری اردو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مجھے ایسے ادیبوں سے کوئی بچاؤ۔ ان حضرت نے ایک کتاب اپنے نام سے اور دوسری اپنے فرزند ارجمند کے نام سے لکھا۔ مسودات ایجوکیشن منسٹری کا ہیرو راشٹر کر دیئے اور پھر تماشہ دیکھئے کہ باپ کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی اپنی ناجائز کتابوں پر انعام کا مستحق قرار دیا گیا آپ ناجائز کتابوں کی اس لفظی ترکیب پر چونکے ہوں گے تو عرض کر دیا جاتا ہے کہ ہر مصنف اپنی قلمی تخلیقات کو معنوی اولاد سمجھتا ہے تو اس لحاظ سے ان صاحب نے اپنی معنوی کتاب کو اپنے بیٹے کی معنوی اولاد بنا دیا تو دوسرے لفظوں میں

بیٹے کی یہ ناجائز کتاب ہی ہوئی یا نہیں۔ آپ کی واقفیت میں اضافہ کرنے کے لئے یہ عرض کرنا تو ہم بھول ہی گئے۔ یہ صاحبزادے اردو کی الف۔ ب سے بھی واقف نہیں۔ مگر داد دیجئے محکمہ تعلیم کے ان حضرات کو جو ایسے انعامات کا فیصلہ کرتے ہیں۔

"لینگویج سیل" ان مسودات کو بھی دیکھتا ہے جن کی اشاعت کے لئے سرکاری طور پر امداد دی جاتی ہیں۔ اس مرتبہ یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ مسودات کی تین کاپیاں داخل کرنی ہوں گی۔ جناب رتن پنڈوری کی پچاس سالہ محنت شاقہ کا ماحصل "ہندی کے مسلمان شاعر" جس پر رتن صاحب نے اپنی زندگی بھر کا سرمایہ لگا دیا ہے۔ قبلہ رتنؔ صاحب کی درخواست پر اس "لینگویج سیل" نے متعلقہ فارم ہی نہیں بھجوایا جبکہ درخواست بذریعہ رجسٹری بھجوائی گئی۔ اگر مہتہ وردؔ کی تصنیف کثیف "اردو کے ہندو شعراء" کے نام میں "ہندو" کے باعث ایجوکیشنل منسٹری کا نام نہاد سیکولرازم خطرے میں پڑ سکتا ہے تو حضرت رتن پنڈوری کی اس تصنیف لطیف "ہندی کے مسلمان شاعر" کے نام میں تو "مسلمان" آتا ہے اور ہماری حکومت کے لئے "مسلمان" ایک ایسی علامت ہے جس کے ابرو پہ بل آتا ہے تو حکومت کے ہر رکن کو اپنی کرسی ایوانِ حکومت سے ہٹتی نظر آتی ہے لہٰذا کوشش کی جائیگی کہ لینگویج سیل کے کسی تجربہ کار رکن سے مشورہ کیا جائے کہ اس کتاب کا کیا نام رکھا جائے۔ تاکہ یہ بیش بہا خزانہ اردو میں شائع ہو سکے۔

لینگویج سیل نے مصنفین کے لئے یہ مشکل بھی پیدا کر دی ہے کہ اب کوئی مصنف براہِ راست اپنی کتاب کی خرید کے لئے درخواست نہ کر سکے گا۔ بلکہ کسی رجسٹرڈ باڈی کے ذریعہ ہی ایسی درخواست کی جا سکے گی۔

ہم حکومتِ ہند کے وزیر تعلیم سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے محکمہ کے اس شعبہ کی طرف توجہ دیں۔ نیز عوام کیلئے آبِ حیات مہیا کرنے کی راہیں مسدود نہ کی جائیں۔ لیکن انتہائی افسوس ہے کہ اگر حکومتِ ہند کا محکمہ تعلیم ہی سیکولر ازم کے معنی سے نابلد ہے تو حکومت کے باقی محکموں کا کیا حال ہوگا۔

سرور تونسوی

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان (پاکستان) سے قریباً [دس] میل کے فاصلے پر کوہ سلیمان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوہ سلیمان کے دامن میں جتنے بھی گاؤں ہیں وہاں کے ہندو دوکاندار کوہ سلیمان پر بسنے والے بلوچیوں (جن کو [بز]دار کہا جاتا ہے) میں سودا سلف فروخت کرنے جاتے تھے [یہ] تمام اشیائے ضروریہ عام طور پر اُدھار ہی دی جاتی تھیں جس کے بدلے میں یہ بلوچی باشندے بھیڑوں کی اون شہد۔ گھی۔ دُنبے۔ جوار۔ باجرہ وغیرہ دیکر یہ قرض چکایا [کر]تے تھے۔ ہندو دوکاندار ایک تو ایسے ہی الا بچی دیکر [ہی] (رتّی) لکھوانے والے ہوتے تھے۔ دوسرے وہ جانتے تھے کہ یہ [بلو]چی لوگ دس تک کی گنتی نہیں جانتے تو ان کی سادہ لوحی [کا] ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے انھیں لوٹتے [تھے]۔ پہاڑی علاقے میں خچر یا گدھے ہی باربرداری اور سواری [کے] کام آتے تھے۔ میرے نانا اور چھوٹے ماموں بھی اپنے آبا و اجداد [کی] طرح انھیں بزداروں میں ہی سودا سلف فروخت کرتے تھے [ا]ن بلوچیوں کی زبان تحصیل سنگھڑ (تونسہ شریف) کا ہر ہندو دکاندا[ر جان]تا تھا کیونکہ ان بلوچیوں کے ساتھ کاروبار کرنے کے لئے [ان] کی زبان جاننا نہایت ضروری تھا۔

میرے والد صاحب ضلع لائل پور (اب جس کا نام فیصل آباد رکھ دیا گیا ہے) میں ایک سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ گرسا[ل] [میں] ایک مرتبہ وہ سارے گھر والوں کو اپنے آبائی وطن ہیرو غربی [ت]حصیل تونسہ شریف لے جایا کرتے تھے کیونکہ ہمارے اکثر رشتہ دار ہیرو غربی اور دوسرے نزدیکی مقامات کے ہی رہنے والے تھے۔ لہذا شادی۔ غمی کے موقع پر ہمیشہ دشوار [گز]ار راہوں سے گزر کر وطن جانا ہی ہوتا تھا۔ آج کل تو تونسہ شریف کی شکل و صورت ہی بدل گئی ہے۔ ان دنوں تو وہاں پہنچنا آسان نہیں تھا۔ دریا سندھ کو کشتی سے عبور کرنا ہوتا تھا

ساون بھادوں کے دنوں میں جب دریائے سندھ کی چوڑائی بارہ میل تک پھیل جاتی تھی اور ہوا کا رخ موافق نہیں ہوتا تھا تو بعض مرتبہ کشتی میں ہی بارہ بارہ دن گزر جاتے تھے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے نانا سے کہا کہ مجھے بھی پہاڑ پر لے چلئے میری ضد پر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ گدھے کی سواری میرے لئے توہین آمیز تھی کیونکہ لائل پور میں تو گدھے کی سواری مذاق سمجھی جاتی تھی اور مقامی طور پر چوری یا بدمعاشی کرنے والے کو گدھے پر بٹھا کر اس کا جلوس نکالا جاتا تھا۔ لہذا میں نے گدھے پر سوار ہونے کی نسبت پیدل چلنے پر ترجیح دی تو میرے نانا فرمانے لگے کہ میدانی علاقہ تو تم پیدل چل لوگے مگر پہاڑ پر تو گدھے کے بغیر گزر نہ ہو سکے گا۔ تاہم۔ میرے نانا صاحب نے گاؤں میں سے کسی سے خچر مانگا اور مجھے پہاڑ پر لے گئے جب ہم پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگے تو دور ہی کوہ سلیمان جو دور سے سیاہ و سفید پتھروں کے ٹیلے نظر آتا تھا۔ بہت ہی اچھا لگنے لگا۔ جگہ جگہ محفوظ جگہوں پر بلوچیوں نے مکانات بنا رکھے تھے۔ بھیڑیں اور دُنبے اس کثرت سے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں پھر کبھی اتنی کثیر تعداد میں نہیں دیکھے۔ جہاں بھی کوئی ہموار جگہ ہوتی بلوچیوں نے وہیں کچھ نہ کچھ بو رکھا تھا۔ پہاڑی چشمہ میں نے پہلی بار دیکھا۔ ہر بلوچی اپنی زبان میں میرے نانا صاحب سے میرے بارے میں دریافت کرتا۔ گو میں ان کی زبان نہیں سمجھتا تھا مگر ان کی گفتگو کے انداز سے میں بہت کچھ سمجھ لیتا تھا۔ بہرکیف پہاڑی علاقہ میں پانچ سات میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے نانا نے ایک بلوچی کے ہاں دو گدھوں پر لدا ہوا سامان اتارا اور مجھے بھی خچر سے اتار کر ایک چٹائی پر بٹھا دیا گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں خچر پر پہلی مرتبہ اتنا سفر کیا تھا۔ کچھ دیر تک تو میری ٹانگیں سیدھی نہ ہو سکیں۔ نانا صاحب نے گڑ سے بنی ہوئی مٹھائی کھانے کو دی اور پہاڑی چشمہ کا پانی پیا۔ اس وقت گڑ کی

منہ خالی نے جو لطف دیا وہ پھر گھنٹے والے حلوائی کی مٹھائی میں بھی نہ مل سکا۔ سرِ شام بلوچی میزبان نے ایک دنبہ ذبح کیا اور اسے صاف کر کے دنبہ کی کھال میں ہی رکھ کر اس میں چاول اور مصالحے وغیرہ بھر کر ایک گڑھے میں اُپلے جلا کر رکھ دیا اور گڑھے کو مٹی سے بند کر دیا گیا۔ تین گھنٹے بعد جب دنبے کا گوشت اور چاول کھانے کو دیئے گئے تو وہ کسی دوسرے جہان کی نعمت لگ رہا تھا۔ ایسا لذیذ گوشت اور چاول پھر میں نے زندگی میں نہیں کھائے۔ یہ بلوچی باشندے بڑے جی دار اور بہت اچھے نشانہ باز ہوتے ہیں۔ جب کبھی ان کی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ تو یہ بھوکے مرنے کی بجائے لوٹ مار کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر لوٹتے ہندوؤں کو ہی تھے۔ اول تو وہاں کے مسلمانوں کے پاس کچھ ہوتا بھی نہیں تھا۔ دوسرے مذہبی طور پر کافروں کو لوٹنا گناہ نہیں سمجھتے تھے مگر ان کے اس اخلاق کی داد دینی ہو گی کہ کسی عورت کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ ایک مرتبہ فورٹ سنڈیمن سے ڈیرہ غازی خاں آ رہی بس پر خاصی بلندی سے ایک بلوچی نے ایسا نشانہ لگایا کہ بندوق کی گولی نے بس کا ٹائر اڑا دیا۔ اور کئی بلوچی بس کے مسافروں کو لوٹنے کے لئے آناً فاناً جمع ہو گئے۔ جس شخص نے کلمہ پڑھ دیا خواہ وہ ہندو ہی کیوں نہ ہو (اکثر ہندوؤں نے بھی کلمہ پڑھنا سیکھ رکھا تھا تاکہ ایسے برے وقت پر جان و مال بچانے کے لئے کام آ سکے) اسے کچھ نہ کہا جاتا اور باقی لوگوں سے کہا جاتا کہ جو کچھ نقد روپیہ زیورات وغیرہ ہیں وہ از خود دے دو۔ اگر کسی نے مزاحمت کی تو وہ بندوق کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ (عام طور پر مقابلہ ہو جاتا تھا کیونکہ وہاں کے ہندو بھی تو آخر اسی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔) مگر کسی بھی ہندو عورت کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ بڑی حلیمی سے کہتے تھے کہ زیور اتار کر خود ہی دے دو۔ اگر حلیمی سے بات نہ بنتی تو وہ ڈراتے دھمکاتے مگر نہ تو حملہ کرتے اور نہ ہی ہاتھ لگاتے۔ اگر کسی عورت نے دل کڑا کر لیا اور چپ چاپ کھڑی رہی تو یہ بلوچ اسے بغیر لوٹے چلے جاتے تھے۔ اس بس میں بھی دو ہندو عورتیں سفر کر رہی تھیں اور ان کے پاس زیورات بھی خاصے تھے۔ ان بلوچیوں نے سب ترکیبیں کر لیں مگر عورتیں ٹس سے مس نہ ہوئیں تو ایک بلوچی نے کہا کہ اگر تم نے زیورات نہ دیئے تو تمہارے شوہروں کو بندوق کا نشانہ بنا دیا جائے گا ان عورتوں نے جواب دیا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو خدا اور رسول تمہیں کبھی معاف نہ کریں گے اور تمہاری عورتیں بھی بیوہ ہو جائیں گی۔ یہ سن کر بلوچی چپ چاپ چلے گئے۔

چھوٹے چھوٹے گاؤں دو دو چار چار۔ سال کے وقفہ سے ان بلوچیوں کے شب خون کا نشانہ بنتے رہتے تھے مگر قصبہ وہوا جو تونسہ شریف سے تیس میل کے فاصلہ پر ڈیرہ اسماعیل خان کی شاہراہ پر واقع ہے اکثر و بیشتر ان بلوچیوں کی دستبرد کا نشانہ بنتا رہتا تھا۔ کیونکہ اس قصبہ میں مالدار ہندوؤں کی خاصی تعداد تھی۔ ایک مرتبہ وہوا پر بلوچیوں نے شب خون مارا تو ایک ہندو دوکاندار نے باہر آکر ایک بلوچی لیڈر سے کہا کہ اس کے بیٹے کی بیوی کو بچہ ہونے والا ہے اور وہ دردِ زہ سے تڑپ رہی ہے۔ دائی اندر بیٹھی ہے۔ بندوقوں کی آوازوں سے اس کی بہو گھبرا رہی ہے اس بلوچی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس مکان کے آس پاس کوئی بندوق نہ داغی جائے اور خود اس ہندو کے مکان کے باہر پہرہ دینے لگا تاکہ کوئی دوسرا بلوچی لوٹنے آ جائے اس ہندو نے صبح جانے سے جب یہ لیڈر جانے لگے تو بلوچی کو پانچ صد روپے دیئے جو اس نے لینے سے انکار کر دیا کہ ہم خیرات نہیں لیتے پھر کسی وقت لوٹ کر لے جائیں گے۔

ایک مرتبہ کچھ بلوچیوں نے چار مالدار ہندوؤں کے لڑکوں کو یرغمال بنا لیا ان لڑکوں کو اپنے ہمراہ لے جاتے ہوئے اعلانیہ ان کے ماں باپ سے کہہ گئے کہ دس دس ہزار روپیہ دے جانا اور اپنے لڑکے کو لے جانا۔ پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے جب صبح ہوئی تو ان بلوچیوں میں سے ایک لیڈر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ ایک لڑکے کو چھوڑ دیا جائے۔ ساتھیوں نے جواب دیا کہ یہ لڑکا تو سب سے بڑے مالدار کا بیٹا ہے اسے کیسے چھوڑ دیا جائے اس پر اس لیڈر نے کہا کہ آج کی لوٹ میں جو میرا حصہ ہو وہ نہ دینا مگر اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس پر بھی دوسرے ساتھیوں نے کہا کہ تو تو پاگل ہو گیا ہے ہم نہیں۔ اسے ہم ہرگز نہ چھوڑیں گے

اس بلوچی لٹیرے نے بندوق اٹھا لی اور کہا کہ پھر ہم سب کو آپس میں لڑنا ہوگا اور یا اسے چھوڑنا ہوگا۔ آخرکار لٹیروں نے فیصلہ کیا کہ آج کی لوٹ میں اسے کچھ نہیں دیا جائے گا اور اس ہندو لڑکے کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ ہندو لڑکا سارا دن بھوکا پیاسا پیدل چلتے ہوئے واپس گھر آیا تو شام ہو چکی تھی مگر سارے قصبہ میں شور مچ گیا کہ فلاں لڑکا واپس آگیا۔ فوراً پولیس انچارج نے اس لڑکے کو بلوایا اور اس سے دریافت کیا کہ تمہیں کیسے رہا کر دیا گیا۔ اس ہندو لڑکے نے بتایا کہ کچھ روز پہلے ایک بلوچی نے میرے پڑوس والی دکان سے کپڑا خریدا تھا۔ جب کپڑے کی رقم یہ بلوچی دکاندار کو ادا کرنے لگا تو ایک آنہ کم تھا۔ دکاندار نے کہا کہ وہ ایک آنے کا ادھار نہیں کرے گا اور کپڑا اٹھا کر دکان کے اندر پھینک دیا۔ جس پر یہ بلوچی بڑا پریشان تھا۔ میں نے اس بلوچی سے اس کی پریشانی کا سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اسے کپڑے کی اشد ضرورت ہے اور اس کے پاس صرف ایک آنے کی رقم کم ہے جس کی وجہ سے دکاندار اس کو کپڑا نہیں دے رہا۔ (یاد رہے کہ ان دنوں اڑھائی آنے گز بہترین کپڑا ملتا تھا) لہٰذا میں نے اسے ایک آنہ دیدیا کہ جب اگلی بار آؤ تو مجھے ایک آنہ واپس دیدینا۔ اس بلوچی نے نہایت تشکر آمیز نظروں سے شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک آنہ مجھ سے لیکر دوسرے دکاندار کو دیا اور کپڑا لیکر چلا گیا۔ اب اسی بلوچی نے مجھے پہچان لیا اور وہ اپنے ساتھیوں سے لڑنے مرنے کو تیار ہو گیا کہ اسے رہا کر دیا جائے اور میں اس ایک آنہ کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔

ایک مرتبہ کسی بلوچی نے مخبری کی کہ فلاں رات کو شب خون مارا جائیگا۔ وہوا کے پولیس انچارج نے ضلع ڈیرہ غازی خاں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اطلاع دی۔ انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس خاصی نفری میں پولیس کے جوان ساتھ لیکر وہوا پہنچ گیا اور بڑی رازداری کے ساتھ وہوا میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اسی رات بلوچیوں نے اپنے پروگرام کے مطابق شب خون مارا۔ اور یہ سپرنٹنڈنٹ اپنے جوانوں کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ کسی بلوچی کا پہلی گولی لگتے ہی انگریز صاحب بہادر کا ٹوپ (ہیٹ) ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا اور صاحب بہادر نے دوڑ کر ان کے آگے پڑے ہوئے لکڑی کے پھٹے کے نیچے چھپ کر جان بچائی۔ ایک گھنٹہ کے مقابلہ کے بعد بلوچی حملہ آور رات کی تاریکی میں فرار ہو گئے مگر پولیس کے جوان بلوچی حملہ آوروں کی نسبت زیادہ ہلاک ہو گئے اور زخمی بھی۔ چونکہ انگریزی حکومت ان بلوچیوں پر ہوائی جہازوں سے بم برساتی تھی اس لئے یہ لوگ انگریز کو سؤر سے بھی زیادہ بدتر سمجھتے تھے۔ اور یہ ناممکن تھا کہ کسی بلوچی کو کہیں انگریز نظر آجائے اور وہ اس پر بندوق نہ داغے۔ دیسی بندوقوں سے یہ لوگ ہوائی جہازوں کو نشانہ بنا کر گرا دیتے تھے۔

یہ بلوچی اس قول کی منہ بولتی تفسیر تھے کہ جس قوم کے افراد نے جنسی طور پر بلند اخلاقی کا ثبوت دیا اسے کوئی نہیں ہرا سکتا اور یہ حقیقت ہے کہ ان بلوچیوں کو نہ تو انگریزی حکومت مغلوب کر سکی اور نہ ہی اب پاکستانی حکومت انہیں اپنا غلام بنا سکی ہے کیونکہ یہ بلوچی بیشک بھوکے مرنے کی نسبت لوٹ لینے کو ترجیح دیتے تھے مگر ان کی بلند اخلاقی کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ قول و قرار کے پکے۔ کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا خواہ وہ غیر مذہب کی ہو اور اور شب خون مارنے کے وقت بھی کسی عورت کو انگلی تک نہ لگاتا۔ جفاکش اتنے کہ سنگلاخ پہاڑوں میں فصلیں اگائیں۔ اور اخلاق کے اتنے اونچے کہ احسان فراموشی کو گناہ عظیم سمجھیں۔ کسی غیر عورت کو انگلی لگانے کو جہنم کی آگ میں جلنا سمجھیں۔ قرضہ کی ادائیگی کو اپنا فرض سمجھیں حالانکہ قرضہ دینے والوں کی لوٹ کا یہ حال تھا کہ دس روپے کا سامان قرض دیکر ایک سو روپیہ وصول کر لینے کے بعد بھی ان کے اکیس روپے بقایا نکلتے تھے۔ اتنے سچے کہ جھوٹ کا لفظ ہی نہیں جانتے تھے۔ بہادر اتنے کہ اپنی جان کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے رہتے۔ جب کسی قوم کے افراد میں یہ اوصاف ہوں تو بھوکے مرنے کی نسبت لوٹ مار بہتر اور سمجھنے کو بھی ان کا ایک وصف ہی سمجھا جائیگا کیونکہ بھیک مانگنے سے کسی لٹیرے مالدار کو لوٹ لینا کہیں بہتر ہے۔

آج بھی جب ان بلوچیوں کی بلند اخلاقی یاد آتی ہے تو بے اختیار خود زبان سے ان کی تعریف کے کلمات نکلتے ہیں۔ خدا کرے کہ اب یہ لوگ آسودہ حال ہوں۔ کیونکہ اب وہ مسلمانوں کو تو لوٹ نہیں سکتے ۔۔۔

گوشۂ عقیل صدیقی

ابن جوزی

شاید کہ اُتر جائے کسی دل میں کوئی بات

حکماء کا قول ہے کہ مزاج میں اعتدال اور اعضاء میں تناسب کا ہونا عقل کی قوت اور ذہانت پر حجت ہے۔ دماغی طاقت اور اس کی زیادتی پر موٹی گردن دلالت کرتی ہے جس کی آنکھ جلد جلد حرکت کرتی ہو اور اس میں تیزی بھی ہو ایسا شخص فریب کا عادی، اور حیلے باز ہوتا ہے جب سیاہ آنکھ زیادہ چمکیلی نہ ہو، اور اس سے زردی یا سرخی مترشح نہ ہو، تو اس سے بلند حوصلہ طبیعت کا سراغ ملتا ہے۔ جس کی آنکھ چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہو، وہ مکار اور حاسد ہوتا ہے۔ جس کا چہرہ پھولا ہو وہ سمجھدار ہوگا۔ لاغر چہرے اور پستہ قامت میں مہربانی کا اظہار ہوتا ہے۔ میانہ قامت افراد کے حالات عموماً صالح ہوتے ہیں۔

بڑائی کی بات یہ ہے کہ کسی بڑے شخص میں عقل زبان سے بڑی ہو یہ نہیں کہ زبان عقل سے بڑی ہو۔ مہلب بن ابی صفرہ یحییٰ بن خالد کا قول ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ان کے بھیجنے والے کی عقل کا انداز ظاہر کر دیتی ہیں۔ ہدیہ مکتوب اور ایلچی

کسی شخص نے یحییٰ کا قصیدہ پڑھتے ہوئے کہا۔

"آپ احنف سے بھی زیادہ بردبار ہیں۔"

یحییٰ نے سنتے ہی کہا۔ "میں ایسے شخص کو اپنے قریب دیکھنا پسند نہیں کرتا جو مجھے میرے مقام سے زیادہ ظاہر کرتا ہے۔"

ہارون الرشید نے ایک دفعہ اپنے مکان میں بید کا ایک گٹھا دیکھا تو اپنے وزیر فضل بن الربیع سے کہا "یہ کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "عُرُق الرماح" (وہ شاخیں جن سے نیزہ بنتا ہے) عربی میں بید کو خیزران کہتے ہیں۔ فضل نے اس سے گریز کیا کیونکہ ہارون الرشید کی ماں کا نام خیزران تھا۔

ایک خطیب نے کسی دولت مند کی مجلس میں وعظ کیا اس نے خوش ہو کر روپیہ دیا جب خطیب چلا گیا تو اس نے احباب سے کہا۔ شکار کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور جال بھی مختلف ہوتے ہیں اس کا شکار اسی طرح ہو سکتا ہے۔

امام شعبی حمام میں داخل ہوئے تو داؤد ازدی کو بغیر پاجامہ کے دیکھا۔ اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ داؤد نے کہا:

"اے ابو عمرو! آپ کب سے اندھے ہو گئے ہیں؟" شعبی نے جواب دیا جب سے خدا نے تیرا پردہ چاک کیا ہے۔

ابراہیم نخعی کو جب کوئی ایسا شخص تلاش کرتا جس سے وہ ملنا نہیں چاہتے تھے تو خادمہ باہر نکل کر عرض کرتی۔ "ان کو مسجد میں دیکھو۔"

قیس بن زبیر کا قول ہے کہ چار شخص جلد ہی اُبل پڑتے ہیں۔ اولاً مملوک۔ جو خود مختار ہو جاتا ہے۔

ثانیاً کمینہ۔ جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔

ثالثاً۔ لونڈی جو وارث ہو جاتی ہے۔

رابعاً۔ بدشکل عورت جس کا نکاح ہو جاتا ہے۔

ایک اعرابی نے اپنی اہلیہ سے پوچھا۔

تمہاری ہنڈیا کہاں تک پہنچ گئی ہے (یعنی سالن پکنے میں کتنی مدت باقی ہے) اس نے جواب دیا۔

خطیب خطبہ دینے کیلئے کھڑا ہو چکا ہے۔ (ہنڈیا کو جوش آرہا ہے)

• ابو یعقوب خزیمی کے سامنے برتن لایا گیا جس میں کدو ڈال کر پکایا ہوا سالن تھا۔ گوشت تھا نہیں صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔

ابو یعقوب نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے یہ شطرنج کا تختہ ہے جس میں مہرے ہی مہرے ہیں (یعنی ہڈیاں)

پھر فالودہ لایا گیا۔ اس میں میٹھا کم تھا۔

فرمایا۔ "معلوم ہوتا ہے یہ شہد کی مکھی پر وحی آنے سے پہلے کا ہے۔"

• ایک شاعر نے دوسرے شاعر سے کہا۔ شعر تم بھی کہتے ہو مگر میرے اور تمہارے درمیان فرق ہے۔
میرے دونوں مصرعے حقیقی بھائی ہوتے ہیں تمہارے چچیرے بھائی۔ مطلب تھا کہ دونوں میں ربط نہیں ہوتا مصرع اولیٰ مصرع ثانی سے معنوی ہم آہنگی نہیں رکھتا ہے۔

• عبداللہ ابن زبیر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے حضرت عمرؓ بن خطاب کا گذر ہوا۔ تمام بچے انھیں دیکھتے ہی مفرور ہوگئے ابن زبیر کھڑے رہے۔
حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا بات ہے۔ زبیر تم اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگے نہیں؟ زبیر نے کہا۔
امیر المومنین! میں نے کوئی جرم نہیں کیا کہ بھاگتا۔ اور راستہ تنگ نہیں تھا کہ آپ کے لئے گنجائش نکالنے کی ضرورت ہوتی ـــ

• خلیفہ معتصم باللہ اپنے ایک دوست کی عیادت کے لئے ان کے ہاں گئے تو باتوں باتوں میں اس کے بچہ سے پوچھا۔
بیٹا! کون سا مکان اچھا ہے؟ ہمارا یا تمہارا۔ بچہ نے جواب دیا۔ "ہمارا" خلیفہ نے پوچھا "کیوں؟" بچہ بولا "اس لئے کہ ہمارے ہاں فروکش ہیں۔
معتصم نے پھر ایک نگینہ دکھایا۔ اور سوال کیا۔ بیٹا! اس سے بھی بہتر دیکھا ہے" اس نے کہا۔ جی ہاں، وہ ہاتھ جس میں یہ نگینہ ہے۔

• ایک مجذوب اپنی دھن میں جا رہا تھا، ادھر کوتوال شہر اپنی داشتہ کے ہمراہ نکلا، تو داشتہ کی چادر کا پلو مجذوب کے پاؤں تلے آگیا۔ کوتوال بھڑک اٹھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مجذوب کو پیٹنا شروع کیا۔ مجذوب مار کھا کر اٹھا اور ہنستا ہوا چل پڑا تھا کوتوال کا پاؤں اس بری طرح پھسلا کہ گرتے ہی روح قبض ہوگئی۔ لوگ مجذوب کے پیچھے دوڑے۔ "بابا! یہ کیا؟" اس نے کہا۔ "کچھ نہیں یار یاروں کے کام آتے ہیں۔ اس کا دوست اس کے کام آیا تھا۔ میرا دوست میرے کام آگیا۔"

• فرزوق (مشہور شاعر) نے ایک نوعمر لڑکے سے کہا "تجھے اس سے خوشی ہوگا کہ میں تیرا باپ بن جاؤں"۔

اس نے کہا۔
"مجھے آپ کے ماں بن جانے سے خوشی ہوگی تاکہ میرے ابا آپ کی ذہانت سے مستفید ہوتے رہیں۔

• ایک جاریہ محلس میں گا رہی تھی۔ ایک بڈھے نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔
"اے سب سے خوبصورت میں تجھ سے ایک بوسہ کا احسان چاہتا ہوں۔"
اس نے جواب دیا۔
"ہرنی کے بچے اور بڈھے گدھے میں کیونکر ملاپ ہوسکتا ہے"

• محمود وراق سے کسی نے امرا کے محلوں کا ذکر کیا۔ فرمایا "ان کے محل وسیع اور شاندار ہیں۔ مگر ان کی قبریں تنگ اور عاجز ہیں"

• علم اسلام کی حیات ہے اور دین کا ستون ہے۔
• خدا جس کو بھلائی دینے کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ اور اس کی طرف صحیح رہنمائی عطا فرماتا ہے۔
• علم مومن کا دوست ہے اور عقل اس کی دلیل راہ اور عمل اس کی قیمت۔
• درست کاری کرو اور میانہ روی برتو۔
• سخی کا ہاتھ سائل کے ہاتھ سے بہتر ہے۔
• بلند ہمتی ایمان کا ایک حصہ ہے۔
• ظالم اپنے ظلم سے اپنی ذات ہی کو نقصان پہنچاتا ہے۔
• حسن عہد، ایمان کی نشانی ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۶ سے

مجھکو آتا ہے مائل! شب ہجراں کا خیال
جب نظر کرتا ہوں میں (کاکل پیچاں) کی طرف
" " " " " "
جب نظر کرتا ہوں میں (گیسوئے جاناں) کی طرف

"کاکل" اور "گیسو" میں ما فاص فرق ہے یعنی کاکل" سر کے اوپر کے پیچیدہ بالوں کو اور "گیسو" ان لمبے بالوں کو جو سر پیچھے دونوں شانوں پر بکھرے ہوتے ہیں، کہتے ہیں۔ "کاکل پیچاں" اور "شب ہجراں" سے کوئی واسطہ نہیں اس لئے تشبیہ وتمثیل ان دونوں کے مابین عبث۔ اصلاح سے قرینہ قائم کر دیا۔ شعر میں جان پڑ گئی

سعدی شیرازیؒ

ہم نے وہ پھول چُنے ہیں جو گُلستاں میں نہیں

ایک دانشور حلب کے بازاروں میں کہہ رہا تھا۔ دولت مندو، اگر تم میں انصاف اور ہم میں قناعت ہوتی تو سوال کا دستور ہی دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔

کسی نے مشائخ سے پوچھا، تصوف کی حقیقت کیا ہے
انھوں نے جواب دیا پہلے ایک ایسی جماعت تھی جو دنیاوی اعتبار سے پریشان اور باطن میں مطمئن تھی اب ایک ایسی مخلوق ہے جو ظاہر میں مطمئن اور دل میں پریشان ہے۔

ایک بدآواز آدمی کلام پاک پڑھ رہا تھا۔ پاس سے ایک خوش مزاج آدمی گذرا، پوچھا "کیا تنخواہ ملتی ہے۔" بولا کچھ نہیں " "تو پھر گلا کیوں پھاڑتے ہو۔" "خدا کے لئے پڑھتا ہوں" "تو خدا کے لئے نہ پڑھو۔" سہ
گر تو قرآن بدیں غلط خوانی ——— ببرے رونق مسلمانی
اگر تو اس طرح قرآن پڑھے گا تو اسلام کی رونق اڑا دیگا۔

دو دوست اس طرح رہتے تھے جس طرح بادام کی دو گریاں ایک پوست میں۔ یکایک ایک باہر چلا گیا، جب لوٹا تو دوسرے نے قاصد نہ بھیجنے کا گلہ کیا۔ پہلے نے کہا بھائی میں نے گوارا نہ کیا کہ قاصد کی نگاہیں تیرے جمال سے روشنی ہوں اور میں محروم رہوں۔
رشکم آید کہ کسے سیر نگہ در تو کند۔

میں نے ایک مستغرب سے پوچھا۔ تمہارا لڑکوں کے بارے میں کیا خیال ہے — بولا۔
"جب تک نازک اندام ہوتے ہیں ان کی فطرت میں درشتی وسختی ہوتی ہے اور جب درشت وسخت ہوتے ہیں تو ان کی عادت میں دوستی ونرمی آجاتی ہے

ماہ رُو ساتھ ہو، تنہائی ہو۔ دروازہ بند ہو۔ پہرے دار سو رہے ہوں، نفس سرکش ہو اور عرب کہاوت کے مصداق چھوہارا پکا ہو اور باغبان نہ منع کرنے والا۔ تو ایسی حالت میں ممکن ہے کہ پرہیزگاری سلامت رہ جائے؟
اس سوال کے جواب میں دانا نے کہا۔
"اگر اس حالت میں خوبصورتوں سے سلامت رہ جائے تو بدگویوں کی ملامت سے کیونکر بچ سکتا ہے؟"

ایک بڈھے نے دوشیزہ سے بیاہ رچایا۔ خلوت میں اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ مبادا اس کے دل کو صدمہ پہونچے اسے کس کہنہ زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے۔ ایکدن بڈھا اس سے کہہ رہا تھا۔
"جوان اچھے ہیں اور خوب رو، مگر وفا کے میدان میں کسی کے ساتھ نہیں ٹھہرتے، یہ طوطا چشم ہو دیکھو تا بدلتی رہتی ہے۔ یہ بلبلوں کی آنکھ رکھتے ہیں کہ ایک پھول سے دوسرے پھول کی راہ لیتے اور نغمہ گاتے ہیں حکماء کا قول ہے کہ اپنے سے بہتر کی تلاش کر اور غنیمت سمجھ، کیونکہ برابر کے ساتھ میں گمراہی کا اندیشہ ہے"
دوشیزہ نے سرد آہ کھینچی اور کہا۔
"زنِ جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند بہ از آنکہ پیرے"
"جوان عورت کے پہلو میں بڈھے کی بہ نسبت تیر کا ہو جانا بہتر ہے۔

ایک کنجوس زردار کا بیٹا بیمار ہو گیا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ کوئی قربانی کر دو، یا قرآن کا ختم۔
کنجوس نے سوچا۔ اور بولا۔ "قرآن مجید کا ختم اچھا ہے کہ مصحف گھر میں ہے۔ قربانی میں دیر لگے گی کیونکہ منڈی دور ہے۔" ایک خوش طبیعت پاس بیٹھا تھا۔ اس نے

"جی ہاں! قرآن نوک سناں پر ہے، اور روپیہ درمیان جاں "

پھر مثنوی کا ایک شعر پڑھا، جس کا مفہوم ہے کہ اطاعت کے لئے تو گردن جھکالی ہے۔ کاش اس کے ساتھ بخشش کا ہاتھ بھی شریک ہوتا ۔

ایک مالدار اتنا ہی بخیل تھا۔ جتنا حاتم طائی سخی تھا جو جان دے سکتا تھا، لیکن اپنے ہاتھ سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ابوہریرہؓ کی بلی اور اصحاب کہف کے کتے کو دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ حتیٰ کہ پرندے اس کے دسترخوان سے بچے کھچے ریزے بھی نہ چن پاتے تھے ۔

ایک چور نے ایک فقیر سے کہا " تجھے شرم نہیں آتی کہ ایک مٹھی بھر چاندی کے لئے ہر لئیم کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے ۔

جس کسی نے اپنے اوپر سوال کا دروازہ کھول لیا۔ وہ موت کے دروازے تک حقیر رہے گا۔ فقیر وہ ہے جو سوال سے مستغنی ہو

ایک سوداگر کو کاروبار میں ہزار اشرفی کا نقصان ہوگیا اس نے بیٹے کو نصیحت کی، کسی سے ذکر نہ کرنا۔ بیٹے نے پوچھا اس میں مصلحت کیا ہے۔ باپ نے کہا، بیٹا اس سے مصیبت دہری ہو جاتی ہے۔ یکے نقصانِ مایہ دیگر شماتتِ ہمسایہ

میں ایک مکان خریدنے کی فکر میں تھا۔ دیکھا پسند آگیا۔ پڑوس میں یہودی تھا۔ کہنے لگا خرید لو، اس میں کوئی عیب نہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ کہا۔ " ایک عیب ضرور ہے " کہنے لگا " وہ کیا؟ "
جواب دیا۔ " یہ کہ تو میرا ہمسایہ ہوگا۔

مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہو؟ کیا یہ کافی نہ ہوگا کہ مجھ پر احسان نہ کرو، یا میری غیبت نہ کرو ۔

غصہ میں تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالنا۔ اس کی دھار دانتوں میں کاٹتا ہے ۔

ہمدان کا ایک قاضی نعل بند کے لڑکے پر فریفتہ ہو گیا۔ اتفاقاً اس لڑکے سے قاضی کی مڈبھیڑ ہوگئی ۔
لڑکے نے گالیاں دیں قاضی یہ کہتا ہوا نکل گیا ۔
" دوست کی مار منقّے کی طرح شیریں ہے "
" محبوب کے ہاتھ سے تھپڑ کھانا، دوسرے کے ہاتھ کی روٹی کھانے سے بہتر ہے ۔ "
" نیا نیا انگور کھٹا ہوتا ہے، دو تین دن صبر کرنے سے میٹھا ہو جاتا ہے ۔

سعدی عشق بازی کے طور طریقے اس طرح جانتا ہے جیسے بغداد میں زبانِ عربی ۔

خوبصورت کے منہ سے پیاز کی بو، اس سے بہتر ہے کہ بدصورت کے ہاتھ سے پھول ملے ۔

مرد کا زیور اس کی جوانی ہے ۔

دین درستیِ معاملہ کا نام ہے

جو شخص ظالم کے ظلم کی اعانت جان بوجھ کر کرے وہ مسلمان نہیں ۔

حق بات کہو، اگرچہ تلخ و ناگوار گذرے ۔

خطرے کا راستہ چھوڑ کر قابلِ اختیار راستہ اختیار کرو ۔

دین خیر خواہی کا نام ہے

حیا ایمان کی شاخ ہے ۔

اصلاحِ سخن

خان زادہ مذاقؔ العیشی کی غزل پر جناب ابوالاقبال علامہ عیشؔ مدظلہٗ کی اصلاح

قولہ مذاقؔ — مجبور ہوکے جذبۂ بے اختیار سے
میری "طرح سے" وہ مجھے دیکھیں گے پیار سے

اصلاح — مجبور ہوکے جذبۂ بے اختیار سے
میری "ہی طرح" وہ مجھے دیکھیں گے پیار سے

توجیہ۔ مصرع ثانی میں "طرح سے" اگرچہ بعض اساتذہ اب بھی اسکے استعمال کو صحیح سمجھتے ہیں۔ لیکن در اصل "سے" ما زائد ہے۔

قولہ مذاقؔ — لپٹا ہوا ہوں دردِ دلِ بے قرار سے
ہے مجھکو ساز "منظرِ" ناسازگار سے

اصلاح — لپٹا ہوا ہوں دردِ دلِ بے قرار سے
ہے مجھ کو ساز "عالم" ناسازگار سے

توجیہ۔ مصرعہ ثانی ترمیم کا محتاج تھا۔ مضمون نہایت پردرد ہے اس موقعہ پر "منظر" سے "عالم" بہت وسیع المعنیٰ ہے۔

قولہ مذاقؔ — وہ توبہ توڑ دی "ترے" میکش نے ساقیا
وہ بوند ٹپکی دامنِ ابرِ بہار سے

اصلاح — وہ توبہ توڑ دی "کسی" میکش نے ساقیا
وہ بوند ٹپکی دامنِ ابرِ بہار سے

توجیہ۔ اس شعر کے کیا کہنے۔ اے سبحان اللہ "ترے" کی ضرورت نہ تھی۔ ترمیم سے شعر میں حسن آگیا۔ بے پناہ شعر ہے۔ بارک اللہ۔

قولہ مذاقؔ — دریا دلیِ ساقیِ محفل کا تذکرہ
"ملتا" ہوا ہے ظرفِ دلِ بادہ خوار سے

اصلاح — دریا دلیِ ساقیِ محفل کا تذکرہ
"چھلکا" ہوا ہے ظرفِ دلِ بادہ خوار سے

توجیہ۔ کتنا اچھا مضمون ہے لیکن استاد کی اصلاح نے شعر کو اور بھی چمکا دیا۔ اگرچہ بظاہر اصلاح کی ضرورت نہ تھی۔ سبحان اللہ۔

قولہ مذاقؔ — تا صبح "شغلِ ساغر و مینا" ہے اور ہم
صحبت ہے گرم زاہدِ شب زندہ دار سے

اصلاح — تا صبح "ذکرِ بادہ کشی" ہے اور ہم
صحبت ہے گرم زاہدِ شب زندہ دار سے

توجیہ۔ اگرچہ اصل شعر بھی اپنے مفہوم پر حاوی اور پرلطف ہے لیکن استاد کی اصلاح نے ایک صحیح واقع کی تصویر کھینچ دی ہے۔

قولہ مذاقؔ — "تیرِ نگاہ کی ترے" اللہ رے شوخیاں
ناوک یہ بڑھ گیا ہے دلِ بے قرار سے

اصلاح — "تیرِ نگاہِ نازکی" اللہ رے شوخیاں
ناوک یہ بڑھ گیا ہے دلِ بیقرار سے

توجیہ۔ مصرعہ اولیٰ میں تیر بیکار تھا۔ اس کے علاوہ "ترے" اپنی جگہ سے بہت ہٹ گیا تھا۔ اصلاح سے شعر میں روانی آگئی۔ خوب شعر کہا ہے۔

قولہ مذاقؔ — وہ ہنس پڑے جو دیکھے گریاں کناں مجھے
"کھل اٹھے" پھول دامنِ ابرِ بہار سے

اصلاح — وہ ہنس پڑے جو دیکھے اچشم تر مجھے
"برسے ہیں" پھول دامنِ ابرِ بہار سے

توجیہ۔ اصل شعر بھی خوب ہے اور اصلاح کی بالکل گنجائش نہ تھی لیکن ترمیم سے زورِ بیان کی خوبیاں بڑھ گئیں اور شعر فصیح تر ہوگیا۔

(سر دو تلفہ)

بابِ تنقید

(ادارہ)

پہیلیاں مرتبین :- جناب شہباز حسین۔ نند کشور وکرم۔ سائز ۳۰×۲۰/۸ حجم ۸۰ صفحے کاغذ بہت اعلیٰ قسم کا۔ چھپائی آفسیٹ۔ کتابت بہتر۔ جلد خوبصورت۔ قیمت آٹھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ پبلیکیشنز ڈویژن۔ وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند نئی دہلی۔ یا دفتر ماہنامہ شانِ ہند، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کے شعبہ مطبوعات نے پہیلیوں کا یہ مجموعہ اچھے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ امیر خسرو، سودا، انشاء اور ظفر ایسے بلند پایہ شاعروں کی پہیلیاں اس مجموعہ میں جمع کر دی گئی ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۵۰۴ ہے آخر میں پہیلیوں کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔

بچوں کے بین الاقوامی سال کے پیش نظر یہ اولین کتاب ہے جو واقعی بچوں بلکہ بچوں کے والدین کے لئے بھی دلچسپ مفید اور کارآمد ہے۔ اس مجموعہ کے مرتبین جناب شہباز حسین اور نند کشور وکرم (مدیران ماہنامہ "اردو آجکل") مبارک باد کے حقدار ہیں جنہوں نے بچوں کے لئے ایسا بہترین تحفہ ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ ایسا ہے کہ ہر لائبریری کے علاوہ ہر ایسے گھر میں بھی ہونا ضروری ہے جس میں کوئی اردو خواں موجود ہو۔

رنجیت سنگھ مصنف :- نریندر کرشن سنہا۔ مترجم کیلاش چندر چودھری۔ صفحات ۲۲۴ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت ترقی اردو بورڈ کی روایات کے مطابق قیمت نو روپیہ پچیس پیسے۔ ناشر ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم، نئی دہلی ۲۲ سے یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے طلب کر سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں انگریزی کتاب (THE REAL RANJIT SINGH) عالیجناب دیوان آنند کمار صاحب کے ہاں نظر سے گزری جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر خارجہ فقیر عزیز الدین صاحب کے کسی نام لیوا نے لکھی ہے۔ یہ کتاب جستہ جستہ پڑھنے کے بعد خیال ہوا کہ اگر یہ کتاب اردو میں منتقل ہو جائے تو یقینی طور پر اردو داں طبقہ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں کئی نئی باتیں معلوم ہوں۔

پچھلے ہفتے جناب شارب ردولوی پرنسپل پبلیکیشنز آفیسر بیورو فار پروموشن آف اردو سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے نریندر کرشن سنہا کی انگریزی تصنیف رنجیت سنگھ کا اردو ایڈیشن تبصرہ کے لئے دیا۔ جسے کیلاش چندر چودھری نے اردو ترجمے کا روپ دیا ہے۔

کتاب کے دیباچہ میں سنہا صاحب نے اعتراف فرمایا ہے کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن خود ان کے لئے ندامت کا باعث تھا۔ اب یہ ایڈیشن پوری طرح نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ اور واقعات زیادہ معقولیت سے پیش کئے گئے ہیں مگر اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ "دی ریئل رنجیت سنگھ" کے مقابلہ میں سنہا صاحب کی کتاب کئی لحاظ سے نہ صرف نامکمل ہے بلکہ اس میں کئی واقعات اپنی اصل شکل و صورت مسخ کر بیٹھے ہیں۔ سنہا صاحب نے ۴۴ کتابوں سے استفادہ کیا ہے مگر اس کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ کاش کہ ترقی اردو بورڈ کے ارباب بست و کشاد "دی ریئل رنجیت سنگھ" کا مطالعہ کریں اور اس کتاب کا اردو ترجمہ کسی ماہر مترجم سے کرائیں تو یقیناً اردو میں ایک ایسی کتاب کا اضافہ ہوگا جس پر تاریخ فخر کرے گی۔

سنہا صاحب کی یہ تصنیف "مہاراجہ رنجیت سنگھ" سے متعلق اردو میں قابل مطالعہ ضرور ہے کیونکہ اس کتاب کے علاوہ رنجیت سنگھ پر اردو میں کوئی دوسری کتاب ہے ہی نہیں ہے

●●●●

سرگذشت بہ ہوساں

[illegible]

[illegible] کی [illegible]

[illegible] میں لیٹ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا

تھا کہ [illegible] واقعہ کیا تھا۔ کیا وہ کہیں باہر گیا [illegible]

[illegible] پڑے رہنے کے کیا معنی۔؟

اس نے اپنے جسم کو ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ جھٹکے دیئے

[illegible] یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے حواس میں ہے۔

آخر وہ بستر پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن کھڑے ہوتے ہی

چکرا کر گر پڑا۔ ایں ..... یہ کیا؟!!

اس کا سر [illegible] آخر کیوں! کوئی وجہ — کیا؟!

کیا بات ہے آخر —؟!!!

وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر سے [illegible] کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

بھلا —!

اس نے تو دروازے اور دریچے سب بند کر رکھے تھے پھر کوئی آئے بھی تو کیونکر؟ آخر انتہائی کوشش کر کے سر کو تھامتے ہوئے اٹھا۔ اور کنڈی کھول دی۔

"اوہ — مسعود۔ تم ہو! آ جاؤ۔"

اشرف نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کے کیا معنی کہ تم اب تک بستر پر پڑے ہو؟

اب پوچھتے بھی ہو۔ رات بھر الجھاتے رہے۔ حالانکہ میں نے پہلے ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ شراب تو کجا میں کسی ہلکے قسم کے نشے کا بھی عادی نہیں ہوں۔

"اب ہو جاتا ہے" مسعود نے قہقہہ لگایا۔ اس بے معنی قہقہہ کی آواز اشرف کے کان میں بہت ہی کرخت معلوم ہوئی۔

ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے ملازم لڑکے نے آ کر کہا۔

"[illegible] — بیگم [illegible] سے آپ کو بلا رہی ہیں۔ میں کئی دفعہ

دیکھ بھی گیا ہوں لیکن دروازہ اندر سے بند تھا اس لئے باہر سے پکارنے کی ہمت نہ پڑی —"

"اچھا آتا ہوں" اتنا کہہ کر اشرف پھر مسعود کی طرف مخاطب ہوا۔ "اچھا دوست۔ اس وقت جاؤ۔ کل سے میں گھر میں گیا تک نہیں۔ پھر ملاقات ہوگی۔"

"شام کا پروگرام معلوم ہے نا؟" مسعود نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ معلوم ہے۔"

اس نے ذرا بے دلی سے کہا۔

تو پھر یاد رکھنا۔ میں چھ بجے شام کو آ جاؤں گا تیار رہنا۔

۲

تمام دن کوئی خیال اسے روحانی تکلیف دیتا رہا۔ ہاں! کوئی نازیبا حرکت۔ جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ آج بیوی کے سامنے جاتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

صبح جب وہ اندر گیا تھا تو بیوی نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے۔ اس کی رات بھر کی غیر حاضری کا سبب دریافت کیا تھا۔ لیکن اس نے سینما جانے کا بہانہ کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جائے ..... کہیں منہ چھپائے۔ دن گذرتے ہی شام کو مسعود پھر آ پہونچے گا۔ پھر وہی تنویر کا گھر — گانا اور ناچ۔ شراب کا دور — بے سر و پا حرکتیں ......!

(اس کا ارادہ کتنا مستحکم تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خوش اطواری کو دھبہ نہیں لگائے گا۔ کبھی اپنے اخلاق کو نہ بگاڑے گا لیکن آج — آج کس نے اس کے ارادے کو یوں ڈانواں ڈول کر دیا کیوں۔ کیوں اس نے مسعود کی باتیں سنیں۔ کیوں وہ ایسی بد اخلاق حرکات کا مرتکب ہوا۔)

[illegible] —

لیکن پھر کیا کیا جائے۔ زندگی [illegible]

بیوی — اونہہ —!

"تو اس کی صورت (غالباً) میرت۔ کیا کبھی اس نے نرمی و محبت کی دو باتیں مجھ سے کی تھیں۔ کبھی اس نے میرے آرام کا میری مسرت کا کچھ خیال کیا تھا —؟ پھر —؟

پھر بھی —!

پھر بھی اسے اپنا گھر آرام دہ بنانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی (اب اس کا نفس اسے ملامت کرنے لگا)

ہاں —!

یہ سچ ہے کہ اس کی بیوی نے کبھی اس سے اظہار محبت نہیں کیا۔ لیکن یہ بھی تو درست ہے کہ اس نے خود بھی کبھی بیوی کے ساتھ خلوص و محبت سے بات چیت نہیں کی تھی۔ یہ کس قدر بے انصافی تھی کہ وہ بیوی کو ایک بیوقوف احمق ہستی سمجھتا تھا۔ جو گھر کی چار دیواری میں رہ کر امانہ داری کے کام انجام دینے کو پیدا کی گئی ہو۔

اس کی شادی کو تین چار سال کا عرصہ گذر گیا تھا اس کی بیوی نے کتنی ہی دفعہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے کوئی کتاب لادی جائے تاکہ فرصت کے وقت وہ مطالعہ کیا کرے۔ یا کبھی کبھی اطمینان سے وہ گھر میں بیٹھا کرے تاکہ تبادلۂ خیالات سے معلومات میں اضافہ ہو۔ یا فرصت کے وقت تفریح کے لئے کہیں سیر کو جایا جائے لیکن اس نے اس کی خواہشات کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

اسی طرح وہ گہری فکر میں غرق تھا۔ اس وقت اسے ہوش آیا جب وہ دوبارہ مکان میں بلایا گیا۔

وہ اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ اسے نہانے دھونے تک کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ اس وقت اٹھا نہا دھو کر کپڑے بدلے اور مکان کے اندر گیا۔ بیوی کھانے پر انتظار کر رہی تھی۔

اشرف کھانے پر بیٹھا تو اس نے کہا۔

"کیا بات ہے آج کہ تم صبح سے باہر ہی ہو۔ کئی روز کی چھٹی تھی کہیں سیر کو چلتے تو دلچسپی رہتی۔ اکیلے میں میری طبیعت گھبراتی ہے۔"

نہیں سیر کی فرصت کہاں۔ آفس کے کام کے متعلق کچھ لکھنا ہے پھر کسی روز دیکھا جائے گا۔"

نعیمہ نے اس کی بے دلی کے انداز پر غور کیا پھر کہنے لگی۔

"رات بہت دیر سے آئے تھے۔ سینما تو بارہ بجے ختم ہو جاتا ہے۔ تم تو تقریباً تین بجے آئے تھے۔ مجھے معلوم ہے لیکن مجھے بھی تو بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے ؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے نعیمہ۔ اس ذکر کو جانے دو" اشرف نے روکھے پن سے کہا "ممکن ہے آج بھی مجھے جانا پڑے"

نعیمہ بالکل خاموش ہو گئی۔

کھانا ختم ہوتے ہی اشرف باہر چلا آیا اور بستر پر لیٹ رہا اب اس کے خیالات کا سلسلہ بالکل دوسرے رخ پڑا۔ دل میں ایک گدگدی سی محسوس ہوئی تنویر کا چھوٹا سا مگر خوبصورت مکان ہلکے ہلکے فرنیچر ون سے سلیقے کے ساتھ سجا ہوا تنویر کا حسین چہرہ — اس کی گفتگو کا انداز — اس کا خوش اندازی سے گانا اس کی مہمان نوازی۔ اس کا محبت بھری نظر دل سے دیکھنا دوبارہ جانے کی بار بار تاکید کرتا تھا۔ سب مل جل کر ایک کشش کی طرح اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔

اچھا —!

اگر صرف آج وہ چلا جائے تو کیا حرج ہے —! صرف آج کتنا اچھا گاتی ہے — وہ تنویر — نام بھی کس قدر پیارا ہے اگر آج وہ اس کا گانا سننے چلا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ......!

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بج رہے تھے .... اسے اپنے دوست کا خیال آیا۔ مسعود اب آ ہی جائیگا۔ صبح تو وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں چھپ جائے تاکہ مسعود سے ملاقات ہی نہ ہو۔ لیکن اب بلا ارادہ وہ اٹھا۔ منہ دھویا بال سنوارے بہترین لباس زیب تن کیا اور خود ہی مسعود کا انتظار کرنے لگا۔

۳

تنویر کی دل لبھانے والی اداؤں نے اشرف کو بالکل ہی دیوانہ بنا ڈالا۔ جب اس نے یکایک اٹھ کر بے تکلفی سے اسکے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور اشرف کی خوبصورتی کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیئے۔ اپنا ایک خوشبو میں بسا ہوا ریشمی رومال خود ہی اشرف کو تحفہ میں دیدیا۔ اسی وقت اشرف نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مسعود غائب تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے والہانہ بغلگیر

ہوتا گیا۔ (خواہشات کے غلام انسان نفس کی لذتوں کو روحانی سکون پر ترجیح دینے والے گمراہ فلسفی تیرے جوہر ذاتی کا اللہ مالک ہے)

آج تنویر اس کی نظروں میں اس قدر حسین تھی جیسے چودہویں رات کا چاند۔ اس کی ہر ادا رنگین اس کی ہر بات شیریں گویا اشرف کے لئے وہ سراپا کیف و سُرور ملیح و خوش انداز پتلی تھی۔ وہ بار بار اس کے نرم خوبصورت جسم کو بھینچ رہا تھا۔ بے بہ بے بوسے لے رہا تھا۔ اسے نا معلوم کس کس طرح پیار کر رہا تھا آخر اس نے بے اختیار ہو کر کہا۔

" پیاری تنویر۔ اگر میں اسی طرح تمہارے ساتھ رہ سکتا فقط تمہارا ساتھ ہوتا اور بس میں ہوتا اور تم۔ میں اپنی جان تک تمہارے اس بے داغ حسن پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔ تم ہی ہو جس نے میری خواہشات کو رنگین شبستانوں کی لذت سے آشنا کیا۔ میرے دل اور دماغ میں مسرت کا طوفان اٹھا یا۔ ورنہ زندگی تو ایک خشک ریگستان کی مثال تھی۔

تنویر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ شکار ہاتھ آ گیا ہے، اب اسے بس میں رکھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس نے اشرف کو لپٹا لیا۔ اور محبت بھرے لہجے میں بولی

اشرف۔ میری اپنی بھی یہی حالت ہے۔ دیکھو تو سہی اب میں نے کسی دوسرے سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا ہے اسلئے کہ میرے دل و دماغ میں تمہارے خیال کے سوا اور کسی شے کا گذر نہ ہو۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ میں تو صرف محبت کی بھوکی ہوں۔

اشرف نے ایسی باتیں پہلے کہاں سُنی تھیں۔ وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ اب دنیا میں اسے تنویر کے سوائے کوئی شے نہیں بھاتی تھی۔

اسی قسم کی اور بھی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر تنویر نے پیار پیار میں رفتہ رفتہ چیزوں کی فرمائش شروع کر دی۔ ان فرمائشوں کو جوش و جنوں کی حالت میں اشرف نے بلا عذر قبول کر لیا اس وقت اسے ذرا بھی خیال نہ آیا کہ اتنی فرمائشیں وہ پوری بھی کر سکے گا یا نہیں۔

۴

تنخواہ ملتے ہی، اشرف سیدھا بازار گیا۔ اور تنویر کی حسب فرمائش تمام اشیاء خرید لیں۔ قریبًا پانچصد روپے اُٹھ گئے۔ تمام اشیاء رفرمائش تنویر کے گھر بھجوا کر مکان کا رخ کیا۔

بیوی کے ہاتھ میں جب آٹھ سو کی بجائے تین سو روپے دیئے گئے تو وہ حیرت سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

اشرف نے کہا۔

" نعیمہ میرے ایک دوست نے پانچصد روپے بطور قرض لئے ہیں پندرہ روز کے اندر ادا کر دینے کا وعدہ کیا ہے کیا کروں مجبورًا دینے ہی پڑے۔ یہ روپیہ تو لو۔ اور ضرورت ہو تو مجھے پھر کہنا۔

اور وہ جواب کا انتظار کئے بغیر ہی باہر کی طرف لوٹا نہ ہوا۔ کہ نعیمہ نے اُسے ہاتھ سے تھام لیا۔ اور تاسف انگیز لہجے میں بولی۔

" دیکھئے صاف صاف کہئے کہ معاملہ کیا ہے۔ اس قدر گھبراہٹ کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ جس کو تم پوری کوشش سے چھپا رہے ہو۔ مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوا ہے تو میں نادم ہوں۔ میری کوئی حرکت یا عادت تمہیں بُری معلوم ہوتی ہے تو کہو۔ تاکہ میں اپنی ہر بات تمہاری پسند کے مطابق بنانے کی کوشش کر دوں"

لیکن اشرف کے لئے یہ تمام باتیں بے اثر ثابت ہوئیں وہ اور کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے نعیمہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور خفگی سے بولا۔

" رہنے دو، ان باتوں کو مجھے زیادہ بک بک کرنے کی فرصت نہیں۔"

شام کو پھر وہی طور تھے۔ اشرف بن سنور کر تنویر کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ جاتے ہی اس کی نظر پہلے ان چیزوں پر پڑی جو اس نے آج بھیجی تھیں۔ کمرے میں کچھ نئی چیزوں کا اضافہ تھا ہر چیز خوش سلیقگی کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔

تنویر ایک طرف سے پردہ اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی اُف!!! کس بلا کا بناؤ تھا۔ کتنا خوبصورت سنگھار تھا۔ آج اشرف کا دل بلیوں اُچھلا پڑتا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی میں اس کا حُسن فوارے کی صورت اُبلا پڑتا تھا۔ تنویر نے پہلے اپنی پیاری

کا شکریہ ادا کیا۔ اور ہر ایک چیز کی حد سے زیادہ تعریف کی۔
اشرف نے تنویر کو دیکھا اور خوب ڈوب کر بغور دیکھا
"تنویر تمہاری بے عیب خوبصورتی میں کسی شے کی کمی رہ
گئی ہے۔ جو اس وقت میری نظروں میں سامنے کھٹک رہا ہے
ہاں۔ ہاں یاد آیا۔ وہ زیور کیوں نہیں پہنے کیوں اتار کر رکھ
دیئے ہیں۔
تنویر نے قدرے مچلتے ہوئے نہایت افسردگی میں ڈوبے
ہوئے کہا۔
"وہ زیور تو میرے نہ تھے اشرف۔ مانگے کی چیز کے
پیوند رکھ سکتی ہوں۔ آخر واپس دیدی گئی۔
اشرف نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں کہا تو وہ کوئی بہت
روپیہ والا آدمی ہے۔
"اچھا یہ بات ہے تنویر۔ مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا
[illegible] ہونا میں تم جیسی نازک کلی کو موتیوں سے آراستہ کر ڈالتا
اچھا فکر نہ کرو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ دوچار روز ہی میں اس
کا بندوبست بھی کرے دیتا ہوں۔"
تنویر نے اسے بیوقوف بنانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی
تھی خوشامدیں کرتی اور جہاں تک ممکن ہوتا خاطر و تواضع میں
بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی تھی اور کچھ ایسا ہی انتظام کیا ہوا تھا کہ
اشرف کو خیال تک بھی نہ گذر سکے کہ وہ اس کے سوا کسی اور سے
راہ و رسم رکھتی ہے۔

۵

نعیمہ شوہر کو اداس دیکھ کر فکر و اضطراب سے نڈھال ہو
گئی۔ اسے اندیشہ ہوا کہیں اشرف کسی نئی مصیبت میں تو گرفتار نہیں
ہو گیا۔ قریب آکر اس نے دریافت کیا۔
"کیوں کیا بات ہے۔ اس قدر پریشانی کس لئے"
جواب میں اشرف زار زار رونے لگے۔ شوہر کے خلاف معمول
حرکت سے متحیر ہو کر نعیمہ نے پے درپے سوالات کئے جن کے جواب
میں اشرف نے کہا کہ کچھ روز ہوئے اس نے ایک دکاندار سے روپے
قرض لئے تھے جس کی ادائیگی وقت پر نہ ہونے کے سبب اس نے
نالش کی دھمکی دی ہے۔ اگر اس نے نالش کر دی تو میں کہیں کا بھی
نہ رہ جاؤں گا۔ میری عزت برباد ہو جائے گی۔ پیاری نعیمہ
بتاؤ میں کیا کروں۔ اس ذلت سے کیونکر چھٹکارا ہو۔ اتنا کہہ کر
وہ بیوی کی طرف نہایت مایوسانہ انداز سے دیکھنے لگا۔
نعیمہ یہ سن کر کپکپا اٹھی۔ گھبرائی ہوئی بولی۔ کہو پھر کیا کیا جائے
میری جان تک تمہارے لئے حاضر ہے۔ میں عورت ہوں کہیں
آجا نہیں سکتی۔ میرے میکے والے بھی اتنے امیر نہیں کہ یہ رقم ادا کر
سکیں۔
بیشک نعیمہ تم درست کہتی ہو۔ اشرف نے ڈوبتی ہوئی آواز میں
کہا۔ مگر ایک صورت ہے۔ کیا کروں کہتے ہوئے بھی جان جاتی ہے
اچھا کہہ ڈالوں۔
"پیاری نعیمہ اگر کچھ روز کے لئے تم اپنے زیورات دے دو
تو یہ تمام مصیبت ٹل جائے۔ زیور رکھ کر قرض ادا کیا جا سکتا ہے
نعیمہ کیا تم [illegible] یہ قربانی کر سکتی ہو۔
"کیوں نہیں" نعیمہ کہتے ہوئے اٹھی۔ اور زیورات کی
پٹاری اٹھا لائی۔ اور اپنے شوہر کے حوالے کر دی۔ نعیمہ کے چہرے
پر اس وقت ذرا بھی افسردگی کی جھلک نہ تھی۔ اسے مسرت محسوس
ہو رہی تھی۔ اشرف کا چہرہ بشاشت سے شگفتہ ہو گیا۔ اس نے
نعیمہ کی طرف محبت بھرے انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"پیاری نعیمہ۔ مجھے یقین نہیں پڑتا تھا کہ تم اتنی بڑی قربانی
بھی کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ گی۔ اپنی سنگھار کی چیزیں مجھے اٹھا
کر دیدو گی۔ اچھا میں انہیں بہت جلدی واپس لانے کی کوشش
کروں گا۔
اس نے بیوی کی طرف دل و جان قربان کرنے والی نظروں
سے دیکھا۔ اور مسکراتے ہوئے زیورات کی پٹاری لئے ہوئے
باہر کا رخ کیا۔
وہی تنویر کا جگمگاتا ہوا مکان۔ وہی مسکراتی ہوئی [illegible]
کا رقص [illegible] اشرف فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ زیورات
سے جگمگاتی ہوئی تنویر کو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا
یہ اس کی بیوی کے زیور تھے۔ جنہیں صاف کروا کے اس نے تنویر کو
اپنے ہاتھوں پہنائے تھے۔ وہ اشرف کی فرمائش پر کچھ دیر محبت
بھرے نغمے گاتی رہی اور اشرف کی بلائیں لیتے ہوئے مستانہ وار

رقص کرتی رہی اشرف اس جنسیات کی دُنیا کو پیچھے چھوڑ کر بہت دُور آگے کسی فردوسی وادی میں محو تصور تھا جہاں وہ تھا۔ اور فقط اس کی تنویر ــــ

آج تنویر کے حسن و جوبن کی بہاریں جنتوں کی رنگینیاں بلو میں لے کر اشرف کے قلب و نظر پر جھکی ہوئی تھیں۔ جو اس طرح سے لٹک لٹک کر گا رہی چلی جا رہی تھی۔ کہ ہر لٹک پر اشرف مٹا جاتا تھا۔ آخر پیمانہ و صراحی کے دور چلے۔ جام پر جام ــ انڈیلے گئے۔ اشرف معمول سے زیادہ پی گیا۔ اسے اتنی بھی خبر نہ رہی وہ اس رنگین بہار سے پوری طور پر لطف اندوز بھی نہ ہو سکا

جب تنویر نے دیکھ لیا کہ یہ بالکل مدہوش ہو چکا ہے تو اس نے اسے کھینچ کر ایک طرف کر دیا۔ اور آپ خود دوسرے تماشائیوں کی انتظار میں حسن کی جوالا بن بیٹھی

اشرف روز و شب اسی دھن میں محو رہتا۔ گھر بار اور لواحقین کا خیال تو ایک طرف وہ اپنے دفتر کے کام کی طرف سے بھی کچھ بے پروائی برتنے لگا۔ ساری ساری رات بیدار رہنے کے باعث وہ دفتر میں اس پہلی سی مستعدی کے ساتھ کام بھی نہ کر سکتا۔ مگر یہ رنگینیاں اسے اپنے میں جذب کر چکی تھیں۔ اب اس کا اپنا ارادہ اور اپنا تصرف کچھ بھی وقعت نہ رکھتا تھا۔ یہ بے پروائیوں کا سلسلہ اس نوبت تک پہنچ گیا تھا کہ ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ نوکری سے علیحدہ کر دینے کی دھمکی دی۔ مگر اشرف کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔

ایک شام کو اشرف کئی طرح کے خیالات میں ڈوبا ہوا تنویر کے مکان پر پہنچا۔

اس نے دیکھا کہ تنویر بہت سے آدمیوں میں گھری ہوئی مستانہ وار گا رہی ہے۔ شراب کا دَور چل رہا ہے۔ تنویر اتنی محو و مصروف تھی کہ اسے اشرف کے پہنچنے کی خبر تک نہ ہوئی ــــ یوں۔ کیا معنی۔

تنویر نے تو کہا تھا کہ وہ فقط اسی کو چاہتی ہے اور سب سے راہ و رسم ترک کر دی ہے۔ اس کے دیئے ہوئے زیورات اس وقت بھی تنویر کے جسم پر چمک رہے تھے اور وہ خوب لٹک لٹک کر ادا سے گا رہی تھی۔

یکایک اشرف کے دل و دماغ بے قابو ہو گئے۔ اس نے تنویر کو گردن سے پکڑ لیا۔ اور نہایت غصہ میں تھرتھراتا ہوا بولا ۔ کیا اس لئے تجھے ان زیوروں سے آراستہ کیا تھا کہ ان کی زیبائش سے تو دوسرے لوگوں کو لطف اندوز کرے۔ اس نے اپنی بیوی کو دھوکہ دیا۔ اور تو مجھے دھوکہ دے رہی ہے۔ دیدے بدبخت مجھے دیدے۔ اتار میرے دیئے ہوئے زیورات اتار ــــ دے میری تمام دی ہوئی چیزیں واپس دے۔

یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ سب لوگ اشرف پر ٹوٹ پڑے۔ اشرف بھی نشے میں تھا۔ اور وہ لوگ بھی ــ خوب مار پیٹ ہوئی۔ تنویر اسی دوران میں وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

ہنگامہ بڑھ گیا۔ بوتل ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اور اشرف چیخ مار کر فرش پر گر پڑا۔

(۷)

اشرف کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو سڑک کے کنارے پڑا پایا۔ اور اپنے گرد پولیس والوں کو دیکھ کر سخت متعجب ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سنبھلا اور حواس درست کئے تو اسے معلوم ہوا کہ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ کپڑے پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔ رات کا تمام واقعہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ابھی کسی نتیجے پر پہنچنے نہ پایا تھا کہ ایک سپاہی نے بڑھ کر دو چار سنتر جمائے اور خون لگنے کا سبب دریافت کیا۔ جب کوئی معقول جواب نہ بن آیا تو انھوں نے تھانے پر پہنچایا۔

وہ شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اور اس کی نظریں اس دوست نما دشمن مسعود کو ڈھونڈ رہی تھیں جس نے دوست کا رویہ اختیار کر کے اس سے دشمنی کی تھی۔ اسے لوٹ لیا تھا۔ اور اب اسے فقیر بنا کر خود غائب ہو گیا تھا۔

اتفاق سے ایک ایسے شخص پر اس کی نظر پڑی جو اس کے والد ماجد کے دوست تھے۔ وہ اشرف کو دیکھتے ہی اس کے قریب آئے اور اسے اپنی ضمانت پر رہا کرا دیا۔

اشرف نے گھر کی راہ لی۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں لیکن کس وقت جب وہ نوکری، عزت، دولت بلکہ سب کچھ کھو چکا تھا۔

•••

ایکتا

از سیف علوی عاصی بی۔ اے کیرانوی

کوئی ہندو ہو یا مسلم ہیں سبھی انسان ایک
دل کے ٹکڑے مختلف ہیں۔ ہے مگر ارمان ایک
مختلف ہیں پیرہن لیکن ہے سب کی شان ایک
ایک میری سرزمیں ہے ایک ہے میرا وطن
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے میرا چمن

گرچہ پہلو مختلف ہیں ہے مگر تصویر ایک
نام کتبوں کے الگ ہیں۔ ہے مگر تحریر ایک
خواب چاہے مختلف ہیں ہے مگر تعبیر ایک
ایک ہیں یارانِ محفل ایک ہے مشکِ ختن
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے میرا چمن

راگ ہوں چاہے الگ پر سب کی سرگم ایک ہے
مختلف نظریں سہی پر دل کا عالم ایک ہے
سمت دھاروں کی ہو کچھ بھی سب کا سنگم ایک ہے
ایک سرچشمہ ہے اپنا ایک ہیں گنگ و جمن
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے میرا چمن

ہیں الگ پروانے لیکن شمعِ محفل ایک ہے
ہیں سفینے مختلف پر سب کا ساحل ایک ہے
مختلف راہیں سہی پر سب کی منزل ایک ہے
ایک ہے سب کی ڈگر اور ایک ہے ...
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے م...

گرچہ عنواں مختلف ہیں پر فسانہ ایک ہے
دُھن ہے سازوں کی الگ لیکن ترانہ ایک ہے
ہیں جبینیں مختلف پر آستانہ ایک ہے
ایک ہے دل کی تمنا ایک ہے د...
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے ...

ہیں تو ناقوس و اذاں دونوں کی ہے آواز ایک
شیخ ہو یا ہو برہمن دونوں کی پرواز ایک
دَیر ہو یا ہو حرم دونوں کا ہے اعجاز ایک
ایک اندازِ نظر ہے ایک فکر ...
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے م...

ساغر و مینا الگ ہیں، دَورِ پیمانہ ہے ایک
فکرِ رندانہ، الگ ہے طرزِ رندانہ ہے ایک
ساقیٔ محفل ہو کوئی رنگِ میخانہ ہے ایک
ایک ہے نغموں کا محور ایک ہے بزمِ سخن
ایک ہے میرا گلستاں ایک ہے میرا چمن

شعرائے پاکستان

جعفر شیرازی

ہم تو جا پہنچے ہیں بکھرنے تک
تم نہیں آئے رُت گزرنے تک
دیکھنا اضطراب فرقت کا
رات جب آئی صبح کرنے تک
اب کہاں اعتبار کی لذت
بات تو تھی تیرے مکرنے تک
کیسے عالم گزر گئے ہیں گے
پھول پر شاخ سے اُترنے تک
ہم تو ایسے ہیں جس طرح جعفر
کارواں گرد کے ابھرنے تک

رشید کامل

مجھ سے بچھڑ کے سفر کی اذیت نہ کم ہوئی
تو ساتھ بھی چلا تو مسافت نہ کم ہوئی
برسوں گزر گئے ہیں یہاں انتظار میں
اک دقیقۂ قلیل کی مدت نہ کم ہوئی
یہ بھی تو سوچ وعدہ خلافی گناہ ہے
کیا اس لحاظ سے تیری چاہت نہ کم ہوئی
پہلے ترا وجود تھا ہمراہ اب خیال
کیسے کہوں کہ تیری رفاقت نہ کم ہوئی
آنسو بھی دل کی آگ کو ٹھنڈا نہ کر سکے
بارش میں بھیگ کر بھی حرارت نہ کم ہوئی
عجز سخن سے ذات کا معیار کیا رہا؟
جب وزن گھٹ گیا تو قیمت نہ کم ہوئی
ایسی روش تو باعث تشہیر ہے رشید
اس کو خیال ہوگا کہ شہرت نہ کم ہوئی

• • • •

زاہد فخری

لہو میں پھڑپھڑاتی ہیں صدائیں لب نہیں ہلتے
میں چلنا چاہتا ہوں پا پر مجھے رستے نہیں ملتے
یہ کیسے موسموں کی سرزمیں پہ آ گئے ہم تم
ہوا چلتی ہے لیکن شاخ پر پتے نہیں ہلتے
فقط باتوں سے مت بہلا مجھے اے چارہ گر میرے
کہ اپنے زخم ایسے ہیں رفوگر سے نہیں سلتے
تجھے مل کر مجھے کچھ اور بھی الجھن سی ہوتی ہے
تری قربت کے لمحے پھول بن کر کیوں نہیں کھلتے
تو کس کو ڈھونڈتا پھرتا ہے اس شہر خرابی میں
یہاں جو صبح کو بچھڑیں وہ آخر شب نہیں ملتے

• • •

صدیق افغانی

کیسی تصویر دکھا دی تو نے
نیند راتوں کی اڑا دی تو نے
چل پڑے شہر بیاباں کی طرف
کیسے لہجے میں سزا دی تو نے
کتنے سرسبز تھے خواہش کے شجر
آگ جنگل میں لگا دی تو نے
آشنائی کا بھرم قائم تھا
یہ بھی دیوار گرا دی تو نے
میں ہی کیوں تشنۂ گویائی ہوں
بے نواؤں کو نوا دی تو نے
اک نظر میری بھی عریانی پر
پیڑ کو سبز قبا دی تو نے
خار و خس کیوں رہیں ظلمت کا نشاں
چہرۂ گل کو ضیا دی تو نے
زلف جاناں سے الجھ کر صدیق
عمر بے کار گنوا دی تو نے

فاطمہ حسن

اب خوف نہیں کوئی مجھے راہ گزر سے
میں دور نکل آئی ہوں پتھر کے نگر سے
دیوار اٹھاتے ہو تو مضبوط اٹھاؤ
ایسا نہ ہو ڈر جاؤ کبھی اپنے ہی گھر سے
یہ لوگ بھی اچھے ہیں مکاں بھی بہت اچھے
بس میں ہی ہوں بیزار ان اچھوں کے نگر سے
اک موڑ پہ ہم اجنبی بن کے بھی ملیں گے
یہ بات تو معلوم تھی آغاز سفر سے
جیسی بھی ہوں اچھی یا بُری اپنے لیے ہوں
میں خود کو نہیں دیکھتی اوروں کی نظر سے

(ماہِ نو)

من کہ مکتوب الیہ

سہیل عظیم آبادی۔ نور منزل۔ پٹنہ ۶

برادرم سرور

ابھی چائے پی کر بیٹھا ہوں۔ تم یاد آ گئے۔ تم کو برادرم ذکی انور کی موت کی اطلاع مل چکی ہوگی سوچتا ہوں ہم لوگ کہاں ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ ایں راہ بہ کعبہ نمی رود اعرابی۔

فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ تو مجھے غصہ تو آتا ہی ہے مگر اس سے زیادہ شرم آتی ہے۔ انگریز کب کا چلا گیا۔ لیکن فرقہ وارانہ فسادات نہیں رکتے آج یہاں اور کل وہاں سوچتا ہوں کیا ہم ہندوستانی کبھی مہذب قوم بن سکیں گے۔ جو آدمی پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک دن مرے گا بھی ضرور۔ اس لئے آدمی کا مرنا اتنا اہم نہیں۔ کیسے مرا یہ اہم ہے۔ اگر قتل و غارت گری کی عادت نہیں مٹی تو سارا ملک برباد ہو جائے گا۔ ابھی تو یہ فساد ہندو مسلم ہوتا ہے۔ کل ہندو ہندو ہوگا۔ تم نے دیکھا پاکستان اور بنگلہ دیش میں کیا ہوا۔ مسلمانوں نے مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں۔ ہندو اتنے رہے ہی نہیں۔ جو ان سے لڑتے۔ یہی ہندوستان میں بھی ہوگا۔ اور تم نے تو نہیں دیکھا۔ بہار میں میں نے دیکھا پچھڑی ذات والوں کے۔ لئے ملازمتوں میں تحفظ کا فیصلہ ہوا تو اونچی ذات کے ہندوؤں نے نیچی ذات کے ہندوؤں کی گردن ماری اور نیچی ذات والوں نے اونچی ذات والوں کی۔ اور اب تک جھڑپیں ہو جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف غم و غصہ پال رہے ہیں۔ کب کیا ہو کوئی نہیں جانتا۔ ایسے بھی ہر روز اخباروں میں ڈاکے اور قتل و غارت گری کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیا ہم قاتلوں اور غارت گر قوم کے افراد ہیں۔ رونا یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں رہنمائی کی ذمہ داری ہے وہ خاموش ہیں اور ایک طبقہ شعوری طور پر اس زہر کو بڑھا رہا ہے۔

تمہاری صحت اب کیسی ہے؟ امید ہے کہ اس مہینے کے اواخر میں دہلی پہنچوں گا۔ خدا کرے تم مع الخیر ہو۔

نیاز مند سہیل عظیم آبادی

ایس۔ ایل سہگل

ایگزیکیٹو ڈائریکٹر ایم۔ ایس۔ ملز لمیٹڈ

ہوشیار پور۔ پنجاب۔　　۲۲ اپریل ۱۹۷۹ء

مائی ڈیر سرور صاحب

امید ہے کہ آپ کی صحت اچھی ہوگی اور آپ جملہ مصروفیات کے باوجود خدمت اردو سے غافل نہیں ہوں گے۔

شانِ ہند کے تین شمارے نظر سے گذرے جن میں آپ کے اداریے شذرے اور پرانی یادداشتوں سے متعلق مضامین پڑھے۔ جو دلچسپی کے علاوہ پر معنی اور مفید بھی ہیں۔ آپ اور شانِ ہند جس مخصوص انداز سے خدمتِ اردو کر رہے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔

میری دعا ہے کہ آپ اور شانِ ہند عمر طبعی پائیں اور جس نیک مقصد کو آپ دونوں نے مدِ نظر رکھا ہوا ہے۔ وہ بطریق احسن پورا ہو۔ نیک خواہشات کے ساتھ آپ کا خیر خواہ

ایس ایل سہگل

ماہنامہ تحریک نئی دہلی ۲　　۹ مئی ۱۹۷۹ء

مکرمی سرور تونسوی صاحب

آداب عرض۔ خط کی اشاعت کا شکریہ۔ اس مرتبہ پھر خط لکھنے کی نوبت آ گئی۔ آپ اپنے اداریے میں دو تسامحات کا شکار ہو گئے۔ حکیم عبدالحمید صاحب اور غالب اکاڈمی کا غالب ایوارڈ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایوارڈ غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے دیئے جاتے ہیں جو ایک مختلف ادارہ ہے۔ ایوارڈ کمیٹی کے صدر قاضی عبدالودود صاحب ہیں۔ یہ انعام ضرورت مندی کی بنا پر نہیں بلکہ صلاحیت کی بنا پر دیئے جاتے ہیں۔ اب ممکن ہے کہ آپ اپنی رائے بدل لیں لیکن اس سے پہلے آپ میری صلاحیتوں کے مداح رہے ہیں یہ مشورہ آپ البتہ دے سکتے ہیں کہ آئندہ انعامات کا فیصلہ کرتے ہوئے ادیبوں کی صلاحیت کو نہیں، ان کی ضرورتمندی کو ملحوظ رکھا جائے۔

نیاز مند　گوپال متل

اصلاح کاریٔ ادب

اور حضرت داغ دہلوی مرحوم کے چند اصلاحی نمونے

(حاجی نعمت اللہ نعمت جلال آباد ضلع مظفر نگر)

(تیسری قسط)

(ص)

کس کو (برباد) کرے گا یہ کہاں جائے گا
بعد مرنے کے مرے دل سے نکلکر اخلاص

" تاثیر) " " " " "

" " " " " "

" اخلاص " کسی صورت میں باعث بربادی نہیں اور مائل صاحب بغیر کسی توجہ شاعرانہ کے اسے لکھ گئے تھے جو ایک بڑا عیب تھا ۔ جہاں اُستاد " نے بجائے برباد کے " تاثیر " حوالۂ قلم کردیا اور اب رنج و الم کا ایک موقع و محل وجود میں آگیا جس نے عاشق کے خلوص کا پایہ بھی بڑھا دیا ۔

حضرت غالب رح کے " جفا میرے بعد " " خفا میرے بعد " کی زمین میں ایک غزل لکھی ہے جس میں اپنے مرنے پر بہت سی چیزوں کی بیکسی و بیچارگی پر دل شکستگی کا اظہار کیا ہے ۔ اس غزل کے یہ دو شعر قابل ملاحظہ ہیں ۔ اور اس لئے اور بھی کہ شعر بالا کے مفہوم سے ان کا مفہوم ذرا پہلو بدل کر نکر کھا جاتا ہے ۔ ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب فنا میرے بعد

مگر اشعار غالب " علیٰ کلِ غالب " کے مصداق ہیں ۔

اب تو وہ پاس (بھی آتے) نہیں میرے ورنہ
میرا اور ان کا رہا کرتا تھا اکثر اخلاص

" " (بیٹھتے) " " " " + " " " " "

" پاس بیٹھتے نہیں " نے معشوق کی [illegible] سے انتہا کنارہ کشی اسکے تنفر اور اپنے تعلقات ماضی و حال کا مکمل نقشہ کھینچ دیا حضرت مومن دہلوی مرحوم نے " التفات ماضی " پر ایک غزل لکھی جس کا مطلع ہے ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

خوب غزل ہے اور خدا جانے کن حالات کے ماتحت مرحوم افکار پیش کئے کہ دل بے چین کر دیتی ہے ۔ ان کے دیوان ہے اسی میں دیکھنی چاہئے ۔

(ص)

خود جانتے ہیں وہ کہ بیمار ہجر ہوں
(اور) مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیسا [illegible]

" " " " + (پھر) " "

" تجاہل عارفانہ " کے لئے " پھر " جس قدر موزوں ہو سکتا تھا اور اس موقع پر جس قدر لطف و تاثیر پیدا کر دیا " اور " کو میسر نہ تھی اس لئے اصلاح کی گئی ۔

دیکھو مریض عشق پر یارو خدا کا قہر
(جو) کی دوا تو اور (بھی) نیا [illegible]

دیکھو مریض عشق پہ یارو خدا کا قہر
(جب) کی دوا تو اور (نہ) [illegible]

" صرف شرط کے معنی دے رہا ہے ۔ [illegible] رو و تاکید نہیں ہے ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

(ط) اصلاح

مجنوں یہ دل مرا شیدا ہوا خدا حافظ
(مجھے یہ مفت کا) جھگڑا لگا خدا حافظ

" " " "

(یہ میری جان کو) " " "

"مفت کا جھگڑا" بازاری زبان تھی اب ادبیت پیدا ہو گئی اور "جان کو جھگڑا لگا" نے شعر کو دم آخر تک کے مصائب کا آئینہ بنا دیا۔

جو ایک دل تھا (سو) پہلے (ہی لے لیا تو نے)
جگر (تھا سو بھی) تو اب لے چلا خدا حافظ
" " " (اسے) " (تو نے چھین لیا)
" (رہا تھا، وہ)

"سو" ایک تو یہ بھدا لفظ تھا اور پھر دونوں مصرعوں میں ایک ایک جگہ استعمال ہوا دوسرے "لے کینے" سے معشوقانہ جبر و عاشقانہ بے اختیاری کا اظہار "جگر تھا" سے اسکی موجودہ حالت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے پہلے "سو" کی جگہ "اسے" "لے لیا تو نے" کی جگہ "چھین لیا"۔ "جگر تھا" کے درمیان "رہا" کا اضافہ اور "وہ" کا اشارہ عجب لطف دے گیا۔ نہ صرف شعر چست ہوا اور اس کی بندش ہی درست ہو گئی بلکہ بے کسی و بے بسی کی ایک پُر تاثیر تصویر بھی تیار ہو گئی۔

(غ)

رات کو جب محفلِ جاناں میں آتے ہیں چراغ
(شرم سے دامن میں اپنا منھ) چھپاتے ہیں چراغ

" " " "

(دامنِ فانوس میں منھ کو) " "

"چراغوں" کے "منھ چھپانے" کے لیے شعر میں کوئی پردہ نہ تھا اور نہ کوئی اشارہ کنایہ۔ لیکن حضرت داغ مرحوم نے "فانوس" کا ایک حقیقی پردہ ڈال دیا۔ "اپنا" اور "شرم" دونوں لفظ بیکار تھے جو نکال ڈالے اور شعر کو چمکا دیا۔ اصل تو یہ ہے کہ یہ اصلاح اور [illegible] جاتے ہیں۔ یہ ہے جو میرے دل میں گھپ گئی ہیں۔ اور ایسی اصلاح تو ہی جیسے حاضر دماغ، ذہین، فطری شاعر اور نباضِ فن کا کام تھی بھی سبحان اللہ کیا وجد آفریں اصلاح ہے؟

"دامنِ فانوس میں منھ کو چھپاتے ہیں چراغ"

(ف)

ہم تو وحشت میں نہ جائیں گے گلستاں کی طرف
لے چل اے جوشِ جنوں! کوہِ بیاباں کی طرف

" " " " "

لے چل اے جوشِ جنوں! کوہ (و) بیاباں کی طرف

اُستاد مرحوم نے بجائے اضافت کے "واؤ" عاطفہ کا اضافہ ہے جو بہت ضروری تھا۔ اب شعر تمام خوبیوں سے مملو نظر آ رہی کا تو نام اُستادانہ نظریں ہیں۔

×× پہنچ جائیں جو کہیں ہم درِ جاناں کی طرف
آنکھ ڈالیں نہ کبھی تختِ سلیماں کی طرف ××

اُستاد مرحوم نے پورا شعر کاٹ دیا اور یہ ریمارک تحریر فرمایا "یہ شعر اچھا نہیں" در سے اور تختِ سلیماں سے تشبیہ یا کچھ بھی نہیں۔

قیس جنگل اکیلا ہے تو اب دیر نہ کر
اے جنوں! لے کے تو چل مجھکو بیاباں کی طرف

قیس جنگل (میں) اکیلا ہے تو اب دیر نہ کر

" " " " " "

اس شعر میں "میں" کی کمی تھی جسے سہوِ کتابت بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر طلباء حروف ربط دورانِ تحریر ترک کر جاتے ہیں۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس شعر کو غزل سے خارج کیوں نہ کر دیا۔ کیونکہ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور اس وقت اور جبکہ ایک بہترین شعر جو زبان زدِ عوام ہے اسی مضمون کا موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کوئی صاحب فرماتے ہیں۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

(باقی صفحہ پر)

حسن ساحو
۱۷ کلا منزل۔ گرو بازار۔ سری نگر

خدا کی دین

احمد بوڑھے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دراصل شادی کے تقریباً بارہ سال بعد احمد پیدا ہوا تھا۔ احمد ابھی دسویں جماعت میں ہی زیر تعلیم تھا کہ والدین کے اصرار پر اسے رضیہ کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ ہوا یہ کہ احمد کی چھوٹی بہن فاطمہ گھر کے تمام کام کاج میں اپنی کمزور ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ لیکن فاطمہ کے ہاتھ پیلے کرنے کے بعد گھر میں کوئی نہیں تھا جو والدہ کے ساتھ کام کاج میں ہاتھ بٹاتا۔

گو احمد چاہتا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اور کسی لائق بن سکے۔ اور اپنے والدین کی بے رنگ زندگی میں خوشی کے نقوش بکھیر سکے۔ اسے کتابوں سے والہانہ عشق تھا۔ اتنی کم عمری میں شادی کرنے کے خلاف اس کی زبان احتجاجاً کھلی ضرور مگر والدین نے کچھ اس طرح سے اپنی ضرورت معذوری جتائی کہ احمد نے ہتھیار ڈال دیئے ——— رضیہ سے منسلک ہونے پر بھی احمد نے حصول تعلیم کے دامن کو ہاتھوں سے جانے نہ دیا۔ میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں کے ساتھ پاس کرنے کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج کی فیس اور دیگر اخراجات پورے کرنے اور والد صاحب پر بوجھ نہ بننے کی نیت سے اس نے کچھ لڑکوں کو فالتو وقت مناسب معاوضہ پر پڑھانا شروع کر دیا۔

والدین کی چاہت تھی کہ ان کے اس دنیا سے اٹھ جانے سے قبل اپنے پوتے کا بھی منہ دیکھیں۔ فاطمہ چار سالوں میں دو لڑکوں اور ایک لڑکی کی ماں بن چکی تھی۔ مگر رضیہ کی گود ابھی تک خالی تھی۔ تعویذ گنڈوں سے کام لیا گیا۔ پیروں فقیروں کے در پر حاضری دی گئی۔ آستانوں اور دیگر متبرک جگہوں پر جا کے منتیں مانگیں۔ لیکن بے سود۔ کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ مجبوراً ڈاکٹروں حکیموں کی طرف رجوع کیا گیا۔ انھوں نے اطمینان دلایا کہ حالات سازگار ہیں۔ اور کسی طرح کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی رضیہ کو کچھ نہ ہوا۔ ادھر احمد کے والدین کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات ابھرے۔ وہ احمد کی دوسری شادی کرانے کی بابت سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ لیکن احمد نے اس معاملہ میں ایک نہ مانی اور ان کے ہر تقاضے کو خوشگوار انداز سے ٹالتا رہا۔ وہ اکثر اپنے والد سے کہتا "ابا حضور! اس میں رضیہ کا کیا قصور ہے یہ تو پروردگار کی مرضی پر منحصر ہے کہ کسی کی کھیتی ہری بھری کر دے اور کسی کی کھیتی سوکھی رکھے۔ اس کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔"

لیکن والدین کو خاندان کا نام باقی رکھنے کی خاطر ایک پوتے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے احمد کو دوسری شادی رچانے پر شدت سے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران احمد مزید تعلیم و ٹریننگ حاصل کرنے کی غرض سے لکھنؤ کے انجینیرنگ کالج میں داخلہ کے لئے چن لیا گیا۔ اپنی بہن فاطمہ سے کچھ رقم ادھار لیکر اور والدین ورضیہ سے رخصت لے کر احمد لکھنؤ چلا گیا کالج میں داخلہ لینے کے بعد ہوٹل میں رہنے لگا۔ ہوٹل میں کھانا ناقص قسم کا ملتا تھا اس لئے احمد نے کالج سے ملحق ہوٹل پر کھانے کا انتظام کر لیا ہوٹل مالک حاجی ستار کے لاڈلے بیٹے عباس کو جو دسویں جماعت میں دو بار فیل ہو چکا تھا۔ احمد پڑھانے لگا۔ کھانے پینے کے عوض احمد نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور رات کو دیر گئے تک عباس کے کرخت و خشک زمین کی آبیاری کرنے لگا۔ عباس کی رفاقت میں احمد نے لکھنؤ کے طول و عرض کو ناپا اور قابل دید مقامات بھول بھلیاں۔ سٹی چوک۔ کمپنی باغ، بابو پور ہوٹل، حضرت گنج، قدیر گنج چوک۔ نخاس، امین آباد چوک، عالم باغ، بڑا امام باڑہ، چھوٹا امام باڑہ وغیرہ مکانات دیکھے۔

اتنے میں محرم الحرام کا چاند نظر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے طول و عرض میں اداسی اور مایوسی کی فضا طاری ہونے لگی۔ اکثر

مقامی باشندے ماتمی لباس میں ملبوس مجالس میں شریک ہوتے۔ احمد کو اس عظیم واقعہ سے انسیت تھی۔ ان ایام کی افادہ کرنے کے سلسلے میں مرثیے اور نوحے پڑھنے میں پیش پیش ہوتا تھا۔ انیس اور دبیر کے اکثر مراثی احمد نے زبانی یاد کر لئے تھے۔ رات کو سونے سے قبل وہ کوئی سا بھی مرثیہ پڑھتا۔ محلے والے عقیدت و دلچسپی سے سننے کیلئے اس کے ہاں جمع ہو جاتے۔

ایک رات رکاب گنج میں وجاہت علی کے ہاں مجلس تھی۔ ان کے اصرار پر احمد بھی وہاں چلا گیا۔ محرم کی آٹھویں تھی۔ ایک صاحب نے اٹھ کے حضرت عباس کی شہادت کا قصہ بیان کیا۔ کس طرح اپنے آقا حضرت امام حسین پر جان قربان کر دی۔ دو مبارک کٹوا لئے۔ اور سارا جسم تار تار ہوا۔ مگر کسی طرح سے بھی افواجِ یزید کے سامنے نہ جھکے۔

کسی اور صاحب نے امام حسین کی ہمشیرہ حضرت زینب وفاداری کی داستان نہایت دردناک انداز میں بیان کی۔ اتنے میں عباس ملک کہنے پر ایک پر احمد کا نام پکارا گیا۔ چار و ناچار احمد اٹھے اور واقعہ کربلا کی فضیلت کو اس دلکش اور دردناک انداز میں بیان کیا کہ ہر سننے والا زار و قطار رو رہا تھا۔

مجلس کے اختتام پر سب شرکاء مجلس احمد کی تعریف کر رہے تھے۔ اگلے روز ——— احمد کو داد و تحسین دینے والوں میں سید منور شاہ پیش پیش تھے۔ شاہ صاحب نے احمد کو اپنے طویل ڈرائنگ میں ...... رہائش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ احمد نے بہانوں سے کام لیا۔ لیکن شاہ صاحب نے ایک نہ سنی۔ ایک سجا سجایا کمرہ احمد کو رہنے کیلئے دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد شاہ صاحب کے اصرار پر احمد نے شاہ صاحب کی بیٹی رضوانہ کو پڑھانا بھی منظور کر لیا تاکہ شاہ صاحب کے احسان کا بدلہ کسی حد تک تو ادا ہو سکے۔ رضوانہ فرسٹ ایئر کا امتحان دینے والی تھی۔ رضوانہ اچھے خد و خال کی مالک تھی۔ اور کافی منہ پھٹ تھی۔ نوکر تو نوکر والدین کے ساتھ گستاخانہ انداز میں مخاطب ہوا کرتی تھی۔ پڑھائی میں دھیان دینے کے بجائے وہ ناول اور دیگر کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ اور کوٹھی میں ہر کسی پر رعب جمانا اپنا حق سمجھتی تھی۔ اور سبب کچھ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باعث لاڈ پیار کا نتیجہ تھا۔

رضوانہ نے احمد کو اپنی آزادانہ روش میں رنگنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن احمد نے بڑے اعتماد اور بڑی سلیقہ مندی سے اس کی ہر نامناسب خواہش کو ٹھکرا دینے میں رضوانہ کی بھلائی دیکھی۔ مگر رضوانہ کی آزاد طبعی میں فرق نہ آیا۔

ایک شام احمد کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا کہ اسے کوٹھی کے باغیچہ سے کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے رضوانہ کی آواز سنائی دی۔ رضوانہ اور نوجوان کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

لڑکا رضوانہ کو بھاگنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ دوسرے دن احمد نے رضوانہ سے استفسار کیا۔ اور رضوانہ کو سمجھایا کہ اس نوجوان کی نیت نیک نہیں ہے۔ وہ محض کسی بھی لڑکی کے جذبات سے کھیلنے اور اس کی زندگی کو ویرانی کے چوکھٹ پر لا کے رفو چکر ہونے والوں میں سے ہے۔ جو ضرور تمہیں دھوکا دے گا چوروں کی طرح رات کی تاریکی میں محبت جتانے والا شخص دھوکہ باز ہوتا ہے۔ خواہشمند ہوتا ہے۔ عاشق صادق نہیں ہوتا۔

رضوانہ نے احمد کی نصیحت کو مجذوب کی بڑ سمجھا۔ اور اسی نوجوان سے رسم و راہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک دن رضوانہ کی زندگی میں انقلاب بپا ہوا۔ کیونکہ وہ نوجوان شہر چھوڑ کے کہیں چلا گیا۔ رضوانہ اس کی جھوٹی محبت اور شادی کے وعدے کے پس پردہ اپنی زندگی برباد کر چکی تھی۔ اور وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بننے کی بنیاد رکھ چکی تھی۔ رضوانہ نے کوشش کی کہ حمل گرا دے یا خودکشی کر لے۔ لیکن احمد نے اس گناہ عظیم سے باز رہنے کیلئے رضوانہ کو سمجھایا اور رضوانہ سے کہا کہ تمہیں حق نہیں ہے کہ اس معصوم کا خون کرو۔ مذہب ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ فعل قتل کے مترادف ہوگا۔ رہا تمہارا خودکشی کا ارادہ تو یہ بھی ایک ان پیچیدہ حالات میں گناہ ہے۔ احمد کے دل میں ایک خیال آیا۔ اور رضوانہ کی عزت برقرار رکھنے کی نیت سے اس شاہ صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ اور جملہ حالات ان کو بتا کر یہ رائے دی کہ وہ رضوانہ سے دکھاوے کے طور پر متع کرنے کو

یار ہے۔ متعہ مقررہ میعاد کے لئے عارضی شادی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ رضوانہ نے گھر والوں اور دنیا والوں کی نظروں میں احمد کی عارضی بیوی کا روپ دھارن کر لیا۔ لیکن احمد نے اسے بیوی کے بجائے محض ایک طالبہ علم رضوانہ ہی سمجھا۔ کیونکہ وہ شادی شدہ تھا اور کسی طور بھی اپنی بیوی رضیہ کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس نے رضوانہ سے صاف صاف الفاظ میں بتا دیا کہ متعہ کا ڈرامہ محض اس کی عزت بچانے کی خاطر کیا گیا ہے۔ اور وہ شادی شدہ ہے۔

شاہ صاحب کی کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ کیونکہ رضوانہ نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ بچے کی دیکھ بھال کے لئے ایک سلیقہ مند دایہ کی خدمات حاصل کی گئی۔ رضوانہ کی ماں بھی بچے سے خوب گھل مل گئی تھی۔ جب متعہ کی میعاد ختم ہونے پر رضوانہ کو آزادی ملی —— کچھ دنوں بعد اپنی عادت سے مجبور رضوانہ پھر سے کسی نئے عاشق کو ڈھونڈنے لگی۔ اب اس نے نواب صادق علی کے نورِ نظر انور کو اپنی بے باک نظروں کا نشانہ بنایا۔

کچھ ہفتے گذرنے پر کوٹھی میں انقلاب سا بپا ہوا جب کہ سننے میں آیا کہ رضوانہ اپنے آشنا انور کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ کافی زیورات اور سیف میں سے خاصی نقدی بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ہر جگہ رشتہ داروں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ لیکن رضوانہ اور انور کا کہیں پتہ نہ چلا۔

چار سال گزرنے پر احمد نے ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد گھر واپسی آنے کی تیاریاں شروع کر دیں —— ہر ایک سے اجازت لے کر احمد نے اسحاق کی انگلی پکڑ لی۔ رضوانہ کے والدین اور احمد کے احباب اسے ریلوے سٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ گاڑی چلنے سے قبل نانا نانی نے اسحاق کو بہت پیار کیا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک بٹوہ تھما دیا جس میں اچھی رقم رکھی گئی تھی۔

احمد گھر آیا تو ڈپلوما اپنے والد صاحب اور اسحاق کو رضیہ کی گود میں دے دیا۔ خود فرطِ محبت میں اپنی ماں سے بغلگیر ہو گیا۔

"یہ بچہ کون ہے بیٹا؟" ماں نے پوچھا۔

"اس ذاتِ پاک کی کرامت ہے امی! بس اتنا جان لو کہ خدائے برحق کو رضیہ کی حالت پر رحم آیا۔ اور یہ چاند سا بیٹا ہمیں عنایت کیا۔"

ماں نے بلا کچھ کہے بچے کو بہو کی گود سے لے لیا اس کی بلائیں لینے لگیں۔ اور رضیہ کو تو جیسے خوشی کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔

جیسے اسحاق اس کا اپنا ہی بچہ ہو۔ اور اسی نے اسے جنم دیا ہو۔

●●●

بقیہ :- بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔

تیری اس خوشی میں شریک ہوں۔ چاچی مگر نوکری کرنا ہے نا۔ کل چلا جاؤں گا ہاں مگر میری بہن کے لئے اچھی سی ساڑی ضرور خرید لینا —— ان کی باتوں میں مقناطیسی اثر تھا۔ کسی سے بات کرتے تو جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں ہوں۔ اور لوگ بہت جلد مانوس ہو جاتے۔ ذکی انور عمر میں مجھ سے ۹-۱۰ سال بڑے تھے۔ جب میں پندرہ سال کا تھا تو ان کی افسانہ نگاری کے خوب چرچے تھے۔ بہار شریف میں مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی تھی کہ بہار شریف میں بھی ایک قلم کار پیدا ہوا۔ اور پھر انھوں نے کئی ناول لکھے زنجیر اور قیامت کی اشاعت کے بعد تو گویا وہ آسمانِ ادب کا درخشاں ستارہ بن گئے تھے۔ افسانے اور کہانیاں تعداد انگنت لکھیں اور ہر افسانے اور کہانی میں اتحاد یکجہتی اور خلوص و محبت کا خزانہ چھپا ہوتا۔

مگر افسوس کہ وہ اپنے ہی ہم وطنوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

بڑی مُشکل سے ہوتا ہے.....

حسب معمول آج بھی صبح اٹھکر میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور اخبار دیکھنے لگا اور پھر اس دل خراش خبر پہ نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ یہ ہندوستان کا فولادی شہر جمشید پور ہے جہاں ۱۱ اپریل کو ہندو مسلم فساد میں اردو ادب کا ایک درخشاں ستارہ، برصغیر کا محبوب ادیب اور ہندو مسلم یکجہتی کا علمبردار" ذکی انور" کو قتل کر دیا گیا۔ جمشید پور کو آگ اور خون سے بچانے کے لئے ذکی انور نے اپنے ایک اہم عصر دوست ڈاکٹر ورما کے ساتھ بھوک ہڑتال تک کی۔ مگر شر پسندوں نے پتھروں کی بارش کر کے انہیں اپنی جگہ چھوڑنے اور بھوک ہڑتال ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ شر پسندوں کو معلوم تھا کہ بھوک ہڑتال ایک ایسی مؤثر کارروائی ہے جو اگر کامیاب ہوگئی تو ہمارے مقاصد میں کامیابی نہ ہو سکے گی۔۔ اور پھر مطلع صاف ہوتے ہی جمشید پور میں فساد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اور معصوم انسانوں کے قتل و خون کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گھروں سے اٹھنے والے شعلے آسمان کی وسعتوں کو چھونے لگے۔ انسانی چیخیں فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرنے لگیں۔ ہر طرف حیوانیت رقص کرنے لگی، انسانیت سسکنے لگی اور موت کا بھیانک فرشتہ دُور کھڑا قہقہے لگاتا رہا۔ ذکی انور نے اپنے بچوں کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچانے کے بعد دوستوں اور ہمدردوں کے اصرار کے باوجود اپنا پیارا مستقر نہیں چھوڑا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ مگر برصغیر کو اتحاد و یکجہتی کا پیغام دینے والا یہ متوالا ادیب یہ بھی جانتا تھا کہ انسانیت کے چراغوں کی لَوؤں کو تیز کرنے کیلئے تیل کی نہیں خون کی ضرورت ہے۔ اور اس سے پہلے کہ حیوانیت کے طوفان کا ایک تیز جھونکا آتا اور انسانیت کے چراغوں کو بجھا کر گزر جاتا برصغیر کے اس متوالے ادیب نے اپنے جسم کے گرم گرم خون سے سارے چراغوں کو روشن کر دیا اور حیوانیت کے طوفان کا وحشی جھونکا انسانیت کے چراغوں سے ٹکرا کر واپس چلا گیا۔ میں نے سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لئے اور محسوس کیا کہ پڑوس کے کسی گھر سے ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز آرہی ہے

وہ کھیت میں ملے گا، کھلیان میں ملے گا
بھگوان تو اے بندے انسان میں ملے گا

اور میں سوچنے لگا کہ واقعی ذکی انور اپنے ہم وطنوں کے دل میں ایک حرف امنٹ کی طرح چپک گیا ہے۔ ذکی انور صوبہ بہار کے ایک چھوٹے سے شہر" بہار شریف،، کے محلہ ،،سکونت،، کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بہار شریف کی سرزمین گو علم و ادب کے لئے سنگلاخ سے کم نہیں۔ تاہم آپ نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی کہ آپ کا ادبی ذوق نکھرتا اور سنورتا گیا۔ بزرگوں کی اعلیٰ تربیت اور دوستوں کی ادب شناس سوسائٹی نے آپ کی ادبی زندگی کو جلا بخشی اور ان میں وہ تمام خوبیاں نمودار ہوئیں جو ایک اعلیٰ انسان اور عظیم قلم کار میں ہونی چاہئیں۔ آپ کی نگاہ میں ہندو مسلم تفریق قطعاً نہیں تھی۔ وہ دنیا کے ہر مذہب و ملک کے انسانوں کو انسانیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ "جیو اور جینے دو" کے اصول پر گامزن تھے۔ امن و شانتی کے خوگر اور مہاتما گاندھی کے اس بھگت کو معلوم تھا کہ گاندھی کے نقش قدم پر چلنے والوں کو گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاندھی اور گاندھی بھگتوں کے جسم کا خون ہی بھارت ماتا کی پیشانی کا تلک بنتا ہے۔ جس سے بھارت کا ذرّہ ذرّہ درخشاں و تاباں ہوگا۔ ذکی انور کا دل غریبوں اور مسکینوں کیلئے بحر بیکراں تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ غریبوں کو گزند نہ پہنچاؤ کیونکہ ان کی آہ اللہ میں شامل ہے۔ اپنے محلہ کے ایک غریب ہم عمر ساتھی کو جب انھوں نے دیکھا تو رو پڑے اور اس مدقوق ساتھی کو سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ اسے رکھ لو دودھ اور پھل کھا لینا۔ ایک بار محلہ کی ایک ہریجن چاچی نے بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ بیٹا جگی (ذکی) اچھا ہوا کہ تو بھی آ گیا پرسوں شادی ہے تیری بہن کی اور ذکی انور نے ہریجن چاچی کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ میں دل سے

(باقی صفحہ ۷۹ پر)

جنتا انتظامیہ کے دو سال

ہمہ جہت ترقی کی سمت میں ٹھوس قدم

ہریجنوں اور کمزور طبقوں پر سب سے زیادہ توجہ

- ہریجن اور پسماندہ طبقوں کی فلاح وبہبود پر خرچ ۷۷-۱۹۷۶ء کے ۴۳ لاکھ روپے سے بڑھکر ۱۰۴ لاکھ روپے اور پہلی بار ۳۷ ہریجنوں کو بسیں خریدنے کے لئے اقتصادی امداد اور بس کا مالک بنانا۔
- نو آباد کالونیوں، شہر پائے گاؤں، غیر منظور شدہ بستیوں، کٹروں اور جمنا پار کی ۵۵ فیصد سے بھی زیادہ آبادی کو پہلی بار زندگی کی بنیادی سہولتیں فراہم کرنا۔
- ۶۵۴۴ مزدوروں کو کرایہ خرید پر مکان مہیا کرنا۔
- گاؤں کے فروغ پر ۲۶ کروڑ روپے خرچ۔ ایک سال کے اندر ہر گاؤں میں پینے کا پانی دینے کے لئے گیارہ کروڑ روپے کی سکیم۔ گزشتہ ۳۰ برسوں میں ۲۵ گاؤں کو یہ سہولت حاصل ہوسکی ہے۔ اسی طرح پہلی بار گاؤں کا لال ڈورا بڑھایا گیا۔
- دو لاکھ لوگوں کو کام مہیا کرانے کیلئے کئی صنعتی بستیوں کی تعمیر وتشکیل۔ جن گھروں میں کوئی بھی کام پر نہیں لگا ہے۔ ان میں کم سے کم ایک کو کام پر لگانے کے لئے انقلابی سکیم۔
- ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک مکمل طور پر نشہ بندی نافذ کرنے کے سلسلے میں مؤثر اقدامات
- دور دراز کی کالونیوں اور گاؤں میں گھر کے نزدیک طبی سہولیات مہیا کرنے کی سکیم کے تحت ۵۰ بستروں والے دو اور ۱۰۰ - ۱۰۰ بستروں والے سات اسپتالوں کی تعمیر کی سکیم۔
- ڈھائی لاکھ بچوں کو تغذیہ بخش غذا اور دوپہر کا کھانا۔ ۲۰۰ بچوں کو وظیفے۔ ہر غریب بچے کو مفت وردی اور کتابیں ۱۶۵۰۰ نوجوان لڑکے و لڑکیوں کو ۱۶ اداروں میں پیشہ ورانہ تعلیم۔ صرف قابلیت کی بنیاد پر داخلہ۔ ۱۰۰۱ آنگن واڑیوں کی ۷ اسکیموں کے تحت ایک لاکھ بچوں اور ماؤں کو تعلیم، تغذیہ بخش غذا اور طبی سہولیات۔
- پہلی بار دلی میں ایک سال میں ۱۱۰۰۰ مکان تیار ہوئے اور اس سال ۲۰۰۰۰ مکانوں و ۲۲۰۰۰ بشمول سروسز پلاٹوں کی تعمیری اسکیم۔ ۸۰ فیصد مکانات کم آمدنی اور اقتصادی طور پر کمزور طبقے کیلئے۔
- پانچ سال میں ۶٫۵ لاکھ لوگوں کو حروف شناس بنانے کی اسکیم۔

آیئے ہم سب اپنے ملک کی راجدھانی کو دنیا کی خوبصورت اور مکمل شہری سہولیات مہیا کرنے والی راجدھانیوں میں سے ایک بنانے کے لئے عہد کریں

جاری کردہ:- محکمہ اطلاعات واشاعت، دلی انتظامیہ - دلی

دیال سنگھ کالج
کرنال

مشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے دیال سنگھ کالج کرنال میں طلباء کو ہمیشہ ڈسپلن قومی یکجہتی اور ملک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہل کرنال اور گرد و نواح کے طلباء کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے اپنے بچوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں۔ تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اٹھا لیجئے۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

ارا کین منتظمہ کمیٹی

رجسٹرڈ نمبر ڈی-۲۷۰

رجسٹرار نیوز پیپر آف انڈیا رجسٹریشن نمبر

ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲

قیمت سالانہ
پندرہ روپیہ
فی پرچہ
ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ماہنامہ
شان ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

شمارہ ٦ — جون ۱۹۷۹ء — جلد ۲۱

آپ کے نام

۱۔ سرور تونسوی ان دنوں علیل ہیں اس لئے شان ہند کچھ کم صفحات پر چھپ رہا ہے۔ انشاء اللہ صفحات کی یہ کمی اگست میں شائع ہونے والے خاص نمبر میں پوری کر دی جائے گی۔

۲۔ شان ہند کا ٹیلی فون نمبر تبدیل ہو گیا ہے۔ نیا ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ ہے۔

۳۔ اگست کا شمارہ ۱۵ ر اگست کی تقریب کے سلسلہ میں آزادی ایڈیشن ہے یہ خاص نمبر ہر ممکن طور پر ایک بہترین شمارہ ہوگا۔ اس شمارہ میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر لکھنے والے کی تصویر بھی دی جا رہی ہے۔

۴۔ یکم جون سے ڈاک شرحوں میں اضافہ ہو گیا ہے اس لئے خط لکھتے وقت محصول ڈاک کے بارے میں اطمینان فرمالیں۔ بیرنگ خطوط دفتر میں وصول نہیں کئے جاتے۔

۵۔ اب کسی بھی حالت میں جواب طلب امور کا جواب بغیر جوابی خط کے نہیں دیا جائے گا۔ لہذا جب بھی دفتر کو خط لکھئے تو جوابی کارڈ لکھئے۔ یا جوابی لفافہ ساتھ بھجوائیے۔

۶۔ شمع لیبارٹریز نئی دہلی کی ادویات اصل اجزاء سے تیار ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ مریض کو فائدہ پہنچانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انتظام کیا گیا ہے کہ قارئین شان ہند کو اگر کسی دوا کی ضرورت ہو تو ان کی فرمائش پر شمع لیبارٹریز کی تیار کردہ دوائیں ادارہ شان ہند بھجوا سکے۔ لہذا آپ کو جب بھی کسی دوا کی ضرورت ہو (خدا نہ کرے) تو اس خدمت کے لئے ہمیں لکھئے۔

سو فیصد صحیح اجزاء سے تیار کی ہوئی شمع لیبارٹریز کی دوا اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ بھجوائی جائے گی۔

۷۔ جن اداروں یا مصنفین کی کتابیں برائے فروختگی ہمارے پاس موجود تھیں ان میں سے جو کتابیں فروخت ہو گئی ہیں ان کی قیمت [illegible] بذریعہ منی آرڈر یا چیک بھجوائی گئی ہے [illegible] کی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

دویا پرکاش سرور ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے لیتھو کے صفحات [illegible] پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی [illegible] پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۸ - انصاری مارکیٹ - دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ صبا چہ کرد

ہندوستانی مُسلمانو! یہ ہیں تمہارے قومی رہنما!!

کہاجاتا ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں میں سے مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو مذہب کے نام پر فوری طور پر ہر قربانی کے لئے سر کٹانے تک کو تیار رہتی ہے۔ مگر اس خوبی کو کچھ لوگوں نے مسلمانوں کی کمزوری سمجھ کر ایسے ایسے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں جس سے عام مسلمان تو تباہ و برباد ہی رہتا ہے اور کچھ لوگ سیاسی، قومی یا ملی سربراہی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ان کے حلوے مانڈے کا مستقل یا وقتی طور پر آسانی سے انتظام ہو جاتا ہے۔

مُسلمانوں کی اس خوبی یا کمزوری سے اکثر چالاک اخبار نویسوں نے عام مسلمانوں کو خُدا۔ رسُول۔ اور نہ معلوم کس کس کا خوف دلا کر کوٹھیاں بنوالیں۔ کاریں خرید لیں۔ اور زمانہ جدید کی ہر سہولت حاصل کر لی اور اتنی دولت جمع کر لی کہ ان کی سات پشتیں بھی آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔ اور وہ عام مسلمان جن کی حلال کمائی سے ان اخبار نویسوں کی شراب نوشی اور عیاشی کے راستے ہموار ہوتے ہیں، وقتی جوش میں اپنا سب کچھ لُٹا کر محض نعروں پہ زندہ رہتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں تین ہفت روزے ہندوستانی مسلمانوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کئے ہوئے ہیں کہ اگر ہندوستان میں مُسلمان زندہ رہ سکتے ہیں تو ان تینوں اخبارات کے سہارے۔

ہندی مسلمانوں کے ان خود ساختہ قومی رہنماؤں میں سلامت علی مہدی ایک ایسی ہشت پہلو شخصیت ہے جو ہر پہلو سے (جیب کے [illegible]) مسلمانوں کو دھوکہ اور فریب دیتے آئے ہیں۔ مگر دلاسے ہندوستانی مسلمان تو بے اس سو فیصدی [illegible] فریب مجسم کے ہر ہر ستم کو ہنسی خوشی اپنے سینے پہ جھیلا اور اس نے [illegible] کے لئے شراب اور عورت کا انتظام کیا۔

شراب نوش اپنی عادت کے مطابق شراب حاصل کرنے کے لئے ہر بُری سے بُری اور ذلیل حرکت کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی بیوی۔ بیٹی سے بھی پیشہ کرا سکتا ہے۔ جے پور میں ایک ریٹائرڈ پرنسپل تھے اور انہیں شراب کی لت اس بُری طرح سے تھی کہ وقت مقررہ پر شراب کے حصول کے لئے ہر حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔ ایک دن راقم الحروف کی موجودگی میں وہ اپنی لڑکی کو بی اے کا کورس گھر پر پڑھا رہے تھے کہ منا جیب سے پچیس پیسے کا سکہ نکال کر بیٹی کو دیا اور کہا کہ دکان سے دو سگریٹ لے آ۔ لڑکی سگریٹ لینے گئی اور یہ اپنی بیٹی کی سب کتابیں سمیٹ کر لے گئے اور بازار میں اونے پونے میں فروخت کر کے شراب پی۔

اسی طرح سلامت علی مہدی کو شراب اور عورت کے [illegible] گھناؤنے سے گھناؤنا جرم بھی کرنا پڑے تو وہ جان پر کھیل [illegible] ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ چوں احمق در جہاں باقیست [illegible] نمی ماند۔ (جب تک بے وقوف باقی ہیں کوئی شخص مفلس نہیں ہو سکتا) اور سلامت علی مہدی تو ہندوستان کے دس [illegible] مسلمانوں کو بے وقوف ہی سمجھتا ہے۔ اس جعل ساز [illegible] جو دھوکے عوام کو اور خصوصاً مسلمانوں کو دیئے ہیں اگر [illegible] تفصیل لکھی جائے تو کئی جلدوں میں بھی یہ تفصیل [illegible] حال ہی میں جو کچھ ہے بلکہ سفلہ پن مسلمانوں کے اس [illegible] مظلومین جمشید پور کے نام پر کیا ہے [illegible] کی سب سابقہ حرام زندگیاں ماند پڑ جاتی ہیں [illegible]

[illegible] ALI MEDI
[illegible] CHIRAGH NAGAR (?)
[illegible]HI - 110092

مکرمی تسلیم۔

[illegible] جمشید پور گیا تھا وہاں سے واپس آنے کے [illegible]
یہ خط لکھ رہا ہوں اور اس [illegible]

ملتِ اسلامیہ کے ہر فرزند کو پکار رہا ہے۔ میں نے وہاں تباہی اور بربادی کے جو مناظر دیکھے ہیں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا آج وہاں تقریباً ایک ہزار مسلمان خاندان بالکل بے گھر ہیں، زندہ رہنے کے لئے ان کے تمام وسیلے ختم ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی خود ان کے لئے ایک بوجھ بن چکی ہے وہ کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں

آپ نے میرا وہ مضمون یقیناً پڑھا ہوگا جو میں نے جمشید پور کے مظلومین کی مدد کے موضوع پر لکھا تھا اور یہ تجویز رکھی تھی کہ مختلف امدادی ادارے اور تنظیمیں جمشید پور کے مظلومین کو آپس میں تقسیم کر لیں، چنانچہ خود میں نے اس تجویز کے تحت جمشید پور کے محلہ بھالو باسا کے رہنے والے ۲۵ مظلوم اور برباد خاندانوں کی مکمل امداد کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔

اپنی اس تجویز کے تحت میں جمشید پور کے ان ۲۵ خاندانوں کو مکان بنوا کر دوں گا۔ جو آج کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ میں ان کو گھریلو ضرورت کا سامان خرید کر دوں گا، ان کے لئے بستر اور لباس کا بندوبست کر دوں گا اور ان کو معمولی کام شروع کرنے کے لئے کچھ نقد رقم دوں گا۔ تاکہ ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا آسان ہو جائے۔ آج ان کے پاس نہ مکان ہے نہ دوکان، نہ سواری ہے نہ روزی، ان کے آگے پیچھے صرف تاریکی ہے،

میں انہی مظلوم کے نام پر آپ کے ملی جذبات اور احساسات سے ایک اپیل کرنا چاہتا ہوں۔ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ ان افراد کی امداد اور بحالی میں میری مدد کریں اور اس کار خیر میں حصہ لے کر اپنا ملی فرض بھی ادا کریں اور ثواب بھی حاصل کریں ظاہر ہے کہ میری استطاعت اتنی نہیں ہے کہ میں تنہا اس عظیم کام کو کر سکوں۔ آپ کو اللہ نے اس قابل کیا ہے کہ آپ مظلومین کی مدد کریں۔ میں تو صرف آپ کے اور جمشید پور کے ان برباد افراد کے درمیان امداد کا وسیلہ بن رہا ہوں بحکم خداوندی نہ ہوتا تو میں اس کا بیڑا نہ اٹھاتا ۔

میں جمشید پور کے ان ۲۵ خاندانوں کے لئے بارش سے قبل مکان بنوا دینا چاہتا ہوں اور بارش پندرہ جولائی سے شروع ہو جاتی ہے اس لئے براہ کرم امدادی رقم بھیجنے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ کریں۔ آپ اپنے حلقۂ احباب کو بھی میری یہ اپیل پڑھنے کے لئے دیں۔ اور ان سے بھی کچھ رقم بھیجنے کے لئے میری طرف سے درخواست کر دیں۔ آپ کی سہولت کے لئے منی آرڈر فارم منسلک ہے ۔

میں امدادی رقمات کی وصولیابی اور اخراجات کی مطبوعہ تفصیل اگست میں آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا ۔

خط و کتابت و ترسیل زر کے لئے مندرجہ بالا پتہ استعمال کریں۔ کیونکہ اسی جگہ امدادی دفتر قائم کیا گیا ہے ۔ آپ کا اپنا ۔
سلامت علی مہدی

یہ خط ہفت روزہ عوام کی اشاعت ۸ر جون ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خط پچاس ہزار کی تعداد میں سلامت علی مہدی نے پوسٹ کیا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک فلمی ماہنامہ کے ایڈیٹر اور مالک نے تمام اخراجات ڈاک اور پرنٹنگ وغیرہ اس شرط پر ادا کئے کہ اس فریب کاری سے جو روپیہ وصول ہوگا سلامت علی مہدی اور یہ فلمی ماہنامہ کے ایڈیٹر ففٹی ففٹی بانٹ لیں گے۔ بھلا ہو جناب رحمٰن نیر صاحب ایڈیٹر و مالک "عوام" کا کہ جنہوں نے یہ خط فوراً اپنے اخبار میں شائع کر کے اعلان کیا کہ اس خط کی ذمہ داری کسی طرح بھی "عوام" پر نہ ہوگی اگر کوئی اس جعل سازی میں پھنس کر روپیہ بھجواتا ہے تو وہ اپنی ذمہ داری پر بھجوائے گا۔ اور اسی وقت سلامت علی مہدی کو "عوام" کے ادارہ سے الگ کر دیا۔

اس خط کا لفظ لفظ پکار کر کہہ رہا ہے کہ سلامت علی مہدی نے اپنی شراب اور عورت کی حصول کے لئے مظلومین جمشید پور کے قیمتی خون کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ یہ حرام زادہ نہ تو جمشید پور گیا اور نہ ہی اس کا مقصد ۲۵ مظلوم گھرانوں کو آباد کرنے کا تھا۔ اس کا تو واحد مقصد ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ وصول کرنا تھا تاکہ اس کی شراب اور عیاشی کا سامان کچھ دنوں کے لئے آسانی سے مہیا ہوتا رہے۔ یہ تو خیر ہوئی کہ کسی نے یہ خط عوام کے دفتر میں بھجوا دیا اور عوام کے مالک جناب رحمٰن نیر صاحب نے اس جعل سازی کا بھانڈہ پھوڑ دیا۔

۱۵ر جون کے عوام میں رحمٰن نیر صاحب نے اس رجسٹرڈ نوٹس کی نقل بھی شائع کی ہے جو انھوں نے سلامت علی مہدی کو وجہ بتاؤ کے لئے دیا ہے اور اس میں صاف لکھا گیا ہے کہ تم جمشید پور نہیں گئے

ہم ہر ہندوستانی سے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم یہ التماس کرتے ہیں کہ مظلومین جمشید پور کے نام پہ دھوکے دینے والے اس سلامت علی مہدی کے خلاف دلی کے پولس کمشنر کو خط لکھیے۔ کہ اس فریب کار کو گرفتار کیا جائے اور لکشمی نگر نئی دہلی ۹۲ کے پوسٹ ماسٹر اور متعلقہ پوسٹ مین سے تحقیقات کی جائے کہ کس قدر روپیہ اس فریب کی آڑ میں سلامت علی مہدی نے بٹورا۔ اڑتی اڑتی خبریں یہ ملی ہیں کہ سلامت علی مہدی نے خود اعتراف کیا ہے کہ انھیں ۲۵ ہزار روپیہ موصول ہو چکا تھا اگر "عوام" یہ بھانڈہ نہ پھوڑتا تو وہ کم از کم دس لاکھ روپیہ بٹور لیتے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مقدمہ اور پولیس کے ڈر سے سلامت علی مہدی دہلی سے کہیں باہر چلے گئے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے دلوں میں مظلومین جمشید پور کے تئیں کچھ ہمدردی ہے تو اس فریب کارِ اعظم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے پولیس کمشنر دہلی کو لکھیے۔ اور جن حضرات نے روپیہ بھجوایا ہے وہ براہ راست جعل سازی کا مقدمہ دائر کر سکتے ہیں۔

عوام کے مالک اور ایڈیٹر جناب رحمٰن نیر صاحب کو چاہیے کہ وہ "عوام" میں اعلان کریں کہ جن حضرات نے سلامت علی مہدی کو اس مد میں روپیہ بھجوایا ہے۔ اسکی تفصیل انھیں بھجوائی جائے۔ اور یہ تفصیل پولس کمشنر دہلی کو دی جائے۔

اگر قارئین شانِ ہند میں سے کوئی صاحب سلامت علی مہدی کے اس فریب کا شکار ہوئے ہیں تو پہلی ڈاک سے منی آرڈر دھیوبی کی رسید کے ساتھ جملہ تفصیلات ہمیں بھجوائیے تاکہ اس سلسلہ میں "شانِ ہند" بھی بساط بھر کوشش کر سکے

مسجد بنی نہیں ملا موجود

ایک سرکاری ماہنامہ کے لئے اردو کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے جس کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کب انٹرویو ہوگا اور کس کس درخواست دہندہ کو انٹرویو کے لئے بلایا جائے گا۔ مگر ابھی سے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ فلاں صاحب اس آسامی کے لئے لازمی طور پر منتخب ہوں گے۔ دریافت کیا گیا کہ آپ کو یہ الہام کیسے ہوا تو فرمانے لگے کہ امیدوار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے پروردہ ہیں۔ اور انٹرویو بورڈ کے ڈاکٹر نارنگ صاحب خود بھی ممبر ہیں پھر سوال کیا گیا کہ انٹرویو بورڈ کے دوسرے ممبران بھی تو ہیں اور آفسران کی بھی کوئی رائے ہوگی یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈاکٹر نارنگ کی ہی بات مانی جائے گی۔ دلیل سے کہنے لگے کہ اس رسالہ کے ایڈیٹر مجتبیٰ حسین صاحب بھی انٹرویو بورڈ کے ممبر ہوں گے اور جب مجتبیٰ حسین کا انتخاب ہوا تھا تو بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہی انٹرویو بورڈ کے ممبر تھے۔ اور انھوں نے مجتبیٰ حسین کو دیکھتے ہی کہا تھا کہ ابھی ان کا انٹرویو لینے کی کیا ضرورت ہے اب آپ ہی بتایئے کہ مجتبیٰ حسین صاحب ڈاکٹر نارنگ کے امیدوار کو کیسے نہ لیں گے۔ ان صاحب کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا گیا کہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر نارنگ نے مجتبیٰ حسین کے انتخاب کی مخالفت کی تھی۔ تو یہ صاحب فرمانے لگے کہ صاحب کچھ بھی ہو اسسٹنٹ ایڈیٹر بنے گا ڈاکٹر نارنگ کا امیدوار ہی۔ پھر عرض کیا گیا کہ یہ امیدوار تو ایک معقول جگہ پر اچھی تنخواہ پا رہے ہیں اپنی تازہ ترین تصنیف سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ اس آسامی کے قطعاً نا اہل ہیں۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر نارنگ یہ روگ نہ پالیں گے فرمانے لگے ستر ور صاحب اگر مالک رام صاحب اور ڈاکٹر نارنگ صاحب ہر دو ٹرسٹ وشوا ناتھ طاؤس کے لئے ووٹ کی بھیک مانگ کر انھیں انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کا ممبر بنوا سکتے ہیں تو یہ کیا مشکل ہے کہ نارنگ صاحب اپنے امیدوار کو اسسٹنٹ ایڈیٹر نہ بنوا سکیں۔ آخر تنگ آکر ان صاحب سے کہا گیا کہ میاں مسجد تو بنی نہیں اور تم ملا کو پہلے سے ہی موجود پا رہے ہو۔ کچھ دن انتظار کرو۔ انٹرویو ہو نے دو۔ سب کچھ سامنے آجائے گا۔

تحریر: درد تونسوی

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

اندرون بوہڑ دروازہ ملتان شہر حکیم چیلا رام کا مطب
یت اور شہرت کا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اس مطب
امیر وغریب سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا ہر
سلم مریض صرف ایک آنہ فیس دے کر اپنے مرض کی
خیص کرا سکتا تھا۔ مسلمان مریض اس فیس سے مستثنیٰ تھے
کیم چیلا رام جو بھی نسخہ لکھتے وہ دو تین پیسے سے زائد قیمت
ادویات کا نہیں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب صبح چار بجے اٹھتے
دریات سے فارغ ہو کر پیدل ان مریضوں کو گھر پہ
یکھنے نکلتے جن کو گھر پہ دیکھنے کا وقت دیا جاتا تھا۔ مسلمان
ریض سے گھر پہ دیکھنے کی فیس چار آنے تھی اور غیر مسلم
ریضوں سے آٹھ آنے۔ یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ وہ مسلمان
ریضوں سے اکثر اوقات فیس کے چار آنے بھی نہیں لیتے اور
وہ محسوس کرتے کہ مریض اور اس کے ورثا مالی طور پر نادار
تو نسخہ پر لکھ دیتے کہ اس مریض سے دوائی کی قیمت
لی جائے بلکہ حکیم صاحب کے ذاتی حساب میں لکھ دی جائے
مسلمان مریضوں سے وہ غیر مسلم مریضوں کی نسبت زیادہ
رمی سے پیش آتے تھے۔ تلخ کلامی ان کا شیوہ تھا جس
سے اکثر مریض اور ان کے تیماردار شاکی رہتے تھے۔ مگر کوئی
مسلمان مریض حکیم چیلا رام کی شکایت نہیں کرتا تھا۔
ی کہتا کہ حکیم چیلا رام مسلمانوں سے ڈرتے ہیں۔ کوئی کہتا
کسی مسلمان رئیس نے ان کی مالی مدد کی ہوگی۔ بہرحال حکیم
صاحب کی مسلم نوازی کے بارے میں کئی داستانیں زبان
زد عوام تھیں۔

غالباً اگست ۱۹۴۲ء کی کوئی تاریخ تھی۔ میں نیو سنٹرل
جیل ملتان کے سپرنٹنڈنٹ لالہ گنیش داس سے ملنے گیا
تاکہ وہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" دہلی
سے میری ملاقات کا کسی طور انتظام کر دیں جو کہ ان دنوں

نیو سنٹرل جیل ملتان میں نظر بند تھے۔ لالہ گنیش داس سردار
دیوان سنگھ مفتون کے نیازمند اور میرے کرم فرما تھے
مگر انھوں نے سردار صاحب سے ملاقات کی اجازت دینے
سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ حکومت کی ہدایات ہی ایسی تھیں
نیو سنٹرل جیل میرے مکان سے کئی میل کے فاصلے پر تھی اور
ان دنوں تانگے کے سوا کوئی سواری ہوتی نہیں تھی۔ کافی
دیر کے بعد تانگہ ملنے کے باعث میں رات کے نو بجے گھر آیا
تو بیوی نے بتایا کہ میرے لڑکے اقبال کی طبیعت یکایک
خراب ہو گئی ہے محلے کے ڈاکٹر اور پھر سرکاری سول ہسپتال
کے ڈاکٹر کو دکھایا دونوں نے انجکشن لگا دیئے اور بس۔ لڑکے
کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ صبح چھ بجے
میری بیوی اور میں بچے کو لے کر حکیم چیلا رام کے ہاں گئے
تو وہاں مریضوں کی ایک لمبی قطار دیکھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ
مریض کی حالت چاہے کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو حکیم صاحب
نمبر پر ہی مریض کو دیکھتے ہیں۔ خواہ حاکم وقت بھی کیوں
نہ ہو حکیم صاحب اس اصول کو نہیں بھولتے۔ مریضوں نے
بتایا کہ یہاں صبح چار بجے سے لائن لگنی شروع ہو جاتی ہے
بمشکل قدرا انتظار کرنے کے بعد ہمارا نمبر آیا۔ میں بچے سے لپٹا تھا۔ حکیم صاحب
نے نہایت ترش روئی سے کہا کیا تمہارا باپ مر گیا ہے جو بچے کو
سر پہ اٹھا رکھا ہے۔ حکیم صاحب کی یہ غیر ضروری بات سینہ چیر گئی
مگر بچے کو دکھانا تھا۔ میں چپ رہا۔ حکیم صاحب نے بچے کی نبض
پر ہاتھ رکھا اور فوراً ہی کہا کہ اسے گھر لے جاؤ اسے اب
کسی دوائی کی ضرورت نہیں ہے نمونیہ کا اثر ہو گیا ہے۔۔۔ ہو چکا
ہے۔ ڈاکٹری انجکشن وغیرہ لگوا کر اسے تکلیف مت دینا۔ یہ
اب بچ نہیں سکتا۔ بچے کو دوسرے مریض کی نبض دیکھنے لگے
ہاتھ میں تھی۔ ایک آنہ پیش کیا گیا جو انھوں نے واپس کر دیا
اور کہا کہ ہم مریض کے لئے ہیں۔۔۔ نسخہ ہی نہیں لکھتا

اس سے ایک آنہ بھی نہیں لیتا میرا بیوی نے تو وہیں ،وناشروع کر دیا۔ ہم چپ چاپ ملتان چھاونی محلہ گجر کھڈا میں اپنے مکان پر آ گئے ۔ میں نے مقدور بھر بچے کا علاج ڈاکٹر سلیم اور حکیم محمد امین سے کرایا مگر ہوا وہی جو حکیم چیلا رام نے کہا تھا ۔ یہ تھی چیلا رام حکیم سے میری پہلی ملاقات ۔ جس سے میں کافی مایوس ہوا تھا ۔ اور میں کئی دن تک سوچتا رہا کہ کیا خدا کی مخلوق میں ایسے تلخ زبان ۔ اور سخت مزاج لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں ۔

کچھ دنوں بعد میرے نانا لالہ کیول رام ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے دوبار کی کوشش مجھے کئی بیماریاں ہیں اور میں حکیم چیلا رام کی تعریف سن کر تمہارے پاس آیا ہوں ۔ میرا علاج حکیم چیلا رام سے کراؤ ۔ یہ سن کر میں نے حکیم صاحب کی تلخ کلامی ۔ بد اخلاقی ۔ لائن میں لگنا وغیرہ کے بارے میں نانا جی کو تفصیل سے بتایا تو فرمانے لگے کہ یہ سب باتیں ایک اچھے حکیم میں ہوتی ہی ہیں بغرض ہم کو ہے احساس کو ہمیں لہذا یہ سب باتیں سہنی پڑیں گی ۔ تمہیں تکلیف ضرور ہوگی مگر میری خاطر یہ سب کچھ کر دو اور میرا علاج حکیم چیلا رام سے کراؤ ۔ دوسرے دن صبح چار بجے میں حکیم صاحب کی دوکان پر پہنچ گیا (نانا صاحب کو آٹھ بجے دوکان پر پہنچنے کی تاکید کر دی) دیکھا تو مجھ سے پہلے چار مریض اور بیٹھے تھے ۔ پانچ منٹ بعد حکیم صاحب نے دروازہ کھولا ۔ ایک نظر ہم سب کو دیکھا ۔ ہماری نمسکار کا جواب خاموشی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے دروازہ بند کر لیا ۔ جو پورے آٹھ بجے کھلا ۔ مریض نمبروار جانے شروع ہوئے ۔ میرا نمبر پانچواں تھا ۔ میرے نانا صاحب تشریف لا چکے تھے ۔ حکیم صاحب کہنے لگے صبح نمبر پر تم تھے اور دکھا رہے ہو کسی اور کو ۔ گزارش کی گئی کہ یہ میرے نانا ہیں فورٹ سنڈیمن سے آئے ہیں ۔ ضعیف ہیں ۔ صبح چار بجے حاضری نہیں دے سکتے ان کی جگہ لائن میں میں لگا کروں گا یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے آج تو پگڑی باندھ کر آئے ہو حیرت ہوئی کہ یہ شخص زیر لب مسکرانا بھی جانتا ہے اور یہ خوشی بھی ہوئی کہ حکیم صاحب نے ننگے سر والے کو پہچان لیا ۔ حکیم صاحب نے میرے نانا صاحب کی نبض پہلے دائیں ہاتھ کی دیکھی پھر بائیں ہاتھ کی ۔ ایک منٹ تک نبض دیکھنے کے بعد امراض کی ایک طویل فہرست گنوا دی اور کہا کہ علاج پر کم از کم ایک سال لگے گا اگر ایسا کر سکو تو میرا علاج شروع کرو ۔ ورنہ کسی ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ ۔ ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ ہمیں منظور ہے ۔ نسخہ لکھا اور حکم ہوا کہ ہر روز آنا ہوگا ۔ اور مریض کا قارورہ بھی ساتھ لانا ۔

میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب کو نسخہ لکھنے کے لئے کاغذ کی قلت کا سامنا ہے ۔ دوسرے دن میں کاغذ کے ریم سے بچی ہوئی تین انچ چوڑی کترن اٹھا کر لے گیا اور حکیم صاحب کو پیش کی کہ اس کترن پر آپ نسخہ لکھا کیجئے ۔ محبت بھری نظر سے دیکھا اور کترن قبول کر لی ۔ ایک ڈیڑھ ماہ کی روزانہ حاضری کے بعد حکیم صاحب نے یہ اجازت دے دی کہ مریض کے آنے کی ضرورت نہیں تم ہر روز ان کی حالت بتا دیا کرو ۔ سائیکل میرے پاس تھی رفتہ رفتہ میں نے یہ عادت بنا لی کہ سویرے ۳½ بجے اٹھتا دس منٹ میں حکیم صاحب کے در دولت پر جا کر تھڑے پر لیٹ جاتا ۔ کسی دن آنکھ بھی لگ جاتی حکیم صاحب چار بجے دروازہ کھولتے اور کبھی مجھے سوتا ہوا اور اکثر جاگتے ہوئے سب سے پہلے نمبر پر دیکھ کر دروازہ بند کر کے مریضوں کو دیکھنے چلے جاتے کچھ دنوں بعد وہ دوسرے مریضوں سے کہتے کہ علاج کرانا اس لڑکے سے سیکھو حالانکہ اس وقت میری عمر ۲۸ سال تھی اور وہ مجھے لڑکا ہی کہتے تھے ۔

اگر کسی مریض نے یہ کہہ دیا کہ حکیم صاحب مجھے جلدی ہے تو وہ بگڑ کر کہتے میں قصائی نہیں ہوں کہ گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر تمہیں دیدوں یہاں تو وقت لگے گا ۔ ایک خاتون نے اپنے بچے کو دکھایا تو کہنے لگے اس کا کفن تیار کر رکھو ۔ ماں کو اس کے بیٹے کے بارے میں کوئی حکیم ایسا کہے تو جو حالت ماں کی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے ۔ فرمانے لگے ۔ دیکھو جی میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ کچھ بھی ہو اس بچے کو ٹکڑا (روٹی) نہ دینا ۔ مگر یہ بچہ دن بھر روٹی کھاتا رہا ہے ۔ میں نے گزارش کی حکیم صاحب یہ کیسے پتہ چلا کہ بچے نے روٹی کھائی ہے ۔ زیر لب مسکرائے اور فرمانے لگے کہ کیا ستر سال سے جھک مار رہا ہوں سنو اس لڑکے

نے روٹی بھنڈی کے ساتھ کھائی ہے۔ لڑکے کی ماں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی کہ کل اس نے چوری روٹی کھا لی تھی اور بھنڈی کے ساتھ بھی کھائی تھی۔

ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے حکیم صاحب سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے ایک گھنٹے کے لئے ایسے وقت حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت دیں جب کوئی دوسرا آپ کے پاس نہ ہو فرمانے لگے آج چار بجے آ جاؤ۔ میں وقتِ مقررہ پر حاضر ہوا۔ حکیم صاحب نے خندہ پیشانی سے نوازا۔ ٹھنڈا پانی پلایا اور کچھ نمکین بھی کھلایا فرمانے لگے کہو کیا بات ہے۔ گزارش کی گئی کہ آپ سے کچھ باتیں پوچھنی چاہیے کھل کھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ میں تو سمجھا تھا کہ تم کسی پوشیدہ مرض کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتے ہو۔ حکیم صاحب قہقہہ بھی لگا سکتے ہیں۔ یہ میرے لئے کولمبس کی دریافت سے کم حیران کن واقعہ نہ تھا۔ پہلا سوال میرا یہ تھا کہ آپ غیر مسلموں کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ بہتر سلوک کیوں کرتے ہیں۔ فرمانے لگے، کیونکہ میرا اُستاد مسلمان تھا۔ یہ سب کچھ اس کا ہی عطا کیا ہوا ہے۔ میرے اُستاد نے اپنے مسلمان شاگردوں کے مقابلہ میں مجھ پر زیادہ توجہ دی تو میں مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کیوں نہ کروں۔ اُستاد کے احسانات کا بدلہ میں کسی طور بھی اتار نہیں سکتا۔

اس کے بعد میں نے مریضوں کے ساتھ تلخ کلامی اور سخت رویہ کا جواز دریافت کیا۔ تو کہنے لگے کہ ایسا میں دانستہ کرتا ہوں ایک تو اس لئے کہ میری بدسلوکی کے باعث میرے ہاں مریض کم آئیں تاکہ میں تھوڑے مریضوں پر زیادہ توجہ دے سکوں [illegible] کہ صبح نو بجے سے شام کے چار بجے تک مریضوں کی لائن ہی ختم نہیں ہوتی اور دوسرے اس تلخ کلامی کے باعث مریض پرہیز کرتا ہے جب کسی بچے کے بارے میں اس کی ماں سے یہ کہتا ہوں کہ اس کے لئے کفن تیار رکھو تو وہ اس قدر ڈر جاتی ہے کہ میرے بتائے ہوئے پرہیز سے بھی زیادہ پرہیز کراتی ہے جس کے نتیجہ میں مریض جلد شفایاب ہو جاتا ہے۔ کہنے لگے دیانند کاشی جی [illegible] کہتا کہ دوا اگر ایک حصہ فائدہ کرتی ہے تو پرہیز تین حصے مریض کو شفا ہونے میں مدد کرتی ہے

اب میرا سوال یہ تھا کہ بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو

فوری طبی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ ہیں کہ خواہ مریض لائن میں ہی مر جائے۔ مگر آپ نمبر کے بغیر اسے نہیں دیکھتے کہنے لگے اگر نمبر تمہارا ہو اور تحصیلدار آ کر مطالبہ کرے کہ پہلے مجھے دیکھو تو تمہارے دل پر کیا بیتے گی اس لئے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے میں اپنے اس اصول کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے لئے سب برابر ہیں فوری طور پر طبی مدد چاہنے والے مریض کسی اور ڈاکٹر یا حکیم کے یہاں جا سکتے ہیں۔ حکیم صاحب نے پھر قہقہہ لگایا اور کہنے لگے کہ ایک سردار جی انکم ٹیکس آفیسر ہیں وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ کار میں آئے۔ اور لائن میں نہ لگتے ہوئے سیدھے میرے پاس آئے اور کہنے لگے حکیم جی میرے بچے کو دیکھئے ———۔ میں نے ان سے کہا سردار جی یہ [illegible] کی دوکان نہیں کہ آپ کو راشن کارڈ کر دیدوں۔ لائن میں کھڑے ہو جاؤ جب نمبر آئے گا تب آپ کے لڑکے کو دیکھوں گا سردار جی بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ اور دوسرے دن انکم ٹیکس دفتر کا چپڑاسی نوٹس لے کر آیا کہ اپنی آمدنی کی تفصیلات پیش کیجئے دفتر میں حاضری دو۔ تاریخ مقررہ پر انکم ٹیکس دفتر گیا سارا دن بیٹھا رہا شام کو صاحب نے تاریخ دے دی کہ فلاں تاریخ کو آنا۔ اب تک چھ تاریخیں بھگت چکا ہوں۔ مریض سارا دن یہاں لائن میں لگے رہتے ہیں اور میں صبح دس بجے تک کچھ مریض دیکھ کر دفتر انکم ٹیکس چلا جاتا ہوں اور پھر جب وہاں سے چھٹی ملتی ہے تو آ کر باقی مریضوں کو دیکھتا ہوں مگر میں اپنا اصول چھوڑوں گا نہیں۔ خواہ سردار جی کچھ ہی کیوں نہ کر لیں

اب میں نے حکیم صاحب سے پوچھا کہ آپ جن مریضوں کو گھر پر دیکھنے جاتے ہیں ان کی طرف سے سواری کی پیشکش قبول نہیں کرتے اور ملتان چھاؤنی تک پیدل ہی مریضوں کو دیکھنے جاتے ہیں۔ کہنے لگے کہ شہر سے چھاؤنی چار میل ہے اور دو پیسے تانگے کا کرایہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مریض یہ کرایہ ادا کر سکتا ہے مگر میں اسی بہانے صبح چار بجے سیر کر لیا کرتا ہوں اور باقی عمر [illegible] دس بارہ میل پیدل چل لیتا ہوں۔ دوسرے مریض صبح خالی پیٹ ہوتا ہے خالی پیٹ مرض کی تشخیص بہتر طور پر ہو سکتی ہے

[illegible] کے بعد حکیم صاحب میرے کرم فرما بن گئے جب بھی چھ دن میں کسی مریض کو دیکھنے آتے تو غریب خانے

کریمی الاحسانی

مشاعرۂ نمائش مظفر نگر

آج ۸ مئی ۷۹ء ہے رات کے دس ہوا چاہتے ہیں دیکھئے یہ پنڈال کتنا وسیع و عریض ہے اسٹیج سے ذرا ایک نظر ڈالئے سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ایک بحرِ بیکراں ہے اس پنڈال میں بمشکل تمام تقریباً ۸ ہزار سامعین سما سکتے ہیں پنڈال سے باہر اور دکانوں پر بھی اردو کے شیدائی جمے اور ڈٹے ہوئے ہیں نہ جانے کتنے ہی حضرات جگہ نہ ملنے کے باعث کھڑے ہوئے ہیں خواتین کے بیٹھنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس مشاعرہ کے دن انگلیوں پر گنے جاتے ہیں اس مشاعرہ میں بجنور۔ سہارنپور۔ میرٹھ بلند شہر وغیرہ سے اردو کے ہمدرد اور بہی خواہ تشریف لاتے ہیں۔ امسال T.V اور ریڈیو کا بھی بندوبست کیا ہوا ہے محترم سعید مرتضیٰ صاحب ایم۔ پی جنکے دم سے یہ مشاعرہ ترقی کر رہا ہے۔ صدارت کے لئے جناب جگجیت سنگھ جی وزیر مرکزی حکومت کا اسم گرامی پیش ہو رہا ہے ہیں جناب شاہد رضا ایڈووکیٹ تائید فرما رہے ہیں اس پر تالیوں سے اظہارِ خوشنودی کیا جا رہا ہے ادھر جناب مظفر نگری صاحب ثقلین حیدر صاحب سے درخواست نظامت کر رہے ہیں اور وزیر موصوف تقریر فرما کر اپنی جگہ آ گئے ہیں ثقلین صاحب نے نہایت جامع اور پُر شکوہ تقریر کے بعد عبدالحق سحر مظفر نگری کو دعوتِ غزل دی ہے سحر صاحب غزل سرا ہیں ؏

بیمارِ محبت کو دوا دو نہ دعا دو
دامن کی ہوا دو اسے دامن کی ہوا دو
پھر اپنی تباہی کا مجھے غم نہیں ہوگا
ساحل پہ کھڑے ہو کے ذرا ہاتھ اٹھا دو
میں چاہوں تو رہ جاؤں فقط سوچ کے دل میں
تم چاہو تو بگڑی ہوئی تقدیر بنا دو

سحر صاحب مناسب داد وصول کئے جا رہے ہیں چونکہ پنڈال میں مائک کی خرابی کی وجہ سے کسی قدر بدنظمی اور شور و غل ہے اس لئے سحر صاحب کو وہ داد نہ دی گئی جس کے وہ مستحق تھے لیجئے اب ثقلین صاحب درخواست غزل کر رہے ہیں ملک کے مشہور مترنم شاعر سلیم کھتولوی سے سلیم صاحب یوں گرج اور برس رہے ہیں ان کو مائک کی بھی ضرورت نہیں ہے سنئے ؏

ہزاروں پردوں میں حسن پنہاں چھپا ہے لیکن چھپا نہیں ہے
نگاہ سے نادری بھی وہ فقط نظر سے نادری رہن ہے
ہماری آہ و فغاں کو سنکر یہ اہلِ محفل برا نہ مانیں
ہم اپنی قسمت کو رو رہے ہیں کسی سے شکوہ گلہ نہیں ہے

سلیم صاحب بھی داد لوٹے جا رہے اور اب نجم مظفر نگری کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے نجم صاحب اپنے مخصوص انداز سے غزل سرا ہیں ؏

لمحاتِ مسرت میں نہ بھولے سے کیا یاد
اچھا ہے برا وقت کہ آیا تو خدا یاد
وہ مجھ سے نہ ملنے کا سبب پوچھ رہے ہیں
جن کو نہ رہا خود بھی مرے گھر کا پتا یاد
وہ کہہ کے برا مجھ کو مکر جاتے ہیں اکثر
کیا خوب کہ ان کو نہیں اپنا ہی کہا یاد

نجم صاحب کو بھی اس ہاؤ ہو میں سن لیا گیا ہے اور اب سلیم شیرازی لکھنوی مائک پر آ گئے ہیں ارشاد ہوتا ہے ؏

ضبطِ الم سے آنکھ میں آنسو بھر آئے ہیں
اس درجہ احتیاط سے ہم مسکرائے ہیں
اب غم کی تیز دھوپ کا چہرہ اتر گیا
اب ہم ہیں اور آپ کی زلفوں کے سائے ہیں
مدت ہوئی اجڑ گیا ہر شہرِ گل سلیم
کچھ لوگ اب بھی شمعِ تمنا جلائے ہیں

سلیم صاحب داد لوٹے جا رہے ہیں اور اب آپ سے

انور شادانی۔ آپ کے ساتھ ہی T.V. والے بھی جاگ گئے ہیں انور صاحب نہایت دلکشی سے غزل سرا ہیں ؎

صرف دیوانے کو احساسِ وفا لازم ہے
اس کو احساسِ وفا ہو یہ ضروری تو نہیں
سر سے آنچل کسی صورت بھی ڈھلک سکتا ہے
شوخیٔ بادِ صبا ہو یہ ضروری تو نہیں
رنگِ خونِ دلِ انور بھی تو ہو سکتا ہے
دستِ نازک پہ حنا ہو یہ ضروری تو نہیں

انور صاحب تالیوں کی جھنکار میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور ایم۔ پی صاحب مائک والوں پر برس رہے ہیں وہ ابھی مائک کی آواز صاف نہیں کر سکے جس شاعر کو آواز دی جاتی ہے وہ آنے سے کترا رہا ہے اس عالم میں استاد رامپوری کو دعوتِ طنز و مزاح دی جا رہی ہے لیجئے استادِ محترم یوں استادی کے ہاتھ دکھلا رہے ہیں ؎

قاتل کے مددگار بھی پہنچیں گے سرِ دار
جو اس نے دیا ہے وہی انعام ملے گا
جلاد سے کہہ دو کہ ابھی ہاتھ روک رکھ
آئندہ مہینوں میں بہت کام ملے گا

ایک ہاؤ ہو کا عالم ہے یہ شورِ خوشگوار ذرا کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

کھڑی تھی اک حسینہ بال بکھرائے ہوئے چھت پہ
نگاہِ شوق کہتی تھی یہ کوئی ماہ پارہ ہے
سڑک پہ ایک ناکامِ وفا لوگوں سے کہتا تھا
کیا برباد جس نے یہ وہی دُمدار تارا ہے

پھر ایک غل غپاڑہ ہے اور استادِ محترم محفل کو قہقہہ زار بنا کر کئی اور قطعات سنا کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور اب رنگِ محفل کے لئے مشہور گلوکار شاعر نور اندوری مائک پہ آ گئے ہیں فرمائشوں کا ایک شور ہے اور T.V. والے بھی مستعد ہو گئے اور نور صاحب یوں شامیانہ شکن ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

کہیں بھی دفا کی نشانی نہیں ہے
یزیدوں کی بستی ہے پانی نہیں ہے
ذرا شیخ صاحب سنبھل کر ہی رہیئے
چھلکتے گلاسوں میں پانی نہیں ہے

آہ اور واہ کا شور کم ہوا تو اسی بانکپن سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

راہ میں تھک کے جو چور ہو جائے گا
منزلوں سے بہت دور ہو جائے گا
اک خوشی ہے کہ وہ مل گیا ہے مجھے
اک غم ہے کہ پھر دور ہو جائے گا
نور کو محفل میں آنے تو دو
ہر طرف نور ہی نور ہو جائے گا

نور صاحب محفل میں جان ڈال کر تالیوں کے بے ہنگم شور میں خراماں خراماں جھومتے ہوئے پلٹ رہے ہیں ثقلین صاحب دوسرے مترنم غزلگو شاعر راز الہ آبادی کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں راز صاحب غزل سرا ہیں ؎

اسقدر تیز تھا کارواں۔ چھپ گئے منزلوں کے نشاں
بھیک میں مانگتے ہیں زباں۔ کھو گئی اپنی غیرت کہاں

داد پر کسی ہنگامہ کا گماں ہو رہا ہے کئی بار دہرا کر اسی بانکپن سے سحر کاری کر رہے ہیں ؎

مہ جبیں گلبدن گل ادا۔ یہ خطاب ان کے قابل کہاں
دیکھئے آنکھ نم ہو گئی۔ اور سنئے میری داستاں
زخمِ دل کے کہیں مٹ سکے۔ مٹ گئے گولیوں کے نشاں

یہ کمالِ یار کے سامعین اور اہلِ ذوق کا جمِ غفیر ہے اس شعر کے پس منظر کو وہ خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں لہٰذا اب داد دینے والے تالیوں پر اتر آئے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں ؎

ہم چمن میں پکارا کئے۔ آشیاں۔ آشیاں۔ آشیاں

پھر داد نقطۂ عروج سے سوا ہے اور راز صاحب تالیوں کے شور میں داد لوٹتے جا رہے ہیں اور چودھری شفقت جنگ سابق ایم۔ پی کے قریب تسنیم صدیقی آ کر بیٹھ گئی ہیں اس پر ایک صاحب [illegible] ہے بھائی جی تصویر اچھی آئیگی۔ اس پر بارونق مسکرا [illegible] دیکھا [illegible] سی سنائی یوں دواں دواں عروج اور [illegible]

رہے ہیں بمشکل تمام ایک قطعہ نوٹ کیا ملاحظہ فرمایئے ؎

آج انسان کیسے انساں ہیں
دل بھی ان کے بدل نہیں سکتے
ایک گاڑی میں بیٹھ سکتے ہیں
ایک رستے پہ چل نہیں سکتے

شمسی صاحب محفل کو گرما کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور اب دوسرے انقلابی شاعر راحت اندوری یوں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

دن ڈھل چکا جو رات گزرنے کی آس میں
سورج ندی میں ڈوب گیا ہم گلاس میں
وہ شخص بھی ملا ہے سنہری لباس میں
جس نے کبھی کتاب نہ کھولی کلاس میں

واہ ہے کہ کچھ زیادہ چھپے نہ جانے کیوں ۷.۳ والے راحت صاحب کو نظر انداز کر گئے۔ راحت صاحب نہایت پُر وقار انداز اور اعتماد سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

مجھ پر نہیں اٹھے ہیں تو اٹھ کر کہاں گئے
میں شہر میں نہیں تھا تو پتھر کہاں گئے
کتنے ہی لوگ پیاس کی شدت سے مر چکے
میں سوچتا رہا کہ سمندر کہاں گئے
میں خود ہی میزباں ہوں مہمان بھی ہوں خود
سب لوگ مجھ کو گھر پہ بلا کر کہاں گئے

راحت صاحب محفل کو نقطۂ عروج پر لا کر کامراں پلٹ رہے ہیں اور اس عالم میں سائرہ صدیقی گلابی ساڑی زیب تن کئے مائک پر آکر فرما رہی ہیں ؎

شاید مجھے جینے کا سلیقہ نہیں آتا
روتی ہوں سر بزم تبسم کی ادا سے
شاداب ہے احساس معطر ہے تمنا
تصویر جوانی ہوں بزرگوں کی دعا سے

سائرہ صاحبہ راحت کے بعد جم نہ پائیں ادھر ملک بھی کام نہیں کر رہا ہے آپ جا رہی ہیں اور اب رنگ محفل بدلنے کے لئے ناظم انصاری ناگپوری یوں محفل کو قہقہہ زار بنانے چلے ہیں ؎

تم اپنے باپ سے پوچھو یا کہ انکل سے
ہم اہل عشق کو ہیبت ہے مار کھانے کی
سمجھ رہا ہوں میں ڈیڈی یتیم اپنے کو
ملی ہے جب سے صدارت یتیم خانے کی

ہاؤ ہو اور ایک شور سا شور ہے اور آپ یوں صاحب کی صحت میں اضافہ فرما رہے ہیں ؎

میں حیران بیکل وغیرہ وغیرہ
وہ شوخ اور چنچل وغیرہ وغیرہ
سب ہجر ہی اکثر میرے کام آئے
یہ پچھڑ یہ کھٹمل وغیرہ وغیرہ

قہقہے۔ تالیاں اور ایک غل غپاڑہ ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

خدا جانے کیا ہم کو سمجھے ہوئے ہیں
ترے باپ انکل وغیرہ وغیرہ

ناظم صاحب محفل کو قہقہوں پر آمادہ کر کے تالیوں کے شور میں چپ چاپ اپنی جگہ آ رہے ہیں اور ثقلین صاحب دعوتِ موسیقی دے رہے ہیں تسنیم صدیقی کو آج تسنیم صاحبہ بڑے شوخ اور عریانیت کا مظاہرہ فرما رہی ہیں ماشاء اللہ کیا عریاں لباس ہے اسے کہتے ہیں آج کے دور میں ترقی لیجئے ۷.۳ والے بیدار ہو گئے ہیں اور آپ لحنِ طلعت میں الاپ رہی ہیں ؎

پی چکی ہوں زہر غم پھر یہ تشنگی کیسے
آج میری آنکھوں میں آ گئی نمی کیسے
وہ تصور میں ہی آ کے چھو گیا ہو گا

اب یار لوگ تفریح کے موڈ میں دوسرا مصرعہ سنیں۔ کہ نہیں اللہ جانے اسی مصرعہ کو دہرا رہے ہیں اور فرما رہی ہیں ؎

ورنہ میرے ہونٹوں پہ آ گئی ہنسی کیسے
آج میں بھٹکتی ہوں تیرگی کے صحرا میں
راستہ دکھلائے گی مجھ کو چاندنی کیسے

اُن کو میری آنکھوں کا مدعا سمجھنا تھا
میں تو ایک مورت تھی مُنہ سے بولتی کیسے

تسنیم صاحبہ ایک اور ایک اور کے شور میں جا رہی ہیں اور سعید مرقطے ایم۔ پی مسکرا کر فرما رہے ہیں۔ آپ اسقدر بیتاب کیوں ہوتے ہیں دوسرے دَور میں سُن لیجئے گا۔ دیکھا تو مظفر زری یوں غزل سرا ہیں ؎

ابتدائے عشق کی رسوائیاں دید کیجئے
مجھ کو میری گمشدہ پرچھائیاں دید کیجئے
مسکرا کر پھول کو رعنائیاں دید کیجئے
شاخِ گل کو جھوم کر انگڑائیاں دید کیجئے

داد شباب پر ہے اور آپ محفل کو چونکا رہے ہیں۔ (یہ غزل شانِ ہند میں پہلے بھی پڑھ چکے ہوں گے) سنئے۔

ایک مدت سے مزاجِ زندگی مغموم ہے
اب تو اس ماحول کو شہنائیاں دید کیجئے

زری صاحب محفل کو گرما کر شاداں پلٹ رہے ہیں اور اس عالم میں جانِ محفل برکھا رانی مائک پر یلغار کر رہی ہیں. T.V. والے اپنا کام شروع کر رہے ہیں اُدھر ایک منچلے نے باآواز بلند کہا اسلام علیکم، اُدھر سے جواب دیا گیا جیتے رہو اور اسی ہنسی مذاق میں یوں دھیمے سروں میں ترنم فرما رہی ہیں ؎

یوں جا کے لوٹ آئے ہیں دُنیا کے ڈر سے ہم
آگے نکل گئے ہیں تری رہگذر سے ہم
ترکِ تعلقات کا ہر تذکرہ قبول
کیسے نظر ملائیں گے اُن کی نظر سے ہم
جن کے بغیر رات کی نیندیں حرام ہیں

آہ اور واہ کا دھماکہ ہوا ہے سامنے والے من چلے اس مصرعہ کو دہرائے جا رہے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

ان کو بھی دیکھتے نہیں دُنیا کے ڈر سے ہم
جب بھی اٹھایا ہاتھ تو بے چینیاں بڑھیں
ڈرنے لگے ہیں اپنی دُعا کے اثر سے ہم

برکھا صاحبہ محفل کو تو شہ کرتا لیوں کے شور میں خراماں خراماں جا رہی ہیں اور اب اس رنگ کو دو آتشہ کرنے کے لئے خوش فکر شاعر نظر ایٹوی کو دعوتِ فکر دی جا رہی ہے نظر صاحب بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

ہونٹوں پہ خوشی ہے آنکھوں میں اُداسی ہے
اب ان کی طرح مجھ سے قسمت بھی خفا سی ہے
اس شہر کے لوگوں کی باتوں میں نہ آ جانا
اس شہر کے لوگوں کی ہر بات سیاسی ہے

داد دینے والے بُری طرح چیخ رہے ہیں ہر چند کہ ابھی مائک کی آواز صاف نہیں ہوئی لیکن داد کا عالم نہ پوچھئے اور نظر صاحب جمے ہوئے ہیں ؎

احساس کے شیشہ پر صدموں کی خراشیں ہیں
جینے کا تصور بھی اب ایک سزا سی ہے

نظر صاحب داد میں ڈوبے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب ملک کے منفرد اور سنجیدہ غزلگو شاعر جناب مشیر جھنجھانوی سے درخواستِ کلام کی جا رہی ہے قبلہ مشیر صاحب حسبِ عادت متانت اور سنجیدگی سے عطا فرما رہے ہیں ؎

اپنے ماحول پہ الزام لگاتے کیوں ہو
آگ کے شہر میں بارود بناتے کیوں ہو
تم ہو صندل تو مہکتے ہی چلے جاؤ گے
اپنا کردار زمانے سے چھپاتے کیوں ہو
تم تو کہتے ہو کہ ہموار ہے سطحِ دریا
پھر سفینوں کو تلاطم سے بچاتے کیوں ہو
ایک ہی خاک سے انسان ہوئے ہیں پیدا
ایک ہی خون ہے پھر خون بہاتے کیوں ہو
آگ مسجد میں لگے گی تو جلے گا مندر
یہ سمجھتے ہو تو پھر آگ لگاتے کیوں ہو

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ اسی پُر وقار انداز سے یوں حقائق پیش کر رہے ہیں ؎

تم نے خود رہزنوں کو نئے چہرے بخشے
اب لٹے ہو تو شور مچاتے کیوں ہو

داد کا سابقہ ریکارڈ بھی اس بھونچال کو دیکھ رہا ہے کہ

کیا ہو رہا ہے یار لوگ تالیوں پر اتر آئے ہیں اور اب مشیر صاحب سے سن کر بھی کیا کیجئے گا اس شعر کے بعد اب رہ بھی کیا جاتا ہے قدیر شمیر صاحب کا مرثیہ محفل کو گرما کر جا رہے ہیں اور اب ڈاکٹر تنظیر صفی پوری آ رہے ہیں نیئر صاحب مظفر نگر میں پہلی بار آئے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

بے نیازی نے یوں مرا دل توڑ دیا
جیسے خوشبو نے دبے پاؤں چمن چھوڑ دیا

چونکہ مائک کا وہی حال ہے بمشکل تمام ایک مطلع ہی ضبط کیا گیا ہے افسوس ہے کہ قارئین کرام ایک اچھی غزل سے محروم رہ گئے آئیے پھر ایک لہجہ ایک انداز ایک ترنم ایک حسین رنگ میں غزل شہریارِ غزل خمار بارہ بنکوی سے سنیں

مری طرح تنگ آکے وہی زہر کھانے والے
تری بے کسی کے صدقے مجھے بھول جانے والے
تری بے وفائی کو میں کبھی کا بھول جاتا
د بڑھاتے بات اتنی اگر آنے جانے والے
انہیں حال دل سنانا وہ سنیں تو بھول جانا
ہمیں وار کرنے والے ہمیں زخم کھانے والے
نہ خمار مجھ سا کوئی کافر تغزل
مجھے یاد تو کریں گے مرا ناز اٹھانے والے

خمار صاحب نہایت دلکشی سے غزل سنا کر ہر شعر پر داد کی جھولیاں بھرے عالمِ رویا میں خراماں خراماں پلٹ رہے ہیں اور اب دعوتِ طنز و مزاح دی جا رہی ہے ہلال سیوہاروی کو۔ ہلال صاحب علامہ آیت اللہ خمینی سے دو دو ہاتھ کرنے چلے ہیں ؎

تم گئے تھے راہ ہدایت کو دکھانے کے لئے
پھر یہ بتلاؤ خود گمراہ کب سے ہو گئے
تم بھی دے سکتے ہو بندوں کو سزا اعمال کی
تم آیات اللہ تھے اللہ کب سے ہو گئے

آہ اور واہ کا شور کم ہوا تو اب ضیاء الحق کو للکار رہے ہیں ؎

خیر سے تم لوگ محروم بصیرت بھی نہیں
پھر یہ بتلاؤ اندھیرے کو ضیا کہتے ہو تم
کیا کیا تھا فاتحِ مکہ نے دشمن سے سلوک
خون بہانے کو نظامِ مصطفےٰ کہتے ہو تم

اب داد دینے والے ہلڑ بازی پر اتر آئے ہیں اور صاحب ایک اعلان حق فرما رہے ہیں ؎

تو نے جو ڈال دی بھٹو کے گلے میں رسی
کل ترے پاؤں کی زنجیر بھی بن سکتی ہے
جو روش تو نے بنا دی ہے بنام اسلام
کل ترے واسطے شمشیر بھی بن سکتی ہے

ہلال صاحب محفل میں ہنگامہ آرائی کر کے تالیوں کے بے ہنگم شور میں ایک اور ایک اور کی فرمائش ان سنی کرتے ہوئے چلتے بنے اور اب ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب ممنونِ کرم کر رہے ہیں ؎

آج اس رنگ میں ایک سراپا لکھوں
جو بھی جلوہ نظر آئے ترا چہرہ لکھوں
اور کیا اس سے سوا شہر کا قصہ لکھوں
مرثیہ دن کا لکھوں شب کا قصیدہ لکھوں

عنوان صاحب رواں دواں سنا کر داد وصول کئے جا رہے ہیں آئیے پھر ایک غزل الحاج خسیم جے پوری سے سنئے ؎

وہ پہلے پہل مرحمتِ ناز کا عالم
اللہ غنی عشق کے آغاز کا عالم
دیکھا ہے مجھے اس طرح جیسے نہیں دیکھا
عالم سے الگ ہے نگہِ ناز کا عالم
پھر کوئی نہ آئے گا اٹھانے
ہم تک ہے تری انجمنِ ناز کا عالم
اب تک تو میں صیاد قفس توڑ رہا تھا
اب دیکھ مری جراتِ پرواز کا عالم

خسیم صاحب محفل کو نغمگی میں ڈبو کر داد و تحسین لوٹے پلٹ رہے ہیں اور اب درخواستِ کلام کی جا رہی ہے عالم فتحپوری سے۔ عالم صاحب قلندرانہ انداز سے فرماتے

کیا گیا ہے جو تحریر خونِ ناحق سے
ستمگر دے اسے آئینِ مصطفےٰ نہ کبھو
جنوں میں ابلہِ مسجد کی سرپرستی میں
کیا ہے خونِ مسلماں اسے سزا نہ کبھو

حادثہ کا ایک دھماکہ ہوا ہے اور آپ اسی پُروقار انداز سے فرما رہے ہیں ؎

بیوفا کی محفل میں دل کی بات کیا کہئے
بہتر اسی میں ہے خود کو بیوفا کہئے
رہنما نے بھی اکثر راہزن کو لوٹا ہے
کس کو راہزن کہئے کس کو رہنما کہئے

عالم صاحب تالیوں کی جھنکار میں جا رہے ہیں اور اب قبلہ فنا نظامی کانپوری یوں تھکے اور بوڑھے ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

دکھائے گی محبت خواب کتنے
اس اک دریا میں ہیں سیلاب کتنے
حسابِ میکدہ دے مجھ کو ساقی
ہیں کتنے تشنہ لب سیراب کتنے
جفاجو۔ بیوفا۔ ظالم۔ ستمگر
جنوں کے بھی ہیں القاب کتنے

قبلہ فنا صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب آ رہے ہیں علامہ انور صابری صاحب تبرکاً ایک قطعہ سن لیجئے گا ؎

چمن والوں میں ہے کہرام برپا
نئے فتنے اٹھائے جا رہے ہیں
قیامت ہے کہ اربابِ نشیمن
نشیمن سے نکالے جا رہے ہیں

آپکے ساتھ ہی تقریباً چار بجے یہ محفلِ شعر و سخن برخاست ہو رہی ہے داد دیجئے سامعین کے صبر و تحمل کی کہ مشاعرہ کو اُڑایا نہ پنڈال کو اکھاڑ پھینکا۔ کسی طرف سے احتجاجی نعرہ بلند ہوا نہ پتھراؤ۔ اور مائک آخر تک خراب ہی رہا۔

یہ شعر نگر ہے یہاں کی ایک روایت رہی ہے اس کا احترام بھی ضروری تھا لہٰذا اس صورت میں بھی مشاعرہ کو کامیاب کیا جناب محترم سید مرتضےٰ صاحب ایم۔پی مسٹر سعید الزماں ایڈوکیٹ چیرمین کوآپریٹو بینک جناب ریاست علی ایڈوکیٹ وغیرہ نے جس تندہی اور خلوص سے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں دلچسپی لی اور مہمان شعراء کی خاطر مدارات کی وہ لائقِ مبارکباد اور قابلِ تحسین ہے ہر مشاعرہ میں زمانے کتنی خرابیاں ہوتی ہیں اور کتنے ہی مشاعرے ہنگامہ آرائی کی نذر ہو جاتے ہیں لیکن یہ مشاعرہ آخر تک سُنا گیا باوجود مائک خراب تھا اس تکلیف دہ کمی کا اعتراف نہ کرنا گناہ ہے پھر بھی مجموعی طور پر یہ مشاعرہ خوب ہی رہا اچھا خدا حافظ۔　　پھر ملوں گا ذرا سا دم لے کر

دیوان سنگھ مفتون

چند دلچسپ لطائف

● مولانا حالی پانی پتی کے پوتے کی بیٹی مسز ممتاز مرزا اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں رہتی ہیں۔ یہ شعر بھی خوب کہتی ہیں اور ذہین بھی بہت ہیں۔ یہ میاں بیوی ہفتہ میں ایک دو بار میرے ہاں آیا کرتے اور گپ بازی میں کچھ وقت بسر ہوتا۔ مسز ممتاز مرزا کے والد یعنی مولانا حالی کے پوتے بیمار ہو گئے تو علاج کے لئے دہلی چلے آئے اور اپنی بیٹی کے ہاں مقیم ہوئے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ مسز مرزا نے ٹیلیفون کیا کہ ان کے ہاں پنکھے کم ہیں۔ ایک پنکھا چند روز کے لئے بھیج دیا جائے۔ میں نے اپنے آدمی کے ہاتھ پنکھا بھیج دیا۔ گرمیوں کا موسم گذر گیا اور اگلے سال جب گرمیاں شروع ہوئیں۔ تو میں نے مرزا صاحب کے ہاں اپنا آدمی بھیجا تاکہ وہ پنکھا واپس لے آئے۔ میرا آدمی وہاں پہنچا تو وہ پنکھا تو نہ لایا۔ مرزا صاحب کی بیوی کا ایک رقعہ لایا جس میں لکھا تھا۔

"کیا دیوان سنگھ اور اخبار "ریاست" کی پچھلی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ ہے کہ کسی کو کوئی شے دیکر واپس لی گئی اور اگر کوئی ایسا واقعہ نہیں تو پھر اس پنکھے کو واپس لینے کا یہ ظلم ہم پر ہی کیوں کیا جاتا ہے"

اس جواب کے بعد پنکھے کو واپس طلب کرنیکی جرأت کیسے ہوسکتی تھی

● رائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس (آئی سپیشلسٹ موگا) حضرت جوش ملیح آبادی اور مسٹر اوما شنکر پرشاد آئی سی ایس چیف کمشنر دہلی تینوں علی الصبح تین چار بجے سیر کرنیکے عادی ہیں اور یہ سیر کرتے ہوئے دہلی کی مال روڈ یا علی پور روڈ پر اکثر ملا کرتے۔ ایک روز جوش صاحب اور ڈاکٹر متھرا داس صبح چار بجے سیر کرتے ہوئے ملے تو جوش صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب آپ شراب پیتے ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ "میں نے تو اپنی زندگی میں شراب کا کبھی ایک قطرہ بھی نہیں پیا۔" یہ جواب سن کر حضرت جوش نے پھر دریافت کیا۔ "تمام لوگ آپ کی نیکی کی تعریف کرتے ہیں اور اگر آپ شراب نہیں پیتے تو پھر آپ اتنے نیک کیسے ہو گئے"

● حضرت خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۲۹ء میں ایک اسٹوڈی بیکر خریدی اور راقم الحروف نے ۱۹۳۰ء میں اسی ماڈل کی ڈاج [illegible] خریدی ۱۹۳۱ء میں ایک روز خواجہ صاحب دفتر ریاست میں تشریف لائے تو میری کار بھی دفتر کے نیچے کھڑی تھی۔ دونوں کاروں کو دیکھ کر خواجہ صاحب نے فرمایا "سردار صاحب میں نے موٹر ایک برس پہلے خریدی اور آپ نے ایک برس بعد، مگر میری موٹر دو برس استعمال کے بعد بھی بالکل نئی معلوم ہوتی ہے اور آپ کی کار ایک برس میں ہی حلیہ بگڑ گیا"۔ میں نے جواب میں عرض کیا۔ "آپ کی موٹر بیوی ہے اور میری موٹر طوائف۔ کیونکہ آپ سے کوئی موٹر طلب کرے تو فرماتے ہیں کہ کار کا ڈرائیور موجود نہیں کار بگڑ رہی ہے۔ گیراج کی چابی نہیں مل رہی یا موٹر دہلی سے باہر گئی ہوئی ہے۔ اور میری کار کی حالت یہ ہے کہ صبح پٹرول کی ٹنکی بھروا کر دوست اسے لیجاتے ہیں اور تمام دن استعمال کرتے ہیں اور کار شام یا رات کو واپس آتی ہے۔

● تبادلہ آبادی سے پہلے دہلی وضعدار لوگوں کا مرکز تھی اور ایسی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں کہ دس دس بیس بیس اور [illegible] پچیس برس تک ایک دوست دوسرے دوست کے بالکل [illegible] کرتے۔ راقم الحروف کے ایک دوست مسٹر رام سیرپ [illegible] "ہمدرد" نکالتے تھے۔ اخبار معمولی قسم کا تھا اور [illegible] میں "ریاست کی تعریف ہوتی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد یہ اخبار بند کر دیا گیا۔ بیری صاحب بہت مخلص اور وضعدار لوگوں میں سے تھے۔ یہ دس برس کے قریب ہر روز شام کو ۷ بجے [illegible] میں تشریف لاتے اور ۹ بجے واپس اپنے گھر چلے جاتے [illegible] سالہا سال سے گوشت۔ سبزی یا دال خود پکاتا ہے اور [illegible] شوربہ صرف گھی کی صورت میں ہی ہوتا ہے۔ بیری صاحب [illegible] سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور [illegible] چاہتے یا سبزی یا گوشت عام طور پر [illegible] والے گوشت یا آلو وغیرہ کو پسند [illegible] ہے کہ دہلی کے بعض ہندو گھرانوں [illegible] بھی جاتے ہیں بیری صاحب [illegible] کیا کرتے [illegible]

کو بھی جو کچھ پکا ہوتا نذر کیا جاتا تاکہ وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شرکت کریں۔ بیری صاحب ہندو گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث [illegible] کے ساتھ کھانے کے عادی تھے مگر میں کسی شے میں پانی شوربہ نہیں رکھتا یعنی شوربہ صرف گھی کی صورت میں رہتا ہے۔ ایک روز بیری صاحب کو بھنا ہوا گوشت پلیٹ میں دیا [illegible] صاحب نے فرمایا "میں شوربہ والا گوشت زیادہ پسند کرتا ہوں" یہ سن کر میں نے پانی کا ایک گلاس اور چمچہ بیری صاحب کو دیا اور کہا کہ آپ جتنا شوربہ چاہیں پانی کے چمچے گوشت میں ڈالکر شوربہ تیار کر لیجئے۔ یہ سن کر تمام دوست قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور بیری صاحب لاجواب ہو گئے کیونکہ شوربہ والے گوشت کے مقابلہ پر بھنا ہوا بغیر شوربہ کے گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے گو یہ بیری صاحب کیلئے ناموافق تھا

● میں دہلی سے یہاں ڈیرہ دون آنے کے بعد اب ڈیرہ دون کے قریب راجپور میں رہتا ہوں یہ قصبہ مسوری اور ڈیرہ دون کے درمیان تین چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ میں جس محلہ میں رہتا ہوں اس محلہ میں ہی تبادلہ آبادی کے سلسلہ میں ایک سکھ سردار دیوان سنگھ راولپنڈی سے آکر آباد ہو گئے تھے اور پانچ سال کا عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے یہاں اپنا مکان تعمیر کر لیا تھا اور اب اس مکان میں ان کی بیوہ، ایک شادی شدہ لڑکی اور ساس رہتی ہیں اور چونکہ یہ لوگ ۱۹۴۷ء سے یہاں مقیم ہیں محلہ کے تمام لوگ ان سردار دیوان سنگھ مرحوم کے نام سے واقف ہیں اور میں چونکہ اس مکان میں صرف ایک برس سے ہی مقیم ہوں۔ صرف تعلیم یافتہ حلقہ ہی میرے نام سے واقف ہے اور عام لوگ مجھے "سردار جی" ہی سمجھتے ہیں چونکہ میں سکھ ہوں۔ ابھی پچھلی گرمیوں کا ذکر ہے محمد اجمل خان صاحب [illegible] سابق پرائیویٹ سکریٹری مولانا ابوالکلام آزاد (جو حال ہی میں ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر نامزد ہوئے ہیں) کے صاحبزادے اپنے ایک دوست مسٹر اقبال کے ساتھ ملنے کیلئے دہلی سے تشریف لائے۔ انھوں نے بس سٹینڈ راجپور پر بس سے اترنے کے بعد ایک دوکاندار سے میرے متعلق پوچھا کہ دیوان سنگھ کا مکان کہاں ہے تو دوکاندار نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس ساتھ والے محلہ میں ہے یہ دونوں اصحاب اس محلہ میں پہنچے تو انھوں نے گلی کی ایک عورت سے دریافت کیا کہ سردار دیوان سنگھ کا مکان کونسا ہے یہ عورت مجھے تو صرف "سردار جی" جانتی تھی مگر انتقال کر چکے سردار دیوان سنگھ کے نام سے واقف تھی کیونکہ مرحوم کا خاندان اس محلہ میں سترہ برس سے مقیم تھا اس عورت نے مرحوم سردار دیوان سنگھ کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مکان ہے یہ دونوں حضرات اس مکان کے اندر چلے گئے وہاں مرحوم سردار دیوان سنگھ کی بیوہ بیٹھی تھیں۔ سلام دعا کے بعد ان کے درمیان بات چیت ہوئی۔

سردار صاحب کہاں ہیں ؟

وہ تو انتقال کر گئے ہیں۔

بہت سخت افسوس ہے ہمارے ان کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔

پرمیشور کی مرضی۔

ہم تو دہلی سے صرف ان سے ملنے کے لئے آئے تھے۔

پرمیشور کو ایسا ہی منظور تھا۔

سردار صاحب کی موت کا کیا باعث ہوا۔

چند روز بخار آیا تھا۔

ان کا انتقال ہوئے کتنے روز ہوئے۔ پانچ سال۔

مگر ہمارے پاس تو ان کا خط پچھلے ہفتہ ہی پہنچا تھا۔

اس خاتون نے جب یہ سنا تو اسے خیال آیا کہ یہ حضرات دوسرے دیوان سنگھ سے ملنے دہلی سے آئے ہیں۔ یہ محسوس کرنے کے بعد اس خاتون نے ان کو بتایا کہ فلاں مکان میں دیوان سنگھ رہتا ہے یہ مکان اس مکان سے صرف چند گز کے فاصلہ پر تھا۔ انھوں نے میرے پاس پہنچنے کے بعد بتایا کہ وہ تو میری موت کی اطلاع سنکر واپس دہلی جانے والے تھے اور اس خاتون نے مکان کا پتہ بتایا۔

● میں موجودہ مکان میں ڈیڑھ برس سے مقیم ہوں اس سے پہلے راجپور روڈ پر ایک کاٹیج میں رہتا تھا۔ اس کاٹیج کے قریب ہی سر رابندر ناتھ ٹیگور کے صاحبزادہ راتھندر ناتھ ٹیگور کی کوٹھی ہے اور اس کوٹھی کے رہنے والے مجھ سے اور میں ان لوگوں سے واقف تھا اور اب بھی میں کبھی کبھی ان کے ہاں چلا جاتا ہوں اور مرحوم سردار دیوان سنگھ کی بیوہ کا ان لوگوں کے ہاں آنا جانا ہے

مرحوم سردار دیوان سنگھ کی اکلوتی بیٹی کے بچہ پیدا ہوا تو رسم کے مطابق مرحوم کی بیوہ نے نواسہ پیدا ہونے کی خوشی میں پڑوسیوں اور واقف لوگوں میں لڈو تقسیم کیئے اور یہ لڈو ٹیگور صاحب کے ہاں بھی گئے اور میرے ہاں بھی آئے۔ جو عورت یہ لڈو تقسیم کرنے گئی ٹیگور صاحب کے ہاں اس نے بتایا کہ یہ لڈو دیوان سنگھ کے ہاں سے آئے ہیں۔ لڈو تقسیم ہونے کے تین روز کے بعد ٹیگور صاحب کے ہاں سے ایک معمر بنگالی خاتون میرے ہاں تشریف لائیں آنے اور نمسکار ہونے کے بعد اس خاتون نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں اور چند منٹ باتیں کرنے کے بعد دریافت کیا کہ یہ جو لڈو بھیجے گئے تھے کیا لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ مبارکباد دینے آئی ہیں۔ چونکہ میرے ہاں بھی لڈو پہنچ چکے تھے میں سمجھ گیا کہ یہ خاتون یہاں غلط فہمی کے باعث آئی ہیں۔ میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ مرحوم سردار دیوان صاحب کی بیٹی کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد یہ بنگالی خاتون مرحوم سردار دیوان سنگھ کے ہاں مبارکباد دینے گئیں یعنی میں مُفت ہی میں مرنے سے پہلے ہمدردی کے جذبات اور دعائیں وصول کرتا ہوں اور بغیر بیٹا، پوتا یا نواسہ پیدا ہوئے مجھے مبارکبادیں ملتی ہیں۔

● پنجاب کے ضلع فیروزپور میں پولیس کا ایک تھانہ دھرم کوٹ ہے، اس تھانہ میں سب انسپکٹر پولیس میرٹھ کے رہنے والے ایک "محتاط" قسم کے مسلمان تھے جن کے خاندان کے بہت سے ممبر پنجاب میں ملازم تھے۔ محتاط قسم سے مطلب یہ ہے کہ یہ پنجابیوں کی طرح ہر خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے اور ہر معاملہ میں اپنا نفع نقصان سوچ لیا کرتے۔ دھرم کوٹ کے علاقہ کے ایک گاؤں میں ڈاکہ پڑا اور ڈاکو جب گھوڑیوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر اس گاؤں میں داخل ہوئے تو گاؤں کا چوکیدار بھاگا ہوا دھرم کوٹ تھانہ میں پہنچا اور تھانہ دار صاحب نے تھانہ کے محرر کو ڈاکہ کی رپورٹ روزنامچہ میں لکھنے کے لئے کہا اور جب رپورٹ روزنامچہ میں درج ہو گئی تو تھانہ دار نے اپنے نجی ملازم کو حکم دیا کہ پاخانہ میں پانی کا لوٹا رکھا جائے۔ پانی کا لوٹا پاخانہ میں رکھنے کے بعد تھانہ دار صاحب کچھ دیر پاخانہ میں تشریف فرما رہے۔ وہاں سے باہر نکلے تو پان کھایا اور باورچی کو حکم دیا کہ ناشتہ تیار کیا جائے۔ ناشتہ کے لئے انڈے اور پراٹھے وغیرہ تیار ہونے ایک گھنٹہ کے قریب صرف ہوا اور ناشتہ تناول فرمانے کے بعد سائیس کو گھوڑے پر زین ڈالنے کیلئے حکم دیا گیا یہ سب کچھ ہو چکا آپ نصف درجن کے قریب کنیسٹبلوں کے ساتھ (جو پیدل تھے) آہستہ آہستہ اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے جس گاؤں میں ڈاکو داخل ہوئے تھے۔ یہ قافلہ جب چوکیدار کے ساتھ گاؤں کے پاس پہنچا تو اس وقت ڈاکو گاؤں کو لوٹنے کے بعد گاؤں کی دوسری طرف سے گاؤں سے باہر جا رہے تھے۔ ڈاکوؤں کو گاؤں سے نکلتے دیکھ کر چوکیدار نے تھانہ دار صاحب سے کہا۔

"حضور وہ دیکھئے ڈاکو گاؤں کو لوٹنے کے بعد گاؤں سے باہر جا رہے ہیں۔" یہ سُن کر تھانہ دار صاحب نے اپنے "محتاط" ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا "تھانہ میں رپورٹ کے درج ہونے کے بعد سب سے پہلے واردات کے موقع کا معائنہ اور سامان کے لوٹے جانے کی فہرست تیار کریں گے۔" چنانچہ ڈاکو تو کسی گاؤں کو چلے اور پولیس کا یہ قافلہ موقع واردات کے معائنہ کے بعد گواہوں کی اور سامان کی فہرست تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کیونکہ تھانہ دار صاحب نے بے وقوف اور غیر محتاط پنجابیوں کی طرح ڈاکوؤں کا فوراً مقابلہ مناسب نہ سمجھا اور ہر قدم آپ نے قانون کے مطابق اٹھایا۔

● دہلی کی بھنگنیں نہ صرف صاف ستھری رہنے کی عادی ہیں بلکہ یہ خوبصورت بھی ہیں۔ اور یہ گندگی صاف کرتے ہوئے بھی اپنے منہ پان رکھتی ہیں اور دہلی میں یہ عام افواہ ہے یا ان بچاریوں پر غلط الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ کھتریوں اور برہمنوں کی اولاد ہیں یعنی دہلی کے طبقہ کے کھتری اور براہمن ان پر کرم فرمائی کرتے ہیں کئی برس ہوئے ایک بھنگن اور اس کی جوان بیٹی میرے ہاں صفائی کرتی تھیں، خوبصورت اور نوجوان تھی۔ یہ کبھی کبھی مسکراتے ہوئے ایک دو بات کیا کرتی اور میں اسے دیدیا کرتا۔ ایک روز اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنے حسن کی نمائش کرتے یعنی پڑا سرکاتے اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی "سردار جی کیا آپ مہاتما گاندھی کا اخبار چھاپتے ہیں؟" یہ تعلیم یافتہ نہ تھی اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا میں مہاتما گاندھی کی ہریجن تحریک کے حق میں اخبار شائع کرتا ہوں میں اس کے نسوانی اداؤں اور اس کے دلچسپ سوال سے سمجھ گیا کہ یہ مجھے بھی غالباً بنانا چاہتی ہے۔ میں نے کچھ غصہ کی حالت میں اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے جواب دیا "ہاں میں مہاتما گاندھی کے حق میں

کہ بٹ صاحب نے اپنے ملازم کے ذریعہ چوری کروائی ہے۔ رپورٹ لکھتے لکھاتے اور پولیس کے ایک کانسٹبل کو تفتیش کے لئے ساتھ لاتے اسے ساڑھے نو بج گئے۔ اتنے میں آٹھ بجے میں اور مسٹر شام لال کپور ایڈیٹر "گرو گھنٹال" وغیرہ تین چار دوست بٹ صاحب کے ہاں کھانے پر پہنچ چکے تھے اور جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو مستغیث معہ پولیس کے ہیڈ کانسٹبل کے موقع واردات پر پہنچا اور اس ہیڈ کانسٹبل نے نشان دہی پر ڈیوڑھی میں سے مرغی کی چونچ، پنجوں اور پروں پر قبضہ کر لیا۔ بٹ صاحب نے پولیس کے اس ہیڈ کانسٹبل سے بات چیت کی تو ان کو معلوم ہوا کہ مقدمہ چوری کا ہے اور تفتیش کے سلسلہ میں چونچ، پنجوں اور پروں پر قبضہ کیا گیا ہے۔ میں نے جب سنا تو میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا کیونکہ اگر مرغی چوری کی تھی تو ہم مرغی کھانے والے مال مسروقہ کو حاصل کرنے کے بھی ملزم تھے اور قانون کے مطابق ہماری پوزیشن بالکل یہی تھی۔ خیر بات چیت کرنے کے بعد دو روپیہ تو بٹ صاحب نے ہیڈ کانسٹبل کی نذر کئے اور مقدمہ تفتیش ناکام قرار دینے کے بعد داخل دفتر کر دیا گیا اور چوری کا مال کھا کر ہم واپس آئے۔

● ہندی زبان کے لفظ "دُشٹ" کے دو معنی ہیں ایک تو مستعمل [illegible] اگر یہ کہنا ہو کہ اس مسئلہ پر غور کیا گیا تو کہا جائے گا اس دشٹ [illegible] کیا گیا۔ اور دوسرے جنسی تعلقات مثلاً اس مرد اور عورت نے دشٹ کیا۔

رہتک اور گوڑگانواں کے اضلاع کا علاقہ زبان کے لحاظ سے "مکسڈ بلڈ" یعنی مخلوط کہا جا سکتا ہے کیونکہ پنجاب کے قریب ہونے کے باعث ان علاقوں میں پنجابی بولی جاتی ہے اور دوسری طرف راجپوتانہ اور یوپی کا علاقہ ہونے کے باعث ان علاقوں میں ہندی ملتی ہے اور ان علاقوں کے لئے دہلی ریڈیو سے ہر روز شام کے وقت دیہاتی پروگرام بھی نشر کیا جاتا ہے جو اسی اردو اور ہندی والی ملی رہتکی زبان میں ہوتا ہے۔ ریڈیو کے اس دیہاتی پروگرام میں خبریں نشر کرتے ہوئے اناؤنسر نے کہا "لوک سبھا میں گرہ منتری (ہوم منسٹر) نے بتلایا کہ انھوں نے اس دشٹ پر ایک لیڈی ممبر پارلیمنٹ سے بھی پراوش (مشورہ) کر لیا تھا" یہ دیہاتی پروگرام رہتک کے علاقہ کے ایک گاؤں میں ایک دیہاتی جاٹ سن رہا تھا۔ اور زبان کے اعتبار سے یہ بیچارہ "مکسڈ بلڈ" ہی تھا اس نے جب دشٹ اور لیڈی ممبر پارلیمنٹ کے الفاظ سنے تو اس

نے اپنے قریب بیٹھے دوسرے جاٹ سے کہا "گرہ منتری کی بھی عقل ماری گئی ہے۔ اس نے اگر کسی لیڈی ممبر پارلیمنٹ سے دشٹ کر ہی لیا تھا تو کیا یہ باتیں لوک سبھا میں کہنے کی ہیں۔ ایسی باتیں تو تمام دنیا کرتی ہے مگر چھپ چھپا کر۔ گرہ منتری نے اس بات کو لوک سبھا میں کہہ کر بہت برا کیا" کیونکہ یہ جاٹ دشٹ کے صرف گندے معانی جانتا تھا اور اس کو لفظ پراوش (مشورہ) کے معنی کا علم نہ تھا۔

● دہلی کے دیہاتی پروگرام کی رہتکی زبان (نصف ہندی اور نصف پنجابی) میں ایک بار ہیر گائی جا رہی تھی تاکہ وہ پنجابی بھی لطف اندوز ہو سکیں جو زندگی بھر ہیر وارث شاہ سنتے رہے اور اب (پاکستان) سے آ کر رہتک اور گوڑگانواں کے اضلاع کے علاقہ میں بسائے گئے ہیں۔ گوڑگانواں کے ایک گاؤں میں بیٹھے وہاں کے دیہاتی اور پنجابی شرنارتھی یہ ہیر سن رہے تھے تو ایک مقامی جاٹ نے پنجابیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فخر کے ساتھ کہا۔ "آپ نے ہریانہ کے علاقہ کی زبان میں ہیر سنی۔ کیا آپ لوگوں نے پسند کی؟" اس کے جواب میں ایک پنجابی نے کہا۔ "یہ ہیر چونکہ ہریانہ کے علاقہ کی زبان میں گائی گئی ہے یہ ہیر پنجاب کے کنارے جھنگ میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ یہ ادھر گوڑگانواں کے علاقہ فرید آباد کے پاس جمنا کے کنارے کسی گاؤں میں پیدا ہوئی ہو گی۔

● مرحوم مولانا عارف ہسوی دہلی کانگرس کے قابل احترام لیڈر تھے۔ آپ اردو زبان میں اچھے لکھنے والوں میں سے تھے مگر آپ انگریزی زبان سے قطعی نابلد تھے۔ ملک میں عدم تعاون کی تحریک کا بہت زور تھا اور دہلی کانگرس بھی اس میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہی تھی۔ مولانا عارف رات کو ۱۱ بجے کے قریب ایک میٹنگ کے بعد کشمیری دروازہ سے اپنے مکان دریا گنج کو پیدل جا رہے تھے تو راستہ میں لال قلعہ کے سامنے ایک نوجوان یورپین عورت شراب میں مخمور کھڑی تھی۔ یہ عورت نئی نئی انگلستان سے آئی تھی اور ہندوستانی زبان سے قطعی ناواقف تھی اس عورت نے عارف صاحب سے انگریزی زبان میں اظہار محبت کیا۔ عارف صاحب کچھ سمجھ نہ سکے کیونکہ یہ انگریزی بالکل نہ جانتے تھے۔ یہ انگریزی کے صرف دو الفاظ نان کوآپریشن اور نان وائیلنس سے ہی واقف تھے۔ آپ نے اس عورت سے اظہار محبت کے جواب میں صرف یہ کہا "میں نان کوآپریٹر ہوں" یہ جواب سن کر وہ یورپین عورت جو نشہ میں تھی قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور عارف صاحب

من کہ مکتوب الیہ

پٹنہ ۱۳ر جون ۷۹ء

مکرمی تسلیم۔

شانِ ہند کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ۔ اس میں گوپال متل صاحب کا ایک خط نظر آیا، جس سے معلوم ہوا کہ شانِ ہند کے کسی شمارہ میں گوپال متل صاحب کو غالب انسٹی ٹیوٹ نے جو انعام دیا ہے۔ اس کے متعلق اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔ یہ شمارہ میں نے نہیں دیکھا انعام کی حقیقت یہ ہے: میں انسٹی ٹیوٹ کا ایک ٹرسٹی ہوں ٹرسٹیز بورڈ نے فخر الدین علی احمد مرحوم یا میری تحریک پر ہر سال انعامات دینے کی تجویز منظور کی اور ایوارڈس کمیٹی کا صدر میں منتخب ہوا کئی سال کے بعد انسٹی ٹیوٹ کی مجلسِ عاملہ کے ایک فیصلے کو میں نے ناپسند کیا اور ایوارڈس کمیٹی اور مجلسِ عاملہ دونوں کی رکنیت سے مستعفی ہو گیا۔ اس کے بعد بعض اصحاب کو جو انعام ملے میرے نزدیک وہ اس کے مستحق نہ تھے اور میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ بورڈ کے آخری جلسے میں ٹرسٹیوں کے اصرار سے میں نے ایوارڈس کمیٹی کی صدارت قبول کر لی اس کے بعد جو جلسہ ہوا اس میں میری تحریک پر گوپال متل صاحب کا نام بالاتفاق منظور ہوا میں کبھی کسی کی ضرورت مندی کا خیال نہیں کرتا اس کی ادبی صلاحیت کو دیکھتا ہوں۔ ان کا نام پیش کرتے وقت خاص طور پر جو کتاب میرے ذہن میں تھی وہ "لاہور کا جو ذکر کیا" کمیٹی کے دوسرے ارکان کلیم الدین احمد صاحب پروفیسر نذیر احمد اور یونس سلیم صاحب سکریٹری انسٹی ٹیوٹ ہیں۔ آپ چاہیں تو اس خط کو شانِ ہند میں شائع کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر اندیش۔ قاضی عبدالودود

● شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور۔

۱۷ر جون ۷۹ء

مکرمی سرمد تونسوی صاحب!

آداب۔ میں خیریت سے ۶/۷ کو پہنچ گیا تھا۔ کسٹم کے عملے نے بڑا تعاون کیا اور میں تمام کتابیں لے آیا ہوں۔ آپ نے جس خلوص محبت اور شفقت و عنایت کا سلوک کیا اس کے لیے آپ کا تادمِ زیست احسان مند رہوں گا۔ آپ کی وجہ سے وہاں میری جو عزت افزائی اور پذیرائی ہوئی اس کیلئے شکرگذار ہوں۔ محترمہ روحی صاحبہ نے جس طرح میری خدمت کی اس کے لئے سر احسان مند ہوں۔ آپ کی کتابیں جلد بھیج دوں گا۔ آپ براہِ کرم خطباتِ آزاد کی ایک کاپی مجھے بھجوا دیں۔ میں نے آپ سے نئی ڈاک کی ٹکٹ کے بارے میں کہا تھا۔ بازار میں ملتی ہیں۔ یادگار ٹکٹوں کا ایک پیکٹ بھی اسی میں بھجوا دیں۔

محترمی ذہین نقوی صاحب سے غالب اکیڈمی کے فنکشن کی تصاویر اور برادرم رحمٰن نیر صاحب سے بیسویں صدی کے دفتر والی تصاویر بھی لے کر مجھے بھجوائیں۔ محترمہ روحی صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب اگر کتابیں دے جائیں تو وہ بھی مجھے بھجوا دیجئے گا۔ ان تکالیف کے لئے پیشگی شکریہ

آپ کا خیر اندیش

طاہر تونسوی

● ۱۱۔ سلور آرچ۔ فرسٹ فلور

نیپین سی روڈ بمبئی ۶

۱۵ر جون

پیارے سرمد بھائی۔ آداب

۲۳ر مئی کا لکھا ہوا گرامی نامہ باعثِ تسکینِ دل و جاں۔ آپ کی بہن جی تیرتھ یاترا سے ۲۶ یا ۲۷ تک لوٹیں گی۔ آج کل رامیشورم میں ہوں۔ یہ عجیب نظامِ قدرت ہے کہ گناہ مرد کریں بخشوانے عورتیں جائیں۔ عورت جو واقعی مجسمۂ ایثار ہے اسے سنت تلسی داس جی نے "تاڑن کا ادھیکاری" مانا ہے۔ جانے کسی عورت کے زخم خوردہ ہوں گے۔ عزیزی پیاری بھو کے ساتھ بمبئی میں ہے۔ ۸ر جولائی کو دلی لوٹے گی۔ روحی کو میں لکھ دوں گا کہ آپ سے ملنے آئے۔ آپ کے لئے قرول باغ تک پہنچنا باعثِ زحمت ہوگا اور ہم تو شریف لوگ کسی کو آزار پہنچانا نہیں چاہتے۔ ۲۳ر جون کا منتظر ہوں غریب خانہ حاضر ہے۔ یہ وعدہ بھی وعدۂ فردا ثابت نہ ہو۔ والا گھر بھر کو آداب۔

آپ کا۔ راجندر گرگ

بابِ تنقید

(ادارہ)

اقبال، ٹیگور اور نذرل

از شانتی رنجن بھٹاچاریہ

$\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کے ۱۷۶ صفحات حجم. قیمت بغیر جلد دس روپے جو یقیناً زیادہ ہے. مگر جب کتاب کا ایڈیشن صرف ۵۰۰ کی تعداد میں ہی شائع ہو تو لاگت زیادہ آئے گی ہی. اس کتاب کا اصل نام تین شاعر ایک مطالعہ ہے. اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنے مقصد میں قابلِ تعریف حد تک کامیابی حاصل کی ہے. جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ سترہ کتابوں کے مصنف ہیں ان میں زیرِ نظر کتاب ان کی دو چار بہتر تصانیف میں سے ایک اچھی تصنیف ہے. جن پر بھٹاچاریہ بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں. اقبال، ٹیگور اور نذرل کے چاہنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے. کاش اس کی کتابت اور چھپائی پر دھیان دیا جاتا. مصنف کے پتہ ۱۲، ۱/۲- اشوک نگر ریجنٹ پارک کلکتہ ۷۰۰۰۴۰ یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے طلب کر سکتے ہیں.

احساس

رئیس رامپوری کا مجموعۂ کلام حال ہی میں شائع ہوا ہے. ۱۹۷۸ء میں جو مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے ان میں "احساس" صفِ اوّل میں اپنا امتیازی مقام رکھتا ہے "احساس" ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جو ہر باذوق اور ذوقِ سلیم رکھنے والے کے مطالعہ کے قابل ہے. لکھنؤ اور دلی کی طرح رام پور بھی شاعری کا ایک سکول شمار ہونے لگا ہے. اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رئیس رام پوری اور "احساس" دونوں رام پوری سکول کی نمائندگی کرتے ہیں. یہ مجموعہ بھی $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز پر چھپا ہے. ضخامت ۱۶۰ صفحات. کاغذ. کتابت اور طباعت بہتر ہی. گٹ اپ قابلِ دید. قیمت مجلد سات روپیہ.

چاند پبلی کیشنز بے تک روڈ

رام پور- یو-پی- یا

دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے طلب کر سکتے ہیں.

کالی دھرتی کی غزلیں

سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے کوئلہ سونے سے بھی زائد اہمیت رکھتا ہے. اور دھنباد (بہار) اس ضمن میں ایک زرخیز علاقہ مانا جاتا ہے. کوئلہ کی نسبت سے دھنباد کو کالی دھرتی تشبیہ دیتے ہوئے شعراء ضلع دھنباد کی غزلوں کے مشترک مجموعہ کو "کالی دھرتی کی غزلیں" مجموعہ کا نام رکھا گیا ہے. اس مجموعہ میں آختر صدیقی. شان بھارتی. رونق گیاوی. نجم عثمانی شوکت نکلی. منظر سلطانپوری. عابد عزیزی اور جمال انور کی منتخب غزلیں جمع کر دی گئی ہیں. یہ مجموعہ جسے آ. صدیقی نے ترتیب دیا ہے اور مکتبہ کنول بسجوا. دھنباد نے ۹۶ صفحات پر شائع کیا ہے. پانچ روپیہ میں ناشر سے مل سکتا ہے.

رسول کی بیٹی

جناب ڈاکٹر محمد نبی سیفی سیوہاروی ملک کے مقتدر شعراء میں شمار ہوتے ہیں. اور ان کی متعدد تصانیف "شمع" گروپ نئی دہلی سے لاکھوں کی تعداد میں چھپکر برِ صغیر ہند و پاک میں شہرت پا چکی ہے. زیرِ نظر کتاب حضرت فاطمہ کی زندگی کے منظوم حالات پر مشتمل ہے. جس کا انتساب محترم الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ "شمع" دہلی کے نام نامی پہ کیا گیا ہے. ۳۵۶ صفحات کی اس کتاب کے پڑھنے سے جہاں [illegible] کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے. وہاں مصنف [illegible] کے لئے دعائے خیر بھی لازمی ہو جاتی ہے. بڑے بڑے مشکل اور نازک موضوعات پر سیفی سیوہاروی نے استادانہ [illegible] قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے. یہ قابلِ قدر تصنیف آٹھ روپیہ میں مصنف کے پتہ.

سیفی کنج. گلبرٹ ہل روڈ. اندھیری (ویسٹ)

بمبئی ۴۰۰۰۵۸

سے منگائی جا سکتی ہے.

طاہر تونسوی کی نذر

آرزو سہارنپوری

جناب طاہر تونسوی کے اعزاز میں ادارۂ شان ہند نئی دہلی کی طرف سے ۱۱ جون ۱۹۷۹ء شام کے ساڑھے پانچ بجے ایک عصرانہ "دفاتر شمع" میں دیا گیا۔ جس میں دہلی کے شعراء۔ ادباء۔ صحافی اور علم دوست احباب نے شرکت فرمائی۔ قبلہ آرزو سہارنپوری بھی اس عصرانہ میں مدعو تھے جو علالتِ طبع کے باعث تشریف نہ لا سکے اور انھوں نے ذیل کی نظم طاہر تونسوی کو نذر کرنے کے لئے بھجوائی جو پیش کی جا رہی ہے۔

(ادارہ)

اے مرے طاہر مری تسکینِ روحِ بیقرار ۔۔۔ ذی حشم، ذی مرتبت، ذی جاہ، اے عالی وقار

اے ادیبِ بے مثال و آبروئے اہلِ فن ۔۔۔ عظمتِ اہلِ ادب، آرائشِ ہر انجمن

شاعرِ آتش نوا، کشافِ اسرارِ دقیق ۔۔۔ خوش مذاق، خوش کلام و مومن و مردِ خلیق

شعر کو بخشا ہے تونے وہ عروج و بانکپن ۔۔۔ ناز کرتے ہیں تری ہستی پہ اربابِ سخن

تجھ سے ملکر پھر وطن کی یاد تازہ ہو گئی ۔۔۔ ہمصفیرانِ چمن کی یاد تازہ ہو گئی

شہرِ تونسہ کے در و دیوار یاد آنے لگے ۔۔۔ وہ گلی وہ کوچہ و بازار یاد آنے لگے

آج تک بھولا نہیں ہوں میں وہ عرفانی مقام ۔۔۔ جس جگہ کرتے تھے جاکر روز ہم دونوں سلام

کس قدر پیارا تھا وہ ہندو و مسلم اتحاد ۔۔۔ کوئی فتنہ تھا کسی جانب، نہ تھا کوئی فساد

وہ بھی کیا دن تھے کہ سب مل جل کے جب رہتے تھے ہم ۔۔۔ پیار کے دریائے معنی خیز میں بہتے تھے ہم

اے عزیزِ من ترے صدقے مگر یہ تو بتا ۔۔۔ کب تک آخر گردشاتِ دہر کا یہ سلسلہ

جھوم کر ابرِ بہار اب پھر نہ آئے گا کبھی؟ ۔۔۔ کیا وہ عہدِ خوشگوار اب پھر نہ آئیگا کبھی؟

دامنِ یادِ وطن اشکوں سے دھو لیتا ہوں میں ۔۔۔ جب وہ لمحے یاد آتے ہیں تو رو لیتا ہوں میں

شکر کا مقام ہے تیرے چشتیہ ساغر رہے ۔۔۔ سایۂ فخرِ سلیمان تجھ پہ تا محشر رہے

حضرتِ شاہ سلیمان کا نظر کردہ ہے تو

اور علم و فضل کا بہتا ہوا چشمہ ہے تو

گوشہ عقیل صدیقی

اصلاح کاری ادب

اور

حضرت داغ دہلوی مرحوم کے چند اصلاحی نمونے

حاجی نعمت اللہ نعمت جلال آباد مظفر نگر یوپی

(آخری چوتھی قسط)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(ق)

مروں تو (کیسے) مروں اور جیوں تو (کیسے) جیوں + ادھر خفا ہے اجل اور ادھر خفا معشوق
" " (خاک) " " " " (خاک) " + " " " " " "

"کیسے مروں"، اور "کیسے جیوں" میں کوئی لطافت نہ تھی اور شعر کا شعر گرانبار تھا۔ "خاک مروں" اور "خاک جیوں" نے روز مرہ کے مطابق کر دیا۔ اور بیزاری، یاس و اندوہ کی کیفیات سے شعر کو بھر دیا۔

خدا گواہ ہے ہم نے تو کچھ کہا بھی نہیں + (پھر ہم) سے کس لئے ناراض ہو گیا معشوق
" " " " " " " + (وہ ہم) " " " "

خود نواب فصیح الملک بہادر مرحوم نے یہ ریمارک دیا ہے "پھر ہم" کی بات نادارد

نکل کے (پہلو) سے دل اس کا ہو لیا ہمراہ + ہمارے گھر سے جب اے دوستو اچلا معشوق
" (سینہ) " " " " + " " " " "

اس شعر پر استاد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ریمارک دیا "پہلو کا واؤ نادارد"

XXX ملے ہیں جب سے مجھے وہ تو لوگ کہتے ہیں + مبارک ہو تمہیں لو آج تو ملا معشوق XX X

استاد مرحوم نے اس شعر کو بالکل کاٹ دیا اور اس پر یہ ریمارک دیا ہے "ہو" نادارد۔ یہ کیا غضب ہے؟ کہنا ہو تو کی تمیز نہیں رہی۔"

مبارک کی "ہو" واقعی گر رہی ہے اور اس ایک "ہو" پر ہی کیا انحصار ہے غزل ہی جیسا کہ اوپر کی کیفیات سے واضح ہے کہ عروضی خرابیوں سے پڑ ہے حضرت فصیح الملک بہادر کے تیور ملاحظہ فرمائیے۔

تو مجھ سے پوچھتا کیا ہے تجھے نہیں معلوم؟ + میں تیرا چاہنے والا ہوں تو مرا معشوق
نہ پوچھ مجھ سے اکہ "تو کون ہے؟" بتاؤں تجھے + " " " " "

"کیا پوچھتا تھا" اس کی تشریح نہ ہونے کے باعث پہلے مصرعہ کی ترکیب بھدی ہو گئی تھی زبان ... بھی خراب تھی اور کچھ عمدگی سے چسپاں بھی نہیں ہوا تھا۔ استاد مرحوم کی اصلاح سے یہ سقم رفع ہوا سو ہوا ہی دوسرے مصرعہ میں جان پڑ گئی اور عاشق کی سوختہ جگری و دل تنگی جس کا باعث بے نیازی معشوق ہے نہایت لطافت کیساتھ نمایاں ہو گئی۔ کیا پاکیزہ اصلاح ہے۔

غم فراق میں (بیتاب کیوں ہوا ہے) مائل + دعا دیکھو آتا ہے) بن ٹھن کے آپ کا معشوق
" (مضطر نہ ہوجیے) " + " (آیا دیکھئے) " " " "

دوسرے مصرعہ کے متعلق یہ ریمارک موجود ہے "آپ کی خبر دیکھو نہیں آتی ہے" پہلے مصرعے میں "ہو جئے" "دیکھئے" اور "آپ" کی مناسبت سے بڑھایا گیا اور "استفہام" کو "اسلوب تشفی" میں تبدیل کرکے شعر کو مؤثر بنایا گیا ہے۔ "حرف ندا" کا مدت سبکی پیدا کر گیا اور "مضطر" سے "بیتاب" کا تغیر کیفیات واردہ کو المضاعف بنا گیا۔

۱۸؍۹؍۶
(ک)

غضب ہے (ہائے تم سنتے نہیں ہو) + مرے سنتا ہے نالے آسماں تک
" " (کان تک اس کے نہ پہونچیں) + " " " " " "

رُو دَر رُو اور براہ راست کہنے کے مقابلے میں، غائبانہ اور پردہ بہ پردہ کہنے میں کچھ لطف زیادہ ہو ہی جاتا ہے ایک تو اصلاح سے یہ بات پیدا ہو گئی دوسرے حسرت و افسوس کی جھلک نے شعر کو زیادہ پُر اثر اور زیادہ پُر درد بنا دیا۔

کچھ ایسا ضعف نے پکڑا ہے دامن + (اٹھا جاتا نہیں یاں سے وہاں تک
" " " " " + (کہ جا سکتا) " " " "

"یاں سے وہاں تک" کے ساتھ "اٹھا جاتا نہیں" کا استعمال قطعی غلط اور زبان و قواعد کے بالکل برعکس تھا۔ "کہ" "حرف بیانیہ" نے دونوں مصرعوں کو مربوط کیا "جا سکتا" نے جہاں اوّل الذکر خرابی کو رفع کیا وہاں مجبوری و بے طاقتی کی تصویر کھینچ دی۔ فعل امکانی نے امکانی طاقت کی کس خوبی سے نفی کی ہے؟

نکل (کر) آئے ہیں ( ) وحشت میں گھر سے + اب آگے دیکھئے جائیں کہاں تک
" (x) " " (ہم) " " + " " " " " "

ایک تو "کر" گراں تھا دوسرے خودی کی کیفیت کا حامل۔ اس کے اخراج نے عالم وحشت کی بیخودی نمایاں کر دی۔ دوسرے فاعل بغیر مصرعہ میں گنجلک تھی جو "ہم" کے اضافہ سے جاتی رہی اور شعر میں سبکی اور روانی بڑھ گئی۔

(تجھے اللہ سمجھے) سوزش ہجر + جلائیں تو نے میری ہڈیاں تک
(خدا تجھکو مٹائے) " " " + " " " " "

استاد کا یہ ریمارک اصلاح کی توضیح کرے گا "تجھے اللہ سمجھے یہ زبان نہیں"

۱۵؍۳؍۸؍۹؍۱۸
گ

ہیں آپ کے جو رُخ پہ یہ گیسو الگ الگ + (بل کھا رہے ہیں مار سیہ تر د) الگ الگ
" " " " " " + (لہرا رہے ہیں سانپ یہ ہر سو) الگ الگ

زُلف کے ساتھ "بل کھانا" نہیں بلکہ "لہرانا" آتا ہے۔ اصلاح نے یہ عیب رفع کرکے تکمیل تشبیہ کر دی زلفوں کے ہر طرف لہرانے کی رعایت سے "ہر سُو" بہت خوب اور "دونوں" زلفوں کی مناسبت سے ردیف کے ساتھ چسپیدگی بالاترے داد۔ "ہجر مار" کا تغیر "سانپ" سے فصاحت کی ایک زبردست ادا ہی ہے جس کو فصیح الملک بہادر سے زیادہ کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔

مائل جبین یار پہ (کیا خوب کسی نے) + لکھے ہیں (دونوں) مصرعۂ ابرو الگ الگ
" " " (ہنگام سرنوشت) + " " (خوب) " " " "

"کیا خوب کسی نے" کاتب تقدیر پر ایک گہرا پردہ تھا جس سے اس کی ایک جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی تھی "ہنگام سرنوشت" کی اصلاح نے کسی پردہ نشیں کو رکھا تو پردے ہی میں۔ لیکن اس کے جلوے نمایاں کر دئے۔ "دونوں" کی تاکید مہمل سی شے تھی کہ ابرو ہوتے ہی ہیں "ہجر ابرو" کی کوئی خوبی موجود نہ تھی "خوب" نے یہ سب خامیاں رفع کر دیں۔

(۱)

(محشر میں بھی تو) اے ستم ایجاد! آجکل + سنتا نہیں ہے کوئی بھی فریاد آج کل

(تیرا ہے دور) " " " " + " " " " "

مائل صاحب کی نظر میں گویا دربارِ محشر ان دنوں ہو رہا تھا۔ اور پھر ہو سکتا تھا دوسری خرابی یہ کہ وہاں اور فریاد نہ سننے تیسری خرابی دونوں مصرعوں میں "بھی" کی تکرار لیکن اصلاح اور ایک سہ لفظی اصلاح نے یہ سارے عیب رفع کر دئے اور لفظاً معناً شعر کو فطری جذبات کا آئینہ بنا دیا۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ حسنِ معشوق کی حکومت مسلّم کرادی۔ اللہ ری استاد مرحوم کی صیقل گری۔

تیرے ستم سے اے ستم ایجاد آج کل + کرتے ہیں (اہل عرش) بھی فریاد آج کل

" " (سنگدل) "(تو)" "

"اہلِ عرش" کا فریادی ہونا۔ کوئی خاص خوبی نہیں رکھتا، علی الخصوص اُس وقت اور بھی جب کہ وہ خیرِ محض ہوں، ہاں اصلاح نے کمالِ ستم ایجاد میں چار چاند ضرور لگا دے۔ اس سے زیادہ اور ستم ایجاد اور کیا ہو سکتی ہے کہ "سنگدل" بھی چیخ اٹھیں۔ "تو" کے اضافہ نے عروضی خلا ہی کو پورا نہیں کیا۔ بلکہ حسنِ کلام میں اضافہ کر دیا اور زور بھی وہ بڑھایا کہ فصاحت میں رُوح پھونک دی۔

بلبل خدا کے واسطے (زیادہ) نہ شور کر + ہے تیری تاک جھانک میں صیاد آجکل

" " " (اتنا) " " + " " " "

"زیادہ" کی جگہ "اتنا" نے جہاں حالتِ موجودہ پر تبصرہ کیا وہاں ندرت اور تجاوز کی کیفیات بھی بڑھا دیں، روانی اور سبکی شعر میں علیحدہ پیدا ہو گئی۔

(۲)

۱۰ ۴۷/۹۸ ۶

(رہ جائے گا خدا بھی جگر اپنا تھام کر) + جب حشر میں سنائیں گے ہم ماجرائے دل

(سُن کر کہیں گے لوگ "دہائی خدا کی ہے") + " " " " " "

پہلا مصرعہ اپنی ترکیب میں بھدے ہونے کے علاوہ گستاخانہ بھی تھا اس لئے تبدیل کیا گیا اور حق تو یہ ہے کہ دوسرے مصرعے کیلئے جیسے زور دار مصرعے کی ضرورت تھی وہ اب ہوا۔

اس بُت کو (دیتے) دیتے تو دل ہم نے دیدیا + اب دل ہی میں کرتے ہیں ہم "ہائے ہائے" ہول

" " (ہائے) " " " " دل میں کرتے ہیں ہم "ہائے ہائے" دل

"دیتے دیتے" غیر فصیح اور کانوں کو گراں گزرنے والا تھا جس کو "ہائے" کی اصلاح نے جہاں فصاحت کی روح پھونکی وہیں دلی جذبات و تاثرات بھی موج زن کر دئے۔ "دل ہی میں ہائے ہائے کرنا" خلافِ محاورہ بھی تھا اور مصرعہ میں کچھ کمی تھی "ہی" کے بعد "دل" کا اضافہ کے محاورہ کو درست اور عروضی خرابی کو رفع کر دیا۔

اے موت! جلد آکے ہماری تو لے خبر + صدمے فراقِ یار (کہاں) تک اٹھائے دل

" " " " " + " " (کب) " "

"صدمے فراقِ یار کہاں تک" میں علامت اضافت بغیر مصرعہ غیر مربوط اور کلام نامعقول تھا۔ "کے" کے اضافہ نے تو یہ خرابی رفع کی "کہاں" اور "کب" ہیں دونوں کلمات استفہام مگر "کہاں" ظرفِ مکان کے لئے ہے اور "کب" ظرفِ زمان کے لئے یہاں ظرفِ زمان ہی ہونا چاہیے تھا نہ کہ ظرفِ مکان۔ اس طرح اصلاح نے قواعدِ زبان کی ایک خاص درستی پیدا کر دی استاد حضرت [illegible] مرحوم نے مائل صاحب کے کلام کو فصیح، با محاورہ، مربوط با معنی [illegible] پیدا کر دی کہ جس سے کلام کا معیار اعلیٰ بن گیا۔ امید ہے کہ معزز ناظرین جو اس فن سے منسلک ہیں قدر کی نظر سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ فقط والسلام (پھر ملیں گے اگر خدا لایا)۔

نیاز کیش صابر [illegible]

لئے عوامی لائبریری
دیال سنگھ پبلک لائبریری
میں
ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں
اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں ہر موضوع
پر ذوقِ مطالعہ کی سیری کے لئے بغیر کسی نقد معاوضہ
کے آپ ہر صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک اپنی
پسند کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اخبار، ماہنامے اور
ہفت روزے بھی ہیں۔
اتوار
اور دوسری تعطیلات
کو لائبریری
بند رہتی
ہے
دیال سنگھ پبلک لائبریری
ٹرسٹ سوسائٹی ۔ دہلی

دیال سنگھ کالج

کرنال

مشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے دیال سنگھ کالج کرنال میں طلبار کو ہمیشہ ڈسپلن، قومی یکجہتی اور ملک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہلِ کرنال اور گرد و نواح کے طلبار کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے اپنے بچوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں۔ تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اٹھائیے۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

اراکین منتظمہ کمیٹی

فارسی لطائف

سرکشش یزدانی
امراپور ۲۴۴۲۳۰۱ (بلندشہر)

غالب دارم!

ایک بار مرزا غالب کسی کتب فروش کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ایرانی نوجوان آیا اور دوکاندار سے دریافت کیا۔ دیوان غالب داری، دوکان دار نے جواب دیا۔ دیوان غالب ندارم دیوان ظہوری دارم، دیوان نظیری دارم۔

ایرانی نوجوان نے کہا۔ نہ نے ہمہ مطلوب نیست۔ دیوان غالب داری۔ ایں قرم ساق خوب می گوید۔ یہ سن کر دوکاندار نے ایرانی کو جواب دیا —— دیوان غالب ندارم غالب دارم، یہ سن کر ایرانی چونکا اور اب جو اس نے مرزا صاحب کو دیکھا تو بہت شرمندہ ہوا۔ مرزا صاحب اسے خجل دیکھ کر یہ کہتے ہوئے لپٹ گئے۔ شرمانے کی بات نہیں واللہ ساری عمر میں سچی داد آج ہی ملی ہے۔

مبارک باشد

عرفی شیرازی اور فیضی میں ہمیشہ نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ جب فیضی بیمار ہو گئے تو عرفی عیادت کے لئے ان کے گھر گئے۔ فیضی اس وقت ایک پلے سے کھیل رہے تھے۔ عرفی نے دریافت کیا۔ اسم مخدوم زادہ چیست؟ عرفی (معنوی) فیضی نے جواب دیا۔ عرفی اپنا اس سبکی کو برداشت نہ کر سکے اور فوراً طنزاً کہا۔ مبارک باشد (شیخ مبارک فیضی کے والد کا نام تھا)

روبہ ماکیاں نمی آرد

عرفی شیرازی کا تعلق جب ان کی زندگی سے بہت ہی تھوڑا رہ گیا۔ تو فیضی ان سے ملنے گئے۔ یہ جاننے کے لئے کہ عرفی کے ہوش و حواس قائم ہیں یا نہیں فیضی نے ان سے کہا۔ ماکیا نیم؟ (ہم کون ہیں) ماکیان فارسی میں مرغی کو کہتے ہیں اس کا دوسرا مفہوم یہ ہوا کہ (ہم مرغی ہیں) اس دوسرے مفہوم کو نظر میں رکھتے ہوئے عرفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حالا مرغ روحم شوق پرواز دارد، روبہ ماکیاں نمی آرد۔

ازمطبخ مادر طلب

شاہ عباس ثانی شاہ ایران کے بیٹے مرزا فرخ کا زینت النساء کے لئے پیغام آیا۔ جب شہزادہ آیا تو شہزادی نے اس کی ضیافت کی اور کئی انواع واقسام کے کھانے کے علاوہ کئی قسم کے سموسے بھی باورچیوں سے تیار کرائے۔ شہزادہ نے کھانا کھاتے کھاتے شہزادی کی چلمن کی طرف نظر کر کے ہنستے کہا۔

سہ بوسہ میخواہم۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے شہزادہ نے سموسہ کا تلفظ غلطی سے سہ بوسہ کہدیا ہے۔ مگر دراصل مقصد مزاح تھا۔ شہزادی کو یہ حرکت ناگوار گزری اور اس نے کہا۔

ازمطبخ مادر طلب (ہمارے باورچی خانے سے طلب کرنا دوسرا مفہوم (ماں کے مطبخ سے طلب کرو)

سر و پیراہن است

ایک شب بدمستی کے عالم میں محمود نے ایاز کی زلفیں ترشوا دیں۔ جب صبح ہوئی اور ہوش و حواس درست ہوئے تو بہت افسردہ خاطر ہوا۔ کیونکہ زلفوں کی کاٹ سے ایاز کے حسن و جمال میں کمی آگئی تھی۔ ملک الشعراء عنصری کو بلا کر یہ ناگوار واقعہ سنایا۔ عنصری نے سلطان کی دلجمعی کے لئے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ہے کہ عیب سر زلف از کاستن است

چہ جائے بغم نشستن و خاستن است
جائے طرب ونشاط و خواستن است
کاراستن سرو بہ پیراہن است

شکیب بنارسی

یوں تو تھے آس کے سائے بھی گھنیرے کتنے
وقت کی دھوپ میں کمھلا گئے چہرے کتنے
پھر بھی ٹوٹا نہیں قسمت کی سیاہی کا گھمنڈ
میں نے بدلے تو اجالوں میں اندھیرے کتنے
زہر اور زہر کا تریاق تمہیں کیا معلوم
سانپ کتنے ہیں زمانے میں سپیرے کتنے
پیار کے نام پہ دھوکا نہ کہیں کھا جانا
لوگ چہرے پہ لگا لیتے ہیں چہرے کتنے
سب کو معصوم نہ سمجھو ذرا ہشیار رہو
گھر کے والوں میں بھی ہوتے ہیں لٹیرے کتنے
کہیں مندر کہیں مسجد کہیں پنڈت کہیں شیخ
تم نے راہوں میں بٹھا رکھے ہیں پہرے کتنے
ایک ایک کر کے سبھی روٹھ گئے ٹوٹ گئے
اپنی آنکھوں میں بھی تھے خواب سنہرے کتنے
یہ نہ پوچھو کہ مری آنکھ میں آنسو کیوں ہیں
یہ بھی دیکھو کہ مرے زخم ہیں گہرے کتنے
کس کو لے جا کے دکھاؤں کہ مداوا ہو جائے
اپنے دل پر ہیں لگے درد کے پہرے کتنے
اس لئے میں نہیں کہتا دلِ مظلوم کا حال
سوچتا ہوں کہ اتر جائیں گے چہرے کتنے
پھر بھی نفرت سے زمانہ نہیں محفوظ شکیب
میں نے لہرائے محبت کے پھریرے کتنے

شکیب بنارسی

خواب جتنے سہانے لگے ۔۔۔ اور بھی دل کو کھانے لگے
پھر کوئی گل کھلے گا ضرور ۔۔۔ زخم پھر مسکرانے لگے
ان کے دامن میں پائی جگہ ۔۔۔ اپنے آنسو ٹھکانے لگے
عشق میں دھڑکنوں کے پیام ۔۔۔ دل سے دل تک تو آنے لگے
کر کے مجھ کو اسیرِ وفا ۔۔۔ آپ دامن بچانے لگے
آپ تو تھے مسیحا نفس ۔۔۔ آپ کیوں دل دکھانے لگے
وقت تو آزماتا رہا ۔۔۔ آپ بھی آزمانے لگے

ان کی یادوں کے جھونکے شکیب
اب یہاں تک تو آنے لگے

متین بدایونی (بمبئی)

محفل میں اہلِ غم کی نہ رسوا کیا گیا ۔۔۔ ہم سے ستم کا اُن کے نہ شکوا کیا گیا
بازار میں نہ ذکرِ زلیخا کیا گیا ۔۔۔ یوسف تھے ہم، ہمارا ہی سودا کیا گیا
ہر شے میں اُن کا خوب نظارا کیا گیا ۔۔۔ پردے میں رہ کے اُن سے نہ پردہ کیا گیا
ماتم کیا گیا کبھی نوحا کیا گیا ۔۔۔ ہر طور ان کے ظلم کا چرچا کیا گیا
ہم اہلِ دل پہ ظلم یہ بیجا کیا گیا ۔۔۔ دل چھین کر ہمارا تماشا کیا گیا
ظلم و ستم تو بند نہ اصلا کیا گیا ۔۔۔ ڈھارس بندھانے کیلئے دورا کیا گیا
بھیجے ثنائیں حمدیں دعائیں ملکائیں کیں ۔۔۔ یعنی کسی کو مائلِ جلوہ کیا گیا
جو محسنینِ قوم تھے جو مصلحینِ قوم ۔۔۔ سنتے ہیں ان کے ساتھ بھی دھوکا کیا گیا
جاں آفریں کو جانِ عزیز اپنی کی سپرد ۔۔۔ ہم سے نہ انتظارِ مسیحا کیا گیا

حق چھوڑا منہ کو موڑا کنارہ کیا متین
لیکن نہ اپنے دوست سے جھگڑا کیا گیا

ذرا ٹھہریے

آپ کے نام

۱۔ جولائی کا شمارہ بھی دیر سے شائع ہو رہا ہے اس کا سبب بھی میری علالتِ طبع اور نائب مدیرہ سائرہ بانو صاحبہ کا رخصت پر چلے جانا ہے۔ تاہم کوشش کی جا رہی ہے کہ ۱۵ اگست کے موقع پر جو آزادی ایڈیشن شائع ہو رہا ہے وہ وقت پر شائع ہو سکے۔ اس خاص ایڈیشن کی کتابت تین کاتبوں سے کرائی جا رہی ہے کچھ تصاویر کے بلاک بن چکے ہیں۔ کچھ بن رہے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس شمارہ میں ہر لکھنے والے کی تصویر بھی دی جائے۔

۲۔ قارئین کرام کی اکثریت جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا لفافہ نہیں بھجواتی اور جب جواب نہیں ملتا تو یاددہانی کراتے وقت یہ حضرات تلخ کلامی پر اتر آتے ہیں۔ اور کچھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے قارئینِ کرام سے متبرّ ہیں۔ اس لئے انھیں جوابی خط بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں صاف طور پر گذارش یہ ہے کہ ایڈیٹر شان ہند کے ذاتی دوست۔ رشتہ دار اور خصوصی کرمفرماؤں کے علاوہ ہر صاحب کو جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھجوانا ہی ہوگا جب بھی مضامین نظم و نثر بھجوائیے تو اس کے ساتھ مناسب ڈاک محصول کے ٹکٹ لگا لفافہ بھجوائیے تاکہ اگر آپ کا مضمون واپس کرنا ہو تو واپس کیا جا سکے اور اگر وہ قابلِ اشاعت ہے تو اس کی اطلاع آپ کو دی جا سکے

۳۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ آپ جب بھی دفتر کو خط لکھیں تو اپنا خریداری نمبر لکھیں اور اپنا پورا پتہ بھی لکھیں۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ جناب اخلاق اشرف جب بھی خط لکھتے ہیں تو اخلاق اشرف بھوپال لکھیں گے۔ انھیں ان کی ایجنسی کی فروختگی ۲ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھجوایا جانا تھا محض ان کا پتہ نہ ہونے کے باعث منی آرڈر کئی دن تک رکا رہا۔ اسی طرح کئی ضروری خطوط کا جواب محض اس لئے نہیں دیا جا سکتا کہ بھیجنے والے نے اپنا پورا پتہ نہیں لکھا۔ یا اپنا خریداری نمبر نہیں لکھا۔ براہِ کرم اسے یاد رکھیئے۔

۴۔ شیخ لیبارٹریز کی ادویات کے بارے میں سابقہ اشاعت میں لکھا گیا تھا۔ اکثر قارئین کرام نے ہماری معرفت شیخ لیبارٹریز کی ادویات منگا کر فائدہ اٹھایا ہے جسکے تعریفی خطوط موجود ہیں۔ یاد رکھئے کہ شیخ لیبارٹریز کی ادویات پر ایمان کی حد تک یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اجزاء اصلی ہیں اور نسخہ کے مطابق پورے ہوتے ہیں۔ اسی لئے یہ فائدہ کرتی ہیں۔ دفتر شان ہند نے شیخ لیبارٹریز کی ادویات بھجوانے کا مناسب انتظام کیا ہوا ہے۔ آپ اپنی ضرورت کی ادویات پورے اطمینان کے ساتھ منگا سکتے ہیں۔

(ادارہ)

دویا پرکاش سرور ایڈیٹر پبلیشر اور پرنٹر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد اور سرورق پاملٹ پریس ۲، چھپوا کر دفتر فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد

محکمۂ ٹیلیفون

ع کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں.

موقر پاکستانی معاصر ہفت روزہ "چٹان" لاہور نے لاہور کے محکمۂ ٹیلیفون کے احتساب اور اصلاحِ احوال کی ضرورت پر ایک نہایت موزوں فکری تبصرہ فرمایا ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ اب ہمارے یہاں بھی ہر سرکاری محکمہ میں پاکستان سے بدترین صورتِ حال کا دَور دَورہ ہے۔ اور ہم سرکاری افسران و ملازم یہ باور کرنے میں حق بجانب ہے کہ کرسیوں اور اقتدار کے حصول میں جب لیڈرانِ کرام میں ہی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے تو ان کا احتساب کرنے کی کسے ضرورت اور فرصت ہے۔

ہندوستان میں نئی جنتا کی حکومت بنے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا ہے اور حکومت کے ارکان ابھی اس تگ و دَو میں سرگرداں ہیں کہ ان کی کرسیوں میں مضبوط فولادی میخیں کس طرح ٹھونکی جاسکتی ہیں تاکہ ان کا اقتدار قائم رہ سکے۔ اس غیر یقینی حالت میں موجودہ حکومت یا حکومت کے کسی رُکن سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ کسی سرکاری محکمہ کے احتساب اور اصلاحِ احوال کی ضرورت پر دھیان دے سکے حماقت پر دلالت کرتا ہے مگر یہ ایک روایت رہی ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد ہر مسلمان سرکاری کارندہ خواہ وہ معمولی چپڑاسی یا کلرک ہو یا افسر، وزیر ہو یا صدرِ مملکت اس نے اپنی ذمہ داری اور فرض شناسی کا احساس کیا ہے جیسے کہ ہوائی فوج کے چیف آف سٹاف ایئر چیف مارشل لطیف نے کل ہی جنگی طیارہ کا معائنہ کرنے کے لئے بہ نفسِ نفیس اُسے اُڑایا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو فضائیہ کے کسی بھی بڑے افسر کو حکم دے سکتے تھے کہ وہ یہ معائنہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مسلمان سرکاری ملازم اپنے ساتھیوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے رشوت اور فرقہ پرستی وغیرہ کے معاملہ میں ملوث ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی مسلم سرکاری ملازمین نے پوری دیانتداری اور فرض شناسی سے سرکاری فرائض انجام دیئے ہیں۔

نئی مرکزی وزارت میں محکمہ مواصلات جناب ذوالفقار اللہ صاحب کو دیا گیا ہے۔ اس لئے کچھ اُمید بندھی ہے کہ شاید وہ اپنی روایات کے مطابق اپنے قدم جمنے پر (خدا کرے کہ ایسا ہو) اپنے محکمہ کے احتساب اور اصلاحِ احوال پر توجہ دے سکیں۔ اس لئے ہم یہ جسارت کر رہے ہیں کہ نئے وزیرِ مواصلات کو محکمۂ ٹیلیفون کی حرام زدگی کی حدوں تک غیر قانونی حرکتوں سے واقفیت بہم پہنچائیں تاکہ اگر وہ اصلاحِ احوال کی جرأت رکھتے ہوں تو اصل صورتِ حال اُن کے سامنے ہو۔ ہم یہ جسارت اس لئے بھی کر رہے ہیں کہ نئے وزیرِ مواصلات اُردو بخوبی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس لئے ہماری گذارشات آسانی سے سمجھ سکیں گے۔

۱۔ ایسے ضروری نمبر جس سے عوام کو اکثر واسطہ پڑتا ہے مثلاً ۱۹۹ - ۱۹۸ - ۳۸۶۱۹۷ - ۱۷۷ - ۱۷۶ - ۱۷۳ - ۱۸۰ - ۱۸۱ - ۱۸۳ - ۱۸۸ - ۱۸۶ - ۱۸۲ - ۱۸۵ پر جب بھی ڈائل کیجئے تو کیا مجال ہے کہ یہ نمبر خالی مل سکیں۔ کئی کئی منٹ تک ڈائل گھماتے رہیئے تو شاید خوش قسمتی سے کہیں سے کوئی کرخت آواز سنائی دے۔ کیا غضب ہے کہ اب تو خواتین اور بیئرروں کے لب و لہجہ میں بھی مردانہ تلخی اور حجت پائی جانے لگی ہے۔ خصوصاً وہ نمبر بڑی مشکل سے ملتے ہیں جن پر خواتین اور بیئررز کام کرتی ہیں۔ ایک تو عورتیں ویسے ہی باتیں کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور جب ان کی نازک حسین یا کالی کلوٹی انگلیوں کی زد میں مفت کا سرکاری ٹیلیفون ہو تو پھر ان کی باتوں کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ یہ سلسلۂ گفتگو خواہ ان کے رشتہ داروں اور سہیلیوں سے ہو یا پیار جتانے والوں کے ساتھ مگر عوام کے لئے بڑا صبر آزما ہے۔ اس لئے اگر کوئی ایسا انتظام ہو سکتا ہو کہ ان فریدہ سروسز میں سدھار ہو سکے اور ان پر مرد یا خواتین اور بیئررز جو بھی کام کرتے ہوں ان کے لب و لہجہ میں اگر نرمی اور ملائمت

کے ساتھ ساتھ خوش سلیقگی کا عنصر بھی موجود ہو تو محکمۂ ٹیلی فون کی نیک نامی ہو گی۔

مندرجہ بالا نمبروں کے افسرانِ اعلیٰ سپروائیزر وغیرہ کو اگر شکایت کرنے یا بروقت مدد کے لئے فون کئے جائیں تو ان کے ہاں گھنٹی بجتی رہے گی۔ مگر رسیور اٹھانے کی تکلیف قطعاً نہیں کی جاتی۔

S T D۔ ایسی زحمت کو محکمۂ ٹیلی فون کے بدکردار لائن مینوں نے یا دیگر ملازمین نے زحمت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس سروس میں ڈائرکٹ ڈائلنگ کی اجرت لوکل کالوں میں شمار کی جاتی ہے اس لئے بددیانت ملازمین اور لائن مین وغیرہ باہر ہی سے ایسے نادار لوگوں کو بھی۔ کلکتہ وغیرہ کے کنکشن کسی بھی نمبر سے ملا دیتے ہیں، جنہیں دن میں کئی کئی بار دُور دراز مقامات پر S T D کالیں کرنی مقصود ہوتی ہیں۔ اور ایسے معصوم لوگ جنہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا اور نہ انہوں نے کبھی S T D کال کی ہوتی ہے ان کے بلوں میں کروڑ رقومات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب بل آتا ہے تو سوائے سر پکڑ کے بیٹھ جانے کے کوئی اور راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ متعلقہ محکمہ کو شکایت کی جائے تو سائیکلو سٹائیز کیا ہوا چھپا چھپایا جواب آجاتا ہے کہ آپ کا میٹر چیک کیا گیا۔ وہ صحیح رفتار سے چل رہا ہے۔ ایسا ہی معاملہ شانِ ہند کو پیش آیا۔ معاملہ جب بہت ہی طول پکڑ گیا تو ایریا منیجر نے بارہ سو لوکل کالز کی اجرت بل سے کم کر دی جس کا مطلب یہ ہے کہ بددیانتی ہوئی۔ کتنی بددیانتی ہوئی اس کا اندازہ ایڈیٹر نہیں کر سکتا۔ اصل اندازہ تو ٹیلی فون رکھنے والا ہی کر سکتا ہے جنرل منیجر صاحب کو اور وزیرِ مواصلات کو اس معاملہ کی شکایت کی گئی مگر کوئی سننے والا نہیں ہے یہاں تک کہ سابق وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے پارلیمنٹ میں یہ تسلیم کیا کہ ٹیلی فون کے بلوں میں ہیر پھیر ہوتا ہے۔ اس پر بھی محکمہ ٹیلی فون کے ناخداؤں کو شرم تک نہ آئی۔ اور ہم ایسے امن پسندوں نے S T D کٹوانے کے سوا کوئی اور راستہ نہ پایا۔ S T D کاٹنے میں بھی ایک ماہ سے زیادہ عرصہ لگایا گیا اور وہ بھی بڑی تگ و دو کے باوجود اور پچاس روپیہ جرمانہ وصول کیا گیا۔ یعنی اگر S T D آپ لینا نہیں چاہتے تو پچاس روپیہ جرمانہ ادا کیجئے۔ اس محکمہ کے کچھ بددیانت ملازمین کے اس ناواجبی رویہ سے تنگ آ کر ہزار ہا اشخاص نے اپنے ہاں کی S T D کٹوا دی ہے۔ یعنی ایک اچھی خاصی رحمت جو کہ زحمت بن چکی تھی سے چھٹکارا پایا ہے۔

دہلی ٹیلی فون کے افسرانِ اعلیٰ کس قدر غیر ذمہ دار ہو چکے ہیں اس کی ایک انتہائی دلچسپ اور حماقت آمیز مثال سنئے۔ شانِ ہند کا ٹیلی فون نمبر ۲۷۸۸۸۰ تھا۔ محکمہ ٹیلی فون نے ہمیں اپنی چٹھی مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۷۹ء کی رو سے اطلاع دی کہ یہ ٹیلی فون نمبر بہت جلد ۲۷۲۸۷۲ کر دیا جائے گا۔ لہٰذا ہم نے نئی سٹیشنری چھپوائی اور اپنے مقامی و غیر مقامی مہربانوں کو اطلاع دے دی کہ اب ٹیلی فون نمبر ۲۷۲۸۷۲ ہو گا جس کی اطلاع بہت جلد اخبارات میں دے دی جائے گی۔ مگر ایک دن اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور حکم دیا گیا کہ آپ کا نمبر ۲۷۵۶۰۲ کر دیا گیا ہے محکمہ ٹیلی فون کا یہ خط موجود ہے۔ یعنی اس محکمہ میں اس قدر دھاندلی مچی ہوئی ہے کہ نمبر کی تبدیلی کچھ بتائی جاتی ہے اور تبدیلی ہوتی ہے کچھ اور۔ تو اور جو ٹیلی فون ڈائریکٹری کا ضمیمہ شائع کیا گیا ہے اس میں بھی ہمارا تبدیل شدہ نمبر ۲۷۲۸۷۲ درج ہے جبکہ تبدیل شدہ نمبر ۲۷۵۶۰۲ ہے۔

بیٹھے بٹھائے فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ آپ نے رسیور اٹھایا تو آواز آتی ہے کہ ہم ٹیلی فون آفس سے بول رہے ہیں آپ کے ذمہ ۱۹۷۲ء کے بل کی رقم واجب الادا ہے۔ یہاں آئیے نیا بل بنوا لیجئے اور ادائیگی کیجئے۔ اور اگر یہ بل آپ ادا کر چکے ہیں تو اس کی رسید لیتے آئیے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ۱۹۷۲ء کی رسیدیں آپ نے کہاں سنبھال رکھی ہوں گی۔ اب دوبارہ بل ادائیگی کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ورنہ ٹیلی فون کی لائن کاٹ دی جائے گی۔

کال بک کر لینے کے بعد دو تین گھنٹے انتظار کیجئے۔ پھر انکوائری سے دریافت کیا جائے کہ ہماری کال کا کیا بنا تو فوراً جواب ملتا ہے آپ رسیور رکھ دیجئے ابھی گھنٹی کریں گے۔ یہ گھنٹی قیامت تک نہیں بجتی۔ آپ دو چار مرتبہ یاد دہانی کرا لیجئے تو کچھ دیر بعد گھنٹی بجے گی اور جواب ملے گا لائن خراب ہے۔ کیا

محکمہ فون کا کوئی افسر یہ بتانے کی تکلیف کرے گا کہ جب کال ٹیک کرائی گئی تھی تو کیا محکمہ کو اس وقت علم نہیں تھا کہ لائن خراب ہے یا نہیں۔ کیوں دوسروں کا وقت ضائع کیا جاتا ہے۔

محکمہ ٹیلیفون میں حوا کی بیٹیوں کی بہتات ہے۔ اور آج کل کی یہ حوا کی بیٹیاں زمانہ جدید کی لت بوائے فرینڈز کی نعمت سے کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہیں۔ لہذا انہیں اپنے دل کے مالکوں سے ... شام کے پروگرام بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی لہذا وہ ٹیلی فون رکھنے والوں کی خدمات کا خیال کیسے رکھیں پہلے خویش بعد میں درویش پر پوری طرح عمل کرتی ہوئیں یہ حوا کی بیٹیاں جب اپنوں سے مفت کے فون پر دس دس پندرہ پندرہ منٹ گفتگو نہ کر لیں عام لوگوں کی گھنٹیاں بجتی رہیں یا فون ڈکار رہے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

راج دھانی میں ہر فون رکھنے والا نالاں ہے کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی جگہ بات کر رہے ہیں تو آپ کے فون پر DIAL ہونے کی کیفیت ہو جائیگی۔ آپ کی بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اور آپ کا فون کسی دوسرے فون سے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ کراس ٹاک تو ہر فون پر آپ کو ملے گی۔

کیا نئے وزیر مواصلات (خدا انھیں اس وزارت کی کرسی پر متمکن رکھے) اپنے اس محکمہ کی طرف توجہ دیں گے۔ اور شانِ ہند سے جو معقول روپیہ بددیانتی کے باعث زائد وصول کر لیا گیا ہے اس کی تحقیقات کا حکم دیں گے۔ کیونکہ ایریا منیجر صاحب نے تو بارہ سو لوکل کالوں کی بددیانتی تسلیم کی ہے اور جنرل منیجر اپنے ایریا منیجر کے فیصلے سے آگے جانا گناہ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بددیانتی زیادہ ہوئی ہے۔

وشواناتھ طاؤس

شانِ ہند کی گذشتہ اشاعت میں جناب وشواناتھ طاؤس ممبر مجلس عاملہ انجمن ترقی اُردو (ہند) سے متعلق ایک ضمنی تذکرہ پڑھنے کے بعد مدیر شانِ ہند کو کئی خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں شکایت کیا گیا ہے کہ وشواناتھ طاؤس تو جس قدر تعریف آپ کی کرتا ہے شاید ہی کسی دوسرے کو سراہتا ہو اور آپ ہیں کہ ان سے متعلق کچھ کشیدہ خاطر نظر آتے ہیں۔ یہی تذکرہ جناب ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند نے ٹیلی فون پر فرمایا۔

اس ضمن میں مدیر شانِ ہند کی یہ گزارش ہے کہ طاؤس صاحب مجھے اپنے بچے کی طرح عزیز ہیں۔ اور ان کی ترقی سے مجھے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ مجھے اپنی اولاد کی ترقی سے ہو سکتی ہے۔ مگر میں انھیں علمی۔ ادبی۔ سیاسی۔ مجلسی یا کسی دیگر صلاحیت کے لئے گوپال متل صاحب کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس وقت بھی طاؤس صاحب کی اہمیت گوپال متل صاحب کے شاگردوں سے زیادہ نہیں ہے۔

لہذا جن حضرات نے گوپال متل صاحب کے مقابلہ میں طاؤس صاحب کو ووٹ دیئے (اور یقیناً یہ ووٹ جناب مالک رام صاحب اور جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے دلوائے) انھوں نے فی الحقیقت انجمن ترقی اُردو ہند کی مجلس عاملہ کو بازیچہ اطفال سمجھا۔ اور یہ اُردو کی بدقسمتی ہے کہ جن ہاتھوں میں اُردو کی بقا و حیات کے لئے اقتدار سونپا گیا ہے یا جن حضرات کی اِس سلسلہ میں آواز سُنی جاتی ہے وہ گروہ بندیوں اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے جوڑ توڑ کرتے وقت اُردو کو قطعی فراموش کر دیتے ہیں۔ اور اپنی خود غرضی اور سربراہی کو قائم رکھنے کے لئے ذاتی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

حال ہی میں ماہنامہ "تحریک" کے تازہ شمارے کے اداریے میں جو کھلے الزامات جناب ڈاکٹر خلیق انجم صاحب پر لگائے گئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جناب گوپال متل صاحب کو مجلس عاملہ کے چناؤ میں ہارنے سے ان کی انا مجروح ہوئی ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر خلیق انجم نے توقع سے زیادہ فرائض منصبی کو نبھایا ہے۔

ہم ایک بار پھر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جناب وشواناتھ طاؤس سے ہماری کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہے۔ جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انتہائی دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ■

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

شراب نوشی اچھی ہے یا بُری اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ مگر میرا ذاتی تجربہ شراب نوشی کے بارے میں یہ ہے کہ اگر آپ کی جیب شراب نوشی کی عادت کو تسکین دینے کی اجازت آسودگی سے دیتی ہے تو آپ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی جسارت کر سکتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ آپ کی جیب شراب نوشی کی متحمل نہیں ہو سکتی اور آپ کو شراب کی لت پڑ چکی ہے تو پھر دنیا کی ہر لعنت آپ کے استقبال کے لئے بیقرار ملیگی۔ جھوٹ دھوکہ۔ فریب۔ چوری۔ ایسی بدعتیں تو معمولی نوعیت کی ہیں شراب نوشی کی لت تو بیوی۔ بیٹی حتیٰ کہ بہن سے بھی پیشہ کرانے کو بھی بُرا نہیں سمجھتی۔ شراب کے ایک جام کی خاطر "دلالی" کا فرض انجام دیتے ہوئے اکثر عادی شراب نوشوں کو دیکھا گیا ہے۔ بے غیرتی۔ خود غرضی۔ اور جنسی بے راہ روی شراب کی خاص خامیتیں ہیں۔

نریش کمار شاد دانشوری کی مضبوط قدروں کا مالک تھا مگر شراب نوشی کی لت کے باعث اُسے خودکشی کرنی پڑی یا خودکشی کے پردے میں وہ موت سے ہم کنار کر دیا گیا۔ شاید ہی دہلی کا کوئی ایسا کھاتا پیتا آدمی ہوگا جس کے ہاں نریش کمار نے یہ کہہ کر روپیہ نہ اینٹھا ہو کہ اس کا اکلوتا بیٹا ایکسی ڈینٹ میں موت کا شکار ہو گیا ہے (خدا اس بچے کو عمر طویل دے) لہٰذا اس کے کفن دفن کے لئے مدد کی جائے۔ اور اس قابلِ عبرت جھوٹ سے حاصل کیا ہوا روپیہ شراب نوشی کی نذر ہوتا۔ اور جن بد سے بدترین مناظر میں دہلی نے عوام ہی نہیں ملک کے اکثر مقامات پر نریش کمار شاد کو دیکھا گیا۔ اس کی تفصیل میں جانا کوئی خوشگوار فریضہ نہیں ہوگا

بدیع الزمان خاور بانگوری دفتر شانِ ہند میں میرے ساتھی تھے۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ وہ شراب کی لت میں اس بُری طرح سے غرق ہو چکے ہیں کہ وہ چوری۔ خیانت۔ بددیانتی اور جھوٹ بولنے کو کوئی بُرائی ہی نہیں سمجھتے۔ ایک اچھا شاعر اچھا نقاد اور تمام دفتری کام پر پوری طرح حاوی خاور بانگوری جب شراب کی لت کے باعث دفتر سے کتابیں چوری کر کے بازار میں فروخت کرتا یا دفتری ادائیگیوں میں ہیر پھیر کرتا اور کاتب سے ایک روپیہ ادھار مانگ کر بھی شراب پیتا تو مجھ ایسا ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک بھی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا۔ آخر کار ایس دہلی سے بانگوٹ پہنچایا گیا۔ کیونکہ وہ شراب نوشی کے باعث مقروض ہونے کے ساتھ ساتھ بددیانتی کے باعث ہزارہا روپیہ غبن کر چکے تھے۔ اور دلی کی سینٹرل جیل ان کی تشریف آوری کی منتظر ہی تھی کہ میں نے انہیں بانگوٹ پہنچا دیا۔ خدا کا کرم ہے کہ اب خاور صاحب نے شراب نوشی سے توبہ کر لی ہے۔

ایک متشاعر کو جناب امیر آغا قزلباش نے میری سفارش پر نظم کہہ کر دی۔ جس کا معاوضہ نظم کی پسندیدگی پر ادا ہونا تھا یہ متشاعر دلی سے باہر رہتے تھے۔ ایک شام کو راقم الحروف ناز ہوٹل جامع مسجد میں کسی بیرونی دوست سے ملاقات کے لئے گیا تو ابھی میں سیڑھیوں میں ہی تھا کہ پیچھے سے امیر آغا قزلباش نے ہانپتے ہوئے آواز دی۔ سرور صاحب ایک منٹ میری بات سنئے دیکھا تو قزلباش کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور پریشانی کی مہر حواس باختگی اُن کے حسین وجمیل چہرے کو ایسے مضمحل کئے ہوئے تھی کہ شاید ابھی ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ عرض کیا کہ فرمائیے کیا بات ہے۔ فرمانے لگے کہ میرے لڑکے .... کا ایکسی ڈینٹ ہو گیا ہے اور ڈاکٹر اس کی ڈریسنگ کر رہا ہے اسی وقت دس روپے چاہئیں۔ دس روپے اُن کی خدمت میں فوراً پیش کر دیئے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ ابھی تو اس کی شادی ہی نہیں ہوئی تو لڑکا کہاں سے آ گیا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ یہ ڈرامہ محض شراب کی لت پوری کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔

میرے ایک ملنے والے صاحب تھے جناب عاجز صاحب یہ ملٹری کے کسی دفتر میں ملازم تھے۔ جہاں سے یہ ملٹری کینٹین سے

رم کی بوتل سستے داموں لاکر دوستوں کو ممنون کیا کرتے تھے۔
جن حضرات کو یہ رم ارزاں داموں پر دیتے تھے وہ اخلاقاً اور
یہ سلسلہ جاری رہنے کے لالچ میں عاجز صاحب کو ... مُفت
رم پلاتے تھے۔ عاجز صاحب سے سستے داموں شراب لینے والے
حضرات عیاشی طبع تھے اور وہ پیشہ ور عورتوں کو بھی بلاتے تھے
مُفت کی شراب پیتے پیتے عاجز صاحب کو شراب کی لت پڑ گئی اور
انھوں نے شراب نوشی کے اخراجات پورے کرنے کیلئے ان پیشہ ور
عورتوں سے راہ و رسم پیدا کر لی جن کو عاجز صاحب کے دوست بلایا
کرتے تھے۔ لہٰذا اب یہ نیک کام عاجز صاحب نے انجام دینا شروع
کر دیا یعنی اپنے خوش طبع کھاتے پیتے دوستوں کو ان پیشہ ور
عورتوں کو سپلائی کرنا شروع کر دیا۔ اس سے انھیں مُفت
کی شراب تو ملتی ہی تھی کمیشن میں مُفت کی عیاشی بھی مل جاتی
تھی۔ اور ہمارے دیکھتے دیکھتے مُفت کی شراب پینے کی عادت
نے عاجز صاحب ایسے معقول آدمی کو مُفت عیاشی کے چسکے پر
ڈال دیا اور یہ چسکا انھیں باقاعدہ ایک پیشہ ور دلال کے روپ
میں لے آیا۔ اور اُسی بدنامی کے عالم میں ہی عاجز صاحب چل بسے
اکثر عیار مالکان اپنے ہاں کی ملازم لڑکیوں کو کوکا کولا یا
دوسرے مشروبات میں بغیر بتائے شراب کی معمولی مقدار
ملا کر پلاتے رہتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ شراب کی مقدار میں اضافہ
کرتے رہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ لڑکیاں نادانستہ طور پر
شراب کی عادی ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور پھر یہ مالکان انھیں بیتاکر
بلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سو دو سو یا دو تین صد روپیہ ماہانہ پانے
والی لڑکیاں گرہ سے خرید کر شراب کیسے پی سکتی ہیں اور
عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے مالکان کی شیطانی خواہشات
کو پورا کر کے شراب کی لت مٹاتی ہیں۔ دہلی میں ایسی ہزاروں
لڑکیاں ہیں جنہیں ان کے مالکان نے شراب کی لت لگائی اور
آج وہ شراب نوشی کے لئے اپنی عزت کو نیلام کر رہی ہیں
سردار سنگھ جو ایک ہندی رسالے کے ایڈیٹر تھے اور
معمول سے بانفیس لکھو پتی ہو گئے تھے ان کے ہاں کچھ لڑکیاں
کام کیا کرتی تھیں انھوں نے اپنے ملازم کو راز دار بنا رکھا تھا
کہ جب بھی وہ کوکا کولا منگایا کریں تو وہ دوسرے کمرے میں

بوتلیں کھول کر ان بوتلوں میں سے کچھ پانی نکال کر شراب ڈال
دیا کرے (صرف ان بوتلوں میں جو صرف لڑکیوں کو دی جاتی
ہوں) اسی طرح وہ دن میں تین چار مرتبہ اپنے سارے سٹاف
کو کوکا کولا پلاتے۔ سٹاف خوش تھا کہ مالک کس قدر فراخ
دل ہے اور مالک اپنی چال پر کہ یہ لڑکیاں شراب
کی عادی ہو جائیں۔ کچھ دنوں کے بعد سردار سنگھ
دانستہ طور پر ان لڑکیوں کے میز پر ہندی کی فحش کتابیں
"بھانگ کی پکوڑی" وغیرہ رکھ دیتے تھے۔ اور خود دفتر سے باہر
کسی کام کے بہانے چلے جاتے تھے تاکہ یہ لڑکیاں ان فحش
کتابوں کو پڑھ سکیں۔ ان کتابوں میں ننگی تصویریں اور
ایسی فحش کہانیاں ہوتی تھیں کہ جنہیں پڑھ کر لڑکیاں اپنے
شہوانی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تھیں۔ اور نتیجہ
میں شام کو جاتے وقت کوئی نہ کوئی لڑکی سردار صاحب کے
ساتھ موٹر میں لفٹ کے بہانے بیٹھ جاتی اور سردار صاحب
نے اسی طرح اپنے دفتر کی تمام ملازم لڑکیوں کی عزت لوٹی
ایک صاحبہ جن کی جوانی نے نصف دلی کو تڑپا رکھا
تھا۔ شراب کی اس قدر رسیا تھیں کہ پوری بوتل پی جانے
کے بعد بھی ہوش و حواس قائم رکھتی تھیں۔ جب ان کی جوانی
ڈھل گئی اور آمدنی کے ذرائع کم ہونے لگے تو فحبہ چوں پیر شود
پیشہ کند دلالی کے مصداق انھوں نے محلے کی کچھ خوبصورت
لڑکیوں سے دوستانہ تعلقات بنائے اور انھوں نے یہی نسخہ
آزمایا کہ ان لڑکیوں کو کوکا کولا میں شراب ملا کر پلاتی رہیں
اور رفتہ رفتہ ان لڑکیوں کو ان "محترمہ" کے ہاں کے کوکا
کولا میں عجیب کیف و مستی کا سرور آنے لگا اور جب تک یہ
لڑکیاں دن میں چار بار ان کے ہاں آکر کوکا کولا نہ پیتیں
انھیں چین نہ پڑتا تھا۔ اور پھر انہوں نے ان لڑکیوں کو بتا
دیا کہ کوکا کولا میں شراب ملی ہوتی ہے اور اب آپ جب
تک شراب نہ پیا کریں گی تو بے چین رہا کریں گی۔ آخر کار
ان لڑکیوں نے اپنی بے چینی مٹانے کے لئے مُفت کی شراب
حاصل کرنے کیلئے اس حرافہ کے کہنے پر انہی کی سابقہ
عاشقان کو سپلائی ہونا شروع کیا جس سے ان محترمہ کا

روزگار چل نکلا اور ان لڑکیوں کو شراب آسانی سے مل جاتی۔

محلہ ناری کا ناکہ جے پور میں ایک ریٹائرڈ پرنسپل اپنی ٹیچر بیوی کے پاس آئے ہوتے تھے (پرنسپل صاحب کی شراب نوشی سے تنگ آکر ان کی معمر بیوی نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور کسی سکول میں پڑھاتی تھیں) ان پرنسپل صاحب کی ایک لڑکی کرشن نگر دہلی میں بیاہی ہوئی تھی جسے میں نے ایک مصیبت سے رہائی دلائی تھی اور یہ لڑکی اپنی ماں کے پاس ہی رہتی تھی۔ میں جب کبھی جے پور جاتا تو اس لڑکی کو دیکھنے ضرور جاتا کیونکہ یہ لڑکی مجھے اپنے باپ سے بھی زیادہ عزت دیتی تھی۔ ایک دن میں اس لڑکی سے ملنے ناری کا ناکہ جے پور گیا تو دیکھا کہ پرنسپل صاحب اپنی چھوٹی لڑکی جو ہائر سکنڈری میں پڑھ رہی تھی کو پڑھا رہے تھے کچھ دیر بعد پرنسپل صاحب نے چند پیسے اپنی چھوٹی بیٹی کو دیئے کہ انھیں بیڑی لادے۔ وہ بیڑی لینے گئی پرنسپل صاحب کی بیوی اور بڑی بیٹی میرے ساتھ بات چیت کر رہی تھیں۔ پرنسپل صاحب نے موقع غنیمت جانا اور بچی کی کتابیں اٹھا کر رفو چکر ہو گئے اور یہ کتابیں فروخت کر کے شراب پی۔ پرنسپل صاحب کی بیوی نے روتے ہوئے سب حال مجھے بتایا بڑی کھوج کے بعد پتہ چلا کہ انھوں نے یہ کتابیں صرف تین روپیہ میں فروخت کیں اور کچی شراب پی۔ جبکہ یہ کتابیں ساٹھ ستر روپے کی تھیں۔ جس شخص نے یہ کتابیں خریدی تھیں وہ لڑکی کی ماں کے آنسو نہ دیکھ سکا۔ اور تین روپے لیکر اس نے کتابیں لوٹا دیں۔

لکھنؤ کی ایک متشاعرہ (جو محض خوش گلوئی کے صدقے میں شاعرہ بنادی گئی ہیں) کے والد نا محترم شراب نوشی کے باعث اس حد تک بے غیرت بن چکے ہیں کہ یہ نام نہاد شاعرہ جہاں بھی مدعو کی جاتی ہیں منتظمین مشاعرہ ان کے والد کو شراب اس کثرت سے پلاتے ہیں کہ انھیں اس کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ ان کی صاحبزادی کیا کچھ کر رہی ہیں۔ چنانچہ اس شاعرہ کو اردو مشاعروں اور ہندی کوی سمیلنوں میں کثرت سے اسی لئے بلایا جاتا ہے کہ ان کے والد محض شراب نوشی کے عوض دلالی کے فرائض

بخوبی انجام دیتے ہیں اور یہ شاعرہ منہ مانگے معاوضہ کے ساتھ پرائیویٹ پیکیشوں سے مزید معقول روپیہ کما لیتی ہیں۔

پاکستان کی مشہور شاعرہ پروین شاکر تشریف لائیں۔ تو انھوں نے گفتار۔ کردار۔ کلام اور رکھ رکھاؤ سے نسوانی وقار کو جلا بخشی اور پاکستانی شاعرہ کی حیثیت سے پاکستان کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔

مگر پچھلے دنوں دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرہ میں ایک پاکستانی سرکردہ شاعرہ تشریف لائیں تو محض ان کی شراب کے باعث بے شک وہ بلبلِ ہزار داستان تو بن گئیں مگر ہے کہ انھوں نے اپنے ملک کا وہ وقار قائم نہ رکھا جسے شاکر صاحبہ نے ہر قدم پر مقدم سمجھا۔ پاکستانی شاعرہ کئی ماہ ہندوستان میں رہے اور انھوں نے پڑھنے کے لئے ہر ممکن حربے استعمال کر کے دعوت نامے لئے اور بڑے طمطراق سے ہر مشاعرہ میں یہ کہتے رہے کہ میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے مگر شراب نوشی کے سفلہ پن، بے غیرتی اور گداگری انھوں نے فرمائی اسے دیکھتے ہی سب کو اس کا یقین ہو گیا کہ ان اوصاف میں واقعی پاکستان کا ان کی ٹکر کا نہیں۔

غزل

محمد یعقوب ساگر

حجرۂ دل میں تھی تنہائی بہت
آپ کی ایسے میں یاد آئی

وعدۂ فردا پہ کیا آئے یقیں
انکی باتوں میں ہے گہرائی

میں نے اپنے آپ پر جب کی نظر
آپ کی صورت نظر آئی

اب مریضِ غم میں کچھ باقی نہیں
آپ نے تکلیف فرمائی

سنگِ دل مائل نظر آنے لگا
کام آئی ناصیہ سائی

کام مشکل میں کوئی آیا نہیں
دوستوں میں بے رخی پائی

بے خودی سی چھائی تھی ان پر اگر
ہر غزل ان کو پسند آئی بہت

گوشۂ
عقیل صدیقی

ہندی زبان و ادب پر اسلامی تعلیمات پر اثر

وقار احمد رضوی

عصر جدید میں ہندی زبان ایک ترقی یافتہ اور مضبوط زبان ہے تقسیم ہند کے بعد سے ہندی نے ارتقا کے جو منازل طے کئے ہیں اور جس تیزی سے کئے ہیں، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہندی میں ہر علم و فن اور سائنس کے ہر شعبہ میں بیش بہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ نفسیات، معاشیات، فلسفہ، حساب، تاریخ، طبعیات کیمیا، ناول، افسانہ، اور سیاسیات غرض ہر موضوع پر اب ہندی میں وافر ذخیرۂ کتب موجود ہے۔ جس کو کسی بھی لحاظ سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک ہندی زبان کی لسانی اہمیت کا سوال ہے ہندوستان کے جدید زبانوں میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا تعلق ہند آریائی لسانیات کے گروپ سے ہے جس طرح اردو کھڑی بولی یا برج بھاشا سے نکلی اسی طرح ہندی قدیم پراکرت کی اپ بھرنش (بگڑی ہوئی) بھاشا ہے دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے تمام افعال، حروف جار، عطف و اسمائے اشارہ، ضمائر، اور حرف استفہام دونوں زبانوں یعنی ہندی اردو میں مشترک ہیں اسما زیادہ سنسکرت کے ہیں اور بعض فارسی اور اردو سے بھی لئے گئے ہیں۔

ہندی رسم الخط، دیوناگری ہے۔ ہندی رسم الخط کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے بنگلہ، گجراتی اور مرہٹی زبانوں کے رسم الخط بنائے گئے ہیں۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندی زبان و ادب کی ترقی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ چنانچہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں امیر خسرو، ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے ہندی میں دوہے کہہ کر زبان اور فارسی، ہندی سے ملی جلی شاعری کو رواج کیا امیر خسرو ہی کے عہد میں ملا داؤد ہندی کے اچھے شاعر تھے اسی طرح ملک محمد جائسی اور عبدالرحیم خان خاناں ہندی کے بڑے شاعر تھے۔ جائسی کی پدماوت ہندی ادب میں اہم مرتبہ رکھتی ہے۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں کتبن شیخ نے "مرگاوتی" نام کی ایک نظم لکھی تھی۔ اس سے ہندی ادب کی تاریخ میں یہ کی پہلی نظم یا مثنوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس مثنوی میں چندر گری کے راجکمار اور کنچن نگر کی شہزادی مرگاوتی کی داستان محبت ہے۔ اس کے بعد ہندی ادب کی ترقی میں صحیح معنوں میں مسلمانوں نے اکبر کے دور میں حصہ لیا۔ یہ زمانہ ۱۵۵۶ء سے شروع ہو کر ۱۶۰۵ء پر ختم ہوتا ہے۔ مغلیہ بادشاہوں میں اکبر بادشاہ کو ہندی شاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ خود بھی ہندی کا شاعر تھا۔ اکبر رائے کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں فنون لطیفہ اور ادب و شعر کو عروج ہوا۔

اکبر کے عہد میں جن مسلمانوں نے ہندی کی ترقی میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں:

(۱) عبدالرحیم خان خاناں
(۲) مُلا فیضی
(۳) تان سین
(۴) مبارک

تان سین کی موسیقی میں دو کتابیں ہیں جن کے نام سنگیت سار اور راگ مالا ہیں۔ فیضی نے ہندی میں دوہے لکھے۔ ملا مبارک کے دوہے ہندی کے مشہور شاعر بہاری کے جیسے ہیں۔ عبدالرحیم خان خاناں نے ہندی شاعری میں چار کتابیں لکھیں ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) رحیم ست سئی
(۲) بروے نائکہ بھید
(۳) راس پنچ ادھیائی
(۴) سنگھار سورٹھ

خان خاناں کی ہندی شاعری کا نمونہ یہ ہے۔ ؎

اب رحیم مشکل پڑی گاڑھے دوؤ کام
سانچے تو جگ نہیں، جھوٹے ملے نہ رام

کیسی مشکل ہے، سچ بولنے میں دنیا ساتھ نہیں دیتی اور جھوٹ بولنے سے خدا نہیں ملتا۔

ایک اور شعر ہے ؎

بے سلگتے بجھ گئے، بجھتے سلگے ناہیں
رحیمن دا ہے پریم کے، بجھ بجھ کے سلگا ہیں

جو چیز سلگتی ہے وہ بجھ جاتی ہے اور جو بجھ جاتی ہے وہ سلگتی نہیں۔ مگر محبت کی آگ بجھ بجھ کے سلگتی ہے۔

اکبر کے بعد شاہ جہاں کا بیٹا، داراشکوہ، ہندی کا بڑا عالم تھا اور نگ زیب بھی ہندی شاعروں کی عظمت کو مانتا ہے چنانچہ ہندی کا مشہور شاعر بھوشن، اورنگ زیب کا درباری شاعر تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں کی طرح رسکھان بھی مسلمان ہندی شاعر تھا۔ ان کا پورا نام سید ابراہیم تھا۔ رسکھان کی زبان کو ہندی ادب میں کسوٹی مانا جاتا ہے۔ آج اس کے کبت (شعر) ہندو لوگ پوجا کی عبادت میں بھجنوں کے طور پر گاتے ہیں۔ اس طرح اس مسلمان ہندی شاعر کے الفاظ مندروں کے در و بام پر گونجتے ہیں۔

اس کے علاوہ جن مسلمانوں نے ہندی شاعری میں کام کیا ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ حاجی ابراہیم سرہندی کا ترجمہ اتھروید
۲۔ عبدالقادر بدایونی کی رامائن و بھارت
۳۔ ملّا فیضی کی لیلاوتی اور نل دمینتی۔
۴۔ شاہ محمد شاہ آبادی کی راج ترنگینی
۵۔ اور مولانا شہری کی ہری بنس

یہ سب ہندی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

سمت ۱۶۷۷ بکری میں شیخ حسین کے لڑکے عثمان نے ایک پریم کہانی لکھی۔ جس کا نام "چتراولی" ہے۔ اس میں نیپال کے راجہ اور روپ نگر کی شہزادی چتراولی کا افسانۂ عشق ہے۔

سمت [illegible] بکری میں ایک مسلمان ہندی کا شاعر ہوتے تھا۔ ان کا نام عالم کوی ہے۔ انہوں نے سنگھار رس میں ہندی کا شاعری لکھی۔ ان کی ایک تخلیق "عالم کیلی" ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں سید غلام مرسلین بلگرامی ہندی کے شاعر تھے ان کی کتاب کا نام "رنگ درپن" ہے۔

سمت ۱۸۰۰ بکری میں نور محمد جائسی نے بھی ہندی میں ایک پریم کہانی لکھی تھی۔ اس کا نام "اندراوتی" ہے۔ اس کے علاوہ میر عبدالجلیل بلگرامی۔ اعظم خان (سنگھار درپن) کاظم علی خان (سنگھاسن بتیسی) قاسم شاہ (ہنس جواہر۔ آصف خان۔ ہاشم بیجاپوری، خان عالم اور انشا واللہ خاں انشاء (رانی کیتکی کی کہانی) ہندی کے عالم و شاعر ہیں

غرض مسلمانوں نے نہ صرف ہندی شاعر اور عالم پیدا کئے بلکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندی ادب اور ہندی شاعروں کی اپنے زمانے میں سرپرستی کی۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں راجہ ٹوڈرمل، راجہ بیربل، مہاراجہ منوہر داس نے ہندی میں شاعری کی۔ ان میں راجہ بیربل کو اکبر بادشاہ نے ہندی شاعری میں کوی رائے کا درباری خطاب دیا۔

ہندی شاعر سورداس کے والد رام داس اکبر کے دربار میں گائک کلاکار تھے۔ اسی طرح کرن اور نرہری سہائے دونوں بھائی اکبر کے دربار میں ہندی شاعر تھے۔ جن کی سرپرستی اکبر نے کی۔ گنگا پرشاد، اکبر کا درباری شاعر تھا۔ جو گنگ کے نام سے زیادہ مشہور رہا۔ یہ ۱۵۳۳ سے لیکر ۱۶۱۷ کے درمیان ہوا ہے کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک چھند (شعر) پر کئی لاکھ روپے انعام ملے تھے۔

علاءالدین خلجی کے زمانے میں ہندی کا ایک مشہور شاعر کیدار تھا۔ علاءالدین خلجی اس کی بڑی قدر کرتا تھا اسی طرح ہمایوں بادشاہ چھیم چند کی عزت کرتا تھا۔ شاہجہاں کے زمانے میں کوی رائے کا خطاب، کوی سندر کو دیا گیا۔ جو ذات کا برہمن تھا۔ اس کے دیوان کا نام "سندر سنگھار" ہے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں، ایشور، معظم شاہ کے زمانے میں عبدالرحمان، محمد شاہ کے زمانے میں گمان اور جگل کشور بھٹ ہندی کے شاعر تھے جن کو شاہی دربار سے مدد ملا کرتی تھی۔

مغل بادشاہوں کے زمانے میں کیشوداس، بہاری لال، جسونت سنگھ، دیو کوی اور سکھ دیو مصر ہندی کے بڑے شاعروں کے نام ہیں۔ ان میں بہاری لال کی شہرت ان کی ست سئی کی وجہ

سے ہے۔ جس میں لگ بھگ سات سو اشعار ہیں۔

جسونت سنگھ، جودھپور کا راجہ تھا۔ اس کی شہرت "بھاشا بھوشن" سے ہوئی۔ اس نے ایک کتاب ویدانت و تصوف پر بھی لکھی ہے۔ اس کی پیدائش ۱۶۷۳ء میں اٹاوہ میں ہوئی سولہ سال کی عمر میں شہزادہ اعظم کے سامنے ایک نظم پڑھی اور دربار میں عزت پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ۷۲ کتابیں لکھیں۔ جن میں سے اب بہت کم باقی ہیں۔

اسی طرح مسلمان صوفیوں نے ہندی شاعری کو متاثر کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی شاعری میں اسلامی تصوف کے اثرات ملتے ہیں۔ چنانچہ ویر گاتھا کال میں چند بردائی کی پرتھوی راج راسو کے بعد امیر خسرو کی ہندی شاعری میں تصوف کے رجحانات ملتے ہیں۔ اس کے بعد ہندی ادب میں ملک محمد جائسی نے صوفی مت کو آگے بڑھایا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جائسی نے اپنی کتاب پدماوت کا آغاز ہی حمد و نعت سے کیا ہے۔

بھگتی تحریک کے چار شاخوں میں ایک شاخ پریم مارگی یا صوفیوں کا سلسلہ کہلاتی ہے۔ کبیر داس اور جائسی کی تصنیفات میں اس تصور کی جھلک ملتی ہے ہندی میں خدا ترسی کے رجحان کو فروغ دینے کے لئے جو تحریک پیدا ہوئی وہ بھگتی تحریک تھی بھگتی تحریک عوامی تحریک تھی۔ اور اس میں برہمنوں کے کٹر جذبات کو جگہ نہیں ملی اس تحریک کے بانی رامانند کا کہنا یہ تھا کہ جس کے دل میں خدا موجود ہو اس کو مندر میں بت پرستی کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر وہ کھل کر بت پرستی کی مخالفت بھی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس نے اپنے چیلوں کے ذریعہ ویدانت یعنی تصوف کی تبلیغ کی۔

بھگتی تحریک کا مقصد عوام میں روحانیت اور مذہب کے بارے میں اس سوئی ہوئی عقیدت کو جگانا تھا جو اس عہد میں کچھ بے رنگ اور مردہ ہو گئی تھی۔ ہندی میں بھگتی تحریک ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتی ہے جو انسانوں سے دوری اور فاصلہ کے بجائے انھیں میں شامل رہتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے۔ وہ عقیدت اور عشق خداوندی پر زور دیتی ہے۔ چنانچہ کبیر داس بابا فرید کے دوہوں میں اس تصور کی جھلک ملتی ہے۔

کبیر داس بھگتی تحریک کے روح رواں تھے۔ انھوں نے اپنے وجد آور نغموں سے ہندی ادب کو مالا مال کیا۔ ان کی شاعری میں تصوف کا اثر صاف ظاہر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیر کی تعلیم میں اسلامی اثر غالب تھا۔ ہندی ادب کی تاریخ میں بھگت کویوں کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے۔ کبیر بھی بھگت تھے۔ انھوں نے مندر میں رہنے والے بھگوان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا دل میں رہتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے ذات پات کی بھی تردید کی۔ ان کی نگاہ میں سب انسان برابر تھے۔ وید پڑھ کر ایشور کو سمجھنا کبیر داس کو پسند نہ تھا۔ وہ تو یہی مانتے تھے کہ جو آدمی سب سے محبت کرتا ہے اور سچے دل سے خدا کی عبادت کرتا ہے وہی سب سے بڑا بھگت (عبادت کرنے والا ہے) اس لحاظ سے کبیر کا مسلک حیات بالکل نیا تھا۔ ان کے نزدیک اللہ اور ایشور ایک ہی خدا کے نام ہیں یہ لوگوں کے اوپر ہے کہ وہ اس کو کس نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

نہائے دھوئے کیا ہوا جو من میں میل سمائے
مین سدا جل میں رہے دھوئے باس نہ جائے

دل کا میل نہانے دھونے سے نہیں جاتا جس طرح مچھلی ہمیشہ پانی میں رہتی ہے۔ مگر پانی سے دھونے پر بھی مچھلی کی بو نہیں جاتی۔

اسی طرح بابا فرید نے اپنے ہندی دوہوں میں قناعت کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ کہا ہے۔

روکھی سوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی
دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائے جی

اپنی محنت کی خشک روٹی کھا کر ٹھنڈا پانی پینا بڑی نعمت ہے۔ دوسرے کی گھی لگی روٹی یا لقمۂ تر کی حرص نہ کرو۔

یہی وجہ ہے کہ نرگن بھگتی کے فلسفہ پر تصوف و اسلام کے وحدت خداوندی کی گہری چھاپ ہے۔ ہندو ناتھ پنتھیوں نے وحدت الوجود اور تصوف کی ایک خاص روایت کو رواج دیا۔ اسلامی تصوف اور رامانند کی ویشنوی تعلیمات سے مل کر نرگن واد کا فکری تانا بانا بنا ہے۔ نرگن واد کا سلسلہ کبیر داس

سے شروع ہوتا ہے۔

اس طرح شنکر اچاریہ نے دنیا کو مایا قرار دیا۔ رامانج نے عالم ظاہر کو جسم اور ایشور کو روح بتلایا۔ اس طرح کرشن بھگتوں نے خاص طور پر صوفیوں سے اثر قبول کیا۔ عشق و محبت کا جو تصور انھوں نے اختیار کیا۔ وہ تمام تر تصوف کے زیر اثر ہے۔ چنانچہ میرا بائی کے ہاں برہ (ہجر) کی جو آگ ہے۔ وہ صوفی مت کے اثر سے آئی ہے۔ گیروا کپڑے بھی صوفیوں کا لباس ہے۔

اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں کی شاعری میں بھی صوفی مت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

رحیمن چپ ہو بیٹھئے دیکھو دنن کے پھیر
جب نیکے دن آئیں گے بنت نہ لگے دیر

کبیر کی طرح گرو نانک کا پیغام بھی ایک خدا کی عبادت کرنا اور انسانوں سے محبت کرنا ہے۔ وہ روحانی ہم آہنگی اور مذہب کی اصل روح پر زور دیتے ہیں۔ نانک نے ہندی شاعری میں وحدت الوجود کے گیت گائے ہیں ان کا ایک مخصوص شعر ہے

جے کارن تٹ تیرتھ جاتے
رتن پدارتھ گٹ ہی ماہے

جس کی خاطر لوگ تیرتھوں پر جاتے ہیں۔ وہ خدا تو تمہارے دل میں موجود ہے وہیں تلاش کرو۔

غرض اس طرح ہندی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شاعری فطری طور پر تصوف یا صوفی مت سے متاثر ہوئی ہے۔ اور اسلامی تصوف کے بنیادی عنصر کو ہندی شاعری نے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف انسان کو روحانی سکون اور ذہنی یکسوئی کا ماحول فراہم کرتا ہے اس کے علاوہ ہندی کے بھجنوں میں بھی وحدت الوجود اور اسلامی تعلیمات کا اثر ملتا ہے۔ کیوں کہ اسلام کے نزدیک خدا سے لو لگانا سب سے بڑی عبادت ہے۔

(ماہ نو)

غزل

طالب، مشتری گرش پوری

لوگو کیا یہی میری شرافت کا صلہ ہے
ہر سمت ہے الفاظ کا پتھراؤ ہوا ہے
وہ شخص خدا جانے پریشان ہے کب سے
بچھڑے ہوئے ساتھی کا پتہ پوچھ رہا ہے
کہتا ہے "غم پور" میں وہ مجھکو ملا تھا
اب وسعتِ دلی میں کہیں کھویا ہوا ہے
وہ شخص محبت کا سمندر ہے یقیناً
وہ پیکرِ اخلاص و شرافت بہ خدا ہے
سنتے ہیں اسی شہر میں وہ شاعرِ خوش فکر
شاید کہیں فٹ پاتھ پہ دم توڑ رہا ہے
وہ شخص ازل ہی سے ہے خوددار طبیعت
ہو سکتا ہے اب بھی وہ اسی ضد پہ اڑا ہے
مل جائے کسی کو تو پتہ ہم کو بتائے
زندہ ہو بہر حال بھکاری یہ ٹھکا ہے
کچھ لوگ حقارت سے مجھے دیکھ رہے ہیں
یہ جانکے مجھکو بہت افسوس ہوا ہے
اک تازہ مصیبت نے لیا جنم یقیناً
جب جب بھی کہیں بیٹھ کے آرام لیا ہے
اک حوصلہ بخشا ہے مجھے میری خودی نے
جب بھی کوئی جھوٹا مجھے الزام ملا ہے
اک روز یقیناً مجھے ڈھونڈے گا زمانہ
اک شعر میں خود حضرتِ طالبؔ نے کہا ہے

جینریشن گیپ

سلطان جمیل نسیم

نام ۔!
رضا حسین
ولدیت ۔!
باقر حسین
قومیت ۔!
پاکستانی
عمر ۔!
۴۴ سال
پیشہ ۔!
ملازمت

اور ملازمت بھی کسی بینک کی اعلیٰ افسری ۔۔ پورے نو سال مغرب میں گذارنے کے بعد جب میں اپنی پندرہ برس کی بیٹی کو لیکر وطن آیا ۔ اور یہاں جب اپنے خاندان میں وہ دادا، دادی، چچا اور پھوپھی سے ملی ۔ اپنی خالہ، ماموں اور ان کی اولادوں کو دیکھا تو اس نے مجھ سے پہلی بات یہی کہی ۔

" ڈیڈی ۔ وے آر کوائٹ اَن کلچرڈ ۔ ڈیری بیک ورڈ ۔"

تو میں نے اس کے بالوں کو الجھا کر ہنستے ہوئے کہا ۔

" مگر بیٹے ۔ دی آر دن آف دیم ۔"

" اوہ ۔ نو ڈیڈی ۔ یہاں سے تو آپ جلد چلیئے ۔ اس ملک کا ایٹماس فیئر ۔ آئی ڈونٹ لائک ۔"

" ارے کچھ دن تو ان میں بھی گذار لو ۔ تبدیلی زندگی کے لئے ماحول کے لئے ضروری ہوتی ہے "

اس نے برا سا منہ بنایا کندھے اچکائے اور دھپ سے اسپرنگ کے پلنگ پر اوندھی لیٹ گئی ۔ میں نے اس کی جھنجھلاہٹ کا مزہ لیا اور پھر ٹائم میگزین میں BUSINESS کا کالم پڑھنے لگا ۔

دو چار مہینے کے اندر میں نے ڈیفینس میں مکان خرید لیا اور اپنے ہی سٹیٹس کے لوگوں کے بچوں سے اپنی بیٹی (جسکو میں محبت میں فریدہ کہتا ہوں اور جس کا نام اس کے دادا نے غلام فاطمہ رکھا ہے) کو ملوا دیا ۔ اپنے ہم عمر اور ہم خیال بچوں سے ملکر ماحول کی اجنبیت کا احساس معدوم ہونے لگا اور پھر کچھ دوست اس نے کالونٹ میں بھی بنا لئے ۔ اب ہر ویک اینڈ پر وہ اپنے دوستوں کو بلاتی ۔ کبھی کبھی خود بھی جانا پڑتا اور وہ رات مشرق میں مغرب کی رات ہوتی ۔ شور ۔ ج ڈوبا اور ہلا گلا ۔ پاپ میوزک ۔ وائلڈ ڈانس جسم کی طنابیں اتنی کھنچ جاتی تھیں کہ بعد میں سارا بدن ڈھیلا پڑ جاتا ۔

ایک مرتبہ میرے ایک دفتری ساتھی نے " ازراہ ہمدردی " مجھے اطلاع دی کہ اس نے فیری کو کسی لڑکے کے ساتھ ۔۔ بہر حال نہایت بے تکلفانہ انداز میں جاتے دیکھا ہے ۔

" SO-WHAT ? " میں نے کہا ۔

ایک دن میں اپنے کام میں بے انتہا مصروف تھا ۔ سکریٹری سے کہہ دیا تھا کہ شام تین بجے تک NO CALL - NO VISITOR لیکن اس کے باوجود جب فون کی گھنٹی نے مجھے ڈسٹرب کیا تو میں نے غصہ میں فون اٹھا کے کہا

" کیا ہے "

" سر آپ کے والد بات کرنا چاہتے ہیں "

" میں نے تم سے کیا کہا تھا ۔"

" سر وہ اصرار کر رہے ہیں کہ ضروری بات کرنا ہے "

" اچھا ۔ ملاؤ "

دوسری طرف سے آواز آئی ۔

" رضا ۔۔۔"

" جی ابا جی "

" صابرہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے ۔۔"

یہ کہہ کر انھوں نے فون میری بڑی بہن کو دیدیا ۔ صابرہ آپا نے پوچھا

" اچھے تو ہو ۔۔"

"جی ہاں —"

"بھیا تم دیس میں آکے بھی پردیسی بنے ہوئے ہو۔"

"جی۔ میں ذرا....."

"ایک سال ہو رہا ہے تم کو آئے ہوئے۔ دوسری بار کے بعد تم سے ملنا ہی نہیں ہوا۔ پردیس میں تھے تو دل کو یہ تسلی تو تھی کہ بھائی کوسوں دور ہے۔ تم تو ایک شہر میں رہ کر بھی قریب نہیں ہوئے"

"آپا میں کل شام کو آؤنگا آپ کے پاس دراصل مصروفیت اتنی رہتی ہے کہ....."

"ہاں اس کا تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ اسی لئے غلام فاطمہ پر بھی توجہ نہیں دے پا رہے ہو....."

"ارے نہیں آپا۔ بینک کے بعد ہی تو مجھے مصروف رکھتی ہے۔"

"بے ماں کی بچی ہے۔ باپ لاکھ توجہ دے۔ ماں تو نہیں بن سکتا۔" صابرہ آپا جانے کس موضوع پر بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ اور میری مصروفیت — میز پر A ! QESTHETIC مریض کی مانند آپریشن کی منتظر تھی۔ میں نے کہا۔

"آپا میں کل شام آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔ ابھی میں بے اندازہ مصروف ہوں۔"

"ابا جی کہہ رہے ہیں۔ کل آؤ تو غلام فاطمہ کو بھی ساتھ لیتے آنا۔"

"جی بہت اچھا۔"

ریسیور رکھنے کے بعد میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے دن شام کو میں نے اپنی بیٹی سے کہا۔

" YOU-ARE [illegible]KING BICY ". چلو بیٹے آج تمہیں [illegible]RA[illegible] سے ملوا لائیں۔

"ارے ڈیڈی آج نہیں۔"

بیٹے آج کے لئے میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔

WITHOUT CONSULTING ME

OH NO DAD. I CANT [illegible]

"بیٹے وہ لوگ تم کو بہت چاہتے ہیں۔ بہت مل کر خوش ہوتے ہیں۔"

"مگر ڈیڈی آج ہمارا پروگرام سیٹ ہے۔ آج ہم فل مون لائٹ انجوائے کرنے بیچ پر جا رہے ہیں۔"

"ہم کون۔؟ اور کون جا رہا ہے تمہارے ساتھ۔؟"

"میرے فرینڈز ہیں۔"

"نام بتاؤ —"

"غزل —"

"اچھا۔ غفران صاحب کی بیٹی۔ اور —"

"سولومن —"

"سلیمان۔ مجید صاحب کا لڑکا ہے نا۔"

"جی۔ اور کوثر ہے۔ مریم ہے۔ زلفی ہے"

"بیٹے پروگرام سیٹ کرتے وقت اس میں ہمیں بھی سیٹ کر لیا کرو۔ میں بھی تمہارا دوست ہوں"

"ڈیڈی آپ تو پروگرام میں سیٹ ہیں۔ مگر آپ وہاں جا رہے ہیں —"

"اگر یہ بات ہے تو چلو۔ آج نہیں جاتے وہاں کل چلے جائیں گے"

سمندر کے کنارے جب یہ سب بچے BATHING COSTUME میں چہلیں کر رہے تھے۔ میں نرم اور نم ریت پر لیٹا ان موجوں کو دیکھ رہا تھا جن کی قسمت میں قرار نہ تھا۔ ساحل جو تلاطم سے گھبرا کر سکون کی تلاش میں کنارے کی طرف بڑھتی تھیں۔ اور کنارہ ان کو نافرمانی کی سزا دینے کیلئے کچھ اور پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ اور وہ تھکے ہوئے انداز میں واپس پلٹ جاتی تھیں۔ میں نے سمندر کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر آج بڑا مانوس اور اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ اس کی لہریں پاپ میوزک پر ڈانس کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں — شور — تڑپ — کھنچاؤ — اور پھر ڈھیلا پن — میں گیلی گیلی ریت پر لیٹا — چاند کو لہروں کے ساتھ کھیلتا دیکھتا رہا۔ سمندر میں ستارے۔ جیسے آسمان کے سنہری آنسو تیر رہے ہوں۔ حد نظر تک چاندنی کے ساتھ پھیلا ہوا سمندر۔ دونوں ساتھ ساتھ۔ مگر الگ الگ۔ یہ قرب قریب نظر۔ سمندر کو میں اپنے سینے میں محسوس کرنے لگا اور ستاروں کو اپنی آنکھوں میں۔ جب چاندنی کا سحر مجھے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ کہ اچانک پری ہنستی اور بھاگتی ہوئی

ے سامنے سے گذری۔ سلیمان اس کا پیچھا کر رہا تھا
دور جا کر وہ ریت پر گر پڑی اور سلیمان بھی۔ میں نے
نی کا جال توڑ دیا اور غیر ارادی طور پر اپنی جگہ سے اٹھا
کے قریب پہنچا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور آہستہ سے

"اب چلو۔"
بکھری ہوئی موج تیزی کے ساتھ آئی میرے قدموں میں لوٹی
جھکے ہوئے انداز میں پلٹ گئی۔
دوسرے دن فیری کو ہلکا ہلکا ٹمپریچر تھا اس لئے میں تنہا صابرہ
کے ملنے گیا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر اباجی نے پوچھا۔
"فاطمہ کو ساتھ نہیں لائے ۔۔؟"
"اس کو بخار ہو گیا تھا"
"وہاں اکیلی گھبرا رہی ہو گی۔ یہاں لے آتے بچوں میں اس کا
دل بہل جاتا۔۔"
"ابھی تو وہ سو رہی تھی۔۔"
صابرہ آپا نے ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے بعد کہا
"برا مت ماننا۔ ہمارا خون ہے اسی لئے کہتے ہیں۔"
"جی فرمائیے۔۔"
"تم نے غلام فاطمہ کو بہت آزادی دے رکھی ہے۔"
میں اپنی سادہ لوح بہن کی بات سن کر ہنس پڑا۔
"یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے بھیا۔ لڑکیوں کی عزت کچے دھاگے
ہوتی ہے۔ جاننے والے تو جو دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں مگر سسرال والے
پیچھے پر کیا گزرتی ہے۔ تم اس سے واقف نہیں ہو۔"
میں اب دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ میری بیٹی کا دم اسی
یا الجھتا ہے یہاں آتے ہوئے۔ ایسی باتیں۔ معلوم ہوتا ہے
مجھ سے اور فیری سے کوئی بڑے گناہ سرزد ہوئے ہوں۔
اباجی نے پوچھا۔
"بچی کی شادی کی بھی کچھ فکر ہے تم کو"
"ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو اس نے سینئر کیمبرج بھی
پاس"
"بس یہی عمر ہے شادی کی۔ اباجی کا انداز حکمانہ تھا۔

آپا بولیں۔
"تم نے دس برس میں اس کو انگریزی طور طریقے تو اچھی طرح
سکھا دیئے۔ اب ذرا گھر بار چلانا بھی سکھاؤ۔ نوکروں کی فوج یہ
کام انجام نہیں دے سکتی۔ آج نہیں تو کل اس کو اپنے گھر جانا ہو گا
اس کے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ سوچ لیا کرو۔"
"آپ لوگوں نے تو مجھے تنہا چھوڑ رکھا ہے۔ کوئی خبر ہی نہیں
لیتا۔ تو تیر اگر زندہ ہوتیں تو یہ ساری مشکلیں آسان تھیں۔ آپ
لوگ میرے ساتھ آکر رہیئے۔ میں ہی اسے ماں اور باپ بن کر پال
رہا ہوں۔ کچھ تو میرا ہاتھ بٹایئے۔۔"
یہ باتیں بالکل غیر ارادی طور پر میں نے کہہ دیں مجھے اپنے لہجے
کی گھگھیاہٹ کا بھی احساس ہوا۔ اباجی۔ آپا اور امی سب کو مجھ پر
بڑا ترس آیا۔ پھر ایک دم اباجی نے نئی بات شروع کر دی۔
"اکبر کو جانتے ہو۔"
"اکبر" میں نے ذہن پر زور ڈالا تو مجھے یاد آگیا کہ وہ
صابرہ آپا کا بڑا بیٹا ہے۔ جب میں ولایت جا رہا تھا تو شاید وہ
آٹھویں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور آنے کے بعد اس سے ملاقات
ہی نہیں ہوئی۔ مجھے تاسف سا ہونے لگا۔ میں اپنے خاندان سے کٹ
کر رہ گیا ہوں۔ ذرا سا اختیار۔ تھوڑی سی آسودگی مجھے اپنے ماحول
سے جدا کر کے کہاں لے گئی ہے۔
"اکبر نے اس سال ڈاکٹری پاس کر لی ہے" صابرہ آپا کے چہرے
پر بڑی تمکنت تھی"
اباجی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
"اور میرا خیال ہے کہ اکبر سے فاطمہ کا رشتہ کر دیا جائے صابرہ
دیکھو۔ اکبر شاید اوپر ہے۔ کسی سے بلواؤ اسے۔ اکبر پڑھا لکھا سمجھدار
بچہ ہے۔ فاطمہ کو اپنے سانچے میں ڈھال لے گا۔"
میں فیری سے پوچھے بغیر اتنے بڑے موضوع پر اباجی کے فیصلہ کن
انداز کی تائید کیسے کر سکتا تھا۔ فیری اور اباجی۔ دو قومی متوازی خطوط
تھا ہر جن کا ملاپ ناممکن۔ مگر جب میں نے اکبر کو دیکھا تو وہ مجھے
بے حد پسند آیا۔ میں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔
اسی دن رات کے کھانے پر میں نے فیری سے کہا۔
"آج اباجی سے بڑے مزے کی باتیں ہوئیں۔"

کیا؟" اس نے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

"وہ سمجھتے ہیں تم بڑی ہو گئی ہو"

"ہوں"

"وہ تمہاری شادی کر دینا چاہتے ہیں"

"POOR GRAD PA"

"اور معلوم ہے کس کے ساتھ۔۔۔؟ تمہارا ایک کزن ہے اکبر۔ ڈاکٹر ہے۔ MBBS کل وہ آرہا ہے تم سے ملنے کے لئے"

"I DONT WANT TO SEE ANYBODY"

"کیا نقصان ہے اس میں؟"

وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ آج اس کی جھنجھلاہٹ پر میں مسکرایا نہیں بلکہ کچھ اور سنجیدہ ہو گیا۔ دوسرے دن اکبر آیا۔ فیری سے بہت روا روی میں تعارف ہوا۔ وہ کہیں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اکبر میرے پاس بیٹھا اتنی دلچسپ باتیں کرتا رہا کہ اگر فیری بھی ان کو سنتی تو یقیناً قہقہے لگاتی جب وہ گیا تو میں اس کا اور گرویدہ ہو گیا تھا۔ اکبر کے جاتے ہی سلیمان اپنی اسپورٹس کار میں آ گیا۔ ہلکی سی کوشش کرنے کے بعد میرے وجود کو نظر انداز کر کے اس نے اپنی گاڑی کا واہیات سا ہارن بجایا۔ جسے سنتے ہی فیری بھاگتی ہوئی آئی دو چار منٹ سلیمان سے باتیں کر کے میرے قریب آئی۔

"MAY I GO DAD"

"کہاں جانا ہے"

"ایک جگہ پارٹی ہے۔ میں نے محسوس کیا آج فیری مجھے تفصیلات میں الجھانا نہیں چاہتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے سارے وجود کو ایک فیصلے کے پلڑے میں رکھ کر تولا اور آہستہ سے کہا۔

"NO"

وہ ناراض ہو گئی۔ اس کے ناراض ہونے کا یہی انداز ہے کہ زور سے بال جھٹک کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے سلیمان ہکا بکا رہ گیا۔ میں بھی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اپنے کمرے میں لیٹ کر کتاب کا آدھا صفحہ پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ جیسے ابھی سلیمان گیا نہیں ہے۔ اس کی کار کے جانے کی آواز ہی نہیں آئی۔ میں نے کتاب پلنگ پر رکھی اور اٹھ کر باہر آگیا۔ سلیمان کی گاڑی ابھی تک وہیں تھی۔ مگر وہ خود موجود نہیں تھا۔ محض اپنے دل میں ابھرنے والے خیال کی روشنی میں چلتا ہوا میں فیری کے کمرے تک پہنچا دروازہ ہلکی سی جنبش سے کھل گیا۔

میں نو برس تک مغربی ممالک میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے روز و شب میں گھل مل گیا ہوں۔ مغرب کی سردی میری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ وہاں کی دھند بار ہا میری آنکھوں کا پردہ بنی ہے۔ اپنی زبان میں مسلسل گفتگو کرتے ہوئے مجھے اپنے جبڑے دکھنے کا احساس ہوتا ہے۔ فیری میری لاڈلی بیٹی ہے۔ میں اس کے ساتھ رقص و موسیقی کی پارٹیوں میں شریک رہا ہوں اس کے باوجود کہ مجید صاحب بڑے سرمایہ دار اور میرے بنک کے اچھے کلائنٹ ہیں میں نے آگے بڑھ کر ان کے بیٹے سلیمان کے منہ پر ایک بھرپور گھونسہ مارا۔ وہ فرش پر گرا تو میں نے اس کے ٹھوکریں ماریں۔ پھر میں نے اس کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور دروازے کی طرف دھکیل دیا۔

"حرامی کے بچے۔ اگر آئندہ میں نے تجھے یہاں دیکھا تو جان سے مار ڈالوں گا۔ نکل یہاں سے" جب وہ کمرے سے نکل بھاگ رہا تھا۔ فیری نے پکار کر اسے رکنے کے لئے کہا۔ مگر وہ چلا گیا۔

پھر میں پلٹا۔ میری نوعمر بیٹی بڑی غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر پوری طاقت سے ایک طمانچہ رسید کیا

"نظریں اٹھاتی ہے باپ کے سامنے"

پھر مجھ پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ میں نے اپنی بیٹی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور مسلسل طمانچے مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا

"زندہ گاڑ دوں گا مردود کو۔ اونچی آواز میں اٹھ کر شادی کرے گی اکبر کے ساتھ۔ بڑی انگریز کی بنی پھرتی ہے۔ ساری جنریشن گیپ آج پاٹ کے رکھ دوں گا۔ جانتی نہیں مسلمان کا بچہ ہوں میں بھی۔"

٭٭٭ (سیپ)

تنہائی کی ساتھی کتابیں ہوتی ہیں
سچی یونیورسٹی لائبریری ہوتی ہے

میں ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں

اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں ہر موضوع پر ذوقِ مطالعہ کی سیری کے لئے بغیر کسی نقد معاوضہ کے آپ ہر صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک اپنی پسند کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں، اخبار ماہنامے اور ہفت روزے بھی ہیں۔

اتوار

اور دوسری تعطیلات کو لائبریری بند رہتی ہے

دیال سنگھ پبلک لائبریری ٹرسٹ سوسائٹی راؤز ایونیو، نئی دہلی

آل انڈیا مشاعرہ دیوبند

کریمی الاحسانی

میلہ چودھویں دیوبند (اتر پردیش) کی تقریبات کے سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ترتیب دیا جاتا ہے۔ امسال مشاعرہ کی تاریخیں بدلنا پڑیں اور بمشکل تمام شعراء کرام نے ۲۰ر اپریل ۱۹۸۲ء خود ہی قطعی اور آخری تاریخ طے کی جب کہ ۱۸ر اپریل کو اور جگہوں پر مشاعرے ہو رہے تھے۔ اکثر شعراء کو ان میں بھی شرکت کرنی تھی۔ بیچارے اُردو کے دیوانے۔ اُردو کے ہمدرد۔ اُردو کے جاں نثار ——— جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ جامعہ اُردو کسی انجمن کا نام ہے۔ یا کسی بزرگ کے خانقاہ کا۔ اس کے تحت کیا کیا کام ہوتا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ہاں جن حضرات کی گلے کی شہنائی شباب پر ہے وہ سمجھتے ہیں جو دولت کمائی جاسکے کمالیں۔ اب وقت ہے ورنہ پھر کوئی نہیں پوچھے گا اور پھر ؎

بیٹھے رہیں گے چاند سی صورت لئے ہوئے

والا معاملہ ہوگا۔ یہ پیشہ ور شعراء اُردو کے بدترین دشمن ہیں ان سے اُردو زندہ کیا رہ سکتی ہے۔ یہ تو اپنے خاندان کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتے۔ ... انھیں کوئی واسطہ ہے نہ مطلب ——— کئی حضرات تو قوالوں اور گلوکاروں کی کمی پوری کرتے پھر رہے ہیں۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کتنے ہی خط تک نہیں لکھ سکتے۔ غزل کہنا یا لکھنا ——— یہ کہنے اور لکھنے کا فرق تک نہیں سمجھتے ——— خدا کی دین ہے اگر ہر کسی کو یہ دولت ودیعت کی جانے لگے تو رہے اللہ کا نام۔ یہ سودا۔ یہ نعمتِ بے بہا۔ یہ نور ہر دل ہر نظر کو کہاں مقدر!

۱۱ بجا چاہتے ہیں۔ توصیف صاحب کنوینر مشاعرہ صدارت کے لئے جناب ایس۔ ڈی ایم صاحب دیوبند کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں۔ اس پر تالیوں سے اظہار خوشنودی کیا جاتا ہے اور جناب بشیر بدر صاحب نے مائک سنبھال کر مختصر سی تقریر فرماکر خوش فکر، خوش گلو، خوش پوش شاعر ندرت نیازی امروہوی کو دعوتِ غزل دی ہے ندرت صاحب مشاعرہ کا آغاز نہایت دلکش اور شگفتہ ترنم سے فرما رہے ہیں ؎

پہلے خود کو جلائیگا سورج × پھر کہیں جگمگائے گا سورج

مطلع نوز علی نور ہے شہر علم غلاوب کا گہوارہ ہے سامعین سخن فہم اور ندرت صاحب کا شعلہ سا لپکتا ترنم سماں بندھ گیا ہے ارشاد ہوا ہے۔ ؎

زُلف لہرا کے مت چلو دن میں	راستہ بھول جائیگا سورج
بہتے پانی میں جھلک لینے دو	خود بخود ڈگمگائے گا سورج
میرے آنسو نہ پی سکا اب تک	یوں تو دریا سکھائیگا سورج
چل کے ندرت نواز کے گھر تک	جانے کس روز آئے گا سورج

ندرت صاحب تالیوں کی جھنکار میں شاداں پلٹ رہے ہیں ناظم بدر صاحب عجلت میں ندرت صاحب کو پڑھوا گئے ورنہ ان کا یہ مقام نہیں تھا مشاعرہ کا آغاز ماشاء اللہ خوب ہوا ہے۔ بدر صاحب حق کانپوری کو دعوتِ موسیقی دے رہے ہیں۔ حق صاحب مائک پر آتے ہی فرما رہے ہیں سر منڈاتے ہی اولے حالانکہ ان سے پہلے ندرت نواز غزل سنا گئے ہیں۔ پھر اس محاورہ کا غلط استعمال کیا معنی رکھتا ہے؟ لحن داؤدی میں غزل سرا ہیں ؎

پہچیا ذرا شعورِ نظر کر کے دیکھئے
دل میں کسی حسین کے گھر کر کے دیکھئے
اس زُلف خم بہ خم کو بھی سر کر کے دیکھئے
سنو دا مگراں ہے بات مگر کر کے دیکھئے
آساں نہیں ہے عشق محبت کا مرحلہ
اس کی ادا ادا پہ نظر کر کے دیکھئے

حق صاحب حقِ غزل ادا کرکے داد لوٹتے ہوئے جارہے ہیں یار لوگ ردیف پر خوب خوب معنی خیز مسکراہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اضافہ بدر صاحب دعوتِ غزل دے رہے

ظاہر رامپوری کو۔ فراز صاحب دلکشی حالیہ فن کا مظاہرہ فرما رہے ہیں۔ ؎

خود کو پڑھتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں × اک ورق روز موڑ دیتا ہوں

داد مطلع ہی سے شباب پر ہے اور آپ اسی بانکپن سے فرما رہے ہیں ؎

تجھ سے رشتہ ہے ریشمی رشتہ — کچے دھاگوں کو توڑ دیتا ہوں
کانپتے ہونٹ بھیگتی پلکیں — بات ادھوری ہی چھوڑ دیتا ہوں

پھر داد کا دریا کہ بہا ہے اور آپ کئی بار دہرا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں ادھر بلند صاحب حبیب عاصم دہلوی کو زحمت سخن دے رہے ہیں۔ عاصم صاحب غزل سرا ہیں ؎

کبھی تو جھوٹے سہاروں کا آسرا کر کے
کبھی لٹے کسی رہزن کو رہنما کر کے
ہزار زخم ملیں گے یہاں وفا کر کے
نہیں تو دیکھ لو اب تم بھی تجربہ کر کے
نہیں تو مل گئی اک لذت فراق مگر
زمانہ تجھ کو ملا کیا ہمیں جدا کر کے

عاصم صاحب داد وصول کر کے جا رہے ہیں اور مولانا حشمت علی انصاری مائک پر آکر اعلان فرما رہے ہیں میں دارالعلوم سے حاضر ہوا ہوں جتنے طلبا یہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ میری شکل ہی سے پہچان گئے ہوں گے۔ دارالعلوم ایک بین الاقوامی ادارہ ہے۔ تمام طلبا خاموشی سے سنتے رہیں اور کسی قسم کی کوئی بات نہ ہونے دیں وغیرہ۔ لیجئے بلند صاحب کسی رام پرشاد کومل کو یاد فرما رہے ہیں۔ کومل صاحب رواں دواں سنا رہے ہیں اور کہیں کہیں تقریر بھی شروع کر دیتے ہیں [illegible] یو۔پی میں سب کچھ ہوتا ہے۔ یہاں لیڈر پیدا ہوتے ہیں اور [illegible] اس طرح سنا رہے ہیں ع

کوچہ کوچہ بستی بستی بکھرے آگ لگانے والے لوگ

اسی ہنسی مذاق میں آپ جا رہے ہیں اور بلند صاحب فرما رہے ہیں اچھا غزل خود غزل کہنے لگی۔ اس غزل کو جب دیکھیں گے تو کیا ہوگا۔ ایک آواز ہے اور آپ ہیں شمع تمنائی۔ تمنائی یہ بار بار مسکرا رہے ہیں [illegible] نہیں۔ تمنا جمالی صاحب کی شاگردہ۔ شمع صاحبہ یوں لحن طلعت میں غزل سرا ہیں ؎

دُور تک حدِ نظر صحرا ہی صحرا ہوگا
کیا خبر تھی غمِ دوراں ترا حملہ ہوگا
میں تو پابند وفا ہوں مری فطرت ہے یہی
تیرا بخشا ہوا ہر غم میرا اپنا ہوگا
مرے دروازے کی زنجیر بجائی کس نے
دیکھنا پھر کوئی حالات کا مارا ہوگا

اس شعر کے پہلے مصرعہ پر داد قہقہوں سے دی جا رہی ہے اور برابر دہرا رہے ہیں اور میں دوسرے مصرعہ پر سوچ رہا ہوں یہ مصرعہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔ ع

ہو نہ ہو کوئی حالات کا مارا ہوگا

شمع صاحبہ محفل کو گرما کر مائک سے جدا ہو رہی ہیں۔ بلند مرغوں کا قبرستان وغیرہ نظمیں سنا کر ہلال رامپوری بھی چلتے بنے۔ لیجئے پھر غزل سماعت فرمائیے نسیم میرٹھی سے ؎

وہی ماہ حق کا طلبگار ہوگا — جو بہتے ہوئے بھی سردار ہوگا
وہ نظروں میں دنیا کو لاتا نہیں ہے — جو الفت میں تیری گرفتار ہوگا

نسیم صاحب بھی مناسب داد پا کر جا رہے ہیں اور اب تمنا جمالی محفل کا جائزہ لے کر یوں غزل سرا ہیں ؎

کون اپنا ہے اگر یہ کبھی سوچا جائے
آدمی رشتوں کے صحرا میں بھٹکتا جائے
اتنی حیرت سے تو شیشوں کے مکانوں کو نہ دیکھ
دیکھنے والے تری آنکھ نہ پتھرا جائے
تیرا جلوہ کہ نمایاں بھی ہے مستور بھی ہے
تجھکو محسوس کیا جائے کہ دیکھا جائے

پنڈال میں بھونچال سا آیا ہے کئی بار دہرا کر اسی سج دھج سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

اک ترے شہر میں بدنام تمنا ہم ہیں
دل میں جو آئے وہ الزام لگایا جائے

تمنا صاحب پنڈال کو نغمگی میں ڈبو کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اس عالم نغمگی میں اندر ہی اندر کا تقاضا تھا لیجئے [illegible] صاحب [illegible] بنا کر حسب عادت یوں شادمانہ ترنم سے الاپ رہے ہیں

ہیں ؎

کہیں بھی دفن کی نشانی نہیں ہے
یزیدوں کی بستی ہے پانی نہیں ہے

دوسرے مصرعہ پر حادثے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے۔ اور ہلال صاحب چیخ کر فرما رہے ہیں۔ اس مطلع کو گرمیوں بھر پڑھے جائیے۔ اور نور صاحب عالم رؤیا میں لہک رہے ہیں ؎

ہمیشہ ہمیشہ جواں ہی رہے گا
میرا دل ہے تیری جوانی نہیں ہے
ذرا شیخ صاحب سنبھل کر ہی پیجئے
چھلکتے گلاسوں میں پانی نہیں ہے

نور صاحب کئی لمبی غزلیں سنا کر داد و تحسین پا کر چلتے بنے دیکھا تو بدر صاحب خاموش غازیپوری سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ خاموش مدھم سروں میں زور آزمائی کر رہے ہیں ؎

عمر جلووں میں بسر ہو یہ ضروری تو نہیں
ہر شبِ غم کی سحر ہو یہ ضروری تو نہیں
وہ جسے سارے زمانے کی خبر رہتی ہے
اس کو اپنی بھی خبر ہو یہ ضروری تو نہیں
نیند تو درد کے بستر پہ بھی آ سکتی ہے
ان کے آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں

خاموش صاحب کا جب ترنم سے کام نہ چلا تو تحت سے غزل شروع کی اور خوب جمے اب ان سے پہلے کی طرح پڑھا نہیں جاتا ہے اور عمر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تحت ہی سے پڑھا کریں آپ جا رہے ہیں اور بدر صاحب ملک کے ایک ابھرتے شاعر راحت اندوری کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ راحت صاحب وہی سنا سنایا کلام گھن گرج کے ساتھ سنا کر محفل کو نعرہ بازی پر آمادہ کر رہے ہیں۔ آیئے آپ بھی سن لیجئے گا ؎

وہ شخص بھی ملا ہے سنہری لباس میں
جس نے کبھی کتاب نہ کھولی کلاس میں
پیاس اب کیسے بجھے گی ہم نے خود ہی کھول کر
میکدے کم ظرف لوگوں کے حوالے کر دیئے
چہروں کی دھوپ آنکھوں کی گہرائی لے گیا
آئینہ سارے شہر کی بینائی لے گیا
حالاں کہ بے زبان تھا لیکن عجیب تھا
وہ شخص مجھ سے چھین کے گویائی لے گیا
میں آج اپنے گھر سے نکلنے نہ پاؤں گا
بس ایک قمیص تھی جو مرا بھائی لے گیا

راحت صاحب خوب خوب گرج اور برس کر کامران جاتے ہیں اور بدر صاحب ہلال سیوہاروی کو دعوتِ طنز و مزاح دے رہے ہیں۔ ہلال صاحب فرما رہے ہیں ؎

تو دیش بھگت بھی تھا اور مجاہد بھی
یہ مرتبہ نہیں ہوتا ہے ہر کسی کے لئے
جو اپنے ملک کی خاطر جھکا تھا شملہ میں
وہ شخص جھک نہ سکا اپنی زندگی کے لئے

ایسا نظر آ رہا ہے کہ اب کچھ بھی نہیں سنا جائے گا ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے اور آپ خوب خوب داد وصول کئے اپنی جگہ ایک اور ایک اور کے شور میں آ رہے ہیں اور صاحب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب عطا فرما رہے ہیں ؎

ملے جو گلے کا یوں مسئلہ ہو گیا × جو پرانا تھا پھر سے نیا ہو گیا
دو بدن دوریاں کاٹ کر آ ملے × پھر دلوں میں عجب فاصلہ ہو گیا
آگ کے سرخ لب چومنے کی ہوس × کاغذوں کا بڑا حوصلہ ہو گیا
چاندنی جام ظلمات نے پی لیا × کونسا یہ نیا حادثہ ہو گیا

بدر صاحب بھی فرمائش کے شور میں اپنی جگہ آ کر پھر پنڈال پر وجدانی کیفیت طاری کرنے کے لئے دعوتِ غزل دے رہے ہیں مشہور خوش گلو شاعر ڈاکٹر ساغر اعظمی کو۔ ساغر صاحب یہاں محفل کو سرشار کرنے چلے ہیں ؎

اب کے موسم میں عجب سازشِ حالات ہوئی
شہر تپتے رہے صحراؤں میں برسات ہوئی
گھر گئے جلتے مکانوں کے دھوئیں میں سورج
سب یہی سمجھے کہ دن ڈھل گیا رات ہوئی
کس سے پوچھیں یہ لہو برسا کہ پانی برسا
لوگ بچوں کی طرح خوش ہیں کہ برسات ہوئی
موجِ طوفان سے الجھنا تو کوئی بات نہ تھی

میں یونہی ڈوب گیا یہ بھی کوئی بات ہوئی

ساغر صاحب کئی غزلیں سنا کر داد میں ڈوبے پلٹ رہے ہیں اور ایسا نظر آرہا ہے۔ یہ مشاعرہ عروج کی طرف پرواز کر رہا ہے اس عالم نغمگی میں بدر صاحب کے اس انتخاب کی داد دیجئے کہ وہ پروفیسر وسیم بریلوی کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں۔ وسیم صاحب نام سنکر یار لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیجئے وسیم مائک پر آگئے ہیں اور — السلام علیکم — ایک آواز بلند ہوئی — وعلیکم السلام — وسیم — ایک قہقہہ — اور اسی تفریح کے عالم میں آپ غزل سرا ہیں ؎

یہ کس کا ہاتھ ہے پھر کاٹ کیوں نہیں دیتے
جو سارے شہر کی شمعیں بجھائے دیتا ہے

داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ اسی اعتماد کے ساتھ الاپ رہے ہیں ؎

یہی چراغ تری تیرگی کا ساتھی تھا
جسے تو صبح کی خاطر بجھائے دیتا ہے

وسیم ذہن کی خودداریاں بھی کیا شے ہیں
بُرا سا لگتا ہے جب کوئی رائے دیتا ہے

وسیم صاحب داد لوٹتے اپنی جگہ آرہے ہیں۔ اور بدر صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ عالم فتحپوری سے۔ عالم صاحب تالیوں کے شور میں مائک پر آکر یوں گرج رہے ہیں ؎

بہار خون کی مہندی لگا کے آئی ہے
یہی ہے رنگِ چمن تو چمن کی خیر نہیں
اٹھا ہے سبزۂ پامال لے کے انگڑائی
تمہارے چمن کے گل و یاسمن کی خیر نہیں
ہوائیں تیز ہیں طوفان آنے والا ہے
چراغ بجھنے لگے انجمن کی خیر نہیں

عالم صاحب بھی شادماں پلٹ رہے ہیں اب مشاعرہ انتہائی عروج پر ہے اور اب صرف دو شاعر باقی ہیں ظاہر ہے رات کا آخری حصہ سرکنے کو ہے یار لوگ بھی تھک سے گئے ہیں بلکہ کتنوں ہی پر غنودگی طاری ہے۔ اب بیکل اتساہی اور فنا نظامی کے لئے ہمہ تن گوش اور محوِ انتظار ہیں لیکن اناؤنسر کی ضد اور زیادتی ملاحظہ ہو کہ اس وقت آپ کے کریکٹر احسانی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جیسے بھی ہو سنائیے ہر چند کہ معذرت خواہ ہوا۔ مگر ایک نہ سُنی گئی اور آج مجھے بھی تفریح میں اڑا دیا دیا گیا۔ جبکہ میں سنانے کے نام ہی سے گھبراتا ہوں ویسے اب سامعین بیکل و فنا کو سنا چاہتے تھے لہٰذا میں ایک قطعہ اور دو ایک شعر سنا کر پلٹ آیا جس مشاعرہ میں مجھے پڑھوایا نہیں جاتا میں خوش ہوتا ہوں میرے لئے یہی سزا کیا کم ہے کہ پورا مشاعرہ قلمبند کر کے اہلِ ذوق حضرات کے سامنے پیش کر کے اس کو تاریخی بنا تا ہوں۔ آئیے اب ان سے سُنئے اور لطف اندوز ہوجئے جنہیں الحاج بیکل اتساہی کہتے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

یوں تو کہنے کو تری راہ کا پتھر نکلا
تو نے ٹھوکر جو لگادی تو مرا سر نکلا
گھر کے گھر خاک ہوئے جل کے ندی سوکھ گئی
پھر جو ان آنکھوں میں جھانکا تو سمندر نکلا

پنڈال انگڑائیاں سی لیتا نظر آرہا ہے ایک نغمگی کا عالم اور آپ بے حال کرنے پر اُتر آئے ہیں ؎

پتوار کاغذی ہے تو بہتی کی ناؤ ہے
ہیں اس ندی میں جس کا ہوا میں بہاؤ ہے
للّٰلہ اب نہ فرقہ پرستی کو کچھ کہو
اس شوخ سے ہمارا پرانا لگاؤ ہے
بارود بو رہی ہے گلابوں کے کھیت میں
فصلِ بہار تیرا عجب رکھ رکھاؤ ہے
کل رات ان کو دیکھا تھا اُمدو لباس میں
کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ اگلا چناؤ ہے

بیکل صاحب کلام سنا کر محفل کو چونکا کر تالیوں کے بیچ شور میں جا رہے ہیں اور ادھر بدر صاحب جناب فنا کانپوری کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں۔ فنا صاحب ایک غزل بوڑھے ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

دو گھونٹ کا اے ساقی الزام نہیں لونگا
میں تشنہ لبی لیکر اک جام نہیں لوں گا

اے چمن والو رکھ لو یہ تحفۂ گل اپنا
مجھکو میرا حق دیدو و انعام نہیں لونگا

دکے شعر میں فرما رہے ہیں یہ شعر اہل علم کی خدمت میں پیش کر
رہا ہوں میں سب کو اہل علم نہیں سمجھتا۔ یہ دیوبند ہے یہاں آکر
اہل علم ہی بنتے ہیں اور پھر حضرت سعدی بھی کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست
باشد کہ پلنگ خفتہ باشد

لیکن فنا صاحب کی غلط فہمی کا کیا جواب ہو سکتا ہے ارشاد
ہوا ہے ؎

بے ترشا ہوا پتھر کافی ہے پرستش کو
پھینکے ہوئے کعبہ کا اصنام نہیں لونگا

خیر یہ اپنے اپنے ذوق اور مذاق کی بات ہے۔ ہوا چاند کے پنڈال
سے لوٹ رہا ہوں باہر کیمپ میں شعراء یار دوستی میں مصروف
ہو گئے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا ہوں بمشکل تمام
توصیف احمد صاحب اس مشاعرہ کے اختتام کا اعلان فرما
رہے ہیں ادھر یار لوگ اٹھنے کا نام نہیں لے رہے ہیں
امسال پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اس قدر ہجوم
تھا کہ کئی بار پنڈال سے باہر جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا
سامعین کا اتنا عظیم جم غفیر شاید اس مشاعرہ میں نظر
نہ آیا ہو!۔

جناب محترم بابائے دیوبند مولانا محمد عثمان صاحب
ایم۔ ایل۔ اے کی کمی محسوس کی جاتی رہی۔ جناب مولانا اعجاز
قاسمی توصیف صاحب اور اراکین میونسپل بورڈ مبارکباد
کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حسب روایت شعراء کرام کی
خاطر مدارات کی اور وہ شعراء جو بن بلائے آ دھمکے اور کنوینر
صاحب کی پریشانی میں اضافہ کیا ان کے بارے میں آپ
سوچئے۔ میں اجازت چاہوں گا۔

السلام علیکم!

غزل

طاہر تونسوی

۱۱ جون ۱۹۷۹ء کی شام کو ادارۂ شان ہند نے جناب
طاہر تونسوی کو دفاتر "شمع" میں استقبالیہ دیا۔ جناب طاہر تونسوی
نے حسب ذیل غزل اس موقع پر سنا کر خوب خوب داد پائی۔
(ادارہ)

زمیں سرد تھی لاوا مگر ابلتا تھا
مرے شعور میں چاہت کا دیپ جلتا تھا

تمہاری کھوج میں چھانا تھا میں نے گھر اپنا
میں پانیوں میں بھی گھر کے مگر پیاسا تھا

ہوائیں گرچہ اڑا لے گئی تھیں راکھ مری
مرا وجود بکھر کے تمہیں کو تکتا تھا

تمہاری ذات پہ دہشت تھی اپنے سائے کی
تمہارے قرب سے مرا بھی رنگ پیلا تھا

میں ڈوب جاتا تری آنکھ کے جزیرے میں
تو خود ہی یاد کے آنگن سے بھاگ نکلا تھا

میں خواہشات کے میلے میں ساتھ تھا سب کے
بدن کی جھیل سے نکلا تو خود بخود ننگا تھا

میں اس کا ساتھ سفر میں کہاں کہاں دیتا
وہ بیٹھ کر ہی مرے قد سے پھر بھی اونچا تھا

مرے لہو سے رقم تھے اگرچہ سب قصے
تمام شہر میں پھر بھی [illegible] کا چرچا تھا

تری تلاش میں طاہر جہاں جہاں بھی گیا
عجیب خوف نے دیوار بن کے روکا تھا

جنتا انتظامیہ کے دو سال

ہمہ جہت ترقی کی سمت میں ٹھوس قدم

ہریجنوں اور کمزور طبقوں پر سب سے زیادہ توجہ

- ہریجن اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ۷۷-۱۹۷۶ء کے ۴۳ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۱۰۴ لاکھ روپے اور پہلی بار ۲۷ ہریجنوں کو بسیں خریدنے کے لئے اقتصادی امداد اور بس کا مالک بنانا۔
- نو آباد کالونیوں، شہر ہائے گاؤں، غیر منظور شدہ بستیوں، کٹڑوں اور جمنا پار کی ۵۵ فیصد سے بھی زیادہ آبادی کو پہلی بار زندگی کی بنیادی سہولتیں فراہم کرنا۔
- ۴۶۵ مزدوروں کو کرایہ خرید پر مکان مہیا کرنا۔
- گاؤں کے فروغ پر ۲۶ کروڑ روپے خرچ۔ ایک سال کے اندر ہر گاؤں میں پینے کا پانی دینے کیلئے گیارہ کروڑ روپے کی سکیم۔ گزشتہ ۳۰ برسوں میں ۲۵ گاؤں کو یہ سہولت حاصل ہو سکی ہے۔ اسی طرح پہلی بار گاؤں کا لال ڈورا بڑھایا گیا۔
- دو لاکھ لوگوں کو کام مہیا کرانے کیلئے کئی صنعتی بستیوں کی تعمیر و تشکیل۔ جن گھروں میں کوئی بھی کام پر نہیں لگا ہے۔ ان میں کم سے کم ایک کو کام پر لگانے کیلئے انقلابی سکیم۔
- ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک مکمل طور پر نشہ بندی نافذ کرنے کے سلسلے میں مؤثر اقدامات۔
- دور دراز کی کالونیوں اور گاؤں میں گھر کے نزدیک طبی سہولیات مہیا کرنے کی اسکیم کے تحت ۵۰ بستروں والے دو اور ۱۰۰ بستروں والے سات اسپتالوں کی تعمیر کی سکیم۔
- ڈھائی لاکھ بچوں کو تغذیہ بخش غذا اور دوپہر کا کھانا ۔ ۲۰۰۰۰ بچوں کو وظیفہ ہر غریب بچے کو مفت وردی اور کتابیں ۱۶۵۰۰ نوجوان لڑکے و لڑکیوں کو ۱۶ اداروں میں پیشہ ورانہ تعلیم۔ صرف قابلیت کی بنیاد پر داخلہ ۱۰۰ – ۱۰۰ آنگن واڑیوں کی ۷ اسکیموں کے تحت ایک لاکھ بچوں اور ماؤں کو تعلیم، تغذیہ بخش غذا اور طبی سہولیات۔
- پہلی بار دلی میں ایک سال میں ۱۱۰۰۰ مکان تیار ہوئے اور اس سال ۲۰۰۰۰ مکانوں و ۲۲۰۰۰ بشمول سروسز پلاٹوں کی تعمیر کی سکیم ۔ ۸۰ فیصد مکانات کم آمدنی اور اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کیلئے۔
- پانچ سال میں ۵ء۷ لاکھ لوگوں کو حروف شناس بنانے کی اسکیم۔

آئیے ہم سب اپنے ملک کی راجدھانی کو دنیا کی خوبصورت اور مکمل شہری سہولیات مہیا کرنے والی راجدھانیوں میں سے ایک بنانے کے لئے عہد کریں۔

جاری کردہ:۔ محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلّی انتظامیہ۔ دلّی

ایم۔ عبدالماجد

کوئی نہیں آئے گا

خالدہ بار بار بڑھتے کے جھرنوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی وہاں سب کچھ تھا لیکن جس کی اسے تلاش تھی جس کو اس کی نظریں ڈھونڈ رہی تھیں اس کا نام و نشان نہ تھا۔ آج تک حامد نے ایسا نہ کیا تھا وہ ہمیشہ اپنے وعدے پر پورا اترا اور یہی تو وہ حقیقت تھی جس نے خالدہ کے دل میں حامد کے لئے بے پناہ خلوص بھر دیا تھا۔

کتنی ہی بسیں گزر چکی تھیں، کتنے ہی چست لباس میں ملبوس نوجوان اس کا طواف کر چکے تھے، بعض نے تو یہ طواف کئی بار کیا تھا اس کے کانوں میں بعض طنزیہ فقرے بھی پڑے تھے۔ کئی کاریں اس کے قریب آ کر اپنی رفتار کھو بیٹھی تھیں، کئی اسکوٹروں کا پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ سائیکل سوار تو اسے ایسے دیکھ کر گزر رہے تھے جیسے وہ عورت نہیں، حلوائی کی دکان پر تھال میں پڑا ہوا اندرسے کا حلوہ ہو۔ لیکن خالدہ کو کسی کی پرواہ نہ تھی۔ اس کے نزدیک تو یہ سب ایسی گدھیں تھیں جو جھپٹنے کے باوجود رات کو خالی پیٹ سویا کرتی ہیں۔

اسے تو حامد کا انتظار تھا۔ حامد نے آخری ملاقات پر کہا تھا کہ پیر کو مجھے اسی اسٹاپ پر ضرور ملنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ آج کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ جو حامد وعدے کے باوجود ابھی تک نہیں پہونچا اور اس کا دل حامد کے لئے دعا کر رہا تھا۔ آخری ملاقات جمعہ کے روز اسی اسٹاپ پر ہوئی۔ اگرچہ آخری ملاقات قدرے خوشگوار نہ تھی۔ وہ اس لئے کہ آخری ملاقات پر اس نے خالد کو صاف صاف کہا تھا کہ وہ ان لایعنی ملاقاتوں سے تنگ آ گئی ہے اس کے دل میں پیار کی لگن اب ختم ہو گئی ہے کیونکہ اس پیار سے وہ اتنی مایوس ہو چکی ہے کہ اسے ہر جانب سیاہی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا اور پھر اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ:-

سچ پوچھو تو حامد میں تمہیں چاہتی ہی نہیں۔ بلکہ میں تمہیں چاہ ہی نہیں سکتی۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہارا پیار ایک ایسے جذبے کی پیداوار ہے جس کے پیچھے خلوص ہی خلوص ہے اور میں آج تک تمہیں اسی لئے ملتی رہی کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ دگرنہ میں نے اپنے اندر تمہیں ملنے کی کبھی کوئی تحریک نہ پائی۔ تمہیں دکھ تو ہوگا اور دکھ مجھے بھی ہے۔ لیکن میں اس کھیل کو زیادہ دیر جاری نہیں رکھ سکتی۔

اس نے ایک ہی سانس میں نہ جانے کتنے فقرے کہہ ڈالے تھے۔ سکینہ نے اسے جو کچھ بھی سمجھایا تھا اس نے اگل دیا۔ حامد کچھ دیر تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا اس کے چہرے کو گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ پیلے پتوں کی طرح زرد پڑ گیا اور خالدہ کو یوں محسوس ہوا جیسے حامد کی روح ابھی قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی۔

سکینہ نے اسے ایسا کیوں کہا تھا اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا اس نے حامد کا دل توڑ دیا ہے۔ لیکن اس میں سکینہ بے چاری کا کیا قصور تھا؟ اس نے تو خود اس سے کہا تھا کہ وہ اب حامد سے تعلقات کو زیادہ دیر برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اس کے [illegible] کیونکہ اس کے والدین نے اس کے لئے رشتہ ڈھونڈ [illegible] باہمت کیوں ذہن جائے۔ والدین کی اس خواہش کو [illegible] اور نہ ہی انہیں اس خواہش سے باز رکھ سکتی ہے اس لئے نہیں کہ اس کے والدین حامد کو پسند نہ کرتے تھے اور حامد [illegible] طور پر ایک پست نوجوان تھا اس لئے بھی نہیں کہ حامد کی مالی حالت قدرے پتلی تھی کیونکہ اگر انہیں دولت ہی تلاش کرنی ہوتی تو خالدہ کے ہاتھ کب کے پیلے ہو چکے ہوتے۔ انہیں قرآن کا انتہائی قریبی بھی تھا اور اس کے پاس کار، اسکوٹر، کوٹھی، بینک بیلنس سبھی کچھ تھا لیکن اس کے باوجود خالدہ کے ابا نے اس رشتے کو ٹھکرا دیا تھا کیونکہ [illegible] انہیں ایک اخلاق باختہ [illegible] وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔

جس طرح انہیں خالدہ کا خود [illegible] تھا۔ حامد کچھ عرصے سے [illegible] بھی اسی لگن تھا اور ان دونوں خاندانوں کے تعلقات بھی آپس میں [illegible] خوشگوار تھے لیکن ایک [illegible] ان دونوں [illegible]

ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ گھر کا ایک ایک فرد اس حادثے سے متاثر تھا اگر کسی نے اس حادثے کا اثر قبول نہ کیا تو وہ خالدہ اور حامد ہی تھے۔ خالدہ خود حیران تھی کہ آخر وہ کیوں ابھی تک اپنے آپ کو اسی خاندان سے متعلق رکھے ہوئے ہے۔ محسن اس کا بھی تو بھائی ہے۔ محسن کو اگر حامد کی بہن کا رشتہ نہ مل سکا تو یہ محض محسن کی توہین ہی نہیں بلکہ اس کی اور اس کے خاندان کی بھی ہے۔ اسے محسن حامد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

اس حادثے سے خالدہ کے ابا سب زیادہ متاثر ہوئے اور انہوں نے کچھ ہی دنوں بعد ایک اچھا سا رشتہ تلاش کر کے محسن کا بیاہ رچا لیا۔ اس طرح اپنی زخم خوردہ انا کو تسکین دے لی۔ اس سارے حادثے میں خالدہ کے لئے اطمینان کا صرف ایک پہلو تھا اور وہ یہ کہ حامد [illegible] بھی تو اس حادثے کو روک نہ سکا تھا۔ اور پھر حادثات بھی کبھی رکے ہیں؟

اسے خواہ خالدہ کا جذباتی پن کہہ لیا جائے یہی وہ نکتہ تھا جس نے خالدہ کو حامد سے متنفر ہونے سے بچا لیا بلکہ یہی وہ موڑ تھا جس نے یک لخت خالدہ کے دل میں حامد کے لئے بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا تھا اور وہ اس طرح حامد کی طرف بڑھ آئی تھی کہ حامد کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

حامد خالدہ کو ایک عرصے سے چاہ رہا تھا وہ حامد کی اس چاہت سے آگاہ بھی تھی لیکن اس نے حامد کی مخلصانہ چاہت کو کبھی سراہا نہ تھا اگر سراہا ہوگا تو دل ہی دل میں۔ بہرحال حامد کے ذہن میں ہمیشہ یہی بات رہی کہ خالدہ اگر اس سے نفرت نہیں کرتی تو اسے چاہتی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے جب بھی خالدہ کی جانب پیار کا ہاتھ بڑھایا اس نے جھٹک دیا اور حامد ایک ایسے احساس کو گود میں آن گرا جس نے ہمیشہ کے لئے اس سے اس کی خود اعتمادی چھین لی۔ وہ مہینوں پریشان رہا۔

خالدہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ یہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ حامد نے جب بھی خالدہ کے اس رویے کے متعلق ذہن میں سوچا اور اپنے دل کو اس سوچ میں شامل کیا وہ اس نتیجے پر پہونچا کہ خالدہ کا ماحول کچھ اس قسم کا ذہنی سا ہے کہ وہ پیار محبت کی دنیا بسا ہی نہیں سکتی وہ صرف بیوی بن سکتی ہے اس لئے کہ اس نے جب بھی خالدہ کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اسے بیوی بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے تو اس نے کبھی ناراضی کا اظہار نہ کیا بلکہ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہو جاتی جو اطمینان اور خوشی کا مظہر ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ حامد مطمئن تھا وہ تو اسے بیوی بنانا چاہتا تھا خالدہ کو چونکہ حامد کے لئے یہ بات نہایت آسان دکھائی دیتی تھی اس لئے

اس نے حامد کی کبھی حوصلہ افزائی نہ کی۔ اس کے خیال میں ایسے ہوئے ایک تو اس کی ذہنی حس آسودہ تھی اور دوسرے وہ حامد کے پیار کو آزمانا بھی چاہتی تھی۔

لیکن اس حادثے نے تو اس کے ذہن کے تمام نقشے کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا۔ اس کے خیال کی دنیا کو بالکل اجاڑ دیا۔ اسے زندگی میں ایک ایسے خلا سے سامنا ہوا کہ وہ اس کے بھیانک پن سے گھبرا گئی۔ اور اس کے سامنے صرف ایک راستہ رہ گیا وہ فی الحال حامد کی بیوی بننے کی خواہش سے دستبردار ہو جائے اب وہ حامد کو کافی آزما بھی چکی تھی۔ حامد اس کے خیال کو پچھلے کئی سالوں سے مسلسل اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے تھا اس حادثے نے حامد کے دل و ذہن پر اس سے بھی گہرا اثر کیا تھا اسی وجہ سے حامد کے ساتھ اس کی ہمدردی اور بھی بڑھ گئی۔ وہ حامد کو ماضی اور مستقبل کی طویل جدائی کا صلہ دینا چاہتی تھی۔

وہ صبح کتنی حسین تھی اور وہ لمحہ کتنا دلفریب تھا جب اس نے خود ہی حامد کو اپنا سب کچھ تسلیم کر لیا اس لمحے کی عظمت حامد کے نزدیک جتنی زیادہ تھی شاید ہی کسی اور کے نزدیک ہو۔ بلکہ شاید ہی کوئی اس عظمت سے واقف ہو۔ چنانچہ کئی روز تک حامد اپنے آپ کو ایک نشے کی کیفیت میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا رہا اور جب وہ اس کیفیت سے باہر آیا تو اسے لوں لگا جیسے وہ بہت آگے بڑھ گیا ہے خالدہ اور حامد کی ملاقاتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شب و روز کی بساط پر پھیلا ہوا تھا بارش ہو یا آندھی سردی ہو یا دھوپ، انہوں نے بہرحال ایک دوسرے کو روزانہ ملنا تھا۔ خواہ یہ ملاقات ایک لمحے پر پھیلے اور خواہ یہ ملاقات کئی گھنٹوں پر محیط ہو جائے۔ خالدہ بی اے کے بعد بی ایڈ یا ٹریننگ حاصل کر رہی تھی اس لئے اسے حامد سے ملنے کے خاصے مواقع میسر تھے۔ حامد نے بھی ایم اے میں داخلہ لے رکھا تھا۔ اسے ایک دو جگہ جز وقتی کام بھی کرنا ہوتا لیکن خالدہ سے ملنے میں نہ تو وہ اپنی ملازمت کو حائل ہونے دیتا اور نہ ہی اپنی تعلیم کو۔ خالدہ کا مقام ان دونوں سے افضل تھا۔ چنانچہ جب بھی خالدہ سے ملنے کا وعدہ ہوا وہ اپنے وعدے پر پورا اترا خواہ اسے اس ملاقات کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑتی۔

وہ ہنسی خوشی زندگی کے دن گزار رہے تھے کبھی کبھی آپس میں ناراضگی بھی ہوتی لیکن پھر ایک دوسرے کو منا لیتے کبھی حامد خالدہ

و راضی کر لیتا۔ کبھی خالدہ حامد سے معافی مانگ لیتی۔ ویسے زیادہ تر حامد کو ہی خالدہ کو منانا پڑتا۔ حساس تو حامد بھی تھا لیکن خالدہ حامد سے بھی زیادہ حساس واقع ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو وہ بہت زیادہ محسوس کرتی تھی۔ اور گھنٹوں ان کے متعلق سوچا کرتی۔ اصل میں وہ پیار تو کرتی تھی لیکن اس کا ذہن اس بات سے مطمئن تھا کہ اس کا یہ عمل مذہبی نقطۂ نظر سے بھی درست ہے کہ نہیں۔ حامد نے اسے کئی دفعہ سمجھایا تھا کہ مذہب کی روح ہی پیار ہے اور اس نے حامد کی بات تسلیم بھی کر لی تھی۔ لیکن مذہب اس قسم کے پیار کی اجازت نہیں دیتا۔ حامد ہمیں اس طرح ایک دوسرے سے ملنا نہیں چاہئے،، اس نے کئی بار حامد کو یہ بات کہی اور حامد کی آنکھوں میں پھیلی ہوئی مایوسی کو دیکھا اور خود بھی مایوس ہو گئی اور اس مایوسی سے چھٹکارا پانے کے لئے اس بحث سے ہی کنارہ کر لیا اور زندگی کے حسین ترین خوابوں میں کھو گئی۔

اسے اس بات سے انکار نہیں تھا کہ حامد ایک ایسا لڑکا ہے جسے پیار ملنا چاہئے۔ حامد اس کے لئے زندگی کا سب کچھ پا لینے کو تیار ہو سکتا ہے اور وہ بھی اگر سکون کی کوئی کرن تلاش کر سکتی ہے تو وہ حامد ہی کے پاس ہے۔ حامد سے زیادہ اسے کوئی نہیں چاہ سکتا لیکن تعلقات کی اس روش سے وہ مطمئن نہ تھی۔ وہ روز چوری چھپے ملتے تھے اول تو ملنا بذاتِ خود قابلِ اعتراض بات تھی گو حامد رشتے میں اس کا چچیرا ہی تھا لیکن جب چچیرے ممیرے جوان ہو جائیں تو پھر غیر ہی ہوا کرتے ہیں، پھر ان کے خاندانی تعلقات میں بھی رخنہ پڑ چکا تھا۔ خدانخواستہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو اس کے باپ کی عزت کا کیا بنے گا؟ اس کے بھائی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے اور اگر کوئی نہ دیکھے پھر بھی کوئی نہ کوئی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ بالکل بچپن سے یہ بات اس کے ذہن میں بٹھائی گئی تھی اور اس کا والد جو ایک کٹر مذہبی انسان تھا کئی بار اس کا اعادہ اس کے سامنے کر چکا تھا۔ وہ اور کسی کو نہیں تو اپنے باپ کو تو دھوکہ دے رہی تھی۔ وہ جب کبھی یہ سوچتی اپنے آپ سے باغی ہو جاتی اور قسم تک کھا بیٹھتی کہ اب وہ حامد سے نہیں ملے گی لیکن ایسی کتنی قسمیں تھیں جو وہ توڑ چکی تھی، ایسے کتنے وعدے تھے جو وہ اپنے آپ سے کرنے کے بعد بھول چکی تھی کیونکہ جس طرح وہ حامد کی کمزوری تھی حامد بھی اس کی کمزوری بن گیا تھا۔ [illegible] ذہن پر بری طرح سوار تھا۔ اٹھتے

بیٹھتے حامد کا خیال سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا۔ وہ اس خیال کو بھولنا چاہتی مگر اس کے خیال میں کھو کر اپنے آپ کو بھولتی جا رہی تھی۔

سکینہ اس کی سہیلی بھی تھی اور رازدار بھی۔ لڑکیوں کی سہیلیاں بہت ہوا کرتی ہیں مگر رازدار کم۔ اس لئے سکینہ کو اس کی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سکینہ نئی نئی اس کی سہیلی بنی تھی اور وہ شاید اس کی سہیلی نہ بنتی اگر وہ بھی اپنے دل پر ایک داغ لئے ہوئے نہ ہوتی۔ اس کا چاہنے والا ولایت بیٹھا نہ جانے کیا کر رہا ہوگا مگر یہ پچھلے تین سالوں سے اس کی یاد کو اپنے دل کے مندر میں بسائے ہوئے تھی۔ اس نے شروع شروع میں کچھ خط بھیجے تھے لیکن اب ایک عرصے سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی منقطع تھا۔ سکینہ دو تین خط لکھ چکی تھی مگر ولایت سے ایک کا بھی جواب نہ آیا۔ وہ اکثر پریشان سی رہتی تھی۔ اس کی پریشانی نے تو خالدہ کے اس خیال کو پختہ کر دیا کہ یہ لڑکی بھی اپنے دل پر کوئی زخم رکھتی ہے۔ اس زخم کو آسودہ کرنے کی خاطر دونوں ایک دوسرے کو قریب لے آئی۔ اور وہ ایک دوسرے کی گہری سہیلیاں بن گئیں۔

خالدہ اپنی ملاقاتوں کی ایک ایک تفصیل سکینہ کو بتاتی، اپنے دل کا سب وہم اجاگر کرتی۔ حالات کے جتنے بھی موڑ کاٹ آئی تھی سب سے اس نے سکینہ کو آگاہ کیا تھا۔ سکینہ جانتی تھی کہ حامد خالدہ کو اتنا زیادہ چاہتا ہے کہ بہت کم لوگ اپنے پیار میں اتنے مخلص ہوتے ہیں، اس نے بھی تو پیار کیا تھا لیکن وہاں معاملہ الٹ تھا۔ جس شدت سے اس نے اپنے محبوب کو چاہا اتنی شدت سے اسے نہ چاہا گیا۔ پیار نہ پا سکا تو نتیجہ مختصر یہ کہ [illegible] کی وہ [illegible] ایک سمندر کی طرح اس [illegible] سامنے تھا [illegible] اور پھر اس کا محبوب ولایت جاتے وقت اس سے مل کر بھی نہ گیا۔ یہ تو اچانک اسی کے ایک دوست نے بتایا تھا کہ وہ چلا گیا ہے۔ اگرچہ اپنے خطوں میں اس نے اس سے روانگی کے کئی بہانے تراشے تھے۔ اور اس نے دل سے اسے معاف بھی کر دیا تھا لیکن اب وہ خطوں کے جواب نہیں دیتا تھا۔ شاید اس نے کسی نیلی آنکھوں والی لڑکی سے دل لگا لیا ہوگا مگر نہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے وہ تو بہت ہی اچھا ہے .... اس نے کبھی بھی اپنے آپ کو اپنے محبوب سے باغی نہ پایا۔

خالدہ حامد کی محبت کی کہانی سن کر اسے ایک اور [illegible] وہ یہ سوچتی آئی تھی کہ عورت اپنے محبوب کے لئے آنسو بہانے کے لئے [illegible]

مردوں کا پیار کساتی اور سطحی ہوا کرتا ہے وہ جب سامنے آتے ہیں تو بہروپیے
بن جاتے ہیں اور جب نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں تو اپنے اس بہروپ
تک کو بھول جاتے ہیں اور ایک نیا بہروپ دھار لیتے ہیں لیکن یہاں معاملہ
اُلٹا تھا۔ حامد خالدہ کے لئے تمام عمر آنسو بہا چکا تھا ایک عرصے سے اس
کے پیار میں جل رہا تھا۔ اس کے لئے زندگی تک قربان کرنے کو تیار تھا۔
اس قسم کے پیار کا تجربہ بالکل نیا تھا مردوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے
خالدہ کو قریب سے اگر یہ معلوم ہوا کہ مرد کا دل بھی کسی کے لئے دھڑکتا ہے
کتنی عظیم حقیقت ہے وہ آج تک نا بلد رہی' خالدہ سکینہ کو بتاتی کہ وہ
حامد سے پیار تو ضرور کرتی ہے لیکن چونکہ اسے یقین ہے کہ وہ ایک
دوسرے کے نہ ہو سکیں گے۔ اس لئے وہ اس سلسلے کو زیادہ عرصہ
جاری رکھنے کے حق میں نہیں لیکن جب وہ حامد کے اترے ہوئے چہرے
کو دیکھتی ہے تو حالات اس کے سامنے سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور وہ اس
کا ہاتھ تھام لیتی۔ حامد بھی اسے انتہائی چاہتا ہے۔ خالدہ نے اس کا کئی دفعہ
دل کو دکھایا لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں میں اپنے لئے پیار ہی پایا "تم ہی بتاؤ
سکینہ! میں کیا کروں؟" انتہائی مایوسی کی حالت میں وہ پوچھتی

جب سے وہ حامد کی اس کیفیت سے واقف ہوئی تھی اسے اپنے پیار
کی طرف سے ایک قسم کا سکون مل گیا تھا اگرچہ یہ سکون منفی تھا لیکن چونکہ
حامد ایک مجبور تھا [illegible] ولایت میں پڑھے خواہ اس کے ملک میں اس کے
لئے کچھ عظمت تھا [illegible] مرد اسے تڑپا رہا تھا ایک ہو کو وہ تڑپتا ہوا دیکھ
[illegible] یہ دیکھ اس تڑپ کی کسی حد تک تلافی کرنے کے لئے کافی تھی
[illegible] اور یہ سوچ کر اس نے خالدہ کو کتنا خوش کر دیا اگر تیرا دل نہیں مانتا تو
[illegible] صاف حامد کو جواب کیوں نہیں دیتی؟ سکینہ جب سے خالدہ سے
ملی تھی اور دونوں کے درمیان رازداری قائم ہوئی تھی خالدہ کے ذہن
پر والدین کی عزت کا بھوت ایک دفعہ پھر سوار ہو گیا تھا۔ حامد آج تک یہ
سمجھ [illegible] خالدہ کو بھی کبھی بس یونہی سا دورہ پڑتا ہے اور یہ دورہ
کسی [illegible] جب انسان مایوس ہو تو اس کی طبیعت میں
قنوطیت اور یاسیت ابھر آتی ہے لیکن یہ دور عارضی ہوتا تھا۔ [illegible] وہ اس
میں ملتے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال لیتے تمام مایوسی اور قنوطیت ختم ہو جاتی
اور وہ ایک ایسی دنیا میں جا پہنچتے جہاں خوشیاں اور بہاریں ہوا
کرتی ہیں جہاں کبھی کسی کی آنکھ نہیں چھلکتی، کبھی کسی کا دل نہیں جلتا
کبھی کسی کو احساس نہیں ہوتا کہ یہ ملاقات بھی ختم ہو جاتی اور [illegible] کی

ملاقات کا وقت مقرر کرکے وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے۔
خالدہ کی شادی کی بات پکی ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس نے حامد کو اس
سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ کرتی بھی کس منہ سے؟ لیکن اس کے ساتھ ساتھ
اس کا حامد سے ملنا بھی عجیب سا لگتا تھا وہ جب بھی حامد سے ملتی اس کا
ذہن منوں بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہوتا تھا وہ ایک ایسی ذہنی کشمکش میں مبتلا
ہوتی جسے حامد کی آنکھیں فوراً پڑھ لیتیں۔ حامد اگر پوچھنے کی کوشش بھی کرتا تو
وہ بڑی صفائی سے ٹال جاتی اور حامد سب کچھ یہ سمجھتے ہوئے بھی [illegible] زرد
زرد تھا۔ سکینہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے سامنے خالدہ اپنے ذہن کا سارا بوجھ
اتارتی اپنی مجبوریوں کی تمام کتھا بیان کرتی۔ حالات کے ہر اونچ نیچ سے
آگاہ کرتی، وہ اپنے محبوب کو بھی خالدہ ہی کی طرح مجبور سمجھ کر معاف کر دیتی
لیکن حامد کو معاف نہ کرتی اور خالدہ کو سمجھاتی کہ اب تیرا حامد سے ملنا
بالکل ہی غیر واجب ہے اگر تیرے سسرال والوں میں سے کسی نے بھی دیکھ
لیا تو کیا بنے گا؟" تو صاف صاف اسے کیوں نہیں کہہ دیتی کہ جب
ہم ایک دوسرے کے ہو نہیں سکتے تو ان ملاقاتوں کا حاصل بھی کیا
مرد تو ہوتے ہی مخلص کیوں نہ ہوں تصوں میں عورت کی زندگی تباہ کر دیتے
ہیں" وہ سکینہ کی باتوں سے اتنا متاثر تھی کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت
سکینہ کے پاس گزارنا چاہتی، سکینہ کے قرب میں اسے ایک خاص قسم کی
آشتی ملتی تھی سکینہ یقیناً اس کی ہمدرد تھی اس لئے کہ سکینہ کو جتنا اس کے
مستقبل کا خیال تھا شاید ہی کسی اور کو ہو، بلکہ اسے تو خود بھی اتنا
نہ تھا۔

•

سکینہ بھی حامد سے دو بار مل چکی تھی اور پہلی ملاقات کے بعد اس
نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ حامد کی شخصیت نے مجھے
بے انتہا متاثر کیا ہے اس کے بات کرنے کا دھیما دھیما لیکن پُروقار
سا انداز اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی ابدی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں
کی چمک نے تو میرے دل کو انتہائی متاثر کیا ہے میں سوچ رہی تھی کہ کتنی
خوش قسمت ہے میری سہیلی جو اتنا اچھا ساتھی اپنے دامن میں چھپائے
ہوئے ہے میں اپنی ساری بدقسمتی بھول گئی اور تیری خوش قسمتی پر
اتنی نازاں ہوئی کہ سچ پوچھو خالدہ اس وقت تمہیں چومنے کو میرا دل
چاہتا تھا لیکن تمہیں دیکھ تو ہو گا مگر حامد کی سبز آنکھوں سے میں
خوفزدہ ہو گئی تھی لوگ کہتے ہیں کہ سبز آنکھوں والے بے وفا ہوا کرتے
ہیں۔ اس کی آنکھیں بھی سنہری مائل تھیں۔

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ لنش گنج (پوربہ)

کل رات فرش پہ جو مرا ہم جلیس تھا
عنوانِ حادثات بنفسِ نفیس تھا

اب کس نوائے وقت کے افسوں میں کھو گیا
احساسِ کائنات جو میرا انیس تھا

دیکھا جو میں نے غور سے یادوں کی طاق پر
اک مصحفِ حیات بطرزِ نفیس تھا

کل ٹھن گئی تھی میرے نفس اور سموم میں
دونوں سے تھے گریم اگرچہ قد انیس بیس تھا

تیرے حریم نازتک آنے کی دیر تھی
لذت بہ درد ٹھہر بہ لب ہر رئیس تھا

ہر آنکھ ازل میں فرطِ عقیدت سے کھل پڑی
میرا لباسِ زیست بھی کتنا نفیس تھا

جویائے آگہی کو بجز خاک کیا ملی
اے شمس کس قدر کفِ صحرا حسیں تھا

ڈی۔ اے۔ ہربین قربان سہارنپوری

رہ نہ سکا ہے ہم کو غریبوں کے شہر میں
گذری ہو زیست جیسے صلیبوں کے شہر میں

جنسِ ہنر کو کوئی یہاں پوچھتا نہیں
کیا انقلاب آیا ادیبوں کے شہر میں

کیوں سنگ و خشت لے کے یہاں لوگ آئے ہیں
شیشوں کے ہیں مکان امیروں کے شہر میں

ہمدرد کس کو سمجھوں کسے سمجھیں غم گسار
یکساں ہیں سارے چہرے حبیبوں کے شہر میں

میں حق پہ اڑ گیا مجھے سولی ہی ملی نصیب
قانون خوب ہے یہ شریفوں کے شہر میں

یہ مصلحت ہے وقت کی یا دل بدل گئے
ہے دوستی کی بات رقیبوں کے شہر میں

اب دیکھئے مریضِ محبت پہ کیا بنے
احباب لے تو آئے طبیبوں کے شہر میں

قربان کچھ لکھا نہ سکے اپنے واسطے
کاتب کے پاس سب تھا نصیبوں کے شہر میں

سید یقین ترمذی
عمر آبادی

اس سے پہلے کہ ہم کچھ ارادہ کریں
شرط ہے رخ ہوا کا بھی دیکھ لیں

پاشکستہ سہی، عزمِ محکم تو ہے
راہ میں راہ بر چھوڑ دیں، چھوڑ دیں

اس سے پہلے کہ معذور و مجبور ہوں
آؤ مل جل کے طوفاں کا رخ موڑ دیں

ہے غمِ زندگی عمر بھر کے لئے
چند سانس سکوں کی ذرا لے تو لیں

مضطرب مضطرب، منتظر منتظر
تم ہی بتلاؤ وعدوں پہ کب تک جئیں

شرط ہے عرضِ روداد غم کے لئے
ہم کہیں تم سنو، تم کہو ہم سنیں

گر زمانے کو کوئی شکایت نہ ہو
ہم تو بس آپ سے آپ کو مانگ لیں

کوئی ان سا رفیق اور ہمدم کہاں
ساتھ تھیں مشکلیں، ساتھ ہیں مشکلیں

اے یقین دل سے ارماں یہ کہکر چلے
اب کے بچھڑے ہوئے دیکھئے کب ملیں

مرے کرم مکتوب الیہ

چھندواڑہ

۷۹ - ۷ - ۱۵ء

قبلہ بزرگوار بھائی صاحب

قدم بوسی!۔ ایک صاحب یہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ بالکل گیروا لباس تہبند اور کُرتہ۔ سر اور ڈاڑھی بالکل صاف۔ انھوں نے اپنے آپ کو قمر جلال آبادی بتایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کا ذکر حضرت قبلہ رتن پنڈوری کا نام اور ان کے کلام بلاغت نظام کی تمام خوبیاں بیان کیں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ [illegible] سے [illegible] آرہا ہوں۔ سرور صاحب نے آپ کا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ ان صاحب نے اپنا نام اوم پرکاش قمر جلال آبادی (فلمی شاعر) بتایا۔ اس خادم سے جو کچھ بھی خدمت ہوسکتی تھی کوئی کمی باقی نہ رکھی اور ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ بتاریخ ۱۱ر جولائی کو رکھا گیا۔ اسی روز ساڑھے بارہ بجے وہ میرے ہاں کھانا تناول فرماکر گوردوارہ چلے گئے۔ کیونکہ وہ گوردوارے میں ہی قیام فرماتے تھے۔ یہ مشاعرہ انجمن گرلز اسکول چھندواڑہ میں رکھا گیا تھا۔ شہر کے تمام معزز حضرات کو مدعو کیا گیا تھا۔ مگر جب مشاعرہ کا وقت ہوگیا تمام ہال سامعین سے بھر گیا اور یہ قمر جلال آبادی صاحب انتظار کرنے کے بعد بھی تشریف نہ لائے تو میں خود ان کی قیام گاہ گوردوارہ میں گیا تو پتہ چلا کہ وہ صاحب تو یہاں سے روانہ ہوگئے ہیں۔ اور گوردوارے میں سوامی جی کے نام سے ٹھہرے ہوئے تھے نہ تو جاتے وقت مجھے کوئی اطلاع دی مشاعرہ کے انتظام کے لئے میں پریشان ہوا اور اس کے علاوہ تقریباً پچیس روپے کی کتابیں اور رسالے اس خادم سے جھپٹ کر لے گئے۔ شان ہند کے چند شمارے شبستاں کے کچھ شمارے، بہشت نظر کی جلد جو قبلہ رتن پنڈوری نے بطور تحفہ عطا فرمائی تھی۔

براہ کرم آپ ذہن پر زور دیکر سوچئے کہ کیا کوئی ایسا شخص اس لباس اور حلیہ کا آپ کی نگاہ میں ہے۔ مشاعرہ خوب ہوا۔ شہر کے شعراء حضرات مدعو تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج بھی کیسے کیسے لوگ ہیں۔ جو ادب نوازی کے مدعی اور فقیرانہ لباس پہن کر لوگوں کو ٹھگتے ہیں یہاں تمام شہر میں اس نقلی قمر جلال آبادی کا چرچا ہے۔ فقط والسلام

خادم: سید عاشق علی عاشق چھندواڑی

گھیر سیف الدین خاں، رام پور۔ ۲۴۴۹۰۱

برادر عزیز! سلام و نیاز

الحمد للہ آپ نے میری باتوں کا اثر قبول کیا۔ خدا کرے یہ مشورے ہر اس موقع پر یاد آجائیں جب کسی خلاف مزاج بات کو سن کر انتہائی غصہ کے عالم میں آپ کا خون کھولنے لگے اور عواقب و نتائج سے بے نیاز ہوکر فوری طور پر کوئی جوابی اقدام کرنا چاہیں کل ۲۳ر کو "شان ہند" کا اکتوبر نمبر موصول ہوا حالانکہ میں "شان ہند" کا ہر شمارہ دیکھنا چاہتا ہوں اور جب ڈاک کے ڈاکو "محروم" کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو آپ کو "زحمت" دی جاتی ہے۔ شمارہ زیر نظر میں آپ نے "یلین" کا تعارف کرا کے اخلاقی اقدار کو بڑھا وا دیا ہے میں تو "بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گذر"۔

کے زیر عنوان آپ کا مضمون پڑھتے وقت جذبات سے مغلوب ہو کر آبدیدہ ہوگیا معلوم نہیں آپ نے اسے کس طرح سپرد قلم کیا ہوگا۔

ایک چہرے کے پس پردہ کئی چہرے ہیں۔
آج انسان کی تصویر بنا نا مشکل (عروج زیدی)

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسلام

خلوص کار!

عروج زیدی

●●●

باب تنقید

(ادارہ)

چکبست اور باقیات چکبست

حجم ۲۷۶ صفحات، سائیز ۲۲×۱۸/۸
کاغذ، لکھائی چھپائی اعلیٰ، خوش نما گرد پوشش۔ قیمت مجلد چالیس روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- دہلی پبلی کیشنز ۷-۱۰ اچولی بھون علا۔ بمبئی ۱۰ نیو میرین لائنز چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰
یا دفتر شان ہند۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جناب کالی داس گپتا رضا ایک درجن سے زائد تالیفات کے مصنف ہیں۔ اور یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اردو ادب میں رضا صاحب کی کچھ تصانیف نے واقعی اضافہ کیا ہے۔ حال ہی میں ان کی نئی تالیف "چکبست اور باقیات چکبست" شائع ہوئی ہے۔ مدت سے چکبست سے متعلق کسی ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں ان کی حیات اور ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی شعری تخلیقات پر کما حقہٗ طور پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ ڈاکٹر افضال احمد کی تالیف میں چکبست کے ساتھ پوری طرح سے انصاف نہیں کیا گیا تھا

جناب کالی داس گپتا رضا نے اپنے منصوبہ کے مطابق چکبست پر یہ زیر نظر کتاب شائع کر کے چکبست کے پرستاروں کے لئے ایک بہت اچھا کام کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں پیش لفظ (اول) حیات مختصر۔ والا محترم۔ اولین نظم اور تلمذ۔ وکالت اور ذوق شعر، وفات۔ چند حوالے۔ ایک عہد ایک تہذیب۔ پانچ مشاعرے۔ برق اصلاح ناسخ اور نسیم۔ مضامین چکبست اور ضمیمہ عنوانات کے تحت دلچسپ تذکرہ فرمایا ہے۔ کئی باتیں تو ایسی ہیں جو شائقین چکبست کے لئے قطعاً نئی واقفیت کی حامل ہیں۔

حصہ دوم جو باقیات چکبست (نثر) پر مشتمل ہے۔ اس میں پیش لفظ (دوم) مولانا حالی کا ہولسے رڈ نا۔ کلام اقبال۔ دیباچہ فہرست مضامین۔ رسالہ صبح امید لکھنؤ اکتوبر ۱۹۱۸ء صبح امید کا مسلک۔ رفتار قوم۔ مشاعرے (احمد علی شوق قدوائی) ہمارے معاصرین۔ زندگی (اقبال) تجویز رفارم مانٹیگو (حسرت موہانی) نالۂ درد۔ عطر سخن۔ رفتار قوم صبح امید لکھنؤ جنوری ۱۹۲۰ء تا جولائی ۱۹۲۰ء و صبح امید لکھنؤ جنوری و مارچ ۱۹۲۱ء نواب مرزا محمد باقر علی خان عروج، عنوانات پر مشتمل ہے اور یہ حصہ بڑا اہم اور کتاب کی جان قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی حصہ میں باقیات چکبست (نظم) کے زیر بحث چند رباعیاں۔ نظمیں اور غزلیں نیز متفرق اشعار بھی دیئے گئے ہیں۔

حصہ سوم کتابیات اور اشاریۂ اشخاص پر مشتمل ہے۔

رضا صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ چکبست کے کلام نظم و نثر کی کھوج ہنوز جاری ہے جیسے ہی معتدبہ مقدار میں مواد اکٹھا ہو جائے گا "باقیات چکبست حصہ دوم" کے نام سے پیش کر دیا جائیگا چکبست پر رضا صاحب کی تیسری کتاب کلیات چکبست ہوگی۔ جس کے بارے میں انھوں نے یقین دلایا ہے کہ ۱۹۸۰ء تک اس کی تدوین و ترتیب مکمل ہو جائے گی اور یہ کلیات رضا صاحب کے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع ہو گی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ رضا صاحب اردو کے پہلے مصنف ہیں جو دور حاضر میں بغیر کسی مالی لالچ کے ایسی مفید اور گراں قدر تصانیف سے اردو ادب کو مالا مال کر رہے ہیں

F all parents !

The savings habit is best taught early in life.

There's one Bank that'll go to school to teach it.

Call it PSB's concern for children. 'School-extension' counters in several schools are helping to inculcate the savings habit among hundreds of school children. Every week, month after month.

PSB–The name of total banking service

THE PUNJAB & SIND BANK LTD.

(Regd. Office: Hall Bazar, Amritsar) Central & Admn. Office: B45/47 Connaught Place, New Delhi.

Chairman: Inderjit Singh

HAKIM 'SHABEER' KANPURI

'GUL' KHALIQI JAIPURI

PRAKASH NARAIN SAXENA

QUMAR-UD-DIN 'BARTAR'

BHATTI HAKIM AZHAR LYALLPURI

MUKHLIS (PUSAD)

QAZI TANVEER

فخر واحدی، قنوج

'HANIF' SOJATI

JYOTISHI
RAM LAKHAN MISRA
KISHAN GANJ
(PURNEA)

خورشید عالم عثمانی سہارنپوری مقیم جدہ (سعودی عربیہ)

پروفیسر جمراہ بارہ مولوی

HILAL BHARTI
BIN M. ALAM

احمد حسین شمس کشن گنج

ہادی حسن فردوسی۔ سری نگر

حسن ساہو۔ سرینگر

بیدل سرحدی

پی بشیر اسارتھی جموں

اخلاق سہسرامی

[illegible] بشیر [illegible]

HAIRAT DURGUI

QAMAR AYOOLVI
(PALGHAR)

آزادی ۱۵ اگست کا خیر مقدم

فیاض گوالیاری

آؤ ، پندرہ اگست !۔
زندہ باد ۔ !
چشم ما روشن و دلِ ما شاد ، !۔
دیدہ و دل ہیں فرشِ راہ ، مگر ،
شرم سے آج سر نہیں اٹھتا ! ،
وہ جو ستیہ یگ کی تھی سنہری کرن ! ،
ہم نے اس کو دیئے تھے چند وچن ! ،
آگے بڑھنے کے ،
آگے آنے کے ،
شانِ ہندوستان بڑھانے کے !،
کچھ بڑھا ؟ ۔
ہاں بڑھی تو مہنگائی ! ۔
لوبھ ، لالچ ، نفاق ، کج رائی ۔ !!
کچھ گھٹا ہے ۔
ہاں ۔ سچائی ، علم و ادب !،
دھرم ، انسانیت ، محبت سب ! ،
پاک گنگا میں ۔
گندگی ڈالی ! ،
ہم نے امرت میں زہر گھولا ہے !۔
علم کے مرکزوں میں نادانی ! ،
خود سری ، بدلحاظی ، شیطانی ! ،
بھائی نے گھر جلا کے بھائی کا !۔
پاؤں میں خود کلہاڑی ماری ہے ! ،
کیا کہیں ہم پہ شرم طاری ہے !! ،
کیا کریں تیرا خیر مقدم ہم ! ،
دکھ سے آزاد ہوں تو بات کریں ،
سب کے دل شاد ہوں تو بات کریں ،
پھر بھی ،
پلکیں بچھائے بیٹھے ہیں ،
تو نے کاٹی تھیں ماں کی زنجیریں !
تیرا احسان ہے سر آنکھوں پہ !
اتنا کم [illegible] ہے ! ،
آؤ ، پندرہ اگست !، زندہ باد ،
چشم ما روشن و دلِ ما شاد ۔ !،

[illegible] سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر [illegible] خواجہ پریس [illegible] جامع مسجد دہلی اور سر [illegible]
چھپوا کر دفتر شانِ ہند [illegible] انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد!

پنڈت رام لکھن مشرا کے

کشن گنج ضلع پورنیہ (بہار) کے جیوتشی پنڈت رام لکھن مشرا اکثر اوقات بڑی دلچسپ پیش گوئیاں فرماتے رہتے ہیں اور اپنی جوتش ودّیا کا سکہ بٹھانے کیلئے اپنی تمام پیش گوئیاں ہر سال پمفلٹ کی صورت میں شائع کراتے ہیں۔ اور یہ پمفلٹ ملک بھر کے مشہور اخبارات کو بھجواتے ہیں تاکہ اخبارات کے مدیران ان کی جوتش ودّیا کے کمال سے باخبر رہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم جوتش اپنی جگہ برحق ہے مگر اس کے جاننے والے بہت کم ہیں۔ پنڈت رام لکھن مشرا ہر سال اپنی... پیش گوئیوں کی تفصیل بھجواتے رہے ہیں۔ مگر ایڈیٹر شانِ ہند انھیں زیر بحث رکھ دیتا تھا کیونکہ یہ پمفلٹ ہندی میں ہوتا ہے اور ایڈیٹر شانِ ہند ہندی سے قطعاً نابلد ہے۔

محترم احمد حسین صاحب شمس ایڈوکیٹ کشن گنج (پورنیہ) نے اپنے گرامی نامہ میں لکھا کہ آج میں مشرا جی کے متعلق کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ملاحظہ کے لئے ان کی پیش گوئیوں سے متعلق ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء کے مطبوعہ دو پمفلٹ بھجوا رہا ہوں جو کہ مشرا جی براہِ راست آپ کی خدمت میں ۷۸ء اور ۷۹ء کے شروع میں بھجوا چکے ہیں۔ آپ ان پمفلٹوں کو پڑھ کر تو حیران رہ جائیں گے کہ مشرا جی کی پیش گوئیاں کتنی صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ مشرا جی بھارت ٹائمز اور دوسرے اخبارات کے ہاں بھی یہ پمفلٹ ہر سال بھجواتے ہیں۔ دہلی میں بڑے بڑے جوتشی بیٹھے ہیں، مگر کسی نے بھی وسط مدتی چناؤ کی پیش گوئی ۱۹۷۸ء میں نہیں کی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

شمس صاحب ایک اچھے شاعر، بہترین قانون داں اور قابل قدر دوست ہیں۔ ان کا گرامی نامہ پڑھ کر مشرا جی کی پیش گوئیوں کے دو نو پمفلٹ ترجمہ کرا لئے گئے۔ آئیے مشرا جی کے ان پیش گوئیوں سے آپ بھی واقف ہو جئیے۔

ایک پمفلٹ میں ۱۸ ستمبر ۷۸ء کو کی گئی پیش گوئیوں میں سے کچھ یہ ہیں۔

۱۔ بھارت کے ایک پڑوسی ملک میں اتھل پتھل ہوگی اور سماج پری ورتن ہوگا۔

۲۔ جنتا پارٹی میں ۱۵ اکتوبر سے ۲۴ نومبر ۷۸ء کے درمیان گہری پھوٹ پڑ جائے گی۔

۳۔ چرن سنگھ اور راج نرائن ایک نئی پارٹی بنائیں گے جو لوک دل جنتا سماج وادی مورچہ ہوگا۔ ایک نئے عربی بھارتی سماج واد کی بنیاد پڑے۔

۴۔ ملک کے کچھ حصوں میں قحط اور بھونچال آئیگا۔

۵۔ بھارتیہ منتری منڈل کے ڈھانچے اور روپ میں اکتوبر۔ نومبر ۷۸ء میں پری ورتن ہوگا۔

۶۔ جنتا پارٹی لوک سبھا میں ... میں کشن کے روپ میں بیٹھے گی۔

۷۔ شری چرن سنگھ اور راج نرائن دونوں کانگریس (آئی) میں ملیں۔

۸۔ پرانتوں کے آپسی جھگڑے بڑھنے کی امید ہے۔

۹۔ دیش کے دکشن پوربی راجیوں میں قدرتی آفات نازل ہونگی اور اتر پردیش راجیوں میں آپسی جھگڑے ہوں گے۔

۱۰۔ آخر بھارت میں جنتا پارٹی راج نیتک صفایا ہو جائے گا۔

۱۱۔ مدھیہ وتی چناؤ ۷۹ء میں ہوگا

۱۲۔ پاکستان کے سابقہ راشٹرپتی اور پردھان منتری بھٹو کا ستارہ گردش میں ہے اور ان کی مرتیو جیل میں ہوگی۔

۳۶ پیشگوئیوں میں سے ۱۲ پیش گوئیاں آپ نے ملاحظہ فرمائیں باقی ۲۴ پیشگوئیاں بھی ایسی ہیں جو قریب قریب صحیح ثابت ہوئیں۔

اب پنڈت رام لکھن مشرا کی وہ پیش گوئیاں ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے ۹ فروری ۷۹ء کو کی ہیں۔

۱۔ ایران۔ عراق۔ افغانستان۔ عرب دیشوں۔ ایشیا۔ امریکہ اور افریقہ دیشوں میں خوفناک خونی کھیل کھیلا جائیگا۔ بھونچال اور دوسری قدرتی آفتیں نازل ہوں گی۔

۲۔ ۲۳ اگست ۷۹ء کے قریب بھارتیہ راج نیتک پری ورتن تین چار ودھان سبھاؤں کا بھنگ اور نئے چناؤ۔

۳۔ یہ سال سوکھے کا سال ہوگا۔ جاڑے شروع شروعات میں

بھارت کے ایک راجیوں میں مدھیہ وتی چناؤ اور مرکزی منتری منڈل میں نیا سنگٹھن ہوگا۔

۴ ۔ شریمتی گاندھی شری چرن سنگھ اور شری جگجیون رام کو مینڈھوں کی طرح لڑائیں گی اور شری سنجیوا ریڈی کی مدد سے بھارت کا نیا منتری منڈال بنوائیگی ۔ بھوکم ۔ اکال ۔ اور دوسری قدرتی آفتیں ایش کے دکھشن پچھم حصوں میں اور (دکھشن پوربی حصوں میں زیادہ) نازل ہونگی ۔

۵ ۔ آچاریہ کرپلانی اور جے پرکاش نارائن کھل کر چرن سنگھ کی حمایت کریں گے ۔

۶ ۔ مدھولمے ۔ ایس ۔ ایم جوشی کی سربراہی میں سماج وادی نشکتیاں راج نرائن چرن سنگھ سے سمجھوتہ کریں گی ۔

۷ ۔ راج نارائن پرکھر ور دوھی نیتا کے روپ میں ابھر کر یا تو جنتا پارٹی کے صدر بنینگے یا جنتا پارٹی توڑ دیں گے ۔

۸ ۔ شری شانتی بھوشن قانون منتری نہیں رہیں گے ۔ اتر پردیش منتری منڈل بدل جائیگا ۔

۹ ۔ راجہ دینیش سنگھ اور راجہ کرن سنگھ کیندریہ منتری منڈل میں لیے جائیں گے ۔

۱۰ ۔ الہ آباد سے شریمتی گاندھی اپنے حریف امیدوار کی ضمانت ضبط کراتے ہوئے ۸۵۵۵۱۱ ووٹوں سے جیت کر پھر لوک سبھا میں آئیں گی ۔

۱۱ ۔ "ر" سے نام شروع ہونے والے لوگ جیسے ربی رائے راج نارائن ۔ روی ایچر ۔ رام چندر راؤ ۔ شام نندن مشرا ۔ سمرن کندو ۔ سمر گوہا ۔ ایس ۔ ایم ۔ جوشی ۔ شری یشونت رائے چوہان ۔ بنادیوی ۔ یشونت پوار ۔ اننت رائے جیسوال بھی مہرہ تو پولن بھورکا نبھائیں گے ۔

۱۲ ۔ بھٹو کی موت جیل میں ہوگی ۔

۱۳ ۔ اس سال شری کانتی ڈیسائی کے خلاف کمیشن بٹھایا جائیگا

مندرجہ بالا پیش گوئیاں پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر پنڈت رام لکھن مشرا جی ان دنوں راجدھانی میں تشریف فرما ہوتے تو ہمارے نیتاؤں کی دلچسپی کا کچھ سامان تو ہوتا ۔ ہم پنڈت رام لکھن مشرا کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ انتخابات کے دنوں میں اپنا قیام دہلی میں رکھیں اور مناسب ڈھنگ سے اپنا جوتش ودیا کے کمال کا مظاہرہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان ایسا موزوں اور بہترین جوتشی عوام ۔ نیتاؤں نیز ملک کے لئے مفید ثابت نہ ہو ۔

پاکستان کے ناموراديب و شاعر؟؟

پاکستان کا ہر وہ شاعر یا ادیب جو اپنے ملک میں کسی گنتی میں شمار نہ ہوتا ہو ہندوستان آتے ہی وہ اپنے ملک کا نامور ادیب اور شاعر بن جاتا ہے اور سب سے پہلے یہاں کے اخبارات میں اپنے ورود مسعود کی خبریں شائع کرانے کے ذرائع تلاش کرتا ہے :

جن شعرائے پاکستان کے کلام کو پاکستانی رسائل و جرائد شائع کرنا اپنے لئے توہین سمجھتے ہیں وہ شاعر یہاں آنے پر پاکستان کی نمائندگی کے دعویدار ہوتے ہیں اور دونوں ملکوں کے مابین کلچرل اور ادبی وفدوں کے تبادلوں کے سلسلے میں کوشاں ہونے کے دعویدار بنتے ہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی شعرا اور ادیبوں کے ہندوستان تشریف لانے پر ان کی عزت افزائی ہونی چاہئے اور ان سے دونوں ملکوں کے ادبی رجحانات پر تبادلۂ خیال ہونا چاہئے ۔ مگر یہ قطعاً مناسب نہیں کہ پاکستان کے مبتدی قسم کے شعرا اور ادیبوں کو بدون ان کے پاکستان کا نمائندہ اور نامور ادیب یا شاعر کہنے کی لن ترانی کو بسر و چشم تسلیم کیا جائے ۔

ہمارے یہاں پاکستان کے بہترین رسائل آتے ہیں اور ان رسائل میں پاکستان کے سینکڑوں نامور نیز مبتدی مگر ہوائے تازہ کے متلاشی شعراء کا کلام نظر سے گزرتا ہے ۔ مگر غضب ہے کہ جن شعرائے کرام کا کبھی نام بھی پاکستانی رسائل میں نہیں پڑھا گیا وہ جب کسی وجہ سے ہندوستان تشریف لاتے ہیں تو اپنے بارے میں یوں پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ جیسے پاکستانی شعر و ادب کے نمائندہ وہی ہوں ۔

ہم اپنے یہاں کے اخبارات کے مدیران کرام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس قسم کے خود ساختہ پاکستانی شعرا اور ادیبوں کے بارے میں کوئی خبر شائع کرتے وقت الفاظ کی حرمت کا خیال رکھا کریں ۔

• • •

ماذ ماذ

عبدالعزیز خالد

تو کہ موضوعِ مزامیرِ زبور
تیری توصیف کا کس ابنِ بشر کو مقدور ؟
عجزِ اظہار و بیاں کا کرے اقرار زباں
جو تری شان کے شایاں ہوں وہ الفاظ کہاں ؟
تری تصویر کشی سے معذور
[illegible]نی انسان کا فن
اے خداوندِ سخن !
پھر ادا جس سے ترا زمزمہ وہ ساز کہاں ؟
طلع البدر علینا کی وہ آواز کہاں ؟
کعب و حسان کا وہ سرمدی انداز کہاں ؟
قلب کا قافیہ سر منزلِ معنیٰ میں ہے تنگ
کوئی محرومی سے محرومی ہے
تیرے دربار میں دارائی بھی محکومی بھی
آستانے پہ ترے خاک بسر برہنہ تن
کجکلاہانِ اقالیم و سلاطینِ زمن
اے سراپردۂ حشمت میں مرا کیا مذکور !
میں مدائن تو مدینہ میں خرابہ تو چمن
میں اندھیرا تو اجالا تو امیں میں امین
میں تشکک تو تیقن تو موحد میں شمن
تو طمانیت و تسکیں میں مباحات و محن
تو حسیں و متبسم میں عبوس و الکن
میرا افلاسِ تخیل، مری ناداریٔ فن
تیرے دربار میں کس منہ سے کرے عرضِ سخن ؟
یہ مرے دل کی لگن ! یہ مرے سینے کی امنگ !

اترے کیسے مرے نغمے میں ترا لحنِ قشنگ
ترے کردار کی خوشبو، تری گفتار کا رنگ ؟
بم و زیر اس کا ہے کاذب، غلط اس کا آہنگ
تیرے اوصاف و شمائل کے تنوع پہ ہوں دنگ
جو مرے دل میں ہے کیونکر ہو بیاں ؟
پیکرِ حرف میں کس طور ڈھلے جذبِ نہاں ؟
گونجے کانوں میں مرے نغمۂ [illegible] دف
اے مؤخر بہ زمانہ و مقدم بہ شرف !
تو ثریا میں ثریٰ ہوں تو زمرد میں خزف
تو عناں گیرِ مشیت میں حوادث کا ہدف
تو ہمہ رحم و رجا میں ہمہ حرمان و اسف
لمسِ جاں پرورِ نیساں کو ترستا ہے صدف
تابِ بیگانگیٔ دل [illegible] اغماض کہاں ؟
وجہِ جمعیتِ خاطر ہے تصور تیرا
ہر بنِ مو ہے گروگانِ تشکر تیرا
رازِ پنہاں کو کروں کیوں افشا ؟
اور کیوں عہدِ وفا کو کہوں دستِ [illegible] ؟
طبعِ غماز کہاں، محرمِ راز کہاں !
اے شہِ ہر دوسرا !
قدمایا بھی تہی اور تہی آخرایا
تہی تلقیط و مخاحل ہے تہی کہدیدہ
المعی یلمعی امی حرمی حیاطا
لاطخ و لوذعی و ذرطِ ذُلعفور و عندہ

ہدیٰ و مقتفیٰ و مامون و عُروت و محمّد
قانت و کا شِر و فتّال و خُتَم و قدوہ
قیم اُمّتِ عوجا، فلج و فعلن و بہیا
جھنم و جحفل و جوّاد و جواد و بینا
حاطِ حاطِ لبِن و لائم و لیِن، لبنہ
مفزع و موکّل و ملجا و ملاذ و ماوی
اَشتم و حاتم و حمّاد حلیم و بہ باء
جامع و جدّ و حبنطا و مجیب و معطاء
ونہِم و قُثم و مختار و ممدّح، مولا
راکبِ رفرف و ذوالقوّۃ و بشریٰ عیسیٰ
طیّب قول و لقا، صدر عُلیٰ، خیرٌ لّھا
تُہی مِنّ ہے تُھی مِنْ اَنفُسِنَا
نورِ انوار بھی تو
سرِّ اسرار بھی تو
خیرِ اخیار بھی تو
حُجّتِ احرار بھی تو
برِّ ابرار بھی تو
لوحِ محفوظ بھی تو
حرفِ اقرار بھی تو
چشمِ پُرخواب بھی تو
دلِ بیدار بھی تو
بیتِ معمور بھی تو
رقِ منشور بھی تو
اسمِ مسطور بھی تو
سقفِ مرفوع بھی تو
بحرِ مسجور بھی تو

شعلۂ طور بھی تو
پیکِ داوار بھی تو
میرا موضوع بھی تو
ہے اسماء کا نہیں [illegible] احصا
نام توراۃ میں ہے احید و حامد تیرا
تیری مداحی کا دم بھرتا ہے تیرا
وہ ترا ناعت و مدّاح وہ حامد تیرا
اس کے بس میں ہے فقط تجھ سے محبت کرنا
اس محبت کے ہیں احوال و مظاہر کتنے!
ضو فشاں چرخِ بریں پر ہیں ستارے جتنے
[illegible] شام و سحر میں ہیں نظارے جتنے
ہیں نہاں پردۂ خوگاں میں اشارے جتنے
جگرِ سنگ میں بیتاب شرارے جتنے
محوِ پرواز فضا میں ہیں پرندے جتنے
جتنے خشکی پہ بہائم ہیں چرندے جتنے
ماہی و مرغ سمندر میں ہیں پودے جتنے
شعلے برکانوں میں کھلیانوں میں دانے جتنے
کرۂ ارض پہ پلانے کے ہیں قطرے جتنے
ابر کے لکوں میں ہیں برف کے گالے جتنے
پھول پھل جتنے ہیں اشجار پہ پتّے جتنے
اور صحراؤں میں ہیں ریت کے ذرّے جتنے
جتنے الفاظ ہیں آفاق میں کلمے جتنے
جتنے الحان و اناشید ہیں نغمے جتنے
جتنے اسفار و اساطیر ہیں قصّے جتنے
جتنے افکار و اقاویل ہیں دعوے جتنے
جتنے القاب و اسالیب ہیں لہجے جتنے
جتنے اکوان و اقانیم ہیں سلسلے جتنے

بے ضابطہ اشتہارات

رشتہ مطلوب ہے

ایک اڑتالیس سالہ نوجوان کیلئے سڈول اور کمزور لڑکی کا رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی خوش شکل، خوش وضع، خوش خصال اور خوشحال ہو، فیشن ایبل پارٹیوں میں شریک ہونے اور "انجمن بہبود گنہگاران" کے لئے چندہ جمع کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ خوشحال ازدواجی زندگی کیلئے مناسب بنک بیلنس، نقل و حرکت کے لیے کار، رہائش کے لیے بنگلہ اور بچے پالنے کیلئے آیا کا ساتھ لانا ضروری ہے۔ عمر اور جہیز کی کوئی قید نہیں مطلقہ خاتون کو بھی ترجیح دی جاسکتی ہے۔

معرفت پوسٹ باکس نمبر ۵۵۵
روزنامہ "فردوس حیات" ہگلبرگ تین لاہور

ایک تعلیمیافتہ خاتون کی ضرورت ہے

ایک ایسی تعلیم یافتہ خاتون کی ضرورت ہے جو فروغ فیشن کے ایک مثالی ادارے میں داخلے کے لئے صرف طالبات کو ترغیب دے سکے یہ ادارہ فیشن کے جدید اصولوں کے مطابق کھولا گیا ہے اور اس میں طالبات کو معاشی اور معاشرتی مسائل حل کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ اس ادارے کی فارغ التحصیل طالبات لاہور کراچی لندن و بنکاک میں کئی نائٹ کلب اور بیوٹی سیلون کامیابی سے چلا رہی ہیں اور لاکھوں میں کھیلتی ہیں۔ منتخبہ خاتون کو تنخواہ کے علاوہ ادارے کی آمدنی سے کمیشن بھی دیا جائیگا۔

الف الف الف
معرفت ماہنامہ قلمی شورہ لاہور

سیلزمین کی ضرورت ہے

ضرورت ہے ایک ایسے سیلزمین کی جو خواتین کی نفسیات کو سمجھ سکے اور ہماری مصنوعات زیبائش کو زیادہ داموں فروخت کرسکے قیمت خرید پر پانچ سو فیصد منافع حاصل کرنیوالے سیلزمین کو ترجیح دی جائے گی۔ سیلزمین کا چرب زبان اور حاضر جواب ہونا ضروری ہے واضح رہے کہ ہماری دکان پر خواتین زیادہ تعداد میں تشریف لاتی ہیں اس لئے سیلزمین کا خوش شکل اور ہینڈسم ہونا بھی ضروری ہے۔

منیجر منور ماسنز، کلفٹن، کراچی

ضرورت ہے سہرا لکھنے والوں کی

ہمیں ایک ایسے قادرالکلام شاعر کی ضرورت ہے جو ارتجالاً سہرا لکھنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہوں ہمارے پاس چند ماڈل سہرے بھی موجود ہیں اور ان میں حسب ضرورت نام تبدیل کرکے کام چلایا جاسکتا ہے۔ جو شعراء عروض میں دسترس رکھتے ہوں ان کے لئے نادر موقع ہے تقریب عروسی میں ترنم سے سہرا پڑھنے کو ترجیح دی جائیگی۔ جز وقتی ملازمت پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

انتباہ

بعض ناہنجار مدیران جرائد میری غزل شائع کئے بغیر مجھے رسالہ دکھلاپل کردیتے ہیں۔ ایسے غیر ذمہ دار مدیران جرائد کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اس قبیح حرکت سے باز آجائیں اور آئندہ مجھے صرف وہ رسالہ وی پی کے ذریعے بھیجیں جس میں میری غزل شائع ہو

دل گرده بادی
شاگرد حضرت جگر مدبب آبادی
حال ساکن چیچو کی ملیاں۔ ضلع شیخوپورہ

ایک اہم ادبی اعلان

من مستمی بے کار خان بیکار لقائی بہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ میں نے پابند شاعری سے توبہ کرلی ہے اور اب میں نے نثری نظمیں شروع کردی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے حلقۂ ارباب ذوق ادبی و سیاسی نوبہار کا گیٹ سے علیحدگی اختیار کرکے حلقہ [illegible]

نثری نظم کا نام کر لیا ہے۔ اس حلقے کی نشست ہر ہفتہ شام کو ٹی ہاؤس میں حلقے والے ہیٹر پر منعقد ہوتی ہے۔ شاعر بننے اور شہرت حاصل کرنے کے خواہشمند نوجوانوں کو صلائے عام ہے۔ نئے اُدبا کو چائے مفت پیش کی جاتی ہے۔ خالد احمد اگر اس حلقے میں شامل ہونا چاہیں تو ان کا خیر مقدم کیا جائے گا اور چائے پیش کی جائے گی۔

اراضی برائے فروخت

ملتان روڈ پر برلب سڑک چار کنال کا ایک قطعہ اراضی فروخت کے لئے موجود ہے۔ اس قطعے پر کسی زمانے میں قبرستان آباد تھا۔ پھر یہاں سبزیاں اگانے کا کام شروع کیا گیا۔ آخر میں نواحی فیشن ایبل بستیوں کو اینٹیں فراہم کرنے کیلئے بھٹہ لگایا گیا۔ جس سے زمین ذرا اونچی نیچی ہوگئی۔ اطراف وجوانب کے غلیظ اسٹوڈیوز کا گندا پانی اس نشیب کی طرف بہنے لگا۔ اور اب یہ قطعہ موزوں تالاب نظر آتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ فروغ امراض کے لئے یہ مچھروں اور مکھیوں کا ایک فارم قائم کیا جا سکتا ہے ملیریا اور ہیضے کے جراثیم کی افزائش بھی کی جا سکتی ہے ادویات سازی کے اداروں کے لئے ایک فارم قائم کیا جا سکتا ہے۔ ملیریا اور ہیضے کی افزائش بھی کی جا سکتی ہے۔ ادویات سازی کے اداروں کیلئے نادر موقع ہے۔ یک مشت ادائیگی پر اراضی کا قبضہ فوری طور پر دیدیا جائے گا۔ ضرورت مند اصحاب براہ راست رابطہ قائم کریں اور پراپرٹی ڈیلروں کے نرغے میں نہ آئیں۔

گمشدہ پالتو

ہمارا پیارا پالتو اچانک پر اسرار طور پر غائب ہوگیا۔ پرسوں شام جب ہم ٹی ہاؤس میں "سنگ نامہ" سنا رہے تھے تو وہ باہر پان والے کے پاس ایک دیسی کتیا کے ساتھ کورٹ شپ کرتا دیکھا گیا۔ ہمارے ایک شناسا نے اسے سرزنش کی اور بر سر عام کورٹ شپ سے منع کیا۔ جس پر پیارا پالتو ناراض ہوگیا اور ہم سے مشورہ کئے بغیر کہیں چلا گیا۔ جس کسی کو ملے ہمیں اطلاع دے ہمارا ٹیلیفون نمبر ۰۰۰۰۰۰۰ ہے۔ پیارے پالتو اگر تم پڑھو تو بلا خوف وخطر واپس آ جاؤ، اسے اور اس کی محبوبہ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

ضرورت ہے ایک کاتب کی

ہمیں اپنے ماہنامہ کیلئے ایک ایسے کاتب کی ضرورت ہے جو خود بھی شاعر ہو تاکہ مضامین سے ضرورت کے مطابق عروض اور املا کی اغلاط دور کر سکے ہم ادبا کے مضامین معاوضہ لیکر شائع کرتے ہیں کاتب کو وصول شدہ معاوضہ کا پندرہ فیصد کمیشن دیا جائیگا جو خاصہ معقول ہے سرورق پر کاتب کا نام شائع ہوگا اور اس کی قیمت وصول نہیں کی جائے گی عینک لگانے والے کاتب درخواستیں بھیجنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔

عاق نامہ

میرے بیٹے مسمی بے کار خان نے پابند شاعری سے منہ موڑ کر نثری نظمیں لکھنا شروع کر دی ہیں۔ اپنی سابقہ تمام تصانیف سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے اس لئے میں اسے اپنی تمام منقولہ جائداد سے عاق کرتا ہوں۔ مسمی بے کار خان ... سے لین دین کرنے والا خود ذمہ دار ہوگا۔

ایک نوجوان بیوہ کی ضرورت ہے

ایک ایسی بیوہ یا مطلقہ نوجوان خاتون کی ضرورت ہے جو بڑھاپے کی طویل علالت میں ہمارے پیارے ابو کی نگہداشت کر سکے۔ ابو کے چار شادی شدہ بیٹے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں لیکن دوسرے قومی کاموں کی وجہ سے انہیں یا ان کی بیگمات کو ابو کو دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ابو کی رہائش کیلئے الگ کمرہ مہیا ہے اور اس میں سہولت کی سب چیزیں دستیاب ہیں گھر میں مہمانوں کی آمد سے ابو کے کھانسی میں مزاحمت نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ ابو نے اپنی تمام جائداد اپنے پیارے بچوں کے نام منتقل کر دی ہے خاتون [illegible] عقد کرنے کی خواہشمند ہوں تو ابو کے فرمانبردار بچوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

ماہر سیاست کی ضرورت ہے

ایک ایسے ماہر سیاست کی ضرورت ہے جو ہمارے امیدوار اسمبلی کیلئے تقریریں لکھ سکے اور جلسے جلوس میں سامعین کا اہتمام کر سکے [illegible] اور ضرورت کا [illegible] ہمارے امیدوار کو [illegible] [illegible] کام [illegible] بعد [illegible] کو عہدہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

گوشۂ عقیل صدیقی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

۱۹۵۵ء میں پہلی بار جے پور گیا تو قبلہ مولانا کوثر مرحوم نے پارس صاحب جے پوری سے ملاقات کرائی۔ کوثر مرحوم ایسی ہستیاں اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتیں۔ چند ہی لمحوں میں مشرقی تہذیب و شرافت کا یہ مجسمہ راقم الحروف کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ کوثر صاحب نے میرے نام کے ساتھ "تونسوی" لکھا دیکھا تو فرمانے لگے خواجہ سلیمان تونسوی کے خلیفہ سے تو جے پور میں آپ مل ہی لیں گے۔ خواجہ سلیمان تونسوی اور تونسہ کا ذکر میرے لئے نوید جانفزا تھی۔ میرے استفسار پر مولانا کوثر نے قبلہ مولانا حاجی معین الدین شاہ صاحب چودھری سے متعلق ایسی باتیں بتائیں کہ میں نے مولانا کوثر مرحوم سے یہ استدعا کی کہ وہ اپنے ساتھ مجھے حضرت شاہ صاحب کے ہاں لے چلیں۔ فرمانے لگے۔ صبح آٹھ بجے سے پہلے پہلے آجانا تو ساتھ چلیں گا بشا۔۔۔ کوثر صاحب نے تاکید بھی کر دی کہ وقت کی پابندی ضرور کیجئے گا۔ کیوں کہ شاہ صاحب نو بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔

میرا قیام مسلم مسافر خانہ میں تھا دوسرے دن صبح سویرے تیار ہو کر میں ساڑھے سات بجے کے قریب پارسا کوثر کے ہاں پہنچا تو یہ رند بلانوش ابھی رات کی بادہ نوشی کے خمار میں بے خبر سو رہا تھا۔ کوثر صاحب کے در دولت پر تنہا ہی گیا تو مولانا کوثر تیار بیٹھے تھے۔ فوراً میرے ساتھ ہو لئے اور اپنے مخصوص لب و لہجہ میں حضرت شاہ صاحب سے متعلق بات چیت کرتے ہوئے تین منٹ کے بعد ایک رتیلے چوک میں لے آئے اور فرمانے لگے کہ خواجہ سلیمان تونسوی کا عرس اسی چوک میں منایا جاتا ہے اور یہ سامنے کا دروازہ وہ دروازہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسی دروازہ سب کچھ دلوا دیں۔ کچھ منٹ کے بعد میں حضرت شاہ صاحب کے سامنے تھا علیک سلیک ہو چکی تب کوثر صاحب نے میرا تعارف شاہ صاحب قبلہ سے کرایا پھر تو گر۔۔۔ وہاں پھر اور کسی کا کیا ہو سکتا تھا قبلہ شاہ صاحب نے تونسہ سے متعلق کچھ باتیں دریافت فرمائیں۔ تونسہ شریف کے خواجگان حافظ صدید الدین صاحب مرحوم اور خواجہ غلام نظام الدین صاحب اور ان کے صاحبزادگان کے بارے میں کئی سوالات فرمائے ہم ایک گھنٹہ تک قبلہ شاہ صاحب کے پاس رہے پورے نو بجے شاہ صاحب اٹھے اور فرمانے لگے اچھا وقت ہو گیا۔ سب حاضرین باہر جانے لگے تو شاہ صاحب نے قبلہ کوثر صاحب سے فرمایا کہ آپ دونوں میرے ساتھ اوپر چلئے۔ نصف گھنٹہ کے قریب قبلہ شاہ صاحب سے مزید بات چیت رہی۔ اس مختصر سے وقت میں حضرت شاہ صاحب نے میرے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ مجھے جو عقیدت تونسہ شریف سے تھی اس کے پیش نظر جے پور میں حضرت مولانا حاجی معین الدین شاہ صاحب چودھری کا آستانہ مجھ دوسرا تونسہ معلوم ہونے لگا اور گزشتہ انتیس سال سے نہایت خضوع و خشوع سے اس دروازہ کے ساتھ اپنی اسی عقیدت کو وابستہ کئے ہوئے ہوں جو مجھے اپنے وطن مالوف تونسہ شریف اور وہاں کی درگاہوں سے تھی۔

قبلہ شاہ صاحب سے اس ملاقات کے بعد میں کسی نہ کسی بہانے جے پور جانے کا پروگرام بناتا رہا کیوں کہ نا وابستہ طور پر بھی کچھ دنوں کے بعد قبلہ شاہ صاحب کے ہاں حاضری دینے کو دل چاہتا تھا۔

ایک دفعہ میں گورنمنٹ ہوسٹل جے پور میں ٹھہرا ہوا تھا اور دوسرے دن صبح کوٹہ جانے کا پروگرام تھا کہ شام کو عزیز قاہر بنس ایم۔ اسے نے ٹرنک کال سے بتایا کہ اگلے ہی روز ہائیکورٹ میں مقدمہ کی تاریخ لگ گئی ہے لہذا آج رات کو ہی دہلی کیلئے روانہ ہو کر صبح ہائی کورٹ کھلنے سے پہلے پہلے آجیئے۔ ان دنوں پنجاب ہائی کورٹ کے دہلی سرکٹ بنچ میں میرے خلاف توہین عدالت کا ایک کیس چل رہا تھا۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے مقدمات کی تاریخیں پہلے سے مقرر نہیں ہوتیں بلکہ ایک روز پہلے مقدمات کی تاریخیں ہندوستان ٹائمز اور دوسرے موقر روزناموں میں چھپ جاتی ہیں۔ کوٹہ جانا بھی اشد ضروری تھا اور ادھر ہائی کورٹ کا معاملہ۔ چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ کوٹہ تار دے کر پروگرام ملتوی کر دیا جائے اور رات کو احمد آباد میل سے دہلی واپس چلا جاؤں میں جانتا تھا کہ شاہ صاحب شام کو ملاقات نہیں ہو سکتی مگر میں نے اس خیال سے کہ دروازہ پر دستک دے کر بشیر الدین صاحب کو بلا کر یہ اطلاع تو دے ہی دینی چاہئے کہ میں رات کو دہلی واپس جا رہا ہوں۔ راستے میں ہمدرد دواخانہ رام گنج بازار میں پارس صاحب مل گئے انہیں میں نے دہلی واپس جانے کے بارے میں کہا تو فرمانے لگے سرکار اگر آپ کوٹہ نہ گئے تو کافی نقصان ہو گا [illegible]

پوچھ لیجئے کہ معاملہ یوں ہے اگر دہلی نہ جاؤں تو ہائیکورٹ میں مقدمہ
کی کیا صورت رہے گی جبکہ کوئی وکیل بھی نہیں کیا ہوا اور اگر کوٹہ نہیں
جاتا ہوں تو ویسے نقصان ہوتا ہے۔ پارسا صاحب میرے ساتھ ہی
شاہ صاحب کے دروازے تک آئے۔ دروازے پہ دستک دی تو بشیر الدین
صاحب باہر تشریف لائے ان سے قصہ بیان کیا تو فرمانے لگے آپ شاہ
صاحب کے پاس چلے جائیں۔ میں اوپر گیا تو مہاراجہ جے پور کے بھائی بھی تشریف
فرما تھے اور شاہ صاحب ایک سلیٹ پہ کچھ لکھ رہے تھے قدمبوسی
کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد
فرمایا۔ سرور صاحب آپ بلا خوف و خطر کوٹہ جائیے۔ دہلی ہائی کورٹ
میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں شاہ صاحب سے رخصت لیکر باہر آیا تو پارسا
صاحب سے کہا کہ بھائی میں تو شاہ صاحب کے فرمان کے باوجود ہائیکورٹ
سے ڈر رہا ہوں۔ پارسا کوثری نے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا۔
سرور صاحب اگر شاہ صاحب نے آپکو کوٹہ جانے کی اجازت دی ہے
تو پھر ہائی کورٹ کیا دنیا کی کوئی بھی عدالت آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی
اور آپ بغیر کسی فکر کے کوٹہ جائیے۔ چنانچہ میں اپنے پروگرام کے مطابق
کوٹہ چلا گیا شام کو جب کوٹہ پہنچا تو میں نے ہوٹل میں سامان رکھنے کے
بعد سب سے پہلے جو کام کیا وہ دہلی ٹرنک کال بک کرنے کا تھا۔ رات
کے نو بجے کے قریب عزیز ہرہوتی نے مجھے فون پہ بتایا کہ ہائی کورٹ
میں جج صاحب بیماری کے باعث تشریف ہی نہیں لائے تھے۔ لہٰذا اب
مقدمہ کی کوئی اور تاریخ مقرر ہوگی جس کا اعلان اخبارات میں
ہو جائے گا۔ میں نے دوسرے دن قبلہ شاہ صاحب کو جے پور خط سے
اطلاع دی کہ ہائیکورٹ کا معاملہ یوں ٹل گیا ہے۔

ایک عرس کے موقع پر روحی صاحبہ میرے ساتھ تھیں۔ روحی
صاحبہ کو اختلاج القلب کا عارضہ تھا۔ عرس کے اختتام پر دہلی جانے
کے لئے جب شاہ صاحب سے رخصت لینے کیلئے انکی خدمت میں حاضری
دی تو میں نے بشیر الدین صاحب سے کہلوایا کہ روحی صاحبہ بھی سلام
کیلئے حاضر ہوئی ہیں۔ کیونکہ خواتین کو شاہ صاحب کے سامنے جانے کی
اجازت نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے روحی صاحبہ کا سلام دو تین قدم کے
فاصلے سے ہی قبول فرمایا تو میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ انھیں
اختلاج القلب کے دورے پڑتے ہیں فرمانے لگے عنبر ایک ماشہ لے کر
ایک ایک رتی کی خوراک بنا کر آٹھ دن کھلا دینا یہ شکایت نہیں رہے
گی۔ حکیم عبدالرحیم صاحب ٹونک والے شاہ صاحب کے پاس
تھے۔ انھوں نے کہا۔ سرور صاحب میرے پاس خالص عنبر ہے
چنانچہ حکیم صاحب سے ایک ماشہ عنبر خرید کیا گیا اور شاہ صاحب
کے مطابق آٹھ دن ایک ایک رتی یا روحی صاحبہ کو کھلائی
کے بعد یہ عارضہ جاتا رہا ہے۔

دو سال ہوئے عرس کے موقع پر جناب گلشنی ناماتی
کو نہایت ادب کے ساتھ قبلہ شاہ صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے
فارغ صاحب شاہ صاحب سے بات چیت کرکے واپس جانے لگے۔ تو
ان کے ساتھ واقف صاحب کے دفتر تک گیا۔ راستہ میں انہوں
نے فارغ صاحب سے کہا کہ آپ نے کب سے شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت
کی ہے۔ فرمانے لگے۔ سرور صاحب آپ کو علم نہیں ہے کیا کہ شاہ صاحب
نے کس قدر احسان فرمایا ہے۔ مجھ ناچیز پر۔ اس کے بعد وہ
کہنے لگے کہ میرا لڑکا جو کہ منڈی میں ہے اچانک بیمار ہوگیا اور اس کے پاؤں
بیماری ہوگئی کہ تمام دواؤں کے استعمال سے بھی آرام نہ آیا اور ڈاکٹروں
نے کہا پاؤں کاٹنا پڑے گا۔ فارغ صاحب نے فرمایا کہ مجھے شاہ صاحب
یاد آگئے اور میں لڑکے کو رکشا میں بٹھا کر شاہ صاحب کے پاس
شاہ صاحب نے چند دنوں میں میرے لڑکے کو ٹھیک کر دیا۔ وہ ڈاکٹر
لڑکے کو لا علاج قرار دے چکے تھے اور کہتے تھے کہ پاؤں کاٹنے
کوئی راستہ اور ہے ہی نہیں۔ وہ دریافت کرتے ہیں کہ آخر وہ
ادویات تھیں جن سے اس لڑکے کو آرام ہوگیا۔ سرور صاحب!
ڈاکٹروں کو کیا بتاؤں کہ جنگل میں مرے ہوئے کتے کی ہڈی کا سفوف
گلو کے پتوں سے اس لاعلاج بیماری کا علاج ہوا ہے کیونکہ حقیقت
ہے کہ یہ قبلہ شاہ صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میرا بچہ چند دنوں
ماؤنٹ آبو سپر ریڈ میں شریک ہوگیا۔ فارغ صاحب فرمانے لگے
صاحب یہ تو اہل جے پور کی بدقسمتی ہے کہ شاہ صاحب انکی بستی
میں ہیں اور یہ بدنصیب ان سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ادھر ادھر
فضولیات میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگوں کے کہنے پر میں گوڑ گانوں کی عدالت میں ایک بیان
چکی ہوں جس شخص سے قطعاً ناواقف تھا) کی پانچ ہزار کی ضمانت
شخص مفرور ہو گیا۔ اور پتہ چلا کہ اس شخص سے ضمانت [illegible]
ڈالنے کا الزام ہے۔ [illegible] جج گوڑگانوں کی عدالت

چنانچہ ایڈیٹر شانِ ہند کے ہمراہ شکیل صاحب بھی عرس شریف کے مشاعرہ میں شریک ہوئے اور عرس کے دنوں میں وہ بے پرہیز چاول، حلوا، گوشت، دالیں وغیرہ سب ایسی غذائیں کھاتے رہے۔ جو ذیابیطس کے مریض کو چھونی نہیں چاہئیں۔ میں نے قبلہ شاہ صاحب سے عرض کیا کہ کیا واقعی شکیل صاحب کو اب یہ مرض نہیں رہے گا۔ فرمانے لگے اسے کہنا کہ بیشک ڈاکٹروں سے پیشاب ٹیسٹ کرا کے دیکھ لے۔ اس کے بعد شکیل صاحب وعدے کے باوجود عرس کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوئے۔ کہتے ہیں کہ فلمی دنیا میں لوگ خدا تک کو بھول جاتے ہیں۔ اگر شکیل صاحب قبلہ شاہ صاحب کو بھول گئے ہوں تو کیا عجب ہے اور ویسے بھی دولت کی بہتات محسنوں اور دوستوں کو بھول جانے کا سبق دیا کرتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں ہزارہا درگاہوں پر عرس لگتے ہیں مگر جہاں بھی جائیے پیسہ کا سوال پہلے ہوتا ہے ہندوؤں کے تیرتھ استھان ہوں یا مسلمانوں کے متبرک مزارات۔ پنڈے اور خادم زائرین کی جیبیں خالی کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مگر شاہ صاحب قبلہ ہر سال خواجہ سلیمان تونسوی کا عرس کراتے رہے اب ان کے جانشین بشیر الدین صاحب یہ عرس کراتے ہیں۔ تو جملہ زائرین کی رہائش اور طعام کا انتظام اپنے پاس سے کرتے ہیں۔ بعض حضرات مہینوں قیام کرتے ہیں مگر انہیں چائے کھانا سب شاہ صاحب کے یہاں سے ملتا رہتا ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ کسی بھی زائر سے نذر نیاز کے طور پر ایک پیسہ نہیں لیا جاتا۔ اور اس امر کے لئے اعلان شائع کئے جاتے ہیں کہ اس عرس کے نام پر یا قبلہ شاہ صاحب کے نام پر کسی کو ایک پیسہ نہ دیجئے بعض امراء نے اپنی مرادیں پوری ہونے پر ہزارہا روپیہ پیش کیا مگر شاہ صاحب نے پہلے تو نرمی سے انکار فرمایا اور اگر کسی نے روپیہ دینے پر اصرار کیا تو اسے سختی سے منع فرمایا۔ لہٰذا اس لحاظ سے یہ آستانہ اپنی نوعیت سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے کہ اس دور میں جب کہ ہر شخص طلب زر کے لئے دنیا بھر کے جھوٹ فریب سے کام لیتا ہے۔ یہاں از خود روپیہ دینے والوں کو بھی منع کیا جاتا ہے کہ وہ ایسا نہ کریں چنانچہ آج کا کوئی انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ یہاں کے اس آستانہ پر روپیہ بٹورنے کا دھندہ نہیں ہوتا۔ بلکہ خدمتِ خلق ہی واحد مقصد ہے تو وہ اس آستانے پر آنے کے بعد حقیقتاً روحانیت کی روشنی محسوس کرتا ہے

اور اللہ تعالیٰ اس کی پریشانی وغیرہ دور کر دیتا ہے۔

یہ یوں کہ یہ عرس بھی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے دوسرے عرسوں کی طرح محض قوالیوں اور شرک و بدعت کو ہی شعار نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ پندرہ دنوں تک نہایت مفید اور دلچسپ پروگرام ہوتے ہیں جن میں سیرت النبی پر تقاریر، بچوں اور بچیوں کو انعامات۔ نعتیہ مشاعرہ۔ کل ہند اردو مشاعرہ۔ کوی سمیلن۔ میوزک کانفرنس۔ چار بیت۔ قوالیاں وغیرہ شامل ہیں۔

جشنِ بہاراں

مہرؔ [illegible]

خوشا اہلِ وطن تقریبِ آزادی مبارک ہو
یہ قومی عیدِ تاباں اور دیوالی مبارک ہو
یہ مژدہ پھر سے دوہراتی ہوئی پندرہ اگست آئی
تمہیں اے ہند والو جیت جنتا کی مبارک ہو
سبھی اہلِ وطن شامل ہیں اس جشنِ بہاراں میں
وہ ہندو ہو، مسلماں ہو کہ عیسائی مبارک ہو
لہر پھر اک نئی آئی ہے اک انقلاب آیا
اٹھا ہے وقت لے کر پھر اک انگڑائی مبارک ہو
وہ جس کو دیکھ کر حبِّ وطن دل میں ہلوریں لے
ادائے خاص پرچم کی وہ لہراتی مبارک ہو
جہاں حیرت میں ہے بھارت کی روز افزوں ترقی پر
ہے چاروں سمت خوشحالی یہ خوشحالی مبارک ہو
لہو کے مول آزادی ملی ہے میرے ہم وطنو!
تمہیں یہ حاصلِ ایثار و قربانی مبارک ہو
چھڑایا کون بھارت ماں کے بیٹوں کو غلامی سے
ملے قسمت سے بابائے وطن گاندھی مبارک ہو
چمن کی رونق و زینت ہے قائم نونہالوں سے
وطن کی پھولتی پھلتی یہ پھلواری مبارک ہو
تمہارے ہاتھ میں ہے اب تو تزئینِ چمن مہرؔ
تمہیں اس باغ کے مالک، تمہیں مالی مبارک ہو

بھارت بھاگیہ ودھاتا

15 اگست 1947ء کو ہم بھارت کے لوگ اپنے مقدر کے مالک (بھارت بھاگیہ ودھاتا) خود بنے۔

آیئے آزادی کی 32 ویں سالگرہ پر آج :-

* اپنی کامیابیوں سے قوت اور تحریک حاصل کریں۔
* مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے تازہ دم ہو کر کام کریں۔

آزادی کے 32 برسوں میں.....

* ہم نے سب بیرونی حملوں کو پچھاڑ کر ملک کی سالمیت کی حفاظت کی ہے۔
* ہماری متوقع اوسط عمر 32 سے بڑھ کر 52 سال ہو گئی ہے۔
* ہم نے اناج کی پیداوار دو گنی سے بھی زیادہ بڑھا لی ہے۔
* ہماری صنعتی پیداوار میں چار گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔
* ہمارے بدیشی سکے کے ذخائر 5,000 کروڑ روپے سے زائد ہیں۔

"قوم بجا طور پر ناز کر سکتی ہے کہ ہماری معیشت جو جامد اور دوسروں کی دست نگر تھی جدید اور خود کفیل بن گئی ہے۔" یہ ہمارے رواں پانچسالہ منصوبے کے ڈرافٹ کا اقتباس ہے۔

آزادی اور خوشحالی کی خاطر اتحاد اور یکجہتی قائم رکھیں۔

davp 79/164

حقیقت و حال

مقبول نصیر آبادی

ہو گئے ہیں اس طرح مانوسِ قید و بند لوگ
زینتِ زنداں پہ کیا کیا ہوتے ہیں خورسند لوگ

ڈالتا ہے باغباں ہر روز نئی طرح ستم
پھر بھی ہیں اپنی زباں کو کرکے بیٹھے بند لوگ

خیر ہو گلشن کی یا رب تاک میں ہیں بجلیاں
اور یہاں بیٹھے ہوئے ہیں کرکے آنکھیں بند لوگ

اب کہاں کے عہد و پیماں اور کیا قول و قرار
سو سو جھوٹی کھاتے ہیں ہر بات پہ سوگند لوگ

باتیں ہی باتیں ہیں کچھ قیمت نہیں اب بات کی
بات کیا کیجے کہاں ہیں بات کے پابند لوگ

دوستی کے نام کو رسوا جنہوں نے کر دیا
بہرِ اغراض ایسے بھی یہاں ہیں چند لوگ

جان تک ایمان پہ بازی لگا کرتی تھی کل
آج جھوٹی کھاتے ہیں ایمان کی سوگند لوگ

خود فریبی اور خود رائی کے آگے اپنی اب
بھولتے جاتے بزرگوں کی ہیں یکسر پند لوگ

شانۂ مفلس پہ ہیں کے بار لے دورِ نوی
جی رہے ہیں آج بھی افسوس، دولتمند لوگ

دیکھ کر اس دور کی غربا نیا لا دینیت
نقش بر دیوار ہیں مقبول عزت مند لوگ

قطعات

ڈاکٹر اُودے شنکر
ارمان۔ بلاری

بے چاری آدمیت کو اب طلاق دیکر
عیش و طرب کے پیچھے انسان پھر رہا ہے
جو بھی ہو اس حقیقت کو مانتے سبھی ہیں
ہم اُٹھ رہے ہیں لیکن اخلاق گر رہا ہے

ضرورت کچھ نہ کچھ ہر آدمی کو رہتی ہے لیکن
یہ ایسی شے نہیں جو سر جھکا دینے کے قابل ہو
ضرورت مند کے دل میں رہے احساسِ خودداری
کبھی مانگی ہوئی شے میں خودی کا خون نہ شامل ہو

برقِ دلِ تعصب رقصاں ہے ہر بشر پہ
اٹھی ہوئی ہے تیغِ تخریب کل کے سر پہ
غافل بنا رہی ہے ہم کو نئی سیاست
خطرے مچل رہے ہیں ہندوستان کے در پہ

غلامی کا اثر انسان کے تن ہی تک نہیں رہتا
یہ اس کی ذہنیت کو بھی بناتی ہے غلام اپنا
ہم اپنے گھر میں انگلش بولنے پر فخر کرتے ہیں
لکھا کرتے ہیں دروازوں پہ انگریزی میں نام اپنا

نعت

حافظ اشتیاق احمد ضیا جونپوری

رکشِ جہاں گل کو بناتے ہوئے ہیں آپ
دیکر جہاں کو درسِ وفا درسِ زندگی
ہر سو بہار چھائی ہوئی ہے مگن ہیں لوگ
معراج میں حضورِ خدا محوِ گفتگو ...
معمارِ کائنات کی عظمت نہ پوچھئے
یہ معجزہ ہے پائے مبارک کا آپ کے
آجاؤ زندگی کے طلبگار و اس طرف
احمد احد کا فرق سمجھنا محال ہے
قسمت ضیا کی اوج پہ ہے شاہِ کائنات

امن و امان کی شمع جلائے ہوئے ہیں آپ
انسانیت کو اوج پہ لائے ہوئے ہیں آپ
تشریف جب سے خلق میں لائے ہوئے ہیں آپ
کتنا بلند مرتبہ پائے ہوئے ہیں آپ
حسنِ کمال یہ ہے بسائے ہوئے ہیں آپ
صحرا کو لالہ زار بناتے ہوئے ہیں آپ
پرچم حیات کا اٹھائے ہوئے ہیں آپ
حق آپ ہیں تو حق میں سمائے ہوئے ہیں آپ
اس کو غلام جب سے بنائے ہوئے ہیں آپ

"چھوت چھات خدا اور انسا[ن] کے خلاف ایک گناہ ہے"

یہ الفاظ مہاتما گاندھی کے ہیں۔
گاندھی جی نے "میرے سپنوں کا بھارت" میں
"چھوت چھات جیسی لعنت کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں"

چھوت چھات کو 1950ء میں ختم کرد[یا گیا] تھا لیکن یہ ابھی تک باقی ہے۔

آئین کے آرٹیکل 17 میں کہا گیا ہے: "چھوت چھات" [ختم کر دی]
گئی ہے اور کسی بھی شکل میں اس پر عمل ممنوع قرار دیا گیا
"چھوت چھات" کی بنیاد پر کسی کے ساتھ بھید بھاؤ
قانون کی رو سے قابلِ سزا جرم سمجھا جائے گا۔
شہری حقوق کے تحفظ کا ایکٹ، جس کو پہلے چھوت چھات
ایکٹ 1955ء کہا جاتا تھا، وہ بنیادی قانون ہے جس کے
وقار اور شیڈول کاسٹ کے کسی بھی ممبر کے مساوی
خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دی جا سکتی ہے۔

ہریجنوں کو اپنے حقوق سے واقف ہونا چا[ہئے] حکومت پانچ برس کے اندر اندر چھوت [چھات] ختم کر دینے کے ارادہ پر اٹل ہے۔

پردھان منتری نے ریاستی سرکاروں سے کہا
ہریجنوں کے حقوق کی خلاف ورزی کے ہر واقعہ کو سختی سے
سماج گروہ بندی سے نپٹائیں اور ان افسران کے خلاف سخت
کریں جو ہریجنوں کا تحفظ نہیں کر پاتے۔
ہمارے جیسے جمہوری سماج کو کمزور طبقوں کے
کرنا چاہئے۔ چھوت چھات کے خلاف لڑائی انسانی وقار کی
لڑائی ہے۔

آٹھ کروڑ انسانوں پر ظلم نہیں کیا جا[نا چاہئے]

ہمارے دمِ قدم سے ہو جو بالا شانِ آزادی

مفتوں کوٹوی۔ ہرن بازار۔ اٹی چوک کوٹہ (راجستھان)

یہ آزادی کا منشا ہے ہماری ہو حکومت کو ہمارے ملک کی خود اپنے ہی ہاتھوں [illegible]
بہم ربط و محبت ہو جہاں انس و اخوت ہو میسر سب کو آسائش ہو آرائش ہو [illegible]

امیر ایسے نہ ہوں جنکو غریبوں کی نہ پرواہ ہو
غریب ایسے نہ ہوں جنکو نہ روٹی تک مہیا ہو

بزرگوں کی کریں تعظیم چھوٹوں پہ کریں شفقت ہو ان کے دل میں عظمت جو ہو [illegible]
ہو نظمِ زندگی ایسا کہ ہو یہ زندگی نعمت وہ ہو پابندئ دستور اپنا دیس ہو جنت

یہی وہ خواب ہے جو لیڈروں نے اپنے دیکھا تھا
یہی تھی جنگِ آزادی یہی بس اس کا منشا تھا

مگر یہ کیا کہ آزادی ملی، اخلاق کھو بیٹھے چراغاں کر رہے ہیں دل کی تاریکی [illegible]
خلوص و انس سے صدق و صفا سے ہاتھ دھو بیٹھے عداوت بغض و کینہ، زمین و زر [illegible]

جو تھیں اسلاف میں وہ خوبیاں باقی کہاں ہم میں
محبت اور مروت کا نہیں نام و نشاں ہم میں

اگر دیکھیں سیاست کو عجب اس کا تماشا ہے ہر اک مکر و ریا کذب و دروغ [illegible]
اراکینِ حکومت کو غرض مندی نے مارا ہے جو ہیں تاجر فقط اپنا منافع ان کو پیارا ہے

نئی نسلوں کے بہتے ہیں تباہی کی طرف دھارے
جو طالب علم ہیں آزاد نظم و ضبط ہیں سارے

ہمارا قول و فعل لائے کاوش ہو شایانِ آزادی ہمارے دم قدم سے ہو جو بالا شانِ آزادی
چمک اٹھے فروغِ خلق سے عنوانِ آزادی ہر اک پہلو سے حاصل ہو ہمیں [illegible]

خدائے پاک آزادی کی اہلیت ہمیں بخشے
جو نعمت دی تو نعمت کی [illegible] بخشے

جشنِ آزادی

اخلاق سہسوانی

اگست کا یہ مہینہ یہ پندرہ تاریخ — دلوں کو جس نے مسرت سے کر دیا معمور
وطن ہمارا ہوا آج ہی کے دن آزاد — اسی لئے تو ہمیں ہونا چاہئے مسرور
ہمارے واسطے یہ دن ہے ایک روزِ سعید — یہ دن یہ رُوحِ رواں نشاط و لطف و سرور

یہ دن یہ طوقِ غلامی کے ٹوٹ جانے کا دن
یہ دن یہ اپنے چمن میں بہار آنے کا دن

یہ دن یہ کیف و مسرت کے امتزاج کا دن — نہ کیوں کہیں ہم اسے یادگارِ آزادی
مگر نہ کر سکے ہم قدر و منزلت اس کی — ہمیں نہ سمجھے کہ کیا ہے وقارِ آزادی

ہمیں نے بھر لی ہے اپنے دلوں میں خود نفرت
سحر کے چہرے پہ ملتے ہیں غازۂ ظلمت

یہ اشکبار کی شبنم یہ سوگوار سے گل — بدل دیئے ہوں بہاروں نے جیسے اپنے اصول
شگفتگی ہے گلستاں سے بے تعلق سی! — ہر ایک غنچہ اُداس اور ہر کلی ہے ملول
یہ کل کی بات ہے جو گلستاں کی زینت تھے — ترس رہے ہیں تبسم کو باغ میں وہ پھول

اٹھو وطن کے جوانو! اُٹھو خدا کے لئے
ذرا جلا دو اندھیروں میں راستوں کے دیئے

تمہیں قسم ہے ان آنکھوں کی جو ہیں آج بھی نم — تمہیں قسم ہے غریبوں کی بے سہاروں کی
ترس رہا ہے چمن جن میں مسکرانے کو — تمہیں قسم ہے ان افسردہ سی بہاروں کی
تڑپ رہی ہیں درِ مستجاب پہ جو ابھی — تمہیں قسم ہے غریبوں کی ان پکاروں کی

بدل سکو تو بدل دو یہ وحشیانہ نظام
مٹا سکو تو مٹا دو ذرا غم و آلام

پڑے رہو گے یونہی ظلمتوں میں تم کب تک — اٹھو ستاروں سے تنویر چھین لو بڑھ کر
تمہارے سامنے جمہوریت کی ہر تو ہین ہے — تمہیں بتاؤ گوارہ کرو گے تم کب تک؟
اُٹھو سنوار دو بڑھ کے کاکل گیتی — اُٹھو کہ فرقہ پرستی سے بڑھ کے لو ٹکر

پھر اس ادا سے تم اپنے قدم جما کے چلو
پہاڑ سامنے آئے تو اس کو ڈھا کے چلو

تمہارے حوصلے پر بربریت معاذ اللہ — اٹھو زمانے کو پیغام زندگی دے دو
شب سیاہ کی ظلمت کو چاک کر ڈالو — سحر سے چھین کے ہر رخ کو روشنی دے دو
بنا دو رشکِ جناں ہند کے گلستاں کو — خزاں کو لالہ و گل کی شگفتگی دے دو

جو چاہو تم تو فلک سے زمیں کو ٹکرا دو
جو چاہو تم تو اندھیروں میں نور پھیلا دو

غزل

حیرت [illegible]

زندگی کی قدر سنے والے کو دعا دینی پڑے
تم کو شاید اپنے دامن کی ہوا دینی پڑے

میں کہوں سرکار سر آنکھوں پہ ہے میری بجا
جب گنہ گار محبت کو سزا دینی پڑے

جس نے توبہ توڑ دی ہے اس کا دل ٹوٹا تو پھر
جام و مینا کو بھی قلقل کی صدا دینی پڑے

توبہ توبہ، توبہ توبہ، اپنے دل ہی میں ہے یہ بات
جانِ منبر ساقیِ رنگیں ادا دینی پڑے

باہمی رنج و رقابت لا نہ دے وہ دن کہیں
آگ اپنے آپ گلشن کو لگا دینی پڑے

عصرِ حاضر کی ترقی دیکھ کر لگتا ہے ڈر
سوچتا ہوں عہدِ ماضی کو صدا دینی پڑے

خونِ شہدا کی امیں ہے پیش داور دیکھنا
یہ امانت اے زمینِ کربلا دینی پڑے

مے کدے کی سیر اچھی شیخ کچھ اچھی نہیں
جانے کیا کیا چیز مرد باصفا دینی پڑے

آتشِ فرقت دبائی جائے گی حیرت کہاں
عین ممکن ہے اسے پھر سے ہوا دینی پڑے

گوتم بدھ

احمد حسین شمس
کشن گنج۔ پورنیہ

سچدانند نے سنبھالی جب　　تیغ ست کی سپر اہنسا کی
بھول بیٹھے استور جور و جفا　　ہوگئی دور دل سے ناپاکی
امن یک لخت چھا گیا ہر سو　　چھوڑ دی سازشوں نے سفاکی
جیو جنتو کو مل گئی راحت　　پریم نے وہ نگاہ پیدا کی
قلب کی تہہ سے جوت وہ پھوٹی　　پیکرِ نور بن گیا خاکی
آرزو کی کلی شمیم افشاں　　روح پرور روش تھا کی
زورِ نکہت کے عہد میں نہ رہا　　ایک دل بھی نصیب کا شاکی

برہمن شودر ایک ہو بیٹھے
نسل کے رنگ و روپ دھو بیٹھے

(۲)

قتل، نفرت، نفاق، ظلم، ستم　　آریوں کے یہی تھے بس جوہر
جل رہی تھی تپ جہنم سے　　ہند کی سرزمیں سراسر
ظلمتوں کی ادا وہ دہشت خیز　　شمعِ خاموش بدحواس نظر
آدمی تک چڑھائے جاتے تھے　　دیویوں اور دیوتاؤں پر
اٹھ رہی تھی صدائے آہ و فغاں　　دین و مذہب کے ظلم سے گھر گھر
اتنے بزدل ہوئے نقوش پرست　　کانپتے تھے ہواؤں سے تھر تھر
اپنے سائے سے خوف کھاتا تھا　　اس قدر تھا قتیلِ وہم بشر

شیطنت کا وہ بول بالا تھا
زرد ماحول، وقت کالا تھا

دیکھ کر حالِ زار بھارت کی　　مضطرب ہو اٹھی نگاہِ کرم
رحم آکاش سے اتر آیا—　　بن گیا منبعِ وفا آدم
ایک برگد کے پیڑ کے نیچے　　صلح و اصلاح کا کھلا پرچم
چین کی بانسری تھی بجنے　　گونج اٹھا صدق و صفا کا سرگم
کس نے گلشن کی آبرو رکھ لی!　　کس نے بخشا بہار کا موسم؟
کس کی منت پذیر ہے دنیا!　　کس کا احسان مند ہے عالم؟
ایک ہستی جہاں کی جنت　　ایک انساں مہاتما گوتم

آدمی آدمی میں انتر ہے
کوئی ہیرا ہے کوئی کنکر ہے

غزل

[illegible]

مکاں تلاش کروں لامکاں تلاش کروں
کہاں کہاں میں تجھے مہرباں تلاش کروں

تمہارے جیسا کہیں بھی نظر نہیں آتا
تمہیں بتاؤ کہ تم سا کہاں تلاش کروں

مجھے بھی جانا ہے جائے طوافِ کعبہ کو
[illegible] کو تمہاں تلاش کروں

یہ میرا عزم مصمم نہیں تو پھر کیا ہے
ہنا کے آشیاں برق تپاں تلاش کروں

جہاں سکون سے یہ زندگی گزر جائے
[illegible] اپنا جہاں تلاش کروں

۱۵ اگست
مُبارک موقع پر
انتہائی نیک خواہشات
کے ساتھ
دلی دُعا ہے کہ ہمارا ملک ترقّی کی منازل
طے کرتا رہے اور ہم سب بھائیوں کی طرح
مل کر ہمیشہ یوم آزادی مناتے رہیں۔
ہوٹل راجدوت
نئی دہلی

ہماری آزادی کا یادگاری دن ہے۔

ہند کی آزادی، جمہوریت، اور قومی یک جہتی کے لئے ہم سب کو صدقِ دل سے یہ حلف لینا چاہئے کہ ہم اپنے کردار اور عمل سے ان قدروں کی حفاظت کریں گے۔ اور دیش کے پتا مہاتما گاندھی کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے ملک کی حفاظت کریں گے۔ اور جمہوری حکومت کو مستحکم کرنے کے علاوہ بلا تخصیصِ مذہب و ملت مل جل کر رہیں گے۔

ہندوستان زندہ باد
ہماری آزادی پائندہ باد

ایمن چند پیارے لال

کلکتہ نئی دہلی جالندھر

غزلیات

امتیاز جے پوری (احمد آباد)

پھر اس طرح سے تمہارا خیال رکھا ہے
تمہاری یاد کو سینے میں پال رکھا ہے

جو غم میں ہجر میں غربت میں جی رہا ہے اُسے
ہر ایک شخص نے دل سے نکال رکھا ہے

اداس رہ کے بھی ہم مسکرائے جاتے ہیں
اسی طرح سے ہر اک غم کو ٹال رکھا ہے

اُلجھ کے رہ گئے حق حق پکارنے والے
وفا کی راہ میں اک ایسا جال رکھا ہے

نہ علم اچھا تھا نہ مشہور امتیاز ہوئے
ہمارے نام کو اُس نے اُچھال رکھا ہے

زخمی حصاری

ایثار سے مقابلہ ہے بدشعار کا
زعم و وقار دیکھئے اک بے وقار کا

فصلِ خزاں کو کہہ دیا فصلِ بہار ہے
اللہ رے اختیار یہ بے اختیار کا

اتنا تو یاد ہے مجھے اے موسمِ خزاں
آیا تھا زندگی میں بھی موسم بہار کا

بربادیٔ حیات جسے راس آگئی
کیا ڈر ہے اس کو گردشِ لیل و نہار کا

تاریکیوں میں بھی مجھے رستہ دکھا گئی
اعجاز جانئے اسے شمعِ مزار کا

وہ شاخ جس پہ میرا نشیمن تھا جل گئی
کارِ نمایاں دیکھئے برق و شرار کا

آتی ہے اُن کی یاد تو خوشیاں لئے ہوئے
سایہ سا دل پہ ہے مگر غم کے غبار کا

جب سے کسی کے قرب میں لذت نہیں رہی
ہے انتظار مجھ کو شبِ انتظار کا

مانا کہ زندگی ہے ہجومِ غم و الم
لیکن جواز چاہئے اس سے فرار کا

بعدِ فنا دکھا دیا انجامِ زندگی
ممنون ہوں میں اپنے شکستہ مزار کا

زخمی فریب خوردۂ رنگِ بہار ہوں
گلزار پر بھی ہے جو گماں خارزار کا

بسمل نقشبندی دہلوی

اک ایک پل حیات کا ہستی پہ بار ہے
چسپاں ہر ایک چہرے پہ یہ اشتہار ہے

ناکام آرزوؤں کا ہر سو حصار ہے
خوش فہمیوں سے پھر بھی نظر ہمکنار ہے

پھولوں کے چہرے زرد ہیں شاداب خار ہیں
شاید خزاں کے تن پہ لباسِ بہار ہے

ایسی تیرگی نے مجھ کو لوح یقیں ناچتے
وہ صبحِ نور جس کا تجھے انتظار ہے

اس طرح زندگی کی دعا کر رہے ہیں لوگ
جیسے حیات سات سمندر کے پار ہے

بے چہرہ لوگ ملتے ہیں راہوں میں ہر جگہ
میں کس دیار میں ہوں یہ کیسا دیار ہے

یوں میرا درد بانٹنے آئے ہوئے ہیں لوگ
جیسے ہر ایک شخص مرا غمگسار ہے

جلتا ہے روز رات گئے میکدے کے پاس
وہ ایک شخص جو کہ تہجد گزار ہے

بسمل وہ رزق دیتا ہے ہر حال میں مگر
دل پھر بھی مبتلائے غمِ روزگار ہے

ساغر ساگری

میں ان کے عنایات و کرم دیکھ چکا ہوں
یعنی شبِ ہجراں کے الم دیکھ چکا ہوں

رہتے ہیں جہاں زہرہ جبیں منتظر لیے
اے دوست میں ایسے بھی حرم دیکھ چکا ہوں

سلجھائے نہ سلجھیں گے کبھی تا بہ قیامت
میں گیسوئے دوراں کے بھی خم دیکھ چکا ہوں

بیتابیٔ دل سوزِ جگر آنکھ میں آنسو
اے شوخِ نظر تیرا کرم دیکھ چکا ہوں

ہے اہلِ گلستاں کی نظر اب بھی قفس پر
میں سارے گلستاں کا بھرم دیکھ چکا ہوں

اب آپ نہ دہرائیے ہجراں کی کوئی بات
میں ان کے بڑے ظلم و ستم دیکھ چکا ہوں

ساغر تو ہے میخوارِ ازل تجھ کو بھی لیکن
پیتے ہوئے اے شیخِ حرم دیکھ چکا ہوں

ہنر صاحب خوب خوب داد وصول کئے جا رہے ہیں
اور عابد صاحب فراقؔ گھنڈوی کو زحمتِ سخن دے رہے
ہیں فراقؔ صاحب بڑے غلام علی خان سے غزل سرا ہیں سہ

دل کو جلوؤں سے ذرا دیر بہل جانے دے
حسرت مرے ارمان نکل جانے دے
دل ترکیب پذیر ہے پتھر بھی پگھل جائیں گے
غم کے افسانے کو تحریر میں ڈھل جانے دے
ایک شعلہ سا بھڑک اٹھے گا رخساروں سے
حسنِ معصوم کے تیور تو بدل جانے دے

فراقؔ صاحب محفل کو نغمگی میں ڈبو کر اور داد پا کر اپنی جگہ
آ رہے ہیں اور عابد صاحب ماہر رتلامی کو یاد فرما رہے ہیں
ماہر صاحب فرما رہے ہیں سہ۔

مسلسل خموشی کا عذاب جتا دو
ذرا میں سنے کی سبے تو بیشک سزا دو
جو آداب رندی کا سے واقف نہیں ہے
اٹھا دو اُسے میکدہ سے اٹھا دو
جو کچھ مجھ سے نفرت مرا گھر جلاتے
ہر کس نے کہا تھا کہ بستی جلا دو

داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے کئی بار دہرا کر ارشاد
ہوا ہے سہ

غنیمت ہے دھندلی سی شمعِ محبت
تبسم کے روشنی دیوانے کو بھلا دو

ماہر صاحب بھی داد لوٹنے اپنی جگہ پلٹ رہے ہیں اور عابد
صاحب کاظم رعنا راہی کو محفل کی زینت بنا رہے ہیں راہی صاحب
ڈاکٹر ساغر نے الاپ رہے ہیں سہ۔

ٹھان لی ہے اب میں نے تیرگی مٹانے کی
ایک طرف میری کوشش اک طرف زمانے کی

دوسرے مصرعہ پر داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ پڑھ رہے
ہیں سہ

کیا ملائے گا کوئی جن کہتے ہیں پر تب سے
ہم نے اتنی کھائی ہیں ٹھوکریں زمانے کی

مجھکو پا نہ لے کوئی خوف تھا یہی ورنہ
مجھکو کیا ضرورت تھی نقشِ پا مٹانے کی

پھر آہ اور داد کا دھماکہ ہوا ہے اور آپ کامران پلٹ رہے ہیں
ادھر عابد صاحب شفیع شمسی بھوپالی سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں
شمسی صاحب فرما رہے ہیں سہ۔

ہر دل پہ غم و یاس کے پہرے نظر آئے
جلسے ہو غضب جان سے چہرے نظر آئے
جو زخم ہمیں دیکھے گیا عہدِ گذشتہ
وہ زخمِ جگر اور بھی گہرے نظر آئے

مناسب داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں سہ

دن سنہرے پی گئی ہر شئے سہانی پی گئی
زندگی کی ساری خوشیاں یہ گرانی پی گئی
ارتقا کی سرحدوں تک جاتے جاتے یہ سبھی
تشنگی میں اک ایک چہرے کا پانی پی گئی

شمسی صاحب داد وصول کئے چلتے بنے اور عابد صاحب دعوتِ نغمگی دے
رہے ہیں شفیق راہی فیروز آبادی کو۔ راہی صاحب تالیوں کے شور
میں مائک پر آکر غزل سرا ہیں سہ

یاد نے تری جب جب چھیڑا رہ کر تنہائی میں
دھیرے دھیرے درد نے کی کروٹ قلبِ سودائی میں
ساون کی رُت لوٹ کے آئی جان پڑی گھنگھورائی میں
پھر اُبھری ہے دل کی چوٹیں آگ لگے پُروائی میں
کتنے نغمے ہیں رقصیدہ ایک تبسم میں تیرے
کتنے محشر پوشیدہ ہیں ایک تری انگڑائی میں
لب پہ تبسم دیکھنے والے کاش تجھے اندازہ ہو
کتنے گہرے زخم چھپے ہیں اس دل کی گہرائی میں

راہی صاحب محفل کو گرما کر کامران پلٹ رہے ہیں اور عابد صاحب
دعوتِ موسیقی دے رہے ہیں، شمع تمنائی صاحبہ کو۔ دیکھا تو ایک
نوعمر خوش جمال مائک پر یلغار کر رہی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں یہ
یہ عمر تو تعلیم حاصل کرنے کی تھی اللہ جانے کیا شوق ہے یا کوئی
مجبوری ہے لحن طلعت میں غزل الاپ رہی ہیں سہ

مجھکو مجھ سے ہی ملا کر یہ سزا دیتے ہیں + میرے دشمن کو مرے پاس بٹھا دیتے ہیں

لم نہ پوچھیے۔ حسن۔ گلے کی نشستانی۔ مطلع کا جواب پھر کون کافر
او نہ دے گا۔ اور یہ بات الگ کہ یہ مطلع شمع صاحبہ کی عمر سے کہیں
یادہ اور بڑا ہے اور آپ ہرا رہی ہیں ؎

وہ دبے پاؤں بھی آئیں تو صدا دیتے ہیں
سوکھے پتے بھی گلستاں کی ہوا دیتے ہیں
نامۂ شوق بعنوان غزل لکھ لکھ کر
اپنے محبوب کو محفل میں سنا دیتے ہیں

بھی محبوب ہے —؟ ایک دبی سی آواز — اور آپ
کو لوٹنے چلی ہیں ؎

ہم تو روداد الم خون سے لکھتے ہیں مگر
وہ جو پڑھتے ہیں تو اشکوں سے مٹا دیتے ہیں

صاحبہ شاداں بیٹھ رہی ہیں اور اس عالم نغمگی میں سعید نعمانی
بادی یوں اپنے ترنم کے جوہر دکھانے چلے ہیں ؎

دکشی تو کر لوں مگر یہ خیال ہے
ار میں جناب کا نام آئے گا
مجھ سے بچھڑ کے بھی مرا سایہ یقین کر
اک اک قدم پہ نقش بقا چھوڑ جائے گا
شکرانے دیکھو تو اپنے سعید کو
یست کے سفر میں بہت کام آئے گا

سعید صاحب تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں اور
ر صاحب حسن فتحپوری کو یاد فرما رہے ہیں حسن صاحب نہایت
وقار انداز سے فرما رہے ہیں ؎

ب ہیں پاسپر لئے صاحب — ذرا آہستہ بولئے صاحب
ن کتابوں میں اپنا ماضی ہے — وہ کتابیں نہ کھولئے صاحب
یرے مٹنے پہ آنکھ میں آنسو — یہ کرم کیوں ہے بولئے صاحب
ج کچھ ہو گیا ہے جی ہلکا — ہم جو کچھ دیر رو لئے صاحب

حسن صاحب داد و تحسین وصول کئے جا رہے ہیں اور عابد
صاحب اس مشاعرے کے روح رواں دانش علیگڈھی سے درخواست
کلام کر رہے ہیں دانش صاحب تالیوں کے شور میں مائک پر آ کر
یوں لحن داؤدی میں غزل سرا ہیں ؎

میری یادوں میں کچھ ان کی ادا شامل ہے
اور کچھ میری خطاؤں کی سزا شامل ہے
نغمگی ایسے لٹاتے ہوئی گذری ہے صبا
جیسے اس میں پائل کی صدا شامل ہے
وہ مرا دوست ہے یا دوست نما دشمن ہے
اب تو ظالم کی وفا میں بھی جفا شامل ہے
ان کو شہرت کی جو معراج ملی ہے دانش
اس میں اپنا بھی تو کچھ خون وفا شامل ہے

دانش صاحب خوب خوب محفل کو گرما کر کامراں بیٹھ رہے ہیں اور
عابد صاحب رزاق انور دھولیوی کو زحمت سخن دے رہے ہیں
انور صاحب فرما رہے ہیں ؎

دنیا کی کسوٹی پر پورے وہ اترتے ہیں
جو لوگ زمانے کے ہر غم سے گزرتے ہیں
کیا سلسلہ باندھا ہے یادوں کی نوازش نے
اک زخم نہیں بھرتا سو زخم ابھرتے ہیں
وہ دن بھی عجب دن تھے لمحوں میں کٹیں صدیاں
صدیوں کی طرح اب تو لمحات گزرتے ہیں

انور صاحب محفل کو گرما کر خوب خوب داد لوٹے اپنی جگہ آ رہے
ہیں۔ اور عابد صاحب اختر آصف برہانپوری کو یاد فرما رہے ہیں
آصف صاحب فرما رہے ہیں

دھیان کے وقت اگر سامنے پتھر آئے
ایک جوگی یہی سمجھے کہ شنکر آئے
ہو پہاڑوں سا اگر دل تو مرے ساتھ چلو
یہ بھی ممکن ہے کہ رستے میں سمندر آئے
نعرۂ امن کا جس سمت سے شور اٹھتا تھا
آج اسی سمت سے پتھر مری چھت پر آئے

آہ اور واہ نے ہال کو اٹھا لینے کی کوشش کی جسے کئی بار دہرا کر
ارشاد ہوا ہے ؎

اپنے مرجھائے ہوئے دل کا جب آیا خیال
اڑکے سوکھے ہوئے پتے جو مرے گھر آئے
شخصیت میری وہ کیا دیکھ سکیں گے آصف
آئینہ جو نہ مرے قد کے برابر آئے

آصف صاحب بھی داد پاکر بلیٹ رہے ہیں ادھر عابد صاحب غوث نغمگی دے رہے ہیں اختر گوالیاری کو۔ اختر صاحب محفل کا جائزہ لیکر یوں لحنِ داؤدی میں غزل سرا ہیں ؎

جب رگ رگ میں غمِ دوست سما جاتا ہے
تب کہیں جا کے دعاؤں میں اثر آتا ہے
غم نہیں وہ بھی نہیں وہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
کون ہے پھر جو غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے

داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ اسی بانکپن سے محفل کو جگمگاتے چلے ہیں ؎

دھوپ ہی ٹھیک ہے اس چھاؤں سے جو گم کر دے
کم سے کم دھوپ میں سایہ تو نظر آتا ہے

ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے کئی بار ٹھہر ٹھہر کر لہرا رہے ہیں ؎

لوگ کہتے ہیں کبھی پی کے تو دیکھو اختر
گرمیٔ مے سے ہر اک درد پگھل جاتا ہے

داد و تحسین ایک اور ایک اور کے بے ہنگم شور میں ایک غزل اسی سج دھج سے سنا رہے ہیں ؎

ہمیں تو ان کی نگاہوں پہ اعتبار نہیں
جو کہہ رہے ہیں ادھر سے بہار گذری ہے
ابھی ابھی تو نہ آئے خیالِ آمدِ یار
ابھی ابھی تو شبِ انتظار گزری ہے
لہو میں ڈوبی ہے پیشانیٔ چمن اے دوست
سنا ہے اب کے برس یوں بہار گزری ہے

اختر صاحب تالیوں کے بے ہنگم شور میں محفل کو لوٹ کر شاداں بلیٹ رہے ہیں اور عابد صاحب غوث صاحب کو یاد فرما رہے ہیں غوث صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

کرے گا کون فریاد و فغاں جب ہم نہیں ہوں گے
ستم ڈھائے گا کس پر آسماں جب ہم نہیں ہوں گے
ہمارے دم قدم سے ہے ترا آباد مے خانہ
اڑے گی خاک اے پیرِ مغاں جب ہم نہیں ہوں گے

غوث صاحب گل افشانی کرا کے چلتے بنے اور اب عابد صاحب رنگِ محفل بدلنے کیلئے مشہور مترنم شاعر انجم چھلپوری کو دعوتِ موسیقی دے رہے ہیں انجم صاحب تالیوں کی جھنکار میں آ کر غزل الاپ رہے ہیں ؎

تھک کے وہ بیٹھ گیا راہ میں رہنما ہو کر بھی
میں تو چلتا ہی رہا آبلہ پا ہو کر بھی
تم تو سورج تھے مگر ڈوب گئے فرقت میں
میں اندھیروں کے مقابل ہوں دیا ہو کر بھی
تو مجھے زہر سمجھتا ہے تو نزدیک نہ آ
میں ترے کام نہ آؤں گا دوا ہو کر بھی
جانے کیا بات ہوئی کون سا جذبہ لیکر
وہ مرے پاس چلے آئے خفا ہو کر بھی

انجم صاحب خوب خوب محفل کو گرما کر داد و تحسین وصول کئے جا رہے ہیں اور اب اپنے کریمی الاحسانی سے وہ اشعار سن لیجئے گا جو گذشتہ سال رتلام کے مشاعرے سے واپسی پر کہے تھے ؎

امیر ہو تو طوائف بھی سب کی سالی ہے
وگرنہ مفلسی گندی سی ایک گالی ہے

میں کسی اور مشاعرہ میں بھی سنا چکا ہوں لہٰذا ان پرانے اشعار کو سنکر کیا لیجئے گا۔ میرے ساتھ ہی اس مشاعرہ کا پہلا کامیاب دور ۱۲ بجے ختم ہو کر دوسرا دور تقریباً پونے تین بجے تک نہایت کامیابی کیساتھ جاری رہا۔ رتلام میں مشاعروں کے ہنگامے جناب دانش صاحب کے دم سے ہیں یہاں کے سامعین سخن فہم اور شعراء نواز ہیں کسی بھی مشاعرہ میں ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی نہیں ہوتی بلکہ نہایت خاموشی سے مشاعروں کو سنکر کامیاب کراتے ہیں۔ یہ سب حضرات اور دانش صاحب اور ان کے کلب کے تمام ممبران مبارکباد کے مستحق ہیں بہت جلد یہاں کے میلہ کا مشاعرہ بھی پیش کرنے میں خوشی محسوس کرونگا۔ سنا ہے کہ یہ مشاعرہ بھی شاندار اور لاجواب ہوتا ہے۔ اچھا خدا حافظ ـــ ●●●

انسانیت کی موت

حسن ساہو
اے بگرو بازار۔ سری نگر۔ کشمیر

جوق در جوق لوگ جن میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ تھی چار اپریل کو نماز غائبانہ ادا کرنے کی خاطر وسیع و عریض پولو گراؤنڈ کی جانب چل پڑے۔

کچھ سینہ کوبی کر رہے تھے۔ کچھ نوحے پڑھ رہے تھے۔ کچھ بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہے تھے اور کرۂ ارض فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔

پاکستان مردہ باد
ضیا کتا ہائے، ہائے
شہید بھٹو امر ہے
مولوی ٹولہ کو ختم کرو
مقبوضہ کشمیر کو واپس کر دو

غرض ایک جم غفیر نے نماز ایک ساتھ ادا کی۔ بلالحاظ پارٹی اور مسلک کے ابھی نماز کے فرائض سے فراغت پانے ہی والے تھے کہ باغ کے گوشۂ راست میں آگ کے شعلے بلند ہو گئے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ مشتعل ہجوم نے گرجا گھر کو آگ لگا دی ہے۔

"ارے بھائی یہ خدا کا گھر ہے عبادت کے لئے وقف ہے۔ اس کے جلانے سے کیا حاصل ہوگا؟ اللہ سے تو ڈرو۔"

میرے بغل میں کھڑے نیم معمر شخص کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ اس کے جواب میں ہجوم میں سے ایک نوجوان نے زبان وا کر دی

"گرجا گھر جلتا ہے تو جلنے دو۔ یہ عیسائی تو ہمارے نہیں بن سکتے۔ ان سے ہمارا نباہ نہیں ہو سکتا۔ امریکہ کی شہ پہ یہ قیامت صغریٰ بپا ہوئی ہے۔ شہید بھٹو کا قاتل تارا مسیح بھی تو عیسائی ہے۔"

"مگر اس میں تارا مسیح کا کیا قصور ہے۔ وہ ایک ملازم ہے اور اپنے آقاؤں کا حکم بجا لایا ہے۔ اس میں گرجا گھر یا عیسائی مذہب کے ماننے والوں کا کیا دخل ...۔ کاش ہم جوش کے ساتھ ساتھ ہوش کو باقی رکھتے۔"

میں اس معمر شخص کی حمایت میں اتنا کہتا ہوا اپنے دوست انور کے ساتھ بھیڑ کو چیر کے آگے بڑھنے لگا۔ لال چوک کے پاس بڑے ہجوم نے ضیاء الحق کے پتلے کو نذر آتش کر دیا... ساتھ ہی ابو الکلام روڈ پر خاصہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ پاس جانے پر ایک غیر ملکی سیاح کو خون میں لت پت پایا۔

"ارے ان انگریز سالوں نے بھٹو کو مروایا ہے۔ ان شاطروں نے ہمیشہ ہمارے جذبات و احساسات کی نگری میں آگ لگا دینا اپنا فرض جان لیا ہے۔"

کوئی تقریر کرنے کے انداز میں بول رہا تھا۔ اور چند بزرگ قسم کے لوگوں کی مداخلت کرنے پر اس انگریز بچو کو آفت سے بچا لیا گیا۔ معاملہ کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے میں نے زباں کو مہر لگا لی۔

اگلے دن ساری وادی میں افراتفری کا بازار گرم ہوا۔ انسانیت سوز واقعات دیکھنے کو ملے۔ ہزارہا واقعات میں سے ایک سانحہ مجھے تا زندگی یاد رہے گا۔ جس کو قارئین شان ہند کی خدمت میں پیش کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔

اعجاز ضلع اننت ناگ کے موضع بجبہاڑہ میں سکونت پذیر ہے۔ اس کی شریک حیات اصغری پاس کے گاؤں اروڑی کے مولوی اشفاق کی دختر تھی۔ اپنے علاقہ میں جب مولوی ٹولہ اور جماعت اسلامی کے خلاف لاوا پکتا گیا۔ اور اس پارٹی سے وابستہ کچھ لوگوں کی پٹائی گئی تو اعجاز کے والدین نے مناسب جانا کہ بہو اصغری اور اس کے سات سالہ لڑکے رزاق کو ننھیال بھیج دیا جائے اعجاز بیوی اور بچے کو والدین کی ہدایت پر اروڑی چھوڑ آیا....

مولوی اشفاق گاؤں کی مسجد میں پیش امام کے فرائض ساتھ ساتھ مقامی اسکول میں استاد تھے۔ لیکن یہ حقیقت کہ اس موضع کے اکثر لوگ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے۔ بیوی اور بچے کو اپنے سسرال چھوڑ کر اعجاز بظاہر فکر سے آزاد ہو گئے۔ لیکن دن ڈھلے ہی سننے میں آیا کہ آس پاس کے علاقوں میں مقیم ہزارہا لوگوں نے

اروی گاؤں پر حملہ کر دیا ہے۔

افسوس۔ ایک خدا
ایک کتاب
ایک قبلہ
ایک رسول

اور ایک مسلک کے ماننے والے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ اسلام کے پیروکار۔ اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں پیش پیش تھے۔ اعجاز نے اس مذہبی منافرت کے خلاف کچھ کہنا چاہا کہ اسے پیٹا گیا۔

" ارے سالے تم نے بھی تو اس جماعت کی لونڈیا کو شریکِ حیات بنایا ہے۔ "

لوگوں کا کہنا ہے کہ مسٹر بھٹو کو امریکہ کی شہ پر فقط جماعتِ اسلامی کے ذمہ داروں نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ قتل کا مقدمہ ایک ڈھونگ تھا، ایک کھیل تھا۔ نظامِ مصطفیٰ ایک دکھاوا... دراصل وہ غریبوں، محنت کشوں اور مزدوروں کے ہمدرد و محسن جناب بھٹو کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ جماعتِ اسلامی "اسلام کے دامن پر ایک داغ ہے۔ اس پارٹی کے کرتوت آر۔ ایس۔ ایس سے کسی طور کم نہیں غرض جتنے منہ اتنی باتیں سننے کو ملتی۔ اور پاکستان کے خلاف لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں اس قدر نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا کہ کچھ شائستہ اور سمجھ دار لوگ اصلیت سے باخبر ہونے کے باوجود زبان نہ کھول سکے۔ گو مسٹر بھٹو نے بھی دورانِ حکومت کچھ غلطیاں کی تھیں لیکن کیا مجال کہ ان کا اظہار کر دیا جائے۔

ہاں تو ہجوم نے جہلم دریا پر تعمیر شدہ پُل کو جو بھیاڑہ اور اروی کو آپس میں ملاتا تھا آگ لگا دی تاکہ کوئی آسانی کے ساتھ دریا پار نہ کر سکے اس کے بعد جلتی ہوئی لکڑیاں ہاتھوں میں لیکر اروی گاؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شیطانی ہتھکنڈے پر پھیلانے میں پیش پیش رہے۔

آن واحد میں گاؤں کو مکمل طور پر آگ کی نذر کر دیا گیا لوگوں کو مارا پیٹا گیا اور تو اور گاؤں کی مسجد تک کو خاکستر کیا گیا۔ املاک کے ساتھ ساتھ میوہ دار درختوں سے لبریز باغات کو تہس نہس کیا گیا۔

اعجاز نے جب یہ خبر سنی تو حواس باختہ اصغری اور ... کی یاد میں اروی کی جانب چل پڑا۔

کسی نہ کسی طرح اس نے دریائے جہلم کو تیر کر پار کر شام گزرے جبکہ آگ کے شعلے ہر طرف بلند ہو رہے۔ سسرال پہنچ گئے۔ مولوی صاحب کی کوٹھی تو پوری جل چکی مولوی صاحب مار پیٹ اور اس حادثہ کی وجہ سے جاں بحق" اعجاز کی حالت ابتر تھی۔ وہ اور اس کی ہوشمندی ڈگمگانے لگی۔ اس نے اصغری اور رزاق کو ڈھونڈنے کی کو کی۔ ادھر اُدھر چیختے چلاتے لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے وہ گاؤں میں جا پہنچا۔ جہاں گاؤں کی عورتیں اور بچے نوحہ خوانی کرتے تھے۔

ایک قیامت کا سماں تھا۔

کچھ پر سکتہ طاری تھا اور کچھ عورتیں بُت بنی بیٹھی تھیں جا بجا انسانیت سوز اور حیوانیت سے لبریز واقعات بکھرے پڑے واقعہ کربلا کی یاد تازہ ہونے لگی جہاں مذہب اسلام کے کے نواسے کو کلمہ گو حضرات نے بے سر و سامانی کی حالت میں رفقا سمیت شہید کر دیا تھا۔ کھوجتے کھوجتے کھلیان کے ایک کونے میں نے اصغری کو بے ہوشی کی حالت میں پایا۔ پانی کے چھینٹے اس کے چہرہ پہ مارے اصغری نے نیم مردہ آنکھیں وا کیں اعجاز کو سامنے پاکر لگی۔

" بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ اعجاز... یہ لوگ تم کو بھی ختم کر بھاگ جاؤ..... آگ..... ابا حضور..... "

اتنا کہا اس نے آخری ہچکی لی۔

لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد اعجاز غم زدہ واپس آر کہ قبرستان کے نکڑ پر خیارکے درخت پر سے رزاق کی آواز اُسے چونکا دیا۔ کچھ بچے بستی کی تباہی دیکھ کر اور خود کو بچا۔ کے لئے درختوں پر چڑھ گئے تھے تاکہ یہ بلا سے لبریز رات نہ کسی طرح کٹ جائے۔

افرا تفری کی حالت میں اعجاز رزاق کو ساتھ لئے اب گاؤں کی جانب چل پڑا۔ اس کی حالت ایک زندہ لاش کی سی شکستہ اور بدحال

امیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے گل ہو چکے تھے۔
اس کے قدم وفورِ غم سے ڈگمگانے لگے۔
آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔
افسوس انسان نے حیوانیت کا لبادہ زیب تن کئے بربریت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

رات کے اندھیرے میں اعجاز بیٹے کے ساتھ جہلم پار کرنے لگا۔ رزاق کو پیٹھ پر لادے وہ مرے مرے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ دریا کے درمیان پہنچ کر اعجاز پر غشی طاری ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے رزاق کی گردن کی گرفت اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ موجوں کی گود میں گم ہو گیا۔

اندھیرے میں ہوش سنبھالے اعجاز بڑبڑانے لگا۔
"رزاق بیٹے۔ رزاق کہاں ہو"
مگر جواب نہ ملنا تھا نہ ملا۔
اب اعجاز کی حالت ایک پاگل سے کسی طور کم نہ تھی۔
کنارے پر آگئے وہ چلانے لگا۔
"آؤ! میں بھٹو کا قاتل ہوں۔
میں نے اسے پھانسی پر چڑھایا ہے۔
آؤ کیا دیکھتے ہو، مجھے ختم کر دو۔
موت کے گھاٹ اتار دو۔
انسان مردہ باد
انسانیت مردہ باد
کہاں ہے انسان .... اشرف المخلوقات۔
بھٹو کو پاکستان میں پھانسی دی گئی۔
اور یہاں ہمیں عتاب و غضب کا ہدف بننا پڑا۔
کیوں۔ ہمارا پاکستان سے کیا تعلق
ارے ۱۹۴۷ء میں بھارت کے ساتھ ناطہ جوڑنے کا یہ صلہ مل رہا ہے۔

یقین کیجئے کہ اعجاز کی حالت اب بھی ابتر ہے۔ گو اس نے دماغی توازن کھو دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھار اس بدحالی میں بھی ایسی ایسی باتیں کیا کرتا ہے کہ ایک فلسفی سا لگتا ہے۔
میں اکثر سوچتا ہوں کہ دوسرے ملک میں رونما ہوئے حالات کا شکار ہم کیوں بن گئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بھٹو کو پھانسی پر لٹکانے سے کشمیر کے طول و عرض میں پاکستان کے لئے نفرت و عداوت کا لاوا پھوٹ نکلا ہے۔ جو اب ختم نہ ہو سکے گا۔

●●●

غزل

نسیم شاہجہانپوری

قول و کردار کو یک رنگ بنا دیتے ہیں
ہم جو کہتے ہیں وہی کر کے دکھا دیتے ہیں

ہم کو جینے کی نہ مرنے کی دعا دیتے ہیں
جانے کس جرم کی احباب سزا دیتے ہیں

وہ ستم کر کے ہمیں یہ بھی جتا دیتے ہیں
ہم اسی طرح وفاؤں کا صلا دیتے ہیں

ہم وہ گم کردۂ منزل ہیں جو منزل کی قسم
ڈھونڈنے والوں کو منزل کا پتا دیتے ہیں

وہ بھی کچھ سوچ کے مائل بہ جفا ہیں شاید
ہم بھی اب مصلحتاً دادِ جفا دیتے ہیں

اسی طرح آج ہمیں وقت نے ٹھکرایا ہے
جس طرح راہ سے پتھر کو ہٹا دیتے ہیں

خود غرض ہیں یہ اجالوں کے پرستار بہت
صبح ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتے ہیں

میکدے میں ہمیں پینے کو ملے یا نہ ملے
ہم [illegible] حال میں ساقی کو دعا دیتے ہیں

اپنا اندازِ طلب سب سے جداگانہ ہے
ہم وہ سائل نہیں جو در پہ صدا دیتے ہیں

کچھ تو رسوائیاں الفت کا مقدر ہیں نسیم
اور کچھ لوگ بھی دانستہ ہوا دیتے ہیں

عارف بیابانی

جناب حکیم شبیر علی خاں صاحب شبیر کانپوری

تیرے ہی نام کی یہ انجمن آرائی ہے — مایۂ ناز ہے، اردو کا تو شیدائی ہے
سعیٔ پیہم تری پیغام نیا لائی ہے — باغِ اردو میں نئی فصلِ بہار آئی ہے

گرمیٔ عزم و عمل جذبۂ تعمیر میں ہے
اس لئے میرا مسدس تری توقیر میں ہے

تو کہ دنیائے ادب کا ہے چراغِ روشن — ہے شعری بھی ہے روشن تو ایاغِ روشن
ذات سے تیری ملے کیوں نہ سراغِ روشن — حق نے بخشا ہے تجھے جب کہ دماغِ روشن

کانپور آج تری ذات پہ نازاں بیشک
چار جانب ترے گلہائے سخن کی ہے مہک

تیرے اخلاق ستودہ ہیں تو کردار جمیل — تو ہے غیروں کا بھی محبوب تو اپنوں کا خلیل
تیرے اشعار خود اس بات کی روشن ہیں دلیل — شہرِ اردوئے معلیٰ کی تو مضبوط فصیل

تو سلامت رہے سایہ بھی ہما پایہ ہے
حق میں اردو کے تو اک گنجِ گراں مایہ ہے

نہ حوادث کا خطر تجھ کو نہ طوفان کا ڈر — تیرا جاری ہے سفر آج بھی بے خوف و خطر
عزمِ طوفان شکن نے یہ دکھایا ہے اثر — خود قدم چوم رہا ہے ترے ساحل بڑھ کر

تجھ پہ اس درجہ ہیں الطافِ خداوندِ کریم
تو مقرر بھی ہے شاعر بھی ادیب اور حکیم

یوں بیاضِ سخن و شعر کے روشن ہیں ورق — چشم کو خیرہ کریں جیسے جواہر کے طبق
ہیں کہیں نورِ سحر اور کہیں رنگِ شفق — سہل سے سہل کئے تو نے مضامینِ ادق

اہلِ ہند اس لئے ہیں آج ترے حلقہ بگوش
تیری ہمت کے مقابل ہوئے طوفان بھی خموش

رشکِ فصلِ بہاراں ہے تخیل تیرا — ہے ضیا بخشِ نظر رنگِ تغزل تیرا
لوت کوئی کا تصدق ہے تجمل تیرا — مدح خواں ہے چمنِ شعر میں بلبل تیرا

رابطہ سرکارِ مدینہ سے ہے محکم تیرا
روح قلب و نظر و چشم میں نورِ بطحیٰ

سوزِ دل سے ترے روشن ہے چراغِ منزل
تپش و نور کا آمیزہ ہے سراغِ منزل

عزمِ محکم یہ کہ ہر گام ہے بے خوف و خطر　　اپنی منزل کی طرف آج ہے تو گرمِ سفر
کیفِ اردو تو کا عطا کرتا ہے شعری ساغر　　جس سے مستِ مئے اردو ہوا میکش پی کر
عظمتِ فن تری سب اہلِ نظر جانتے ہیں
دیدہ ور جتنے بھی ہیں سب تجھے پہچانتے ہیں

بے بہا گوہرِ گنجینۂ اردو تو ہے　　گلِ اردو کی مہکتی ہوئی خوشبو تو ہے
سر پہ چڑھ کر جو پکار اٹھے وہ جادو تو ہے　　تلتے ہیں لعل و گہر ایسا ترازو تو ہے
ان کے سایہ میں ہیں اور نام بھی شبیر علیؔ
ساتھ ہے دولتِ دارین نہیں کوئی کمی

خونِ دل دے کے جلایا ہے سراجِ اردو　　اور مہیا کئے نسخاتِ علاجِ اردو
تو نے سمجھایا زمانے کو مزاجِ اردو　　لے لیا اپنے مخالف سے خراجِ اردو
صبح کے خوف سے لرزاں ہے اندھیروں کی برات
جان پر کھیل کے لوٹائی ہے اردو کی حیات

حضرتِ میرؔ کی افسردہ زبانی کی قسم　　آتشِ سوختہ کی شعلہ بیانی کی قسم
غالبِ نغز ذوقِ معانی کی قسم　　داغؔ و سرشارؔ و جگرؔ باقی و قانی کی قسم
چند پھولوں ہی پہ تنہا نہیں احسان ترا
بہت ممنون ہے اردو کا گلستان ترا

نرمیِ لہجہ بھی ہے گرمیِ گفتار بھی ہے　　پرچمِ امن بھی ہے ہاتھ میں تلوار بھی ہے
تنگ داماں ادب و شعر کا گلزار بھی ہے　　ساقیِ میخانۂ اردو کا بھی مئے خوار بھی ہے
اک ادا ایسی بھی پیوست تری ذات میں ہے
مختصر یہ کہ بڑا وزن تری بات میں ہے

نے سمجھا دیا اردو کی حقیقت کیا ہے　　مشترک فکر کا یہ رشتۂ وحدت کیا ہے
دمیت کے لئے اس بولی کی عظمت کیا ہے　　اقتضاءِ وقت کا بھارت کی ضرورت کیا ہے
تیرے اشعار میں خود شرح و بیانِ اردو
وحدتِ فکر کا حاصل ہے زبانِ اردو

مجاہد ہے تو اردو کا نہیں جس کی مثال　　معترف ہیں تری عظمت کے جنوب اور شمال
نازشِ فکر ہے اردو کا نکھارا ہے جمال　　زیبِ تاریخِ ادب ہوگا ترا حسنِ خیال
کانپور آج ترے جلووں سے ہے روشن دیکھا
اور اردو کا مہکتا ہوا گلشن دیکھا

مئے اُردو کو دیئے تُو نے نئے جام و سُبو
گلشنِ شعر کے ہر گُل کی جُدا ہے خوشبو
گلشنِ شعری کو تُو نے ہے دیا دل کا لہو
جس سے سر سبز ہے شاداب ہے باغِ اُردو
کیوں نہ نازاں ہو تری ذات پہ اقلیمِ سخن
گلِ بداماں بھی معطر بھی ترا شعری چمن

مدحِ شبیر علی خاں پہ چلا میرا قلم
وہ محامد و محاسن جو کئے میں نے رقم
صابری فیض کے انوارِ جہاں ہیں پیہم
مایا کھنڈ جو ہیں راجہ وہ انھیں کا ہے کرم
ان کی فرمائش پیہم پہ مُسدّس لکھا
اسی آئینے میں شبیر علی کو دیکھا

ادبی جرم ہی بن جاتا اگر ہوتا سکوت
میری اس بات پہ احباب بھی ہونگے مبہوت
تیری خدمات ہی اس بات کی روشن ہیں ثبوت
ایسا شبیر علی خان ہے صد فخر سپوت
عارفؔ اندازۂ شبیر علی خاں کیا ہو
وہی کچھ جانے گا جس نے بھی اُسے سمجھا ہو

مِلن

امتیاز جے پوری (احمد آباد)

عید اُن کی ہے جو پھولوں کی طرح مسکائیں
عید اُن کی ہے جو جی بھر کے مسرت پائیں
عید اُن کی ہے کہ جو خوش رہیں آباد رہیں
عید اُن کی ہے جو ہر قید سے آزاد رہیں
عید آتی ہے تو اک پیار کا پیغام لئے
عید آتی ہے محبت بھرا اک جام لئے
اب محبت رہے سینے میں وہ پیمانہ کہاں؟
ہائے وہ یاری کہاں اور وہ یارانہ کہاں؟
کھو گیا سرمئی سُورج کے اندھیرے میں بشر
کیا سمائے گا بھلا کل کے سویرے میں بشر
یہ نہ ہندو نہ مسلمان بنا بیٹھا ہے
آج کا آدمی حیوان بنا بیٹھا ہے
اب تو وہ عید نہیں اور وہ دیوالی بھی نہیں
جس کو بھی دیکھئے مطلب ہے وہ خالی بھی نہیں
عید پر ہر کوئی ہنس ہنس کے گلے ملتا ہے
اور دیوالی پہ محبت کا دیا جلتا ہے
پر یہ مشکل ہے گلے مل کے بچھڑ جاتے ہیں
دیپ بجھ جاتے ہیں گلزار اجڑ جاتے ہیں
ہم کو ہر عید کو دیوالی سمجھنا ہوگا
اور دیوالی کو سر آنکھوں پہ رکھنا ہوگا
چاہئے ہندو نہ رہے اور نہ مسلمان رہے
میں تو کہتا ہوں کہ بس آدمی انسان رہے
ہر اک انسان محبت کی صداقت بن جائے
ہر صبح نت نیا پیغامِ محبت بن جائے
سارا گلزار اک گلزار مہک جائے گا
دل مسرت بھری کلیوں کا چٹک جائے گا

کیا ہوا گھر میں بھی رہ کر پسِ دیوار ہیں ہم
امتیازؔ آج بھی گلشن کے پرستار ہیں ہم

[illegible]

لاڈلی حسن فردوسی
سرینگر (کشمیر)

رمضان، محکمہ راشن اسٹور میں بحیثیت چوتھے درجے کے اہلکار کے کام کرتا تھا۔ یومیہ اُجرت ملتی ہے۔ ایک جھونپڑا نما مکان میں بیوی اصغری اور چار سالہ لڑکے انور کے ساتھ زندگی کو ناز ندگی بنانے میں پیش پیش ہے۔ کوئی چھ سال قبل اپنی لاغر اور بیمار ماں کے اصرار کرنے پر اصغری کو شریک حیات بنالیا تھا۔ شروع شروع میں وہ اصغری کو دل و جان سے چاہنے لگا۔ اور اس کی ہر فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لیکن ماں کے انتقال اور انور کی پیدائش کے بعد رمضان کی اُلفت اور ہمدردی میں فرق آنے لگا۔ اب وہ گھر بھی دیر سے آتا۔ اور اُجرت کا بڑا حصہ عیاشی میں صرف کرنے لگا۔ اصغری نے اسے سمجھایا۔ بہت روئی بہت گڑگڑائی۔ مگر رمضان ٹس سے مس نہ ہوا۔ اصغری نے گھر کا خرچ چلانے کیلئے مقامی دستکاری سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ وہ انور کو ساتھ لیکر سینٹر میں پیپر ماشی کے ڈبے بنانے لگی۔ جب اسے کچھ رقم اسے مل جاتی۔ رمضان کا اب معمول بن گیا تھا۔ شراب پینا۔ جوا کھیلنا۔ اور گھر دیر سے آنا اور پھر اصغری پر سختی کرنا۔ اصغری نے ظلم اٹھا کر بھی کوشش کی کہ رمضان اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے۔ اور وہ ایک خاوند اور سب سے بڑھکر ایک باپ کے فرائض ادا کرے۔ اصغری کے بڑے بھائی رشید نے آکر رمضان کو بھلے بُرے کا احساس دلایا۔ دراصل وہ رمضان کا گہرا دوست بھی تھا۔ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے ہی رشید کے کہنے پر اس کے باپ نے اصغری کا ہاتھ رمضان کے ہاتھ میں دیا تھا۔ غرض اصغری نے ہر طرح کا ظلم سہ لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ بچہ کی خاطر اس نے ہر ستم گوارا کیا۔ اور اُف تک نہ کی۔

ایک دن رمضان کو بھی بچائی رقم دی تاکہ وہ بازار سے انور کے لئے کپڑا خرید کر لائے کیونکہ انور کی چھٹی سالگرہ قریب تھی مگر رمضان گھر سے نکلکر سیدھا جوا خانہ پہونچ گیا۔ اور جوئے میں اس نے وہ رقم بھی ہار دی اور پھر جیب خالی ہونے پہ جاکر دیسی شراب کی بوتل اُدھار خرید لی اور حلق تر کرنے لگا۔ کافی رات گئے وہ گھر لوٹا۔

"کیوں لائے انور کے لئے کپڑا؟" اصغری نے پوچھا۔

"کون سا کپڑا... ارے.. ہاں..... اصغری نئے کپڑوں کے بغیر بھی تو سالگرہ منائی جاسکتی ہے.... یہ۔ یہ سب تو امیروں کے چونچلے ہیں۔"

رمضان کی آواز بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اصغری غم کی تاب نہ لاسکی اور غصہ میں اُبل پڑی۔

"کتنے ظالم ہو تم۔ بچے کی خوشی بھی تم کو گوارا نہ ہوئی۔ تم اس قدر گر چکے ہو، میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کم از کم اس معصوم کی خوشنودی کی خاطر تو ہوش مندی سے کام لیا ہوتا.... میں جانتی ہوں تم نے حسب عادت یہ پیسے کہاں صرف کئے ہوں گے؟۔ اُف"

اصغری رو پڑی۔

غرض تُو تُو میں میں نے اچھے خاصے جھگڑے کا روپ اختیار کر لیا اور پھر رمضان نے اپنے کئے پر پچھتانے کی بجائے۔ حیوانیت کی راہ اپنائی اور اصغری کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ گالیوں کی بوچھار کر دی۔ اور جب اصغری مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو کر گر پڑی تو رمضان نے روتے بلکتے ہوئے معصوم انور پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ اس معصوم کے واویلا کرنے پر اڑوس پڑوس کے لوگ آکر جمع ہوگئے۔ کچھ لوگ اصلیت سے باخبر ہونے کیلئے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے ساتھ بھی رمضان نے بد اخلاقی کا رویہ اختیار کیا۔ سب اس کی نازیبا حرکت پہ کافی برہم ہوئے۔ لیکن کر بھی کیا سکتے تھے؟

اصغری کو جب ہوش آیا تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اپنی غلطی پر پشیماں ہونے اور پچھتانے کی بجائے رمضان نے بے سبب اس پہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ رمضان سے بے حد بدگمان تھی۔

محلے والوں میں سے کسی خیر خواہ نے جا کر رشید کو اس کی بہن کی بدحالی کے بارے میں بتا دیا۔ رشید کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پھر کیا تھا۔ رشید نے محلے کے چند بزرگوں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ تاکہ وہ اپنی بہن کو طلاق دلا سکے۔ اسے اور انور کو رمضان جیسے حیوان سے چھٹکارا دلا سکے۔ اصغری نے مجبوراً اس سلسلے میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ انور کی سلامتی کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھی۔ محلہ کے بزرگوں اور خود مولوی وقار اللہ نے اگلے جمعہ کو نماز ظہر کے بعد اس معاملہ پر غور و خوض کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادائیگیٔ نماز کے بعد چند بزرگ، مولوی صاحب کی سرکردگی میں مسجد کے صحن میں جمع ہو گئے۔ رشید موجود تھا۔ رمضان اور اصغری کو بھی بلایا گیا۔

"کیوں رمضان یہ تمہارا معمول بن چکا ہے کہ ہر روز شراب پی کر گھر آؤ اور بیوی بچے پر ہاتھ اٹھاؤ۔ آخر کس لئے۔ کیا یہی خدا اور رسولؐ کا فرمان ہے۔ کیا یہ تم شوہر ہونے کا حق اسی طرح ادا کرتے ہو۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ لوگوں کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس دنیا میں کون نیک ہے کون بد۔ ذرا مجھ پر تہمت لگانے والے خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ وہ اصلیت میں کیا ہے۔ گناہ سب کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں برائی کا اظہار کھل کر کرتا ہوں اور تم لوگ پردے کے پیچھے چوری چھپے یہ کام کرتے ہو۔" رمضان کے چہرے کا رنگ غصے کے مارے بدل چکا تھا۔ اس کی غیر متوقع باتیں سن کر مجلس میں انتقامی لہر منڈلانے لگی۔

"بدتمیز، بد اخلاق، اپنی غلطی کو نہ مان کر تم ہم پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی"، مولوی صاحب چلائے۔

اتنے میں حاجی ستار رمضان پر ہاتھ اٹھانے کی غرض سے اپنی جگہ سے اٹھے۔ دفعتاً اصغری برقعے میں ملبوس سامنے آکر معافی مانگنے لگی۔

"تم اتنے ذلیل ہو کہ محلے برادری کا بھی لحاظ نہ رہا۔ خیر یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ تم بدمعاشانہ افراتفری کا بازار گرم کرو۔ اور اصغری پر ظلم کرو۔ اور اپنے بچے انور پر ہر قسم کا ستم ڈھاؤ۔ تمہیں اپنے فرائض کا احساس نہیں۔ تم کو سنتِ رسولؐ کا بھی احساس نہیں۔ تم....."

"حاجی صاحب میری بہن کو اس درندے کے شکنجے سے چھٹکارا دلا دیجئے۔" رشید دانت کاٹتے ہوئے کہہ اٹھا۔

"میں اپنی بہن اور اس معصوم بچے کو لیکر گاؤں چلا جاؤں گا خدا کا دیا ہوا میرے پاس بہت ہے حاجی صاحب۔ لیکن میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے خواب میں بھی یہ امید نہ تھی کہ شادی کے بعد رمضان اس طرح بدل جائے گا۔"

غرض سارے مجمع کی زبان اصغری کی بھلائی میں اور رمضان کے خلاف کھل گئی۔ چھوٹا بڑا سب اس پر برس پڑا۔ اور اصغری بے حس و حرکت ایک کونے میں بیٹھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک گٹھری سی معلوم پڑتی تھی۔ اس کے سامنے ہی انور بیٹھا سہمی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب باتوں کی بوچھار ذرا تھمی۔ تو مولوی وقار اللہ نے سکوت کے عالم میں بولنا شروع کیا۔

"رمضان اب تک جو کچھ سننے میں آیا۔ اس کے مطابق اب کوئی اور راستہ ہی نہیں رہا ہے کہ اصغری کو طلاق دیدو۔ تو تشدد کی یہ اس مار پیٹ اور دھاچوکڑی کا نام نہیں ہے۔ اس طرح بیوی پر وقت بے وقت ہاتھ اٹھانے سے صاف ظاہر ہے کہ تمہیں بحیثیت شوہر کے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں رہا ہے۔ چپ کیوں ہو۔ تمہیں اس ضمن میں کچھ کہنا ہے۔ اس سے قبل کہ برادری اپنا فیصلہ سنائے تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو کہہ ڈالو"؟

"مولوی صاحب میں کیا کہوں۔ جبکہ آپ لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ اگر طلاق حاصل کر کے اصغری اور اس کے بھائی رشید کو خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور محلے والوں کی دلی خواہش پوری ہو سکتی ہے تو اس ضمن میں کچھ بولنا ہی فضول سمجھتا ہوں۔ البتہ کچھ کہنے سے قبل میں اصغری کی رائے اس بابت جاننا چاہوں گا۔ کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ فیصلہ کرتے وقت اسے انور کی بہبودی کو مد نظر رکھنا ہوگا۔"

یہ سنتے ہی سب کے سب چہرے صحن کے اس کونے کی جانب دیکھنے لگے جہاں اصغری زرد اور افسردہ چہرہ لئے دم سکت تھی۔

"یہ کیا کہہ گئی مولوی صاحب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ رمضان سے طلاق حاصل کرنا ہے۔ یہی خواہش میری بہن کی بھی ہے۔ اس پر سوچنا اب فضول ہے۔ میں اپنی بہن کی زندگی چاہتا ہوں۔ رمضان

تو برائیوں کا مجسمہ ہے۔"

"لیکن رشید اس معاملے میں اصغری بیگم کو از خود کچھ کہنا پڑے گا ورنہ ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ سچ ہے کہ رمضان بُری عادتوں میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اور اصغری اگر طلاق چاہتی ہے تو یہ کوئی غیر شرعی فعل نہیں سمجھا جائیگا" مولوی وقار اللہ نے کہا۔

اور ادھر اصغری سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسے یاد آیا وہ سماں جب ڈولی میں سوار ہونے سے پہلے بابوجی نے اس سے کہا تھا۔

"بیٹی اب تم اپنے گھر جا رہی ہو۔ اس گھر کو اب اپنا حقیقی گھر سمجھنا۔ اور اپنے گھر کو خوشیوں و مسرّت سے بھر دینا تمہارا فرض ہے اب اس گھر سے تمہاری لاش ہی اٹھنی چاہئے بیٹی۔ کیونکہ بیوی کا اصلی مقام اس کے شوہر کے قدموں میں ہی ہوتا ہے۔"

یہ سوچتے ہی اصغری اپنی جگہ سے اٹھکر انور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے حاضرین سے مخاطب ہوئی

"رشید بھیا خوب عزّت اُتاری ہے تم نے میری اور اپنے بہنوئی کی اس مجلس میں۔ میں مانتی ہوں کہ میرے شریک حیات زیادتی سے کام لے رہے ہیں لیکن تم یہ کیوں فراموش کر جاتے ہو کہ میں ان کی بیوی ہوں ان کا ایک انگ ہوں۔ سُکھ دُکھ میں ان کا ساتھ میں نہ دونگی تو اور کون دے گا۔ میرے گھر کی عزت کو اس طرح اُچھالنے کا کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ طلاق کی بات کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ روٹھے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں کتنا ثواب ہے۔ مولوی صاحب شادی کوئی مذاق نہیں ہے۔ کھیل نہیں ہے۔ جو اس طرح اس پاک رشتے کی رسوائی کیجائے اور جب جی چاہے جوڑ لیا۔ جب دل چاہا توڑ دیا۔ اگر انور کے باپ نے سختی سے کام لیا۔ تو کیا میں بھی فرض شناسی کا راستہ چھوڑ کر پاپ کا راستہ اپنالوں؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ انور لینے باپ سے کہدو کہ گھر چلیں۔ بڑے آئے یہ لوگ میری زندگی میں فیصلہ دینے والے"۔

دیکھتے ہی دیکھتے ماحول پر خاموشی طاری ہو گئی۔ کسی میں بھی کچھ کہنے کی ہمت باقی نہیں تھی۔ سب ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ جیسے سب کو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ سب کی زبان پر تالے پڑ گئے۔

دفعتاً اصغری ایک فاتح کی طرح مسجد کے صحن سے باہر نکلی اور انور اس کے ساتھ تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے مرے مرے قدموں کے ساتھ رمضان بھی چلنے لگا۔ اس کے ماتھے پر ملامت اور شرمساری کے آثار صاف عیاں تھے ●●●

غزلیات

حکیم بھٹی ازھر لائل پوری

بھر کے اے دوست چھلک جاؤں میں وہ جام نہیں
ظرف کو داغ لگا دوں یہ مرا کام نہیں
سامنے منزلِ مقصود کہاں رکھی ہے
راہ رو ہوش میں آ فاصلہ دوگام نہیں
وہ نوازیں نگہِ لطف سے یہ بات الگ
ورنہ یہ خوئے فغاں لائقِ انعام نہیں
آپ جو چاہیں کہیں حضرتِ ناصح لیکن
اب بھی ایمان مرا عشقِ بد انجام نہیں
یہ الگ بات کہ حالات سے ہوں میں مجبور
آگے بڑھنے کا خیال اب بھی مرا خام نہیں
یہ ہیں اور ان کا یہی آٹھوں پہر کا رونا
غمزدوں کے لئے لطفِ سحر و شام نہیں
یہ درِ یار ہے تو شوق سے جھک جا ازہر
شان و شوکت کے دکھانے کا یہاں کام نہیں

صابر دہلوی۔ اسکائر کالونی

اب یہ سوچا ہے محفل میں تیری، اس طرح تجھکو دیکھا کروں گا
تیرے چہرے پہ نظریں جما کر، رُوبرُو تیرے بیٹھا رہوں گا
یوں کروں گا علاجِ غمِ دل، شغل یہ رات دن اپنا ہوگا
میں تصوّر میں تجھکو بٹھا کر، تیری زُلفوں سے کھیلا کروں گا
ہے یہ بازارِ دنیا یہاں پہ، عشق کا مول آساں نہیں ہے
فیصلہ ہے مرا جان دیکر، تیری اُلفت کا سودا کروں گا
دیکھ کر یہ ادا بندگی کی، محوِ حیرت رہے گی خدائی
اُس کو اپنا خدا جان کر میں بیخودی میں جو سجدہ کروں گا
بے خودی رنگ لائے گی میری، دور دل کا اندھیرا کروں گا
اپنی نظروں کا دامن پسارے، تیرے جلوئے سمیٹا کروں گا
تو ہے معبود میرا میں صابر، اس حقیقت پہ ہے ناز مجھکو
ذرّے ذرّے میں پایا ہے تجھکو ذرّے ذرّے کو سجدہ کروں گا

ایک تعارف

شکیب بنارسی کی غزل گوئی

ن۔ ا۔ ناظر

شکیب بنارسی صاحب میرے دوست ہیں اور ہماری دوستی بیا ۱۲ سال سے قائم ہے۔ چونکہ میں نے ان سے اکثر شعر و ادب اور موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔ اور ان کی شاعری اور شخصیت سمجھنے کی پُرخلوص کوشش کی ہے، اس لئے میں ان کی شخصیت کی شنی میں ان کی غزلیہ شاعری پر اپنے تاثرات و تعلقات کا اظہار ں گا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے شکیب صاحب ۱۹۲۳ء بنارس کے مشہور محلے پیتری کلاں میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں را کا گڑھ تھا۔ شکیب صاحب کے والد صاحب عربی و فارسی زبانوں سے واقف، لیکن وہ شاعری سے سخت منحرف تھے۔

حتیٰ کہ وہ شیخ سعدی کی ناصحانہ شاعری کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے لیف جہاں تک مکتبی اور درسی تعلیم کا تعلق ہے شکیب صاحب بعض وجوہات کی بنا پر محروم رہے۔

لیکن جب سے ان کے شعور نے آنکھ کھولی ان کے اندر شعر گوئی کا شوق انگڑائیاں لینے لگا۔ اور گرد و پیش کے شعری ماحول سے انھیں شعر گوئی ا تحریک ملی۔ لہٰذا انھوں نے اپنے طور پر ٹوٹے پھوٹے اشعار کہنے شروع دیئے۔ اس ضمن میں بعض "اُستاد شعراء" سے اپنے کلام پر اصلاح بھی ں، لیکن جلد ہی انھوں نے عروض و قواعد کی جکڑ بندیوں سے اکتا کر اور اُستادی ورشاگردی کے روایتی طلسم کو توڑ کر اپنے وجدان و شعور کو اپنا رہنما بنا لیا

شکیب صاحب ۱۹۴۹ء میں بنارس سے ہجرت کر کے روزگار کی تلاش میں بمبئی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ـــــ بمبئی بنیادی حقیقت سے ایک تجارتی شہر ہے، جہاں اشیاء خوردنی اور مشینی لات سے لیکر جسم فروشی اور "اور" یہ بہت اہم ہے ـــ فنی و شعری ہر تک کا نیلام سستے داموں پر ہوتا ہے۔ باقر مہدی نے اس کاروباری ذہنیت کو کسی کربناک جذبے کے تحت فنی لمس عطا کیا ہے۔

ہر شخص کی قیمت ہے بِک جاتے ہیں سکتے
دیکھے سرِ محفل یہ تماشا کوئی کب تک

بہر حال فیشن پرستی، فلم بینی اور شور و شغف کی اس "دُنیا" میں اپنی آواز کو یا ناجوئے شیر لانے کے مترادف ہے ـــ شکیب صاحب عالم فاضل تو نہیں ہیں، لیکن کتب بینی کا شوق جنون کی حد تک ہے۔ لہٰذا دن بھر کی کاروباری مصروفیات سے "نجات" پاکر رات کو اپنے کمرے کی چھوٹی سی پُرسکون کائنات میں نئے پُرانے شعری مجموعوں میں سر کھپاتے ہیں۔

ان کا حافظہ بہت قوی ہے۔ دورانِ گفتگو اشعار پر اشعار سناتے چلے جاتے ہیں۔

موصوف کو اُردو کے عظیم ترین غزل گو غالبؔ کے بھی بہتیرے اشعار یاد ہیں، لیکن وہ اس کی حقیقت کا بلا پس و پیش اعتراف کرتے ہیں کہ غالبؔ انتہائی مشکل پسند شاعر ہیں اور ان کی شاعری کو سمجھنے اور اس سے لُطف اندوز ہونے کیلئے فرصت، وسعتِ مطالعہ اور دقتِ نظر چاہئے۔ دراصل ان کی ذہنی قربت میرؔ، فراقؔ اور جگرؔ سے غالبؔ و اقبالؔ کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ میرؔ، فراقؔ اور جگرؔ کی شاعری "عشق" سے عبارت ہے جو شکیب صاحب کی غزلوں کا مرکزی موضوع ـ لہٰذا ان کی شاعری میں عشق درد مندی کا استعارہ بن جاتا ہے۔ وہ عشق ہی کے دائرے میں انسانی رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انسان دوستی جو کہ ان کی فکر کا محور ہے، کا جادو جگاتے ہیں۔ ان کے لہجے میں نرمی اور گھلاوٹ اور جذبات میں خلوص کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کلاسیکی غزل کے مزاج داں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار ادق الفاظ اور نامانوس فارسی عربی تراکیب سے یکسر عاری ہیں۔ چونکہ ان کا ذہن انتخابی ہے اس لیے انھوں نے اپنے پیشرو اور ہمعصر شعرا کی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں (واضح رہے کہ یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے) ہر دور میں شاعروں نے ایک دوسرے سے استفادہ بھی کیا ہے اور ایک دوسرے کو متاثر بھی کیا ہے۔ کہ زمین لینا معیوب نہیں، لیکن شاعری کا حق تبھی ادا ہوتا ہے

جب اپنا قرض مع سود در سود ادا کر دے۔

اس باب میں چند مثالیں درج کرنا ضروری گردانتا ہوں۔ میر کا ایک شعر ہے۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

اس سے استفادہ کرتے ہوئے اقبال نے ایک شعر کہا ہے جس میں زبان و بیان کا نکھار بھی ہے اور بڑی قوت بھی۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دیگر نہ لوں شانِ خداوندی

مومن کے جس شعر پر غالب اپنا دیوان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے، اس سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک ایسا شعر کہا ہے جو مومن کے خوبصورت اور پُر تاثیر شعر کے مقابلے میں زیادہ فائقیت کا حامل ہے کہ وہ محض جذبے کے حصار میں محصور نہیں بلکہ جذب و فکر کا خوبصورت اور معنی خیز فنی پیکر ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا + جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن)

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو (غالب)

بہر حال شکیب صاحب کوئی بڑے شاعر نہیں ہیں، لیکن میری رائے میں وہ ایک بہت اچھے غزل گو ضرور ہیں۔ ان کی غزلوں میں پیچیدگی، ابہام اور رمزیت کے بجائے جذبے کی سادگی، معصومیت اور خلوص کے عناصر کارفرما ہیں۔

ان کے اشعار کو نہ صرف پڑھا، سنا بلکہ گایا بھی جا سکتا ہے۔

اب میں انکی غزلوں سے قارئین کی خدمت میں اپنی پسند کے اشعار پیش کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ان اشعار سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

نوٹ:۔ گذشتہ سال جے پور میں شکیب صاحب کا جشن منایا گیا جس میں نہ صرف شاعروں ادیبوں بلکہ اربابِ حکومت نے بھی انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

ل۔ا۔ ناظر

جب سے پیار میں دھوکا کھایا تب سے محتاط بہت
دیکھ کے اب دامن پکڑے ہیں سوچ کے موتی رولیں ہیں

نہ دن پہاڑ لگے اب نہ رات بھاری لگے
نہ آئے نیند تو آنکھوں کو کیا غاری لگے
کوئی نہ ہو کبھی احباب کے کرم کا شکار
مری طرح نہ کسی دل پہ زخم کاری لگے
نفس نفس ہمیں روزِ جزا سے بڑھکر ہے
وہ شوق سے جئے جس کو حیات پیاری لگے

صحرائے زندگی میں اگر ہم ترس گئے + تم بھی تو بھیگے کون سے بادل برس گئے
کہتے نہ تھے کہ ترکِ محبت نہ کیجئے + آخر وہی ہوا کہ وفا کو ترس گئے

یوں مرے خونِ رگِ جاں کے طلبگار گرے
جس طرح قیمتِ ارزاں پہ خریدار گرے
ایک ہی بات ہے دونوں کا بھرم کھلتا ہے
تیری دیوار گرے یا مری دیوار گرے

ہے دل میں اور بھی کچھ پیار کے سوا نہ کہو
صلیب دید و مگر مجھ کو بے وفا نہ کہو

کبھی تو آئیگا اُس کو خیالِ عہدِ وفا + ابھی وہ بھول گیا ہے تو بے وفا نہ کہو

تو نہ پوچھے نہ کبھی دادِ وفا دے مجھکو
کون پھر میری محبت کا صلہ دے مجھکو
سنگ سازی مجھے اوروں کی نہیں بھاتی ہے
اپنے ہاتھوں سے کوئی سخت سزا دے مجھکو

الزام یہ اس پر کہیں جھوٹا تو نہیں ہے + قاتل جسے کہتے ہیں مسیحا تو نہیں
سوگند محبت کی ذرا غور سے دیکھو + پلکوں پہ مری خونِ تمنا تو نہیں

مٹی میں ملی ہلا دو جو آئے ہو بعدِ مرگ
ایک اور آرزو ابھی لپٹی کفن میں ہے

اک اک ادا میں دل کو دکھانے کی بات تھی
تم نے بھی کی وہی جو زمانے کی بات تھی

...نے بھولے سے کسی دل کو دُکھایا ہو اگر
...دگی بھر مرے ہونٹوں پہ تبسم نہ رہے
اپنی کشتی کی تباہی ہے مجھے منظور مگر
شرط یہ ہے کہ مرے بعد تلاطم نہ رہے

جو ترے ساتھ میں گذرے تھے زمانے مانگے
زندگی مجھ سے وہی خواب سہانے مانگے

سنا ہے جب سے کہ دیوار و در کے کان بھی ہیں
جو تھی کسی سے اکیلے میں گفتگو بھی گئی

کتنے چڑھے ہوئے تھے زمانے کی آنکھ پر + اچھا ہوا کہ ہم ترے دل سے اُتر گئے

اے بیوفاؤ جو فرصت ملے کبھی تم کو + مجھے بھی دیکھو کہ آئینہ وفا ہوں میں
نظر میں ہیچ ہے تحت الثریٰ کی پستی بھی + یہ آج کس کی نگاہوں سے گر گیا ہوں میں

دامنِ ضبط کو اشکوں میں بھگو لیتا ہوں
درد جب حد سے گذرتا ہے تو رو لیتا ہوں
اب تری یاد ہی تسکینِ دل و جاں ہے مجھے
اب ترے درد نے بستر پہ بھی سو لیتا ہوں

فصیلِ عشق سے اک دن چھلانگ مار دے گا
ابھی تو دیکھ رہا ہوں وفا کے زینوں کو

بت کدے سے کعبے تک پتھروں کے جلوے ہیں
ہم کریں کہاں جا کر سجدۂ رائیگاں اپنا

حرم میں سجدے کئے دیر میں پکار آئے
تو سرِ بارِ تجسس بھی ہم اُتار آئے

سلام کہیو ہمارا بھی صحنِ گلشن میں
ہمارے بعد چمن میں اگر بہار آئے

آنکھوں میں کھنچ کے آ گیا خونِ جگر شکیب
قطرے نے بڑھ کے سر پہ سمندر اٹھا لیا

یہی نہیں کہ تنہا وہ بیقرار گیا + مرے بھی دل پہ محبت کا تیر مار گیا
مری وفا پہ تو وہ سرنگوں تھا خود بھی شکیب + میں اپنے آپ محبت کی بازی ہار گیا

آس ٹوٹے نہ کبھی آس لگائے رکھنا
آندھیوں میں بھی شمعِ دل کی جلائے رکھنا
خونِ دل اور سہی، خونِ جگر اور سہی
رنگ بے رنگ نہ ہو رنگ جمائے رکھنا
دامنِ دوست بہت دور سہی پھر بھی شکیب
ہاتھ اٹھے ہیں تو پھر ہاتھ بڑھائے رکھنا

جب محبت بنا لی گئی + آنسوؤں میں بسائی گئی
کوئی مجھ سا نہ نکلا شکیب + جب وفا آزمائی گئی

بقیہ صفحہ ۲۹ — راجپوتانہ کے ایک راجہ کا جذبۂ آزادی

ادا کیا ہے۔ ایک رئیس وقت کا حب الوطنی کے جذبات کا اظہار اشعار سے بہتر اور کسی صورت میں ممکن نہ تھا۔ خصوصاً جب قدرت نے شعر گوئی کی صلاحیت بھی نوازا تھا۔ کسی صاحبِ اقتدار کیلئے اپنا راز دار کسی کو منتخب کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے خصوصاً جب شاہانہ تقاضے بھی ہوں اور فقیرانہ انداز بھی۔ خود مختاری کی نعمت کا پاس بھی ہو اور غلامی کی ذلت کا بھی احساس ہو۔ کردار و گفتار میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے ایسے میں شعر کا قلم بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں۔ شہنشاہ ظفر سے لیکر راج راجا راجندر سنگھ مخمور تک اس ضمن میں شامل ہیں خود کہہ بھی گئے ہیں ؂

مخمور شاعری میں کیا حالِ دل بیاں + دل کے پھپھولے پھوٹ کے بہہ کر غزل گئے

لیکن سلطان ٹیپو اور راجہ راجندر سنگھ مخمور کی سی بصیرت و فراست قسمت کا خصوصی عطیہ ہے۔ یہ دولت ہر ایک کو نہیں ملتی۔ بہرحال ؂

بہ آن گروہ کہ از ساغرِ وفا مست اند + زما سلام رسانید ہر کجا ہست اند

مارا جو تو نے پھول وہ پتھر سے کم نہیں

پروفیسر بہرآہ بارہ مولوی
معرفت: آر لومے (ڈائیل ویکسٹ)
محلہ جدید۔ بارہمولہ ۱۹۳۱۰۱ کشمیر

میں بار بار قلم اٹھاتا ہوں
تمہاری وہ تصویر بنانے کیلئے جس کے فٹ پر تم نے لکھا تھا
"مارا جو تو نے پھول وہ پتھر سے کم نہیں"

عرصہ ہوا
ابھی تصویر مکمل نہیں ہوئی
مشکل سے آدھا چہرہ بن گیا۔

○

مصروفیات زیادہ ہیں۔
آفس کے بعد گھر میں بھی کافی مشغول رہتا ہوں
اس مشینی دور میں جب کوئی موقع ملتا ہے تمہاری تصویر بنانے کیلئے
میں خوش ہوتا ہوں
یہاں تک کہ ستاروں کے مالک کی تعریف بجا لاتا ہوں
لیکن پھر جونہی قلم اٹھاتا ہوں
الیکٹرک کال اور ٹیلیفون ستانے لگتے ہیں
ڈاکٹر بھی بار بار کہتا ہے۔
"سر کو لی لینا چاہتا ہے"
شام کو دوستوں کی پارٹیوں میں مصروف رہتا ہوں
کئی بار شمولیت نہیں کی
دوستوں نے کہا "تم اعلیٰ سوسائٹی کے قابل نہیں"
شب سے اکثر کافی دیر سے لوٹتا ہوں، لوٹنا پڑتا ہے
تو ہر بار سوچتا ہوں
آج تمہاری دوسری آنکھ بناؤں
تمہارے میٹھے میٹھے پیارے پیارے لبوں پہ مسکراہٹ پیدا کروں
لیکن جونہی قلم اٹھاتا ہوں

بھورے بھورے بالوں نیلی نیلی آنکھوں والی تمہاری سہیلی
آرٹسٹ کی انگلیوں سے کبھی رنگ کبھی برش چھین لیتی ہے

○

گزشتہ راتوں میں یادوں نے کافی تنگ کیا
پچھلے پہر بیدار ہوا
سوچا یہی موقع ہے تمہاری تصویر مکمل کرنے کا
چپکے چپکے اپنے آپ کو جسم کی تنگی سے آزاد کیا
اور گالوں میں سرخی بھرنے لگا
ابھی رنگ بھر ہی رہا تھا،
کہ ہاتھ تھام لیے گئے
رنگ بکھیر دیا گیا
کچھ گالوں پر گر پڑا
کچھ ننگے بدن پر
مجھے ایسا لگا کہ میں نے خون کیا۔

● ● ●

غزل

ڈاکٹر ایس ایم الیاس
قدوائی شمیم۔ بارہ بنکوی

بشر کے جوہر مردانہ غم میں کھلتے ہیں
جو حادثات مقدر ہیں کب وہ ٹلتے ہیں

کبھی تو ناصحِ الفت سے پیش تم آتے
وہ بات جس سے کہ دیوانے بھی بہلتے ہیں

ہزار ہوتے ہیں ارمان دل میں انساں کے
یہ اور بات ہے کتنے مگر نکلتے ہیں

مجھے پڑوس کی خوشیاں لگے ہیں اپنی سی
وہ کیسے ہوتے ہیں انسان جو کہ جلتے ہیں

عجیب ہوتا ہے عالم خوشی کا دونوں طرف
بچھڑ کے دوست جو مدت کے بعد ملتے ہیں

چمن میں باغ میں، اور گلستاں میں گو تسلیم
یہ کس کے واسطے صحرا میں پھول کھلتے ہیں

شمیم کوئی بھی انساں برا نہیں ہوتا
خلوص چاہیئے جب ہم کسی سے ملتے ہیں

بستی کا المیہ

او۔ پی۔ شرما "سارتھی"

وقت بھی مانند آسمان کے زہر سے لبالب بھرا پیالہ تھا جو الٹا لٹکا ہوا تھا۔ برسوں سے ٹپکتا نہیں تھا۔

ایک ہی بار فلک کے پیٹ نے زور مارا۔ تمام زہر آبشار صورت بہنے لگا۔

اُسے چھت پر پڑے بہت دیر ہو گئی تھی۔ پچھلی رات بہت ہو کر آئی تھی۔ رات نے چاہا تھا کہ تیرگی کو کسی بڑی بھٹی میں جھونک دے اور جلا کر اپنے جسم کو روشن کرے۔ لیکن رات یونہی سر دُھنتی رہی کہ سیاہ پرندے اس کی پکڑ میں نہ آ سکے۔

رات شاید زیادہ طویل ہو گئی تھی۔ اس کی سوچ روشنی کی سمت اُگنے لگی تھی بار بار صبح کی روشنی کا، چکا چوند تصور اس کے ذہن میں ہوئی کسی شے کے خطرے کی مانند کوند جاتا

افق کے چہرے پر کالک برقرار تھی۔ حدِ نظر تک تیرہ شبی اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑے ہوئے تھی، چھتوں پر، دیواروں پر، دروازوں اور کھڑکیوں پر، اور آنکھ آنکھ پہ نابینا اندھیرا تسلط جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔

بستی کے نظام میں خلل نہ پڑے اسی خاطر آزادی کے ساتھ چہکنے اور صبح کے پر تو کو ساتھ لانے والے پرندوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ یہ کام اب بستی کے چند لوگوں کے سپرد تھا وہ وقت پر سجے سنورے موڑ موڑ، گلی گلی ٹھہر کر ہانک لگاتے۔ ہم نظامی پرندے ہیں۔ ہم پر یقین لا کر سوؤ اور جاگو ہم باشندوں کو سلاتے بھی ہیں اور جگاتے بھی ہیں۔

سورج اپنا راستہ بھول گیا۔ صبح نہیں آئی۔ بستی والے جاگ گئے اور بیشوں اور دھندوں کے طوق گلے میں ڈال کر گھروں سے نکل گئے۔

دفعتاً اس کے وجود میں سرایت کرتا ہوا تمام لہو ذہن کی جانب بھاگنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہیں بہت نزدیک جیل کے گھڑیال کی موسیقی نے صبح کی آمدگی کی خبر دی ہے۔ آوازوں کے دائرے بن رہے ہیں۔ جاگو اور زندگی کی تجارت کرو۔ آج سے میں بستی کے ہر شخص کے تئیں صبح لایا کروں گا۔ روشنی لایا کروں گا۔ روشنی لایا کروں گا۔ میں گھڑیال روشنی کا نامہ بر ہوں۔

اندھیرا بڑا گہرا تھا۔ اُسے سیڑھیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں وہ اندھوں کے مانند ہوا کو ٹٹولتا اور دھکیلتا ہوا نیچے آیا۔ خاموشی میں غرق صحن میں۔

جلدی ہی داخلی دروازے سے باہر نکل وہ گلی میں آ گیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ گلی کے رنگ ڈھنگ بوڑھی طوائف جیسے تھے۔ لیکن اب اس کے زخموں میں گھاس پھوس اور مٹی ٹھونس کر بھر دیئے تھے اور اس کی چھاتی پہ تیز روشنی تیر رہی تھی۔ لوگ خلافِ معمول ایک دوسرے سے بلا ٹکرائے گزر رہے تھے۔

آتے جاتے لوگوں کو وہ دیکھتا رہا۔ کسی نے آنکھ اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا۔ سب کو شاید اپنے پاؤں بہت دل آویز لگ رہے تھے۔

یوں زمین کو دیکھ کر۔ سر جھکائے ہوئے لوگ اسے بہت خوبصورت دکھائی دیئے جیسے تمام لوگ حسینوں، مہ جبینوں نازنینوں میں بدل گئے تھے اور پاؤں میں پڑے زخمی دل ڈھونڈ رہے تھے۔

لیکن۔ اب ایک منظر بہت کربناک تھا۔ کسی کے لبوں پر رخساروں پہ ہاتھ پاؤں اور آنکھوں میں کہیں بھی مسکراہٹ کی لکیر تک نہیں تھی۔

دو قدم آگے بڑھ کر وہ ایک شخص کے برابر ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ تمہارے پاؤں بہت خوبصورت ہیں۔

اس شخص نے جبڑے بھینچ لئے۔ پاؤں نہیں۔ میرا سر بہت خوبصورت ہے میں سر کو سنبھالتا ہوا چل رہا ہوں۔

ایسا کیا قہر گرا ہے کہ خود کو سنبھالنے کیلئے تمہارا سر خم ہو گیا ہے؟

اس نے پوچھا۔

میاں بستی میں سروں کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ خوبصورت سر کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے۔ میں بیچنا نہیں چاہتا۔

تم کرتے کیا ہو؟۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

زندہ رہنے اور وجود کو بنائے رکھنے کی سعی کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر اس شخص نے چور نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر کہا۔ تم جانتے ہو زبان کیا ہوتی ہے؟

اسے سوال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ کچھ کہنے کو ہوا کہ ایک لمبا چوڑا اگارڈ نما آدمی جس نے بن مانس کا چہرہ پہن رکھا تھا۔ ان کے ساتھ ملکر چلنے لگا۔

اب وہ تینوں بڑی سڑک پر چل رہے تھے۔ سڑک پر جگہ جگہ تحریر شدہ کاغذوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔

چہرے والے آدمی نے ایک پیوند پر پاؤں رکھا۔ اور اس سے پوچھا۔ ہاں تو تم کیا بات کہہ رہے تھے۔ شاید کہہ رہے تھے۔ زبان کیا ہوتی ہے۔

ہاں میں نے پوچھا تھا دوسرے شخص نے کہا۔ اور اس نے جواب دیا تھا کہ اگر منہ میں لگی ہو تو راستے کا پتہ چلتا رہتا ہے۔

بن مانس نے زور دار قہقہہ لگایا — یہ بھی کہ زائقے کے ساتھ ساتھ زمین کا بھی پتہ چلتا رہتا ہے۔ تم دونوں شاید نہیں جانتے لبستی کے نئے نظام کے مطابق اب نئی رسم کا دور دورہ ہے۔ لبستی کے ہر شخص کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے دیکھے۔ کان بند کر کے سُنے اور زبان بند کر کے بولے۔ اگر تمہیں گفتگو کرنا ہے تو زبان بند رکھکر کرو۔

پھر جاتے جاتے اس نے کہا — تم دونوں کے ہاتھوں کی انگلیاں قلم جیسی خوبصورت ہیں۔ ایک ایک انگلی مجھے دیدو۔

دونوں ناخوش ہو گئے۔ دونوں نے ایک آواز میں کہا۔ کس حق سے انگلیاں مانگتے ہو؟

حق؟ مانگنے کا حق ملتا ہے نہ دیا جاتا ہے۔ لبستی کی نئی رسم ہے۔ رسم انگلیاں مانگ رہی ہے۔ اور اگر تم دینے سے انکار کرنا چاہتے ہو تو خود پر ایمان لا کر کہو کہ آج سے تم دونوں ہوا میں لکھا کرو گے یا زمین کے بے وجود پردوں پر۔

دونوں نے کہا۔ ہم دونوں پانی ڈھونڈیں گے اور اس کی سطح پر ضروری بات لکھیں گے۔

بن مانس مطمئن ہو گیا اور چلنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ جاتے جاتے یہ ارتکو لیتے جاؤ۔ تم سچ مچ کے بن مانس ہو یا صرف چہرے کے؟

تم دونوں کو یاد ہوگا۔ الیسی لبستی کے مکتوب میں تحریر ہے کہ یہاں کا حسن اصلی اور خالص تھا۔ اس کی حفاظت کے لیے اس نے محافظ بھی اصلی اور خالص بن مانس ہوا کرتے تھے۔ اب حسن بھی نام کا ہے اور محافظ بھی نام کے۔ میں بن مانس نہیں ہوں۔ میں نے چہرہ پہن رکھا ہے اتنا کہہ کر وہ بن مانس چلا گیا۔

ایک نئے اندیشے کے ساتھ دونوں کو تھوڑی راحت ملی۔ قدموں میں تیزی آئی۔ وہ چلنے لگے۔

اب وہ بڑے بارونق بازار سے گزر رہے تھے لیکن وہ سکتے میں تھے۔ سڑک پر، دیواروں پر، ہر گھر کے موڑ پر، دوکانوں کے چہروں پر غرض ہر سمت کاغذ ہی کاغذ تھے۔ تحریریں ہی تحریریں تھیں یوں محسوس ہوتا تھا۔ لبستی باشندوں کی نہیں کاغذوں کی ہے۔

وہ بھیڑیں۔ وہ شور وغل، ہنگامے، جسموں کے کھلے ہوئے گودام اور تانگوں کے پاؤں کی رینگتی ہوئیں قطاریں سب کہاں کس غار میں سما گیا تھا سب کچھ۔

لبستی میں گھر تھے، لوگ تھے، عورتیں تھیں، مرد تھے دوکانیں اور سڑکیں تھیں۔ مگر ان کی جگہ خاموشی جم کر کیوں بیٹھ گئی تھی۔

سکون تھا۔ لیکن اس میں خوف کا پرتو تھا۔ ایک اندیشہ تھا جو ہر خاموش شئے کے سر پر منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے گم ہو رہے تھے۔

لبستی کی نئی نظامی رسم کے مطابق دوکانوں پر آدم قد آئینے لگے ہوئے تھے جن کے نیچے موٹے حروف میں تحریر تھا — اپنی شکل دیکھئے۔ خوبصورتی اور بدصورتی کا اندازہ خود لگائیے۔ پھر خود کی اوقات کے اختیار سے خوبصورت اور بدصورت چیز خرید لیجئے۔

اپنی شکل دیکھنے کے بعد کوئی چیز خریدنا ضروری ہے؟ اس نے ساتھ والے شخص سے پوچھا۔

شاید نہیں۔ خرید و فروخت ضروری نہیں۔ البتہ اپنی شکل کا امتحان لازمی ہے۔ جواب ملا۔

تو چلو۔ اپنی صورت آئینے میں دیکھیں۔

تمہیں اپنی صورت کا احساس نہیں ہے کیا؟ دوسرے نے پوچھا۔

تھا۔ شدت سے تھا۔ لیکن اب نئی رسومات اور نظامی فرق کی بنا پر محسوس ہو رہا ہے میری صورت بدل گئی ہے۔

دونوں ایک بڑی دوکان میں داخل ہوئے جہاں دکاندار کاؤنٹر پر

ایک دلکش عورت، جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی سرخی اور رخساروں پر بالکا دلویدار رعب تھا کھڑی تھی۔

آئینے کے روبرو وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور خود کو دیکھنے لگے۔ لیکن جلد ہی سخت پریشان ہو گئے۔ وہ بار بار آئینے میں خود کو دیکھتے اور اپنے ہاتھ اپنے وجود پر گھما کر انگوں کو محسوس کرتے جب حیرت سے ان کی پیشانیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور سخت لاچاری کے باعث زبان تالو سے چپکنے لگی تو کاؤنٹر والی عورت ان کے قریب آ گئی اور ہنس کر کہنے لگی۔ آپ دونوں بہت پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن آپ حوصلہ بنائے رکھیں دراصل یہ آئینے صداقت کے آئینے ہیں۔ ان میں آدمی کا خارجی بہروپ دکھائی نہیں دیتا۔ آدمی کی داخلی اور نفسیاتی کیفیت کا عکس یہ آئینے ابھارتے ہیں۔

ہم دونوں ہی آدمی ہیں۔ عورت نہیں۔ لیکن اس آئینے نے ہمیں کوئی تیسری ذات ثابت کر دیا ہے۔ دونوں نے کہا۔

یہ تو بہت اچھا ہوا۔ عورت مسکرائی۔ تیسری ذات میں شامل ہونے کے تئیں تو بستی کے بے شمار لوگ ترس رہے ہیں۔ یہ آئینے انھیں کی آرزو کے تکمیل کے تئیں ایجاد ہوئے ہیں۔ ترس رہے ہوں گے۔ ہم دونوں کے ذہن تو پیچیدہ ہو گئے ہیں ہم دونوں اس آئینے میں ہجڑے نظر آ رہے ہیں۔

اب عورت ضبط نہ کر سکی۔ کھلکھلا کر ہنس دی۔ آپ دونوں دو ذاتوں کے قریب آ گئے ہیں۔ عورت آپ کو عورت سمجھے گی، مرد آپ کو مرد تصور کریں گے۔ حق بات یہ ہو گی کہ آپ عورت ہوں گے نہ مرد۔ آپ کی اپنی انفرادیت قائم رہے گی۔

ہم دونوں .... لیکن ہم دونوں تو مرد پیدا ہوئے تھے۔ دونوں نے دھیلے پن سے کہا۔ عورت ان کے زیادہ قریب آ گئی اور بولی۔ اس بستی کا ہر شخص ہر مرد یہی کہتا ہے۔ برسوں سے کہتا آ رہا ہے۔ یہ کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ یہ دشواری قدرے آسان تو ہوئی ہے .... آپ لوگوں کو شاید کچھ بھی خریدنا نہیں ہے۔ عورت نے کہا۔

آپ کے یہاں کیا کیا دستیاب ہے؟ اس نے پوچھا۔

بہت کچھ۔ تقریباً سبھی کچھ۔ یہاں چوڑیاں، پازیب، گھنگھرو، گردنوں کا خم، کمر کی لچک، ہاتھ پاؤں اور وجود کی پھسلن۔ سبھی کچھ ملتا ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت ہے کاغذ کی وہ تلوار جس سے ذہنوں کی چیر پھاڑ کی جا سکتی ہے۔

ہم وہ تلوار دیکھ سکتے ہیں؟ دوسرے شخص نے کہا

عورت فوراً اندر اندھیرے میں گئی اور جھٹ ہی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک مجسمہ تھا۔ دونوں بغور دیکھنے لگے۔

یہ تو مجسمہ ہے عورت کا۔ اس نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

ہاں مجسمہ۔ آج کل عورت کا مجسمہ ایک ایسی شمشیر ہے جو ذہنوں کو جوڑ توڑ سکتی ہے۔ عورت نے کہا۔

اس عجیب مجسمہ کی قیمت کیا ہے؟ دوسرے پوچھا۔

کچھ زیادہ نہیں۔ آپ کا اپنے کردار کا کچھ حصہ یا فطرت کا چھوٹا بڑا ٹکڑا ادا کرنا ہوگا۔

ہم دونوں جب دھندے کا طوق گلے میں ڈال کر باہر آتے ہیں تو اپنا کردار اور فطرت طاق پر رکھ کر آتے ہیں۔ کل اپنے ساتھ لائیں گے اور ادا کر کے یہ تلوار نما مجسمہ تلوار خرید کر لے جائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں دکان سے باہر نکل آئے۔

جانی پہچانی سڑک آج ان کو اجنبی دکھائی دے رہی تھی۔ جس سڑک پر وہ عادتاً گرد خواری کرتے تھے وہی سڑک ان کو عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چل رہے تھے۔

ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟

جہاں یہ سڑک جا رہی ہے۔ دوسرے شخص نے جواب دیا۔

یہ سڑک کہاں جا رہی ہے؟ اس نے پوچھا

یہ سڑک صرف چلے گی۔ پہنچے گی کہیں نہیں۔ جواب ملا۔

تو ہم کہاں پہنچیں گے۔؟ اس نے پھر پوچھا۔

جب سڑک ہی کہیں نہیں پہنچتی تو ہم کہاں پہنچیں گے؟

چلتے ہوئے وہ کہیں بھی نہیں پہنچے تھے۔ لیکن جو منظر ان کے سامنے تھا، وہ بہت دلکش تھا۔ اور ان کے تئیں بہت نیا۔ اس میدان میں شاید جسموں کا اور چہروں کا کل بستی مقابلہ ہو رہا تھا کہ نگاہ کے دائرے میں پھنسنے والا ہر شخص چہرہ پہنے تھا لیکن .... لیکن ننگا تھا ...

چہروں کی وجہ سے کسی کو پہچاننا مشکل تھا۔

خوبصورت گردنیں، دل آویز ہاتھ پاؤں، دلکش گھٹنے اور ٹخنے، جسم اس طرح گھوم رہے تھے جیسے بحر میں بے خطر مچھلیاں۔ روشنی کے نقاطی

پھنسے قہقہے لگا رہے تھے۔

یک بہ یک جیسے ماحول کی تھم گئیں۔ ایک بہت چھوٹا آدمی جس نے بہت بڑا پیغمبری چہرہ پہن رکھا تھا۔ پتھر کے ایک بت پر سوار ہو کر باآواز بلند چلایا۔

میرے محبوب نظامی پرندو اور ہمزاد ذات کے باشندو! — آج کے جشن کی سب سے بڑی خوبی اور کامیابی آج کے نیم عریاں اور عریاں جسم تھے۔ ان کی نمائش بہت مقبول ہوئی اور ستائش بے انداز ہوئی ہم چاہتے ہیں کہ بستی کے ہر شخص کو چہرہ دستیاب ہو تاکہ وہ اس جشن میں شریک ہو سکے اور حسن کی اور جسم کی نمائش کا لطف اٹھا سکے۔ اور پہچانا بھی نہ جا سکے۔

پھر اس پیغمبری چہرے والے نے بہت نرم و نازک انداز میں کہا آج کی خاص اہمیت انعامات میں بھی ہے۔ آپ کی حاضری میں اس بستی کے چند خادموں کو انعامات دیئے جائیں گے۔ لیکن چند لوگوں کو قصوروار بھی ٹھہرایا جائے گا۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں جشن کا دوسرا دور شروع ہوا۔

یہ صاحب جن کو آپ زنانہ لباس اور زنانہ جسم میں دیکھ رہے ہیں انھوں نے گھر گھر گھوم کر ذہنی اور جسمانی زخموں کا حساب رقم کیا ہے

تالیاں — اور دو جوڑی تیز بینائی کی مصنوعی آنکھیں عطیہ کے طور پر انھیں دی جاتی ہیں۔

ان صاحب نے بستی کی بھوک کو بیماری کے طور پر پھیلنے کے خلاف ایک بہت عمدہ کاغذی پلان کیا ہے۔

تالیاں۔ ایک عدد ہلتی ہوئی زبان انعام کے طور پر انھیں پیش کی جاتی ہے۔

اب ان صاحب کی باری ہے انھوں نے بستی کی نئی نسل کے تئیں پُر وقار چہرے بنانے کا کارخانہ قائم کر لیا ہے۔

ایک ساتھ کئی تالیاں۔ انھیں جنگلی بھینسے کا چہرہ عطیہ کے طور پر دیا جاتا ہے

اور یہ صاحب خود ان پڑھ ہیں۔ لیکن ان کی ہستی دیکھئے کہ بستی والوں کے لئے انھوں نے پُرانے الفاظ کو نئے معنی دیئے ہیں۔ اور گلی گلی گھوم کر حرفی اور معنوی چراغ روشن کئے ہیں۔

تالیاں — اور گارڈر نما ایک قلم اور کنواں نما دستانی (ان کو

انعام کے روپ میں دیا جا رہا ہے۔

اور اب آخر میں ایک عظیم الشان انسان کی باری ہے عظیم صاحب کی ... خدمات کو بستی کی نسلیں تا ابد یاد رکھیں گی۔ انھوں نے آئینے ایجاد کئے ہیں۔ جس میں ہر شخص ایک ہی ذات کا دکھائی دیتا ہے۔ درمیانی ذات کا۔

تالیاں — اور ایک حسین ترین۔ پیجڑا انعام کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

پھر تالیاں بجیں کہ بستی اور زمین دونوں اپنے محور سے سرک گئیں۔

اب شاید قصورواروں کے حساب کی باری تھی۔

چند مریل سے لوگ جن کے ڈھانچوں پر کھال انگ سے منڈھی ہوئی نظر آ رہی تھی جن کے انتڑیاں اور پیٹ پھٹے پرچم کے مانند پھڑپھڑا رہے تھے۔ باندھ کر لائے گئے اور سنایا گیا۔

یہ لوگ بستی کے وجود کے لئے خطرناک ہیں کیونکہ یہ لوگ کان کھول کر سننے کے عادی ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھتے ہیں اور زبان پورے طور پر کھول کر بولنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ یہ لوگ چہروں اور چہرہ سازوں کو گالیاں دیتے ہیں۔ یہ لوگ آئینہ توڑ دینے کے پلان مرتب کرتے ہیں اور بے وجہ بھوک بھوک چلا کر بستی کا ماحول خراب کرنے کے درپے ہیں ان کے اس جرم کو ثابت کرتے ہوئے ان کے کان زبان آنکھیں اور بازو گونگے کر دیئے جاتے ہیں۔

ان دونوں کے ذہن حلق میں آ کر پھنس گئے۔ وہ بھاگنے لگے۔۔۔ بے تحاشہ بھاگنے لگے۔ جشن کا منظر اور نشہ بکھر گیا۔ سڑک کہیں رہ گئی — آئینے پیچھے چھوٹ گئے۔ دونوں اپنے وجود کو بازوؤں میں سمیٹے بھاگ رہے تھے۔

وہ دونوں بُری طرح اکھڑ چکے تھے۔ عضو عضو بے جان ہو گیا تھا وہ سوچ رہے تھے

ہم آنکھ کھول کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کان کھول کر سننا چاہتے ہیں۔ اور زبان کھول کر بولنا چاہتے ہیں ہمیں اب اپنی سزا آج ہی سے معین کر لینی چاہئے

وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ ٹوٹا ہوا آئینہ اس کے سامنے تھا آئینہ کہہ رہا تھا۔

تم خود کو دھوکہ دے رہے ہو۔ دراصل تم درمیانی ذات کے جاندار ہو درمیان پیہ وہ میں لٹکے ہوئے آنے والی نسلیں تمہیں کس روپ میں قبول کریں گی اب اس جنگ کی تیاری کرو ———

● ● ●

جوش ملیح آبادی

بدستور سرکاری وظیفہ لے رہے ہیں

باغوں کی دیکھ بھال کیلئے بھارت جانا چاہتے ہیں

جوش مشاعرے میں موجود سامعین غائب

قارئین کرام! آپ کو یاد ہوگا کہ قومی اتحاد کے حکومت میں شریک ہونے کے بعد، لاہور کے ایک ہفتہ وار میں جوش ملیح آبادی صاحب کا وہ انٹرویو شائع کر دیا گیا تھا، جو اس وعدے کے ساتھ لیا گیا تھا کہ

"ان کی وفات کے بعد نشر کیا جائیگا"

اس انٹرویو میں جو قابلِ اعتراض باتیں قائدِ اعظم، پاکستان اور علامہ اقبال سے متعلق کہی گئی تھیں ان کو جاننے کے بعد مختلف سیاسی اور سماجی حلقوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، اس انٹرویو کی اشاعت کے بعد اس وقت کے وزیر اطلاعات جناب محمود اعظم فاروقی نے اعلان کیا تھا کہ:-

"ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ان کا کلام نشر نہیں کیا جائے گا۔"

اس دن سے اخبارات میں جوش صاحب کے متعلق یہ تاثر عام تھا کہ ان کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ اور یہ کہ وہ دل برداشتہ ہوکر بھارت چلے جانا چاہتے ہیں۔

ان خبروں کی اشاعت کے بعد سے جوش صاحب کے حامیوں اور مخالفوں میں زبردست محاذ آرائی ہوئی اور برابر جاری ہے خصوصاً ترقی پسندوں نے جوش صاحب کی مظلومیت کو خوب اچھالا جبکہ ماضی میں ان کو یہ شکوہ رہتا تھا کہ

جوش سرمایہ دارانہ سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ترقی پسندانہ تحریک کے لئے ان کی ذات سے زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔

بہرحال جوش صاحب کو مظلوم کی حیثیت سے پیش کرنا نے ان کی کچھ آؤ بھگت کی گئی۔ کراچی میں ایک جوش امدادی کمیٹی بھی بنائی گئی تاکہ ان کی مالی امداد کے لئے فنڈ جمع کیا جائے جبکہ اس کمیٹی کے قیام کے بعد ان کے کچھ حامیوں نے یہ بھی کہا کہ یہ اچھا اقدام ضرور ہے۔ لیکن جوش کی شخصیت ایسی ہے کہ ان کو مالی امداد کی ضرورت نہیں۔ ان کے خاموش مداحوں میں کچھ بڑے لوگ ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جو یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ اتنی خوش اسلوبی سے کہ ایک ہاتھ سے دیں تو دوسرے ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے

کراچی پریس کلب میں کبھی جوش ملیح آبادی کی آؤ بھگت کے منصوبے کے تحت ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ ان کو اعتماد بخشا دی گئی۔ تقریب میں جوش کی ذات سے حکومت کے رویے کا شکوہ کیا گیا۔ اس تقریب میں مقررین نے جماعتِ اسلامی کو جوش کی اہانت کا ذمہ دار قرار دیا۔ اور جو لوگ جوش کو سننے آئے تھے ان میں جوش کے کلام سے آشنا بہت ہی کم لوگ پائے گئے بس ایک جلسہ کا اہتمام مقررین کے لئے بھی ضروری تھا سو ہو گیا۔ جوش نے بہت کم گفتگو کی، زیادہ کلام بھی سنایا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کو مخاطب کرنے کے لئے باقاعدہ ان کے دوست کوشاں تھے۔

محاذ آرائی یا سیاسی جنگ سے ہٹ کر بھی بہت سے لوگ جوش کی ذات سے لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ ایسے افراد جوش صاحب کو یونس کے ایک منڈلی کے ساتھ دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔ کیونکہ چند مخصوص افراد جوش کے ارد گرد دکھائی دیتے رہے اور لاتعداد تصاویر ان لوگوں نے جوش کے ساتھ بنوائیں۔ اور بعد کو تصاویر کے حصول کے لئے فوٹو گرافروں کو نوٹنے رہے۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ یہ لوگ جوش کو مشاعرے میں سننے کے لئے ایک آدمی بھی نہ لا سکے۔ پریس کلب میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ساڑھے نو بجے جب منتظمین جوش صاحب کو لیکر آتے تو سامعین

موجود تھے کچھ دیر جوش صاحب کو مسند پہ لاکر بٹھایا گیا اس
کے بعد صورت حال دیکھ کر ان کو واپس چلکر آرام کرنے کا مشورہ
دیا گیا۔ تو ان کی زبان سے نکل گیا کہ :-
"ہاں یہاں تو کوئی کچھ بھی نہیں ہے"

ہاں تو بات یہاں چلی تھی کہ خبر گرم تھی کہ جوش کو ملازمت
سے الگ کر دیا گیا ہے ان کا مکان اور جملہ مراعات چھین لی گئی ہیں
اس لئے وہ دل برداشتہ ہو کر بھارت واپس چلے جانا چاہتے ہیں ان
خبروں پہ راقم کو بہت حیرت بھی ہوتی تھی کیونکہ مارچ کے مہینے سے
جہاں ایسی خبریں گرم تھیں وہیں بعض معقول لوگوں نے بتایا کہ :-
"جوش صاحب بدستور کام پہ ہیں اور جملہ مراعات مل رہی ہیں"
اب گذشتہ دنوں جوش صاحب کراچی آئے تو ان سے ملنا
ہوا ان کی باتیں سننے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی مراعات جاری ہیں وہ
اسی بنگلے میں رہتے ہیں جس کا کرایہ حکومت تین ہزار روپے ماہوار ادا
کرتی ہے اور اس کے علاوہ مشاہرہ بھی معقول طور پر ادا کیا جا رہا ہے
ان کی ذات کے خلاف کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہوتا رہتا ہے۔ اب کے بھی
ہوا۔ لیکن وظیفہ بدستور مل رہا ہے ———
جوش صاحب کا کہنا تھا کہ :-
"جنرل ضیاء الحق کے افسر تعلقات عامہ مل آئے تھے۔ یہ ان
دنوں کی بات ہے جب اخبارات میں متضاد خبریں شائع ہو رہی
تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ مطمئن رہیں۔ اسی دوران ان سے پوچھا گیا
کہ آپ بھارت جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ
نہیں۔ اب یہیں انتقال فرمائیں گے، نہ وہاں سے آنے کا کوئی
افسوس ہوا کہ چلے جائیں۔ یہاں بہت دوست ہیں، مداح ہیں،
بہت اچھا ماحول ہے ,,
اور وہ "ہر ملک ملکِ ماست" کہہ کر مسکرانے لگے۔ پھر رک
کر کہنے لگے :-
"میں نے ہندوستان کے دورے پر جانے کی درخواست منظور
کی ہے۔ باغوں کی دیکھ بھال کے لئے جانا چاہتا ہوں ,,
باغوں کی دیکھ بھال کے لئے ؟
جوش صاحب نے بتایا کہ وہاں میرے [illegible] باغ ہیں۔
رشتہ داران کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہ مجھے لوٹ رہے ہیں سوچتا
ہوں کہ جا کر ان کو فروخت کر دوں۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ یہاں روپیہ
کیسے آئے گا حصے کی رقم تو خورد بُرد ہو جاتی ہے،
کاش کوئی انتظام ہوتا کہ رقم لے آتا۔ دیکھئے اب جانا ہوتا ہے
یا نہیں۔

اسی دوران جوش صاحب کی بیوی کا تذکرہ آ گیا کہنے لگے۔
"بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ ہائے پچاس ساٹھ برس کا ساتھ چھوٹ
گیا، بیچاری بیمار رہتی تھی، بڑی عجیب موت ہوئی اس کی" جوش صاحب
بہت یادوں کے سائے میں ڈوب گئے تھے۔ دوستوں اور [illegible]
کو یاد کرنے لگے۔ بابا ذہین شاہ تاجی اور آغا شورش کاشمیری
کو بھی یاد کرتے رہے۔ ان سے بہت سی باتیں یاد ہوئیں۔ کچھ ان کے
مخالفین کا تذکرہ بھی آیا کہنے لگے میں صاف گوئی سے کام لیتا ہوں اور
اور یہی میرا سچ بولنا لوگوں کو بُرا لگتا ہے۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ
کبھی نہیں کیا۔ نظریات کے خلاف کبھی نہیں جھکا۔ اسی لئے میرے بارے
میں سب کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن ہم کو سب عزیز ہیں۔ محبت ہی ہمارا
شعار ہے اور اب تو عمر بہت ہو گئی اب کیا رکھا ہے۔ انہاتوں
ہیں۔ ان سے عمر دریافت کی گئی تو کہنے لگے عمر بتانے میں
اب تکلیف ہوتی ہے۔

میرے دوست قطب الدین ساتھ تھے انھوں نے اولاد
کی بابت پوچھ لیا۔
جوش صاحب مسکرائے اور گویا ہوئے۔
" ایک مطلع کہا ہے۔ بس، یعنی ایک لڑکی اور
ایک لڑکا۔,,

اس ملاقات کے بعد یقین ہوا کہ ———
جوش صاحب بدستور وزارت تعلیم سے
وابستہ ہیں ———
اب قارئین اخبارات میں چھپنے والی خبروں
کا تجزیہ یہ خود کر لیں۔

(چٹان)

ادھورے سپنے

مس شمع یاسمین
سہارنپوری

شبانہ دلہن بنی ہوئی اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھی تھی سب سہیلیاں بڑھ چڑھ کر ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ مگر شبانہ ان سب سے بے نیاز اپنے ماضی میں کھوئی ہوئی تھی۔ ماضی کی تمام باتیں پردۂ سیمیں کی طرح اس کے سامنے آ رہی تھیں اس کو وہ دن آج بھی یاد تھا جب سہیل سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

سہیل اس کی سہیلی قیصر کا بھائی تھا۔ قیصر کے گھر ان دنوں بہت چہل پہل تھی شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں برات آنے میں ابھی چار دن باقی تھے۔ اس وقت شبانہ کا قیصر کے گھر برابر آنا جانا بار بار ہو رہا تھا۔ چار دن بعد اس کی پیاری سہیلی رخصت ہونے والی تھی۔

قیصر شبانہ کو ایک منٹ بھی اپنے سے علیحدہ نہیں ہونے دیتی تھی خوشی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو بچھڑنے کا زیادہ غم تھا دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کی دکھ سکھ کی ساتھی جو تھیں۔

ایک دن شبانہ سہیل کے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی قیصر کمرے سے باہر گئی ہوئی تھی بیٹھے بیٹھے شبانہ سہیل کی تصویر دیکھنے لگی وہ تصویر دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے کسی کے آنے کا پتا بھی نہ چلا۔ نہ جانے سہیل کب سے وہاں کھڑا شبانہ کو دیکھ رہا تھا۔

"محترمہ کب تک اس بے جان تصویر کو دیکھتی رہیں گی۔ بندہ حاضر ہے"

یہ سنتے ہی شبانہ بری طرح گھبرا گئی وہ سہیل سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرما رہی تھی اسے ایسا لگا کہ وہ عین وقت پر چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ وہ وہاں سے بھاگنے ہی والی تھی کہ سہیل نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اس طرح کب تک تڑپاتی رہو گی شبانہ!

کیا تم مجھے پسند نہیں کرتی کیا میں اتنا برا ہوں کہ تم میری طرف دیکھ بھی نہ سکو؟"

شبانہ نے جلدی سے اپنی پلکیں اٹھائیں اور سہیل کی طرف دیکھنے لگی لیکن وہ سہیل سے نظریں نہ ملا سکی اس کی پلکیں شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔

وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر سہیل کی باہوں کا گھیرا اتنا مضبوط تھا کہ وہ صرف کسمسا کر ہی رہ گئی۔ سہیل اس کی بے بسی پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ دونوں خاموش تھے لیکن ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں لاکھوں تمنائیں تھیں ایک دوسرے کو پانے کی حسرت تھی۔ نہ جانے کب تک اس حالت میں دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اپنی بے انتہا محبت کا اظہار کرتے رہے کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

پھر وہ بلا ناغہ روز ہی ملنے لگے کافی دیر تک باتیں کرتے کبھی کسی بات پہ بحث ہو جاتی تو دونوں اپنی بات پہ اڑے رہتے۔ بیچ میں قیصر آ جاتی تو وہ دونوں کی بحث کو ختم کرتی۔ کہتی "کیا بچوں کی طرح آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہو؟"

دونوں سہیلیاں آپس میں بیٹھی باتیں کرتی رہتی اور اگر اسی بیچ سہیل کمرے میں آ جاتا تو قیصر کوئی بہانہ کر کے وہاں سے کھسک جاتی۔ قیصر نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے شبانہ اور سہیل آپس میں بات نہ کر سکیں۔ وہ دونوں کو ملنے کا موقع دیتی کیونکہ وہ دونوں کے دلوں کا حال جانتی تھی اور چاہتی تھی کہ شبانہ ہی اس کی بھابھی بنے۔

اس طرح دن گزرتے گئے دونوں کی محبت پروان چڑھتی گئی۔ اسی دوران سہیل کو کسی کام سے ایک مہینے کے لئے بمبئی جانا پڑ گیا۔ جب شبانہ کو معلوم ہوا تو اسے لگا کہ جانے سہیل اس سے کتنے مہینے کے لئے جدا ہو رہا ہے تو ایک منٹ کی بھی جدائی

برداشت نہیں نہیں تھی شبانہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔

سہیل نے اُسے سمجھایا کہ اس میں رونے کی کیا بات ہے میں جلدی آ جاؤں گا۔

اسے تسلی دیکر سہیل بمبئی روانہ ہو گیا۔ اور شبانہ ایک ایک دن گن گن کر کاٹتی رہی۔ روزانہ نماز پڑھکر اس کی خیریت سے لوٹ کر آنے کی دعا کرتی تھی۔

شبانہ کے لئے ایک دن ایک صدی کے برابر تھا۔ قیصر سے وہ سہیل کی واپسی کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ انتظار کرتے کرتے ایک مہینہ بڑی مشکل سے گزرا۔

یہ خبر سنی کہ رات سہیل آگیا ہے مارے خوشی کے اس کا برا حال تھا۔ قیصر سے ملنے کے لئے شبانہ کا دل بیتاب ہو رہا تھا۔ وہ انتظار کر رہی تھی کہ کب سہیل اس کو بلائے اور وہ جا کر اس سے لپٹ جائے وہ سوچ رہی تھی کہ پہلے تو اس سے بناوٹی ناراضگی کا اظہار کر کے اسے پریشان کروں گی۔ اور جب وہ منائے گا تو......

یہ سب سوچ خود ہی شرما رہی تھی۔

چار دن گزر گئے سہیل کا کوئی پیغام نہیں آیا وہ بہت روئی اس کے لئے ایک ایک لمحہ بھاری تھا قیصر سے ملنے کے لئے وہ پاگل ہو رہی تھی۔ ادھر سہیل نے شاید اس سے نہ ملنے کا عہد کر لیا تھا شبانہ بہت پریشان تھی کہ کیا کرے کس طرح سہیل سے ملے وہ سہیل کو دل و جان سے پیار کرتی تھی اس سے سہیل کی بے رخی برداشت نہیں ہو رہی تھی وہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر سہیل کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا پردیس نے اس کو بیگانہ کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا کہ سہیل کو اس کے گھر میں شبانہ کے خلاف کسی نے بھڑکایا ہے اور اسی لئے سہیل نے شبانہ سے ملنا بند کر دیا ہے۔

شبانہ اس سے ملنا چاہتی تھی تاکہ وہ سہیل کی غلط فہمی دور کر سکے اس کی غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن سہیل اس کو اتنا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ اب تو سہیل اس کو نظر بھی نہیں آتا تھا اور شبانہ نے بھی اس کے گھر آنا جانا بند کر دیا تھا۔

اس طرح ایک سال گزر گیا وہ ہر وقت روتی تھی سہیل کی جدائی کے تصور سے ہی وہ کانپ جاتی تھی اس کا ذہن بہت پریشان تھا۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ سہیل تم نے مجھے غلط سمجھا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میرا دل میرا دماغ تمہارے بارے میں سوچتا ہے۔ خدا کے لئے مجھے اس طرح نہ تڑپاؤ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤنگی۔ مگر وہاں اس کی آہ و زاری سننے والا کوئی نہیں تھا وہ تڑپ رہی تھی اور اپنی محبت کی آگ میں تنہا جل رہی تھی۔ صرف حسرت بھری نظروں سے سہیل کی تصویر کو ہی دیکھتی رہتی۔ اس کی آنکھوں میں ایک درد تھا، تڑپ تھی۔ اپنی بے بسی پر وہ رو کر رہ جاتی۔

ایک دن اسے سہیل کا پیغام ملا جس میں اس سے ملنے کا اظہار تھا۔ پھر وہ پڑھکر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ تھوڑی دیر کیلئے اپنے آپ کو بھی بھول گئی وہ یہ بھی بھول گئی کہ ایک سال کن دشواریوں سے گزار آئے اس نے نہ جانے کتنی راتیں رو رو کر اور جاگ جاگ کر کاٹی ہیں؟ اس نے سہیل سے ملنے کا تہیہ کر لیا وہ سہیل کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی اپنی پاک محبت پر وہ کسی طرح کا الزام نہیں لگانا چاہتی تھی۔ یہ بات بھی نہیں کہ ایک سال میں سہیل کو بھول گئی ہو بلکہ اس کی محبت دور رہ کر اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

آخر وہی ہوا جس کی شبانہ کو امید تھی سہیل کی غلط فہمی دور ہو گئی اور اس نے غرہ جذبات سے شبانہ کو گلے لگا لیا اور وہ گلے لگ کر سسک پڑی ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا کر شبانہ ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی ایک بار پھر پیار کے دیوانے منزل کی تلاش میں چل پڑے۔

اسی بیچ سہیل نے اپنے ایک دوست کا شبانہ سے تعارف کرایا جس کا نام رشید تھا۔ رشید سہیل کا خاص دوست تھا۔ ایک دوسرے کے ہمراز ایک جان دو قالب تھے۔

رشید کے کوئی بہن نہیں تھی اس نے شبانہ کو اپنی بہن بنا لیا۔ رشید خوش تھا کہ شبانہ اس کی بہن ہی نہیں بھابی بھی بننے والی ہے۔

رشید شبانہ کو سگی بہن کی طرح پیار کرتا۔ شبانہ کی زندگی میں پھر بہار آگئی۔

سہیل نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور کسی آفس میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ شبانہ بہت خوش تھی لیکن سہیل نوکری سے خوش نہیں تھا

اس کے خیالات بہت اونچے تھے۔ اس نے دوسرے ملک میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شبانہ نہیں چاہتی تھی کہ سہیل اتنی دور جائے۔

پھر بھی وہ سہیل کی ترقی میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی محبت اور ضد کی وجہ سے سہیل کا مستقبل تاریک ہو۔ اسی ہنسی خوشی میں چھ مہینے گذر گئے۔ ایک دن اس کی محبت کا راز فاش ہو گیا۔ شبانہ کے گھر والے اس شادی کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ سہیل نے اس کی ڈھارس بندھائی اور کہا میری شبو محبت کا دوسرا نام ہی قربانی ہے ہر انسان کو کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔

ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ اچانک سہیل نے شبانہ سے ملنا بند کر دیا۔ شبانہ بہت پریشان ہوئی کہ نہ جانے اب کون سی نئی مصیبت آنے والی ہے۔

رشید نے بتایا کہ سہیل شبانہ سے ملنا نہیں چاہتا سہیل شبانہ سے پیار کا ناٹک کر رہا تھا وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

رشید کو بھی بہت دکھ ہوا۔ اس نے شبانہ سے کہا میں سمجھتا تھا سہیل واقعی تم سے پیار کرتا ہے لیکن اب معلوم ہوا وہ محبت کی آڑ میں تمہیں دھوکا دے رہا تھا۔

یہ سب سنتے ہی شبانہ کے ہوش و حواس گم ہو گئے اسے لگا جیسے کوئی اسے پستی میں دھکیل رہا ہو۔ "نہیں نہیں سہیل مجھے دھوکا نہیں دے سکتا میں نے اس سے پیار کیا ہے اور وہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہے یہ سب کچھ جھوٹ کہتے ہیں،، وہ اپنے آپ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔

وہ باتیں ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں ہمیشہ ساتھ دینے کے دعوے سب جھوٹے نکلے۔

اس کے باوجود وہ سہیل کو نہ بھلا سکی۔ اس کا نام ہر وقت اس کی زبان پہ رہتا۔ رشید کہتا بھول جاؤ۔ شبانہ تمہاری زندگی میں سہیل نام کی کوئی چیز آئی تھی اس کی یادوں کے نقوش تک اپنے دل و دماغ سے مٹا ڈالو اسی میں تمہاری بھلائی ہے" وہ ایک دم تڑپ جاتی جیسے کسی نے اس کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہو۔ وہ کہتی "رشید جاؤں میں اپنی زندگی اپنے پیار کو کیسے بھلا دوں سہیل بے وفا نکلا تو کیا ہوا اپنی ماضی کی حسین یادوں کے سہارے اپنی ساری زندگی گزار سکتی ہوں،،

ابھی کچھ دن بیتے ہوں گے شبانہ کو پتا چلا سہیل سنجیدہ نام کی کسی لڑکی کے چکر میں پھنس گیا ہے اور اب اسے پیار کے سپنے دکھا رہا ہے۔

سہیل ایک بھنورے کی طرح ہر کلی کے گرد منڈلاتا تھا۔ لیکن شبانہ ایک بے وفا ہرجائی عاشق کو بھول نہ سکی۔ وہ پیار میں اتنی دور جا چکی تھی کہ پیچھے لوٹنا ناممکن نظر آتا۔ سہیل نہ جانے اب تک کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کر چکا تھا۔ شبانہ اب بھی سہیل سے پیار کرتی تھی۔

ابھی وقت کے بے رحم ہاتھ اس کے زخم کو مندمل بھی نہ کر پائے تھے کہ اس کے گھر والوں نے اس کی شادی کہیں اور طے کر دی اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی خاموش اپنی بربادی کا تماشہ دیکھتی رہی ایک دن آیا کہ اسے کسی کے پلے باندھ دیا گیا۔ نہ جانے کب تک وہ اپنے خیالوں میں کھوئی رہی قیصر نے اُسے جھنجھوڑ دیا " شبانہ کہاں کھوئی ہو" دیکھو برات آ گئی ہے،، شبانہ کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا اور اپنی حال کی دنیا میں واپس آ گئی۔ اس کے کانوں میں شہنائیوں کی آواز گونج اٹھی۔

رخصتی کا وقت ہو چکا تھا۔ شبانہ کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہیں نکل رہا تھا گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رخصتی کے وقت بہن بھائی بلک بلک کر رو رہے تھے۔

شبانہ کو ڈولی میں بٹھایا جا رہا تھا۔ ڈولی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے چاروں طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے وہ سب سے اپنی اجڑی ہوئی محبت کی فریاد کر رہی ہو۔

اپنی سب تمنائیں ماضی کی سب حسرتیں اپنے سینے میں دفن کر کے وہ اس گھر سے رخصت ہو گئی۔

اور سہیل کے ساتھ سجائے ہوئے مستقبل کے سب سپنے ادھورے رہ گئے۔

●●● ———

دولت کے پجاری

خورشید عالم عثمانی
مقیم جدہ سعودی عرب

وہ برسات کی ایک سہانی رات تھی۔ آسمان پر چاند اپنے پورے شباب سے چمکتا رہا تھا آسمان پر چاروں طرف چاندنی کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ چاند ایک تھکے ماندے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ اپنی آرام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے کالی بدلی آئی اور ہلکی ہلکی سی پھوار پڑنے لگی جس نے موسم کو اور خوشگوار بنا دیا۔ وہ ابھی تک سوچے جا رہا تھا بغیر وقت اور موسم کی رنگینی کا لحاظ کئے ہوئے نہ معلوم ایسے کتنے رنگین موسم اس کی زندگی میں آئے اور چلے گئے قدرتی مناظر بھی اس کو متاثر نہ کر سکے تھے۔ وہ بس لکھے جا رہا تھا اس کو اپنا افسانہ مکمل کرنا تھا اگر وہ ان مناظر میں کھو جاتا تو شاید یہ اس کی زندگی کی طرح نامکمل اور ادھورا رہ جاتا۔ اس کی زندگی ہر پہلو سے نامکمل رہی تھی۔ اس کی رومانی زندگی جس کا آغاز اتنا رنگین اور نشاط انگیز ہوا تھا پھر کچھ ہی دنوں میں وہ کتنی بھیانک اور تاریک ہو کر رہ گئی تھی۔ اب اس میں کسی امید کی معمولی کرن بھی نہ داخل ہو سکتی تھی۔ ہر طرف سے مایوس اور مجبور ہو کر وہ ایک ادیب بننے کی ناکام کوشش کئے جا رہا تھا۔ جب انسان کو زندگی میں مایوسی اور ناکامی ہوتی ہے تب ہی اس کے ذاتی جوہر اور قابلیت کا مظاہرہ ہوتا ہے اس زندگی کو اختیار کرنے سے پیشتر وہ بھی ایک رومان پسند الھڑ طالب علم تھا۔

رات کافی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آخر وہ افسانہ مکمل کر کے اٹھا۔ کمرے کے باہر آیا۔ ابھی تک ہلکی ہلکی پھوار بدستور پڑ رہی تھی اس نے ایک گلاس پانی سے اپنی نہ بجھنے والی پیاس کو ٹھنڈا کیا اور پھر کمرے میں چلا گیا۔

سونے کے لئے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ یکایک ہوا کا ایک تیز جھونکا برابر میں کھلی ہوئی کھڑکی سے داخل ہوا اور اس پر ہلکی سی بارش کی پھوار کر گیا۔ ایک دم اس کے تصورات ماضی کی دنیا میں بکھر گئے اور ساتھ ہی انجم جس سے اس کے ماضی کی کتنی رنگین یادیں وابستہ تھیں۔ اپنی تمام رعنائی اور خوبصورتی کے ساتھ ...... اس کے تصور میں آ گئی۔ وہ بارش میں ایک ساتھ گھومتے ہوئے کتنی خوش ہوتی تھی۔ وہ پہلی اور آخری لڑکی تھی جس کو اس نے اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے چاہا جو اس کے خوابوں کی دنیا کی ملکہ تھی جس کی محبت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ جس کو باوجود کوشش کے بھلا نہ سکا تھا۔

انجم ایک بہت پیاری نازک سی لڑکی تھی۔ کالے کالے گھونگھریالے شانوں پر لٹکتے بال۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹ، ستواں ناک چمکیلی آنکھیں اور کالی کالی لمبی پلکیں۔ بس قیامت تھی۔ پھول جیسا نازک بدن بالکل پھولوں کی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ جو بھی دیکھتا بس اس کو حاصل کرنے کی جستجو میں لگ جاتا۔ بات کرتی تو گویا منھ سے چاندنی کے پھول جھڑتے ہیں۔

انجم جمشید کی بہن کی سہیلی اور کلاس فیلو تھی۔ دونوں کا وقت زیادہ تر ساتھ گزرتا تھا۔ دونوں اسکول ساتھ آئیں جائیں۔ ایک دن جب انجم کا اچانک جمشید سے سامنا ہو گیا تو وہ پہلی ہی ملاقات میں اس کا دیوانہ ہو گیا اور اپنا دل جو اب تک کسی لڑکی کو نہ دے سکا تھا انجم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دے بیٹھا۔ ادھر انجم بھی جمشید سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور اس طرح دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی پارک میں کبھی بازار میں اور کبھی دونوں سینما فلم بھی دیکھنے چلے جاتے۔ انجم بھی جمشید کی دیوانی ہو گئی تھی ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا اور ہر وقت اپنی آنکھوں کے قریب دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک دن بھی اگر ملاقات نہ ہوتی تو انجم بیقرار ہو جاتی اور یہی حال کچھ جمشید کا تھا۔ وہ دل و جان سے انجم کو چاہنے لگا تھا۔ ہر وقت اس کے خیالوں میں گم سوتے جاگتے اس کے سپنے دیکھنے لگا وہ انجم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنانے کیلئے تیار تھا اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا۔ ادھر انجم بھی جمشید کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کیلئے کمربستہ تھی۔

"تم مجھے دھوکا تو نہ دو گے"

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گے"

"دیکھئے میں تمہارے بغیر ایک پل زندہ نہ رہ سکوں گی"

"تم سے جدائی کا تصور بھی میرے لئے موت کا پیغام ہوگا"

"یہ زندگی میں میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ خدا کے لئے مجھے ٹھکرا مت دینا میں نے زندگی میں آج تک کسی سے پیار نہیں کیا میں تم کو دل و جان سے پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ ہی کرتی رہوں گی میں قسم کھا کر کہتی ہوں اور قسم بھی اس کی جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ یعنی میری پیاری امی کہ میں تم سے اور صرف تم سے پیار کرتی ہوں میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی آیا اور نہ آئیگا۔ میں تمہارے بغیر...... انجم اپنی آنکھوں میں پیار بھرے جام لئے جمشید کے قریب بیٹھی کہتی رہی۔

وقت تیزی سے گذرتا گیا۔ جمشید انجم سے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ ایک دن جب جمشید صبح ہی صبح موٹر سائیکل پر گھومنے کے لئے نکلا تو راستے میں کالج جاتی ہوئی انجم سے ملاقات ہوگئی اور اس کو اپنے ساتھ کالج تک چھوڑ آیا۔ کالج پہونچ کر انجم نے موٹر سائیکل کی باسکٹ سے اپنی کتابیں نکالیں اور پیار بھرے انداز سے ہاتھ لہراتی ہوئی کالج میں داخل ہوگئی۔ گھر آکر جمشید کی نگاہ باسکٹ میں پڑے ہوئے لفافے پر پڑی اس نے بڑی تیزی کے ساتھ لفافہ اٹھایا اور جلدی جلدی اسے چاک کیا اور پھر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس میں سے انجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک محبت نامہ جو کہ کسی نصیر کو لکھا گیا تھا ملا۔ اس کے دل و دماغ پر جیسے بجلی سی گری اس کے تمام ارمانوں پر جیسے پانی سا پھر گیا اسے اپنی دنیا بھیانک اور تاریک نظر آنے لگی۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو ملا مگر حقیقت ایک حقیقت تھی جس کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ کاش آج وہ زندہ نہ ہوتا۔

نصیر اس کا رقیب جس نے اس کی دنیا میں آگ لگا ڈالی تھی۔ ایک اعلیٰ اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا اور گھر میں سب کا چہیتا تھا۔ انجم کا دور کا رشتہ دار ہوتا تھا دیکھنے میں خوبصورت اسمارٹ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے انجینئرنگ امتیازی پوزیشن سے کی تھی۔ اور فوراً ہی ایک مل میں نوکری بھی مل گئی تھی۔ ہر طرح سے خوبصورت ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ جو لڑکی بھی اس کو دیکھتی بس ہمیشہ کے لئے اسی کا ہونے کی خواہش کرتی بیچاری انجم کا بھلا کیا قصور تھا

ادھر جمشید ایک بے روزگار، غریب اور معمولی تعلیم حاصل کئے ہوئے تھا۔ اس کے پاس علاوہ خلوص اور پیار کے کچھ بھی تو نہ تھا۔ مگر اسے دولت کی اندھی دنیا میں کسی کے پیار کی کیا قیمت ہے۔ جب اس نے انجم سے اس خط کے بارے میں معلوم کیا تو انجم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بڑی صفائی سے کہا کہ اس نے آج تک کسی کو خط نہیں لکھا۔ تمہارے علاوہ میرا اس دنیا میں ہے ہی کون۔ میں نے آج تک تم کو بھی خط نہیں لکھا پھر بھلا کسی دوسرے کو لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا یقین کیجئے۔ جمشید حیران و پریشان تھا کہ اپنی آنکھوں پر یقین کرے یا کسی کی قسم کا۔ اور اس کے بعد پھر اچانک ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہوگیا جمشید لاکھ کوشش کرتا مگر انجم اس کے سامنے آنے سے کترانے لگی۔ اور اگر اتفاقاً دونوں کہیں مل بھی گئے تو انجم ایک اجنبی کی طرح گذر جاتی۔ انجم جمشید کی دنیا میں آگ لگا کر اور ہمیشہ کے لئے تاریک کرکے دولت مند نصیر کی باہوں میں جا بیٹھی۔ جمشید اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور وہ ایک دن اس گھر۔ اس در۔ اس محلہ۔ اس شہر اور اس ملک کو خیر باد کہکر کبھی نہ آنے کے خیال سے دور بہت دور چلا گیا۔

اور اب انجم کے لئے راستہ بالکل صاف تھا۔ بس وہ تھی اور نصیر۔ رات دن ایک دوسرے کے ساتھ گھومتے پھرتے انجم کے گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ بھلا اس دور میں لڑکے ایک تو ویسے ہی عنقا ہیں پھر نصیر جیسا ہیرا تو لاکھوں کیا کروڑوں میں بھی چراغ لیکر ڈھونڈا جاتا تو شاید کبھی نہ ملتا۔ نصیر کے گھر والوں کو انجم قطعاً پسند نہ تھی۔ انجم انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ان کے خیالات بہت اونچے تھے۔ ان کے تصور میں جو لڑکی تھی وہ بیچاری غریب انجم اس کا مقابلہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کے پاس کار۔ کوٹھی بنگلہ کچھ بھی تو نہ تھا جو وہ نصیر کے گھر والوں کی نذر کر سکتی۔ اس کے پاس تو صرف پیار بھرا دل تھا جو وہ پہلے ہی نصیر کے سپرد کر چکی تھی مگر اس دولت کی پجاری دنیا کے سامنے ایک دل کی کیا حقیقت ہے۔ یہ دولت ہی تو دونوں کے بیچ ایک آہنی دیوار بنکر کھڑی ہوگئی جس کو عبور کرنا شاید نصیر کے لئے ناممکن ہی تھا۔ ایسی دیوار جس

کے آگے کسی دل و جان، کسی وعدہ اور کسی قسم کی کوئی قیمت نہیں۔

آخر کار نفیس کی منگنی شہر کے ایک دولت مند سیٹھ کی اکلوتی مگر بدشکل لڑکی سے کر دی گئی۔ انجم نے نفیس کو بہت جھنجھوڑا۔ اس کو تمام وعدے قسمیں یاد دلائے اس کے آگے روئی، گڑگڑا کر اس سے التجا کی مگر نفیس ایک پتھر کا بُت بن گیا تھا۔ اس پر انجم کے رونے کا کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ بس وہ اتنا کہہ سکا کہ میں گھر والوں کے آگے مجبور ہوں انجم۔ میں ان کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میرے والدین کو ذرّہ برابر بھی دکھ پہونچے۔ ذرا تم ہی سوچو انجم میرے ماں باپ جنہوں نے مجھے اپنا خون پلا پلا کر پروان چڑھایا۔ مجھے پڑھایا لکھایا اور آج میں جو کچھ ہوں صرف ان کی ہی بدولت ہوں۔ تم ہی بتاؤ کہ انجم کیا تمہاری خاطر میں ان کا حکم ٹال دوں۔ شاید میں ایسا ہرگز نہ کر سکوں گا۔ مجھے بھول جاؤ انجم۔ میرے نقوش اور میرا تصور اپنے دل و دماغ اور ذہن سے کھرچ ڈالو۔ بھول جاؤ کہ کبھی ہماری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ انجم میں نے تم سے پیار کیا تھا۔ پیار کرنا کوئی جرم تو نہیں۔ انجم یہی کیا کم ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کے سہارے کتنی رنگین شامیں ایک ساتھ گذاری ہیں۔ میں نے تم سے کبھی ایک دوسرے کا ہو جانے کا وعدہ بھی تو نہیں کیا تھا۔ مگر میں تم سے پھر بھی پیار کرتا رہوں گا۔ نہ جانے زندگی کے کسی موڑ پر مجھے تمہاری ضرورت پیش آجائے۔ یہ اور بات ہے کہ میں فی الحال کسی دوسرے کا ہونے جا رہا ہوں۔ انجم تمہاری طرح نہ جانے کتنی حسین لڑکیاں میری زندگی میں آئیں اور چلی گئیں اگر میں سب کو اپنا لیتا تو شاید ایک لمبی لائن لگی ہوتی۔ نفیس کہتا رہا۔

انجم پر ایک بجلی سی گری وہ بے ہوش ہو کر نفیس کے قدموں میں جا گری اور نفیس اسکو اسی حالت میں چھوڑ کر دور بہت دور جا چکا تھا۔ جب انجم کو ہوش آیا اُس کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ اس کی دنیا اب شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک ویران و برباد ہو چکی تھی۔ آج نہ جانے کیوں اُسے جمشید یاد آگیا۔

●●● ————

غزل

چودھری کاپڑ سروش اُنا

چلائے تھے کبھی خوش ہو کے جو بزمِ حریفاں میں
وہی خنجر لہو میں ڈوبے ہوئے میری رگِ جاں میں

نہ رکھا تار کوئی جیب و داماں و گریباں میں
مگر بل تھے کہ پڑتے ہی گئے زلفِ پریشاں میں

مزاجِ گل سرشتِ خار سے واقف تو ہوں لیکن
مجھے تو راز رکھنا ہے گلستاں کا گلستاں میں

سفینے سیرِ دریا کے وہی کچھ اہل ہوتے ہیں
کناروں سے جو ٹکرا کر ٹھہر جاتے ہیں طوفاں میں

یہ محشر ہے اسے اب پھینک دو کیا منہ دکھاؤ گے
لہو میرا تو جم کر رہ گیا ہے نوکِ پیکاں میں

ترے وحشی نہ جانے کیا وہ منظر دیکھ لیتے ہیں
کہ زنداں سے نکل کر پھر پلٹ آتے ہیں زنداں میں

مرا انجامِ ہستی آئینہ سا جگمگا اُٹھا
جلا کر کون شمعیں رکھ گیا گورِ غریباں میں

نگاہ فطرتِ انساں نے پڑھ کر مجھ سے فرمایا
جوازِ ہر گنہ شامل ہے تیری فردِ عصیاں میں

یہ جلتی آئے دن شمعیں فروزاں ہوتی رہتی ہیں
دھواں کچھ اور بھرتا جا رہا ہے ذہنِ انساں میں

تمہیں یہ ناز تم پر ختم ہے پروازِ انسانی
مجھے یہ دیکھنا ہے کیا نہیں ہے میرے امکاں میں

انہیں دو منزلوں کے درمیاں یہ زندگی گذری
بیاباں سے گلستاں میں گلستاں سے بیاباں میں

بچا کر سب کی نظریں اس لئے یہ دھجیاں رکھ لیں
تری زلفوں کے بھی کچھ تار تھے میرے گریباں میں

سروش اُن کو بہر صورت دکھانا تھا غمِ دل ہم نے
کبھی خوں ہو کے دل میں تو کبھی خوں ہو کے داماں میں

بیدل سرحدی
بی اے، ادیب کامل
"گلزار گنج" پٹنہ (بہار)

روپ، رنگ اور رس

اس کا نام گائتری تھا۔ لیکن گھر والے پیار سے اسے صرف "گے" ہی کہتے تھے۔ انگریزی میں گے Gay لفظ ہے جس کے معنی ہیں چمکیلا، نمائشی، بھڑکیلے کپڑے پہننے والا ---- اور گے واقعی Gay of the alley تھی۔ وہ سچ مچ اپنے محلے کی رونق تھی۔ جس میں آئے ہوئے اسے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا۔ گے میں سحر کی سنہری کرنوں سے سجے ہوئے کھلتے کنول کی سی معصوم [illegible] خوبصورتی ہی نہ تھی بلکہ وہ فلاسفی پڑھتی لکھتی بھی تھی۔ آرٹ اور ادب سے تو اسے بے حد عشق تھا۔ گو اس نے اپنی زندگی میں شاعری کبھی نہ کی تھی۔ مگر اس میں ایک شاعرہ کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس میں تخیل کی پرواز اور فکر کی گہرائیاں موجود تھیں۔ وہ ایک ایسے شاعر کی تلاش میں تھی جو اس کے تخیل کی پرواز کو عرش کی بلندیوں پر لے جائے۔ اسے تمنا تھی شاعرہ بننے کی اور اس سے بھی زیادہ کسی شاعر کی نظم کا عنوان بننے کی۔ لیکن اسے وہ شاعر نہ مل سکا جس کی اسے تلاش تھی جو اس کی ادھوری نظموں میں جان ڈال سکتا۔

آخر ایک دن اچانک خوشی کی لہریں موجیں مارتی ہوئی اٹھیں اور گے کو اس کی خواہشات پوری ہوتی دکھائی دینے لگیں۔ آج وہ تیار ہوتے وقت بیحد خوش تھی آج وہ ایسے کپڑے پہن کر جانا چاہتی تھی جس سے وہ واقعی مشاعرے کی [illegible] بن جائے ایسی گے جو اپنے من مندر کے خیالی دیوتا کی [illegible] آسکے۔ اس نے مختلف رسائل میں چنچل کی بہت سی غزلیں اور رومانٹک نظمیں پڑھ رکھی تھیں۔ اور آج وہ اس نوجوان، خوبصورت، البیلے چنچل شاعر کو بذاتِ خود دیکھنے کے لئے تیار تھی جس کی تصویر وہ کئی اخبارات میں دیکھ چکی تھی۔ وہ بڑی بے صبری سے گھڑی دیکھتی رہی کہ کب سات بجیں اور وہ [illegible] پہنچے۔ آخر وہ وقت بھی آگیا۔ شاعرہ مقررہ وقت سے [illegible] پہنچ گئی [illegible] اور مشاعرہ شروع ہونے کے

تقریباً دو گھنٹہ بعد چنچل کی باری آئی۔ یہ دو گھنٹے گے نے کس طرح گزارے صرف اس کے جوڑے ملتے اور ناک کی نوک پر تیرتی ہوئی پسینے کی ننھی شبنمی بوندیں اور انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے گال ہی بتا سکتے تھے۔ چنچل کے اسٹیج پر آتے ہی گے کا دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگا کہ پاس بیٹھا ہوا آدمی اس کی آواز کو آسانی سے سن سکتا تھا۔ لیکن چنچل کے استقبال میں ہال اچانک تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور گے کے دل کی دھڑکن کی آواز تالیوں میں گم ہو کر رہ گئی۔ اس نے دیکھا چوڑا پاجامہ اور شیروانی زیب تن کئے ایک خوبرو نوجوان نظم پڑھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ سامعین اس کی مسکراہٹ سے بے نیاز نظم کی معنویت میں کھوئے جا رہے تھے۔ گے چنچل کی مسکراہٹ اور لغزش ادائیگی میں۔ یا یوں کہئے کہ اس کی شخصیت پر جادو سی طاری سی ہو گئی۔ اسے نظم کا ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا وہ ٹکٹکی باندھے چنچل کو گھورتی رہی اور اپنے دل ہی دل میں کہتی رہی مجھے کلا کا دیوتا مل گیا، ایک چنچل دیوتا ---- چنچل نے تیسری اور آخری رومانٹک نظم "میرے سپنوں نگر میں خوشبو شعلہ بن کر بھڑک رہی ہے"، ختم کی اور ہال ایک بار پھر (ونس مور) ونس مور، ایک اور – ایک اور کی آواز سے اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ چنچل اسٹیج چھوڑ کر جب مدعو شعراء کی نشستوں پر آیا تو گے جیسے خواب سے چونک پڑی۔ وہ اٹھی اور [illegible] آگئی چنچل سے ملنے کے لئے ---- اسے اپنی [illegible] بنانے کے لئے ---- وہ اس کمرے میں جہاں [illegible] تھے [illegible] چنچل بھی چائے نوشی میں مشغول تھا گے [illegible] کے قریب جا کر آہستہ سے انگریزی میں معاف کیجئے [illegible] آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں کیا آپ باہر آنے کی زحمت فرما سکتے ہیں؟ چنچل کو اس کی معصوم سی [illegible] نے اپنی طرف کھینچ لیا [illegible] پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آگیا

"مجھے کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی"
"جی میرا نام گائتری آٹو والا ہے اور میں سیٹھ مادھو شام آٹو والا کی بیٹی ہوں۔ گگے بولتے بولتے قدرے نروس ہوگئی۔ .. میں آپ کا زیادہ وقت نہ ضائع کرکے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ .... مجھے شاعری سے بے پناہ محبت ہے .... وہ بولے جارہی تھی الفاظ کی ادائیگی سے بے خبر ...... میں چاہتی ہوں کہ آپ کل ہمارے غریب خانے پہ تشریف لائیں" آئیں گے نا آپ؟۔ اس وقت گگے کی چشم نازیں فن کی بھوک سے زیادہ پیاس کا نشہ تھا۔
"اگر آپ بخش سکیں تو ___ چنچل نے مسکراتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ گگے بول اٹھی۔"
"نہیں چنچل جی آپ کو آنا ہی ہوگا ___"
"بہر صورت ___"
"جی ہاں ___"
"تو کس وقت تکلیف دوں آپ کو؟"
"کل ...... ایک لمحہ سوچنے کے بعد یکایک بولی ___ نہیں۔ پرسوں ساڑھے چھ بجے شام، دیکھئے وقت پہ آجائیے گا میں بے چینی سے انتظار کروں گی"
"اچھا، نمستے"
"نمستے"

گگے برآمدے سے نکل کر باغ میں آگئی اس کا رواں رواں جھوم جھوم رہا تھا۔ زبان آپ سے آپ کھینچے ہوئے ہونٹوں پہ پھیرنے لگی تھی۔ اس نے ہونٹ ذرا اور زور سے بھینچ لئے تاکہ کوئی اسے اکیلی کو اس عالم میں دیکھ کر اس کے دل کا راز نہ جان جائے ___ کہ ___ اس نے چنچل کو پرسوں شام تک کے لئے کہا ہے اور پرسوں شام اس لئے کہا ہے کہ وہ گھر میں اکیلی ہوگی ___ ان دو دنوں میں گگے کی کیا حالت رہی یہ تو شاید کاغذ کے وہ سسکتے ہوئے ٹکڑے بھی بیان نہ کرسکیں جن پر گگے نے چنچل کے استقبال کے لئے نظم لکھنے کی ناکام کوششیں کی تھیں ___ چنچل کے آنے کی تقریب نزدیک آتی جارہی تھی اور گگے کے دل کی دھڑکنیں چنچل کے آنے کی خوشی اور اضطراب سے اتنی مدھم پڑ گئی تھیں کہ اُسے دل کے ہونے پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ وہ شیشے میں اپنے سنگار میں کوئی نہ کوئی ترمیم کرکے مزید دلکشی کی کوشش کرتی اور اپنے عکس سے دل ہی دل میں کہتی انھیں کھینچ ہی لیا۔ اسے اپنے حسن کی کشش پر ناز تھا پہنچنے کا وقت جوں جوں قریب آتا گیا اس کی بیقراری تجاوز کرتی گئی اور جوں ہی اس کی نگاہ چنچل پر پڑی بھاگتی ہوئی باہر آگئی ___
"نمستے گائتری دیوی جی"
"چنچل۔ گائتری نہیں صرف گگے کہو گے ___"
"اچھا گگے ہی سہی، چلئے اندر تو چلیں"
"بہت انتظار کروایا چنچل ___ تم نے!"
"انتظار؟ لیکن ابھی تو سوا چھ ہی بجے ہیں"
"یہ انتظار آج کا نہیں چنچل ___ برسوں کا ہے ___"
"برسوں سے میرا انتظار ___؟"
"ہاں چنچل تم کیا جانو؟ میرے دل کی حالت، کا مجھے کب سے انتظار تھا؟"
(چنچل کچھ نہ سمجھا اور نہ ہی وہ جوانی کے نشے میں گگے کو سمجھنا ہی چاہتا تھا)
"اب تو آپ کی تمنا پوری ہوگئی؟"
"ہاں چنچل۔ لیکن مجھے آ[illegible] کہو۔ تم کہو"
"دراصل بات یہ ہے گگے میں چھوٹے بڑے کو آپ کہتا ہوں۔ مجھے آپ بہت پسند ہے، تم میرے لئے پسند نہیں گگے کہ ___ چنچل یکایک رُک گیا تیکھی نظروں اور جھکی ہنسی ہنستے ہوئے اسے دیکھ [illegible]"
"تو تمہیں کیوں پسند نہیں؟" گگے نے دلچسپ آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"میرا مطلب صرف تم سے ہے گگے ___" چنچل اور بے چارگی کے ملے جلے جذبات میں پوچھا گیا

دیال سنگھ پبلک لائبریری
تنہا آدمی کی کتنی کتابیں ہوتی ہیں
یونیورسٹی لائبریری ہوتی ہے
اس کے لئے عوامی لائبریری
میں
ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں۔ اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں ہر موضوع پر ذوقِ مطالعہ کی سیری کیلئے بغیر کسی نقد معاوضہ کے آپ ہر صبح دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک اپنی پسند کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اخبار، ماہنامے اور ہفت روزے بھی ہیں۔
اتوار اور دوسری تعطیلات کو لائبریری بند رہتی ہے
دیال سنگھ پبلک لائبریری ٹرسٹ سوسائٹی، راؤز ایونیو، نئی دہلی

دیال سنگھ کالج

تصویرِ آزادی

توصیف علوی عاصی بی۔ اے کیرانوی

ابھی سنوری نہیں انسان کی تصویرِ آزادی
نہیں ہے صحنِ عالم میں ابھی تنویرِ آزادی
ابھی تک امتیازِ خار و گل باقی ہے گلشن میں
ابھی تک کاغذی تحریر ہے تحریرِ آزادی
مفکرانِ چمن نے خواب تو ہر دور میں دیکھے
مگر دیکھی نہیں ہے آج تک تعبیرِ آزادی
لبوں پر دیکھ کر اہلِ زباں کے مُہرِ خاموشی
ہوا کرتی ہے خود ماتم کناں تقریرِ آزادی
بھرا جاتا ہے رنگ اس میں لہو کی سُرخ بوندوں میں
نکھرتی ہے ہمیشہ خون سے تصویرِ آزادی
قدم اس راہ میں آگے بڑھاتے ہیں جنوں والے
کیا کرتے ہیں "اہلِ دار" ہی تعمیرِ آزادی
جگر کے زخم ہی دیتے ہیں اس منزل میں تابانی
ہوا کرتی ہے سوزِ دل ہی سے تنویرِ آزادی
اُسے معلوم ہے پابندیاں رکھتی ہے یہ کتنی
پہن کر جس نے دیکھی ہے کبھی زنجیرِ آزادی
"یقیں محکم" سے پڑتی ہیں ہمیشہ اسکی بنیادیں
"عمل پیہم" سے ہوتی ہے ہر اک تعمیرِ آزادی
کہاں تک خواب کی دُنیا میں یہ انسان بھٹکے گا
نظر آئے گی کب آخر اسے تعبیرِ آزادی
حقیقت پوچھئے آزادیٔ گلشن کے خاروں سے
گلوں کے حُسن میں ملتی نہیں تصویرِ آزادی
نہ جانے کتنے دل کتنے جگر قربان ہوتے ہیں
ہوا کرتی ہے تب جاکر کہیں تعمیرِ آزادی
ابھی تک زندگی ہے سرنگوں طاقت کے ایواں میں
ابھی محصور کچھ ہاتھوں میں ہے جاگیرِ آزادی
وقارِ آدمیت جسکو ہے معلوم اے عاصی
سمجھتے ہیں حقیقت میں وہی توقیرِ آزادی

کیا اسی کا نام ہے جمہو

یونس مخمور

صاحبِ علم و ہنر بیکار ہیں
جتنے عزت دار ہیں سب خوار ہیں
پُرسکوں لیکن فقط دربار ہیں
کیا اسی کا نام ہے جمہوریت

=

جس کو آتا ہے خوشامد کا ہُنر
حاکموں کے دل سے ہے نزدیک
اہلِ دانش پھر رہے ہیں در بدر
کیا اسی کا نام ہے جمہوریت

=

دیش بھر میں کالا بازاری ہے
یعنی اب بھی ہے وہی کہنہ نظ
کوئی حاکم ہے تو کوئی ہے غا
کیا اسی کا نام ہے جمہوریت

=

جل اُٹھے ہیں پھر تعصب کے چر
پھر پراگندہ ہیں لوگوں کے د
دامنِ انساں پہ ہیں پھر خون کے

=

ہوگیا پامال سب امن و امان
ہر طرف جھگڑے کرا ہیں سسکیاں
غسلِ خوں کرتا ہے جب ہندوستان
کیا اسی کا نام ہے جمہوریت

=

ذرا ٹھہریئے

ٹیلیفون نمبر ۲۶۰۶۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا رجسٹریشن نمبر ۵/۶۳۳ — رجسٹرڈ نمبر ڈی-۳۷

ماہنامہ
شانِ ہند دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ ۱۵/ روپے
فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

شمارہ نمبر ۹ — ستمبر ۶۹ء — جلد نمبر ۴

قطعات

حضرت بوم میرٹھی (مرحوم)

جاں دے کے سپوتوں نے کیا ہے اسے حاصل
آزادی کوئی لوٹ کا سامان نہیں ہے
ہر شخص یہ کہتا ہے کہ بانٹو ہمیں حصہ
یہ ملک ہے حلوائی کی دوکان نہیں ہے

جب میری گستاخیوں کی وہ سزا دینے لگے
وصل کی شب اُن کے گھونسے بھی مزا دینے لگے
اُن کے اک تھپڑ سے ہی میں دم چُرا کر پڑ گیا
گھبرا کے وہ دامن کی ہوا دینے لگے

آج تو اُس پینے والے پیر کو دھوکہ ہو گیا
جو کلیم اللہ کا قصہ بہت مشہور ہے
جب چڑھے ہاتھی پہ ہم دونوں تو پبلک نے کہا
یہ تجلی ہے یہ موسیٰ ہے یہ کوہِ طور ہے

ہے حُسن اپنی جگہ پر حُسن کی توقیر پھرتی ہے
محبت کی جو رنگینی ہے بے توقیر پھرتی ہے
خدا غارت کرے فوٹو کو اور فوٹو گرافر کو
گلے میں یار کی بکتی ہوئی تصویر پھرتی ہے

جلنے والے قیامت میں ملیں گے لاکھوں
کچھ تمیز ہوگی نہ اپنوں کی نہ بیگانوں کی
ایسے جھگڑے نہ کہیں حشر میں ہم کو پیش آئیں
ایک فہرست بنا لیجئے دیوانوں کی

خدا کے فضل سے غارت مصیبت ہونے والی ہے
کہ عاشق کو کئی دن میں عیش و عشرت ہونے والی ہے
دعائیں مانگتا پھرتا اس لئے بابو کے مرنے کی
جو دولت اُن کی ہے وہ مابدولت ہونے والی ہے

[illegible] سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ... پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند ... سے شائع کیا۔

مشاعرہ رسمِ اجراء "قلم کا سفر" رتلام

کریمی الاحسانی

یہ نگر پالیکا رتلام کا پُر سکون، سادہ اور دلکش ہال
ہے جناب دانش علی گڈھی کے مجموعۂ کلام "قلم کا سفر" کا آج
۱۱ جولائی ۷۹ء کو ۹ بجے شب اسی ہال میں اجراء ہو رہا ہے ہال
میں صوفہ سیٹ۔ فرش اور روشنی کا معقول انتظام کیا ہوا ہے
سامعین کا ایک جمِ غفیر ہے جب ہال فدایانِ اردو اور دلدادۂ
شعر و ادب سے پُر ہو چکا تو نیچے کمروں، سڑک اور قریب کی
دکانوں پر سامعین جمع ہوئے ہیں۔ اوپر گیلری میں خواتین
ہیں حالانکہ اس جلسہ کا اعلان عین وقت پر ہوا پھر بھی رتلام کے
سخن فہم اور ادب نواز جوق در جوق ٹولیوں میں پہونچ
رہے ہیں۔!

لیجئے منشی قدرت اللہ صاحب "قلم کے سفر" کے
اجراء کے لئے محترم عباسی صاحب بیرسٹر سے درخواست
کر رہے ہیں۔ عباسی صاحب کی گلپوشی کی جا رہی ہے کیمرہ بھی
حرکت میں آگیا ہے۔ بیرسٹر صاحب فرما رہے ہیں:۔

باہر سے آئے ہوئے شعراء اور مہمان حضرات۔

میرے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ ہمارے یہاں ایسے شاعر
موجود ہیں کہ جنہوں نے ادبی دنیا میں نام پیدا کیا ہے میں
کتاب "قلم کا سفر" پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ پھر اس کتاب
کا اجراء فرما کر سیٹھ شانتی لال گپتا جی کی خدمت میں پیش
کر رہے ہیں۔ تالیوں کے شور میں بیرسٹر صاحب اپنی جگہ آرہے
ہیں۔ اور صدارت کے لئے رتلام کی معزز اور ہر دلعزیز ہستی
سیٹھ شانتی لال گپتا جی کا اسمِ گرامی پیش کیا جا رہا ہے
جس پر تالیوں سے اظہارِ خوشنودی کیا جا رہا ہے۔ اور رزاق
انور صاحب ایک منظوم تہنیت نامہ پیش فرما رہے ہیں جسے
آپ کل ملاحظہ فرمائیے:۔

تیرے قلم میں نہاں جلوۂ پیامِ جدید
ترے سخن سے عیاں رنگِ صبح و شامِ جدید
روش روش پہ مذاقِ سلیم و جدید ہے
پسند آئے نہ کیوں کر ترا خرامِ جدید
خدا کرے کہ مبارک ہو تیرا مستقبل
جہانِ شعر میں تجھ کو ملا مقامِ جدید
ہے دورِ نو سے ہم آہنگ محفلِ افکار
مئے جدید و سرورِ جدید و جامِ جدید
ادائے فکر کا یہ طرفہ بانکپن دیکھو
کئے ہیں شعر و سخن میں یہ التزامِ جدید
خدا کرے یہ ثمر تو قبولیت چمکے
بیاضِ شعر کو تیری ملا جو نامِ جدید
نکالا مصرعۂ تاریخ فکرِ انور نے
ترے قلم کا سفر شوکتِ کلامِ جدید

لیجئے [illegible] جی لالی فرما رہے ہیں:۔
ہمارے ادب پیٹھ اور ساہتیہ کے لئے بڑی خوشی کی بات
ہے کہ دانش صاحب نے اپنی کتاب "قلم کا سفر" پیش کیا
ہے وغیرہ۔ تالیوں کے شور میں آپ جا رہے ہیں اور پھر دانش
صاحب کی گلپوشی کے ساتھ ہی مسہری کی گئی ہے دانش صاحب
شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ مہمان شعراء کرام کو پھولوں کے ہار
پیش کئے جا رہے ہیں اور جناب عابد رضوی مجید پوری نے نظامت
کے فرائض انجام دینے کے لئے مائک سنبھال کر رہبر جونپوری سے
درخواستِ کلام کی ہے۔ رہبر صاحب دلکشی سے فرما رہے ہیں:۔

جب تجھے دل سے بھلانے کی قسم کھاتے ہیں
درد کچھ اور بڑھانے کی قسم کھاتے ہیں
میری کوشش ہے رہوں ہوش پہ قائم رہبر
اور وہ ہوش اڑانے کی قسم کھاتے ہیں

اُردو پبلشرز لکھنؤ کے پروپرائٹر، اتم شرما نے شناخت کروایا تو انہوں نے بڑے خلوص و تشویع سے مصافحہ فرمایا کیونکہ دفتر شاہی ہند میں بھی اکثر اوقات اُردو پبلشرز لکھنؤ سے کتابیں منگائی جاتی ہیں۔ باتوں باتوں میں حضرت جوش ملیح آبادی کی تصنیف "یادوں کی برات" کا ذکر آیا تو یہ صاحب فرمانے لگے یاد کیا کروں اس کے تین ایڈیشن ختم ہو گئے اب چوتھے ایڈیشن کی تیاری مکمل ہو چکی تھی کہ دہلی سے ایک انکوائری اس کتاب کے بارے میں آ گئی اور میں نے بیان دیا کہ میں نے یہ کتاب نہیں چھپوائی اور نہ ہی مجھے اس کتاب کے بارے میں کچھ علم ہے یعنی پانچ منٹ پہلے جو صاحب اپنی کاروباری دیانتداری کا ڈنکا پیٹ رہا تھا کس دیدہ دلیری سے اپنی بد دیانتی کا اقرار کر رہا تھا کہ "یادوں کی برات" کے تین ایڈیشن غیر قانونی طور پر چھاپ کر فروخت کر لئے اور چوتھے ایڈیشن کی تیاری بھی کئے بیٹھا تھا اور انکوائری ہونے پر انکار کر دیا کہ اس کتاب کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں ہے۔

دیانت داری کی اس زندہ مثال پر ہم سب مسکرا دیئے مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردو پبلشرز لکھنؤ نے "یادوں کی برات" کے تین ایڈیشن شائع کئے اور کم و بیش اس سے پچاس ہزار روپیہ کمایا۔ اور جب اس سلسلہ میں محاسبے کا وقت آیا تو سراسر جھوٹ کا سہارا لے کر انکوائری کرنے والے افسران کو جھوٹا بیان دیا۔ لکھنؤ کی سی آئی ڈی کے بارے میں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اگر یہ معاملہ پنجاب یا سرحد کی پولیس کے سپرد ہوتا تو اُردو پبلشرز کے مالک صاحب کا ایک ہی نسخہ میں پاجامہ خراب ہو جاتا اور وہ توبہ توبہ کرتے ہوئے قبول کر لیتے کہ یادوں کی برات کے تین ایڈیشن انہوں نے چھاپے۔ پہلا ایڈیشن پندرہ روپیہ فی جلد۔ دوسرا ایڈیشن بیس روپیہ فی جلد۔ تیسرا ایڈیشن پچیس (۲۵) روپیہ فی جلد کے حساب سے فروخت کیا گیا۔ اور ملک بھر کے کتب فروشوں کو یہ کتاب اُردو پبلشرز نے سپلائی کی۔ ہم اُردو پبلشرز لکھنؤ کے مالک سے مؤدبانہ گزارش کریں گے کہ خدا کے فضل سے آپ کا کاروبار بڑا اچھا ہے اور بقول آپ کے ابھی حال ہی میں کشمیر سے آپ کو [illegible] چھوڑ کر پندرہ فیصدی رشوت دینے پر اکیس ہزار روپیہ ..... کا آرڈر ایسی کتابوں کا ملا ہے جو کہیں بھی فروخت نہیں ہو سکتیں تو ایسی حالت میں آپ کو حضرت جوش ملیح آبادی کو اس علالت کے زمانے میں دس بیس ہزار روپیہ پیش کرنا چاہئے تاکہ آپ کے گناہوں کی تاریکی کچھ کم ہو سکے اور جوش صاحب کو ان کی تصنیف کا کچھ معاوضہ مل سکے۔ ہم لکھنؤ پولیس کو لکھ رہے ہیں کہ "یادوں کی برات" کے سلسلے میں جو افسر تحقیقات کر رہے ہیں اگر وہ دفتر شاہی ہند میں تشریف لا سکیں تو انہیں اسی سلسلے میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم اصولی طور پر پاکستانی مصنفین کی کتابیں بغیر معاوضہ دیئے یہاں اور ہندوستانی مصنفین کی تصانیف پاکستان میں غیر آئینی طور پر شائع کرنے کے خلاف ہیں۔

آکاش وانی کی "ہندی دشمنی"

اس دور میں ریڈیو کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پروپیگنڈے کے لئے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے یہاں جو بات ہو گی وہ دیوتاؤں کی سمجھ میں آ سکے تو آ سکے لیکن کسی انسانی دماغ میں یہ اہلیت نہیں کہ اسے سمجھ سکے۔ چنانچہ حکومت کے ارباب بست و کشاد کی یہ "دیوتائی شان" ریڈیو کی زبان میں بھی کارفرما ہے ہمارا ریڈیو جو زبان آج کل استعمال کرتا ہے وہ ہندوستانی عوام کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

دوسرے پروگراموں کو تو چھوڑیئے آکاش وانی سے جو خبریں نشر کی جاتی ہیں وہ نوے فیصد سننے والوں کو سمجھ نہیں آتیں۔ خیال تھا کہ آزادی ملنے کے بعد گاندھی جی کے فارمولے کو شروع کیا جائے گا اور ہندوستانی زبان کو بڑھاوا دیا جائیگا۔ مگر ہندی کو ترقی دینے والوں نے ایسی زبان استعمال کرنی شروع کر دی ہے کہ یہ ہندی دشمنی تو کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس سے ہندی کی ترقی قطعاً ممکن نہیں۔ ضرورت ہے کہ خبریں ایسی زبان میں نشر کی جائیں جو زیادہ سے زیادہ سننے والوں کو سمجھ آ سکیں۔ حال ہی میں ریڈیو پر ایک تقریباً وقت سمبدھان پر سی بھیو اسپنا لوک منترک ماگوتا راجیہ [illegible] ہے کہ ہندی کا سے نابلد ہونے کی وجہ سے یہ الفاظ لکھنے میں بھی غلطی [illegible] کانسٹی ٹیوشن آف انڈین پبلک" یعنی ہستنترا ناپترا (ذیلے کی پالیسی) [illegible]

دہ ستیاناس کر کے چھوڑا (صدر کی رضامندی کیلئے) ایسے سہل اور عام فقرات سننے میں آئے تو اس تقریر کے سننے والے سہند کا پریمی اس ہندی پریم پر سر پیٹ لیا۔

آکاش وانی کے ذمہ دار افسران کو چاہئے کہ وہ اپنی غلط روش پر دھیان دیں اور آکاش وانی کے پروگراموں میں وہ زبان استعمال کریں جو ہندوستان کے عوام زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں۔

سرکاری دفاتر میں انگریز کی معنوی اولاد

دہلی کے اکثر سرکاری دفاتر (جن میں بلدیہ، میٹرو پالیٹن، حکومت دلی اور حکومت ہند کے دفاتر شامل ہیں) میں اب تک انگریزی راج کے طور طریقوں کی نقل کرنیوالے سرکاری افسران کی فرعونیت کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ڈائن تو چلی گئی ہے لیکن اپنے دانت چھوڑ گئی ہے۔ انگریز کی یہ معنوی اولاد، اپنے دفاتر کے باہر عوام سے ملاقات کے اوقات کے بورڈ لٹکانے کے باوجود فرعونیت کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنے اردلیوں کی زبانی ملنے والوں کو ٹال دیتی ہے۔ نہ معلوم "میٹنگ" کی وبا تمام سرکاری دفاتر میں چھوت کی بیماری بن کر کیسے پھیل گئی ہے۔ جس دفتر میں جائیے یہی سننے میں آتا ہے کہ افسر متعلقہ میٹنگ میں ہیں۔ مرکزی حکومت کا ...

ایڈیٹر شان ہند نے ملاقات کا وقت دے رکھا تھا۔ وقت مقررہ پر اردلی نے بتایا کہ صاحب بہت ضروری میٹنگ بلا رکھی ہے اس لئے آپ یا تو لنچ کے بعد آجایئے گا یا دوبارہ وقت مقرر کر لیجئے گا۔ مگر ایڈیٹر شان ہند نے میٹنگ کے اختتام تک انتظار کرنا منظور کیا اور افسر مذکورہ کے دفتر کے باہر رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ قریباً ایک گھنٹہ بعد ایک حسین و جمیل چھوکری اداۓ کافرانہ دلربائی کمرے سے نکلی اور قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔ اور فوراً افسر مذکورہ نے ایڈیٹر شان ہند کو اندر بلا لیا۔ صاحب بہادر کی میٹنگ میں دخل در معقولات دینے کا اثر ان کی پیشانی سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لہٰذا اکھڑے اکھڑے لہجے میں بات کرنے لگے اور فرمانے لگے کہ سرکاری کام ہمیں پہلے کرنا ہوتا ہے اور پبلک کا بعد میں ان کا یہ کہنا تھا کہ راقم الحروف نے ان کی اس میٹنگ کی سرکاری اہمیت کا پس منظر جتنی سمجھ پایا تو کھسیانے ہو کر کہنے لگے یار تم بیٹھو کر ... کہا نہ کرو۔

کاش کہ انگریز کی یہ معنوی اولاد وقت کی رفتار پر نظر رکھے اور عوام کو بھیڑ بکریاں نہ سمجھے۔

بلبل الشعراء

ابو الانوار ستام ساگری صاحب کو بزم احسن دموہ نے ۱۷ جولائی ۱۹۴۹ء کو کل ہند مشاعرے میں "بلبل الشعراء" کے خطاب سے نوازا ۱۹۳۲ء میں بزم ادب جبل پور نے ستام صاحب کو فخر ساگر اور ۱۹۴۲ء میں ادارہ حیدری جبل پور نے موصوف کو رشک بلبل کے خطابات سے نوازا!

بقیہ صفحہ ۸ سے — بہ کوئے یار بہ انداز ۔۔۔۔

وہ لوگ اس لڑکے کو پہچانتے ہیں جن کی چوری ہوئی ہے تو ہم کیا کر سکتے تھے۔ رات کو فکر مندی میں سوچتے سوچتے ایک ترکیب ذہن میں آئی اور صبح اٹھتے ہی میں نے محلے کے ایسے دو تین اشخاص کو جن کا تھانے پر ہر روز کا آنا جانا تھا یہ بتایا کہ اس لڑکے کو جس چوری میں پھنسایا گیا ہے اس روز تو وہ جیل میں تھا اب یہ تھانیدار اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے کی تیاری کرے۔ پولیس کے خیر خواہوں نے یہ خبر تھانیدار تک پہنچا دی اور دوسرے دن اس تھانیدار نے علاقہ مجسٹریٹ کے ہاں جاکر یہ درخواست دی کہ تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ لڑکا بے قصور ہے لہٰذا اسے ڈسچارج کر دیا جائے اور شام کو لڑکا گھر آگیا۔ پولیس کے ہاتھ پر اچھا ڈھیلے کے اس دہلے کا یہ اثر ہوا کہ اب پولیس والے اس لڑکے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے پہلے سوچنے لگے۔ (جاری ہے)

قطعہ

حضرت بوم میرٹھی

کہیں عزت کہیں بے عزتی سے انقلاب آیا
کہیں جوتے پڑے سر پر کہیں جام شراب آیا
اجی چھوڑو انھیں تم اپنی دہلی کی طرف دیکھو
زلیخا کی طرح سے پھر بڑھی بلی پہ شباب آیا

سے یہ الفاظ ادا ہوتے تھے کہ گھر کا کھانا کیا ہوتا ہے۔ یہ آج ہی پتہ چلا۔ کھانے کے بعد رات کے گیارہ بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ دفتر والے کمرے میں ہی چارپائی بچھا دی گئی اور میں شب بخیر کہہ کر اوپر چلا گیا۔ بیوی کہنے لگی کہ جانی نہ پہچانی اگر وہ رات کو کچھ سامان اٹھا کر چلا گیا تو کہاں ڈھونڈو گے۔ بیوی کی یہ بات سن کر میں فوراً نیچے آیا اور اس لڑکے سے کہا کہ آؤ تمہیں غسل خانہ وغیرہ دکھا دوں۔ مکان ایسا تھا کہ دونوں طرف کھلتا تھا۔ دیدہ دانستہ میں نے اُسے مکان کا تمام نقشہ سمجھا دیا۔ تاکہ اگر اسے بھاگنا ہی ہے تو آج ہی بھاگ جائے اور اگر یہ آج نہیں بھاگتا تو میں اسے مستقل طور پر اپنے ہاں رکھ لوں گا۔

صبح ساڑھے پانچ بجے میں نیچے آیا تو یہ لڑکا بے خبری کے عالم میں گہری نیند سو رہا تھا۔ چھ بجے بیوی نے کہا کہ اسے جگا کے دیکھو آؤ۔ میں نے بالکنی سے جھانک کر دیکھا تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ جب یہ جاگے تو پھر چائے بنا دینا۔ نو بجے دفتر کے لوگ آ جاتے تھے۔ اس لئے ساڑھے آٹھ بجے میں نے اُسے جگایا تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور کہنے لگا بابو جی پتہ نہیں کہ ایسی میٹھی نیند پہلے کب آئی تھی۔ اس نے جلدی سے دری۔ چادر اور تکیہ اُٹھایا اور چارپائی باہر آنگن میں رکھ دی۔ میں نے کہا کہ اوپر جاؤ اور ماتا جی سے کہو کہ چائے بنا دیں۔ کہنے لگا کہ میں نہائے بغیر چائے نہیں پیتا۔ آدھے گھنٹے میں یہ ضروریات سے فارغ ہو کر نہا دھو کے آسن جما کر بیٹھ گیا اور شنکر بھگوان کی اُستتی کرنے لگا۔ مجھے شرما جی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا جنم سے مسلمان ہے۔ اس لئے مجھے تعجب ہوا کہ میں ہندو ہونے کے باوجود شنکر بھگوان کی اُستتی تو کیا کچھ بھی نہیں جانتا اور یہ مسلمان ہو کر شنکر بھگوان کی اُستتی کر رہا ہے۔

ناشتہ کرنے کے بعد کہنے لگا بابو جی تلک نگر میں میرے کچھ کپڑے وغیرہ کسی دوست کے ہاں پڑے ہوئے ہیں وہ میں لے آؤں۔ بس گیا اور آ گیا۔ میں نے پوچھا بس کا کرایہ وغیرہ بھی ہے یا نہیں اس نے قمیص کے کف اُوپر چڑھا رکھے تھے ایک طرف کے کف کھولتے ہوئے دس روپیہ کا نوٹ نکالا اور دکھاتے ہوئے کہنے لگا پیسے تو ہیں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت یہ واپس آ گیا۔ اور آتے ہی کہنے لگا میرا کام مجھے بتا دو۔ میں نے کہا کہ تمہارا کام آہستہ آہستہ تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ ڈاک آنے میں دو۔ پی بجے تک [illegible] میں نے اسے ڈاک فائنڈ کیا اور وی۔ پی کلرک سے بھی کہہ دیا کہ اسے یہ رولا کیا کرے گا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکا بیکار

نہیں بیٹھ سکتا۔ اور وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتے رہنا چاہتا تھا اور جونہی وہ بے کار رہتا تو فوراً سگریٹ سلگا کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر کش لگانے لگتا۔

دو چار دن گذرنے کے بعد میں نے اس لڑکے سے کہا کہ دیکھو بھئی اب تو تم ہمارے لڑکے بن گئے ہو اس لئے سب باتیں ایک دوسرے کو معلوم ہو جانی ضروری ہیں۔ کہنے لگا بابو جی میں تو خود اس موقع کی تلاش میں تھا کہ آپ کو وقت ہو تو اپنی کہانی سنا دوں۔ اس لڑکے نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ میں چار سال کا تھا کہ گھر سے بھاگا۔ مگر مجھے آج بھی اپنا گھر۔ ماں۔ بھائی اور گاؤں کی گلیاں سب یاد ہیں۔ میں لڑکپن میں عجیب کر کسی نہ کسی طرح دہلی آ گیا اور دنیا میں ہر وہ تکلیف جو کسی بھی انداز میں ہو سکتی ہے مجھ پر گذر گئی اور میں سات آٹھ سال کی عمر میں جرائم کی دنیا میں اچھا خاصا نام پیدا کر چکا تھا۔ ایک تھانے دار نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور کہا کہ جیب تراشی سے جو کچھ کماؤ وہ سب مجھے لا کر دیا کرو۔ بچاس سے لے کر ہزاروں روپیہ تک میں نے اس تھانے دار کو دیا تھانے دار کے گھر تک پہنچے تک ہتھیایا ہوا روپیہ میرا ہوتا تھا اور میں اپنے معیار کے مطابق کھلی۔ کوکا کولا پیتا جلیبی وغیرہ کھاتا تو کھا لوں یا ٹیکسی میں سفر کر لوں مگر جونہی تھانے دار کے گھر پہنچا تو اس کی بیوی میری جیب خالی کر دیتی تھی۔ بمبئی میں لوگوں کی جیبیں خالی کرتا تھا اور تھانے دار اور اس کی بیوی میری جیب خالی کر دیتے تھے۔ مگر مجھے ایک ایسی پناہ گاہ میسر تھی کہ مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر میں پولیس کے ہاتھ چڑھ گیا تو یہ تھانے دار ٹیلیفون کر کے مجھے چھڑا لیتا تھا جس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں نے اس فن میں اور بھی اچھے انداز سے کام کرنا شروع کیا۔ مگر میں جب دس سال کا ہو گیا تو تھانے دار کے ہاں سے بھاگ آیا اور ایک دن پولیس نے پکڑ لیا۔ مجسٹریٹ نے ریفارمیٹری سکول میں بھجوا دیا۔ وہاں میں نے ہندی پڑھی۔ گرنتھ سیکھا شنکر بھگوان کی آرتی وہاں کرائی جاتی تھی وہ مجھے یاد ہے۔ [illegible] ہوتا۔ لہٰذا ریفارمیٹری سکول میں ہر لڑکا فالعبو چکور [illegible] بارے میں سوچنا سب کا مشترکہ فرض۔ ریفارمیٹری سکول میں [illegible] بھی لڑکے نقصان دہ ذہن جرائم کی شافت سے وحشت [illegible] اس لئے اس چار دیواری میں بھی ہر وقت ذہنی طور پر [illegible] رہتی کہ کیسے باہر نکلیں اور اپنے جوہر دکھائیں۔ کچھ دنوں کے [illegible]

تیرے گھر والے اب کوئی اور منگیتر ڈھونڈیں گے۔
چچھلتی بولی ۔ لفٹ کا کیا ہے ۔ جس سے مرضی ہے مانگ لے جس سے مانگے گی وہ پھولے نہیں سمائے گا۔

ان باتوں کے باوجود وہ روز ہسپتال جاتی رہی دو مہینے گزر گئے اس کی اس باقاعدگی کو دیکھ کر ممی ڈیڈی گھبرا گئے ایک روز جب وہ ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو ممی نے اسے آواز دی۔ بش ذرا ادھر آنا۔

جب وہ ممی کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ ڈیڈی بھی وہیں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔

بش۔ ممی نے کہا۔ تو کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہے۔؟

میں نہیں سمجھی ممی وہ بولی۔

بعض ہسپتال کی فضا بڑی ڈپیرسنگ ہوتی ہے۔ ذہن پر برا اثر کرتی ہے۔ ڈیڈی نے کہا۔

اگر جانا ضروری ہے تو ہفتے میں ایک دفعہ ہو آیا کر ممی بولی۔

بش۔ ڈیڈی نے کہا۔ اب اس اٹیچمنٹ کو ختم کر دینا چاہئے۔ تو ایک سمجھدار لڑکی ہے۔ ایک معذور کے ساتھ زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔

وہ تو اب ، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ممی بولی۔

ہاں فارگٹ اٹ ۔ ڈیڈی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

تو کیا کہتی ہے بش۔

ٹھیک ہے وہ بولی ۔ ساری عمر میں وہیل چیئر سے تو بندھی نہیں رہ سکتی ۔ بش کا حلق بند ہو گیا ، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سمجھدار لڑکی ہے ڈیڈی نے بش کو تھپکتے ہوئے کہا۔

ڈیڈی آج تو مجھے جانا ہی ہوگا۔ البتہ کل۔ بش رک گئی۔

ضرور ضرور ڈیڈی نے جواب دیا۔

بلکہ اچھا ہے ممی بولی۔ آج خدا حافظ کہہ آ۔

اس شام جب وہ ذولف کے پاس پہنچی تو وہ بڑی حسرت سے پورٹیکو میں کھڑے موٹر سائیکل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے کے سامنے پلاٹ میں وہیل چیئر پہ بیٹھا تھا۔

ہیلو وہ بولی۔

ذولف چونکا۔ اس نے نگاہ اٹھائی ... بش۔ آج اکیلے بیٹھے ہو۔

ہوں۔

گھر والے نہیں آئے۔

کوئی انگیجمنٹ ہوگی۔ صرف تم ہی روزانہ آتی ہو۔

اچھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔

کل سے شاید تم بھی نہ آؤ۔ وہ بولا۔

کیوں

کل میں گھر جا رہا ہوں

کیا واقعی

ہاں بیساکھیاں آ گئی ہیں۔

کہاں ہیں۔

اندر پڑی ہیں۔

ہوں ۔ وہ چپ ہو گئی ۔ دیر تک وہ دونوں چپ بیٹھے رہے ذولف بش بولی۔ آرٹیفیشل لمبز نہیں۔ لگتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ صرف دیکھنے دکھانے کے لئے ہیں۔ ویسے نہیں۔

اوہ ۔ وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولی۔ ٹانگیں تو ٹھیک ہو گئی نا۔

ہاں ٹانگیں تو ٹھیک ہے لیکن ۔

لیکن کیا اس نے پوچھا۔

دی لگز آر آل رائٹ وہ بولا ۔ بٹ ایوری تھنگ اباؤٹ ملی نیو رہل آل رائٹ۔

وہ پھر خاموش ہو گئی دل پہ بوجھ پڑ گیا۔ پھر اس نے خود کو مجبور کیا

مجھے اب جانا چاہئے۔

ہاں وہ بولا ۔ تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ کب تک اپاہج کے ساتھ بندھی رہو گی۔

بش کو ایک چکر سا آیا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ خدا حافظ وہ بولی۔

راستے میں وہ سوچتی رہی۔ سچ کہتا تھا۔ اپاہج سے کون بندھا رہے ڈیڈی ہی ٹھیک کہتے ہیں۔ اس دلیل سے بچ نکلنا اہم ہے۔ میری سہیلیاں نوم ۔ بیدہ ۔ پوپو سب میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ چلو اچھا ہوا۔ آج خدا حافظ کہہ دیا۔

جب وہ گھر پہنچی تو بہت خوش تھی
گھر والوں نے اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

اس رات بش بڑے اطمینان کی نیند سوئی لیکن پتہ نہیں آدھی رات کو کیا ہوا۔ گویا کسی نے اسے جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ کمرہ کسی موجودگی سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ موجودگی گویا بہت ہی مانوس موجودگی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک احساس ابھرا۔ یوں جیسے ہفتوں بھولی ہوئی بات یکلخت ذہن میں ابھر آتی ہے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ذولفی کے پیچھے ہوا میں تیر رہی ہے۔ موٹر سائیکل گھاؤں گھاؤں کر رہا تھا۔ پھر وہ غاؤں غاؤں مدھم پڑتی گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ہوا میں تیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ موٹر سائیکل کا نشان باقی نہ رہا تھا۔ رفتار جو پہلے موٹر سائیکل سے وابستہ تھی اب ذولفی کی ذات سے وابستہ ہو گئی۔ ذولفی کی ذات ابھری ابھرتی چلی گئی۔ سارا کمرہ۔ ذولفی کے پسینے کی خوشبو سے بھر گیا۔

بش گھبرا گئی۔ اس موجودگی کے احساس سے گھبرا گئی وہ موجودگی اس کے اندر سے یوں نکل رہی تھی جیسے چولہے سے دھواں نکلتا ہے۔ جیسے بوتل سے جن نکلتا ہے۔

وہ محسوس کر رہی تھی جیسے اس میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہو۔ جیسے سنڈی تتلی بنی جا رہی ہو۔ جیسے لڑکی عورت میں بدل رہی ہو۔

بش پھیل رہی تھی۔ بھاری درخت بنتی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں وسعتیں ابھر رہی تھیں۔ اتھاہ گہرائیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں جسم حسیات سے لت پت ہوا جا رہا تھا۔ حسیات میں رشتوں کے بندھن ابھر رہے تھے۔ اس کی باہیں ذولفی کے گرد یوں پیوست ہو گئی تھیں۔ جیسے بیل بوٹے کے ارد گرد بل کھا کر لپٹ جاتی ہے ذولفی کا ہیلمٹ سر سے گر گیا تھا۔ جیکٹ تار تار ہو گیا تھا۔ آنکھوں پر چڑھے ہوئے چلا مٹک کے شیشے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے اس کی ذات ننگی ہو گئی تھی اور ذات کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔

اگلے روز وہ بے دھڑک ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوئی ڈیڈی میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں ذولفی سے اپنی انگیجمنٹ نہیں توڑوں گی۔

باپ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
میں ذولفی سے شادی کروں گی۔
لیکن بیٹی باپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"ہی از نیڈ می ڈیڈ" وہ بولی
"بٹ ڈو یو نیڈ ہم" باپ نے پوچھا۔
اس نے جواب دیا۔ "آئی ڈو آئی ایم ہز مدر اینڈ مدر از لے لینڈ آف تو ریٹرن۔"
ڈیڈی نے چونک کر بش کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے نہیں بشرہ کھڑی تھی۔

• • • ——————

غزل

اخلاق سہسوانی

تمہارا غم ہمیں منظور کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
محبت اس قدر مجبور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

چھلک پڑتے ہیں اب آنسو پہ آنسو بے ارادہ ہی
دل اتنا درد سے معمور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

زمانہ ارتقا کی منزلوں پر ہے، مگر انساں
ابھی انسانیت سے دور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

یہ دنیا ہے یہاں مختار بھی مجبور ہے، لیکن
یہاں مختار بھی مجبور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

بدل دیں ہم نے راہیں، بلکہ رہبر تک بدل ڈالے
مگر منزل ابھی تک دور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

کبھی فصلِ خزاں سے بھی ہمیں تھا پیار، لیکن اب
بہاروں میں بھی دل رنجور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

گُل افسردہ، کلی پژمردہ، شبنم اشک ریزاں ہے
مگر یہ باغباں مسرور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

نہ دیکھا حضرت موسیٰ نے کچھ بھی طور پہ لیکن
فسانہ طور کا مشہور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

یہ کیا جادو کیا اخلاقؔ ان کی یاد نے آکر ؟
ہماری شام غم پُر نور کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے!

چنڈی گڑھ
۳۰ راگست ۷۹ء

محترم جناب سرور صاحب

تسلیم!

"شان ہند" کا جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ پچھلا شمارہ پڑھ کر کچھ حضرات نے مجھے بھی لکھا تھا کہ تم سرور صاحب کے اس قدر مداح و معتقد ہو لیکن تم پر چھینٹے اڑائے گئے ہیں۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے لئے آپ کا دل آئینے کی طرح صاف ہے۔

ہمارے مخلصانہ روابط کو ایک زمانہ گذر چکا ہے اور آپ سے بہتر مجھے کون جانتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب آپ نے مجھے "شان ہند" کا فلم ایڈیٹر مقرر کیا تھا۔ اس وقت میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا اور آج میرا لڑکا فرسٹ ایر میں پڑھ رہا ہے اس طویل عرصے میں نہ کبھی آپ کی شفقت میں فرق آیا اور نہ میری عقیدت میں کمی واقع ہوئی۔ زندگی میں دو ہی شخص میرے لئے سب سے زیادہ قابل احترام رہے ہیں۔ ایک آپ اور دوسرے جگناداس اختر میں نے ہمیشہ بڑے فخر کے ساتھ اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ میری ادبی اور صحافتی تربیت جناب سرور تونسوی اور جناب جگناداس اختر ایسی مسیحا ذہن شخصیتوں نے کی ہے۔ جس کے باعث میں ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رہا ہوں اور اردو کی خدمت کو میں نے عبادت کا درجہ دیا ہے۔ گذشتہ سال آل انڈیا ریڈیو جالندھر کے لئے انٹرویو دیتے ہوئے میں نے یہ بات کہی تھی۔ یہی سچائی میں نے پچھلے دنوں ہفت روزہ "عظیم آباد ایکسپریس" اور ہفت روزہ "نیا دور" میں شائع شدہ اپنے مراسلوں میں بیان کی ہے۔ حق بات یہی ہے کہ آپ سے اور اختر صاحب سے زیادہ مسلمانوں کا سچا ہمدرد اور اردو زبان کا حقیقی غمگسار اور کون ہے۔ آپ کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کے باعث محترم شبیل عظیم آبادی نے بجا طور پر آپ کو سپر مسلمان کہا ہے۔

میں نے آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کے ایک لیک رکن کے سامنے آپ کی تعریف کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جواباً میں بھی آپ سے اپنی تعریف کی توقع کروں۔ ایک آزاد صحافی کی حیثیت سے آپ کو اظہار خیال کا پورا حق حاصل ہے۔ خدا گواہ ہے کہ آپ نے جو کچھ تحریر کیا میرے جی میں اس کا رتی بھر ملال نہیں ہے۔

پیر اور مرید اور استاد اور شاگرد کے رشتے ادبی اور ابدی ہوتے ہیں، ان رشتوں کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ میرے دل میں آج بھی آپ کے لئے بے پناہ محبت اور بے پایاں عقیدت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی دعائیں آج بھی میرے ساتھ ہیں۔

یہ سطور اس اعتقاد کے ساتھ تحریر کی ہیں کہ آپ کے اور میرے درمیان غلط فہمی کی خلیج بھی حائل نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی شخص ہمارے مراسم میں دراڑ پیدا کر سکتا ہے۔

اپنی خیر و عافیت سے مطلع فرماتے رہا کریں۔

خاکسار
وشو ناتھ طاؤس

---

۳۱ راگست ۱۹۷۹ء

برادرم سرور — محبت

شان ہند کا جولائی شمارہ آج ملا۔ اور عادت کے مطابق تمہارا لکھا ایک ایک لفظ پڑھ گیا۔ میں تمہاری صاف گوئی کا مداح ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں نیلی فون کی جو حالت تم نے لکھی ہے وہ عالمگیر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی قید نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کا ایک جیسی حالت ہونا قدرتی امر ہے۔ عجب کی کوئی بات نہیں۔ تقسیم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی اصل کو تو نہیں جلا سکتی۔

وشوا ناتھ طاؤس پر تمہارا نوٹ پڑھا۔ میں نہیں جانتا کہ رام صاحب اور ڈاکٹر نارنگ نے وشوا ناتھ طاؤس کی کامیابی کے لئے کیا کچھ کیا۔ کم سے کم مجھ سے ان دونوں نے تو کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ مجھے

تھے۔ وشوا ناتھ طاؤس کا نام انجمن کی رکنیت کے لئے تجویز کرنے والا میں بھی اور پٹنہ یونیورسٹی کے اُستاد ڈاکٹر عبدالمغنی بھی۔ اور شاید بھائی شہاب دلیسنوی بھی۔

دراصل ہوا یہ کہ پچھلے سال پٹنہ میں اُردو کانفرنس ہوئی جس میں اکثر ممتاز ممبروں نے بھی شرکت نہیں کی۔ نام جان کر کیا کیجئے گا۔ دہلی سے صرف ڈاکٹر نارنگ آئے تھے۔ لکھنؤ سے حیات اللہ انصاری اور ان کی بیگم۔ اور کلکتہ سے شانتی رنجن بھٹا چاریہ۔ اور کوئی بھی شریک نہ ہوا۔ مجھ پر اس کا اثر ضرور ہوا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں وشوا ناتھ طاؤس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے۔ ہر اجلاس میں شریک رہے۔ اور دلچسپی لیتے رہے۔ اُردو سے ان کی دلچسپی اور ان کے جوش نے کم سے کم مجھے تو بیحد متاثر کیا۔ اور میں نے ان کا نام تجویز کیا۔ اور دوستوں کو خطوط لکھے۔

سوال گوپال متل صاحب کے مقابلے کا نہیں۔ بہت سے لائق افراد چناؤ میں نہیں آسکے۔ نام جان کر کیا کیجئے گا۔ بے حد لائق اور باصلاحیت لوگ۔ میرے ایک بے حد عزیز دوست اور ایک بے حد عزیز بھائی ہار گئے۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن کسی پر الزام کیوں ڈالوں۔ جمہوری ادارہ ہے۔ ووٹروں کو حق حاصل ہے کہ جس کو چاہیں ووٹ دیں اور جس کو نہ چاہیں نہ دیں۔ گوپال متل سے میرے تعلقات ۱۹۴۶ء سے ہیں۔ پہلی بار میری ان کی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی پھر دہلی میں بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بعض معاملات پر اختلاف ہونے کے باوجود ہم دونوں کے ذاتی تعلقات بیحد دوستانہ اور خوشگوار رہے اور اگر وہ مجھے پہلے لکھتے تو میں انھیں ضرور ووٹ دیتا۔ ان کا نام بھی تجویز کرتا۔ لیکن ان کے ایک عزیز کا خط اس وقت آیا جب میں دوسروں سے وعدے کر چکا تھا۔ اور گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔

گوپال متل صاحب ہار گئے۔ اور وشوا ناتھ طاؤس جیت گئے یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ طاؤس گوپال متل صاحب سے کسی لحاظ سے افضل ہیں۔

میرا خیال ہے کہ تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ گوپال متل صاحب اور وشوا ناتھ طاؤس کا راست مقابلہ تھا۔ پانچ جگہیں خالی تھیں اور چھ دس یا پندرہ امیدوار تھے۔ ہارنے والوں میں اکثر جیتنے والوں سے بڑے نام ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وشوا ناتھ طاؤس انجمن کے لئے کس حد تک مفید ثابت ہوتے ہیں۔

میں اچھا ہوں۔ خدا کرے تم بالکل اچھے ہو۔

خیر اندیش — ہیبت علیم آبادی

بمبئی ۱۵ ستمبر ۷۹ء

پیارے سرور بھائی آداب!

آپ نے بمبئی نہ آکر مجھے ترسایا اور انتقاماً میں نے آپ کے گرامی نامے کے جواب میں تاخیر کر دی آپ کی بہن جی سارے ہندوستان کے مقدس مقامات کی پیمائش کرنے کے بعد بخوشی و خرم واپس آ چکی ہیں۔

آپ کے ذاتی حالات۔ اور ہمارے ملک کے سیاسی حالات میں کافی مناسبت ہے۔

ع یکساں کسی کی گزری نہ ....

اس سال کے ریس کے گھوڑوں نے بھی وہ دولتیاں ماریں کہ جی جانتا ہے لیکن کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔ جب انسان نہیں تو جانوروں سے پیار کرنا ہی پڑتا ہے۔

امید کہ گھر پر سب خیریت سے ہوں گے۔

کار لائقہ اور نالائقہ سے یاد فرمایئے گا۔

آپ کا — راجندر کرشن

لکھنؤ۔

برادرم سرور صاحب آداب!

"شانِ ہند" کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ کی خود نوشت داستان "یہ کوچے یہ بازار بہ انداز محرمانہ گذر" کی یہ قسط بھی بہت دلچسپ لگی۔ خصوصاً آپ کے بچپن اور پھوپھیوں کے کردار کا ذکر۔ یہ کب تک مکمل ہوگی۔ کتابی شکل میں بھی چھپے گی۔

آج میں نے بعض وجوہ کی بنا پر سردار کاؤنسل سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

مخلص

رام لعل

افراد کو ڈراتا، دھمکانا، کلاس روم میں سگریٹ نوشی سے دل بہلانا۔ نقل کو اپنا آئینی حق سمجھنا۔ اگر اتفاق سے کبھی عام گذرگاہ پر ملجانا تو متوقع ہونا کہ ناچیز اُستاد پہلے سلام کرے۔ اگر اس عاجز کی طرف سے پہل میں کوتاہی کا ارتکاب ہو جائے تو قریب آکر منہ سے سگریٹ جُدا کئے بغیر بڑی بے تکلفی سے پوچھنا۔ اور کیا حال ہے یار؟

بے شک یہ تمام حرکات وسکنات آپ کے روشن مستقبل کی دلیل ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ جناب والا اپنے مستقبل کے سلسلے میں چنداں فکر مند ہونے کی ضرورت محسوس نہیں فرماتے کیونکہ آپ کا مستقبل بنانے کیلئے سرکار والا نے ہمیں ملازمت مرحمت فرمائی ہے۔ یہ ہمارا فرضِ اولین ہے کہ اپنے شاگرد ذی رشید کا تمام ہوم ورک مکمل کریں۔ ان کے بالوں پہ ڈائی کے رنگ کا انتخاب کریں۔ فارغ اوقات میں ان کی بیشر ٹوں کے تسمے ہوئے بٹن ٹانکیں اور مختلف خفیہ ذرائع سے انہیں "پلے بوائے" اور "پلے گرل" جیسے سبق آموز رنگین باتصویر رسائل منگوا کر دیں تاکہ ان کا دل اُداس نہ ہو۔ اور ان کی اخلاقیات (؟) کے مطابق متعین ہوں۔ مگر عالی جاہ! گذارش محض اتنی ہے کہ آپ سال چھ مہینے میں صرف ایک بار تعلیمی درسگاہ کا معائنہ فرمایا کریں تاکہ حاضری رجسٹر آپ کی خواہش کے عین مطابق تیار کیا جا سکے اور آپ کو دیکھ کر دل کو تسلی ہو کہ آپ اپنے اساتذہ کے پیٹنے پر مونگ دلنے کے لئے اسی شہر میں موجود ہیں۔

عالی جناب

اگر آپ گستاخی متصور نہ فرمائیں تو عرض کروں کہ ہمارے زمانہ میں یونین کا تصور بھی ہمارے ذہنوں میں نہیں تھا اور اگر طلبا کو جیب کے دنوں میں پانی کے گھڑے کی ضرورت بھی پڑ جاتی تو اس سلسلے میں یونین کا ہنگامی اجلاس طلب کرنے کی بجائے ہم آپس میں چندہ کر لیا کرتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے بڑے ترقی یافتہ دور میں آنکھ کھولی ہے جب کالج کے لئے ایک بس کا مطالبہ کرتے ہیں تو سارے شہر کی کم از کم بیس بسیں نذرِ آتش کر دی جاتی ہیں یونین کے ایک کمرے کے حصول کے لئے پورے تعلیمی ادارے پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ ایک ناچیز اُستاد پر پچاس لڑکے دھاوا بول دیتے ہیں۔ الغرض پچھلے چند برسوں میں لوگ غلط کو ٹھیک طور شاداب ہو گئے ہیں۔ بس کے لئے میں حضور کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ کے دم سے گلشن کا کاروبار چل رہا ہے۔ ناچیز اُستاد کی حیثیت پہلے باغبان کی ہوتی تھی اور اب دربان کی بھی نہیں رہی۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کی شب و روز محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو علم وفن سے کس قدر جذباتی لگاؤ ہے۔ اُمید ہے اس اپیل کی محتاط لفاظی آپ کی طبعِ نازک پر بار ثابت نہ ہوگی اور حضور اس سال کے اختتام پر حقِ شاگردی عطا کرنے کے لئے بنفسِ نفیس اپنی تعلیمی درسگاہ میں نیاز مندوں کی سالانہ کارکردگی کا معائنہ فرمانے تشریف لے آئیں گے۔

شکریہ

آپ کا سعادت مند اُستاد

افسر کی اپیل ماتحت کے نام

بحضور فیض گنجور عالی جناب ماتحت صاحب تسلیمات

مقامِ حیرت ہے کہ آپ جیسی جلیل القدر ہستی کا افسر کی ندامت میرے حصے میں آئی ہے اکثر اوقات جب میں بلاوجہ آپ کو اپنے کمرے میں بلواتا ہوں تو دل ہی دل میں مقدس کتب کی آیات پڑھتا رہتا ہوں جن سے روزِ جزا میں مدد ملتی ہے۔ پھر بھی دل ڈرتا ہی رہتا ہے کہ کوئی بات خاطرِ ناشاد کی مزید خرابی کا باعث بنے۔

عالی جاہ!

جب سے آپ نے مجھے ماتحتی کا آغاز بخشا ہے مجھے یاد نہیں کہ کوئی دن ایسا گزرا ہو جب حضور کی ڈانٹ ڈپٹ دھونس اور دھاندلی سے یہ مسکین اور عاجز بندہ محفوظ رہا ہو۔ اگر آپ اپنے یادداشت پر زور دیں تو آپ کو یاد آئیگا کہ دفتر کا وقت آٹھ بجے صبح سے دوپہر ڈھائی بجے دن تک ہوتا ہے جہاں تک میری ناچیز یادداشت کام کرتی ہے مجھے یاد نہیں کہ عالی جاہ کبھی ساڑھے دس یا گیارہ بجے سے پہلے دفتر تشریف لائے ہوں۔ گیارہ بجے دفتر پہنچتے ہی آنجناب دفتر کے دیگر کارکنوں کو اپنے ہمراہ لیکر چائے پینے تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں سے عموماً بارہ بجے واپسی ہوتی ہے۔ آپ سگریٹ کا دھواں ناچیز کے منہ پر پھینکتے ہوئے مختلف ادھورے کاموں پہ اپنے رنج وغم کا اظہار فرماتے ہیں اور پھر انہیں جلد از جلد مکمل کرنے کا حکم یا وعدہ فرما کر سائیکل چلاتے ہوئے لنچ کیلئے تشریف لے جاتے ہیں۔ اس لنچ میں قیلولہ شامل ہو جائے تو آپ تشریف نہیں لایا کرتے اگر شام دو بجے

ترقی اردو بورڈ کی تازہ ترین مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
حیاتِ جاوید	مولانا الطاف حسین	24/..
توضیحی لسانیات	ایچ اے گلیسن جونیئر، عتیق احمد صدیقی	23/-
ہندوستان میں چھاپہ خانہ	اے۔ کے۔ پرولکر، علی ابن الحسین زیدی	7/25
ہندوستان کے زمانۂ قدیم و وسطیٰ کے کتب خانے	بمل کمار دت، سرتاج احمد عابدی	10/25
قدیم ہندوستان میں شودر	ڈاکٹر رام سرن شرما، جمال محمد صدیقی	14/50
ہندوستان کی معاشی تاریخ اول	رمیش دت، غلام ربانی تاباں	18/75
غزل اور غزل کی تعلیم	اختر انصاری	10/25
انقلاب فرانس	جے۔ ایم۔ تھامپسن، بی جے سنگھ	25/50
عربی ادب کی تاریخ	عبد العلیم ندوی	13/..
یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین علی	14/50
امراض النساء	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	27/25
فطری علاج	غلام احمد، حسن الدین احمد	6/00
تاریخ شاہ جہاں	ڈاکٹر بنارسی داس سکسینہ، ڈاکٹر سید اعجاز حسین	14/..
شہیدانِ آزادی حصہ اول	بی۔ این۔ چوپڑا، بھگونت سنگھ	24/..
شہیدانِ آزادی حصہ دوم	بی۔ این۔ چوپڑا، بھگونت سنگھ	20/-
تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورلیس، ڈاکٹر سلامت اللہ	41/75
ہند آریائی ہندی	ڈاکٹر ایس۔ کے۔ چٹرجی، ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی	13/50
انسانی ارتقاء	ڈاکٹر ایم۔ آر۔ ساہنی، ڈاکٹر احسان اللہ	13/75
مفتاح التقویم	حبیب الرحمٰن خان صابری	28/..
دیوانِ حسرت عظیم آبادی	مرتبہ ڈاکٹر اسعد سعیدی	18/..
انگریزی ادب کا جائزہ	سلامت اللہ خاں	9/50
انیس کے مرثیے	مرتبہ صالحہ عابد حسین	20/..
تحریکِ خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	29/-
دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خاں شیروانی، رحم علی الہاشمی	15/50
بابر	ایل۔ ایف۔ ولیمز رشبروک، ڈاکٹر رفعت بلگرامی	13/25
تعلیمی تشکیلِ نو کے مسائل	خواجہ غلام السیدین	12/75
تاریخ جہانگیر	بینی پرشاد، رحم علی الہاشمی	18/75

کتاب	مصنف	قیمت
ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات	ڈاکٹر سید اسد علی، ڈاکٹر ماجدہ اسد	17/00
آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائے، کشور سلطان	10/50
فرہنگ آصفیہ	مکمل چار جلدوں میں	150/00

بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر ترقی اردو بورڈ نے مندرجہ ذیل کتابیں بھی شائع کی ہیں

کتاب	مصنف	قیمت
بچے کی صحت	ڈاکٹر ستیہ گپتا، ڈاکٹر شمیم نکہت	5/75
باپو اور بچے	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن، تاجور سامری	2/25
مولانا روم کی کہانیاں	مرتبہ محمد حفیظ الدین	2/00
نصوح کا خواب	مرتب حفیظ عباس	3/50
پودوں اور جانوروں کی دنیا	اطہر پرویز	2/50

کتابوں اور دیگر معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتے پر لکھیں

بیورو فار پروموشن آف اردو
منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیئر
ویسٹ بلاک 8، آر۔ کے۔ پورم ۔ نئی دہلی 110022

غزلیں

واحد پریمی مکان ۴۲ گنوری بھوپال ۱

تری نظر کی دھنک ہے ترے لبوں کی شفق
جو رنگ دلوں سے پرچھے مری غزل کا افق

ہر ایک چیز معطر ہے تیرے آنے سے
ترے بدن کا پسینہ ہے یا گلوں کا عرق

کہیں یہ آخری لمحات زندگی تو نہیں
ترے مریض کے چہرے پہ آج کچھ ہے رمق

یہ اہلِ قلب و نظر کے لئے ہے درسِ حیات
مرے صحیفۂ حالات کا ہر ایک ورق

میں اس طرح تہِ بحرِ حیات میں گم ہوں
کہ فکرِ موج خوشی ہے نہ خوفِ سیلِ علق

زباں سے کیا ہے جو گردن بھی کاٹ دو پھر بھی
ہمارے خون سے اُٹھے گی اک صدائے حق

جدید شعر کی پہچان ہے یہی واحد
بیان سپاٹ ہو، مفہوم ہو ادق سے ادق

عروج زیدی رامپوری

ہم نے یہ کفر جابجا دیکھا
نگہ و دل میں فاصلہ دیکھا

حاصلِ عرضِ التجا دیکھا
اُن کا تلطف گریز پا دیکھا

مختلف ہے ہماری طرزِ نظر
خود نما کو خدا نما دیکھا

تم مزاج آشنائے دنیا ہو
کیوں مجھے از سرِ وفا دیکھا

جب سے اُن کی نگاہ بدلی ہے
زندگی کا بھی رُخ نیا دیکھا

رنگِ محفل پہ ناز تھا تم کو
میرے اُٹھتے ہی کیا ہوا دیکھا

جو ہمارے نہیں، ہم اُن کے ہیں
اُلجھا اُلجھا یہ مسئلہ دیکھا

جب دوبارہ کوئی ملا ہم سے
اُن کا چہرہ بھی ہم سرا دیکھا

آؤ کانٹو! گلے سے لگ جاؤ
ہم نے پھولوں کو آشنا دیکھا

صاف گوئی بھی کیا قیامت ہے
ہم نے ہر شخص کو خفا دیکھا

داد خواہی عروج کس سے کریں
قلم پر شورِ مرحبا دیکھا

* * *

بقیہ جدید اپیلیں

توں موجود ہیں اور محلے کی واحد ڈسپنسری میں روز بروز مریضوں کی تعداد میں اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ کار کا ہارن بجا کر حلقے کے تمام ناچیز ووٹروں کو اپنی کار کے پاس بلالیں اور وہیں انھیں نصیحتیں، دھمکیاں، وعدے یا نقد رقم عنایت فرمادیں تاکہ آپ کی لائق احترام پنڈلیوں پر اپنی گیٹ سے ناواقف کتوں کے زہریلے دانتوں اور خونخوار پنجوں کا کوئی نشان نہ پڑنے پائے آپ کی عین نوازش ہوگی۔ فقط

بتیس برس سے آپکا غلام بے دام ووٹر

صنعت کار کی اپیل

مزدور کسان کے نام

بخدمت جناب مزدور کسان صاحب قبلہ

موتیوں والی سرکار!

تسلیمات۔ امید ہے جناب کے مزاج عالی خوش گوار ہوں گے۔ یہ غلام بھی جیسے تیسے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے اور عالی جاہ کی درازی عمر و اقبال کیلئے دعا گو ہے۔

عالی جاہ!

جب سے آپ نے لفظ "حقوق" کا استعمال شروع کیا ہے اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے ذریعے اس کے عملی مظاہرے دکھانے پسند فرمائے ہیں۔ یہ عاجز.... غلام بالکل حواس باختہ ادھ موا اور قریب المرگ ہو کر رہ گیا ہے کوئی دن جاتا ہے کہ سن لیجئے گا کہ یہ چراغ سحری بھڑک کر بجھ گیا۔ اور اس غلام کی فیکٹری اور کارخانے پر تالہ پڑ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

حضور انور!

ایک زمانہ تھا (ــــ ہائے وہ زمانہ!) کہ ہم میں اور آپ میں طرح طرح کی حکایتیں ہوتی تھیں۔ محبتیں ہوتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کام ہوتا تھا۔ یہ غلام اگر آپ کو چھ گھنٹے کا ملازم رکھتا تھا تو آپ اس عاجز کی خوشنودی اور اوور ٹائم کے حصول کے لئے بارہ گھنٹے سے پہلے فیکٹری یا کارخانے سے باہر جانا کفر سمجھتے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ رجسٹر حاضری میں تو آپ کا اسم گرامی نظر آتا ہے خود آپ مہینہ بھر سے پہلے گیٹ کے اندر داخل ہونا کسر شان سمجھتے ہیں۔

یہ غلام جو موجود ہے۔ کرتا ہی کیا ہے۔ بجلی کی مشینوں کا بٹن دباتا ہے۔ سو یہ عاجز اس کام کے لئے ہمیشہ تیار پایا۔ پروڈکشن جس کو آپ پیداوار کہتے ہیں کا گراف اگر صفر پر اٹکا رہے تو آپ کا اس میں کیا قصور ہے۔ آخر اس جرم پر آپ ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جائے۔ کیوں نہ اپنی کمائی کے چند صفر نکال آپ کی تنخواہ کے ہندسوں کے ساتھ جوڑ دیے جائیں تاکہ اس دل خوش ہو اور آپ کو اطمینان حاصل رہے کہ اس ملک کی صنعتی ترقی میں آپ کا بھی ہاتھ ہے (تنخواہ کے بل پر انگوٹھا لگانے والا ہاتھ)

عالی جاہ!

میری کیا مجال ہے کہ آپ کی خدمت اقدس میں اپیل کرسکوں۔ لیکن جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ قبلہ و کعبہ اس عاجز نے لاکھوں کروڑوں روپے کی لاگت سے جو مشینیں خریدی ہیں وہ محض دیکھ کر گزر جانے یا ہاتھ پھیر کر دھات اور بناوٹ کی تعریف کیلئے نصب نہیں کیں بلکہ آپ اپنے ذہن پہ زور دیں اور ڈیوٹی چارٹ پر نظر کرم فرمائیں تو آپ کو چند بٹن چند لیور اور چند دیگر پرزے یتیموں کی طرح شفقت کے متمنی اور منتظر دکھائی دیں گے ان پر ایک مخصوص مدت تک دست شفقت پھیرنے کے نتیجے میں یقینا صنعتی بحران میں ایک حد تک کمی آجائے گی۔ یقین نہ آئے تو آزما دیکھئے مگر اس کے لئے جناب والا کو فیکٹری یا کارخانے تک خود آنے کی زحمت گوارہ کرنی پڑے گی۔

آپ کا ناچیز صنعت کار غلام

قطعہ

ڈاکٹر یوسف سرن ارمان۔ بلاری

غلامی کا اثر انسان کے تن ہی تک نہیں رہتا
یہ اس کی ذہنیت کو بھی بناتی ہے غلام اپنا
ہم اپنے گھر میں انگلش بولنے پر فخر کرتے ہیں
لکھا کرتے ہیں دروازوں پہ انگریزی میں نام اپنا

حضرت احسن رضوی

دانا پور

فانوس میں شعلہ یہ تری جلوہ گری ہے
دل یوں تو سلامت ہے مگر آگ بھری ہے
بجھتا تو ہے پانی بھی احسن آتش غم سے
لیکن مری حسرت ہے کہ شو کی نہ ہری ہے

ٹھکرا دی ستم گر نے یہ کہہ کے مری رُود اد
تاریخ وفا ایسی مثالوں سے بھری ہے
پتھر کی طرح ثبت ہیں کل نقش ستم کے
دل ٹوٹ کے دل کب ہے عقیق جگری ہے

شایاں تو جبھی ہیں اشکوں کی عبارت
اس سطر میں جو بھی ہے وہ نکتہ نظری ہے
زہراب محبت کا اثر دیکھ رہا ہوں
اب کشت تمنا اسی پانی سے ہری ہے

جو نکالے ہیں گلشن کی ہوا دے کے ٹھوکے
پھولوں پہ گراں لذت خواب سحری ہے
اونچی نظر آتی ہے مری خاک زمیں سے
مٹنے پہ بھی باقی وہی پالیدہ سری ہے

کہتے تھے دل ناز کے شعلے سے بچا کر
دنیا ہے ، اس آگ میں خود جل کے مری ہے
گم جا دہ حیرت میں ہوئے جاتے ہیں دل وہوش
اب ساتھ وہ سامان بھی نہیں جو سفری ہے

لذت بھی ہے عشق کی تلخی بھی ہے غم کی
احسن ہے غزل شیشہ تو مضمون پری ہے

احمد حسن شمس

کٹرے گنج پوریہ

مجھ کو جنگل کی ادائیں بھا گئیں
سب لکیریں ہاتھ کی عشرت آگئیں

دھوپ ابھی کیاری کو چھو پائی نہ تھی
خواہشوں کی کونپلیں مرجھا گئیں
خون میں بس کر ہوائیں شہر کی
اب مری دہلیز تک بھی آگئیں

مردمک میں چھپ گئی حق بین نظر
ہر طرف درسی کتابیں چھا گئیں
اک گلی کی موڑ پر کل رات کچھ
اجنبی پرچھائیاں ٹکرا گئیں

یوں تو پابِ نفس میں ہوں ضبط کیش
اور اگر زلفیں تری لہرا گئیں
میں اسی وقت ایک دفعی جاگ اٹھا
صندلی باہیں جو بھی بل کھا گئیں

دشت نے آواز دی ہی تھی سبھی
بجلیاں بے ساختہ اٹھلا گئیں
شمس کے آنگن میں کیسی آئی بوچھار
ننھی ننھی بوند یا شرما گئیں

حضرت ساقی سکندرپوری مرحوم

شفق ہے رنگ گلوں سے شباب مانگے ہے
ریاضِ خلد کسی کا جواب مانگے ہے
مسیح و خضر کو بھی جس کا حوصلہ نہ ہو
وہ زندگی دلِ خانہ خراب مانگے ہے
بلائے رحمت پیری ارے معاذ اللہ
تمام عمر کا غائم حساب مانگے ہے
مزاج گردشِ دوراں سے ہوشیار رہو دوست
قدم قدم پہ نیا انقلاب مانگے ہے
جنونِ عشق کی نارسائیوں کا حال نہ پوچھ
طلوعِ مہر سے توفیقِ خواب مانگے ہے
ہے آج بھی وہی ساقی کے زہد کا عالم
قفس نصیب شراب و کباب مانگے ہے

ڈاکٹر غیاث عارف وزیری آغیز بمبئی

مائل وہ بلا وجہ کرم پر تو نہیں ہے
اس خیر کے پردے میں کہیں شر تو نہیں ہے
ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں اخلاص دلوں میں
اس نام کی دھرتی پہ نہیں جگر تو نہیں ہے
تہذیب نہ وہ شہر میں ہر جسم ہے عریاں
یہ وقت کا بھلا بھیا جور تو نہیں ہے
ہر سمت نظر آتے ہیں کیوں خون کے چھینٹے
ناکردہ گناہی تہِ خنجر تو نہیں ہے
آثار نمایاں ہیں منزل کے ابھی تک
بے بہرۂ منزل تمہیں رہبر تو نہیں ہے
کیوں دیکھ آزار ہے اس دور کا انسان
سینے میں کہیں واقعی پتھر تو نہیں ہے
اس دور پہ مجھیں ساقی کو ہر کوئی ہے بیتاب
اس دور میں کہیں جذب سراسر تو نہیں ہے
نظروں کو تشفی نہیں کیوں جلوۂ گل سے
عادت کوئی منظر پس منظر تو نہیں ہے

اگر آپ زیادہ شرحوں پر باقاعدہ
سالانہ آمدنی حاصل کرنا چاہتے ہیں
تو
ڈاک گھر میعادی ڈپازٹ اسکیموں میں روپیہ لگائیے
میعاد
شرح سود
تفصیلات
5 سال
3 سال
2 سال
ایک سال
10 فیصد سالانہ
8 فیصد سالانہ
7 1/2 فیصد سالانہ
7 فیصد سالانہ
* سود قابل ادائیگی سالانہ
x سود لینے آپ آپ کے ڈاک گھر بچت بنک کھاتہ میں منتقل کر دیا جائیگا۔
x سود پچاس روپے کے حاصل ضرب میں لیے آپ آپکے اسی میعادی ڈپازٹ کھاتے میں جو بدلا دیا جائیگا
دیگر فوائد
آپ جتنی رقم چاہیں لگا سکتے ہیں، مگر 50 روپے سے کم نہیں۔
3000 روپے تک سالانہ سود کمانے پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔
ایک سال کے بعد آپ میعاد پوری ہونے سے پیشتر بھی کھاتہ بند کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں لاگو ہونے والی شرح سود میں 2 فیصد کی کمی ہو جائے گی۔
تفصیلات کے لئے،
اپنے قریبی ڈاک گھر، یا
منظور شدہ ایجنٹ، یا
ڈسٹرکٹ سیونگز افسر، یا
اپنے علاقے کے ریجنل ڈائرکٹر د بنفل سیونگز سے رجوع کریں۔
قومی بچت ادارہ
پوسٹ بکس نمبر 9، ناگپور - 440001
DAVP 79/92

رازی نے تو شادی تک کے لئے اس سے کہا دو اکنٹ کر
گئی۔ اس بے باکی پر اسے طیش نہیں آیا۔ سہیل کا خیال آتے ہی
اس کی ہونٹوں پہ ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ آ گئی وہ اس کے لئے دل
کسی گوشے میں جگہ ضرور پاتی تھی۔ مگر اس کے خیالات عجیب
سے تھے۔ وہ کہتا:

"یونیورسٹی کی لڑکی سے دوستی کی جا سکتی ہے اس کے
ساتھ تفریح کی جا سکتی ہے۔
مگر وہ مرد کو سکون نہیں دے سکتی"

سہیل کی انہی باتوں سے وہ اندازہ لگا لیتی کہ وہ اس کا
ذہن پڑھ لیتا ہے اس کے سامنے وہ مجرم سی بنی رہتی۔ پتہ نہیں کس
لئے سہیل اس کی کوئی کمزوری پکڑ لے اور پھر اس نے سہیل کا خیال
ذہن سے کھرچ ڈالا۔ وہ سوچتی بھلا راستہ چلنے والے کا بھی کبھی ہاتھ
تھاما جا سکتا ہے وہ تو پاس سے گزر جاتا ہے۔ اور کبھی پیچھے مڑ کر بھی
نہیں دیکھتا۔ اس سے تعلق تو بس اتنا ہوتا ہے کہ نگاہیں اٹھائیں ایک
لمحے کے لئے رک گئے اور پھر آگے چل نکلے جیسے دو چیونٹیاں چلتے
چلتے ایک دوسرے سے کانا پھوسی کر کے پاس سے گذر جاتی ہیں۔ زندگی
کی راہ پہ ہر لمحے ہر آن دھڑکن بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن یہ راہ اس قدر
معروف ہوتی ہے کہ اس کے بڑھنے سے کوئی کہانی جنم نہیں لیتی
پھر فوراً ہی وہ اپنے خیالات کے ہیولے سے ان سب کا موازنہ کرتی
تو یہ سب اس کے آگے ہیچ نظر آتے اور پھر یہ سب وقت کے ساتھ
ساتھ اس کی زندگی کے پس منظر میں گرتے رہے اس کی یادوں کا
یہ پس منظر انہیں نگلتا رہا۔

وہ اپنے خیالات کے ہیولے کو سینے سے لگائے زندگی کی پگڈنڈی
پہ چلتی رہی۔ زندگی کے ہر موڑ پر تنہا کھڑی ہر آنے جانے والے کو دیکھتی
رہی اور پہچاننے کی کوشش کرتی رہی کہ کس میں اس کے ہیولے کے
نقش بہت نمایاں ہو آئے یقینی تھا کہ کسی موڑ پر اس کے خیالات کا ہیولا
اس کا استقبال کرتا ہوا ملے گا۔ ماں باپ مطمئن تھے کہ اس نے تعلیم
مکمل کر لی ہے۔ اب جیسا وہ چاہتے ہیں۔ ویسا ہی رشتہ ملے گا لیکن
وہ زندگی کی پگڈنڈیوں پہ اکیلی ہی چلتی رہی۔ فاصلے گھٹتے رہے۔ وہ دیکھتی
اس کا ہیولا سامنے کھڑا ہے مگر چلتے چلتے وہ تھکتی جا رہی تھی۔ وقت کو
پنکھ لگ گئے تھے۔ اس انتظار کی یکسانیت سے اکتا کر اس نے اپنے آپ

کو بہلانے کے لئے اس نے ایک کمپنی میں ملازمت کر لی۔ ماں نے مخالفت
نہیں کی اور باپ کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ اس کا دل بہلتا رہے گا۔
عصمت کے اس کمپنی میں داخل ہوتے ہی ایک دم ایک تبدیلی آ گئی۔ یہ
تبدیلی خود عصمت نے بھی محسوس کی جہاں پہلے لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر
بیٹھے اونگھتے رہتے تھے اب ان میں زندگی کی تازگی آ گئی تھی۔ لوگ
لباس میں خاصا اہتمام کرنے لگے۔ وقت پہ آنے اور دیر میں جانے لگے
یہ تبدیلی محسوس کر کے آخر ایک روز اس کے افسر صدیقی صاحب نے
اس سے کہہ ہی دیا۔

"مس عصمت آپ نے تو اس دفتر کی کایا ہی پلٹ دی" وہ مسکراتی
ہوئی واپس اپنی سیٹ پہ آ گئی کام کرتے کرتے کبھی نظر اٹھا کر ادھر ادھر
نظر ڈالتی تو کئی نظروں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتی۔ اس کے
گلابی چہرے پہ شفق ابھر آتی۔ اسی شام تھکی ہاری دفتر سے گھر پہنچی تو
معلوم ہوا کہ اس کے پاس ہی بیٹھنے والے خالد نے پیغام بھجوایا ہے۔
اسے غصہ آ گیا، جانے کیوں؟ اس نے سوچا کہ دفتر میں کیا چپ چاپ
اور نیچی نگاہیں کئے بیٹھا رہتا ہے۔ ماں باپ نے اس کی رائے لی تو اس
کے سامنے اس کا ہیولا آ گیا اور عصمت نے فوراً انکار کر دیا۔ پھر عصمت
نے دفتر میں دیکھا کہ خالد نے اپنی سیٹ دوسرے کمرے میں لگوا لی
سب اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی حماقت کر رہا ہو
کیونکہ ہر شخص اپنی سیٹ وہیں لگوانا چاہتا تھا مگر وہ بے پروائی سے
اپنے کام میں لگی رہی۔ پھر صدیقی صاحب کے پاس ایک فائل لے کر کسی
کام سے چلی گئی وہ دیکھتے ہی خوش ہوئے جیسے اس کا انتظار کر رہے
ہوں۔

"میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا" صدیقی نے مسکرا کر
کہا۔ عصمت نے صدیقی کو بھرپور نظر سے دیکھا وہ بھی اس کو دیکھ رہا
تھا۔ اس کی تیز نگاہوں نے عصمت کی روح کو جھنجھوڑ دیا۔ اس کے سینے
میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ کئی دنوں سے وہ صدیقی اور اپنے ہیولے کا
موازنہ کر رہی تھی۔ صدیقی بالکل اس کے معیار کا طرح دار [illegible]
اور اعلیٰ منصب والا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اپنے خوابوں کا ہیولا
نظر آیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے اور یہ کچھ کہنے کے لئے کئی دنوں سے سوچ
رہا ہوں"

خود عصمت بھی اس سے کچھ سننا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے خوابوں کا ہیولا اب مجسم بن جائے اور اسے اپنے ساتھ کہیں دور لے جائے۔ عصمت کے چہرے پر تجسس کے تاثرات نمایاں تھے جو شاید صدیقی نے پڑھ لئے۔

"میں آپ سے شادی....."

اس لمحے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے مندر میں گھنٹیاں سی بج رہی ہوں اور وہ اپنے جذبات کی متلاطم موجوں پر بہتی چلی جا رہی ہو۔ اس کے آگے عصمت میں سننے کی تاب نہیں تھی وہ کمرے سے بھاگ گئی۔ اس کے رونگٹے رونگٹے سے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ وہ سوچنے لگی صدیقی اس کے لاشعور کی بات کیسے سمجھ گیا جو ابھی اس کے شعور میں بھی نہیں آئی تھی۔ شاید خیالات اور روح کا سفر ایک ہی ہوتا ہے لیکن صدیقی کے ایک ہی جملے سے اس کے لاشعور کی ساری خواہشات اس کے شعور کے دامن میں آپڑیں۔

چھٹی ہونے پر صدیقی نے اسے اپنے گاڑی میں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی تو وہ راضی ہو گئی۔ اس سے پہلے اگر صدیقی اس سے یہ کہتا تو شاید وہ کبھی نہ مانتی اور صاف انکار کر دیتی۔ صدیقی کا گھر راستے میں تھا اس نے کہا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرا گھر دیکھ لیجئے اور ایک پیالی چائے بھی، اس کے بعد میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

وہ انکار یا اقرار بھی نہ کر پائی تھی کہ صدیقی نے کار اپنے گھر کے سامنے روک دی وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور صدیقی کو ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھا دیا۔

"آپ تنہا ہی رہتے ہیں" عصمت نے پہلی بار پوچھا۔

"ہاں" صدیقی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا عصمت کو جانے کیوں اس پر ترس آیا۔ صدیقی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"شادی سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔"

عصمت کے گالوں پر قوس و قزح لہرا گئی جانے کیسے وہ اس کے دل کی بات لے اڑا تھا، وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ صدیقی نے اپنے بازو اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس پھندے کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اس کی پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح کربل کھا کے رہ گئی۔ اسے اپنے خیالوں کا ہیولا دھندلا ہوتا نظر آیا۔

صدیقی کی آنکھوں میں اس کے ہیولے کی جگہ صدیقی خو
تھا۔ وہ اس کے وجود کی صاف و شفاف چادر پر اپنے قد
نہ مٹنے والے نشان چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ ا
بنا دینا چاہتا تھا جہاں آئے دن فاتحہ پڑھنے لوگ آتے
بھر کی چھاؤں کی خاطر اسے زندگی بھر کے لئے تپتی دھو
ہوا چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

"اتنے بڑے افسر کی بیوی تم آسانی سے نہیں بن سک
صدیقی نے اس کے ذات کے بارے میں اس کے جسم
رائے قائم کی اور اس کی روح کو اس نے مادے کی ترازو
کی فطری خصلت ابھر آئی جو ہر دکی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔
عصمت ہی کی قوت سے اُسے دھکیل کر علیحدہ ہو گئی اور ا
کے اندر کے اندھیرے میں لڑکھڑاتا چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ گھ
اوندھے منہ پلنگ پر گر پڑی اور بہت دیر تک روتی رہی
محسوس ہوا جیسے اس کا ہیولا اس پر ہنس رہا ہو۔ اور پھر اگلے
اس نے دفتر جانا بند کر دیا، ماں باپ نے بھی زیادہ نہیں پو
عصمت زندگی کی پگڈنڈی پر تھکے تھکے قدموں سے
اس کی زندگی کی شاہراہ پر مختلف سمتوں سے پگڈنڈیاں آ
ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر جاتیں۔ ہیولا اس کی نظروں سے
ہونے لگا جیسے جیسے وہ اس کے پیچھے چلتی اس پر کہر سا چھا
ایک روز وہ ایک معروف سڑک سے گزر رہی تھی تو اُسے سی
اور شیرازی تینوں ساتھ ہی ساتھ مل گئے۔ معلوم ہوا شیرازی
کی شادی ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ اور وہ بہت خوش ہیں۔
ابھی تک وہی خیالات تھے۔ اس نے وہی بات پھر کہی۔
"پہلے تو لڑکیاں اپنے معیار کے چکر میں کسی کو اپنے نز
پھٹکنے نہیں دیتیں لیکن پھر ان کا یہ معیار انہیں کبھی نہیں ملتا
عصمت کو محسوس ہوا جیسے پہلی نے اس کے دل میں چٹکی
ہو اور اس کے اندر چھپے ہوئے چور کو پکڑ لیا ہو وہ گھبرا کر
رخصت ہوئی اور ایک دکان میں گھسی تو ٹھٹھک کر رہ گ
خالد کسی لڑکی کا ہاتھ تھامے نکل رہا تھا۔ اس نے اپنے ہیولے کو
کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو کہیں کھو گیا تھا اس لئے وہ ا
تنہائی کو محسوس کرنے لگی جو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوتی

جو عمر بھر سائے کی طرح ساتھ رہتی ہے جس کا تعلق ہمارے ماحول
سے نہیں بلکہ ہماری روح سے ہے۔ وہ سوچتی ہم سب ایک
دوسرے کے لئے ازلی وابدی اجنبی ہیں۔ وہ تھکے تھکے قدموں
سے گھر اور آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے
سامنے اندھیرا چھانے لگا اس کے سر میں سفید بال چمک رہے تھے
یہ احساس اس کے دل میں پرورش کرتا ہوا اس کی روح پر چھا گیا
اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کو دونوں ہاتھوں میں
لے کر نچوڑ دیا ہو اور اس کا خون قطرہ قطرہ اس کی روح پر گر رہا
ہو۔

عصمت اپنی پرانی کتابیں جھاڑ رہی تھی کہ ماں آگئی۔ ماں کے
لہجے اور چال میں اب وہ تیزی باقی نہیں تھی جو پہلے تھی۔

"عصمت تم سے بات کرنی ہے۔"

"امی مجھے معلوم ہے آپ کیا بات کریں گی" اس نے بے پروائی
سے کہا ماں کا دل بیٹھ گیا۔ مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

"بیٹی ایک رشتہ آیا ہے"

"رشتہ۔ رشتہ" وہ جھنجھلا گئی "امی رشتے آنے
کب بند ہوں گے" ماں نے فرمایا۔

"وہ تو بند ہی ہو گئے ہیں۔ ہم نے بہت سے اچھے اچھے رشتوں
کو ٹھکرا دیا مگر اب سوچنا پڑے گا۔"

ایک لڑکا ہے میٹرک پاس اور کلرک"

عصمت کو یوں لگا جیسے ایک سرد اور تاریک خلا میں معلق ہو کر
رہ گئی ہو۔ ماں کی انہی باتوں سے اکثر ایسی سوچیں چور راستوں سے
اس کے دماغ میں داخل ہو جاتیں۔ پھر یہ سوچیں یادوں میں ڈھل
جاتیں اور پچھتاوے بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے
لگتیں۔ وہ کبھی چاہتی کہ گزرا ہوا وقت واپس آ جائے لیکن گزرا ہوا
وقت تو ہمیشہ یادوں کی حسین اور طویل داستان اپنے پیچھے چھوڑ
جاتا ہے جس نے نشتر بن کر اس کے وجود میں بھی جنم لے لیا تھا۔
عصمت نے خالی خالی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور ایک کتاب
کی گرد جھاڑتے ہوئے خاموش رہ کر اس نے رضامندی ظاہر کر دی
"شام کو وہ دیکھنے آ رہے ہیں" ماں کی آواز کسی گہرے کھنڈر سے
آتی ہوئی لگی۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی ماں ابھی اس کی
زندگی کی کتاب سے گرد صاف کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو

شام کو آنے والوں کے لئے خوب خوب اہتمام ہوا اور سلام کرنے
کے لئے عصمت کو بلوایا گیا۔ عصمت نے کنکھیوں سے دیکھا لڑکا
اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے بکرا پیڑی میں لوگ جانوروں کو
پرکھتے ہیں مانگے روز ہی جواب نفی میں آگیا۔ لڑکے کا کہنا تھا۔

"مجھے اپنی رکھوالی کے لئے بزرگ عورت نہیں چاہئے۔"

عصمت کی ماں نے سر تھام لیا۔ عصمت خاموشی سے کوئی کتاب
پڑھتی رہی جیسے اسے کوئی افسوس ہی نہ ہوا ہو۔ مایوسیوں نے اس
کے احساس کو ڈس لیا تھا۔ اس کی حیثیت ایسے جہاز کی سی تھی جس
کی روشنیاں بجھ گئی ہوں جو سمندر میں مارا مارا پھر رہا ہو جو صرف اس
سمت جاتا ہو جہاں کوئی اسے خوش آمدید کہنے والا نہ ہو۔ وقت اندھیر
کو ساتھ لئے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ یہ اندھیرا ہمیشہ بڑا مہربان
ہوتا ہے کیونکہ ہمارے ہر دکھ ہر غم پر شکست کو اپنے سمیٹ لیتا ہے
آخر میں ہم خود اس بے پایاں اندھیرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

پھر عصمت کے چچا نے بتایا کہ ان کا ایک دوست اپنے بچوں
کی دیکھ بھال کے لئے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس رشتہ
پر راضی بھی ہے اور پہلے عصمت کو دیکھنا چاہتا ہے اور آج اسی
لئے صبح ہی عصمت کی ماں نے شور مچا رکھا تھا اور تیاری میں کوئی کسر
نہیں چھوڑی گئی تھی۔ کچھ ملی جلی آوازوں سے عصمت کو معلوم ہوا کہ وہ
آ گئے ہیں۔ اس نے جھانک کر دیکھا صرف ایک آدمی چچا اور ابا کے
پاس بیٹھا ہے، سیاہ رنگت۔ چھوٹا قد اور موٹا جسم، اس نے
اپنے خیالوں کے شہزادے کو تصور کی وادیوں میں دور دور تک
تلاش کیا مگر اس کا کہیں پتہ نہ ملا۔ وہ تھک گئی اس نے چپکے سے کہیں
دم توڑ دیا ہوگا۔ وہ بھی اسے تلاش کرنے کے لئے اب تک
زندگی کے ریگستان میں ننگے پاؤں پیدل چلتی رہی تھی اور اب
تھک چکی تھی۔ زندگی سے، اپنے آپ سے، اپنے خیالات سے، دنیا
سے، ہر چیز سے۔ اپنے وجود کا سارا بوجھ وہ اپنی لاش کے کندھوں
پر اٹھائے لئے پھرتی رہی۔ ابا کی آواز سے وہ چونکی اور چپ چاپ ول
گئے سب کے سامنے جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد مہمانوں نے رخصت چاہی
سب نے خوش اخلاقی سے رخصت کیا۔ چچا مہمان کو باہر تک چھوڑنے
گئے۔ عصمت اپنے کمرے میں اس امیدوار کے عدم اعتقادی کے احساس

کے ساتھ آگئی۔ جونوکری کا انٹرویو دے کر کمرے سے نکل رہا تھا۔ مگر کے پاس پردہ سرکانے کی غرض سے تھی تو باجوں کی بدی تشنگی اس کی روح پر اترائی اور منتشر کر رہ گئی وہ صاحب کہہ رہے تھے۔

"ابھی لڑکی کی عمر بہت ہے۔"

اس لمحے عصمت کو اپنی نبضیں تھمتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس کا دماغ کھمبوں کے سروں پہ بیٹھی ہوئی تاروں کے مانند سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں ایک دم بہت ساری گھنٹیاں بجنے لگیں۔ آنکھوں کے سامنے گول دائرے گھومنے لگے۔ اور اسے یوں لگا جیسے اس کے خیالات کا ہیولا اس کے سامنے کھڑا اس پر قہقہے لگا رہا ہو۔

"مگر آپ کو تو اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ان کی ماں کی ضرورت تھی۔"

چچا کی آواز کمزوری کی وجہ سے لرز رہی تھی، چچا کی اس بات پر ان صاحب نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے مگر مجھے اپنے لئے بیوی بھی تو چاہئے۔"

●●● ———

بقیہ ص۲۵ سے فرمودۂ علام ......

شاعر نے پارس کی را ساکن ہی لکھی ہے۔ ورنہ کیا ذوق صاحب یہ مصرع اس طرح نہ لکھ سکتے تھے۔

ع بوئی اکسیر کی حاصل ہو کہ پارس مل جائے۔

ذوق صاحب جانتے تھے کہ پارس ایک پتھر ہوتا ہے۔ جسے ہندو پارس ناتھ کہتے ہیں۔ سنگ موسیٰ۔ سنگ اسود۔ پارس ناتھ اور کھک (کسوٹی) یہ سب کالے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ذوق نے پارس ناتھ والے پتھر کے التباس سے بچانے کے لئے پارس بسکون را لکھا۔ اساسی کو صحیح خیال کیا۔ محترم نے زش گسے۔ لکھ کر را کو تو متحرک ثابت کر دیا لیکن یہ محسوس نہ کیا کہ اس طرح مصرعے میں کتنا جھول پیدا ہو گیا اور اگر کا الف ساقط ہو کر پارس گر (یعنی پارس بنانے والا) بن گیا۔

فہم کچھ ملے نہ ملے مقتضی ہے احترام
آپ کے ارشاد سے ہو کس طرح کوئی گریز

●●● ———

گاندھی

توصیف علوی عاصی بی اے شیر کوٹوی

زندگی کا وہ نرالا راہ دار
راہِ حق کا وہ اچھوتا شہسوار
جنگِ آزادی کا وہ سالارِ قوم
وہ جہانِ حریت کا تاجدار
وہ کہ جس نے قوم کو دی زندگی
وہ کہ جس نے دیش کو بخشا وقار
امن کا رہبر اہنسا کا نقیب
وہ جہاں میں شانتی کا شاہکار
وہ نرالا پیکرِ حبِ وطن
دیش کا وہ اک حقیقی جاں نثار
وہ کہ جس کی زندگی کا ہر قدم
گلستانِ ہند کی وجہِ بہار
ہند کی تاریخ کا وہ "بابِ نو"
عظمتِ قومی کا وہ آئینہ دار
وہ جہاں میں دشمنوں کا خیر خواہ
دوستوں کا وہ حقیقی غمگسار
وہ زمانے میں محبت کا ستون
آدمیت کا نیا وہ شاہکار
وہ کہ جو ہے جاں نثارِ راہِ حق
وہ کہ ہے جس کی شہادت صد وقار
وہ کہ جس کا جام عظمت کا امین
وہ کہ جس کی بزم ہے بزمِ وقار
وہ کہ جس کی زندگی شرحِ وفا
وہ کہ جس کی موت رمزِ حق شعار
وہ جہاں میں پیکرِ انسانیت
نوعِ انساں کا وہ سچا دوستدار

غزلیات

امتیاز جے پوری (احمد آباد)

پھر اس طرح سے تمہارا خیال رکھا ہے
تمہاری یاد کو سینے میں پال رکھا ہے
جو غم میں ہجر میں غربت میں جی رہا ہے اُسے
ہر ایک شخص نے دل سے نکال رکھا ہے
اداس رہ کے بھی ہم مسکرائے جاتے ہیں
اسی طرح سے ہر اک غم کو ٹال رکھا ہے
الجھ سکا رہ گئے حق حق پکارنے والے
وفا کی راہ میں اک ایسا جال رکھا ہے
نہ تھم اٹھا تھے نہ مشہور امتیاز ہوتے
ہمارے نام کو اس نے اچھال رکھا ہے

زخمی حصاری

ایثار سے مقابلہ ہے بدشعار کا
فصلِ خزاں کو کہہ دیا فصلِ بہار ہے
اتنا تو یاد ہے مجھے اے موسمِ خزاں
بربادیٔ حیات مجھے راس آگئی
تاریکیوں میں بھی مجھے رستہ دکھا گئی
وہ شاخ جس پہ میرا نشیمن تھا جل گئی
آتی ہے اُن کی یاد تو خوشیاں لئے ہوئے
جب سے کسی کے قرب میں لذت نہیں رہی
مانا کہ زندگی ہے ہجومِ غم و الم
بعد فنا دکھا دیا انجامِ زندگی

زعم وقار دیکھئے اک بے
اللہ رے اختیار یہ بے اختیا
آیا تھا زندگی میں بھی موسم
کیا ڈر ہے جس کو گردشِ لیل و
اعجاز جانئے اسے تسبیح مزا
کارِ نمایاں دیکھئے برق و شرا
سایہ سا دل پہ ہے مگر غم کے عش
ہے انتظار مجھ کو شبِ انتظا
لیکن جواز چاہئے اس سے فر
ممنون ہوں میں اپنے شکستہ فرا

زخمی فریب خوردۂ رنگِ بہار ہوں
گلزار پر بھی ہے جو گماں خارزار کا

بسمل نقشبندی (تلاجی)

اک ایک پل حیات کا ہستی پہ بار ہے
ناکام آرزوؤں کا ہر سو حصار ہے

چسپاں ہر ایک چہرے پہ یہ اشتہار ہے
خوش فہمیوں سے پھر بھی نظر ہمکنار ہے

پھولوں کے چہرے زرد ہیں شاداب خار ہے
آئینگی تیرگی نے پھولوں میں خار چھپے

شاید خزاں کے تن پہ لباسِ بہار ہے
وہ صبح نور جس کا تجھے انتظار رہے

اس طرح زندگی کی دعا کر رہے ہیں لوگ
بے چہرہ لوگ ملتے ہیں راہوں میں ہر جگہ

جیسے حیات سات سمندر کے پار ہے
میں کس دیار میں ہوں یہ کیسا دیار ہے

یوں میرا درد بانٹنے آئے ہوئے ہیں لوگ
ملتا ہے روز رات گئے میکدے کے پاس

جیسے ہر ایک شخص مرا غمگسار ہے
وہ ایک شخص جو کہ تہجد گزار ہے

بسمل وہ رزق دیتا ہے ہر حال میں مگر
دل پھر بھی مبتلائے غمِ روزگار ہے

ساغر ساگری

میں ان کے عنایات و کرم دیکھ چکا ہوں
یعنی شبِ ہجراں کے الم دیکھ چکا ہوں
رہتے ہیں جہاں زہرہ جبیں منتظر لے
اے دوست میں ایسے بھی حرم دیکھ چکا ہوں
سلجھائے نہ سلجھیں گے کبھی تا بہ قیامت
میں گیسوئے دوراں کے بھی خم دیکھ چکا ہوں
بیتابیٔ دل سوزِ جگر آنکھ میں آنسو
اے شوخ نظر تیرا کرم دیکھ چکا ہوں
ہے اہلِ گلستاں کی نظر اب بھی گلوں پر
میں سارے گلستاں کا بھرم دیکھ چکا ہوں
اب آپ نہ دہرائیے ہجراں کی کوئی بات
میں ان کے بڑے ظلم و ستم دیکھ چکا ہوں
ساغر تو ہے میخوارِ ازل تجھ کو بھی لیکن
پیتے ہوئے اے شیخِ حرم دیکھ چکا ہوں

ڈاکٹر ستیہ پرکاش تفتہ
(کوروکشیتر)

رُباعیات

گندمی سا دمکتا ہوا چہرہ ضو پاش
آنکھوں میں ہے سمٹا ہوا نرمل آکاش
وہ نرم ہنسی جیسے شفق پھولے ہو
یا چھٹتی ہوئی دھند سے ابھرے آکاش

یہ بھیگی مسیں اور جوانی بھرپور
ہر انگ نشہ میں ڈوبا جاتا ہے چور
مدماتے ہوئے جسم سے اٹھتی ہوئی سگندھ
جیسے چیت میں آموں پہ ہے آیا ہوا بور

چنچل سا یہ روپ، دیومالائی تن
خوشبو میں ڈوبے ہوئے زلفوں کے بن
یہ لوچ، یہ نرمی، یہ نزاکت، جیسے
پانی میں اترتے ہی لچک جائے کرن

مدماتا ہوا پھول سا سرشار بدن
گلشن کا سراپا ہے وہ شہکار بدن
پھوٹی ہیں دھنیں اور اڑی ہیں تانیں
سنگیت ہی سنگیت ہے رفتار بدن

شانوں پہ یہ زلفوں کی گھٹائیں گھنگھور
یہ ٹوٹتی انگڑائی، چھلکتی بھرپور
ماتھے پہ چمکتی ہوئی اک چندر کرن
رتنارے نین اور یہ جوبن چت چور

مسکان لئے صبح کھڑی ہو جیسے
مندر میں کہیں جوت جگی ہو جیسے
ماتھے وہ رہ رہ کے لپکتا کوندا
پربت پہ کہیں آگ لگی ہو جیسے

ودیا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے [illegible] خواجہ پریس [illegible] جامع مسجد دہلی اور سرورتی پاینیر پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند
بلڈنگ نمبر ۱، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

شراب پینا
ایک سماجی بُرائی ہے

یہ آپ کی صحت اور خاندان کو برباد کرتا ہے

انسان کی اور برائیوں کے مقابلے میں
شراب نے کہیں زیادہ گھر اجاڑے ہیں۔

کوئی بھی آدمی جو "مذاق" یا "دوستی" کے
نام پر شراب پیتا ہے بربادی کے راستے
پر پیر بڑھاتا ہے۔

شراب آدمی کو اپنا غلام بناتی ہے۔
پھر یہ آپ کی صحت کو برباد کرتی ہے
یہ جگر کو بیکار اور دل کو کمزور
کرتی ہے۔ خون میں زہر گھول
دیتی ہے۔

شراب کا غلام
بننے سے پہلے ہی
اس سے چھٹکارا
پائیے۔

وقت سے پہلے ہی ہوشیار ہو جائیے

بُلبُل چہ گفت؟ گُل چہ شُنید؟ وصبا چہ کرد

ننگا ناچ۔ محاورہ نہیں، حقیقت

پہلے "صدقِ جدید" لکھنؤ کے اس اداریے کو پڑھیے،

"عین اس وقت جب کہ دہلی یونیورسٹی کی یونین کی سالانہ الکشن کا ہنگامہ بپا تھا۔ اس یونیورسٹی کے ایک زنانہ ہوسٹل کے باہر آدھی رات کو ایک کالج کے پچاس ساٹھ طلبا نے یکایک اپنے سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا ہو کر ناچنا شروع کر دیا۔ اخبار نادرن ہیرلڈ (لکھنؤ ایڈیشن) کے رپورٹر نے اس کی خبر دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ ہندوستان میں پہلی بار لڑکیوں کے کسی ہوسٹل کے سامنے لڑکے ننگے ہو کر ناچے اور لڑکیاں بجائے اس کے کہ اس عریانی اور فحاشی کے مظاہرے کے غیرتِ نسوانی کے اثر سے [illegible] ناراضی ظاہر کرتیں۔ خبر میں ہے کہ وہ ہوسٹل کی دیواروں پہ چڑھ کر بے حیائی کے اس نظارے کو نہ صرف دیکھتی بلکہ اس ناچ سے ہم آہنگ گانے گا رہی تھیں۔ اور تالیاں بجا کر ان لڑکوں کی ہمت افزائی کرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد پولیس بلائی گئی۔ وہ صرف آٹھ ننگے افراد کو گرفتار کر سکی طلباء دہلی کی ایک قدیم درسگاہ سینٹ اسٹیفن کالج سے تعلق رکھتے تھے جو کبھی زمانے میں دہلی کے مہذب بہترین اور شائستہ ترین کالج سمجھا جاتا تھا جو طلبا اس بے حیائی کے اس مظاہرے میں گرفتار ہوئے ہیں۔ وہ اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایک پولیس کمشنر کا صاحبزادہ اور دوسرے راجستھان کے والیانِ ریاست کے ہیں۔ خبر کا ٹکڑا مزید عبرت کے لئے پڑھ لیجئے، جب پولیس آئی تو بے حیائی کا تماشہ دیکھنے والی لڑکیوں نے "پولیس مردہ باد اور لڑکے ہمارے دوست ہیں" کے نعرے لگائے۔ نامہ نگار نے لکھا ہے کہ اگرچہ طلبا گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ لیکن عدالت سے شاید ہی وہ سزا پا سکیں۔ اس لئے کہ پولیس کو کوئی صحیح گواہ نہیں مل رہا ہے زنانہ ہوسٹل کے وارڈن صاحبہ تک گواہی دینے پر تیار نہیں ہیں واقعہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات بے حیائی کے عام زہن یکساں [illegible] داخل ہو چکے ہیں۔"

[illegible] ایک [illegible] بس میں جس میں زیادہ تر دہلی یونیورسٹی کے طلبا سفر کر رہے تھے یہی ننگا ناچ موضوعِ بحث تھا۔ ایک صاحب نے بڑے وثوق سے کہا کہ ہوسٹل کے منتظمین کا ارادہ پولیس بلانے کا ہرگز نہیں تھا ہوسٹل کی لڑکیاں جو ہوسٹل کی دیواروں پر چڑھ کر ننگا ناچنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں انہیں ان لڑکوں نے دعوتِ شرکت دی اور لڑکیوں کی ایک خاص تعداد اس دعوت کو لبیک کہتے ہوئے اس ننگے ناچ میں شرکت کیلئے تیار ہو گئی اور ان لڑکیوں نے منتظمین سے کہا کہ ہوسٹل کا صدر دروازہ کھول دیا جائے تاکہ وہ اپنے ان دوستوں کا ساتھ دیکر حقِ رفاقت ادا کر سکیں اس پر منتظمین ہوسٹل حواس باختہ ہو گئے اور انہوں نے پولیس کو فون کر کے بلایا۔ لہٰذا پولیس کے آنے پر لڑکیوں نے اظہارِ ناپسندیدگی اور ناراضگی کے طور پر "پولیس مردہ باد" "منتظمین ہوسٹل مردہ باد اور لڑکے ہمارے دوست ہیں" کے نعرے لگائے۔

فلموں ریڈیو ٹیلی ویژن نیز فحش اور عریاں فلمی رسائل و جرائد نے ہر گھر کو رفاہ عیّنہ کنجر خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس لئے اگر ہمارے نوجوان اس قسم کی حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں [illegible] کی ساہیہ [illegible] ہو رہی ہیں تو ایسا ہونا فطری امر ہے کیونکہ جب چاروں طرف ماحول جنسی افراتفری کا ہوگا تو پھر آپ کو خوش اخلاقی بلند کرداری اور خاندانی عزت ایسے خوشنما الفاظ کو ڈکشنری میں ہی مقید رکھنا ہوگا۔

راجدھانی کے سودیشی ڈاک خانہ

محکمہ ڈاک بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ چھٹیوں کے دنوں میں بھی ضروری سروس کے لئے ڈاکیے خاص اوقات میں رجسٹر وی۔ پی اور پارسل وصول کرتے ہیں مگر حالت کیا ہے اس کی تفصیل سنئے۔

ابھی حال ہی میں ڈاکیے نے جاڑوں بیند ہے تو ایک کاروباری [illegible] کو کچھ ضروری پارسل بھجوانے تھے پارلیمنٹ سٹریٹ کے ڈاک خانہ [illegible]

پارسل بھجوائے گئے تو صرف ایک پارسل لیا گیا اور باقی پارسل یہ کہہ کر واپس لوٹا دیئے گئے کہ ڈاکخانہ میں ٹکٹ نہیں ہیں کہا گیا کہ آپکے ہاں فرینکنگ مشین کے ذریعہ ٹکٹوں کے مالیت کی چٹ لگائی جا سکتی ہے تو پھر ٹکٹ نہ ہونے کا بہانہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ مگر سودیشی ڈاکخانہ میں بچارے عوام کی کون سنتا ہے۔ دوسرے دن کشمیری گیٹ کے بڑے ڈاکخانہ میں قسمت آزمائی کی گئی تو وہاں بھی یہی ڈرامہ دُہرایا گیا کہ صرف ایک پارسل لیا گیا اور باقی واپس کر دیئے گئے کہ ڈاکخانے میں ٹکٹ نہیں رہے۔ تیسرے دن انفسر پرستو ہیڈ آفس میں جھانکا گیا تو جواب ملا کہ یہ ڈاکخانہ چھٹی کے دن کوئی کام نہیں کرتا۔ پھر پارلیمنٹ اسٹریٹ ڈاک خانے کا رُخ کیا گیا تو وہاں گھڑا گھڑایا جواب موجود تھا کہ ٹکٹ ہی نہیں ہیں۔ چوتھے دن ادارے کے مالک خود ڈاک خانہ پارلیمنٹ تشریف لے گئے اور منتظمان سے دریافت کیا کہ اگر آپ کے ہاں ٹکٹ نہیں ہیں اور آپ لوگ کوئی کام کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں تو پھر عوام کو بے وقوف بنانے سے کیا فائدہ یہ ادارہ ہی ختم کر دیا جائے تو ان لوگوں نے بتایا کہ سٹاف کم ہوتا ہے چھٹی کے دن ضرورت کے مطابق ٹکٹ رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی یعنی ہر وہ جواب دیا گیا جو کوئی بھی کاہل۔ حرام خور اور نااہل ملازم دیا کرتا ہے۔

اس وقت ہندوستان کی حکومت ایسی نہیں کہ جس سے ایسی توقع کی جا سکے کہ وہ سرکاری مشینری کو اپنے فرض کی ادائیگی ٹھیک ٹھیک سے کرنے کے لئے مجبور کر سکے۔ لیکن وہ اپنی سہل کاری سے کم از کم ایسے سرکاری محکموں کا انتظام تو بہتر طور پر کریں جس سے سرکار کو آمدنی ہوتی ہے۔

اگر محکمہ ڈاک کا کوئی ذمہ دار افسر پارلیمنٹ سٹریٹ اور کشمیری گیٹ کے ڈاکخانوں کے ناخداؤں سے اس غیر ذمہ داری کا سبب پوچھ سکے تو یہ محکمہ کی نیک نامی کا باعث ہوگا۔

کیا شعراء بد چلن ہوتے ہیں؟

کچھ ناکام شاعروں نے حسین سہاروں کے بل بوتے پر شاعروں میں گھس جانے کی راہ ڈھونڈ نکالی تو ذوقِ سلیم رکھنے والے منتظمینِ مشاعرہ نے اس بلیک میلنگ کے خلاف دبے الفاظ میں شکایت کی کہ جب بھی کسی مشاعرہ کو منعقد کیا جاتا ہے تو وہ جواب میں لکھواتی ہیں (کیونکہ انہیں خود لکھنا نہیں آتا) کہ فلاں شاعر کو بلوائیے تو میں آسکتی ہوں۔ مشاعرہ کو طوائفیت کی چاشنی دینے کے لئے ایسی خودساختہ شاعرات یا ناکام شاعروں کی اللہ جیاکھیوں کو مجبوراً بلانا پڑتا ہے مگر اس بلیک میلنگ میں یہ خودساختہ شاعرات وغیرہ اور جن شاعروں کی یہ سفارش کرتی ہیں دونوں ہی بدنام ہوتے ہیں۔ اور اس بدنامی کو تقویت بخشی نورجہاں قمر حیدرآبادی تسنیم اور اس قسم کی کئی دوسری شاعرات نے۔

جس طرح ایک مچھلی سارے تالاب کو خراب کر دیتی ہے اس طرح ان معدودے چند شعرا اور شاعرات کی بدچلنی کے باعث عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اُردو کے شعراء عام طور پر بدچلن ہوتے ہیں۔

اُردو کے شاعرو! اگر خدا نے تمہاری عقل و ذہانت سلب نہیں کر لی تو سوچو کہ مشاعرہ میں تمہاری کیا عزت رہ گئی ہے غضب خدا کا کہ کسی اخلاقی مجرم۔ چور اور فی الحقیقت غنڈے کو بھی غنڈہ کہا جائے تو اس کی بھی رگِ حمیت پھڑک اُٹھتی ہے اور وہ اپنے آپ کو غنڈہ یا ذلیل کہلانے کو کسی طور بھی تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور ایک آپ ہیں کہ لوگ نہ صرف محض زبانی طور پر بد اخلاق کہتے ہیں بلکہ ایسا سمجھتے بھی ہیں۔ کاش کہ شعرائے کرام اپنی اس پستی پر غور فرمائیں اور اپنے آپ کو شرفاء میں شمار کرائیں۔

امریکہ کے کتے

امریکہ کے مشہور اخبار "نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون" نے بڑے فخر کے ساتھ ایک خبر چھاپی ہے ذرا اس خبر کو آپ بھی پڑھ لیجئے

اب امریکہ میں کتوں کو جو کھانا کھلانے کے لئے دیا جاتا ہے اور جو کپڑا پہننے کو دیا جاتا ہے وہ پہلے کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے اور امریکہ کا دولت مند طبقہ سالانہ ۷ اکروڑ ڈالر کتوں کی خوراک اور پرورش پر خرچ کرتا ہے۔

آپ کی مزید اطلاع اور معلومات متعلقہ کے لئے یہ لکھنا ضروری ہے کہ امریکہ میں کتوں کی حفاظت کے لئے ایک باقاعدہ "انجمن نیشنل کونسل فور ڈیفینس آف ڈوگز" یعنی قومی مجلس برائے تحفظ سگان" ہے۔ اس انجمن نے ابھی حال ہی میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے ہیں جو یہ

امریکہ میں کتوں کے اخراجات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ایجنسی نے بتایا ہے کہ کتوں کے لئے گرم کمبلوں اور کھلونوں کی خریداری پر پچاس لاکھ ڈالر سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔

اس خبر پر تبصرہ کرنا بظاہر بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ امریکہ کا اندرونی اور ذاتی معاملہ ہے لیکن جو امریکہ متباہ کن ہتھیار دوں۔ ایٹم بموں۔ ہائیڈروجن بموں اور نہ معلوم کون کون سے بموں کی دوڑ میں ساری دنیا سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ اور جس کے بموں نے ہیروشیما اور ناگاساکی میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ وہ اپنے گھر میں حقیر جانوروں کی بھی حفاظت میں اس قدر سرگرم اور محتاط ہے۔ اس سے ہم تو یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ امریکہ کو اپنی دنیا سے باہر رہنے والے انسانوں کی زندگی کے مقابلے میں امریکی کتے زیادہ عزیز ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک قسم کی وطن دوستی ہے لیکن پھر اپنے ملکوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ساری دنیا کا درد بھی اپنے دل میں رکھنے کے دعوے دار ہوں یا انسان دوستی کے علم بردار بن کر دنیا کے سامنے آئیں اور نہ یہ زمانے بھر میں امن پرستی کا ڈھول پیٹتے پھریں

مطلع یوں ہے

جناب لکشمی نارائن فا آرغ جے پوری تحریر فرماتے ہیں کہ ماہِ اگست کے شانِ ہند میں ان کا مطلع غلط چھپ گیا ہے۔ اصل مطلع یوں ہے۔

پسند آیا تو ذوقِ سعی کا حاصل پسند آیا
بعند مشکل بھی اک عقدۂ مشکل پسند آیا

غزل

طالب مشیری بی ۲۷/۲ مدن گیر مارکیٹ نئی دھلی ۶۲

میں بھی نہ کہہ سکا کبھی خود اپنے دل کی بات
تجھ کو بھی نہ ہوا کبھی احساسِ التفات

لوبان کی طرح میں سلگتا رہا مگر
روشن ہوئی نہ ایک بھی تنہائیوں کی رات

جلنے کی اک نہ ایک گھڑی آئے گی ضرور
کب تک رہیں گے دوستو ترکِ تعلقات

کل صبح تیری شکل کا اک شخص کیا ملا
آتا رہا ہے یاد تو مجھکو تمام رات

سفاک دل بھی کر نہیں سکتا سلوک جو
احباب نے سلوک کئے ہیں وہ میرے ساتھ

حق مانگنے سے کس کو ملا ہے بھلا کبھی
حق چھینتے ہیں مرد ہمیشہ بڑھا کے ہاتھ

مظلوم ہی رہے گا جسارت نہ کرے اگر
دشمن ہمیشہ یوں ہی لگاتے رہیں گے گھات

جلتا رہا ہوں میں اندھیروں کے شہر میں
طالب مگر ہے عقل کے دشمنوں کو دی ہیں مات

غزل

زیڈ اے ہلال ایڈوکیٹ شاہ آباد

اک دھوم ہے کہ وہ ہیں جواں دیکھتے چلیں
کتنی ہے دل میں تاب و تواں دیکھتے چلیں

اٹھتا ہے کس طرف سے دھواں دیکھتے چلیں
جلتا ہے آج کس کا مکاں دیکھتے چلیں

آئے ہیں قتل گاہ میں سب دل لئے ہوئے
چلتے ہیں کس پہ تیر و کماں دیکھتے چلیں

اس راہ میں لٹا تھا کبھی کاروانِ دل
مل جائے شاید اُس کا نشاں دیکھتے چلیں

اُن کی جواں نگاہ سے ماحول گرم ہے
گرتی ہے کس پہ برقِ تپاں دیکھتے چلیں

پابندیاں لگی ہیں زبان و بیان پر
کھلتی ہے آج کس کی زباں دیکھتے چلیں

جائیں گے ہم بھی جانبِ کعبہ کبھی مگر
اے دل ہجومِ رشد رخاں دیکھتے چلیں

اب آ گئے ہو کوئے صنم میں تو لے ہلال
کس حال میں ہے جانِ جہاں دیکھتے چلیں

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

ایک روز شام کے ساڑھے سات بجے میں نے اس لڑکے کو کشمیری گیٹ جنرل پوسٹ آفس میں ایک عزیز کا رجسٹرڈ لیٹر پوسٹ کرنے کے لئے بھیجا۔ کیونکہ کرشن نگر میں شام کے پانچ بجے کے بعد ڈاک خانے میں کام نہیں ہوتا۔ اس لئے کشمیری گیٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنرل پوسٹ آفس میں نائٹ سروس ملتی تھی۔ قریباً نو بجے ٹیلیفون پر کسی نے نام بتائے بغیر اطلاع دی کہ آپ کا لڑکا کشمیری گیٹ تھانے میں بٹھایا ہوا ہے اگر آپ فوراً دو سو روپیہ لے کر آجائیں تو اسے بند کرنے سے پہلے لے جائیے ورنہ بند کر دیا جائے گا۔ ان دنوں کشمیری گیٹ تھانے کی بلڈنگ زیر تعمیر تھی اور تھانہ عارضی طور پر جی۔ پی۔ او۔ کشمیری گیٹ کے عقب میں بنا لیا گیا تھا۔ میں بغیر روپیہ لئے تھانے پہنچا۔ شام کے وقت کرشن نگر سے کشمیری گیٹ پہنچنا کارے دارد والا معاملہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جمنا برج آدھ آدھ گھنٹہ بند رہتا ہے۔ قریب نو بجے ہوں گے کہ تھانے پہنچا تو پتہ چلا کہ اس لڑکے کو بند کر دیا گیا ہے اور بند کرنے والا تھانیدار رام لیلا کے انتظام میں نوکرہ پر چلا گیا ہے۔ کیونکہ عارضی تھانے میں حوالات کا انتظام نہیں تھا اس لئے ملزمان کو کسی دوسرے تھانے کی حوالات میں بند کیا جاتا تھا۔ ایک سپاہی کی زبانی معلوم ہوا کہ دو چارج شیٹ ہی ہوئے ہیں کہ ملزمان کو بیدل ہی لے جایا گیا ہے۔ میرے پاس سکوٹر تھا میں نے جی پی او کے موڑ پر ہی ان لوگوں کو جا لیا اور چلتے چلتے لڑکے نے مجھے بتایا کہ رجسٹری کی رسید بھی تھانیدار نے لی ہے اور باقی پیسے بھی۔ ڈاک خانے کے باہر ہی مجھے پکڑ لیا گیا اور چرس ڈال کر مجھے بند کر دیا گیا۔ پہلے تھانیدار نے کہا کہ دو سو روپیہ دو تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ میں نے آپ کو فون کرایا۔ مگر تھانیدار کو جلدی تھی اس لئے وہ کاغذات کی خانہ پری کر کے حوالات میں بند کرنے کی کارروائی پوری کر کے چلا گیا ہے۔ آپ صبح کچہری آجائیے گا آپ کو ایک ایسی بات بتا دوں گا کہ جس سے یہ مقدمہ کل ہی فرضی ثابت ہو جائے گا۔

مجھے رات بھر نیند نہیں آئی کہ کس طرح اس لڑکے کو پولیس کی دست برد سے بچایا جائے۔ صبح میں کچہری تیس ہزاری پہنچا۔ مختصر شام منشی نے بتایا کہ اسے بعد دوپہر عدالت میں پیش کیا جائے گا اور مجسٹریٹ وہی ہے جس نے لمبے شراب کے جھوٹے کیس میں بری کیا تھا۔ وکیل صاحب نے ضمانت کی درخواست لکھی اور ضمانت نامہ بھرا۔ میں پولیس اس لڑکے کو عدالت کے سامنے لے آئے۔ اس لڑکے نے وکیل کے کان میں کوئی بات کہی اور وکیل کو میں نے یہ کہتے سنا کہ اس تھانیدار کو معطل نہ کرا دوں تو کہنا۔

کچھ دیر بعد پولیس والوں نے ملزم کو عدالت کے سامنے پیش کیا۔ مجسٹریٹ کے سامنے ضمانت کی درخواست پیش کی گئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا کہ ملزم سے چونکہ چرس برآمد ہوئی ہے۔ اس لئے پولیس نے اس کا ریمانڈ مانگا ہے تاکہ اس سے پوچھ تاچھ کر سکے کہ یہ چرس کہاں سے خریدتا ہے اور کن لوگوں کو فروخت کرتا ہے۔ مجسٹریٹ کی خدمت میں وکیل نے مودبانہ گزارش کی کہ جناب والا یہ وہی ملزم ہے جس کے پیٹ پر آپ نے بارہ بوتل شراب کی ٹیوب بندھوا کر دیکھی تھی اور اس جھوٹے مقدمے میں آپ نے اسے باعزت بری کیا تھا۔ وکیل نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے گزارش کی کہ حضور والا یہ مقدمہ جو اس وقت آپ کے سامنے رکھا گیا ہے اس کے جھوٹے ثابت کرنے کیلئے تو تھانیدار نے خود ہی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ چنانچہ جناب چرس کی برآمدگی جن گواہان کے سامنے لکھی گئی ہے ان گواہان کے نام تو لکھ دیئے گئے ہیں۔ مگر دستخط یا نشان انگوٹھا کسی کا بھی نہیں ہے۔ مجسٹریٹ نے جونہی کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے تو واقعی ایسا ہی تھا گواہان میں ایک تو جامع مسجد کا پولیس ٹاؤٹ تھا اور دوسرا بھی کوئی ایسا ہی "معزز" شخص تھا۔ وکیل نے گزارش کی کہ یہ کاغذات سیل کر دیئے جائیں۔ چنانچہ مجسٹریٹ صاحب نے ان کاغذات کو سیل کرنے کا حکم دیا اور ملزم کی درخواست ضمانت منظور فرما کر ایک ہزار روپیہ کی ضمانت کا حکم دیا۔ ضمانت میں نے ہی دی جو فوراً منظور کر لی گئی۔

گواہی بھگتنے پر وکیل نے اس لڑکے کو شاباش دی اور کہا کہ تم نے
بات بتائی کہ اب تھانیدار کی خیر نہیں۔

چند دنوں کے بعد یہ تھانیدار صاحب ہمارے وکیل صاحب کے
پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ میری ترقی ہونے والی ہے اور مجھے کسی ٹریننگ
کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ اگر ملزم اقبالِ جرم کر لے تو میرا بچاؤ ہو سکتا
ہے ورنہ میری ترقی تو کیا نوکری بھی چلی جائیگی۔ اس لئے میرے بچوں پر
رحم کھائیے اور ملزم سے کسی طرح اقبالِ جرم کرا دیجئے جو بھی جرمانہ
ہوگا میں ادا کروں گا۔ وکیل نے کہا اوّل تو اس جرم میں محض جرمانہ نہیں
بلکہ قید کی سزا ہے اور اگر بفرضِ محال مجسٹریٹ محض جرمانہ پر ہی اکتفا
کرے تو ملزم جھوٹے مقدمہ میں اقبالِ جرم کیسے کرے گا۔ رفتہ رفتہ بات
یہاں تک پہنچی۔ میں پولیس کی ان حرام زدگیوں پر آگ بگولہ ہوا بیٹھا تھا
یہ تھانیدار مذکور وکیل صاحب کو لیکر میرے پاس آئے تو میں نے
وکیل صاحب سے کہا کہ کیا آپ انصاف کا بول بالا کرنے کے لئے ایسا
مناسب سمجھتے ہیں میرا اتنا کہنا تھا کہ تھانیدار نے اپنی طُرّے دار پگڑی
اتار کر میرے قدموں پر رکھ دی اور عاجزانہ طور پر کہنے لگا کہ سرور
صاحب میں آپ کے بیٹے کی عمر کا ہوں مجھے معاف کر دیجئے ورنہ میری
نوکری جاتی رہے گی اور میرا کیریئر خراب ہو جائے گا میرے بچے مارے
پھریں گے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میری ماں شریف عورت
ہے اور میں اپنے باپ کا نطفہ ہوں تو آئندہ میں کبھی جھوٹا مقدمہ کسی
کے خلاف نہیں بناؤں گا۔ مگر میں نے قطعاً انکار کر دیا۔ یہ تھانیدار
عدالت کے اہلکاروں سے مل کر ہر تاریخ پر لمبی تاریخ لگوا دیا کرتا
اور لڑکا کچہری سے واپس آکر بتاتا بابو جی تھانیدار آج تو اپنی بیوی اور
بچوں کو بھی ساتھ لیکر آیا تھا اور اس کی بیوی رو رہی تھی اور
بچے بڑے پیارے تھے اور وہ کہہ رہے تھے انکل جی ہمارے ڈیڈی کو
معاف کر دو۔ میں نے بیٹے کی ان باتوں سے اندازہ لگایا کہ اس کے
دل میں تھانیدار کے تئیں کچھ نرم رویہ اپنانے کے ارادے ہیں
اسی دوران مجسٹریٹ صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور جو مجسٹریٹ ان کی
جگہ آئے وہ جناب سکھراج بہادر تھے جو ذاتی طور پر میرے واقف
اور کرشن نگر میں ہی سکونت رکھتے تھے۔

ایک دن میں کہیں سے واپس آ رہا تھا کہ میرے پڑوسی قریب
سیمنٹ والوں کے ہاں اس تھانیدار کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ مجھے دیکھتے
ہی تھانیدار صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور کہنے لگے میں تو بڑی دیر
سے آپ کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ میں نے اخلاقاً جواب میں کہا
کہ فرمایئے میرے لائق کیا حکم ہے۔ کہنے لگے کہ ذرا لالہ جی نے آپ کو بلایا
ہے وہاں کچھ اور دوست بھی بیٹھے ہیں میں تھانیدار کے ساتھ سیمنٹ
والوں کے یہاں کمرے میں گیا تو وہاں کرشن نگر کے دس پندرہ سرکردہ
اصحاب تشریف فرما تھے۔ اور ان سب سے میرے تعلقات محلہ داری
کے تھے۔ دو چار منٹ کے بعد سیمنٹ والوں نے عرضِ مدعا بیان کیا
کہ جیسے بھی ہو اس تھانیدار کی نوکری بچائی جائے۔ اسے پروموشن کا
حکم مل چکا ہے اور اسے ٹریننگ کے لئے پھلور جانا ہے اور جب تک
اس معاملہ کا فیصلہ نہ ہو جائے یہ اپنے آپ کو خطرہ میں سمجھتے ہیں میرا
جواب سنے بغیر لالہ صاحب فرمانے لگے کہ انہوں نے اور ہم نے یہ انتظام
کر لیا ہے کہ لڑکا اگر اقبالِ جرم کر لے تو اسے صرف وارننگ دیکر
بری کر دیا جائے گا۔ دوسرے دن صبح کو عدالت میں تاریخ تھی میں
نے گلو خلاصی کرانے کے لئے سب صاحبان سے کہا کہ آپ بھائیوں
کا فرمان سر آنکھوں پر۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ تھانیدار صاحب
کی نوکری بچ جائے۔

رات کو میں نے اس لڑکے کو بلایا اور پوچھا کہ تمہارا کیا
ارادہ ہے۔ کہنے لگا بابو جی جیسے آپ کہیں گے وہی ہوگا۔ میں نے
زور دیکر کہا کہ تم بھی تو اپنا ارادہ بتاؤ کہنے لگا بابو جی اگر میرے
اقبالِ جرم سے اس تھانیدار کی نوکری بچ سکتی ہے تو مجھے اقبال
جرم کر لینا چاہئے جبکہ محلے کے سرکردہ لوگوں نے آپ کو یقین
دلایا ہے کہ مجسٹریٹ محض وارننگ دیکر بری کر دے گا۔ اس سے
سارے محلے کو علم ہو جائیگا کہ پولیس مجھے خواہ مخواہ جھوٹے مقدمات
میں پھانستی ہے ورنہ میں ایسا ہوں نہیں اس سے مجھے بھی پوری تسکین
ابھی ہو جائیگی۔ دوسرے تھانیدار مندر میں قسم کھانے کو تیار
ہے کہ وہ اپنی نوکری میں کبھی کسی کو جھوٹے مقدمہ میں نہیں پھنسائے
گا۔ بابو جی اگر یہ اپنی قسم پر قائم رہا تو نہ معلوم کتنے ہی مجھ جیسے
اس کے ہاتھوں جھوٹے مقدمات میں پھنسنے سے بچ جائیں گے۔ اور
اگر کچھ بھی نہ ہوا تو بھی یہ تھانیدار جب تک زندہ رہے گا یاد کرے
گا کہ کسی دل والے سے واسطہ پڑا تھا۔ لڑکے نے دیکھا کہ میں اس
کے جواب سے نہ صرف مطمئن نہیں بلکہ کسی حد تک اس کا ہم خیال بن رہا ہوں

تو اس نے سادہ وار اداز لہجے میں کہا کہ بابو جی یہ تھا نیدار کی بیوی چار ہزار روپیہ دے رہی تھی کہ یہ میں اپنے زیورات گروی رکھ کر لائی ہوں آپ لے لو اور میرے شوہر کی نوکری بچا لو۔ بابو جی مجھے اس عورت کے آنسو اب بھی یاد آرہے ہیں اور میں نے اس سے کہا تھا کہ بہن جی روپیہ آپ واپس لے جائیے اور اپنے زیور چھڑا لیں۔ میرے لئے یہ روپیہ بڑا سو گند ہے۔ ہاں میں اپنے بابو جی سے کہوں گا کہ وہ معاف کردیں۔ روپیہ کی پیشکش مجھے بھی وکیل کی معرفت ہو چکی تھی جسے میں نے نامنظور کردیا تھا۔ دوسرے دن صبح چھ بجے ہی دروازہ پر دستک ہوئی [illegible] دیکھا تو ایک خاتون دو بچوں کے ساتھ کھڑی ہے میں نے خاتون اور بچوں کی نمستے کا جواب دیا اور کہا کہ میں نے آپ کو پہچانا نہیں شاید آپ غلطی سے ہمارے مکان پر آگئی ہیں۔ خاتون کہنے لگی پتا جی نہیں میں آپکے پاس ہی آئی ہوں میں ... تھانیدار کی بیوی ہوں اور یہ ہمارے دو بچے ہیں۔ میں نے پورے احترام سے اس خاتون کو اور بچوں کو کمرے میں بٹھایا بیوی کو آواز دی جو سو رہی تھی دو منٹ بعد میری بیوی اور یہ لڑکا بھی میرے کمرے میں آگئے۔ میں نے اپنی بیوی سے اس خاتون کا تعارف کرایا اور لڑکے نے بڑی عقیدت سے اس خاتون کو نمستے کی۔ میں اس خاتون کی تشریف آوری کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ مگر اخلاقاً میں نے بڑی عزت سے دریافت کیا کہ آپ نے کیسے تکلیف فرمائی۔ یہ خاتون رو دی اور کہنے لگی کہ میں نے آپ کو پتا جی کہا ہے مجھے معلوم ہے کہ آپ کی لڑکیاں ہیں اور آپ بھی نواسے اور پوتوں والے ہیں اب آپ کی لڑکی آپ کے سامنے ہے جو مناسب سمجھیں عدالت میں ویسا ہی کیجئے۔ میں نے بغیر سوچے اس خاتون کو وعدہ دیدیا کہ آپ بے فکر رہئے۔ جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔

میں اس بجے لڑکے کو لیکر عدالت میں پہنچا۔ عدالت کے دروازے پر ہمارا وکیل۔ تھانیدار۔ سیمنٹ والے۔ لالہ جی اور دوسرے کچھ اور اصحاب موجود تھے۔ لالہ جی نے مجھ سے پوچھا سرقد صاحب آپ نے کیا سوچا ہے۔ میں نے نہایت نرم رویہ اپناتے ہوئے کہا کہ اب میرے فیصلہ کی بات ہی نہیں رہی میں نے اپنی بیٹی سے وعدہ کرلیا ہے۔ ساڑھے دس بجے ہم سب ہنسی خوشی عدالت سے باہر آگئے مجسٹریٹ صاحب نے لڑکے کے اقبالِ جرم پر وارننگ دیکر مقدمہ

ختم کردیا۔ تھانیدار صاحب نے عدالت سے باہر نکلتے ہی پاؤں کو ہاتھ لگائے اور کہا کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے

یہ حقیقت ہے کہ یہ تھانیدار اب انسپکٹر ہے یہ مجھے یا اس لڑکے کو ملتا ہے تو خود آواز دیکر بلا کر [...] مارتا ہے اور اس کے بعد میرے پاؤں بھی چھوتا ہے۔ [...] وعدے پر ثابت قدم رکھے اور یہ کسی کو جھوٹے مقدمے [...]

کرشن نگر میں کا نیت نام کا ایک بدمعاش [...] میں رہتا تھا۔ کھیل کھیل میں میرے لڑکے خوش بخت نے [...] چھوٹے بھائی کو کسی بات پر تھپڑ مار دیا۔ دوسرے دن [...] کے پچھلے دروازے کے باہر دھوپ میں کرسی پر بیٹھا اخبار [...] تھا کہ یکایک ایک چھ فٹ کا لمبا تڑنگا نوجوان میرے [...] اور کہنے لگا بابو جی نمستے۔ میں نے نمستے کا جواب دیا تو [...] تمہارے لڑکے نے میرے بھائی کو مارا ہے۔ میں نے کہا کہ تو تمہیں جانتا ہوں اور نہ تمہارے بھائی کو اگر میرے لڑکے نے تمہارے بھائی کو مارا ہے تو بھائی اس کی معافی چاہتا ہوں۔ [...] میں میرا لڑکا خوش بخت باہر آیا اور کہنے لگا پتا جی میں نے مارا کہ وہ ہمیں کھیلنے نہیں دیتا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔ [...] میں نے اپنے لڑکے کو سرزنش کی کہ وہ محلے سے اس طرح کی [...] نہ آنے دے۔ اور میں نے اخبار پڑھنا شروع کردیا۔ یکد[...] کی آواز آئی اس لمبے نوجوان نے میرے لڑکے کو تھپڑ مارا [...] یہ آواز تھی جس پر میرا لڑکا اس نوجوان سے الجھ پڑا۔ یہ [...] کمرے میں رہتا تھا۔ یہ ایک ایک چھلانگ میں تین تین سیڑھی [...] اترتا ہوا نیچے آیا اور آتے ہی اس لمبے نوجوان کو اچھل کر ٹکر ماری کہ حضرت کے منہ اور ناک سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا ٹکر کی آواز ایسی تھی جیسے فلموں میں ہیرو اور ویلن کی لڑائی [...] تڑاخ تڑاخ کی آوازیں آتی ہیں۔ محلے کے پچاسوں عورتیں [...] اور آدمی اکٹھے ہوگئے۔ وہ لمبا نوجوان ناک اور منہ پر ہاتھ [...] اپنے گھر کی طرف بھاگ گیا اور محلے کے لوگوں نے اس لڑکے کو [...] دی کہ اس بدمعاش کا ایسا کوئی بھی ٹکر نہیں ملا۔ یہ لڑکا کسا رہے گا [...] کا۔ مگر ان میں یہ ہے کہ اس لمبے قد لڑکے نے ایسی ٹکر ماری کہ مجھے یقین ہونے لگا کہ واقعی یہ لڑکا کسی کی پہنچ سے باہر [...]

سکتا ہے۔

کالیہ ہفتہ بھر گھر سے نہ نکلا۔ مگر اس کے دو بھائیوں نے چند لڑکوں کو ساتھ ملا کر ہمارے گھر کے ارد گرد چکر لگانے شروع کر دیئے اور کئی لڑکوں کے ہاتھوں میں ہنٹر تھے اور وہ علی الاعلان کہتے کہ اب وہ لڑکا ہاتھ آئے تو اسے ماں کا دودھ یاد کرا دیں گے۔ رات کو میری بیوی اور میں نے اس لڑکے کو صورت حالات سے آگاہ کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ کچھ دن گھر میں ہی رہے اور کوئی کام کرنے باہر نہ جائے۔ لڑکے نے کہا کہ بابو جی اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ میں گھر میں بیٹھ جاؤں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایسا علاج کر دوں کہ سارا معاملہ ختم ہو جائے۔ مگر میں نے اسے یہی ہدایت کی کہ تم گھر سے باہر نہ جانا۔ دوسرے دن شام کو میں پولیس کے کام کے سلسلے میں قرول باغ گیا ہوا تھا۔ کالیہ کے بھائیوں نے اپنے حواریوں کو ساتھ لیکر پھر ہمارے مکان کے ارد گرد چکر لگانے اور آوازیں کسنے شروع کئے۔ یہ لڑکا پہلے تو چند منٹ تک یہ مظاہرہ دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کچن میں گیا اور سبزی کاٹنے والی چھری لیکر باہر نکل آیا۔ کالیہ کے بھائیوں اور دوسرے لڑکوں نے جب ننگی چھری اس کے ہاتھ میں دیکھی تو سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ آگے آگے یہ مظاہرین اور پیچھے پیچھے یہ ہاتھ میں چھری لئے۔ ماؤں نے اپنے بیٹوں کو گھروں میں کھینچ کر دروازے بند کر لئے۔ کالیہ کی ماں بھی بھاگی آئی اور اپنے بیٹوں کو گھر لے گئی۔ مظاہرین چھپے اپنے گھروں میں اور یہ لڑکا چھری ہاتھ میں لئے بہ آواز بلند کہتا رہا کہ جس نے ماں کا دودھ پیا ہے آ جائے سامنے۔ اگر کالیہ بھی سن رہا ہو تو وہ بھی اپنے بھائیوں کو ساتھ لیکر باہر آ جائے۔ اگر سب کی آنتیں باہر نہ نکال دوں تو کہنا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میری بیوی اس لڑکے کو مارتی اور گالیاں دیتے ہوئے گھر لے آئی۔ شام کو ساڑھے سات بجے میں گھر آیا تو یہ تمام کیفیت مجھے بتائی گئی۔ اس لڑکے نے کہا بابو جی یقین رکھئے کہ میں کسی کو چھری مارتا نہیں۔ مگر چھری کی جھلکی (ڈیمانسٹریشن) ہی اس کا واحد حل تھا۔ آج نہیں تو کل آپ بھی میرے ہم خیال ہوں گے مگر میں نے کافی حد تک اظہار ناراضگی کیا۔ جس سے یہ لڑکا کچھ مایوس ہوا۔

رات کو محلے والوں نے میٹنگ کی اور مجھے بلایا گیا اور شام کے واقعہ کو سامنے رکھا۔ میں نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ جب تین دنوں سے آپ لوگوں کے صاحبزادگان ہاتھوں میں کوڑے اور گالیاں لیکر میرے مکان کا گھیراؤ کرتے رہے اس وقت آپ کہاں تھے۔ آپ نے یہ میٹنگ جو آج بلائی ہے پہلے کیوں نہ بلائی تاکہ یہ معاملہ اس حد تک نہ بڑھتا۔ جب ان لوگوں سے جواب نہیں بن پڑا تو ایک صاحب فرمانے لگے آپ نے ہم سے شکایت کب کی۔ میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ کو شکایت ہے تو پھر مجھے یہاں کیوں بلایا ہے میرے ہاں آیئے اور شکایت کیجئے۔ اس پر معاملہ بگڑتے دیکھا۔ تو ایک دوسرے صاحب نے کہا کہ ہمیں مجبوراً پولیس کے پاس جانا ہوگا میں نے جواب میں کہا کہ آپ تو اب پولیس میں جائیں گے۔ میں تو سابقہ تین دنوں سے سارے مظاہرے کی رپورٹ لکھواتا رہا ہوں۔ مگر میں نے دیدہ دانستہ آپکے لڑکوں کے نام نہیں لکھوائے تھے۔ اب آپ پولیس کا شوق پورا کر لیجئے۔ پھر مجھ سے بات کیجئے گا تاہم محلے کا معاملہ تھا۔ کچھ لوگوں نے پھر سے بٹھا لیا۔ اور میں نے انھیں وشواش دلایا کہ آپ اپنے بچوں کو سنبھال لیں۔ یہ لڑکا آپ سب کا خادم ثابت ہوگا۔

دوسرے دن سے محلے کے لڑکوں نے کالیہ اور اس کے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ کر اس لڑکے کو سلام کرنے شروع کر دیئے۔ اور کالیہ کئی دنوں تک سامنے نہیں آیا۔ ایک دن میں گلی میں کالیہ کے مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ کالیہ باہر آیا اور کہنے لگا بابو جی نمستے۔ میں نے نمستے کا جواب دیا تو وہ کہنے لگا بابو جی اس دن کی بیوقوفی کے لئے میں معافی چاہتا ہوں میں نے اسے تھپتھپاتے ہوئے محبت بھرے الفاظ میں سمجھایا کہ محلہ میں مل جل کر رہنا پڑتا ہے۔ وہ لڑکا تمہارا دوست ہے دشمن نہیں اور یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

(جاری ہے)

گوشۂ عقیل صدیقی

مشاعرہ میلہ گوگھال سہارنپور

کریم الاحسا

میلہ میں ایک عظیم پنڈال بنایا گیا ہے جو برقی قمقموں اور ٹیوب لائٹس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ سامعین کا ایک جم غفیر ہے۔

آج ۱۶؍ستمبر ۸۹ء ہے رات کے سوا دس ہوا چاہتے ہیں اعلان ہوا ہے کہ اس مشاعرہ کا افتتاح جناب محترم قاضی محی الدین وزیر جنگلات اتر پردیش فرما رہے ہیں۔ دیکھا تو قاضی جی کھدر میں ڈوبے گاندھی کیپ زیب سر کئے ایک شمع روشن کر رہے ہیں۔ آپ کا تالیوں اور پھولوں سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ کیمرہ بھی حرکت میں آگیا ہے۔ اور پھر صدارت کے لئے جناب رفعت عباس سہارنپوری کا اسم گرامی پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کو بھی پھولوں سے لادا جا رہا ہے۔ لیجئے محمد علی موج رامپوری نے مائک سنبھال کر نظامت کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے ہیں۔ محترم قاضی جی سے درخواست کر رہے ہیں کہ افتتاحیہ تقریر فرمائیے۔ قاضی جی نے پُر وقار انداز میں تقریر فرمائی ہے جسے سن کر آپ کیا کریں گے۔

موج صاحب نے ظہور سہارنپوری کو یاد فرمایا ہے۔ ظہور صاحب مائک پر پہنچ کر نہایت خفگی اور ترناٹے کے ساتھ پیچ کر فرما رہے ہیں۔ چونکہ مجھے دعوت نامہ نہیں بھجوایا گیا لہٰذا میں بطور احتجاج نہیں پڑھ رہا ہوں اور یہ کہہ کر یہ جا اور وہ جا ادھر تالیاں جاگ اٹھی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ مشاعرہ میں کیوں تشریف لائے جناب —؟ اگر احتراماً آپ کو یاد فرما لیا گیا تو اس عالم میں خفگی کا مظاہرہ نہ کرنا چاہئے تھا بھول چوک بھی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ قاضی جی نے مائک پر آکر فرمایا۔ جب اسمبلی میں کوئی ممبر خفگی کے عالم میں چلا جاتا ہے تو ذرا دیر بعد پھر تشریف آوری ہو جاتی ہے لہٰذا میں ظہور صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ آکر اپنا کلام سنائیں۔ لیجئے ظہور صاحب نے آکر ایک طویل نظم میرے پیارے وطن سنائی ہے اور اب موج صاحب سلیم کھتولوی کو دعوت غزل دے رہے ہیں۔ سلیم صاحب بھی ایک پرانی غزل الاپ رہے ہیں۔ ؎

مائل بہ کرم جب وہ ستمگار ہوا ہے + ہر زخم جگر اور بھی خوں بار ہوا ہے

نیلام وفا جب سر بازار ہوا ہے + دل بیچنے والا ہی خریدا

ادھر داد کا دھماکہ ہوا ہے ادھر قاضی جی اسٹیج سے قالین کی صف میں آگئے ہیں اور اور اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر ہوتا ہی آرہا ہے کبھی کبھی بوریا نشین بھی بننا پڑتا ہے۔ تو بر ضا و رغبت مسند ہی سے قالین پر آگئے ہیں آئیے

غیروں سے محبت تیرا مشرب ہی سہی لیکن

نادان کبھی خود سے بھی تجھے پیار ہوا ہے

ہے شیخ کے کاندھوں پہ برہمن کا ح

کس شان سے جشنِ رسن و دار ہ

سلیم صاحب داد لوٹے اپنی جگہ لائے جا رہے ہیں (… نابینا ہیں) موج صاحب زحمت سخن دے رہے ہیں، اسکول کے ایک ابھرتے مترنم اور خوش فکر شاعر کو۔ فراز صاحب بھی ایک پرانی غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

خود کو پڑھتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں + اک ورق روز موڑ دیتے

میں پجاری برستے پھولوں کا + جھک کے شاخوں کو چھوڑ دے

تجھ سے رشتہ ہے ریشمی رشتہ + کچے دھاگوں کو توڑ دیے

کانپتے ہونٹ، بھیگتی پلکیں + بات ادھوری ہی چھوڑ د

فراز صاحب بھی ہر شعر پر داد وصول کئے پلٹ رہے ہیں؛ … صاحب آگئے ہیں موج صاحب نے مائک ان کے سپرد کر دیا، وسیم صاحب نے محفل کا جائزہ لیکر اور فہرست پر ایک نگاہ … سدلیش کمار معصوم سہارنپوری کو یاد فرمایا ہے معصوم صاحب ایک طویل نظم رواں دواں سنائی۔ کس نے سنی یہ اللہ ہی … آیئے پھر ایک حسین غزل محمودہ ناز لکھنوی سے سنئے ؎

حسن بڑھتا ہے تماشا کا تماشائی سے

تیری شہرت کا بھرم ہے مری رسوائی سے

درد میں آج تھکن بھی ہے لطافت بھی

تیری یادوں کی صبا لی گئی پُروائی سے

داد کا عالم نہ پوچھئے آپ کی تصویر لی گئی ہے پیش …

سے دریافت کیا نازؔ صاحبہ کی تعریف ۔۔۔؟ فرمایا شاہجہاں بانو یاد کی بہن ہیں۔ میں نے عرض کیا ۔ایں خانہ تمام آفتاب است دیکھا تو آپ اسی سٹیج سے لپک رہی ہیں سے

گنگنا اٹھی مرے کانوں میں کسی کی یادیں
نازؔ آتی ہے صدا جب کسی شہنائی سے

نازؔ صاحبہ مائک سے جدا ہوا چاہتی ہیں کہ ایک اور ایک اور کے غل غپاڑے میں وسیم صاحب مائک پہ آکر دریافت فرما رہے ہیں غزل پسند آئی ۔۔۔؟ واہ خوب وسیم صاحب کیا کہنا پھر ادھر سے جواباً ہلڑ بازی ہے۔ وسیم صاحب پھر نازؔ صاحبہ سے درخواستِ غزل کر رہے ہیں۔ نازؔ صاحبہ پھر اسی بانکپن سے ایک غزل سے

جہانِ شوق میں جی بھر کے مسکرانے دو
خدا کے واسطے مجھکو فریب کھانے دو

سُنا کہ کامراں جا رہی ہیں اور وسیم صاحب سہارنپور کے ذیشان سحرؔ کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں سحرؔ صاحب فرما رہے ہیں سے

سیاہ رات کے پنجوں میں جان رہنے دو
لہو سے سرخ زمین آسمان رہنے دو
مورخوں کے لئے داستان رہنے دو
لہولہان مناظر میں جان رہنے دو
تمام شہر کو لاشوں سے تم نے ڈھانپ دیا
کہیں تو سر پہ کھلا آسمان رہنے دو
ہماری لاشیں جلاؤ نہ ان فصیلوں پر
کوئی تو رشتۂ خوں درمیان رہنے دو

سحرؔ صاحب محفل کو گرما کر داد و تحسین پا کر شاداں پلٹ رہے ہیں اور اب محمد علی موجؔ رامپوری ایک شگفتہ سنائی غزل چھیڑ رہے ہیں سے آپ تو ایسا بولئے صاحب + ہم نے تیکھے بگولے صاحب

آتش کے دامن کو چھو کے آئے ہیں
ہم کو پھولوں میں تولئے صاحب
"ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں"
اتنا اونچا نہ بولئے صاحب

موجؔ صاحب بھی داد لوٹ کے مائک سے جدا ہوا چاہتے ہیں کہ ایک غزل کی فرمائش نے ان کو پھر ایک غزل سے محفل کو جھنجھوڑ ابھار رہا ہے + ہوا میں تیر چھوڑ ابھار رہا ہے سنانے پر مجبور کیا اس غزل پر بھی داد کی جھولیاں بھر کے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور وسیم صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں شمسی مینائی سے ۔ شمسی صاحب حسبِ عادت یوں گرج رہے ہیں سے

روشن ہو اگر دل شوالا ہے ہر قدم
روشن جو دل نہ ہو تو شوالا بھی کچھ نہیں
ہمت اگر ہو پست تو ذرّے بھی روک دیں
ہمت اگر بلند ہو تو ہمالہ بھی کچھ نہیں

کئی بار دہرا کر فرما رہے ہیں سے

آج انسان کیسے انسان ہیں ۔۔۔ دل بھی ان کے بدل نہیں سکتے
ایک گاڑی میں بیٹھ سکتے ہیں ۔۔۔ ایک رستے پہ چل نہیں سکتے

داد کا شور کم ہوا تو ایک طویل نظم دلی کے حالات سے شروع کی ہے اس نظم سے کتنے چہرے فق ہوئے اور کتنے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے اور کتنے چہروں پہ اتار چڑھاؤ آیا یہ نہ پوچھئے آپ تو صرف دو شعر سن لیجئے گا سے

دھردوں کی گھنی چھاؤں میں اترا کے چلے تھے
گاندھی کی سمادھی پہ قسم کھا کے چلے تھے
ہر وعدہ کو تم نے ہی تو بے جان کیا ہے
گاندھی کی سمادھی کا بھی اپمان کیا ہے

شمسی صاحب تالیوں کے شور میں گرج اور برس کر جا رہے ہیں اور پھر تالیوں کی جھنکار میں ڈاکٹر ساغر اعظمی مائک پہ آکر غزل سرا ہوئے سے

ہنس دیا کوئی مجھے دیکھ کے روتے روتے
ٹل گیا آج پھر حادثہ ہوتے ہوتے

دوسرے مصرعہ پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ اسی بانکپن سے محفل کو لوٹتے چلے ہیں سے

یہ جو دامن پہ تمہارے ہیں لہو کے چھینٹے
تم کو اک عمر گزر جائیگی دھوتے دھوتے
دل سے گزرا تھا ابھی تیرے ہی جیسا کوئی
بچ گئی آج امانت تیری کھوتے کھوتے

زندگی سے ہے اب اتنا ہی تعلق ساغر
جیسے تھک جائے کوئی بوجھ کو ڈھوتے ڈھوتے

ساغر صاحب یارانِ محفل کی تشنگی بڑھا کر مائک سے ہٹا ہوا چاہتے ہیں کہ ایک اور ایک اور کا نعرہ بلند ہوا ہے۔ پھر ایک غزل سے

اب کے موسم میں عجب سازشِ حالات ہوئی
شہر تپتے رہے صحراؤں میں برسات ہوئی

اسی سج دھج سے سنا کر داد وصول کئے آرہے ہیں لیجئے اب سہارنپور کے ایک ترقی پسند اور جدید گلوکار شاعر سکندر حیات آرہے ہیں آپ کا خیر مقدم جلد کیوں قہقہوں اور تفریحی نعروں سے ہو رہا ہے داد دیجئے حیات صاحب کو کہ اس عالم میں بھی جم کر سناتے رہے یہ اپنے اپنے حوصلہ اور ہمت کی بات ہے ایک مطلع سنتے چلئے سے

آجا دلِ تباہ میں لیکن سنبھل کے آ
دُنیا کی خواب گاہ سے باہر نکل کے آ

سامنے پنڈال میں ایک ہلڑ بازی ہے اور آپ ہیں کہ اس عزت افزائی پر کوئی دھیان نہیں دیتے آخر کب تک شعرا کے اصرار پر پلٹ رہے ہیں حیات صاحب نہ جانے کب سے اس غزل کی مشق کر رہے ہوں گے اور یہ حشر ہوا لیجئے پھر اس ہڑبونگ کو دو آتشہ کرنے کے لئے ہلال سیوہاروی راج نرائن کا عطر پیش کر رہے ہیں سے

عطر کے شوقین اس دُنیا میں لاکھوں ہیں مگر
کام کرتا ہے تمہارا عطر جادو کی طرح
بس ذرا محفوظ رکھے اس تمہارے عطر سے
جس کے لگ جاتا ہے اُڑ جاتا ہے خوشبو کی طرح

کئی بار دہرا کر ارشاد ہوا ہے سے

تیرے ہونٹوں پہ یہ مسیحائی کی باتیں کیسی
یہ حقیقت کے عوض خواب و فسانہ تو نہیں
قوم کے درد میں ڈوبی ہوئی تیری آواز
یار نزدیک الیکشن کا زمانہ تو نہیں

پھر ایک غل غپاڑہ ہے اور اب آپ ایک طویل نظم مسز گاندھی کو سلام سنا کر خوب خوب داد پا کر تالیوں کے بے ہنگم شور میں آرہے ہیں آئیے پھر ایک غزل سے غزل سنئے۔ اور اب آرہی ہیں شگفتہ انجم۔ نیلی ساڑی جس پر سلمہ ستارے چمک چمک کر رہے ہیں۔ گلے میں ایک رومال بندھا ہوا ہے۔ غالباً ان دنوں ان کی مشاعروں میں مانگ بڑھ رہی ہے۔ غزلیں الا اچھے بیٹھ گیا یا خراب ہو چلا ہے خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے لحنِ علا میں غزل سرا ہیں سے

سازِ ہستی کا اعتبار کہاں + کیا خبر ٹوٹ جائے تار کہاں
دلِ بسمل کو رقص کرنے دو + موت ملتی ہے بار بار کہاں
جان دے کر کرے جو دلجوئی + اب جہاں میں وہ غمگسار کہاں
ان کو دیکھا تو آنکھ بھر آئی + آنکھ ہوتی ہے اشکبار کہاں

انجم صاحبہ گلوکاری کا مظاہرہ کر کے داد لوٹتے اپنی جگہ آ ہیں اور اب وسیم کو داد دیجئے کہ ایسے لاجواب شاعر کا انتظام کہ جواب نہیں وہ دیکھئے ایک نوجوان خوبرو باریش مائک پر آ محفل کا جائزہ لیکر غزل چھیڑنا چاہتے ہیں کہ فرمائشوں سے ہنگامہ کو جنم دیا ہے اور سبحرود ھکار ساقی صاحب سنی ان سنی لحنِ داؤدی میں غزل سرا ہیں سے

دربزمِ ساقی سے ہوشیار نکلے + مسیحا کے کوچے سے بیمار نکلے
میں جسکو نہیں بیچنا چاہتا تھا + اس احساس کے سب خریدار نکلے
مرا جن سے خود بھی تعارف نہیں تھا + وہ میری کہانی کے کردار نکلے

داد کا سابقہ ریکارڈ بھی اس شامیانہ شکن ہنگامہ دیکھ رہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور ساقی صاحب کئی بار دہرا کر اسی بانکپن سے محفل کو چونکانے چلے ہیں سے

میں پھولوں کی وادی سے واپس جو آیا
مرے پاؤں میں ان گنت خار نکلے

ساقی صاحب داد کی جھولیاں بھرے شاداں پلٹ رہے ہیں اور وسیم صاحب اس نازک موڑ پر آزمائش میں ڈال رہے ہیں شمعِ غزل کرشن بہاری نور لکھنوی کو۔ نور صاحب کا نام سنتے ہی لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں اور نور صاحب پُروقار انداز سے فرما رہے ہیں سے

تمام جسم ہی گھائل تھا گھاؤ ایسا تھا
کوئی نہ جان سکا رکھ رکھاؤ ایسا تھا
خریدتے تو خریدار خود ہی بک جاتے

تپے ہوئے کھرے سونے کا بھاؤ ایسا تھا۔
بس اس کی مانگ میں سیندور بھر کے لوٹ آئے

ہمارے اگلے جنم کا چناؤ ایسا تھا

یوں تو داد نے ایک ہنگامہ کا ہو پیدا حاصل رکھا ہے لیکن اس شعر پر من چلے تالیوں پہ اتر آئے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

زباں سے کچھ نہ کہوں گا غزل یہ حاضر ہے
دماغ میں کئی دن سے تناؤ ایسا تھا

لوگ صاحب داد میں ڈوبے تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اس وقت اور کوئی قربانی کا بکرا نہ تھا وسیم صاحب نے اسے بچا کر خود کو پیش کر دیا ارشاد ہوا ہے ؎

وہ میری پیٹھ میں خنجر ضرور اتارے گا
مگر نگاہ ملے گی تو کیسے مارے گا

دوسرے مصرعہ پر ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے یہ ہنگامہ فرو ہوا تو چلتے رہے ہیں ؎

گھرا ہوا ہے وہ بہت سے چہروں میں
اکیلا ہوگا تو پوچھو کیسے پکارے گا
یہ ساتھ ایسا نہیں ہے جو اس طرح چھوٹے
میں چپ رہا تو رشتہ تجھے پکارے گا
یہ سوچ کر ہی میں اپنی صدیں بھی کھو بیٹھا
میں اس کی آخری بازی ہوں کیسے ہارے گا

پھر داد نقطۂ عروج سے ہوا ہے اور آپ مقطع عنایت کر رہے ہیں ؎

وسیم کون ہے اس قہقہوں کی دنیا میں
جو میری پلکوں سے آنسو کا بوجھ اتارے گا

وسیم صاحب داد و تحسین وصول کئے اپنی جگہ آ کر انور تاباں سہارنپوری سے درخواست کلام کر رہے ہیں۔ مقامی شعراء کا عجیب نمائندہ انتخاب ہے۔ جس میں علامہ آنند سہارنپوری حنیف سیمابی، حمید قریشی، کوثر تسنیمی، کمل، محمد احمد ساحل ریاض حیدر پڑگو اور قادر الکلام کہنے والے شعراء غائب اس مصلحت کو مقامی حضرات ہی مجھ سے زیادہ جان سکتے ہیں انور تاباں صاحب بہت تیز نکلے ایک شعر سنا کر معذرت کر کے چلتے بنے آیئے پھر اسی جمود کو توڑنے کے لئے مشہور غزل گو شاعر ایاز جھانسوی مائک پر یوں غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

اس اجنبی کا یقین دل نے کر لیا کیسے
وہ ایک سادہ ورق تھا اسے پڑھا کیسے
جو گاؤں گاؤں پھرا شہر شہر گھوم آیا
ذرا سی بھیڑ میں وہ آج کھو گیا کیسے
وہ شہر یار ہواؤں کا رخ سمجھتا تھا
چراغ اس کا جلایا ہوا بجھا کیسے

اب داد دینے والے بے حال ہو چلے ہیں۔ سامنے سے ایک آواز بلند ہوئی ایک بار اور ــــ ایاز صاحب نے فرمایا میرے خیال میں آپ شہریار کا مطلب سمجھ گئے پھر مسکرا کر جھوم رہے ہیں ؎

جو زیرِ آب تھے سب میرے انتظار میں تھے
میں ڈوب کر ہی تو ابھرا تھا ڈوبتا کیسے

ایاز صاحب محفل کو گرما کر جا رہے ہیں اور عالم فتحپوری یوں گرج رہے ہیں ؎

یہ سچ ہے دورِ گذشتہ بہت برا تھا مگر
یہ دور اس سے بھی بد تر ہے کیا کیا جائے

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

پھول مسلے۔ کلیاں توڑیں۔ کیا غنچوں کا خون
باغباں ہو کر چمن میں وہ ستم ڈھائے کہ بس

شیرازہ رہزنوں کا پریشاں ہوا تو ہے
منزل پہ اب پہنچنے کا امکاں ہوا تو ہے

آج عالم صاحب گلو خلاصی کر کے چلتے بنے اور آپ کے ساتھ ہی ۲½ بجے پہلا دور ختم ہو کر ساتھ ہی دوسرا دور یہ اعلان کر کے جمایا گیا کہ بیگل اتنا ہی لگے ہیں۔ اور یار لوگ پھر جم گئے ہیں جو غالباً سوا تین بجے تک چلا یہ دور مختصر سا ہی تھا۔

● ● ●

جنگل میں راستہ

کہکشاں ملک

موسم ابر آلود تھا سکول میں چھٹی ہونے تک اچھی خاصی بارش ہونے لگی۔ میں تیز تیز قدموں سے بس سٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ ذہن پر اپنے بچوں کا خیال بُری طرح چھایا ہوا تھا جنہیں صبح ہمسایوں کے گھر چھوڑ کر چلے آنا پڑا تھا۔ نوکر ہفتہ ہوا۔ راشن چینی لینے گیا اور بیس روپے، راشن کارڈ اور چینی کے تھیلے سمیت ابھی نہیں لوٹا تھا۔ نئے نوکر کی تلاش جاری تھی۔ ایک دو ملے بھی مگر ان کی تنخواہ اور روٹی کپڑے کو ملا کر اتنا ہی خرچ اٹھنے کا اندیشہ تھا جتنی میری تنخواہ تھی۔ اور اس سے بہتر تھا کہ نوکری کی بجائے گھر کی نوکری اختیار کر لیتی۔ بڑی مشکل سے ہفتے میں تین دن مجھے اور تین دن میرے شوہر کو چھٹی لیکر گھر پہ رہنا پڑا تھا۔ مجبوراً آج ساتویں دن ہم دونوں روٹی کے علاوہ مکان کے کرائے کی خاطر گھر سے کام کے لئے چل پڑے اور بچیاں ہمسایوں کے ہاں چھوڑنی پڑیں۔ سب سے بڑی بچی چار سال سے ایک ماہ کم ہی تھی اور وہ باقی بہنوں کو میری غیر موجودگی میں کسی طور پر دیکھ بھال نہ کر سکتی تھی۔ ہمسایوں کے گھر کے باہر والے برآمدے میں ایک جگہ سوئچ بورڈ اکھڑا ہوا تھا اور ننگی تار نظر آتی تھی جسے میری وہمی طبیعت نے بچیوں کو وہاں چھوڑتے وقت بُری طرح محسوس کیا تھا۔ میری منجھلی بچی بڑی تند اور شریر واقع ہوئی تھی وہ اس تار کو چھونے سے ہرگز نہ ہچکچاتی اور چھو کر چھوڑتی اوپر سے موسم کی غیر متوقع خرابی میرے لئے اور بھی پریشان کن تھی۔ لہٰذا میں بغیر آگے پیچھے دیکھے بس سٹاپ کی طرف بھاگی جا رہی تھی کہ بس سٹاپ کے پاس میں نے ایک اچھے معقول قسم کے آدمی کا پاؤں کچل کر رکھ دیا۔ وہ صاحب بلبلا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے بھی چونکہ پاس ہی کھڑے ہونا تھا اس لئے نہایت ہی خجالت محسوس کرتے ہوئے۔ "معاف کیجئے گا میرا دھیان کہیں اور تھا" ان صاحب نے رومال سے جوتا صاف کرکے میری جانب غور سے دیکھا۔ پھر ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی وہ بولے۔ جی نہیں کوئی بات نہیں۔ "ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" اصولاً یہاں معاملہ ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ میں کچھ زیادہ شرمندہ تھی۔ دوسرے شاپ خالی تھے۔ اور ان صاحب کا دل مزید کچھ بات چیت کرنے کو تھا اس لئے میں نے سوچا تلافیٔ ملاقات کے لئے اس درگزر کا شکریہ ایک دفعہ اور ادا کروں میں نے کہا۔ جی ہاں پھر بھی جو آپ کو تکلیف ہوئی میں انتہائی شرمندہ ہوں۔

ایسی کوئی بات نہیں جس کے لئے آپ شرمندہ ہوں۔ میں آپ کو تقریباً روز ہی اس پریشانی اور عجلت میں پاتا ہوں کیا آپ کے گھر میں کوئی بیمار وغیرہ تو نہیں ان صاحب نے بڑے اہتمام سے میرے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔ میں جواب میں اس شجرہ نما سوال پر چونک گئی۔ پھر میں نے اپنی افسانوی اور مبالغہ تراش طبیعت پر لعنت بھیجتے ہوئے ان صاحب کے سوال کو بڑا ہی بے ضرر پایا اور کہا۔

جی نہیں۔ دراصل گھر میں نوکر نہیں ہے نا۔ تو بڑا ہی پرابلم ہوا بن گیا ہے۔ میری بچیاں اکیلی رہتی ہیں۔ انہیں آج میں ہمسایوں کے گھر چھوڑ آئی تھی۔

بچیاں۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔

جی ہاں! میری اتفاق سے تینوں بچیاں ہیں۔ سب سے چھوٹی کی عمر ابھی ڈیڑھ برس کی ہو گی۔ میں نے اس قحط الرجال پیدا کرنے والے زمانے میں اس انکشاف کا جرم کرکے خفیف سی ہو کر کہا۔

عجب اتفاق ہے ان صاحب نے نیم نگاہیہ انداز میں میرا جائزہ لیا۔

کیوں۔ کیا آپ کی شادی نہیں ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

جی ہوئی ہے اور اتفاق سے میرے تینوں بچے ہیں۔ سب سے چھوٹے کی عمر بھی غالباً ڈیڑھ برس کی ہو گی۔ وہ مسکرا کر بولے۔

اور آپ کی بیوی (مجھے ان صاحب کی بیوی پہ بے طرح رشک آ گیا) آپ کی بیوی تو سروس وغیرہ نہیں کرتی ہوں گی۔ وہ گھر ہی پہ رہتی ہوں گی۔

میں نے بالکل عام انداز میں کہا۔

دھنک	عزیز اندوری	۶-۰۰	مٹی کا چراغ	سلمیٰ صدیقی
بادہ و جام	شارق میرٹھی	۲-۵۰	آدھا راستہ	کرشن چندر
تاروں کی چھاؤں میں	عزیز عالم	۲-۰۰	آئینے اکیلے ہیں	"
ضیائے کوکب	کوکب گھرونڈوی	۳-۵۰	شیشوں کا شہر	"
بیسویں صدی کے تیر و نشتر	خوشتر گرامی	۱۸-۰۰	دارا شکوہ	قاضی عبدالغفار
انوار و تجلیات	مولانا قمر واحدی	۱۰-۰۰	غبارِ شب	"
اقبال البم	جگن ناتھ آزاد	۵۰-۰۰	چار چہرے	سہیل عظیم آبادی
بہارستان اولیاء	حضرت آرزو	۱۰-۰۰	بے جڑ کے پودے	"
کلپور قدسی	"	۱۰-۰۰	چراغِ تہ داماں	اقبال نبی
ہندوستان ہمارا۔ اول، دوم	جاں نثار اختر	۲۰-۰۰	تنکے کا سہارا	شکیلہ اختر
سٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری	مولانا عبدالحق بابائے اردو	۴۵-۰۰	کھلونے	مسعود نقی
فیروز اللغات جامع اردو نو ترمیم ایڈیشن	مولوی فیروز الدین		طوفانِ حوادث	پروین سرور
		۶۰-۰۰	ایک محبت کی کہانی	صلاح الدین
افکارِ سودا	ڈاکٹر شارب ردولوی	۶-۰۰	یگانہ	البرٹ
مطالعۂ ولی	"	۱۰-۰۰	شجرِ صدا	عمیق حنفی
عرضِ ہنر	ڈاکٹر محمد حسن	۱۲-۰۰	نژادِ سنگ	بلراج کومل
تلاش و توازن	ڈاکٹر قمر رئیس	۱۰-۰۰	امیج	بشیر بدر
فلسفہ اور ادبی تنقید	ڈاکٹر وحید اختر	۲۰-۰۰	عکس ریزہ	مظفر حنفی
بنگال میں اردو	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۷-۰۰	لمحوں کا حصار	آفتاب شمسی
سب رس کا تنقیدی جائزہ		۲-۵۰	آتش سیال	ساجدہ زیدی
۲۰ نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی	۱۲-۰۰	خراشیں	سہگل
سب سے چھوٹا غم	عابد سہیل	۱۰-۰۰	تصور (ناول)	راج ہندی
خالی پٹاریوں کا مداری	اقبال نبی	۱۲-۰۰	کلیاتِ اقبال اردو (عکسی) صدی ایڈیشن	
کچا پکا البم	"	۱۰-۰۰	فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم
پہلی آواز	رتن سنگھ	۶-۰۰	اقبال فن اور فلسفہ	ڈاکٹر نورالحسن نقوی
پنجرے کا آدمی	"	۱۰-۰۰	اقبال معاصرین کی نظر میں	وقارِ عظیم
کل کی باتیں	رام لعل	۱۰-۰۰	تصوراتِ اقبال	مولانا صلاح الدین احمد
معصوم آنکھوں کا بھرم	"	۶-۰۰	دیوانِ غالب (عکسی)	نورالحسن نقوی
ورق ورق زندگی	صبیحہ انور	۶-۰۰	غالب تقلید اور اجتہاد	پروفیسر خورشید الاسلام
سبزہ بیگانہ	نور پرکار	۱۰-۰۰	غالب: شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری
رسائی	جوگندر پال	۶-۰۰	اطرافِ غالب	ڈاکٹر سید عبداللہ

ہے۔ لیکن آنکھیں جن کا راز فاش کر دیتی ہیں۔ انھوں نے جو قمیص صبح پہنی تھی۔ اس پر ننھی شہلا نے مزے سے سالن سے بھرا ہوا ہاتھ لگا دیا تھا۔ اور وہ معمولی سی بنی دھونے کے باوجود نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ اس سے بے نیاز میرے قریب کھڑے تھے۔ تفکرات نے ابھی سے کنپٹیوں کے بالوں کی سیاہی نگلنا شروع کر دی تھی۔ میں سکول کے بچوں کا ہوم ورک چیک کرنے کے لئے تیاری کرنا چاہتی تھی۔ وہ حسب عادت سگریٹوں کے لئے پیسے مانگ رہے تھے۔ پوری کی پوری تنخواہ میری ہتھیلی پر رکھنے کے بعد اس سات سالہ زندگی میں یوں ہی اپنی ضروریات کے لئے مجھ سے پیسے مانگا کرتے ہیں۔ میں نے پاس رکھے پرس سے پانچ روپے نکال کر دیئے اور وہ شکریہ کہہ کر چلے گئے۔

مگر میرے خیالات نے جھٹکا سا محسوس کیا۔ وہ اداس بھوکی دلکش سی نگاہیں میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ میرے ہاتھ سے اچانک ہی قلم گر گیا اور میں کھو سی گئی۔

آخر وہ شخص اتنا اُداس کیوں ہے۔ اس کی نگاہوں میں اطمینان کیوں نہیں۔

اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہے۔ اور مجھے ہنسی آگئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے دور شہنائی کی آواز قریب آتی جا رہی ہو۔ اور میری عامرہ کو اس کی سہیلیاں دلہن بنا رہی ہیں۔ اس کی گوری سی پیشانی پر ٹیکہ دمک رہا ہے۔ اور میں کتنی بوڑھی ہو گئی ہوں۔

بوڑھی۔ ایک نہیں۔ دو نہیں۔ تین بیٹیوں کی بوڑھی ماں۔ میرا چہرہ کتنا جھریوں سے بھر گیا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے سچ مچ ان جھریوں کو چھوا۔ پھر میں نے زور سے عامرہ کو آواز دی۔ اور اس چہرے کو غور سے دیکھا کتنی طمانیت تھی۔ کتنی فراغت تھی۔ میں نے اس کا منہ چوما اور پھر کاپیوں میں اُلجھ گئی۔

شام کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ میری طبیعت پھر خراب تھی۔ تین بچیاں پہلے ہی کیا کم تھیں۔ اس پر سکول کی نوکری۔ میرے لئے ایک اور بچہ صحت اور مالی لحاظ سے کسی طور سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ مگر کیا کرتی میں دوسروں کو کیا کہوں۔ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ایک بیٹا مل جائے۔ صرف ایک بیٹا۔ جو اپنی بہنوں کی ڈولیوں کو کندھا دے سکے۔ اس ریسے اب چوتھی مہم شروع تھی

طبیعت بہت گری گری رہتی تھی۔ سکول میں اکثر نہیں آ جا سکتی تھی اور وہ صاحب بھی میرے ذہن سے اُتر چکے تھے لیکن اسی شام میں پیدل ہی کلینک کی جانب جا رہی تھی کہ میرے پیچھے سے آنے والا ایک سکوٹر رُک گیا۔

آداب عرض یہ وہی صاحب تھے۔

میں سٹپٹا سی گئی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ——

کہاں جا رہی ہیں۔ انھوں نے انتہائی بے تکلفی سے پوچھا۔

میں یہیں کسی سے ملنے جا رہی ہوں۔ میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔

آپ کا رنگ اُڑا اُڑا سا لگتا ہے۔ خدانخواستہ کہیں بیمار تو نہیں تھیں۔ چلئے میں آپ کو سہیلی کے ہاں چھوڑ آؤں۔

جی نہیں میں قریب ہی جا رہی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

اجی تکلف نہ کیجئے۔ آیئے بیٹھئے نا۔ انھوں نے بڑے اصرار سے کہا۔

جی نہیں مجھے اس پر بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ میں نہیں بیٹھ سکوں گی۔ میں نے بہانہ تراشا نہیں دو قدم پر تو جانا ہے۔ آپ خواہ مخواہ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔

تو چلئے جب تک آپ چلتی ہیں۔ میں بھی چلتا ہوں۔ باتیں کرتے چلیں گے۔

مجبوراً مجھے پھر ان کی نگاہوں سے دوچار ہونا پڑا اور نتیجے کے طور پر میں سہم سی گئی۔

اور ہم چلنے لگے۔

دیکھئے پہلے یہ بتایئے آپ اس طرح خوفزدہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ خدانخواستہ آپ میرے بارے میں یہ رائے تو نہیں رکھتیں کہ میں کوئی کوئی عامیانہ حرکات ....

ان صاحب نے سنجیدہ ہونا شروع کیا اور مجھے اپنی کمزور طبیعت پر رونا آنے لگا۔

میں چپ ہی رہی۔

بتایئے نا۔ انھوں نے اصرار کیا۔

کیا بتاؤں۔ خوفزدہ ہونے کا کیا سوال پیدا کر دیا آپ نے۔ دراصل ہمارا معاشرہ۔ میرا مطلب ہے۔ کم از کم جس طبقے سے میرا تعلق ہے وہاں اس قسم کی بے تکلفی اچھی نظروں سے نہیں دیکھی جاتی (باقی صفحہ ۲۶ پر)

فیشن

[illegible]
بی اے ادیب کامل

جیسے گرمی کے موسم میں جدھر دیکھیے بھنبھناتی ہوئی مکھیاں ہی مکھیاں نظر پڑتی ہیں ٹھیک اسی طرح دیدۂ حاضرین جدھر بھی نظر ڈالئے ہر شخص ایک ماہر معالج، قابل سیاستدان اور ایک اعلیٰ نقاد نظر آتا ہے۔

خدا نہ کرے آپ کے گھر میں کبھی کوئی تکلیف ہو لیکن مثال کے طور پر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ رات سے آپ کے چھوٹے منّے کو بخار ہے اور صبح آپ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں راستے میں کوئی واقف کار ٹکرا جاتا ہے اور زمانہ کے دستور کے مطابق خیر و عافیت دریافت کرتا ہے جواب میں آپ منّے کی علالت اور ڈاکٹر کا ذکر کرتے ہیں تو وہ آپ کی مکمل بات سننے سے پہلے ہی اپدیش دینا شروع کر دے گا۔ "اجی آج کل کچھ موسم ہی ایسا چل رہا ہے اس موسم میں بچوں کے معاملے میں خاص طور پر احتیاط لازم ہے چائے میں تلسی کی دو چار پتی ڈال کر منّے کو پلا دیجئے بخار بھاگ جائیگا۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

اسی طرح راستے میں آپ جس جس سے بھی تذکرہ کریں گے ہر شخص ایک معالج کی طرح اسپرو، اینا سین، سارڈان اور کولڈ رین کی گولیوں کا غیر طلبیدہ مفت مشورہ دیئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

آج جبکہ ملک کے تقریباً سبھی چھوٹے بڑے شہروں کے بازاروں میں ہر چار پانچ دوکانوں کے بعد چائے کا ریستوران دکھائی پڑتا ہے شاذ و نادر ہی کوئی شخص ہو گا جسے کبھی کسی ریستوران میں چائے پینے کا اتفاق حاصل نہ ہوا ہو۔ آپ ریستوران میں چائے سے شوق فرماتے ہوئے میز پر پڑے اخبار کے یہ الفاظ اگر ذرا اونچی آواز میں پڑھ دیں کہ "پانچویں پانچسالہ پلان کے لئے ہماری گورنمنٹ نے نو سو ارب روپیہ پاس کر دیا ہے" تو آپ کے قریب بیٹھے ہوئے دو چار اصحاب میں سے ایک آدھ ضرور بول پڑے گا "اجی ہماری گورنمنٹ تو بیوقوف ہے دیکھئے نہ پانچسالہ پلانوں پر تو پانی کی طرح روپیہ بہا دی ہے مگر عوام کو دو وقت کی روٹی مہیا نہیں کر سکتی" معلوم ہوتا ہے وہ حضرت کھانے کے بعد ہی چائے سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ مگر گیہوں کی طرح

روپئی کا ذکر بغیر ضرور کریں گے۔ اسی اثنا میں کوئی دوسرے صاحب بھی تائید کے طور پر فرمانے لگیں گے "جناب دراصل ہمارے گورنمنٹ کی باگ ڈور ہی کچھ نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ تو پنڈت نہرو تھے جو کسی حد تک ملک کی کشتی سنبھالے ہوئے تھے اندرا گاندھی تو آئے دن نئے نئے ہتھکنڈوں اور حربوں کو اپنا کر حکومت [illegible] سے چپکی رہی آخر کیا حشر ہوا؟ بھلا عورتیں بھی حکومت کر سکتی ہیں؟ جنتا سرکار کا تختہ بھی کچھ ہی دنوں میں الٹنے والا ہے" اسی طرح کچھ بعد دیگرے ہر شخص اس موضوع پر اپنے بیش قیمت خیالات کا اظہار ضرور کرے گا اور ریستوران میں ایک کبھی نہ ہونے والی بے مقصد گفتگو چھڑ جائیگی۔ جیسے سیاستدانوں کی کوئی کانفرنس ہو رہی ہو ویسے ان لوگوں میں کوئی بھی ایسا شخص نہ ہو گا جسے سیاست سے دور کا بھی واسطہ ہو۔

اسی طرح اگر آپ روزمرہ کی گفتگو اور واقعات پر سنجیدگی سے غور فرمائیں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فی زمانہ ہر شخص جہاں ایک ماہر ڈاکٹر اور ایک قابل سیاستدان ہے وہاں ایک اعلیٰ نقاد بھی ہے مثال کے طور پر کسی کالج کی سالانہ تقریب کے موقع پر اگر کوئی شاعر طالب علم اپنی بلند پایہ تخلیق پیش کر رہا ہو تو تقریب میں موجود حضرات میں اردو سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی خود کو بہترین شاعر ظاہر کرنے کی غرض سے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص کو یہ کہہ کر اپنی طرف متوجہ کر ہی لے گا۔ "بس الفاظ کی الٹی سیدھی سی بندش ہے بیچارہ شاعری کے فن سے قطعی ناآشنا ہے" دوسرے صاحب بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے فرمائیں گے "ہاں صاحب! مصرع اولیٰ بے وزن ہے اور مصرع ثانی تو خارج از بحر ہے" اگر کسی تیسرے شخص نے ان دونوں کی گفتگو کو سن لیا تو وہ بھی اپنا راگ الاپنا شروع کر دے گا۔ "ان نوجوانوں نے تو ادب کا ستیاناس کر دیا ہے۔ دو ایک تک بندیاں کر لیں اور اپنے نام کے ساتھ کوئی بے ہودہ سا تخلص [illegible] رنجیدہ، نادیدہ، فہمیدہ، یا سنجیدہ شاعر" اگر ان تینوں حضرات کی اہلیت پر غور کیا جائے تو شاید [illegible]

شخص ایسا ہو جو اُردو میں اپنا نام صحیح لکھ سکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لیکن چند سنے زمانے، بگھنے مٹنانے جملوں کو دہرا کر دوسروں پر اپنی قابلیت اور عظمت کا سکہ جمانا آج کے انسان کی فطرت میں شامل ہے خدا جانے آج ہر شخص اپنی اصلیت سے بڑی بڑی باتیں بنا کر دوسروں کو مرعوب کرنے کی فکر میں کیوں ہر وقت تیار رہتا ہے۔ ہر آدمی دوسروں کو فریب دینے کی فکر میں درحقیقت خود کو فریب دے رہا ہے گویا ایسا کرنا ایک فیشن ہے۔ جو چل نکلا ہے

لیجئے اب فیشن کی بات آگئی تو اس کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ عرض کریں دوں لفظ فیشن میں بڑی کشش اور خاصی وسعت ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی موضوع پر گفتگو کر رہے ہوں۔ اس میں لفظ فیشن بہ آسانی فٹ کیا جا سکتا ہے ایسا کرنے سے آپکی بات اگر زیادہ پُر اثر نہ ہوگی تو اس کی اہمیت میں کسی طرح کی کمی بھی واقع نہ ہوگی آج کل یہ لفظ اس قدر بکثرت سے مستعمل ہے کہ اپنے حقیقی معنی تک کھو چکا ہے آج کسی درزی سے گاہکوں کی قمیص کے کالر اگر کافی لمبے ہو جائیں تو وہ انھیں کاٹ کر ٹھیک کرنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اسی صورت میں پہننے دیتا ہے اور گاہک سے کہتا ہے کہ میں نے آپکی قمیص کے ڈبل کالر بنا دئیے ہیں یہ جدید فیشن ہے۔ اگر کسی کے پتلون میں گھٹنوں کی چوڑائی کم اور پائنچوں کی چوڑائی حد سے تجاوز کر جائے تو کہتا ہے کہ یہ فیشن ہے بیل باٹم کہا جاتا ہے حضور، حالانکہ یہ جدید فیشن کے کپڑوں کو پہنکر بھلا چنگا آدمی بھی جوکر معلوم ہوتا ہے۔ کالج کی نوجوان لڑکیاں فیشن کی دلدادہ ہیں وہ چھوٹے دار جاکٹوں میں [illegible] عریاں لباس پہنتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ جدید فیشن کے لباس پہن کر وہ زیادہ جاذب نظر اور خوبصورت نظر آتی ہیں کہ لوگوں کی نظریں ان پر جم کر رہ جاتی ہیں لیکن حقیقتاً اپنی نیم برہنگی کے باعث وہ راہگیروں کے لئے تماشا بنی ہوتی ہیں غرضیکہ زندگی کا ہر شعبہ آج کل کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک نئے فیشن کا حامل بن گیا ہے۔ مختصر یوں سمجھئے کہ آج اگر آدمی دنیا کے کسی کام کو ٹھیک ڈھنگ سے انجام نہ دے کر الٹا سیدھا یا غلط طریقے سے سرانجام دیتا ہے تو وہ فیشن کہلاتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آج کا انسان بد اخلاقی کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے قدیم زمانہ کے لباس گو درحقیقت نیا سوال ہے کم عریاں نہ تھے مثلاً سڑک کے کنارے بیٹھ کر روڑی کوٹنے والی عورتوں کے لباس پر نظر ڈالیے یا خانہ بدوش بنجارنوں کو دیکھئے جو شہر شہر گاؤں گاؤں میں چند روزہ پڑاؤ ڈال کر پتھر وغیرہ کی خانگی استعمال کی اشیاء بنا کر اور انھیں فروخت کر کے ساری زندگی گزار دیتی ہیں۔ روڑی کوٹنے والی عورتوں اور بنجارنوں کا لباس قدیم لباس ہے کسی کی پیٹھ ننگی ہوتی ہے تو کسی کا پیٹ برہنہ۔ گھاگھرے اسقدر اونچے پہنتی ہیں کہ ٹانگوں کا بیشتر حصہ عریاں رہتا ہے البتہ اپنی چھاتیوں کو ضرور ڈھک کر رکھتی ہیں مگر لوگوں کی نگاہیں ان کی جانب نہیں اٹھتیں ان کی دو خاص وجوہات ہیں اول تو وہ غریب ہونے کے باعث کچھ صاف ستھری نہیں رہ پاتیں دوسرا کڑکتی دھوپ، آندھی، طوفان برسات غرضیکہ ہر موسم میں سخت محنت مشقت کرتے رہنے سے ان کا رنگ زیادہ کالا ہو جاتا ہے اسی لئے یہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز کم بنتی ہیں۔ لوگوں کی نظریں ان کی ننگی پیٹھ ننگی باہوں، ننگے پیٹ اور ننگی ٹانگوں کی جانب کم اٹھتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس کسی کالج کی لڑکی کو اگر محض بغیر آستین کا جمپر پہنے ہی دیکھ لیں تو حریصانہ نظروں سے اس کی ننگی پتلی گوری یا کالی باہوں کو لوگ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں جب تک وہ لڑکی حدود نظر سے نہاں نہیں ہو جاتی پچھلے زمانے میں عورتیں یقیناً بہت زیادہ عریاں لباس پہنتی تھیں اور بہت تندرست، تنومند اور زیادہ خوبصورت و جاذب نظر ہوتی تھیں مگر اس وقت کے لوگوں کی نظریں لچر کی نہ تھیں وہ بہت اخلاق مند تھے ان میں بناوٹ اور تصنع نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ سادگی پسند تھے اور اسی لئے وہ لوگ حکمی نہ تھے خوشحال تھے ان کی زندگی پُر سکون تھی وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھے اور اس کے برعکس آج ہر شخص اپنی زندگی سے بیزار ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں کوئی بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہے ۔۔۔۔!

● ● ●

قطعہ

ڈاکٹر اودے سری آرتان۔ بلاری

صبا آئے ہوئے معلوم ہو جاتی ہے مالی کو
اسے گلچیں کے آنے کی خبر کیسے نہیں ہوتی ہے
غلط کیا ہے جو ہم مشکوک ہے بریں انکی حفاظت پر
حفاظت نام ہے جس کا کبھی ایسے نہیں ہوتی

اُردو شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور جو لوگ شعر و ادب سے ذرا سا بھی لگاؤ یا دلچسپی رکھتے ہیں یا مطالعہ کے عادی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو کیا ہے اور اُردو زبان میں کی جانے والی شاعری کا انسانی زندگی اور سماج اور سیاست سے کس قدر گہرا تعلق ہے!

آج کچھ تنگ نظر اور تنگ ذہن لوگوں کا خیال اور نظریہ یہ ہو گیا ہے کہ "اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے" "یا غیر ملکی بھاشا ہے" اور اس زبان میں ہونے والی شاعری بجز عشق و عاشقی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر ان حضرات کا یہ خیال ریت کی دیوار اور پانی کے بلبلے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

آئیے پہلے تو آپ کا تعارف اُردو کے رشتہ داروں سے کرا دوں اُردو بہر حال "ایک بھارتی زبان ہے" "شورسینی کی پر پوتی، مغربی ہندی کی پوتی، دِلّی بھاشا کی بیٹی اور فارسی ہندی کے میل ملاپ سے عالم وجود میں آئی ہے۔ گویا اس کی جڑیں تمام ہندی ہیں۔ اردو کو بدیسی زبان سمجھنا یا کہنا گویا اپنے جسم کے کسی حصے سے انکار کرنا ہے۔ اُردو زبان میں جب شاعری شروع ہوئی تو اس وقت ہندی اصولوں پر ہی اس کی بنیاد رکھی گئی۔ اور "چھند" "پنگل" نیز "دوہا" کی بحریں خوب استعمال کی گئیں لہذا اُردو کے پرانے شعراء کا کلام زیادہ تر انہی بحروں میں پایا جاتا ہے بعض بحریں تو آج تک برتی جاتی ہیں۔ مثلاً

"بحرِ رمل" اسے ہندی میں "ہری گیت چھند" کہتے ہیں۔

"بحرِ متدارک" اسے ہندی میں "ترہبنگہ" کہتے ہیں۔

"بحرِ متقارب" اسے ہندی میں "بھجنگ پریات" کہتے ہیں

"بحرِ سریع" اسے ہندی میں "چوپائی" کہتے ہیں۔

اور اُردو میں یہ بحریں کافی مقبول و مستعمل ہیں۔ یہاں میں ایسے دو بزرگ شعراء کا کلام پیش کرتا ہوں جو اُردو شاعری کے باقاعدہ شروع ہونے سے پہلے گزرے ہیں ان میں سے ایک ہیں پنڈت ... پیارے لال شوقی ہیں جو عہد جہانگیر کے صاحب کمال بزرگ تھے اور دوسرے ہیں پنڈت چندر بھان برہمن، یہ شاہجہاں کے دربار میں میر منشی تھے اب آپ پہلے منشی پیارے لال شوقی کے شعر ملاحظہ کیجئے ؎

جن پیم رس چاکھا نہیں امرت پیا تو کیا ہوا
جن عشق میں سر نا دیا جو جگ جیا تو کیا جیا
مارگ سبھی سب چھوڑ کر دل تن میں خلوت پکڑ
شوقی پیارے لال بن سب سیں ملا تو کیا ہوا

پنڈت چندر بھان برہمن ؎

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا بگیا سیں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

دیکھا آپ نے دونوں خالص عربی بحریں استعمال کی ہیں اور الفاظ خود گواہی دے رہے ہیں کہ وہ اُردو کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں بہر حال یہ بات روزِ روشن کی طرح صاف ہے کہ ہندوستان کے ہندو اہلِ کمال نے عربی اور فارسی عروض کو اپنانے میں ذرا بھی تنگ دلی سے کام نہیں لیا اور علم نوازی کی شان کو خلوصِ دل سے دوبالا کر دیا۔

آج اُردو اور سارے اُردو شاعری کے ہر دلعزیز ہونے کا راز یہی ہے کہ یہاں شاعری کے بنیادی اصولوں سے کوئی الگ نہیں ہے۔ اور ان ہی فنی اصولوں کی پابندی کے سبب اپنے اندر وہ تاثیر اور کشش رکھتی ہے کہ سننے والوں کے دلوں کو مسحور کر دیتی ہے۔

جس طرح روح و بدن کا ازلی رشتہ ہے اسی طرح ہندی اور اُردو کا بھی بہت پرانا تانا بانا اور ایک اٹوٹ سمبندھ ہے جسے آج تک نہ تو کوئی جدا کر سکا ہے اور نہ آئندہ ہی کر سکے گا۔

جس طرح میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اُردو شاعری کی نوک پلک درست کرنے میں صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ ہندو شعراء نے بھی کافی کام کیا ہے اور آج بھی اگر ہم دیکھیں تو متعدد ہندو شعراء اُردو غزل کی آبرو ہیں۔ بلکہ غزل میں تو سر فہرست ان کا نام آتا ہے وہ ہیں پنڈت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری۔ باوجود ہندو

...ہنے کے انھوں نے پچھلے ساٹھ سال سے اُردو ادب ہی کی آبیاری کی
...یہ اضافہ استعمال اُردو عروض کا ہی کیا ہے۔
انھیں کے ساتھ ہی ساتھ کئی مسلمان شعرا بھی ایسے ہیں جنھوں نے ہندی بحریں اپنانے کی کوشش کی ہے۔ آیئے ہیں اُردو شاعری کا ایک ممتاز شاعر جسے ہندی عروض (بحروں میں) میں کیا کیا گُل کاریاں کی ہیں اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس نے صرف ہندی بحریں ہی نہیں اپنائیں بلکہ ہندی ادب کی رُوح کو بھی اپنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو سے

پھولوں کی اِک پژمردہ پتّی گھاس پہ بیٹھے ہانپ رہی ہے
ننھی نویلی ایک کلی شاخوں میں چھپ کر کانپ رہی ہے
دیکھ کے ایک بھکارن کو اک مرد نے آگے ہاتھ بڑھائے
شہزادی زلفیں بکھرا کے اپنا سینہ ڈھانپ رہی ہے

دفن ہے اس مٹی میں وہ دل جس میں عشق کا دعویٰ بھر دکا
اے بجلی بادل سے اُتر کر اس ڈھیری کا بوسہ لے لے
جیتے جی بھی بدقسمت نے اک لمحہ بھی چین نہ پایا
بہتر ہے مر کر بھی اس سے کوئی تُند بگولہ کھیلے

کھیل نہیں ہے عشق کی بازی دل دینا آسان نہیں ہے
نوک پہ تیکھے کی پلتا ہے روئی کا باریک سا دھاگا
کوئی مرے جی میں کہتا ہے یہ تو ہوس ہے عشق نہیں ہے
دیا جلا پروانہ آیا دیا بجھا پروانہ بھاگا

تُند ہوائیں مست گھٹائیں آئیں جائیں دھوم مچائیں
شاخوں پر البیلی چڑیاں چونچ سے چونچ ملا کر گائیں
اے دوشیزہ آنکھیں مل کر رقص کر اور کونین پہ چھا جا
جانے کب یہ دل رُک جائے جانے کب سانسیں تھم جائیں

یہ قطعات ہیں ہند و پاک کے مشہور شاعر احمد ندیم قاسمی کے کیا ان اشعار میں ہندی ادب کی روح رواں دواں محسوس نہیں ہوتی اور کیا ہندی ماتراؤں سے الگ کر کے انھیں عربی عروض میں ڈھالا جا سکتا ہے؟

آیئے اب اُردو کے ایک اور مشہور شاعر کے اشعار کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ انھوں نے ہندی ادب کی روح کو اُردو ادب کے جسم میں داخل کرنے کی کس درجہ کوشش کی ہے! سے

نیم کا بوڑھا پیڑ بھی چپ تھا دیواریں اور فرش بھی چپ
اور میں خاموش سا آدھی رات میں گھر سے نکلا تھا
اس انجانے شہر میں بھی ہم منہ کو چھپاتے پھرتے تھے
گویا اپنے چہرے پہ بھی نام تمہارا لکھا تھا

یادوں کے سہانے موسم میں اس گرم بدن کی آنچ لئے
چل نکلے ہم یوں خوش خوش سے جیسے وہ ادھر تنہا ہی تو ہے
ہر صنفِ سخن کو ہاشمی جی اک طرز نئی دی ہے ہم نے
ہر اک سے الگ ہر اک سے جدا ہر شعر میں عکس اپنا ہی تو ہے

ہم ہیں اسی زبان کے شاعر جس میں میر نے شعر کہے
لیکن کل شاید ہی اس کا کوئی سمجھنے والا ملے

دُنیا کے اسرار و رموز کی ایک سے ایک گرہ کھولوں
بیٹھ کے دل کے آنگن میں جب تنہائی سے بات کروں
سدا سہاگن رہے ترا یہ روپ جوانی کا سنگھار
آ اے دھرتی اپنے لہو سے آج میں تیری مانگ بھر دوں

یہ اشعار ہیں شکر دت کمار ہاشمی کے۔ یہ وہ نمونہ تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اُردو شاعر کس کس طرح ہندی بحروں کو اپنا رہے ہیں اور یہ رشتہ جو ان کی پیدائش کے وقت ہوا تھا آج بھی قائم ہے۔
آخر میں ہمارے ملک کے عظیم رہنما آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی فرمان شدہ چند سطور بھی ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ لگایئے کہ موصوف اُردو زبان کو کس قدر پسند فرماتے تھے اور زبان کو ترقی دینے کے سلسلے میں کیسے پاکیزہ خیالات رکھتے تھے۔
"اُردو بھارت اور دوسرے ملکوں کے درمیان رسم الخط اور زبان کی وجہ سے تعلق کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر کوئی وسطی ایشیا میں جائے اور اسے اُردو آتی ہو تو وہ اپنا کام وہاں چلا سکتا ہے۔ ہندی کا ایک مقام طے ہو چکا ہے لیکن ہمارے ہندی کے کچھ دوست

اُردو سے اب بھی خائف ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُردو ان کی دشمن ہے ... ہندی سے ترقی نہیں کر سکیگی۔ اس لئے کہ اُردو ایک کونے میں گھس بیٹھی ہے۔ اُردو کو ملک کی دولت بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ ہمارے یہ دوست بعض اوقات اُردو کے وجود سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ میں ان سے کہوں گا کہ وہ اُردو کو اس طرح گرا کر ہندی کو ترقی نہیں دے سکتے!"

یہ وہ الفاظ تھے جو ہمارے ملک کے ایک عظیم ترین رہنما کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ مگر افسوس کہ تنگ ذہنوں پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ جبکہ اُردو ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی نمائندہ ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل ملاپ سے عالم وجود میں آئی اور ملک کے مختلف سیاسی۔ سماجی۔ اخلاقی۔ مذہبی رجحانات کی آئینہ دار بنی ہر طبقہ اور خیال کے لوگوں نے اس کی نشو و نما میں حصہ لیا اور اس کے دامن کو تخیل کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال کیا۔

آخر میں پاکستان کے ایک مشہور شاعر ریاض مجید کی غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے

کون میرا ہو بجنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں

میرا دکھ یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

جرم کرتا ہے کوئی اور شرم آتی ہے مجھے
یہ سزا کیسی ہے میں کس عرصۂ محشر میں ہوں

دیکھتے ہیں سب مگر کوئی مجھے پڑھتا نہیں
اگلے وقتوں کی عبارت ہوں عجائب گھر میں ہوں

مندرجہ بالا اشعار بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہندی اور اُردو کسی طرح جدا نہیں ہیں۔ یہ دونوں زبانیں شروع سے ساتھ رہی ہیں۔ ساتھ پلی ہیں۔ اور ساتھ ہی پروان چڑھی ہیں تو اب کیسے جدا ہو سکتی ہیں۔

غزل

ڈاکٹر ستیہ پال [illegible] گفتہ [illegible]

اسیرِ دامِ صبح و شام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
اِک اِک شے بستۂ انجام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ازل سے عشق ہی بدنام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
وفا ہی مَوردِ الزام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ہمارا دل تمہارے پیار کے جذبے سے خالی ہے؟
تمہیں ایسا خیالِ خام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
جہاں میں اور بھی ہیں کامگارِ جذبۂ اُلفت
مگر ہر سو ہمارا نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

جسے بھی دیکھئے اس کے جگر پر داغِ حسرت ہے
محبت کا یہی انعام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
سرِ میخانہ اگر یہی وہی ہے کیفیت غم کی
یہاں بھی گردشِ ایام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

وفادارانِ اُلفت سے بہانے کس لئے آخر؟
ترے وعدوں میں صبح و شام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
تمہاری کاکلِ پُرپیچ یوں تو جان لیوا ہے
جو حلقہ ہے بہ شکلِ دام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

وطن کے رہنماؤ! آپ کے عہدِ قیادت میں
وطن میں بھوک سے کہرام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
یونہی بیٹھے بٹھائے کیا کہیں کیوں اشک بہ نکلے
لبوں پر پھر کسی کا نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

وہ لمحہ جب تخیّل میں غزل تخلیق ہوتی ہے
وہ لمحہ درد کا ہنگام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
خدا کے نام سے کیوں جھرجھری آتی ہے انساں کو
گناہوں کو صلائے عام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

جہاں میں پاسِ ایمان و عمل ہی آدمیت ہے
مگر یہ شے برائے نام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
ہوس نے نام اپنا اور ہی کچھ رکھ لیا ہے
محبت ان دنوں بدنام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ہماری زیست امرت ہو کے بھی امرت نہیں گفتہ
فقط سقراط ہی کا جام کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

جناب ساقی سکرودہوی خلد آشیاں کے خطوط اپنے دوستوں اور عقیدتمندوں کے نام

جناب ساقی سکرودہوی خلد آشیاں نے اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کو جو خطوط لکھے۔ اُن کا ایک حصہ ماہنامہ شانِ ہند دہلی میں پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔

اب کچھ اور خطوط ناظرینِ شانِ ہند کی نذر کئے جا رہے ہیں ساقی مرحوم کے اندازِ بیان کی جتنی بھی سراہنا کی جائے۔ تھوڑی ہے۔ ایک ایسے دورِ افتادہ گاؤں میں جس میں علم و ادب کی روشنی قریب قریب معدوم ہے۔ زندگی گذار نیوالا ایسے نادر و بے بہا پُر خلوص اندازِ بیان لئے ہوئے خطوط لکھے۔ تو اسے قدرت کی دین کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

(کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے)

(راؤ لونذ علیخان ایڈوکیٹ لوہارو پٹی)

مولوی شریعت احمد صاحب کے نام

محترم المقام ...... سلام اخلاص

سالِ نو مبارک۔ اور ایک ہدیۂ عقیدت

مقامِ خیر الانام کیا ہے سمجھ چکا ہوں سمجھ رہا ہوں
درود کیا ہے سلام کیا ہے سمجھ چکا ہوں سمجھ رہا ہوں
یہ مدرسے یہ یتیم خانے یہ خانقاہیں یہ بارگاہیں
حلال کیا ہے حرام کیا ہے سمجھ چکا ہوں سمجھ رہا ہوں
طریقِ یارانِ دلفگار، سلوکِ خلوصِ احباب جانثاران
کتابِ سنت کا نام کیا ہے سمجھ چکا ہوں سمجھ رہا ہوں

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

دعاؤں کا طالب ساقی سکرودہوی

سکرودہ (سہارنپور) یکم جنوری ۱۹۷۶ء

ڈاکٹر سید جمیل حسین صاحب دیوبندی کے نام

رفیقِ محترم ——— السلام علیکم ... مزاجِ گرامی

غالب تو اپنے محبوب کو اپنے شکستہ گھر میں دیکھ کر متحیر بھی تھے اور شکرگزار بھی خود اُن کے بقول

(کبھی ہم اُن کو کبھی ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں)

مگر میری کیفیت یہ ہے۔ کبھی آپ کا خط پڑھتا ہوں۔ کبھی اپنی طرف دیکھتا ہوں۔ یہ آنکھوں پہ یقین آتا ہے نہ اپنی ذات پہ۔ کیا واقعی یہ خط مجھے ہی لکھا گیا ہے۔ کیا درحقیقت میں ان عنایات و نوازشات کا اہل ہوں

ساقی کہاں کہاں یہ کرم ہائے بے پناہ
ذرے کو آفتاب بنانا پڑا تمہیں

میرے محسن میں نے مرزا بہزاد بیگ کے خط کے جواب میں جو کچھ لکھا تھا اس سے میرا منشا اپنے جرم کی پردہ پوشی یا اظہارِ شکایت ہرگز نہ تھا بلکہ حقیقت کی وضاحت مقصود تھی۔ وہ بھی اس خیال کے پیشِ نظر کہ مبادا میرے کرمفرما میری فرو گذاشت کو غرور نیت یا بیجا خود پرستی نہ سمجھ لیں۔ آپ کے خط سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے اسے اظہارِ شکایت سمجھا۔

ہو سکتا ہے کہ میرے الفاظ نے میرے خیالات کا ساتھ نہ دیا ہو۔ اور میں اپنا ما فی الضمیر سمجھانے سے قاصر رہا ہوں۔ ساقی کے الفاظ میں یہ بھی ممکن ہے:

انتہا تھی کوئی گلہ تو نہ تھا + گفتگو رُخ بدل گئی۔ ہو گی

میرے محترم۔ میری زندگی تو زمانے کے عروج و زوال کی ایک مکمل داستان ہے۔ امارت سے غربت تک۔ عزت سے ذلت تک شوکت سے فنا تک۔ نہ جانے کتنی بار لایا لیجایا گیا ہوں۔ مگر میرے بے رحم آئینہ کی طرح کائنات کو ہر پہلو بدل بدل کے دیکھا ہے، چند [illegible] تلخ قطرات میرے ایسے سم کش دریا نوش کو کیا بدمزہ کر سکتے ہیں بلکہ

تمنا ہے کہ ہر قطرہ سمٹ کر جام ہو جائے

انجام [illegible] دشواری [illegible] کو آسان بنا لیا
[illegible] غم جانان بنا لیا

اور بس والسلام

نیازمند ساقی سکروڈہوی

سکروڈہ بسہار نپور ۱۴؍ جولائی ۱۹۷۶ء

● اقبال صابری دیوبندی کے نام ان کے منظوم خط کے جواب میں

عزیز اقبال .... بہت بہت دعائیں

میں ابھی تک سنگین حالات کی گرفت میں ہوں، رستگاری کے لئے دعا فرمایئے۔

تمہارے منظوم شاہکار کا جواب تو ممکن نہیں۔ البتہ جو تاثرات پیدا ہوئے۔ مشتے نمونہ از خروارے پیشِ خدمت ہیں۔ مگر اندیشہ ہے کہ طبعِ نازک پر گراں نہ گذریں۔ پسند و ناپسند سے مطلع فرمائیں۔

جواب کا منتظر ساقی سکروڈہوی

سکروڈہ ۳؍ جنوری ۱۹۷۷ء

میرے حبیب میرے غمگسار میرے رفیق
خدا تجھے خلشِ دل سے بے نیاز کرے
عطا ہو تیرے تخیل کو گوہرِ ادراک
ترے سخن کو حریمِ نوائے راز کرے

فلک عطا بھی تو کرتا ہے خاک زادوں کو ۔۔۔ کلاہِ شہر کو بخشا ہے تاجِ سلطانی
زہے نصیب کہ [illegible] ہو جس کا ۔۔۔ خوشا وہ جس کو میسر ہو تیری مہمانی

مگر عزیز گرامی بیا احتیاط رہے ۔۔۔ کہ میری خستہ دمی پر گراں ہے شانِ غرور
خراجِ مہر و محبت متاعِ عجز و نیاز ۔۔۔ مرا شعار مری بندگی مرا دستور

مرا طریق نہیں آمرانہ خوشنودی ۔۔۔ مری بلا سے نہیں ملتفت جو پیرِ مغاں
مجھے عزیز ہے اپنا شعارِ فکر و عمل ۔۔۔ مرا جنونِ خودی ماورائے سود و زیاں

جو کاٹ سکیگی مجھے کیا فنا کی شمشیر ہے ۔۔۔ یہ خاک پیرِ مغاں [illegible] ہے بہار بدوست
تجھے پتا نہ کہ تو خانہ زادِ عشرت ہے ۔۔۔ مجھے یہ فخر کہ خانہ خراب ہوں بدوست

خلافِ وضع جو ساقی یہ تیرا طرزِ سخن ۔۔۔ کمالِ نخوتِ احباب ایں چہ بوالعجبیست
گدا نہ ناتہ تجھے ہدیۂ سلام و نیاز ۔۔۔ حضورِ حسن شکایت کمالِ بے ادبیست

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

تمہارا اپنا ساقی سکروڈہوی

● مولوی شریف احمد صاحب کے نام

کرم فرمائے بندہ .... سلام مسنون

آپ کے ہفتہ وار پند و نصائح بجا و درست۔ ان کی افادیت مسلّم۔ لیکن مجھے تامل ہے کیوں۔ اس لئے کہ.....

سلامت جد یہ ذوقِ پرستش ہے تو کیا غم ہے
محبت میں کسی کی برہمی سے کچھ نہیں بنتا

بولے مولوی ... جو وہ چاہے تو سب دشواریاں آسان ہو جائیں
نہ چاہے وہ تو اس نوحہ گری سے کچھ نہیں

علامہ اقبال مرحوم کی سی جرأت کوئی کہاں سے لائے۔ جو یوں کہے

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

ہم تو اس سے یا التجا کرتے ہیں

مرے دستِ طلب کو جرأتِ گستاخ دے یا رب
یہاں دستِ طلب کی عاجزی سے کچھ نہیں بنتا

اور جناب چلتے چلتے ایک بات اور عرض کیجئے۔

زبان بندی ہی تسلیم و رضا کی شرط ہے واعظ
تو جبرِ قضا و قدر کی۔ تفسیر۔ کیا ہوگی

اور بس۔ والسلام —— خیر طلب۔ ساقی سکروڈ:

سکروڈہ۔ سہارنپور۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء

● چودھری رحمت علی صاحب حیدر آباد کے نام

مجبی —— درازئ عمر و ترقئ درجات

تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

محبت بھرا خط ملا۔ پڑھا اور بار بار پڑھا۔ مگر دل کو کسی طرح یقین نہیں آیا۔ بے اختیار طالب باغپتی کے اشعار زبان پر آگئے۔

کس کس طرح خیال میں لانا پڑا مجھے
تم بھی ہو بیقرار جتا نا پڑا مجھے

چھپ چھپ کے اشکِ ناز بہانا بھی آگیا ۔۔۔ یہ راز عشق یہ راز بتانا پڑا مجھے

یہ عاجز بدنصیب اس قابل کہاں کہ مجھے کوئی یاد کرے۔ بقول ظفر

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

رفع ہو جاتی ہے۔
امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو گا۔　　　والسلام

نیاز مند　　ساقی سکروڈھوی
سکروڈہ ۔ سہارنپور

جنگل میں راستہ

بقیہ صلا سے

لیکن آپ کے اندازِ گفتگو سے تو یہ پابندی آپ پر عائد ہوتی نہیں دکھائی دیتی۔

کیوں کیا میں نے کوئی زیادہ ہی بے تکلفی کا اظہار کیا ہے۔

نہیں نہیں۔ بس معلوم نہیں۔ آپ کی بے تکلفی دوسرے کو سمجھ لینے کا اور پُر خلوص انداز۔ میرا یہ مطلب تھا۔ آپ کو یہ طبقاتی سوال نہیں اٹھانا چاہئے۔

بس یہی تو کمزوری ہے کہ میں دوسرے کی شخصیت سے متاثر ہو جاتی ہوں۔ اور پھر جب تنہا ہوتی ہوں تب تو خود کو اپنے اصلی مقام پر لے آتی ہوں۔

لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کی شخصیت بھی دوسروں کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ مجھ سے اپنے آپ کو اپنے اصلی مقام پر لایا نہیں جا رہا۔"

ارے میری بچی! مجھے اس کے لئے دوائی بھی تو لینا تھی تم یہ سب کلینک سے پہلے دوائی ہی لے لوں۔ میں نے ان صاحب کی بات کاٹ ڈالی اور جلدی سے کلینک میں گھس گئی۔

لیڈی ڈاکٹر میرے دل کی دھڑکن جانچ رہی تھی۔ مجھے طاقت کے انجکشن، پھلوں کا استعمال اور ٹانک لکھ کر دے رہی تھی۔ مگر میرے ذہن میں وہی فقرہ گردش کر رہا تھا۔

آپ کی شخصیت بھی تو دوسرے کو متاثر کرتی ہے جب کہ تم ہر شخص کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہو۔ خلوص یا ملنے سے پہلے عورت مرد کی تخصیص بھی کر لیا کرو۔ تمہارا تکلم جو محض تمہاری عادت ہے۔ کبھی کبھی ترغیب بھی بن جاتا ہے۔ یہ وہ جملے کئے فقرے تھے جو برسوں پہلے میں نے کسی سے سنے تھے۔ یہ فقرے میرے تخیل کے صاف شفاف زود نرم سے نج سے تھے۔ میں اس اجنبی انسان کی غلط فہمی کے بارے میں سوچتے ہوئے بڑا دکھ سا محسوس کر رہی تھی۔

اب تو عرصہ ہی گزر گیا تھا۔ کبھی ذہن ماحول کی موزونیت سے متاثر ہوتا تو میں سوچتی وہ شخص اتنا تنہا سا کیوں لگتا تھا۔ وہ سایہ کے پیچھے کیوں لپک رہا تھا۔ اس کی بیوی اور پھر تین بچے۔ مگر اس کے چہرے پر باپ کی شفقت کی کوئی کرن کیوں نہ پھوٹتی تھی۔ وہ نگاہیں میں اداسی اور ڈوبا ہوا حزن اور میں اس خیال کو جھٹک دیتی۔

پھر ایک دن عامرہ اور گل رُخ نے ضد کی کہ انھیں نئے کھلونے چاہئیں۔ اور ننھی شہلا بغیر انتظار کئے مجھے شاپنگ کے موڈ میں کر باہر سڑک پر جا کھڑی ہوئی۔ میں تینوں کے ساتھ تو لدی پھندی شہر کے بڑے بازار میں جا پہنچی۔ اور مختلف دکانوں سے کپڑے فراک اور جوتے وغیرہ خریدکر جب ہم ٹیکسی پکڑنے کے لئے ایک مخصوص جگہ پر کھڑے تھے کہ میں نے ان صاحب کو بے دھیانی میں جاتے ہوئے دیکھا۔ جانے مجھے کیا خیال آیا۔ میں نے نوکر کو دوڑایا کہ صاحب کو بلا لائے نوکر نے جب انھیں راستے میں پکڑ کر میری طرف اشارہ کیا۔ تو وہ بھاگے سے آ گئے اور میرے ساتھ تینوں بچیوں کو دیکھ کر اور چوتھے کے وجود کو محسوس کر کے ٹھٹھک کر رہ گئے۔

یہ ہیں میری بچیاں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان کے چہرے پر دھواں سا تیر گیا اور وہ ساکت ہو گئے۔

کیوں کیا بات ہے۔ آپ اس طرح حیران کیوں ہو گئے۔

میں گھبرا گئی۔

تو سچ مچ آپ کی تین بیٹیاں تھیں۔ وہ مردہ سی آواز میں بولے۔

کیوں۔ میں نے کوئی جھوٹ بولا تھا۔ میں نے کچھ دُکھ سے کہا۔

جی نہیں آپ نے نہیں۔ میں نے جھوٹ کہا تھا کہ میرے تین بچے ہیں۔

انھوں نے نگاہیں نیچی کئے کئے کہا۔ میں سمجھی آپ مجھے بنا رہی ہیں اور وہ چپ ہو گئے۔

تو کیا آپ کی شادی — میں نے ان کی عمر کا شاید بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔

میرے اس ادھورے سوال کا جواب وہی اداس بھوری گہری گہری نگاہیں تھیں۔ جو اس روز کے بعد پھر کبھی نظر نہیں آئیں۔

راجو تی

●●●

دیوالی کا پیغام

توصیف علوی عاصی بی اے کیرانوی

نہیں بنتی ہیں تقدیریں کبھی رنگیں خیالوں سے
نہیں کھلتا ہوا دیکھا کوئی عقدہ سوالوں سے
کبھی بجھتی نہیں ہے تشنگی خالی پیالوں سے
ہمیشہ زندگی نکھری ہے انساں کے کمالوں سے
ذرا آؤ بدل ڈالیں اندھیروں کو اجالوں سے

زمانے کو محبت کے نئے کردار دینے ہیں
بیابانوں کو دنیا کے نئے گلزار دینے ہیں
دھندلکوں کو صداقت کے نئے انوار دینے ہیں
نئی تاریخ دیتی ہے ہمیں زندہ مثالوں سے
ذرا آؤ بدل ڈالیں اندھیروں کو اجالوں سے

بہاروں سے بدل دیں آؤ دنیا کی خزاؤں کو
دکھا دیں ہم نئی سمتیں زمانے کی ہواؤں کو
بنا دیں آؤ ہم پرکیف عالم کی فضاؤں کو
چمن زار جہاں کو زینتیں دیں نونہالوں سے
ذرا آؤ بدل ڈالیں اندھیروں کو اجالوں سے

بدلنی ہے بہرصورت نگاہ ساقئ دوراں
سجانی ہے نئے جام و سبو سے محفل رنداں
ہمیں لبریز کر دینا ہے ہر اک ساغر ارماں
پلانی ہے مئے الفت خلوص دل کے پیالوں سے
ذرا آؤ بدل ڈالیں اندھیروں کو اجالوں سے

محبت کے چراغوں سے ہر اک محفل سجانی ہے
دلوں سے تیرگی بغض و عداوت کی مٹانی ہے
زمانے کو کہانی ربط باہم کی سنانی ہے
جہاں رنگیں بنانا ہے ہمیں رنگیں جیالوں سے
ذرا آؤ بدل ڈالیں اندھیروں کو اجالوں سے

ستاروں سے بدلنے ہیں، ہمیں داغ جگر اپنے
جہاں والوں کو دینے ہیں نئے فکر و نظر اپنے
بنانے ہیں ہمیں روشن خود ہی شام و سحر اپنے
ہر اک منزل سجانی ہے ہمیں پاؤں کے چھالوں سے
ذرا آؤ بدل ڈالیں اندھیروں کو اجالوں سے

اخوت کے چراغوں سے جہاں کو روشنی دیدو
بہت غمگین ہے دنیا اسے آسودگی دیدو
دل انساں کو اس دھرتی میں تابندگی دیدو
نیا عالم بنا ڈالو نئے روشن خیالوں سے
ذرا آؤ بدل ڈالیں اندھیروں کو اجالوں سے

۱۔ یہ ہندوستان

10/- روپے

اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی، معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے اور انھیں بڑے دلچسپ انداز میں بتایا گیا ہے کہ اس ملک کی دنیا میں کیا اہمیت ہے۔ عمدہ کتابت و طباعت اور رنگین تصاویر سے مزین یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ضرور پڑھنا چاہیئے۔

۲۔ جواہر لال نہرو کی کہانی، تصویروں کی زبانی

3/50 روپے

محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کیلئے ایک عمدہ تحفہ۔

۳۔ پہیلیاں

8/00 روپے

(پانچ سو سے زائد دلچسپ پہیلیاں)

انگریزی اور دیگر بھارتی زبانوں کی کتابیں بھی دستیاب ہیں۔

محصول ڈاک ہمارے ذمے۔

دس روپے یا اس سے زیادہ قیمت کی کتابیں بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک یا بذریعہ وی۔ پی بھیجی جائیں گی۔

اپنا آرڈر درج ذیل پتے پر بھیجئے:

۱۔ بزنس منیجر، سیلز ایمپوریم، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی 110001

۲۔ بزنس منیجر، سیلز ایمپوریم، پبلیکیشنز ڈویژن، سپر بازار، دوسری منزل، کناٹ پلیس، نئی دہلی 110001

DAVP 79/261

سرور تونسو

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ
چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسیلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گ
گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے گھر میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود
کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا
ہیں اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے قیمت چھ روپے ـــ شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹر

آپ ہیں سردار گوپال سنگھ واحد، پنجاب کی ایک نامور ادب دوست اور اردو پرست شخصیت جو ستاون سال کی عمر میں آج بھی اپنے نام کی مناسبت سے بدستور واحد ہیں۔ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا اردو صحافت، اردو ادب اور اردو شاعری سے دلچسپی رہی ہندوستان کے مشہور صحافی سردار دیوان سنگھ مفتون، راقم الحروف اور واحد صاحب کے مشترکہ دوستوں میں سے تھے۔ واحد صاحب جب بھی موگا سے دہلی آتے تو حسب معمول مفتون صاحب کے ہاں ضرور آتے۔ جہاں گھنٹوں پنجاب کی سیاست اور دیگر ادبی معاملات پر گفتگو رہتی۔ راقم الحروف سے دوستانہ مراسم بھی تبھی سے قائم ہیں۔ گو مفتون صاحب ۲۶ جنوری ۷۵ء کو رحلت فرما گئے۔ مگر واحد صاحب جب بھی اپنے کاروباری سلسلے میں چنڈی گڑھ یا موگا سے دہلی تشریف لاتے ہیں تو اپنے معمول کے مطابق ایڈیٹر شانِ ہند کی مزاج پرسی کیلئے بھی دفتر شانِ ہند میں تشریف لاتے ہیں خدا نے انھیں کاروباری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے والہانہ لگاؤ بھی عطا فرمایا ہے۔

گزشتہ دنوں ان کے استادِ محترم ابو الفضل خواجہ محمد لطیف انصاری سابق پروفیسر ڈی۔ ایم۔ کالج موگا، بعمر ۹۴ سال ڈسکہ ضلع سیالکوٹ پاکستان میں انتقال فرما گئے۔ ان کے چہلم میں شرکت کیلئے واحد صاحب ۱۵ ستمبر کو لاہور اور ڈسکہ تشریف لے گئے تھے۔

خواجہ محمد لطیف انصاری صاحب قریباً ۱۵، ادبی کتابوں کے مصنف تھے اور انھوں نے ایک درجن سے زائد درسی کتابیں ترتیب دیں۔ مخزن جواہر فارسی جلد اول اور دوم ایسی مشہور فارسی گرامر کے آپ ہی مصنف تھے۔ خواجہ صاحب متحدہ ہندوستان میں ایک مشہور عالم دین تھے اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جنرل سکریٹری رہے۔ موگا میونسپلٹی کے سالہا سال نامزد ممبر رہے۔ مشہور ماہر چشم ڈاکٹر متھرا داس صاحب کے رفیق اور ان کے کالج میں چوتھائی صدی تک اردو فارسی کے پروفیسر رہے۔ مشہور مزاح نگار جناب کنہیا لال کپور اور واحد صاحب خواجہ صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ سردار صاحب کا فرمان ہے کہ چند گھنٹوں میں سفارتخانۂ پاکستان سے ویزا کے مراحل طے پا جانا جہاں پاکستانی سفارتخانہ کے کارکنان کی انسان دوستی کا اعلیٰ ترین ثبوت ہے وہاں اسے خواجہ صاحب کی روحانی سرپرستی کا بھی کرشمہ کہا جا سکتا ہے۔

سردار گوپال سنگھ واحد کے قیام ڈسکہ (پاکستان) کے دوران پاکستان کے موقر ہفت روزہ "لاہور" کے مراسلہ نگار نے ان سے جو باتیں کیں اسکی روداد ہفتہ وار لاہور کے شکریہ کیساتھ شانِ ہند میں شائع کی جا رہی ہے۔ جو زمانہ جو گی نہ کہ "سفیر انسانیت" کے عنوان سے ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

سرور تونسوی

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴۶/۵ — رجسٹرڈ نمبر ڈی۔ ۳۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے قیام مجھکو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

زرِ سالانہ - پندرہ روپیہ
فی پرچہ - ڈیڑھ روپیہ

جلد نمبر ۴۴ — نومبر سنہ ۱۹۷۹ء — شمارہ نمبر ۱۱

آپ کے نام ---------- اشد ضروری پیغام

گزشتہ ایک سال میں کاغذ دوگنی قیمت تک گراں ہو چکا ہے۔ اور اب گرانی کے ساتھ ساتھ کم یابی بلکہ نایابی کا مرحلہ آگیا ہے۔ آنے والے الیکشن میں کئی لاکھ ٹن کاغذ صرف ہوگا چنانچہ گرانی اور نایابی کا اور بھی بول بالا ہوگا۔ یہ صورتِ حال رسائل و جرائد کے لئے صبر آزما ہے کوئی ماہنامہ ۳۲ صفحات سے کم شائع ہو تو سرکاری اشتہارات اس کیلئے شجرِ ممنوعہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ قیمت بڑھائی جائے تو عوام کی قوتِ خرید اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اگر اشاعت بند کر دی جائے تو اس کے لئے دل نہیں مانتا کہ جس ماہنامے کی آبیاری میں چالیس سال کا طویل عرصہ گزار دیا۔ اسے اب بند کس دل سے کیا جائے۔ اشتہارات کے حصول کے لئے کسی رسالے یا اخبار کا کثیر الاشاعت ہونا ضروری ہے اور اس کثیر اشاعت کی باقاعدہ تصدیق اے۔ بی۔ سی ادارہ نے کی ہو۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اردو رسائل کی کثیر تعداد کثیر الاشاعت ہونے کے قابل ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر اردو ادیب اور شاعر جسے اپنے نام کے ہجے بھی صحیح طور پر نہیں آتے وہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسے رسالہ اعزازی طور پر بھجوایا جائے۔ اور یہ حضرات اردو رسالہ خرید کر پڑھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں (یہ دوسری بات ہے کہ یہ خریدنے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے)

اس میں کوئی شک نہیں کہ شانِ ہند ایک مخصوص حلقے میں پسند کیا جاتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شانِ ہند کے ایسے بھی سرپرست ہیں جو گزشتہ تیس اور پینتیس سالوں سے مستقل خریدار ہیں۔ مگر اب یہ انتہائی ضروری ہے کہ ایک تو شانِ ہند کے ایک ہزار نئے مستقل خریدار بنائے جائیں۔ اور دوسرے اس کیلئے اشتہارات کی فراہمی کیلئے دلچسپی لی جائے۔ لہٰذا اس سلسلے میں عملی قدم اٹھانے جا رہا ہوں میں خود اس سلسلے میں بمبئی نومبر کے وسط میں جا رہا ہوں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے حلقۂ احباب میں شانِ ہند کے مستقل خریدار بنائیے۔ اس ضمن میں میں ذاتی طور پر جناب ڈاکٹر اودے سرن ارمان کا ممنونِ احسان ہوں جنہوں نے شانِ ہند کے ۵۱ نئے مستقل خریدار دیئے ہیں۔ اور ان اکیاون نئے خریداروں کا چندہ سالانہ بذریعہ بینک ڈرافٹ بھجوایا ہے۔ اگر ڈاکٹر اودے سرن ارمان کی طرح آپ بھی کوشش فرمائیں تو ایک ہزار نیا مستقل خریدار مہیا ہونا آسان ہو سکتا ہے۔ آپ کے عملی تعاون کا شدت سے منتظر

آپ کا اپنا ... سرور تونسوی

دویا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے چار صفحات خواجہ پریس چتلی قبر جامع مسجد دہلی اور سرورق پائینٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۹ الفغدی مارکیٹ، دریا گنج - نئی دہلی ۲-۰۰۱۱ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد

ہندوستانی مسلمانوں کے نادان دوست

مسلم لیگ نے پاکستان بننے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان کی راہ لی اور یہاں کے مسلمان اپنے بل بوتے پر اپنے قدم پھر سے جمانے میں کوشاں رہے مگر پاکستان بننے سے ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت ذہنی طور پر پریشانی اور سراسیمگی کے باعث ہر دو ملکوں میں قدم جمانے کی کوشش میں رہی اور یہ قدرتی طور پر اپنی جگہ بالکل برحق تھا۔ کیونکہ اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ جس طرح پاکستان کو ہندوؤں سے بالکل خالی کرا لیا گیا تھا ہو سکتا تھا کہ کسی وقت ہندوستان میں بھی ایسی حالت درپیش ہو تو یہ ہندوستانی مسلمان اپنے دوسرے گھر پاکستان جا سکیں اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت نے یہ کیا کہ ایک بھائی یہاں رہا تو دوسرا پاکستان چلا گیا اگر باپ یہاں رہا تو بیٹا وہاں چلا گیا یہاں تک کہ ہمارے مرحوم راشٹرپتی جناب فخر الدین علی احمد کے بھائی بھی پاکستان چلے گئے تھے۔

جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی وفاداری اور ملک پرستی کے جذبات میں وہ مضبوطی نہ رہی جو ایک آزاد ملک کے آزاد شہریوں کی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا نہایت ضروری ہے کہ خال خال ہندوستانی مسلمانوں کے ایسے خاندان بھی ہیں جو اس افراتفری میں پاکستان جانے کے لئے مجبور رہتے مگر بہت جلد انہیں یہ احساس حقیقت ہو گیا کہ اپنا ملک اور اپنا گھر پھر اپنا ملک اپنا گھر ہے اور وہ [illegible] ہی واپس ہندوستان لوٹ آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اس لئے کہ اب ان کے اپنے ذاتی مفاد اب اس ملک کے ساتھ وابستہ ہیں کیونکہ ان کی املاک، کاروبار سب یہیں ہے۔ مثال کے طور پر شمع گروپ کے بانی جناب حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی۔ جنہوں نے پاکستان گئے ہوئے اپنے اہل و عیال کو پھر سے ہندوستان میں بلا کر پہلے سے بھی زیادہ اپنے کاروبار کو ترقی دی اپنی املاک کو بڑھایا اور ایک آزاد ہندوستانی شہری کے طور پر اپنے کنبے کو ہندوستانی معاشرت میں ڈھالا۔ دینی طور پر اللہ کے فضل سے حافظ صاحب کا پورا کنبہ صوم و صلوٰۃ کا پابند اور خالص اسلامی روایات کا ضامن ہے مگر وہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہلوانے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ملک بھر میں اس خاندان کی ایسی عزت و شہرت ہے کہ جو دوسرے مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ حافظ صاحب کے خاندان کے ساتھ ہر مذہب اور ہر فرقہ کے لوگوں کے ایسے مراسم ہیں کہ جس پر ناز کیا جا سکتا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیڈروں کا فقدان رہا اس لئے جس کسی نے بھی مسلمانوں کے حقوق کا نعرہ لگایا وہ وقتی طور پر لیڈر بن گیا۔ سمجھ دار علماء حضرات کانگریس کے ہاتھوں بک گئے انہیں اپنی قوم اور ملک کی بہتری کی نسبت اپنی بہتری کی فکر لگ گئی اور مسلمانوں کو جس نے بھی اپنے پیچھے لگانا چاہا یہ اس کے پیچھے لگ گئے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ کسی بھی لیڈر نے ان مسلمانوں کو یہ نہ بتایا کہ اب تم یہاں رہ رہے ہو یہیں جینا مرنا ہے۔ تمہیں غیر مسلموں کے ساتھ مل کر رہنا ہے ان ہی کے ساتھ مل کر کام کاج کرنا ہے۔ ہندوستانی معاشرت جو کہ صدیوں سے مسلمانوں کے خون میں رچی ہوئی ہے اسی پر چل کر اپنے ملک کو ترقی دینی ہے بلکہ ان مسلمانوں کو یہ سکھایا گیا کہ ہندو اور مسلمان کا رہن سہن الگ ہے۔ ان کی معاشرت الگ ہے۔ ہمارا قومی نظریہ الگ ہے۔ ہمیں اقلیتی حقوق ملنے چاہئیں۔ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار برقرار رکھا جائے۔ مسلم پرسنل لاء میں مداخلت نہ کی جائے۔ یہ نہ کیا جائے وہ نہ کیا جائے۔ حالانکہ یہ سب کچھ ایک اچھے انداز میں خالص ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ان لیڈروں نے اپنے مفاد کی خاطر ہندوستانی مسلمانوں کو غلط راہ پر ڈال کر ایسے دھارے میں بہا دیا ہے کہ قومی یکجہتی۔ ملکی وفاداری۔ ہندو مسلم رواداری سب کچھ اسی دھارے میں بہہ گیا ہے۔ سب سے بڑا نقصان ان مفاد پسند لیڈروں نے مسلمانوں کا یہ کیا ہے کہ ان کے دلوں میں یہ بٹھا دیا ہے کہ تم ہندوستانی کہلانے کو ایک ثانوی سمجھو۔ اور اپنے آپ کو پہلے مسلمان سمجھو اور پھر کچھ اور۔ اور یہ وہ نظریہ ہے جو کسی بھی آزاد شہری کو اپنے ملک اور ملکی مفاد

کے ساتھ وابستہ نہیں رہنے دیتا اور ہر ایسا شخص ذہنی طور پر پسماندہ رہتا ہے۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان جو اپنے آپ کو ذہنی طور پر پریشان سمجھتے ہیں اس کی خاص اور اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کے جذبہ ملک پرستی کا سوتہ خشک کر دیا گیا ہے۔

کسی مسلمان لیڈر نے مسلمان نوجوانوں سے یہ نہیں کہا کہ وہ ہر شعبہ میں ترقی کے لئے محنت کریں اور دوسرے ہم وطنوں کی طرح محنت سے اور میرٹ کے طور پر آگے آئیں۔ بس ان کو سکھایا گیا تو یہ ہے کہ ہریجنوں کی طرح اقلیتی حقوق مانگو۔ سرکاری ملازمتوں میں ۲۰ فیصدی کی تخصیص ہونی چاہئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار برقرار رکھا جائے۔ خاندانی منصوبہ بندی میں حصہ نہ لو اور تجارت اور صنعت کی طرف توجہ نہ دو۔

عام مسلمانوں نے نادان دوستوں کو اپنا نجات دہندہ جانا اور جامع مسجد کے شاہی امام جن کا مذہبی رتبہ بہت بلند ہے آپ کو سیاسی قلابازیوں میں اُلجھا کر رہ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے خطبات جمعہ میں مسلمانوں کو دینی روایات کی پابندی کی تلقین کے ساتھ یہ ہدایات دیتے کہ تجارت اور صنعت کو اپناؤ۔ اور اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش ملک کی ترقی میں حصہ لو۔ زیادہ بچوں کی پیدائش ملک اور خود اپنے ماں باپ کے لئے مصیبت کا باعث ہے۔ سیاسی طور پر اپنے ووٹ ان لوگوں کو دو جو ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ عوام کی ترقی کا بھی خیال رکھیں اور جن کا سیاسی۔ اخلاقی کردار صاف اور بے داغ ہو۔ اس کے برعکس شاہی امام صاحب کبھی اندرا گاندھی کی مدح سرائی کرتے تھے تو کبھی جنتا پارٹی کے نقیب الوزرا بنے۔ کبھی راج نرائن جی سے یاری گانٹھی تو کبھی بہوگنا کے ناک کے بال بنے۔

اگر بات یہیں تک رہتی تو بھی خیر تھی۔ اب مسلمانوں کے نادان دوست ہندوؤں میں بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ جیسے کوئی نومسلم حقیقی مسلمان سے بھی زیادہ تبلیغی ادارہ بن جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے یہ ہندو دوست اور بھی خطرناک ہیں۔ آج کل بہوگنا جی مسلمانوں کے غم میں آنسو بہانے میں بہت تیز رفتاری دکھا رہے ہیں۔ لیکن یہ تو سوچو کہ ان کا اپنا سیاسی کردار کیا رہ گیا ہے۔ جب یہ یو پی کے چیف منسٹر تھے تو انہوں نے مسلمانوں کے لئے کیا کیا صرف یہ کہ اُردو اکاڈمی کی گرانٹ بڑھا دی تاکہ چند دانشوروں کے منہ میں لقمہ تر دے کر ان کی مفت کی واہ واہ حاصل کر لی جائے۔ اس وقت بہوگنا نے اُردو کو یو پی میں دوسری علاقائی زبان کا درجہ کیوں نہ دیا کیا اُس وقت مسلمان اقلیت میں نہیں تھے۔ اُس وقت انھوں نے خود اقلیت نوازی یہ فرمائی کہ اپنی بیٹی کی شادی کا دعوتی رقعہ اُردو میں چھپوا کر مسلمانوں کو بھجوایا۔ اور مسلمانوں نے نعرہ تکبیر لگایا کہ اُردو زندہ ہو گئی ہے۔ انھوں نے اقلیت نوازی کا یہ ثبوت دیا کہ روزہ کشائی میں شرکت فرمائی۔ یا کسی مسلمان کے لڑکے کی شادی میں چند منٹ کے لئے جا کر گلے میں ہار ڈلوا لئے وہ مسلمان جو بہوگنا کو ہندوستان میں مسلمانوں کا محافظ کہتے ہیں۔ وہ اتنا تو بتائیں کہ آج تک بہوگنا نے مسلمانوں کے لئے کیا کیا؟ ہاں سلامت علی مہدی ایسے عیار اور شاطر اخبار نویس کو ضرور نوازا اور سلامت علی مہدی نے بہوگنا کے نام پر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو لوٹا۔

راج نارائن آج کل ــــــ مسلمانوں کے لئے بہوگنا سے بھی زیادہ آنسو بہا رہے ہیں۔ کیا کوئی مسلمان اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کو راج نارائن سے کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یا یہ مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

چند دن ہوئے دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ محمد کویا صاحب کیرل میں وزیر اعلیٰ کیا بنے کہ مسلم لیگ کی باسی کڑھی میں اُبال آ گیا۔ جامع مسجد پر مسلم لیگ کے اجلاس میں جو واہی تباہی بکی گئی ہے کیا اس سے ہندوستانی مسلمانوں کو کچھ مفاد پہنچ سکتا ہے؟ یا مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار پھر سے قائم ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی اور ملک ہوتا تو جس جماعت کے باعث ملک کے ٹکڑے ہوئے اس جماعت کو نہ صرف ممنوع قرار دیا جاتا بلکہ ایسی جماعت کا ممبر ہونا ملک کا غدار ہونا قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ ہندوستان کا سیکولرازم ہے کہ وہی مسلم لیگ ایک صوبہ میں اپنی وزارت بناتی ہے۔ اور وہی مسلم لیگ پھر سے نئے پاکستان بنانے کی بنیاد رکھنے کی تیاری کر رہی ہے۔ اور کئی میر جعفر مسلم لیگ کے ہاتھ مضبوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

مسلمانو! یاد رکھو کہ الیکشن کے باعث تمہارے ووٹ حاصل

کرنیکے لیئے تمہیں طرح طرح کے سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں۔ تمہارا کوئی دوست نہیں ہے۔ نہ بہوگنا۔ نہ راج نرائن نہ شاہی امام اور نہ کوئی اور۔ سب تمہارے ووٹوں کو حاصل کرکے حکومت پر قابض ہونے کے لئے بے قرار ہیں۔ اس لئے تمہارے لئے یہ کہیں بہتر ہے کہ ان نادان دوستوں کی بجائے اپنے دانا دشمنوں کا ساتھ دو۔ کیونکہ ان سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنا الو سیدھا کرنے کے بعد تمہیں انگوٹھا دکھائیں گے۔

اور مسلمانو یہ بھی گرہ میں باندھ لو۔ کہ تم تجارت صنعت اور دیگر کاروبار اختیار کرنے میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا دو اپنے نوجوانوں میں صلاحیت پیدا کرو کہ وہ محنت کریں اور میرٹ کے لحاظ سے ہر کمپیٹیشن میں آگے آئیں۔ ایسی کتنی مثالیں ہیں کہ مسلمان نوجوانوں نے ہر محاذ پر میرٹ کے لحاظ سے اپنا مقام اول درجہ پر پایا۔ ان ہندو اور مسلمان نادان دوستوں کی باتیں سننے سے انکار کردو۔ ان کے بہکنے میں آکر اپنا دماغی اور ذہنی توازن نہ بگاڑو۔ اپنے ہندو ہم سایوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی کوشش کیجئے اور یہ مت بھولئے کہ ہندو پہلے زر پرست ہے اور بعد میں کچھ اور ہے اس لئے ہندو فطری طور پر امن پسند ہے کیونکہ امن نہ ہوگا تو وہ پیسہ کیسے کمائے گا۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ ہندو زر پرستی کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک پرستی۔

[illegible]

ہندی مسلمانوں کے نادان دوستوں میں کچھ مسلم اخبارات سرفہرست ہیں۔ ان اخبارات کے مالکان بھولے بھالے عام مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور اپنے اخبارات کی اشاعت بڑھاتے رہیں۔ ہندوستان میں ہندو مسلم فساد کے زیادہ تر ذمہ دار یہی اخبارات ہیں۔

ہندی مسلمان ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ وہ اپنے ان نادان دوستوں کے باعث کب تک نقصان اٹھاتے رہیں گے۔

اشتعال انگیز بکواس

"بھارت کے کسی بھی فرقہ میں کسی کی ماں نے وہ دلاور نہیں جنا جو ایک مرد مومن کا مقابلہ کر سکے" یہ سات کالمی سرخی ہے ہفت روزہ "مفسر" اورنگ آباد (مرہٹواڑہ) کی۔ اب ہندی مسلمان ہی بتائیں کہ اس اشتعال انگیز بکواس سے اس اخبار نے مسلمانوں کی کونسی خدمت کی ہے۔ اگر یہی سچ مان لیا جائے تو پھر یہ مسلم اخبارات علی گڑھ، جمشید پور وغیرہ کے فسادات کا رونا کیوں روتے ہیں یا تو ان فسادات میں مسلمان مرے ہی نہیں اور اگر مرے ہیں تو وہ کسی مرد مومن کے ہاتھوں ہی مرے ہوں گے۔ کیونکہ بھارت کے کسی بھی فرقہ میں کسی کی ماں نے وہ دلاور جنا ہی نہیں جو ایک مرد مومن کا مقابلہ کر سکے۔ تو پھر ان مرنے والے مومن مردوں کو کس نے مارا؟

اور اگر اس اخبار کے مدیر صاحب ناراض نہ ہوں تو کیا وہ اس کا جواب دے سکتے ہیں کہ مٹھی بھر اسرائیل نے سارے عرب ممالک کے چھکے چھڑا دیئے۔ کیا عرب کے مرد مومن بھارت کے مرد مومن سے کمزور ہیں۔ یا عرب مرد مومن ہی نہیں ہیں۔

اسرائیل کو بھی چھوڑیئے۔ ایڈیٹر شان ہند تو ایک پینسٹھ سالہ دل کا مریض ہے۔ "مفسر" کے مدیر محترم جو اپنے آپ کو مرد مومن کہتے ہیں۔ اسی کا فر ہندی سے ہی مقابلہ کر کے دیکھ لیں تاکہ انھیں اس کا ذاتی تجربہ ہو سکے کہ بھارت کے ہر فرقہ میں ایسی ماں ہیں جو ایسے بچے جنتی ہیں جو کسی بھی مرد مومن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اگر گستاخی معاف ہو تو جناب ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں یہ مودبانہ گذارش کی جائے کہ جب آپ ایسے مرد مومن محض طلب زر کے لئے اپنے خدا اور رسول کے احکام کی پابندی نہ کرتے ہوئے اس قسم کی بکواس کرتے ہیں۔ تو آپ ایسے مرد مومن تو بھارتی گیدڑ کا بھی مقابلہ نہیں سکتے۔ ●●●

قطعہ

ڈاکٹر ستیہ پرکاش تفتہ
(کورو کشیتر)

دھڑکنوں میں سکوت کا عالم
خامشی میں چھپی ہوئی تقریر
یہ متانت یہ پُرسکوں چہرہ
مونا لیزا کی جس طرح تصویر

یہ کوئے یار یہ اندازِ مجرمانہ گزر

سرور تونسوی

تھانہ گاندھی نگر کے ایس۔ایچ۔او۔ سردار پیارا سنگھ اور چوکی رام نگر کے انچارج موہن لال انسپکٹر پولیس ایک ... رات کو گشت کرتے ہوئے لد پھا ایر سینما سدن تالکیو کی طرف گئے (ان دنوں یہ سینما اوپن ایر ہی تھا) تو یہ لڑکا سینما دیکھ کر گھر آرہا تھا کہ ایک پولیس کانسٹبل کے سکھانے پر ان پولیس افسران نے جیپ روک کر اس لڑکے سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ تھانے چلے۔ کیونکہ وہ آوارہ گردی کر رہا ہے لڑکے نے سینما ٹکٹ کا نصف حصہ دکھاتے ہوئے کہا کہ سینما دیکھ کر آیا ہوں اور نظام لال کوارٹر میں اپنے گھر جا رہا ہوں مگر اکثر پولیس والے اپنے علاقہ میں اس روائتی کتے سے بھی گھٹیا کردار کے مالک ہوتے ہیں جو اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے۔ ایس۔ایچ۔او اور انسپکٹر موہن لال نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس لڑکے کو زبردستی اٹھا کر جیپ میں پھینک دیا۔ اور جیپ میں بیٹھے ہوئے پولیس کانسٹبلوں نیز موہن لال انسپکٹر نے لڑکے کو مارا بھی۔ جیپ میں ہینڈل پڑا ہوا تھا کہ اس لڑکے نے یہ ہینڈل اٹھا کر موہن لال انسپکٹر کے دے مارا جو ان کی ناک پہ لگا۔ اور موہن لال کی طوطا نما ناک کسی حد تک بیٹھ گئی۔ بس پھر کیا تھا چوکی رام نگر پر اس لڑکے کو لا کر پولیس والوں نے اس بری طرح مارا کہ شاید ان مارنے والوں کو کسی عورت نے جنم نہ دیا ہو۔ میں ساری رات انتظار کرتا رہا لڑکا جب ایک بجے تک بھی نہ آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ تھانہ گاندھی نگر اور چوکی رام نگر پہ فون کر کے دریافت کیا گیا۔ تو کچھ پتہ نہ چلا۔ صبح ایک پولیس کانسٹبل نے آ کر بتایا کہ انھیں اس لڑکے نے بھجوایا ہے کہ آپ کو اطلاع دے آؤں۔ آج لنچ کے بعد اسے علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا جائیگا۔ بعد اس پولیس کانسٹبل نے تمام مندرجہ بالا کیفیت بھی سنائی۔ ڈھائی بجے بعد دوپہر لڑکے کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ موہن لال انسپکٹر کی ناک پر ڈریسنگ دورسے ہی صورتِ حال کی غمازی کر رہی تھی۔ پولیس والوں نے عدالت میں جی بھر کر زور لگایا کہ ضمانت نہ ہو۔ مگر وکیل نے تمام حقیقت اس انداز میں بیان کی کہ عدالت کو یقین آ گیا کہ لڑکا بے قصور تھا اس پر بے جا تشدد ہوا تو اس نے احتجاجاً انسپکٹر موہن لال پر ہینڈل دے مارا جس کی پاداش میں پولیس والوں نے دل کھول کر لڑکے کو مارا ہے۔ لہٰذا عدالت نے تین ہزار روپیہ کی ضمانت کا آرڈر فرمایا جو میں نے اسی وقت دے دی اور لڑکے کی ہتھکڑی کھلتے ہی ٹیکسی پر بٹھا کر گھر لے آیا۔ گرم گرم دودھ کے ساتھ ہلدی اور پھٹکری کی پسی ہوئی دو مٹھیاں نگل کر اس لڑکے نے کہا کہ اب مجھے بالکل آرام ہے۔ اب سردار پیارا سنگھ اور موہن لال نے اس لڑکے کو اپنا دشمن سمجھ لیا اور تمام ناجائز طریقوں سے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ہر دس بارہ دنوں کے بعد گاندھی نگر کی پولیس میرے مکان کو گھیر لیتی اور پریس میں کام کرنے والوں تک کو تنگ کرتی۔ میں افسرانِ بالا کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کرتا رہا مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ محکمہ پولیس نیچے سے لیکر اوپر تک ایک ایسے ناپاک اتحاد کے رشتہ میں منسلک ہوتا ہے کہ اس کی اتھاہ کو کوئی نہیں پا سکتا۔ چھوٹا افسر زیادتی کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ اسے اپنے افسرِ اعلیٰ کی شہ حاصل نہ ہو۔

میں نے اس لڑکے کو چھ صد روپیہ ماہوار قسط پر تری وہیلر سکوٹر ہائر پرچیز کرا دیا اور اس لڑکے نے نہایت ایمانداری سے سکوٹر چلا کر اقساط بھی ادا کیں اور ہر روز بیس روپے مجھے بھی دیتا رہا۔ مجھے افسوس ہے کہ جب تک سردار پیارا سنگھ اور موہن لال گاندھی نگر کے تھانے میں رہے انھوں نے ہر ممکن حرامزدگی سے کام لیا۔ مگر یہ لڑکے کو سزا نہ کرا سکے کیونکہ جھوٹا مقدمہ تو جھوٹا ہی ہوتا ہے۔ قریباً ایک درجن جھوٹے مقدمات گاندھی نگر پولیس نے بنائے اور خدا کے فضل سے سب مقدمات میں یہ لڑکا باعزت بری ہوتا رہا۔

پھر یہ الجھن کے باعث میں نے پریس بند کر دیا اور اپنے

ذاتی مکان انصاری مارکیٹ دریا گنج میں آکر پھر سے ماہنامہ شانِ ہند کی طرف توجہ مبذول کر دی اور کتب فروشی کا کام شروع کر دیا اور اس لڑکے کو بھی اسی کام میں لگا لیا۔ چونکہ اس کا رجحانِ طبع تکنیکی تھا اس لئے یہ کاغذ کے دھندے میں دلچسپی نہیں لے سکا آخرکار اسے اس کے رجحانِ طبع کے مطابق کام کرا دیا گیا جس کی وجہ سے یہ اپنی دوکان میں ہی سونے لگا۔

ایک دن یہ لڑکا آیا اور بڑی رازداری سے اپنی ماتا جی سے کہنے لگا۔ ماتا جی بات کرتے ہوئے شرم تو آتی ہے مگر آپ سے بات کئے بغیر بات بنتی بھی نظر نہیں آتی۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ ایک لڑکی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ آپ لڑکی دیکھ لو اگر پسند آ جائے تو شادی کرا دیجئے۔ لڑکی کا حسب و نسب پوچھا گیا۔ تو اس نے بتایا کہ وہ اس وقت لاوارث ہے اسے ایک غنڈہ اور بدقماش عورت بہلا پھسلا کر بری نیت سے لے جا رہے تھے اور میں نے ان لوگوں کے پنجے سے زبردستی لڑکی کو چھڑایا ہے۔ اور اپنے مالک مکان کے گھر میں اسے حفاظت سے رکھوا دیا ہے۔ جس بہادری سے میں نے اس لڑکی کو ان بدمعاشوں سے چھڑایا ہے اس سے لڑکی متاثر ہو کر کہہ رہی ہے کہ میں شادی کروں گی تو تم ہی سے ورنہ جمنا میں ڈوب کر مر جاؤں گی کیونکہ اور تو یہاں میرا کوئی ہے ہی نہیں۔

یہ لڑکا ان دنوں ایک تھانیدار کے مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر رہ رہا تھا۔ اور وہ لڑکی اسی تھانیدار کے گھر میں ہی تھی۔ مجھے اور میری بیوی کو یہ اپنے مالک مکان تھانیدار کے ہاں لے گیا۔ لڑکی بھی وہاں موجود تھی۔ تھانیدار کی بیوی نے ہمیں یہ سب باتیں بتائیں کہ لڑکی کہتی ہے کہ میں شادی کروں گی تو اسی لڑکے سے ورنہ آتم ہتیا کر لوں گی۔ لڑکی نے بتایا کہ ان کے علاقہ میں قحط پڑ جانے کے باعث والدین اپنی اولاد تک کو بھول گئے۔ ہم دو بہنیں گاڑی پر بیٹھ کر دہلی کے لئے روانہ ہوئیں اور بھی بھاتی بغیر ٹکٹ دہلی ریلوے سٹیشن پر اتریں۔ سٹیشن کے باہر نکلے تو غنڈے ہمارے پیچھے لگ گئے ایک عورت اور ایک آدمی نے مجھے گھیر لیا اور دوسروں نے میری بہن کو۔ میری بہن کا تو کچھ پتہ نہیں مگر مجھے انہوں نے ان لوگوں سے چھڑایا

چونکہ میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس لئے یہ مجھے یہاں تھانیدار کے گھر میں لے آئے ہیں۔ میں مسلمان ہوں اور اس وقت میرا کوئی نہیں ہے۔ میں شادی کروں گی تو ان سے ہی ورنہ اپنی جان دے دوں گی۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ یہ ہندو ہے (حالانکہ یہ لڑکا جنم سے مسلمان ہے اس کی خبر اس لڑکی کو نہیں تھی)

میں نے ساری صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد لڑکی سے وعدہ کیا کہ تمہاری شادی اسی لڑکے سے ہوگی۔ گھر آ کر میں نے اپنی بیوی سے صلاح مشورہ کیا کہ یہ لڑکا بھی جنم سے مسلمان ہے اور لڑکی بھی مسلمان ہے ان کی شادی ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ اور اس طرح ایک بے سہارا لڑکی برے ہاتھوں میں جانے سے بچ جائیگی

دوسرے روز میں نے اس لڑکے کے مالک مکان تھانیدار اور اس کی بیوی سے مشورہ کرنے کے بعد عدالتی شادی کے لئے درخواست دیدی میں نے لڑکی کی گارڈین شپ کی اور میری بیوی نے لڑکے کی۔ اور یہ شادی ہو گئی۔ شادی کے دس دن بعد یہ لڑکا مقدمہ کی پیروی کے لئے کچہری گیا کہ وہاں اسے پولیس نے دفعہ ۳۰۷ گرفتار کر لیا۔ مجھے فون آیا اور میں کچہری پہنچا تو یہ لڑکا حوالات میں بند تھا۔ میں نے حوالات میں اس سے ملاقات کی تو اس نے بتایا کہ میں نے ایک بات آپ سے چھپائی تھی اور وہ یہ ہے کہ جس روز میں نے اس لڑکی کو بدمعاشوں سے چھڑایا تھا تو مقابلہ میں مرد اور عورت دونوں میری چھری سے زخمی ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے رپورٹ لکھائی ہو گی لہٰذا اس سلسلے میں یہ گرفتاری عمل میں لائی گئی ہے۔ اب میں پولیس والوں کے پاس گیا تو انہوں نے بتایا کہ ہمیں تو پتہ نہیں مگر ایک عورت نے رپورٹ لکھائی ہے کہ راہ چلتی کو اس لڑکے نے چاقو مارا ہے اور اس کے پیٹ پر جو زخم لگا ہے اسے گیارہ ٹانکے لگے ہیں اور وہ عورت ارون ہسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ جو حلیہ اس عورت نے بتایا وہ اس لڑکے سے ملتا جلتا تھا بڑی مشکل سے آج یہ کچہری میں پکڑا گیا ہے۔ اب معاملہ بالکل سچا تھا۔ تاہم میرے ضمیر نے اس خیال سے اس لڑکے کی مدد کرنے کی اپیل کی کہ اس نے یہ جرم ایک نیک ارادے سے کیا۔ یعنی کہ ایک بے بس لڑکی کو غنڈوں سے چھڑایا۔ میں نے جی جان سے پیروی

ی اور سیشن کورٹ سے دفعہ ۳۰۷ کے اس کیس کی ضمانت منظور کرائی۔ اور دس روز کے بعد اس کی سات ہزار کی ضمانت بھی گھر لے آیا۔

ابھی یہ مقدمہ زیر سماعت ہی تھا کہ ایمرجنسی کا نفاذ ہو گیا س قسم کے سب لوگ پکڑ لئے گئے تھے۔ یہ لڑکا میرے پاس آیا اور نے لگا بابوجی اس سے پہلے کہ پولیس مجھے پکڑے یا میں کچہری مقدمہ کی تاریخ پہ جاؤں اور وہیں پولیس مجھے دبوچ لے میں دہلی سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو کچھ وقت کے لئے اخراجات کے لئے روپیہ دیدیا ہے آپ اور ماتا جی اس کا خیال رکھنا اور میں جب تک ایمرجنسی ہے دہلی سے باہر رہوں گا یہ کہتے ہوئے اس لڑکے نے سات ہزار روپیہ کے نوٹ میرے سامنے رکھ دیئے کہ آپ نے میری ضمانت دے رکھی ہے آپ پر عدالت زور دیگی کہ مجھے حاضر کیا جائے لہذا آپ یہ زر ضمانت ادا کر دیجئے گا اور باقی ایک دو مقدمات میں درخواست لگا دیجئے جو ہوگا بعد میں دیکھا جائیگا۔

اس کے بعد یہ لڑکا دہلی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد عدالت سے میرے نام نوٹس آیا اور ضمانت ضبطی کی کارروائی کے بعد مجھ پر ضمانت ڈال دی گئی۔ جس کی میں نے سیشن کورٹ میں اپیل کی اور کئی ماہ کے بعد سیشن کورٹ نے زر ضمانت نصف کر دیا اور جو باقی مقدمات چل رہے تھے باقی روپیہ سے ان کی زر ضمانت بھی ادا کر دی گئی۔

جونہی ایمرجنسی ختم ہوئی یہ لڑکا آگیا اور آتے ہی مجھے کچہری لے گیا اور عدالت میں درخواست دلوائی کہ ملزم آگیا ہے اسے میں عدالت کے سپرد کرتا ہوں۔ مجسٹریٹ صاحب نے درخواست پڑھی اور فرمایا کہ آپ زر ضمانت تو ادا کر ہی چکے ہیں۔ اب اگر آپ ملزم کو پیش بھی کرتے ہیں تو وہ روپیہ تو واپس ملے گا نہیں۔ اور میرے پاس اس کی فائیل ہے نہیں۔ میں اسے گرفتار کروں تو کیسے۔ عدالت نے درخواست تھانہ متعلقہ کو رپورٹ کے لئے بھجوا دی کچھ دنوں بعد وہاں سے تصدیق کرائی اور لڑکے نے اپنے آپ کو عدالت میں پیش کر دیا۔ اور عدالت نے اسے جیل بھجوا دیا۔ بڑی رد و کد کے بعد دوبارہ ضمانت منظور کرائی گئی۔ چونکہ اب اس مقدمہ میں دوبارہ میری ضمانت ہو نہیں سکتی تھی تو کسی دوست سے ضمانت دلوائی گئی اور

پہلی پیشی پر ہی مضروب نے کہا کہ جس نے مجھے چاقو مارا وہ یہ لڑکا نہ تھا۔ مضروب کا یہ کہنا تھا کہ مجسٹریٹ نے اسے بری کر دیا۔

اب یہ لڑکا اپنا کاروبار کرتا ہے دو سو روپیہ ماہوار مکان دیتا ہے۔ گھر میں ہر سہولت حاصل ہے اور بڑے آرام سے زندگی گزار رہا ہے۔ مگر اس کے پرانے دوست پولیس والے بھی کبھی کبھی اسے پھانس ہی لیتے ہیں۔ اور لڑکا مجھے کہتا ہے بابوجی ہندوستان میں پولیس جب کسی کے پیچھے پڑ جائے تو اس کی موت تک نہیں چھوڑتی۔ خواہ وہ فرشتہ ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے کوئی باک نہیں کہ اس لڑکے نے میری سگی اولاد سے بہتر خدمت کی ہے اور اب بھی جہاں میرا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار رہتا ہے۔ یہ لڑکا میرا بیٹا نہیں بن سکتا اور اس نفسا نفسی کے دور میں یہ لڑکا میرے لئے حقیقتاً ایک روشنی کا مینار ہے۔ خدا اسے عمر طویل دے اور ہمیشہ نیک راستہ پر چلتے ہوئے محنت سے اپنی روزی کمائے

غزل

عشرت قریشی اندوری

حیثیت دل کی ہے اُن کے لئے پتھر جیسی
چیز محبوب جنہیں ہوتی ہے گوہر جیسی

ہیچ ہر چیز جہاں میں ہے جواہر جیسی
کوئی دولت نہیں کردار کے زیور جیسی

لوٹ لیتا ہے وہی راہ میں موقع پا کر
بات اکثر جو کیا کرتا ہے رہبر جیسی

راز کو راز وہی شخص رکھیگا یارو
ظرف میں جس کے ہو گہرائی سمندر جیسی

بیچ دیتے ہیں سرِ راہ متاعِ ایماں
بات کرتے ہیں مگر لوگ پیمبر جیسی

عکسِ حالات زمانہ نظر آتے جس میں
شاعری ہو بھی تو جمشید کے ساغر جیسی

کیوں زمانہ تجھے کہتا ہے سخنور عشرت
کوئی خوبی تو نہیں تجھ میں سخنور جیسی

میری زندگی میں روشنی کے مینار

مسٹر ہینری فورڈ

مسٹر ہینری فورڈ کے بارے میں ان کے ایک گہرے دوست پادری ولیم ایل سٹیجر کی قلم سے ۱۹۴۹ء میں امریکہ کے مشہور رسالہ ٹروسٹوری میں ایک آرٹیکل نکلا تھا جس کے چند دلچسپ حصے نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

عام طور پر مسٹر ہینری فورڈ اپنے متعلق کچھ بتانا پسند نہیں کرتے جب کبھی ان سے اس قسم کا سوال کیا جاتا ہے تو وہ اول اس کو ٹال جاتے ہیں اور نہ کوئی اور ذکر چھیڑ دیں گے۔ ورنہ ایک دوسری باتیں کہہ کر معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ میں ان کو مدت سے جانتا ہوں اور اکثر ملتا رہتا ہوں میں نے کئی مرتبہ ان سے مفصل بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوتی تھی۔ مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ سردی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں فورڈ صاحب اپنے ڈیئر بورن کے دفتر کی ایک کرسی پر آرام کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرا یہ بہت سالوں سے پوچھنے کو دل کرتا تھا کہ وہ کون سے شخص ہیں جنہوں نے آپ کی زندگی میں خاص اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ میں نے آج مناسب موقعہ اور وقت سمجھ کر یہ سوال کر ڈالا۔ اور میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب فورڈ صاحب نے بالکل بے تکلفی سے بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ یوں کہنا شروع کر دیا۔

"دنیا میں ہر شخص نے جس سے میرا واسطہ پڑا ہے میری مدد کی ہے ایسا کوئی بھی شخص نہ ہوگا۔ جس کا میری زندگی کے ساتھ کبھی تعلق پڑا ہو اور وہ مجھ پر تھوڑا بہت اثر نہ چھوڑ گیا ہو۔ خاص کر چار عورتوں نے میری جتنی مدد کی ہے اس کو میں بیان نہیں کر سکتا اور میں ان کے احسان کا بدلہ عمر بھر ادا نہ کر سکوں گا۔ یہ چار عورتیں ہیں۔ میری ماں، بہن، ساس اور بیوی۔ ان سب کی میری زندگی پر گہری چھاپ پڑی ہے"

"میری ماں میرے لئے اس دنیا میں اتنا کچھ کر گئی ہیں کہ ان سب کی تفصیل دینا میرے لئے ناممکن ہے۔ لوگ ہم سے اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم اپنی دوکانیں اس قدر بے داغ صاف ستھری اور شیشے کی طرح چمکتی کیوں رکھتے ہیں۔ میری ماں ہر کام پسند سے طریقہ اور سلیقہ کے ساتھ کیا کرتی تھیں اور صفائی پسند تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح سے میری ماں کا رسوئی گھر نہایت صاف ستھرا اور اجیالا رہتا تھا۔ اور وہاں تنکا تک کبھی پڑا نظر نہ آتا تھا۔ اسی طرح ہماری دوکانیں بھی رہنی چاہئیں اب چاہے اسے میرا وہم سمجھیں۔ مگر میں تو اس کو دھرم کا ایک لازمی انگ مانتا ہوں اور مجھ کو یہ پختہ یقین ہو چکا ہے کہ لوگ گندی اور غلیظ جگہ کی نسبت صاف اور ستھری جگہ میں کئی درجہ زیادہ خوش اور نیک بن کر رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ویسے بھی یہ منافع کا سودا ہے دیکھ لیجئے۔ ایک انجن کو جتنا صاف ستھرا کر رکھو گے۔ اتنا ہی وہ زیادہ چلیگا اور بہتر کام دے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پرانی کہاوت و کہاوت ان کی جگہ سے اتر کر دوسرے درجہ پر صفائی ہے، بہت ٹھیک سچی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ اور ملا دینا چاہئے کہ یہ صفائی خوشحالی کی بھی جان ہے۔ "جہاں پر اور جس کام میں گندگی اور بے سلیقہ پن ہوگا وہاں پر بربادی اور تباہی کے آنے میں دیر نہیں۔"

"ایک بار میری ماں نے مجھے صحت کے اصولوں کے متعلق ایسا اچھا سبق پڑھایا جو مجھے ساری عمر یاد رہے گا۔ جب میں سورج نکلنے سے پہلے اٹھتا تھا تو میرا کھانا سب سے باندھ دیا کرتی تھیں۔ مگر اس کھانے میں صرف سادہ چیزیں ہوا کرتی تھیں۔ اور اس وجہ سے ہم سب بچوں کی صحت بہت عمدہ رہا کرتی تھی"

"مگر ایک دن میں سکول سے گھر بیمار لوٹا۔ میری ماں کو بہت فکر ہو گیا۔ اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہوئی۔ آخر کار میری چوری پکڑی گئی۔ میرے بھائی نے ماں کے پاس شکایت کی کہ میں نے سارا کھانا چھوڑ دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں اپنی سادی روٹی سکول کے ایک دوسرے لڑکے کے کیک کے ساتھ بدل لیا کرتا تھا۔ اور اس کو کئی

دن متواتر کھانے کی وجہ سے بیمار پڑا۔ ماں کو مجھ پر بہت غصہ آیا اور انہوں نے مجھ کو ایسی سخت سزا دی کہ میرے سدا کے لئے کان ہو گئے۔

میں جانتا ہوں کہ فورڈ صاحب کے خوراک کے بارے میں چند خاص قانون اور قاعدے ہیں جن پر وہ بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں وہ ہمیشہ بھوک رکھ کر کھاتے ہیں۔ بلکہ میں نے یہ آزما کر دیکھا ہے کہ جتنے زیادہ کھانے والے ساتھی ہوتے ہیں ان سب میں کم کھانیوالے سدا بہار نکلتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک دوست نے ان کا اتنا کم کھانے اور تڑکے اٹھنے پر مذاق اڑایا۔ اور ہنسی ہنسی میں یہ بھی پوچھا کہ شہر میں آئے دن اتنی دعوتیں اور پارٹیاں ہوتی ہیں۔ مگر ان میں تمہاری شکل بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے! فورڈ صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ میں شہر تو جاتا رہتا ہوں مگر صرف ان موقعوں پر جب کہ میرے دوستوں میں سے کسی کی موت چٹورپن یا پیٹو ہونے کی وجہ سے واقع ہو گئی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ گو فورڈ صاحب نے حال ہی میں ۷۱ ویں سال میں قدم رکھا ہے تو بھی اتنی عمر ہو جانے کے باوجود ان کی جسمانی حالت جیسی اچھی اور عمدہ ہے ویسی سارے امریکہ بھر میں بہت کم آدمیوں کی ہوگی۔ ابھی ان کی چال میں لچک اور پھرتی ہے۔ آج تک انھیں کبھی زکام نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت اپنے کام پر موجود رہتے ہیں۔ صبح چھ بجے اٹھتے ہیں، اور کارخانہ کھلنے کے وقت جب کاریگر اور مزدور لوگ اپنے اپنے کاموں پر آ رہے ہوتے ہیں وہ اپنے دفتر میں پہنچ چکے ہوں گے یا کارخانہ کے اندر کہیں گھوم رہے ہوں گے۔ ان کو کارخانہ کے اندر کاریگروں وغیرہ کو کام پر لگے ہوئے دیکھنے میں خاص مزہ آتا ہے اور اسی واسطے وہ عام طور پر سویرے اٹھ بیٹھتے ہیں یہ سب عادتیں ان کی ماں کی ڈالی ہوئی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی ماں کے اتنے احسان مند ہیں کہ جب بہت کما کر وہ بہت دولتمند بن گئے تو انہوں نے ڈیربورن کے جس گھر میں اپنا بچپن گذارا تھا۔ اس کی رسوئی گھر کے تمام فرش اور آنگن کو کھدوا کر وہ سب چینی کی پلیٹیں اور پیچ پیالے وغیرہ نکلوا کر جن کی بابت ان کو خیال پڑتا تھا کہ میری ماں ان کو استعمال کیا کرتی تھی [illegible] ان کو ہاتھ لگے ہوتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اس بچپن کے گھر کا اور سامان اور فرنیچر ان کو بھی انہوں نے بڑی حفاظت سے سنبھال رکھ چھوڑا ہے۔

تھوڑی دیر رک کر فورڈ صاحب پھر کہنے لگے۔ میں ابھی تیرہ سال کا تھا جب میری ماں پرلوک سدھار گئیں۔ اس کے بعد میری بہن نے گھر بار کا چارج لیا اور ہم سب بہن بھائیوں کو پال پوس بڑا کیا ہے میں اس کا ہمیشہ بہت احسان مند رہوں گا۔ کیوں کہ اس نے واقعی ہمارے ساتھ ایک سچی بہن کی طرح سلوک کیا۔

میری ساس کو میری قابلیت اور تجویزوں پر بڑا بھروسہ تھا میں ہمیشہ اپنی تجویزوں اور تجربوں کی رپورٹ اس کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ وہ میری سب باتوں کو بڑے دھیان سے سنا کرتی تھی۔ اور اتنی سیانی عورت تھی کہ وہ میری تمام باتوں کو یہاں تک کہ جو کچھ میں گیس انجنوں اور مشینوں کے متعلق بھی بتلاتا تھا۔ ان کو بھی وہ بالکل اچھی طرح سے سمجھ لیتی تھی۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اول تو عام خلقت کے لئے کسی کار کے بنانے کا خیال کرنا ہی فضول ہے کیوں کہ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا اور پھر گیس کی کار تیار کرکے دینے کی بابت تجویز سوچنا اور بھی بڑی حماقت ہے۔ مگر میری ساس بڑی سمجھدار اور عقلمند تھی اور اس نے ہمیشہ میری سکیم کی حمایت کی۔

میری بیوی نے سدا میرا ساتھ دیا ہے۔ نہ صرف اس نے شروع شروع میں میری ہمت باندھی تھی اور میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ جب کہ میں اپنی کار کے بنانے میں رات دن جٹا رہتا تھا۔ مگر ہاتھ میں روپیہ پیسہ بہت تھوڑا تھا اور باہر سے کوئی آسرا دینے والا اور دل بڑھانیوالا نہ تھا بلکہ اس نے آج تک برابر میری مدد کی ہے اور دلیری دی ہے جب میں باگلے ایونیو کی ایک چھوٹی سی دکان کے اندر اپنی پہلی کار تیار کر رہا تھا تو وہ راتوں کو جاگ کر میرے پاس بیٹھی رہا کرتی تھی جب ہم شہر ڈیٹرائٹ کے اندر اپنی کار کو پہلے پہل چلانے لگے تو ہم کو یہ دھمکی دی گئی کہ کیونکہ اس کار کے چلنے سے گھوڑے بدکتے ہیں۔ اس لئے ہم کو گرفتار کیا جاوے گا مگر میری بیوی نے ذرا پرواہ نہ کی اور وہ ان چند شخصوں میں سے تھی جو سب سے اول میرے ساتھ اس کار میں سوار ہوئے تھے اس نے ہمیشہ مجھے نیک صلاح دی ہے میری مدد کی ہے اور میرا [illegible] بڑھایا ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ وہ میری سب سے پہلی اور پکی پجارن ہے کیونکہ جب شروع دنوں میں کسی کو میرے تجربوں پر اعتبار نہ آتا تھا اور ہر شخص کو میری کامیابی میں بہت شک و شبہ تھا۔ اس کو میری کامیابی کا پورا یقین تھا اور

بھروسہ کرتا تھا "

سکول کے اُستادوں نے بھی میری کافی مدد کی ہے۔ ہمارے سکول میں ایک ماسٹر جی ہوتے تھے جن کا نام کیلوگ تھا۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مجھے اپنی جماعت کی کتابیں پڑھنے کی نسبت گھڑیوں کے پرزے کھولنے اور گھڑیوں کی مرمت کرنے کا زیادہ شوق ہے۔ تو انھوں نے مجھے جھڑکنے کے بجائے میری ہمت بڑھائی اور مجھے مشورہ دیا کہ مجھے خوب دل لگا کر یہ کام کرنا چاہئے۔ ایک اور ماسٹر جی نے جن کا نام وارڈ صاحب تھا ایک دن مجھے نصیحت کی کہ یہ رقموں کے سوال لکھ کر کیوں نکالا کرتے ہو؟ دماغ سے کیوں کام نہیں لیتے۔ ہمیشہ رقموں کے جوڑنے وغیرہ کے سوال زبانی نکالا کرو۔ تب سے میں ایسا ہی کرتا ہوں اور نتیجہ یہ ہے کہ اب مجھے ہمیشہ اپنے دماغ سے سوچ کر کام کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اور رقمیں جوڑنے کیلئے بھی کاغذ پنسل استعمال نہیں کرتے۔

فورڈ صاحب بڑے ایشور بھگت ہیں۔ اپنی ماں کی یادگار میں انھوں نے اپنے گاؤں گرین فیلڈ میں ایک چھوٹا سا گرجا گھر بنا رکھا ہے۔ جس میں روز صبح ساڑھے آٹھ بجے سے لیکر نو بجے تک ایشور پرارتھنا ہوتی ہے۔ بائبل پڑھی جاتی ہے اور بھگوان کی مہما کے بھجن گائے جاتے ہیں۔ فورڈ صاحب کو ایشور بھگتی میں حد سے زیادہ یقین ہے اور ان کا کہنا ہے کہ لوگوں کے مذہب جدا جدا ہوں اس میں کچھ ہرج نہیں ہے مگر ہر سمجھدار شخص کے لئے ایشور کی ہستی میں یقین رکھنا اور دھرم کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا اور کام کرنا نہایت لازمی ہے۔ چنانچہ بہت بار دیکھا گیا ہے کہ اگر وہ چند دنوں کی غیر حاضری کے بعد کہیں باہر سے لوٹتے ہیں اور گرجے کا وقت ہو گیا تو وہ پہلے وہاں کی پرارتھنا وغیرہ میں شامل ہوں گے اور بعد میں اپنے گھر جائیں گے۔

فورڈ صاحب کو پرندوں کا بہت شوق ہے۔ یہ پیار اور لگاؤ انھوں نے اپنے باپ سے سیکھا ہے ابھی وہ تین برس کے تھے جبکہ ایک بار ان کے باپ انھیں سیر کرانے باہر لے گئے اور راستہ میں ایک جگہ اشارہ کر کے کہنے لگے۔ وہ دیکھو یہ گانے والی چڑیا کا گھونسلہ ہے۔ تب سے ہی ان کو یہ چڑیا سب سے زیادہ پیاری ہے حالانکہ انھوں نے اپنے احاطہ میں ۵۲ طرح کے پرندے پال رکھے ہیں پرندوں کے لئے ان کا دل بہت ہی نرم ہے اور وہ ان کو ذرا سی بھی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک بار جب انھیں یہ پتہ چلا کہ کارخانہ کے اندر کسی جگہ پر ایک پرندے نے بچے دیئے ہیں تو آپ نے اُدھر آنے جانے کا دروازہ ہی بالکل بند کرا دیا۔ تاکہ اس پرندے کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ اسی طرح ایک مرتبہ فصل کھیتوں میں پک کر کٹنے کو تیار کھڑی تھی مگر جب انھیں یہ خبر ملی کہ ان کھیتوں میں پرندے انڈے دے رہے ہیں۔ تو آپ نے فوراً یہ حکم دیدیا کہ فصل کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیشک یہ کھڑی کی کھڑی خراب ہو جائے۔ پرندوں کے بارے میں اس قدر دلچسپی لینے کا اثر یہ ہوا ہے کہ اب وہ صرف گھونسلا دیکھ کر یا پرندہ کا گانا سن کر جھٹ سے بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں پرندہ ہے وہ ہمیشہ پرندوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو پرندوں سے بہت کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں۔ پرندے جانتے ہیں کہ اصل دولت کیا ہے۔ انسان کو اس کی خبر نہیں وہ روپیہ کو دولت سمجھ بیٹھا ہے اور اس لئے اس کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ مگر پرندوں کو پتہ ہے کہ دولت کا خزانہ تو اصل میں قدرت ہے اور اس کا دل کھول کر خوب فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اسی لئے جب کام میں مندی آنے لگتی ہے تو انسان کا دم خشک ہونے لگتا ہے۔ مگر پرندوں کو اس کی ذرا پروا نہیں ہوتی خواہ کیسا ہی موسم ہو۔ وہ اپنے وقت پر برابر اپنی جگہ آتے جاتے رہتے ہیں کیونکہ ان کو اس بات کا تجربہ ہے کہ قدرت کے خزانے میں کبھی کمی نہیں پڑتی اور اس لئے وہ ہمیشہ خوش چہچہاتے رہتے ہیں۔ اور بڑے مزے سے اپنی زندگی کے دن گذارتے ہیں۔

فورڈ صاحب بچوں سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ بچے ہماری امیدیں اور ہماری امیدوں کی شمع ہیں۔ وہ زمین کی سب سے قیمتی چیز ہیں اور قدرت اس سے بہتر چیز بنا کر ہمیں کبھی نہیں دے سکتی۔ ان کو دیکھ کر ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے اور دل مضبوط ہوتا ہے مصیبت اور مایوسی کے دنوں میں ان کے نزدیک رہ کر ہماری ڈھارس بندھتی ہے۔ یہ ہمیں زندگی اور تازگی بخشتے ہیں۔ انسان ان سے بہت کچھ نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ جتنا وہ ان کے پاس رہے گا۔ اتنا ہی اس کے لئے اچھا ہے۔

آخر میں میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ آپ کے دوست مسٹر ایڈیسن نے آپ کی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ فورڈ صاحب مسٹر ایڈیسن کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی کہ مسٹر ایڈیسن فورڈ صاحب کی۔

جواب میں انھوں نے فرمایا۔ نوجوانی میں میری سب سے بڑی یہ خواہش تھی کہ میں بھی کبھی ایڈیسن جیسا لائق اور ہوشیار بنوں اور سیانی عمر میں آکر تو وہ میرے دوست بن گئے تھے۔ تو بیک ان کو بجلی کی دُنیا کا جادوگر پکارتی تھی اور ہر شخص کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ آئندہ زمانے میں بجلی کا ہی بول بالا رہے گا۔ انھوں نے میرے منہ سے گیسولین کار بنانے کا خیال سن کر میری خوب پیٹھ ٹھونکی اور حوصلہ بڑھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میرا دل بہت ڈگمگا رہا تھا اور چاروں طرف سے میرے کان میں یہی آواز پہنچتی تھی کہ یہ بالکل نکما خیال ہے اس میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں اور مجھ کو اسے چھوڑ دینا چاہئے میرا دل ٹوٹ چکا تھا اور ایک طرح سے میں اس تجویز کو ترک کر دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مجھے ایسے جانکار کی سخت ضرورت تھی جس کو اس علم کی پکی واقفیت ہو جو میری اس [illegible] میں پھنسی ہوئی کشتی کو کنارے پر لگا سکے۔ میرے گرے ہوئے حوصلے کو ابھار سکے۔ اور مجھے دلیری اور ڈھارس دے کر پاؤں پر کھڑا کر سکے۔ یہ کام ایڈیسن صاحب نے کیا۔

مجھے خود گیسولین کار کی کامیابی میں رتی بھر بھی شک و شبہ نہ تھا۔ لیکن چاروں طرف سے لوگوں کی باتیں سُن سُن کر میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ یہ میری زندگی کا سب سے نازک موقعہ تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں دنوں میں مجھکو ایڈیسن انجینیروں کی سوسائٹی (جس کا میں بھی ممبر تھا) کے ایک جلسے میں شریک ہونے کے لئے نیویارک جانا پڑا۔ وہاں پر کسی نے باتوں باتوں میں میری گیس موٹر کار کا ذکر بھی چھیڑ دیا۔ اس وقت صرف بہت تھی صرف سرسری طور پر موٹر کار کے واسطے گیس انجن کی تجویز سُن کر بھلا ایڈیسن صاحب فوراً کیسے یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ بہت اچھا خیال ہے۔ لیکن جب میں نے بعد میں ان کے سامنے اپنی ساری تجویز کھول کر بیان کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور میز پر زور سے مُکا مار کر کہنے لگے کہ واہ میرے نوجوان! تم نے کمال کر دیا ہے۔ واقعی تمہاری تجویز نہایت عمدہ ہے [illegible] اور [illegible] ہو اور اس کو [illegible] کر کے [illegible] بیٹا تو [illegible] حد سے زیادہ کامیابی ہوگی کیونکہ بجلی کی کاریں صرف وہیں پر استعمال ہو سکیں گی جہاں ... میں بجلی کی طاقت پیدا کرنے والے سٹیشن ہونگے۔

سٹوریج بیٹری اس قدر بھاری ہے کہ اس سے [illegible] مشکل ہے۔ بھاپ کی کاریں بھی کامیاب نہیں ہو کیونکہ ان کے لئے بائلر اور آگ کی ضرورت ہے کار اپنے [illegible] پاس رکھتی ہے اور اس کو باہر سے کسی چیز [illegible] نہیں ہے۔ نہ آگ نہ بائلر نہ دھواں اور نہ بھاپ بھی ٹھیک کہتے ہو تم ضرور بازی لے جاؤ گے۔ لیکن تم خیال کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ جیت تمہاری ہے۔

اس رات ایڈیسن صاحب کا میز پر مکا مار کر کہنے سے میری جان میں جان پڑ گئی۔ اور میرا حوصلہ [illegible] گیا۔ ابھی تک میں بہت سوچ بچار میں پڑا ہوا تھا اور نہ کر سکا تھا۔ لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ دنیا کا سب ایجاد کرنے والا یہاں تک کہتا ہے کہ میری گیس موٹر کی موٹر کار سب سے بڑھیا نکلے گی۔ وہ لمبے لمبے فاصلے چل سکے پھر مجھے کیا ڈر ہے۔ میرے سب خدشے اور اندیشے دور [illegible] میں نے جم کر یہ کار بنانا شروع کر دیا نتیجہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔

اتنا کہہ کر فورڈ صاحب بولے " سو بھائی دیکھو تو جب کو ضرورت آن پڑتی ہے تو وقت پر کوئی نہ کوئی پیدا ہو جاتا ہے یہ قدرت کا قانون ہے۔ اگر ہم سیکھنے والے ہو [illegible] سکھلانے والے بھی [illegible] اگر ہم دوستی اور محبت کرنے والے دوسرے بھی ہم سے ضرور دوستی اور محبت کریں ہم سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ ہمیں [illegible] ضرورت ہے۔ دوستوں کی بھی ضرورت ہے۔ سرمایہ دار کاریگر اور مزدور کی ضرورت ہے۔ کاریگر اور مزدور کو سر[مایہ دار] کی ضرورت ہے۔ ایک آدمی کو اپنی بیوی کی ضرورت ہے۔ [illegible] کو اپنے آدمی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہر قوم کو دو[سری] قوم کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا [illegible] ہمیں [illegible] ملتی تو ہم کبھی کار نہ بنا سکتے تھے۔

ہماری سوسائٹی کے رِستے ہوئے پھوڑے

مُہلک جراثیم

یعنی

ہیجڑے یا مُخنّث

"کافی عرصہ ہوا مجھے سولہ صفحوں کا ایک مختصر سا پمفلٹ ملا تھا جسے پڑھ کر میرے دل و دماغ پر شدید اثر ہوا تھا اور یہ تاثر اس قدر جاگزیں ہوا کہ آج تک مجھے خیال آتا ہے کہ جس ملک میں اس قدر خوفناک اور منظم جراثیم موجود ہوں، وہ کیوں کر آزادی کی نعمتوں سے مکمل حظ اندوز ہو سکتا ہے؟ ہم ملک و قوم کی اقتصادی بدحالیوں کا رونا روتے ہیں۔ ہم سرمایہ داروں کی انسانیت سوز ہوس زر اندوزی پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور دولت کی غلط تقسیم پر کڑھتے ہیں۔ مگر نہیں سوچتے کہ ہم نے کیا کیا زہریلے ناگ اپنی آستینوں میں پال رکھے ہیں؟ ہماری سوسائٹی کس قدر داغدار ہے۔

یہ اقتباسات آئینہ ہے۔ ہماری گلی سڑی سماج کا"　　(مدیر)

تمام اقوام عالم اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ خورد سالہ معصوم اور بے گناہ بچے عالم وجود میں آنے کے بعد نو وارد اور ناتجربہ کار کی ہی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی تقلید کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چل کر زندگی کے مراحل طے کرنے کے قابل بنتے ہیں اور انہی کا وجود اپنے شجاع اور غیور اسلاف کا نام بھی قائم و قائم رکھنے کا موجب ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ کولمبس واسکوڈی گاماں۔ نپولین۔ غازی صلاح الدین۔ غازی انور پاشا غازی مصطفیٰ کمال پاشا ماضی و حال کی بساط کے شاطر بچے ہی جوان ہو کر اخلاقی تعلیم و تربیت حاصل کر کے اپنے اپنے ملک و قوم کیلئے سربلندی کا باعث بنے۔ جن کی ذات پر ان کے ممالک جس قدر بھی ناز کریں بجا ہے۔

مہلک جراثیم مشرق کا باوا آدم ساری دنیا سے نرالا واقع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کے نام سے اس کے کان ناآشنا ہیں اور پستی کو اپنا نصب العین قرار دیکر شاید یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ آسمان سے فرشتے آکر اس کے تمام کام خود بخود کر دیں گے۔ اسی غفلت و فراموشی کے طفیل ہمارا ملک طرح طرح کے عیوب و جراثیم کا گہوارہ بنتا چلا جا رہا ہے جن میں خود یہ جبلی اور بناوٹی ہیجڑے سب سے زیادہ مہلک جراثیم ہیں۔ اور یہ منتشر اور غیر منظم نہیں بلکہ منضبط اور منظم ہیں۔ ان کی تحریک ہیجڑا ازم نخرہ ازم ایسی ہی باضابطگی کے ساتھ جاری ہے کہ جیسی مہذب ممالک میں سوشلزم یا کمیونزم یا بالشوازم نازی ازم وغیرہ وغیرہ ان کا وجود شجاعان سلف اور بہادران ماسبق کی تاریخ کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہے اور موجودہ سوسائٹی کے لئے موجب ننگ و عار، اور نوجوانوں کے اخلاق کے لئے خطرہ عظیم خصوصاً ان کا بناؤ سنگار کرنا اور چکلوں میں بیٹھنا یا عام گذرگاہوں پر نمائش کرنا گویا اعلانیہ معصیت کی دعوت دینا ہے۔ ان کے اڈے گناہوں سے بھبکتے ہوئے میخانے ہیں۔ ان کے ڈیرے ایسے گھناؤنے اور قابل نفرت حرکات و افعال کا مرکز ہیں جنکی توضیح و تشریح کی کوئی تہذیب متحمل نہیں ہو سکتی۔ پس اس جگہ ہم اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ الغرض تلخیصہ اشنا ہیجڑوں کی آمدنی کا ذریعہ صرف اپنی ذاتی حرام کاریوں اور بدکرداریوں تک محدود نہیں بلکہ مختلف تقاریب سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ شادی بیاہ اور اولاد کی پیدائش کی تقریب پر بن بلائے آکر جبلی ہیجڑوں کا ناچنا گانا اور بھیک نہیں بلکہ

اپنا حق مانگنا گویا یہ بھی ہم پر ان کا ٹیکس ہے۔ سردست ہمارا موضوعِ سخن اس بدکردار گروہ سے متعلق ہے۔ یہ گروہ بڑے بڑے شہروں سے لیکر چھوٹے چھوٹے قصبات اور دیہات تک میں پھیلا ہوا ہے۔ جس کی زد سے اعلیٰ و ادنیٰ کوئی باہر نہیں ہے۔ اس گروہ کی مجموعی تعداد ۵۰ لاکھ یا ۶۰ لاکھ تک پہونچتی ہے۔ ملک و قوم کے لئے یہ جراثیم سب سے زیادہ خطرناک ہیں۔

ہیجڑوں اور زنخوں کا پنتھ

یہ گروہ اپنے آپ کو گرو گورکھ ناتھ کے زمانے سے منسوب کرتا ہے اور نندی مائی کا جو گورو گورکھ ناتھ کے زمانے میں بتلائی جاتی ہے ماننے والا ہے مگر یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اصلی ہیجڑا تھا یا بناوٹی۔ غالباً خیال یہی ہے اس لعنت کا بانی مبانی وہی تھا۔

قسمیں اور ذاتیں

یہ لعنتی گروہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ یعنی ایک کٹے ہوئے اور ایک بغیر کٹے۔ ایک تیسرا درجہ گنڈیری زبان کا ہے۔ جس کی صرف ڈنڈی کاٹ دی جاتی ہے اور بقایا حصہ موجود ہوتا ہے۔ ان قسموں کے علاوہ ان کی چار یا پانچ مندرجہ ذیل ذاتیں ہیں۔ مثلاً سوجانیہ۔ کلیانیہ۔ گنگا رامیہ۔ فیروزنہ - نیم۔ دکھوگری اور رائے جی وغیرہ۔

رائے جی کے خاندانوں کو سب ذاتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اور وہی ان میں شہنشاہ ہونے کا دعویدار ہے اور زیادہ نوجوانوں کو خصی کرنے کے ذمہ دار بھی یہی ہیں۔ اکثر ان میں گدی نشین زنان یعنی خصی ہی کو کہا جاتا ہے۔ دوسری روایت ان میں یوں بھی بیان کی جاتی ہے کہ متذکرہ بالا چاروں پنتھوں کے بانی مبانی مادر زاد ہیجڑے تھے جو اپنا اپنا پنتھ مقرر کرکے دوسروں کو اپنے اندر شامل کرنے کی وصیت کر گئے ان میں سول و ملٹری دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی گنگا رامیوں کی ایک قسم نیم کہلاتی ہے۔ جو شہروں کی برتوں کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے اور حسب طریق مطلوبہ ٹیکس وصول کرتی ہے۔ دوسری قسم کی ٹولی ہے جو لشکری کہلاتی ہے جو چھاؤنیوں کو اپنی ملکیت بنائے بیٹھے ہیں۔ اور خراج وصول کرکے گزر کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ چاروں گروہ رائے جی کے خاندان کے تابع فرمان ہیں۔ رائے جی کے خاندان کو ان تمام پر اسی طرح فوقیت حاصل ہے جس طرح بادشاہ کو۔ غرضیکہ یہ تمام فرقوں میں بذات خود افضل ترین خاندان ہے۔

اگر کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کے حلقے میں جاکر ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو چاروں جماعتوں کے ذمہ دار اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ جن میں اونچی جگہ یعنی نشست فوقانی رائے جی کے فرقے کو دی جاتی ہے۔ اور اسی کا فیصلہ قابل تسلیم سمجھا جاتا ہے۔

خونین ڈراما

(قطع و برید کی ہوشربا رسم یا ارتکاب قتل عمد)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

جو بچہ یا نوجوان ان کے پنجۂ جفا میں پھنس جاتا ہے اس کو بدچلنی و سیاہ کاری اور ہر قسم کے نشہ کا عادی بنا لیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ آخرش انہی میں جذب ہو جاتا ہے اس کے بعد یہ جا پیشہ اس کو ترغیب دیتے ہیں کہ تم بڑے خوبصورت ہو اور کئی لوگ تم کو چاہتے ہیں۔ اس لئے تم کو زنان یعنی ہیجڑہ یا خسرہ بن جانا چاہئے۔ کیونکہ اس صورت میں تمہارا حسن جو چند دن کا مہمان ہے دائم رہے گا۔ بلکہ تمہاری خوبصورتی اور زیادہ ہو کر ان کو اپنا گرویدہ بنا لے گی۔ نیز تم برتوں کی آمدنی کے حصہ دار بن جاؤ گے۔ جس سے تمہارا تمول بڑھ جائے گا۔ دیکھو جب تک گلاب جان زنان نہ بنی تھی تو تمہاری طرح فاقہ مست تھی آج لاکھوں روپیوں میں کھیل رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اس کو اس شرمناک مکروہ فعل پر آمادہ کر لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ان کے داؤ گھات سے قابو میں نہ آئے تو پھر اس کو یہ جھانسہ دیا جاتا ہے کہ خود نندی مائی خود آکر کسی کو زنان بننے کے لئے فرماتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نندی مائی تم پر مہربان ہے تم پر مہربان ہے تم بڑے بھاگوان معلوم ہوتے ہو ورنہ ایسی قسمت کہاں میسر۔ غرضیکہ کسی طرح کے حیلے بہانوں سے ان بے چارے نوگرفتار کو اس ذلیل فعل پر رضامند کر لیا جاتا ہے۔ جس کی اجازت کوئی قانون اور اخلاقی ضابطہ نہیں دے سکتا۔ اور جدید فریب خوردہ شکار کی اس موقع

ی کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی ۔ یہ شعر اس کی حالت کا صحیح
نا ہے ؎

تو گرفتار ہوں کچھ رسم مجھے یاد نہیں
اس لئے لب پہ مرے نالہ و فریاد نہیں

بعد ازاں نزدیک و دُور کی ساری ستم شعار پارٹی مدعو کی
ہے اور باقاعدہ تقریب منائی جاتی ہے جس میں نندی مائی
ا ہی چڑھتی ہے اور راگ و رنگ کی محفل جمائی جاتی ہے
نئے شکار کو اچھے کپڑے پہنا کر درمیان میں بٹھایا جاتا
س کے ایک طرف راگ رنگ شروع کیا جاتا ہے اور دوسری
آگ جلائی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آگ پر گھی کا چھینٹا
تا ہے۔ آگ فوراً بھڑک اٹھتی ہے۔ سارے پاپی مل کر شور
تے ہیں کہ مبارک باد۔ مبارکباد۔ نندی مائی نے اسے قبول
یا۔ اب یہ نربان بنالی جائے گی۔ اس کے بعد وہ پرانا خبیث
س بے دام غلام کو اپنا چیلہ بناتا ہے وہ اس کے ختنہ زیر
کے لئے کوئی ایک جگہ محفوظ تجویز کرتا ہے جو یا تو جنگل بیابان
نا ہے یا آبادی سے دُور کوئی خالی مکان یا بعض اوقات اپنے
مکان کے اندر ایک گڑھا کھود کر اس میں گری کے کھوپے۔
ت کے رنگ برنگ کے آٹے چاول۔ سیندور، سالم ماش
رہ باقاعدہ ڈالتے ہیں۔ اس کو نندی مائی کا گڑھا کہتے ہیں۔ اس
کنارے خصی ہونے والے کو جسے غیر معمولی نشہ پلا کر بیہوش
نیا جاتا ہے لے جاتے ہیں۔ اس وقت ایک موجب قطع و برید
یا جراح جو کچھ بھی کہئے جو اکثر انہی جرائم پیشہ سفاکوں میں سے
ناہے اور ایک اس کا گورو ہوتا ہے۔ ان تینوں سے واجبھے
کو بھی اس خفیہ کارروائی کی خبر تک نہیں ہوتی۔ لہٰذا کون پوشیدہ
از کو عوام پر واضح کرے اس ختنہ زیر و بالا کو معاوضہ دو تین
روپے ہوتا ہے عضو تناسل معہ خصیتین اُڑا کر سارا جھگڑا ہی
ن کر دیا جاتا ہے۔ خون کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ اس خون کو اس
چہرے پر مل کر دونوں جہانوں کی سرخروئی عطا کی جاتی ہے اس
ان خسرہ گیروں کا پاکیزگی پر وہ ایمان رکھتے ہیں کہ اس کی برکت
سے داڑھی مونچھ کے بال ساری عمر نہ اُگیں گے بشرطیکہ
خون آنجہانی نہ ہو جائے۔

اگر یہ احمق اس جراحت جانکاہ سے زندہ بچ گیا تو اس
کی ذلت اور رسوائی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ یعنی پہلے
اگر یہ نامخنث تھا تو اب مخنث ہو گیا۔ پہلے ناقابل فروخت اور
اب فروختنی ہے اور مخنثین کی بردہ منڈی میں قدر کی نگاہوں سے
دیکھا جاتا ہے۔ دُور دُور کے ڈیروں سے پیغام آتے ہیں کہ یہ
(ننگی شمشیر) ہمیں دیدو۔ اگر اسے کچھ حسن اور خوش گلوئی بھی میسر
ہے تو اس کی قیمت سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچتی ہے
جو اسے خریدتا ہے وہ آقا کی حیثیت رکھتا ہے اور بکنے والا غلام
کی سی حیثیت۔ یہ زر خرید غلام ہمیشہ کے لئے اپنے آقا کے ہر حکم کی تعمیل
پر مجبور ہے خواہ وہ حکم کسی نوعیت کا ہو۔ حتیٰ کہ اگر یہ زر خرید غلام اپنے
آقا کے جابرانہ اور ظالمانہ احکام سے اکتا کر کسی ڈیرے میں چلا جائے
تو آقا اس ڈیرے کے خلاف مقدمہ چلاتا ہے اور ذمہ دار اس کا ان
مخنثین کی چوری اس جرم کے پاداش میں سینکڑوں سے لیکر ہزاروں
روپے تک جرمانہ کی سزا تجویز کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

کالی رات

اگر اس ختنہ زیر بالا سے مرغ بسمل جان بحق ہو گیا۔ یعنی نندی
مائی نے مل کر سورگ باش ہو گیا تو گڑھا کھدا کھدایا موجود ہوتا ہے
اسے ضرورت کے مطابق گھٹا بڑھا کر کام کیا اور چلتے بنے۔ یہ عمل
جراحی لڑکے کو کسی دُور دراز شہر یا مقام پر لیجا کر جہاں اس کو کوئی
بھی نہ جانتا ہو۔ کیا جاتا ہے تاکہ کوئی اس کی واقفیت پر اسے تلاش
نہ کرے۔ جس رات یہ خوفناک آپریشن کیا جاتا ہے اس رات کو یہ لوگ
اپنی اصطلاح خاص میں کالی رات کہا کرتے ہیں۔ اس اصطلاح
میں کئی رموز مضمر ہیں۔ فاعل اپنے نامہ اعمال میں ایک مزید سیاہ
داغ کا اضافہ کرتا ہے اور مفعول اپنی سیاہ بختی پر ایک نئی مہر ثبت
کرتا ہے۔ نیز دنیا کی سیاہ کاریوں میں ایک نئے باب کا افتتاح
ہوتا ہے۔ اور اگر مفعول اس گھاؤ کی تاب نہ لا کر نندی مائی کے گڑھے
سے جہنم کے گڑھے میں جا گرا تب بھی دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک
ہو گئی اور یہ ایسی سیاہی ہے جس کے بعد کوئی سفیدی کی جھلک
نہیں۔ غرضیکہ یہ کالی رات ہر معنوی اعتبار سے بھی کالی رات
ہے۔ مگر اس نام سے ظاہری معنی یہ مترشح ہوتے ہیں کہ سیاہ کاری

وسیاہ بختی کے لئے شب تاریک ہی موزوں ہوسکتی ہے تاکہ اس قاتلانہ جرم کے ارتکاب سے فارغ ہوکر مجرمین اپنی اپنی راہ لیں تو شب سیاہ ان کی امداد پردہ پوشی کرسکے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ اس رات کی سیاہ چادر میں لپٹے ہوئے خدا کی زمین پر دو ایسے مجرم چل رہے ہیں جو ایک بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ یا اسے زندہ درگور کر چکے ہیں۔ یہ ہے کالی رات کی مختصر سی سرگزشت۔

جاں دے کے جس نے جنس گنہ کی خرید کی
صد حیف اس کے بخت سیہ پر شب سیاہ

زنانہ اور ہیجڑہ میں فرق

زنانہ اور ہیجڑہ پارٹی میں صرف اتنا فرق ہے کہ زنانے آپریشن شدہ نہیں ہوتے۔ کچھ مردانہ وضع قطع اختیار کئے رہتے ہیں۔ اور کئی بالکل زنانہ شکل و لباس اختیار کر لیتے ہیں۔ زنانہ ازم کے دوسرے درجے کے لوگ کئی ایک شکلوں میں ملک و قوم کی تباہی و بربادی کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ بعض بازاری عورتوں کی مانند گھر والی بن کر نوجوانوں کے گھروں کو بے چراغ بنا رہے ہیں۔ بعض شرفا کے گھروں میں نوکری پیشہ اختیار کرکے پوشیدہ طور پر دلالی کا کام کر رہے ہیں۔ بعض ناچتے گاتے پھرتے ہیں بلکہ ہر گھر ہر کوچہ میں کھلم کھلا جا گھستے ہیں عام تحقیق اور اکثر حقائق ہم سے دعوے کی تصدیق ثابت ہو رہی ہے بلکہ اکثر زنانہ اخبارات میں ایسے واقعات کا ذکر آتا رہا ہے۔

قطعات

ڈاکٹر ستیہ پرکاش
تفتہ (کردہ کشتبرا)

کس قدر بے قرار ہیں جذبات
موج در طوفاں کے ساتھ رہنے کو
دیکھ کر آپ کی حسیں آنکھیں
دل مچلتا ہے شعر کہنے کو

جیتے جی زخم کیا نہیں کھائے
پھر نا قسمت کا ہم تو بھر پائے
مفلسی اس پہ طرّہ بیماری
چوٹ پر اور چوٹ لگ جائے

اس حماقت کے دَور میں جینا
جی کا جنجال ہو گیا اے دوست
مجھ کو دُنیا نے اتنے زخم دیئے
سینہ غربال ہو گیا اے دوست

عیب جوئی سے دُور دُور رہیں
دل ہی دل میں یہ چاہتے سب ہیں
اُف یہ دنیا کا شیخ چلی پن
چاہتے سب ہیں، نباہتے کب ہیں؟

خامشی کا وقار کیا کہنا
اس کی اپنی ہی شان ہے پیارے
سو تکلم نثار ہیں جس پر
خامشی وہ زبان ہے پیارے

دیوارِ قہقہہ

نگہت عقیل صدیقی

پشاور کے قصہ خوانی بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک جگہ میرے قدم رُک گئے۔ دیکھا تو ایک پٹھان نے اپنی دوکان پر کچھ اس قسم کا بورڈ لگایا ہوا تھا۔

ایوب خان مردہ باد .... چینی دو روپے سیر
ایحییٰ خان غدار .... چینی تین روپے سیر
بھائی دور زندہ باد .... چینی چار روپے سیر
اور ....؟ چینی بارہ روپے سیر
(پاکستان پائندہ باد)

ایک ظریف گاڑی میں بغیر ٹکٹ سفر کر رہے تھے۔ اچانک ٹکٹ چیکر ڈبے میں آگیا۔ ظریف کی جان پر بن گئی اس نے جلدی جلدی صندوق کھول کر مصلےٰ نکالا اور جلدی سے نماز کی نیت باندھتے ہوئے کہنے لگا: دو سو رکات نماز

کیا آپ جانتے ہیں کہ کسی نازنین کے لئے کمر کا مثالی ناپ کیسے اخذ کیا جائے۔؟

نہیں تو آیئے ہم آپ کو بتائیں :

۱۔ نازنین کے سینے کا ناپ معلوم کریں۔
۲۔ نازنین کے کولہوں کا ناپ معلوم کریں۔
۳۔ دونوں کو باہم جمع کریں۔
۴۔ میزان کو اپنے موزے کے نمبر سے ضرب دیکر حاصل ضرب کو ۳۲ سے تقسیم کر دیں۔ جو جواب آئے وہ کمر کا مثالی ناپ ہوگا۔ کیونکہ بندہ کو ادم مشتاق احمد یوسفی صاحب راوی نسخۂ ہذا یہی کہتے ہیں۔

ایک سہیلی سے ملتے ہوئے دوسری سہیلی نے پریشانی سے کہا:
"آج اس کے پاپا بہت غصے میں تھے جب انھوں نے ممی اور نوکر کو ایک ہی صوفے پر بیٹھے دیکھ لیا۔"

"بھئی یہ تو تمہارے والد کا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہاری چہ معنی دارد ؟" سہیلی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکی مطمئن ہو کر چلی گئی اگلے روز وہ پھر ملیں تو وہ لڑکی بڑے اموڈ میں تھی۔ اس کی سہیلی نے کہا۔

"کل والی بات کا کیا بنا ؟" کیا تمہارے والد نے نوکر نکال دیا۔؟"

نہیں ــــ

"تمہاری امی کو میکے بھیج دیا۔؟"

نہیں ــــ

"پھر کیا ہوا ؟"

"انھوں نے جھگڑے کی جڑ کو ہی ختم کر دیا۔"

یعنی ــــ !!

"انہوں نے صوفہ ہی بیچ ڈالا ــ" جواب ملا۔

ایک صاحب اپنی بیمار بیوی کے قریب بیٹھے تھے۔ دس سال تک وہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی رہ چکے تھے اور اب یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ان کی بندھن ٹوٹ جائے گا۔ بیوی نے آنسوں بھری نگاہ سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں مر جاؤں تو تم دوسری بیوی کو میرے کپڑے مت پہننے دینا۔ بتاؤ میرا کہنا مانو گے نا ؟"

شوہر نے جواب دیا: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری دوسری بیوی یہ کپڑے بالکل نہیں چھوئے گی۔ اور ویسے بھی یہ کپڑے نسرین کے جسم پر فٹ نہیں آئیں گے۔"

دو خبطیوں نے ایک کمرہ پینٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک چھت پر سفیدی کرنے کے لئے سیڑھی پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھی نے پوچھا "کہ تم نے برش کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے"

"بالکل" چھت پر سفیدی کرنے والے نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے" اس کے ساتھی نے کہا۔

"تم برش کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ مجھے تھوڑی دیر کا کام ہے۔ میں سیڑھی لے جا رہا ہوں۔"

بیگم صاحبہ نے دفتر جانے سے پہلے اپنی نئی ملازمہ سے تاکید کی کہ میرے واپس آنے تک بچوں کے منہ ہاتھ دھلوا دینا اور نئے کپڑے پہنا کر تیار کر دینا۔ بیگم صاحبہ چھٹی کے بعد گھر لوٹیں۔ تو ملازمہ نے بیگم صاحبہ کے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"بیگم صاحبہ! میں نے سب بچوں کے منہ دھلوا دیئے تھے لیکن یہ بچہ منہ نہیں دھلوا رہا تھا۔ میں نے زبردستی دھو دیا ہے۔"

تین سہیلیاں ایک چینی ہوٹل میں پہنچیں۔ بیرا مینو لایا اور تینوں نے اپنے اپنے پرس سے عینکیں نکالیں۔ پہلی نے شرما کر کہا۔

"میں صرف پڑھتے وقت عینک لگاتی ہوں"

"میں کار چلاتے وقت عینک لگاتی ہوں"، دوسری بولی۔

"اور میں" تیسری نے انکشاف کیا۔ "صرف اس وقت عینک لگاتی ہوں جب مجھے کچھ دیکھنا ہوتا ہے۔"

تمہاری عمر کتنی ہے۔ جج نے پوچھا۔ "یاد رکھو تم حلفی بیان دے رہی ہو۔"

"اکتیس سال چند مہینے۔" خاتون نے جواب دیا۔

"چند مہینے سے کیا مراد کیا ہے۔ مہینوں کی تعداد بتاؤ؟"

"جی" خاتون نے جواب دیا "ایک سو آٹھ مہینے"

ایک صاحب اپنے ملازم کی تعریف کر رہے تھے۔ فرمانے لگے: "وہ جتنا عرصہ ہمارے ہاں رہا کبھی بددیانتی نہیں کی۔ کبھی خیانت نہیں کی حتیٰ کہ جس دن میری لڑکی کو لے بھاگا اس کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

نسیمہ نے شمیمہ کو دیکھتے ہی کہا۔ "اگر میرا خیال غلط نہیں تو تم یقیناً امید سے ہو۔"

"میں تو تردید نہیں کرونگی۔" شمیمہ مسکرائی۔ "مگر یہ تو بتاؤ ابھی تو تمہاری شادی کو پورا سال بھی نہیں ہوا تھا۔ آخر تمہارے گھر میں اتنی جلدی بہار کیسے آگئی۔؟"

شمیمہ نے کہا: "میں ایک ہزار سالہ سنیاسی باوا کے پاس گئی تھی۔"

"اس کے پاس تو ہم لوگ جا چکے ہیں۔" نسیمہ نے کہا۔ "بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پچھلے تین سال سے میں اور میرا شوہر ہر دوسرے تیسرے ہفتے اس کے پاس جاتے ہیں۔ پھر بھی ہمارے ہاں کوئی پھول نہیں کھلا۔"

"احمق کہیں کی۔" شمیمہ نے مسکرا کر نسیمہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسے پہنچے ہوئے بزرگوں کے پاس ہمیشہ ... جانا چاہیئے۔"

غزل

امتیاز جےپوری
احمد آباد

عجیب میرا مقدر ہے کیا کیا جائے؟
رفیق ستمگر ہے کیا کیا جائے؟
وہ جس کے ہاتھ میں مہندی رچائی تھی میں نے
اسی کے ہاتھ میں خنجر ہے کیا کیا جائے؟
میں تشنہ لب دمِ آخر اداس بیٹھا ہوں
وہی سبو، وہی ساغر ہے کیا کیا جائے؟
مرے عزیز بھی پہچانتے نہیں مجھ کو
یہ دورِ آج کا محشر ہے کیا کیا جائے؟
میں بے وفائی کا الزام دوں تو کس کو دوں
ہر ایک شخص پیمبر ہے کیا کیا جائے؟
ہے امتیاز ہمیں غم سے اختلاف مگر
طویل دل کا سمندر ہے کیا کیا جائے؟

مکتوبِ پاکستان ——— ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) سے ایک مکتوب

بہ وساطت ہفتہ وار "لاہور"

رمتا جوگی کہ سفیرِ انسانیت

سردار گوپال سنگھ واحد خواجہ محمد لطیف انصاری کے چہلم میں

محترمی، پچھلے دنوں انسانیت دوستی اور اعلیٰ ایشیائی اقدار کا ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ ۱۶ ستمبر ۷۹ء کو یہاں ایک معروف مذہبی شخصیت اور شیعہ عالم دین خواجہ محمد لطیف انصاری مرحوم کا چہلم تھا۔ مرحوم کے اعزہ واقارب کے علاوہ پاکستان بھر سے بعض ممتاز شیعہ اکابر شرکت کے لئے آئے تھے کہ تقریب کے آغاز سے کچھ دیر پہلے یہ خبر سننے میں آئی کہ چہلم میں شرکت کیلئے مرحوم کا ایک شاگرد سردار گوپال سنگھ واحد نامی موگا۔ ضلع فیروز پور (بھارت) سے بھی آیا ہے۔

عجیب عزت افزائی تھی کہ انہی کی لائی ہوئی دستار بندی کے لئے منتخب ہوئی۔ یہ اعزاز انہی کے حصہ میں آیا۔ سردار گوپال سنگھ موگا کے کھاتے پیتے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آج سے چالیس بیالیس سال قبل خواجہ صاحب سے (جب مرحوم ڈی۔ ایم (دیانند متھرا داس) کالج موگا میں اردو و فارسی ادب کے پروفیسر تھے) کسب فیض کرتے رہے ہیں۔ ان کے ادب سے شغف اور ادبی شخصیتوں سے دلی لگاؤ کے پیش نظر انہیں واحد کا قلمی نام یا تخلص بھی خواجہ صاحب ہی نے دیا تھا۔

گلے میں کھلی قمیض۔ نیچے نیکر۔ پاؤں میں چپل، اور گردن اور کندھوں پر ایک تولیہ۔ جس پر ان کی گنگا جمنی داڑھی اور سر کے بال یا کیس جھولتے رہتے ہیں۔"

یہ صوفی منش بزرگ عام طور پر ٹھیٹ پنجابی میں گفتگو کرتے اور گفتگو کے دوران اس نفاست سے اردو کے بعض بلند پایہ اشعار اور انگریزی کی ضرب الامثال فٹ کرتے کہ سامع کے ذہن پر ان کا مافی الضمیر بہ تمام و کمال ثبت ہو جاتا ——— خواجہ صاحب مرحوم کے اعزہ واقارب نے بھی اپنے بزرگ کے اس بھارتی عقیدت کیش کی شایانِ شان پذیرائی کی۔ بعض شیعہ اکابر کے علاوہ جب انہیں اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ تو انہوں نے خواجہ صاحب سے اپنی وابستگی کا رونے ہوئے گلے اور برستے ہوئے اشکوں کے ساتھ اس جذباتی انداز میں تذکرہ کیا۔ کہ بیشتر آنکھیں شبنمناک ہو گئیں اپنے اس مختصر سے خطاب کے دوران انہوں نے وہ اظہار سپاس بھی پڑھ کر سنایا۔ جو ڈی ایم کالج اور سٹاف کے ممبران کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اور جس کی تحریر وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ویزا کیوں کر ملا

تقریب کے خاتمہ پر غیر رسمی بے تکلف گفتگو کا موقعہ ملا۔ اور راقم الحروف نے آپ سے ان کے اس سفر کے بارے میں چند باتیں دریافت کیں تو انہوں نے کہا کہ میں تو اسے محض اپنے استاد کی کشش کا معجزہ سمجھتا ہوں۔ جس وقت مجھے چہلم کی اطلاع ملی۔ اس کے بعد میرے پاس صرف ۴۸ گھنٹے تھے کہ اگر مجھے ویزا مل جائے تو میں بھاگم بھاگ پہنچ سکوں۔ چنانچہ میں نے دہلی پہنچ کر سفارت خانۂ پاکستان کا در کھٹکھٹایا اور جب میری ملاقات وہاں سفارت خانہ کے دو معزز ارکان خاور رمانی اور اے بی عظیم صاحبان سے ہوئی تو میں نے ویزے کی درخواست ان کے سامنے رکھ کر زبانی گزارش کی کہ مرحوم کے پسماندگان نے میری ان سے عقیدت کے باعث مجھے یہ اطلاع بھجوائی ہے۔ میں اس کے بعد صرف اتنا ہی کہہ سکتا تھا کہ موگے سے دہلی پہنچوں اور آپ کا در التفات کھٹکھٹاؤں۔ میری پاکستان جانے سے کوئی کاروباری غرض وابستہ نہیں اور اب اگر مجھے اجازت نہیں بھی ملتی تو میں اپنی جگہ مطمئن ہوں گا کہ جو کچھ میرے بس میں تھا میں کر گزرا۔ اب آگے آپ جانیں اور آپ کے اختیارات کہ آپ ان حالات میں یہ معجزہ دکھا سکتے ہیں یا نہیں، کہ میں وہاں پہنچ کر اظہارِ نیازمندی کر سکوں۔ اور میرا رواں رواں حکومتِ پاکستان کے سفارتخانہ دہلی کا ممنون ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی انسانیت دوستی نے یہ معجزہ کر دکھایا۔ اور دفتری کارروائی کے تمام مراحل ۲۴ گھنٹوں میں

طے کر کے، مجھے اس تقریب میں شرکت کے قابل بنا دیا۔ اس کے بعد میں ان کے جوابی مروت کے مظاہرہ کے طور پر بھارتی سفارتخانہ کے بارے میں کچھ پوچھ ہی والا تھا کہ انھوں نے کہا — اوہ — اب نہ رہ کر میرے دل میں یہ بات آرہی ہے کہ اسے کاش (جب سال دو سال کے بعد میری وفات پر) میرے بھوگ میں شرکت کے لئے یہاں سے میرے دوست موگا آنا چاہیں، بھارتی سفارت خانہ بھی ان سے ایسی ہی مروّت اور دلداری کا سلوک کرے۔ جب ایسا ہوگا تو میری روح مطمئن ہو جائے گی۔ یہ دیکھ کر کہ بھارت کا دامن بھی اعلیٰ مشرقی اقدار کی پاسداری کے سلسلے میں خالی نہیں ہے۔"

ادبی باتیں

اُن کے ادبی ذوق کے پیش نظر کچھ اور باتیں چھیڑیں۔ تو انہوں نے بتایا کہ انھیں صحافت سے بھی ایک زمانہ میں لگاؤ رہا ہے اور اس معاملہ میں بھارت کے سردار دیوان سنگھ مفتون، اور پاکستان میں ثاقب زیروی مدیر لاہور کا بے باک انداز تحریر ان کا پسندیدہ انداز صحافت ہے۔ عرض کیا کہ حضرت ثاقب زیروی تو پاک ہند شہرت کے شاعر بھی ہیں۔ تو کہنے لگے۔ ہاں میں نے تقسیم ہند سے پہلے متعدد دفعہ اور تقسیم کے بعد ۱۹۵۷ء میں انھیں دہلی کا ٹن ہال کے مشاعرہ میں سُنا جس میں جو غزل سب سے پہلے انہوں نے عطا کی تھی۔ اس کا یہ شعر آج بھی میرے قلب و ذہن پر نقش ہے۔ ؎

چھیڑتا ہے جو کوئی تذکرۂ مہر و وفا
رنگ کیوں آپ کے چہرے کا بدل جاتا ہے

اور اسی طرح ان کے دو شعر بھی جو ایک دفعہ انہوں نے ڈی ایم کالج موگا کے مشاعرہ کے بعد میری آٹوگراف بک میں ۱۹۳۰ء میں لکھے تھے۔ ؎

وفا یہ زندگی کی کون سی منزل میں لے آئی
ہر انساں کے نظر میں بے رخی محسوس کرتا ہوں
دو ہاں لے دو عالم کے بصیرت بخشنے والے
فریب زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں

اس سفیر انسانیت کے شوق اور مشاغل بھی عجیب سے تھے۔ تقریب سے فراغت ہوئی تو پاکستان کے فرزند جلیل چودھری سر محمد ظفر اللہ خان کا ڈسکہ میں آبائی مکان دیکھنے تشریف لے گئے سیالکوٹ میں پاسپورٹ وغیرہ میں اندراج کے سلسلے میں گئے تو ہوا کہ پولیس آفس سے فراغت کے معاً بعد حکیم الامت حضرت علا[مہ اقبال] کے مکان پر اظہار نیاز کے لئے جا پہنچے۔ میں نے چلتے وقت اُن [کے] شستہ و رفتہ انداز گفتگو کی تعریف کی تو اپنے مخصوص براد[رانہ] انداز میں بڑے انکسار سے کہنے لگے۔

"میرے عزیز۔ یہ سب ان بزرگ سکالروں اور شعروا[دب کے] نگہبانوں کی صحبتوں کا فیض ہے۔ اس میں میری اپنی کسی صلا[حیت] کا دخل نہیں" — یہ کہا اور اپنے تولیہ کو گردن کے گرد لپیٹ[کر] سب حاضرین سے گہرے معانقے کے بعد لاہور کے لئے روانہ [ہوئے] اور ڈسکہ کے صاحب ذوق حضرات کی محفلوں میں اس سفیر انسا[نیت] اور اس رشتے جوگی کے تذکرے آج بھی اسی لذت کے سا[تھ] ہو رہے ہیں۔

اصغر علی (ڈسکہ)

غزل

حنیف ...

تبسم سے انھیں غم ہو نہ جائے
سبب خوشیوں کا ماتم ہو نہ جائے

سُنا دوں حالِ غم لیکن یہ ڈر ہے
کسی کی آنکھ پُر نم ہو نہ جائے

کسی کا درد وجۂ زندگی ہے
الٰہی دردِ دل کم ہو نہ جائے

سکونِ زندگی کی جستجو میں
نظامِ زیست برہم ہو نہ جائے

حنیف اس برہمی میں سر یہ تیرا
کسی کے سامنے خم ہو نہ جائے

حضرت علامہ عشق آبادی کا آخری کلام

علامہ تحمر عشق آبادی ماہ جنوری کے آخر میں دفتر شان ہند میں تشریف لائے اور اپنا تازہ کلام برائے اشاعت مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد وہ بستر علالت پر دراز ہوگئے اور ادھر میں ہارٹ اٹیک کے باعث ۳ر مارچ کو داخل ہسپتال ہوگئے اور پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کا یہ تازہ کلام اب آخری کلام کے طور پر نذر ناظرین ہے۔

(سرور تونسوی)

دورِ نازک کی قسم

جو ہو بد پرہیز ایسے چارہ گر سے عار ہے
بے عمل واعظ سے ہر سامع کا دل بیزار ہے

بھائی سے بھائی کے دل میں کینہ ہے پیکار ہے
بہرِ تکمیلِ ہوس کتنے دلوں میں خار ہے

جو یہ کہتے ہیں کہ ہر انساں سے ہم کو پیار ہے
اتحادِ باہمی رکھو تو بیڑا پار ہے

ایسا ہر ناصح مگر لڑنے کو خود تیار ہے
بھیڑ کا بچہ یہ خون آشام اک گلدار ہے

عدل اسیرِ ظلم مجروحِ ستم خوں بار ہے
قتل و غارت کی بدولت گرمیٔ بازار ہے

دن دہاڑے عصمتیں لٹنے سے ہاہاکار ہے
جس کی سو کوڑے سزا اس جرم کی بھرمار ہے

دوست بن کر جو دغا دے وہ بڑا مکار ہے
جو بغل میں جا گھسے مکار کی عیار ہے

جیبکیوں سے جس کی ایک اک دیدہ ور ہشیار ہے
شیر کی کھال اوڑھنے والا وہ گیدڑ یار ہے

جو خلافِ حق کہے وہ ملک کا غدار ہے
دو سو درے ہیں مناسب یا سزائے دار ہے

جس کا ہر وعدہ ادھار اللہ کی سرکار ہے
خواب میں تعمیر ہے تعبیر میں مسمار ہے

دورِ نازک کی قسم اب زندگی دشوار ہے
شاعری دشواریوں پر مستقل آزار ہے

غزل

نسیم پھاں پوری

ترے کوچہ میں سب پر پھول برسے
مگر ہم ایک پتھر کو بھی ترسے

وقارِ بندگی ہے تیرے در سے
ترے در کا بھرم ہے میرے سر سے

ہمیں نے بھیک بھی جلووں کی مانگی
ہمیں محروم بھی تابِ نظر سے

پتہ دیتے ہیں قدموں کے نشانات
کوئی گزرا ہے پہلے بھی ادھر سے

جسے کہئے مرا عہدِ جوانی
گئی وہ دھوپ اب دیوار پر سے

چلا ہوں اس لئے طوفاں بہ طوفاں
بہت نزدیک ہے ساحل ادھر سے

پریشاں ہے مری چشمِ تجسس
مجھے آواز دی تم نے کدھر سے

خلوصِ دل اگر شامل نہ ہوتا
پلٹ آتی ... دعا بابِ اثر سے

مری منزل شناسی اللہ اللہ
نسیم آگے ہوں اپنے راہبر سے

عید کے دن

بی اے کیرانوی

چار سو ہے نئی تنویرِ سحر عید کے دن
ذرّے ذرّے کو ملا نورِ قمر عید کے دن

بندگی کیا ہے حقیقت میں یہ پوچھو ان سے
سجدہ ریزی میں ہوئی جن کی سحر عید کے دن

ختم ہوتی ہے جہاں صبر و رضا کی منزل
رحمتوں کے وہیں کھل جاتے ہیں در عید کے دن

کچھ سمجھ پائے ہیں دراصل وہی رمزِ حیات
جھک گئے ہیں جو درِ ناز پہ سر عید کے دن

زندگی جن کی ہے تصویرِ یقینِ محکم
ان کے پاتے ہیں جلا ذوقِ نظر عید کے دن

اہلِ ایمان جنہیں نہلاتے ہیں خونِ دل سے
ان ہی شاخوں سے برستے ہیں ثمر عید کے دن

منفعل آنکھوں سے ڈھلتے ہیں جو آنسو، انکو
رحمتیں چنتی ہیں باشوقِ گہر عید کے دن

بزمِ عشرت میں چھلکتے ہیں کہیں جامِ نشاط
اور پیتا ہے کوئی خونِ جگر عید کے دن

رنج و غم جن کے مقدر کا بنے سرمایہ
ان کے دامن میں ہو خوشیوں کے گہر عید کے دن

اس طرح دنیا کے ہونٹوں کو تبسم دے دو
کوئی انسان نہ رہے دیدۂ تر عید کے دن

یہ ہے یکجہتیٔ انسان کے لئے اک مرکز
آؤ ہم ایک کریں قلب و نظر عید کے دن

دے زمانے کو اخوت کا نیا [illegible] پیغام
صاف الفت کی ہو ہر راہ گزر عید کے دن

زندگی کی ہے یہ عظمت کا تقاضا عاصی
ہو جہاں دارِ جہاں "خلدِ نظر" عید کے دن

غزلیں

نسیم شاہ جہاں پوری

[illegible] پر سرِ پیکار کہ بس
آج ہے شیخ و برہمن کا وہ کردار کہ بس

جب بھی پیراہنِ ہستی کی طرف ہاتھ بڑھا
مصلحت نے کہا مجھ سے ہر اک بار کہ بس

صاحبِ جلوہ پہ ہے جلوہ نمائی لازم
خود ہی جب تک نہ کہے طالبِ دیدار کہ بس

جلوہ فرما کرم جلوۂ پیہم کے نثار
کہہ دے کس دل سے بھلا طالبِ دیدار کہ بس

اور دریائے کرم جوش میں آجاتا ہے
جب بھی کہتا ہے لبِ شکرِ طلب گار کہ بس

یہ بھی کیا کم ہے کہ بخشش کا یقیں ہے ورنہ
ورنہ میں ہوں وہ سیہ کار و گنہگار کہ بس

چشمِ پُر آب میں ان کی وہ جھلک قہر کی اُف
ہیں سمندر میں وہ طوفان کے آثار کہ بس

تا قیامت سہی مجبور ہوں جینے کے لئے
اُس نے اس طرح کیا وعدۂ دیدار کہ بس

سب سے منصور کی تقلید نہیں ہو سکتی
اس قدر سخت ہے یہ مرحلۂ دار کہ بس

میری ہر بات وہ ٹھکرائے چلے جاتے ہیں
ضد پہ وہ ضد ہے، وہ انکار پہ انکار کہ بس

جب سے حالات کے زنداں میں ہیں فنکار اسیر
اس قدر پست ہے تخلیق کا معیار کہ بس

ناقدو مجھکو بتاؤ کہ برائے تنقید
پیش خدمت کروں کیا اور کچھ اشعار کہ بس

صبح تک دیکھئے کیا دل پہ گزرتی ہے نسیم
شام ہی سے [illegible] تے ہیں وہ آثار کہ بس

اختر شاہجہاں پوری

جو حوادث کے مقابل نہیں ہونے پایا
میرے احباب میں شامل نہیں ہونے پایا

کوئی کیا دے گا ہمیں بھیک کرم کی [illegible]
ہم سے خود دار تو سائل نہیں ہونے پایا

ان کی آنکھوں میں سماجاتا ہے ہر اک [illegible]
جو ترے عشق میں کامل نہیں ہونے پایا

ہمسفر اپنا کوئی ڈوب گیا ہے شاید
ہم جو آسودۂ ساحل نہیں ہونے پایا

دیکھ لیتی ہے بہر رنگ انھیں میری [illegible]
لاکھ پردے سہی حائل نہیں ہونے پایا

اپنے احباب پہ تکیہ تو بجا ہے [illegible]
یہ سہارا کبھی حاصل نہیں ہونے پایا

سعیٔ پیہم نے اثر اپنا دکھایا آخر
ورنہ حل عقدۂ مشکل نہیں ہونے پایا

تعلیم اور مسئلہ معاش

بیدل سرحدی بی۔اے ادیب کامل
۱۱۔ کلکٹر گنج، ہاپوڑ (یو پی) ۲۴۵۱۰۱

پرانے وقتوں میں ہماری زندگی سادگی پسند اور معاشرتی ماحول متوازن تھا آزادی سے قبل انسان کی نیک نامی کا قیمتی اس کے بنک بیلنس پر مبنی ہے یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سماج کسی غیر متحرک، جامد ساکن یا ٹھہری ہوئی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے گروپ کا نام ہے جس میں مقاصد، اقدار اور رہن سہن کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ سماج زمانے کے حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے یہ کبھی مکمل نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ زیر تشکیل رہتا ہے ایک ایسی دنیا میں جہاں ہر چیز بدلتی رہتی ہو وہاں کسی چیز کے مستقل یا دائمی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں سے میری مراد یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ تعلیم کے بنیادی مقاصد سے متعلق لوگوں کے نظریات کا بدلتے رہنا (ایک فطری) امر ہے ضمنی تذکرہ کے طور پر یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے مگر تعلیم کی قدروں اور مقاصد کا تعین سماج کرتا ہے مثال کے طور پر امریکہ میں تعلیم کا مرکزی مقصد تحریر و تقریر کی انفرادی آزادی کو فروغ دینا ہے مگر روس عوام کی بھلائی کے لئے تحریر و تقریر کی انفرادی آزادی کو قربان کر سکتا ہے اس لئے وہاں کے نظام تعلیم میں سماجی نظام کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔

بہر نوع ہمارے ملک میں انگریزوں کے تسلط کے دوران تعلیم کے بنیادی مقاصد میں مسئلہ معاش کو جو اہمیت حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ انگریز جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو انھوں نے ایک ایسے گھٹیے نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی جس کا واحد مقصد ان کے دفتری نظام کے چلانے کے لئے پڑھے لکھے "بابو" تیار کرنا تھا اس کا ثبوت لارڈ میکالے کی اس تحریر سے بھی ملتا ہے۔ کہ ہمیں ایک ایسا طبقہ تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر لباس، انداز فکر کے اعتبار سے انگریزی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذریعہ تعلیم میں انگریزی کو لازمی قرار دیا گیا اور بچوں کی تعلیم دینی کتابوں کی رٹائی اور تعلیمی سندوں کے حصول تک محدود ہو کر رہ گئی۔ تعلیم کا مقصد محض دفتری ملازمت حاصل کرنا سمجھا جانے لگا۔ طلباء یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اہم فریضہ رٹ رٹا کر امتحان پاس کرنا ہے اور اساتذہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ان کے درس و تدریس کا مقصد محض دفتری ملازمت کے لئے بچوں کو تیار کرنا ہے۔ لہذا بچوں کے ذہن کتابی معلومات اور اعداد و شمار کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے اور ان کے اعصاب پر کتابیں سوار ہوتی گئیں بلا شبہ انگریزوں نے ۱۸۵۴ء سے ۱۹۴۷ء تک اپنی حکومت کے دوران تعلیمی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لئے بظاہر بہت سی کمیٹیاں اور کمیشن مقرر کئے ... مگر ان کی سفارشات پر عمل درآمد کرنے میں ہمیشہ ان کی خود غرضانہ ڈپلومیسی کارفرما رہی۔ ہمارے صاحب بصیرت طبقوں میں نظام تعلیم کے ناقص ہونے کا احساس دورِ غلامی میں بھی موجود تھا مگر اس وقت وہ مجبور و لاچار تھے کیونکہ انگریزوں کی خود غرضی سیاست تعلیمی اصلاحات کے منافی تھی۔

یہاں ان افلاس زدہ گھرانوں کے بچوں اور ان کی تعلیم کا ذکر تو لاحاصل ہے جن کے بچوں کو تعلیم تو کجا پیٹ بھر کھانا بھی میسر نہ ہو پاتا تھا۔ البتہ متوسط درجہ کے ان والدین کا ذکر نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے جنھوں نے تعلیم کا مقصد صرف بچوں کو کمانے کے قابل بنانا سمجھ لیا تھا جن کے دماغوں میں یہ بات گھر کر گئی کہ ان کے بچے مخصوص اداروں میں اس قسم کی تعلیم حاصل کریں جو انھیں جلد از جلد کسی منصب پر پہنچا دے جنھوں نے اپنے بچوں کو فقط مستقبل کی تیاری کا مرکز کے تحت ایسے مضامین اور فنون کی تربیت کے لئے مجبور کیا جو بہتر روزگار کے لئے معاون ثابت ہوں چاہے ان کے بچے اسکول کی تعلیم کا صحیح طور پر کوئی مقصد ہی نہ سمجھتے ہوں۔ بلا شبہ تعلیمی مقاصد میں مسئلہ معاش کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا عوام کو حسابات کا حق حاصل ہے کہ ان کے

بچے پڑھنے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں یا کوئی ایسا ہنر سیکھ لیں جو انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دے مگر عوام کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تعلیم کا مقصد محض وسیلۂ روزگار سمجھ لیں اور مسئلہ معاش کو مرکزی اہمیت یا اولیت کا درجہ دے کر بچوں کو اخلاق و عادات اور تہذیب و تمدن کی قدروں سے روشناس نہ ہونے دیں۔ بچوں کو شروع ہی سے کام میں لگا کر ان کے تمدنی اور اخلاقی پہلو [illegible] پر تیک لگا دیا۔ اور ان دلچسپیوں، فطری صلاحیتوں، رجحانات اور ان کی نفسیاتی خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر دیں جس سے وہ معاشرہ کا مفید کارکن بننے کے بجائے سوسائٹی کے لئے پریشانی و مصائب کا سبب بن جائیں۔ انھیں اپنی کتابوں سے محبت نہ رہے، اساتذہ کے لئے ان کے دلوں میں احترام کا جذبہ نہ رہے، وہ مشکل، بے کیف، مصنوعی اور بور کن تعلیم کے سبب اسکول کی تعلیم سے دلی نفرت کا اظہار کرنے لگیں۔ یا وہ مزاجاً کتاب زدہ، غیر مطمئن، مضطرب اور متوحش بن جائیں اور ان کا شمار سوسائٹی کے بیمار افراد میں ہونے لگے۔ اس بارے میں مزید وضاحت کے لئے یہاں برناڈ شا کے نظریے کا ذکر برمحل ہوگا کہ "سوسائٹی کے بیمار افراد ایک بیمار قوم ہی پیدا کرتے ہیں۔ ایسی قوم زندگی کے لئے ایک ذلت ہے"، یہاں اس حقیقت سے بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم کا کوئی جامع یا متوازن نظام بچوں کو صرف درسی تعلیم دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان میں ہمدردی، تعاون، شگفتگی، جدت، قیادت اور اختراعیت کی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ ان اوصاف میں تربیت حاصل کئے بغیر بچے تعلیم کے اصل مفہوم سے کسی صورت بھی مستفیض نہیں ہو سکتے۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی قیادت میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن [illegible] جس نے ہمارے نظام تعلیم کی بنیادی خامیوں پر روشنی ڈالی اور انھیں دور کرنے کے لئے متعدد تعمیری تجاویز بھی پیش کیں۔ ۱۹۵۱ء میں لکشمن سوامی کی صدارت میں سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن مقرر ہوا جس نے اسکولوں میں پیشوں کی تعلیم کو شامل نصاب کرنے اور ذریعۂ تعلیم مادری زبان قرار دینے کی پرزور سفارش کی۔ اس دوران اسکولوں اور طلبہ کی تعداد میں تو کافی اضافہ ہوا مگر تعلیم کا معیار۔ بعد ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر کوٹھاری کی زیر قیادت قائم رہا جس نے قومی نظام تعلیم کے بارے میں اپنی سفارشات کیں مگر تعلیمی اصلاحات سے متعلق مقرر کئے گئے کمیشنوں کو عموماً بے توجہی کا نذر ہوتی رہیں اور کوئی خاطر خواہ نتائج نہ ہوئے اس سلسلے میں تیس برسوں کی مایوس کن کارگزاری بنیاد... [illegible] "برائے نام ترقی" کا نام ہی دے سکتے۔

- آج بھی ہماری تعلیم کا ڈھانچہ قریب قریب وہی ہے جو انگریز تیس برس پہلے چھوڑ گئے تھے۔
- آج بھی ہمارا نصاب تعلیم اپنے اوپر صدیوں سے کیلئے ہم سے فریاد کناں ہے۔
- آج بھی ہمارے تدریس کے مروجہ طریقے ناقص ہیں [illegible] کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے۔
- آج بھی بوسیدہ طریق تعلیم کے باعث ہم انسا[ن کی] صحیح تشکیل نہیں کر سکتے۔
- آج بھی اوسط درجہ کے بیشتر افراد کے دماغوں میں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا مقصد سرکاری یا غیر سرکاری ملاز[مت] کے حصول تک محدود ہے۔
- آج بھی ذریعۂ معاش کے معاملہ میں مستثنیات کو چھوڑ کر کوئی بھی شخص انفرادی صلاحیتوں کے مطابق اپنے مقام پر نہیں ہے۔
- آج بھی ہمارا معاشرہ درس تدریس کے مقدس ا[ور اہم] کام کو ایسے لوگوں کو سونپنے کے لئے مجبور ہے جن کی اکثریت مفلوج الفکر اور دقیانوسی فکر و عمل کی حامل ہے۔
- آج بھی تعلیم بچوں اور ان کے والدین کے لئے [illegible]
- آج بھی مناسب ماحول کی عدم فراہمی کے سبب ہم [illegible] کی حفاظت نہیں کر سکتے۔
- آج بھی نامناسب ماحول کے سبب ہم اپنے آپ کو بدلتی دنیا یا بدلتی ہوئی معاشرتی قدروں سے ہم آہنگ نہیں کر سکتے۔

ادھر ملک میں ملازمت کے ذرائع میں بتدریج کمی سے یہ حال ہے کہ ہندوستان کی راجدھانی دلی میں [illegible]

گریجویٹ اور چار ایم اے پاس اصحاب بطور چپراسی کام کر رہے اور امسال یعنی ۱۹۷۸ء میں دلی میونسپل کارپوریشن کے پرائمری ٹیچروں کی آسامیوں کے لئے چھ ہزار گریجویٹوں اور چھتیس پی ایچ ڈی اصحاب نے درخواستیں دی ہیں۔ بے مقصد تعلیم کا اگر یہی سلسلہ جاری رہا، تعلیم اور ملازمت کے رشتے میں اگر یونہی گہری وابستگی کو برقرار رہنے دیا گیا تو مستقبل قریب میں اگر ہزاروں نہیں سینکڑوں پی۔ ایچ۔ ڈی صاحبان کو چپراسی کی نوکری کے لئے درخواستیں دینے پر مجبور رہنا پڑے گا۔ یہاں اس بات کا ضمناً وضاحت بے محل نہ سمجھی جائیگی کہ ہر انسان کے ذہن میں ترقی کا ایک معیار ہوتا ہے اور یہ معیار جتنا بلند ہوتا ہے اتنا ہی طاقتور انسان کے اندر اکتساب کا جذبہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے لئے مناسب ماحول کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اس بارے میں ڈاکٹر واٹسن کا کہنا ہے کہ "اگر مناسب ماحول فراہم کیا جا سکے تو کسی بھی بچے کو ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، پروفیسر، سائنسدان یا مصور وغیرہ بنایا جا سکتا ہے"۔ واٹسن کے اس نظریے سے کچھ ماہرین تعلیم کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر اختلاف کے باوجود ہم ماحول کے سودمند اثرات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے ہم مناسب ماحول کی افادیت کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ آج مناسب ماحول کی فراہمی اور بوسیدہ طریق تعلیم میں تبدیلی وقت کی اہم اور فوری ضرورت ہے۔ اس ضمن میں تغافل سے کام لینا یا موجودہ صورت حال کو برقرار رہنے دینا ملک اور قوم کی ترقی میں رکاوٹ کے امکانات کو یقینی بنانے کے مترادف ہے۔

بقیہ صفحہ ۳۰ سے من کہ مکتوب الیہ

جناب سرور صاحب،

نذرانہ ہائے خلوص و نیاز

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ "صحیفۂ ادب" اگست کیلئے خاص "شان ہند" کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی آپ نے نہایت ہی کاوش اور صحافیانہ صلاحیتوں اور کارپردازیوں کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے اور شمارہ کی خصوصیت کے مدنظر کافی ادبی اور علمی مواد فراہم فرمایا ہے۔ یہ آپ کی "ادب پروری" اور "سخن نوازی" کی آئینہ داری ہے۔ کہ آپ نے اس نمبر کو "اہل قلم" کی تصویروں سے آراستہ کیا ہے جب کہ اکثر اعیان ادب و صحافت ایسے شماروں کو "اہل سیاست" کی تصویروں سے مزین کیا کرتے ہیں۔ بہر حال میں آپ کی اس علم دوستی اور ادب نوازی کے ساتھ ایسا اچھا اور کامیاب شمارہ نکالنے پر دلی مبارکباد اور ہدیۂ ہائے تہنیت پیش کرتا ہوں۔

لیکن اس دور کے اہل قلم اور صاحب ذوق حضرات کی اس سرد مہری کو دیکھکر قدرے افسوس ہوا کہ اس مخصوص قومی شمارہ میں زیادہ تر داعیان سخن نے قومی، وطنی، انسانی اور آزادی جیسے موضوعات سے ہٹ کر صرف روایتی کلام پیش کیا ہے جبکہ ایسے مخصوص نمبروں کا مقصد اور تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اہل فکر اور صاحب قلم حضرات ایسے موقعوں پر خاص موضوعات پر قلم فرسائی کریں اور ان سے متعلق نظریات اور خیالات پر روشنی ڈالیں۔ دراصل یہ خاص شمارے فنکاروں کیلئے بھی ایک خاص دعوت فکر و خیال لیکر آتے ہیں۔

نیازکیش۔ توصیف علوی کیرانوی

بقیہ صفحہ ۲۷ سے باب انتقاد

شاعری میں "دوہے" بھی ایک صنف ہے جو اردو شاعری میں کافی حد تک کم یاب رہی ہے۔ بقول جناب گوپال متل اردو میں دوسرے شاعروں نے جو دوہے لکھے ہیں وہ دوہے کی اصل بحر میں جواب تک ہندی سے مخصوص رہی ہے نہیں لکھے گئے ہیں۔ اعجاز کے دوہے اصل ہندی بحر میں ہیں۔ اس طرح انھوں نے اردو میں ایک نئی صنف شاعری کو استحکام دینے کے ساتھ ہمیں ایک نئی بحر سے بھی روشناس کرایا ہے"۔

"آس نراس کی شام" خالص ہندوستانی زبان میں لکھے گئے دوہوں کا بہت اچھا مجموعہ ہے۔ جو سات روپیہ میں مطبوعہ مکتبہ شاہراہ ۱۷۔ ۳۳ دہلی گیٹ نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰ سے دستیاب ہے۔ دفتر شان ہند نئی دہلی ۶ سے بھی یہ مجموعہ دستیاب ہو سکتا ہے۔

من کہ مکتوب الیہ

ایس۔ ایس کالج، ہیلاکانڈی۔ آسام

مشفقی و محبی سرمد صاحب، نمستے

شان ہند کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ شان ہند اپنے بیباک اداریوں کے لئے تو مشہور تھا ہی اب "بکوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" اور "گوشۂ عقیل" جیسے دو مستقل فیچروں نے اس کی آب و تاب میں یقیناً مزید اضافہ کر دیا ہے۔

اردو اور مسائل اردو پر آپ کے خیالات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور میں آپ کے نقطۂ نظر کو ہمیشہ پسند کرتا ہوں۔ ساتھ ہی آپ اردو کے گمنام گوشوں کو روشنی میں لاتے ہیں۔ اور ابھرتے ہوئے قلم کاروں کی خاصی عزت افزائی کی ہے۔ مثلاً راجستھان میں اردو کے احوال و کوائف پر مشتمل آپ نے شان ہند کا خصوصی نمبر شائع کیا۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ آپ اس خصوصی نمبر کو کتابی شکل میں دوبارہ شائع کرنے پر غور کریں۔ راجستھان کی اکیڈمی کو چاہئے کہ امداد کرے۔

واقعی، شان ہند خوب سے خوب تر ہونے کی مساعی جمیلہ میں برابر لگا ہوا ہے۔

آپ کا ـــــ تاراچرن رستوگی۔

◎ ۳۰/۶ ـ بی۔ مائیتری پارک
چمبور، بمبئی ۷۱

برادرِ عزیز! مکرم و محترم جناب سرمد صاحب!!

آپ سب کے لئے دعائیں۔ آپ کا خلوص نامہ ملا؛ "شانِ ہند" کا تازہ پرچہ بھی ملا جسے میں شروع سے آخر تک ایک ایک لفظ پرنٹ لائن تک پڑھتا ہوں۔ "شان ہند" بسترِ علالت پر میرا عزیز رفیق ہے اور دن رات میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ تازہ شمارہ میں گلِ جیل چہ گفت؟ و گل چہ شنید ... کی شدید کمی محسوس ہوئی۔ آپ کے دوسرے قارئین کو بھی یہی محسوس ہوا ہوگا۔ حقائق سے بھرپور "یوم آزادی کا خیر مقدم" اداریہ جناب فیاض گوالیاری کی جسے میں نے دوبار جھوم جھوم کر پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ ستم ظریفی کی یہ حد ہے اور اسے انقلابِ زمانہ ہی کہنا چاہئے کہ "بیسویں صدی" جس کی پیشانی پر میرا نام چھپتا ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے میرے نام بند ہے۔ میرے نام سے جاری کرنا تو کجا میرے خطوط کا جواب تک نہیں دیا جاتا۔

آپ کا دعاگو ـ خوشتر گرامی

◎ ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں
نزد سٹی پوسٹ آفس۔ پاکیا، ہیلی بھیت

مخدومی جناب سرمد صاحب، تسلیمات!

میں دہلی آیا تھا۔ آپ کے دولت کدے پر یوں تو میری حاضری ایک تجارتی مقصد کے تحت تھی۔ لیکن آپ کے گھر کے تمام چھوٹے بڑے لوگوں نے آپ کی عدم موجودگی میں میرے ساتھ حسنِ خلوص محبت اور اپنائیت کا برتاؤ کیا۔ میں اس سے انتہائی متاثر ہوں۔

مجھے تو یہ محسوس ہوا کہ جیسے میں اپنے ہی گھر میں آگیا ہوں۔ آپ کے گھر کے سب چھوٹے بڑے بہت اچھے ہیں۔ میرا سب سے آداب کہدیجئے۔ اب جب بھی میں دہلی آؤں گا۔ اپنے "اس گھر" پر ضرور حاضری دوں گا۔ امید ہے آپ بھی اپنا چھوٹا سمجھیں گے۔ ایک بیٹے کی طرح۔ آج سے ہمارے اور آپ کے درمیان تجارتی معاملات کبھی نہ ہوں گے صرف روح اور آتما کا واسطہ رہے گا ـ!

آپ کے یہاں سے میں "شان ہند" کا تازہ پرچہ لے آیا تھا آپ کے مضمون "بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر" کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں ادب کے تعلق سے مذہبی پاسداریوں اور دیواروں کا قطعی قائل نہیں ہوں۔ اور اس سے پہلے اگر کچھ تھا بھی تو آپ کے تمام گھر والوں کی محبت نے اُسے ہمیشہ کے لئے بالکل ختم کر دیا ہے۔

آپ کے درِ دولت سے محبت کی کیفیات سے سرشار ہو کر میں جب نکلا ہوں، تو ریاض خیرآبادی کے اس شعر کے مثل میری

کا یا پلٹ ہو چکی تھی بس ـــ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

آپ کا چھوٹا
ذکاء الدین شایاں

⊙ سہارنپور
۱۰ / اکتوبر ۱۹۷۹ء

عزیزم سلمہٗ .... دعائیں

ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ اس خط کے ہر لفظ نے میرے ساتھ وہی کام کیا جو بوئے پیرہن نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔

خدا آپ کو رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ آمین

اگر موقع ملا تو میں آپ کو رڑکی کے مشاعرہ میں ملوں گا۔ غالباً آپ کو مشاعرہ میں بھی بلایا گیا ہوگا۔ ورنہ پھر دہلی آؤں گا

میں کل مراد آباد جا رہا ہوں

روحی سلمہا کو بہت بہت آشیرواد

دعاگو ـــ آرزو سہارنپوری

● بلاری ـــ ۹ / ستمبر ۱۹۷۹ء

قبلہ سرور صاحب آداب و نیاز!

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ اگست کا "شانِ ہند" مل گیا چاروں قطعات مع تصویر کے شائع کرنے کے لئے بہت بہت شکریہ۔ میں نے اردو، ہندی کے جتنے بھی رسائل اب تک دیکھے ہیں کسی بھی ایڈیٹر صاحب کو آپ جیسا اہلِ قلب و انفتاح نہیں دیکھا کہنے کو تو سارے ہی ادب ایک گلستاں ہوتے ہیں اور ہر شاعر ایک پھول ہوتا ہے۔ لیکن اہلِ چمن کی نظر چند پھولوں کی طرف زیادہ جاتی ہے کچھ پھول تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ آپ نے غیر معروف شعراء کو جس طرح اس بحر میں نوازا ہے یہ آپ کا کمالِ انفرادیت ہی ہے۔ اردو کے اس دورِ انحطاط میں آپ کا یہ قدم ہر رہبرِ ادب کو دیا دکھلائے گا۔

میں نے ایک خط اس سے پہلے لکھا تھا شاید آپ کو مل گیا ہو۔ دھوکے سے ایک قطعہ وہ بھی لکھ گیا ہوں جو شانِ ہند میں شائع ہو چکا ہے (غلامی کا اثر انسان کے تن ہی تک نہیں رہتا) اگر مناسب سمجھیں اور "شانِ ہند" کی شان کے خلاف نہ ہو تو صرف ایک ہی قطعہ تو کسی ورق پر جگہ دے دیں۔ مجھے اشاعت سے اتنی خوشی نہیں ہوتی۔ جتنی خوشی آپ کے توجہ فرمانے پر ہوتی ہے۔

میری شاعری کا اصل میں دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ سادہ بات کو سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی ایک کوشش ہے۔ میں ثقیل الفاظ سے مضمون کو بوجھل بنانے کے خلاف ہوں لفظوں کی شعبدہ بازی مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے یہ سادگی مجھے کہیں کا بھی نہ چھوڑے مگر میں اپنا راستہ نہیں چھوڑوں گا۔ باقی ملاقات پر۔ منتظر۔

آپ کا نیازکیش ـــ آرمان بلاری

● نصیر آباد (راجستھان)

حبیبی و طبیبی سرور صاحب، آداب و نیاز!

مودت نامہ موصول ہوا اور شانِ ہند کا آزادی ایڈیشن بھی نظر نواز ہوا۔ ماشاء اللہ خوب ہے۔ مضامین، نظم و نثر کے سلسلہ میں آپ کے حسنِ انتخاب اور اندازِ ترتیب کی کیا تعریف کی جائے؟ سچ پوچھئے تو آپ ایک مرتبہ پھر مدیرانہ اہلیت اور صحافتی مہارت کی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ محترمی عبدالعزیز خالد صاحب کی نعت پاک تو بہت ہی پسند آئی "ماذ ماذ" جیسی ایمان افروز تخلیق پر ان تک میری مبارکباد پہنچا دیجئے گا ـــ اور ــ بکوئے یار ...... کے تحت تقدس مآب حضرت مولانا الحاج شاہ معین الدین صاحب مدظلہ العالی کے فیض و برکت کے روح پرور واقعات نے بیحد متاثر کیا۔ کیونکہ خاکسار خود بھی مصنف، مفتی قاری، حافظ، الحاج مولانا ابوالقاسم شاہ محمد عتیق رحمۃ اللہ علیہ فرنگی محلی لکھنوی کے دست حق پرست پر سلسلۂ قادریہ، رزاقیہ نظامیہ میں بیعت ہے۔ حضرت پیر و مرشد دو برس ہوئے کہ واصل بحق ہوگئے ـــ

خدا رحمت کند ایں بندگانِ پاک طینت را

مخلص ـــ مقبول نصیر آبادی

● کیرانہ علوی منزل

عنایت و کرم فرما!

(باقی ص ۳۴ پر)

قومی بچت اسکیمیں

اب

زیادہ سود فراہم کرسکتی ہیں

یکم اکتوبر 1979 سے کھولے جانے والے کھاتوں کے لئے

کھاتہ/سکیورٹی	سود کی نئی شرح	مدت کی تکمیل پر واجب الادا رقم	کیفیت
1	2	3	4
(i) ڈاک گھر بچت بنک کھاتہ	5.5 فیصد	–	واحد/مشترکہ/پنشن/سنچایکا/ پراویڈنٹ یا سپرانیوشن یا گریجوٹی فنڈ کھاتہ۔
	5 فیصد	–	سرکاری کھاتہ
	3 فیصد	–	سکیورٹی ڈپازٹ اور دیگر کھاتے
(ii) ڈاک گھر میعادی جمع کھاتہ	8 فیصد	–	ایک سالہ کھاتہ — سالانہ قابل ادا سود ششماہی مدت کے مطابق حساب لگایا جاتا ہے
	8.5 فیصد	–	2 سالہ کھاتہ
	9 فیصد	–	3 سالہ کھاتہ
	10.5 فیصد	–	5 سالہ کھاتہ
(iii) 5-سالہ ڈاک گھر ریکرنگ ڈپازٹ کھاتہ	10.5 فیصد (مرکب)	10 روپے ماہانہ کے کھاتے 778.10 روپے بن جاتے ہیں	دیگر رقموں کے کھاتوں میں اسی تناسب کے مطابق رقم ملتی ہے۔
(iv) ×10 سالہ اجتماعی میعادی کھاتہ	6.75 فیصد (مرکب)	10 روپے ماہانہ کے کھاتے میں 1693.20 روپے بن جاتے ہیں۔	ایضاً۔ کھاتوں پر انکم ٹیکس کے قانون مجریہ 1961 کی دفعہ 80 سی کے تحت انکم ٹیکس میں چھوٹ ملتی ہے۔
(v) ×7 سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ (دوسرے اجراء)	6.5 فیصد (مرکب)	100 روپے کے کھاتے میں 155.50 روپے بنتے ہیں۔	تین برس بعد رقم واپس لی جاسکتی ہے
(vi) 7 سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ (پانچواں اجراء)	10.75 فیصد (مرکب)	100 روپے کے کھاتے میں 204.50 روپے بنتے ہیں	
(vii) 5 سالہ قومی ترقیاتی بانڈ	10.5 فیصد (مرکب ششماہی مدت کے مطابق حساب لگایا جاتا ہے)	100 روپے کے کھاتے میں 167 روپے بنتے ہیں۔	

× سود انکم ٹیکس سے مکمل طور پر مستثنیٰ ہے۔ دیگر سیکورٹیوں کے معاملے میں 3000 روپے سالانہ سود پر انکم ٹیکس نہیں لگتا ہے۔

قومی بچت

ہمیشہ بہتر رہے

اور اب ہمیشہ سے بہتر ہے

رابطہ قائم کریں اپنے نزدیکی ڈاک گھر یا اپنے علاقے کے ریجنل ڈائریکٹر (نیشنل سیونگز) سے یا

قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس نمبر 96، ناگپور 440001

DAVP 79/264

باب انتقاد

شمع جنتری

اکثر کاروباری ادارے اپنی فہرست کو معقول شخصیتوں کے ذریعہ طلبہ اسکے کیلئے جنتری کا روپ دیدیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر قسم کی ساں ہر جنتریاں کھی جاتی ہیں اور ان سے حسب ضرورت تہواروں تیک اور عید و ماہ جولائی اور دیگر ضروریات کے مطابق دن اور تاریخ معلوم کئے جاتے ہیں۔ "ادارہ شمع" بھی ہر سال شمع جنتری شائع کرتا ہے۔ جیسا کہ ادارۂ شمع اپنی مطبوعات اور رسائل کی طباعت، کتابت اور گٹ اپ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اسی طرح اس ادارہ کی یہ جنتری بھی اپنی نوعیت میں قابلِ تعریف حد تک معقولیت لئے ہوئے ہے۔ بڑی بڑی قیمتی جنتریوں اور تقویم کے مقابلہ میں یہ جنتری زیادہ مفید اور عام فہم ہے اور ہر طبقہ کے لئے دلچسپی کے وافر سامان مہیا کرتی ہے۔ بہت اچھی معلومات، بہترین پند و نصائح، اچھے اور معقول لطائف، فلمی اداکاروں اور فن کاروں کے رہائشی پتے اور ٹیلی فون نمبر اور دیگر کئی دلچسپ عنوانات سے جنتری کو ہر انداز سے بہتر اور قابلِ مطالعہ بنایا گیا ہے۔ شمع گروپ کے بانی جناب الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی نے جنتری کا جو ابتدائیہ تحریر فرمایا ہے۔ اسے ہر شخص کو پڑھنا چاہیے۔ یہ ابتدائیہ زندگی کی ہر منزل پر کام آنے والی حقائق کی ترجمانی کرتا ہے اور اگر کوئی بھی شخص ان پر عمل کرے تو وہ ترقی کی منازل بخوبی طے کرسکتا ہے۔ جنتری $\frac{30 \times 20}{16}$ سائز پر بہت ہی خوبصورت شائع کی گئی ہے جسکی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے جو دفتر شمع - آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کے علاوہ ملک کے ہر بک اسٹال اور ایجنٹ اخبارات سے دستیاب ہے۔

ماہنامہ گلفشاں نئی دہلی

جناب محمود سعیدی ادبی اور شعری دنیا میں ایک جانا پہچانا مقام رکھتے ہیں۔ ہر اُردو جاننے والا محمود سعیدی کو ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے جانتا ہے۔ جناب محمود سعیدی ایک طویل عرصہ سے "ادارۂ تحریک" سے منسلک تھے اور اب انہوں نے اپنی ادارت میں ماہنامہ "گلفشاں" جاری کیا ہے جس کے تین شمارے اب تک شائع ہوکر اُردو رسائل پڑھنے والوں میں مقبولیت پاچکے ہیں۔ یہ ایک ایسا ماہنامہ ہے جو سب کے لئے ہے۔ آپ گلفشاں کو ایک نظر دیکھیں گے تو ہمارے اس دعوے کی تصدیق کریں گے کہ محمود سعیدی بہ حیثیت مدیر بھی اتنا ہی فنکارانہ سلیقہ رکھتے ہیں جتنے کہ وہ اچھے شاعر ہیں۔ گلفشاں عام ادبی رسائل کے سائز پر بڑے صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ زرِ سالانہ ۳۵ روپے اور ایک پرچہ کی قیمت تین روپیہ ہے۔ دفتر ماہنامہ "گلفشاں" ۱۸-انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پندرہ روزہ خیر و خبر علی گڑھ

رضا الکبیر پری سام پور کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جناب عرشی زادہ نے باتوں باتوں میں پندرہ روزہ "خیر و خبر" علی گڑھ کا تذکرہ فرمایا تو اسے دیکھنے اور پڑھنے کے لئے مدیر خیر و خبر سے بذریعہ عریضہ درخواست کی گئی۔ اس وقت تک خیر و خبر کے چار شمارے نظر سے گزر چکے ہیں۔ علمی - ادبی - شعری - سیاسی - تاریخی - سماجی - اسلامی غرضیکہ ہر انداز سے یہ پندرہ روزہ اپنا جواب آپ ہے۔ لکھائی چھپائی کے لحاظ سے بھی یہ پندرہ روزہ اچھے سے اچھے رسالے کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ کاغذ کی اس ہوشربا گرانی اور کمیابی کے زمانے میں بھی ایسا کاغذ لگایا گیا ہے جو عام طور پر کتابوں کے لئے بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس پندرہ روزہ کے حلقۂ ادارت کے جملہ اسمائے گرامی صحافتی طور پر نئے اور انجانے معلوم ہوتے ہیں مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہر رکن ادارہ نے اپنی فرائض کو اس خوبی سے نبھایا ہے کہ کہنہ مشق صحافی بھی ان کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک پرچہ کی قیمت دو روپیہ ہے جو ریلوے بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہے۔ مفصل تفصیلات صدر دفتر ایسٹ ویسٹ کمیونیکیشن۔ سیمی منزل ریذیڈنسی۔ جیل روڈ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

اُس فراس کی شام

جناب بھگوان داس نالگیال اعجاز ایک اچھے شاعر ہیں۔ احباب

(بقیہ صفحہ پر)

حضرت رتن پنڈوری مدظلہ العالی

نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال جس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ جس کتاب کے لئے مسودہ فراہم کرنے پر لگا دیا۔ جس کتاب کے لئے بھاری بھرکم معاوضے پر انڈیا لائبریری لندن سے دوسری زبانوں کی کتابوں سے مطلوبہ مواد ترجمہ کرایا گیا۔ اور

جس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کے لئے فاضل مؤلف نے ہزارہا کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں تک کو قربان کر دیا۔ وہ

نادر اور بے مثال کتاب

ہندی کے مسلمان شعراء

طباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ اور ہر ممکنہ طور پر بہت سے بہتر انداز میں چھپ رہی ہے۔ تفصیلی معلومات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

ایک مخصوص موضوع پر واحد کتاب جو اپنے جلو میں ہر طبع سلیم کے لئے دعوت مطالعہ رکھتی ہے۔

ودیا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر پروپرائیٹر کے صفحات خواجہ پریس، چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق پائنیئر پریس دہلی سے چھپواکر دفتر شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔۔۔۱۱ سے شائع کیا۔

بُلبُل چہ گفت؟ گُل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

انڈو پاک پریم سبھا

پاکستان کے مشہور صحافی اور قطعات کے بادشاہ جناب رئیس امروہوی نے اپنے کچھ احباب کے تعاون سے پاک ہند پریم سبھا قائم کر رکھی ہے جس کا صدر دفتر کراچی میں ہے اور شاخیں پاکستان کے ہر شہر میں۔ پاک ہند پریم سبھا نے پاکستانی عوام میں خاصی مقبولیت پائی ہے کیونکہ پاک ہند پریم سبھا کا اولین مقصد یہ ہے کہ دونوں ملکوں (پاکستان و ہند) کے عوام کے درمیان نزدیک ترین تعلقات (کلچرل۔ ادبی۔ شعری) قائم کئے جائیں۔

ہندوستان میں بھی انڈو پاک سبھا قائم کی گئی ہے اور اس کے کرتا دھرتا جناب جمنا داس اختر مدیر "سویرا" مقرر کئے گئے چونکہ وہ ایک عرصے سے لندن میں مقیم ہیں اس لئے اپنا قائم مقام جناب وشوا ناتھ طاؤس صاحب کو بنا گئے تھے۔ خیال تھا کہ جمنا داس اختر صاحب اور وشوا ناتھ طاؤس صاحب اس مفید اور ضروری انجمن کی شاخیں ملک بھر میں قائم کرنے کے لئے سرگرمی دکھائیں گے مگر نہ معلوم وشوا ناتھ طاؤس ایسے مستحکم ادارے کے مالک نے بھی اس طرف کیوں مناسب توجہ نہیں دی۔

انڈو پاک پریم سبھا اور پاک ہند پریم سبھا کے مطالبات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دونوں ملکوں کے درمیان سفر کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۲۔ سندھ کراچی اور بلوچستان کے عازمین ہند کے لئے اور وسطی ہند نیز جنوبی ہند کے مسافران پاکستان کے لئے کھوکھرا پار کا راستہ (ریلوے لائن) کھول دی جائے۔

۳۔ دونوں ملکوں کے درمیان کلچرل وفود کے زیادہ سے زیادہ تبادلے ہوں۔

۴۔ ڈاک محصول کی شرح میں تخفیف کی جائے۔ ہندوستان سے پاکستان، پاکستان سے ہندوستان کے درمیان ڈاک محصول کی شرح وہی رکھی گئی ہے جو امریکہ، روس، کینیڈا، برطانیہ یا ممالک عرب کے لئے مقرر ہے۔ حالانکہ ہندوستان اور بنگلہ دیش نیز نیپال کے ساتھ ڈاک محصول کی شرح وہی ہے جو اندرون ملک ہے۔ پاکستان سے بنگلہ دیش کو ستر پیسے میں ایروگرام جا سکتا ہے۔ جب کہ پاکستان سے ہندوستان جانے والے لفافہ پر دو روپے چالیس پیسے اور ایروگرام پر دو روپے کے ٹکٹ لگانے پڑتے ہیں۔ اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان محصول ڈاک کی شرحیں اندرون ملک کی نہیں رکھی جا سکتیں تو بھی اس میں اتنی ترمیم ہونی چاہئے کہ عوام اس محصول ڈاک کو جبریہ جرمانہ نہ سمجھیں۔

۵۔ دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں اور رسالوں کی آزادانہ تجارت ہو۔ ہم جناب رئیس امروہوی کے ممنون احسان ہیں کہ انھوں نے اس عہد کی سب سے بڑی ضرورت کا احساس فرمایا ہے اور پاکستان میں پاک ہند پریم سبھا قائم کی ہے۔

پاک ہند پریم سبھا اور اس کی بہن انڈو پاک پریم سبھا کے اغراض و مقاصد اتنے صاف اور واضح ہیں کہ ان کی معقولیت پہ دونوں ملکوں کے عوام ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان کے ہر شہر اور قصبہ میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں اور ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھکر دونوں ملکوں کے عوام اپنے ہاں کی حکومتوں سے مطالبہ کریں .... کہ یہ مطالبات منظور کئے جائیں تاکہ دونوں ملکوں کے عوام راحت کا سانس لیں

جشن حق کانپوری

"کیا الفاظ کے لغوی معنی بدل گئے ہیں؟"

اخبار "تیر و نشتر" اور دیگر جرائد میں پروفیسر امیر اللہ خان صدر بزم حسن ریوا، مدھیہ پردیش کا حسب ذیل اعلان نظر سے گذرا ہے

"جشن حق کانپوری کی تیاریاں"

ریوا (مدھیہ پردیش) ماہ جنوری ۱۹۸۰ء میں بزم حسن ریوا کی جانب

ہندوستان کے مشہور و معروف اور ہر دلعزیز شاعر جناب حق کانپوری کے جشن کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ زیر صدارت عالی جناب ڈی این آریہ انکم ٹیکس افسر الہ آباد منعقد ہو رہا ہے جس میں ہندوستان کے مشہور و منفرد شعرائے کرام کے علاوہ عظیم ہستی فلمی اداکارہ نمی اور ڈائرکٹر ایکٹر جوگندر سنگھ بھی شرکت فرما رہے ہیں۔ مشاعرے کی کاغذی تیاریاں آخری مراحل طے کر چکی ہیں عنقریب ہی تاریخ اور مقام کا اعلان کر دیا جائے گا۔

(صدر بزم حسن ریڈر ادبیہ پرو لیبل) پروفیسر امیر اللہ خان)

اس اعلان میں "مشہور و معروف" "ہر دلعزیز" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ امیر اللہ خان صاحب خدا کے فضل سے پروفیسر ہیں اور بزم حسن کے صدر بھی انہیں "مشہور و معروف" اور "ہر دلعزیز" کے لغوی معنی یقیناً معلوم ہوں گے۔ مگر انہوں نے ایک ایسے شاعر کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن پر ایک نابینا شاعر کے اشعار چوری کرنے کا الزام ایک مدت سے عائد کیا گیا ہے۔ مگر حق صاحب نے نابینا شاعر کی اس حق تلفی کے سلسلے میں آج تک تردید نہیں کی۔ اگر ان الفاظ کے لغوی معنی بدل نہیں گئے تو پروفیسر امیر اللہ خاں صاحب نے ایک چور شاعر (جسے شاعر بھی نہیں کہا جا سکتا) کی تعریف میں ایسے الفاظ استعمال فرما کر یقیناً ان الفاظ کی بے حرمتی کی ہے۔

ڈائرکٹر ایکٹر جوگندر سنگھ کی شرکت جشن میں یقیناً مبارک فال ہے کیونکہ ایسا کم ظرف شاعر جس نے ایک نابینے کو بھی نہ بخشا ہو ڈائرکٹر ایکٹر جوگندر سنگھ کے اس فلمی کردار کی ہمنوائی کرتا ہے جس میں انہوں نے "رنگا خوش" کا مظاہرہ کیا تھا۔ فلم بندیا اور بندوق میں جوگندر سنگھ نے ایک ایسے ناپسندیدہ رنگا ڈاکو کا پارٹ ادا کیا تھا جو قلم اٹھانے اور دوسروں کا حق تلف کرنے پر "رنگا خوش" کا نعرہ لگاتا ہے۔ نمی ایک باہوش۔ سخن فہم اور ادب نواز خاتون ہیں انہیں یقیناً اس کا علم نہیں ہوگا کہ حق صاحب نے ایک نابینا شاعر کو بھی نہیں بخشا۔ ورنہ وہ ایسے جشن پر لعنت بھیجتیں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ نمی کی تخلیق ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جن کا اوڑھنا بچھونا موسیقی تھا اس لئے ممکن ہے کہ حق صاحب کے ترنم سے مسحور ہو کر نمی نے انہیں نوازنے کا وعدہ فرما لیا ہو۔ مگر نہ معلوم جناب ڈی۔ این آریہ نے اس جشن مشاعرہ کی صدارت کیسے قبول فرمائی جبکہ یہ جشن ایک ایسے شاعر کا ہے جو ایک نابینا شاعر کے اشعار چوری کرنے کے گھناؤنے الزام میں ملوث ہے۔

حق صاحب کا جشن منانے والے یقیناً اردو کے دشمن ہیں۔ ورنہ اردو کا کوئی بھی شیدائی کسی بھی اردو کے چور شاعر کو یہ اعزاز دینے کی بجائے لعنت بھیجتا۔

دفتر شمع میں ادبی تقریب

برصغیر کے نامور اور مقبول شاعر جناب قتیل شفائی کی دہلی میں آمد کے سلسلے میں دفاتر شمع نئی دہلی کی طرف سے معزز مہمان کے اعزاز میں پرتکلف استقبالیہ دیا گیا جس میں ملک کے اعلیٰ ترین شعرائے کرام۔ ادیبوں۔ صحافیوں اور سیاسی سربراہوں کے علاوہ پاکستان کے سفیر کبیر متعینہ نئی دہلی اور دوسرے پاکستانی سفارتی افسران نے شرکت فرمائی تقریب کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی جب پاکستان کے ڈاکٹر فرمان فتحپوری ایڈیٹر نگار پاکستان کراچی اور ہندوستان کے مشہور فلمی شاعر جناب راجندر کرشن نے بھی اس استقبالیہ میں تشریف لے آئے۔

استقبالیہ کی صدارت جناب ساغر نظامی نے فرمائی۔ جناب ڈاکٹر عنوان چشتی نے قتیل شفائی کی شاعری اور شخصیت پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہوئے دفاتر شمع کے مالکان قبلہ الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی اور ان کے فرزندان ارجمند کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے قتیل شفائی سے دلی کی ادبی شخصیتوں کو ملاقات کا موقع دیا۔

قبلہ حافظ محمد [illegible] معزز مہمان جناب قتیل شفائی کو اور محترمہ زینت کوثر مدیرہ بانو نے بیگم قتیل شفائی کو طلائی ہار پہنائے معزز مہمان قتیل شفائی نے اپنی تازہ ترین چار غزلیں سنا کر خوب خوب داد پائی۔ آخر میں صاحب صدر کے شکریہ کے ساتھ یہ یادگاری ادبی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کا واحد حل

پہلے یہ خبر پڑھئے جو اخبار پرتاپ میں شائع ہوئی ہے۔

"۵ ڈاکو گرفتار"

دریا گنج پولیس نے ایک اطلاع کی بنا پر دلی گیٹ کے قریب خونی دروازہ پر چھاپہ مار کر ۵ افراد کو گرفتار کیا جو مبینہ طور پر رنگ روڈ پر کسی بس کو لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ملزمان کے قبضے سے ایک دیسی ساخت کا پستول اور ایک

کا پر آمد کار توس دمین چاقو برآمد کئے ہیں۔ گرفتار شدگان میں سے چار ملزمان جامع مسجد کے اور ایک بلی ماران کا ہے۔ گرفتار شدگان میں اوم پرکاش۔ سراج حسن۔ راجندر کمار۔ ظہیر احمد راج سنگھ ہیں۔

ایک واقعہ اور بھی سُن لیجئے۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں جب ملک میں افراتفری مچ رہی تھی۔ تو لائل پور نہر کے کنارے سکھوں اور مسلمانوں کے دو گروہ مشترکہ طور پر لائل پور کے کچھ بیوپاریوں کو لوٹنے کی نیت سے جمع ہوئے اور رات کو حملہ کرنے کے انتظار میں اس نہر کے کنارے کیمپ لگا کر کھانے پکوا رہے تھے مسلمان کیمپ میں حلال گوشت پک رہا تھا اور سکھوں کے کیمپ میں جھٹکہ یعنی دونوں اپنے اپنے مذہبی اصولوں پر قائم مگر ڈاکہ ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کے لئے مشترک۔

آپ نے دیکھا کہ دونوں حالات میں یہ ڈاکو۔ ہندو مسلمان اور سکھ ہونے کے باوجود اقتصادی مفاد کے لئے مشترک ہیں اور ان میں نہ تو مذہبی منافرت ہے اور نہ ایک دوسرے سے بغض۔

کاش ہماری حکومت اور عوام ان ڈاکوؤں سے ہی ہندو و سکھ و مسلم یگانگت رکھنے کا سبق سیکھ سکتے۔ کہ صرف اور صرف اقتصادی مفاد ہی ہر کسی کو ایک مشترک لڑی میں رکھ سکتا ہے۔ اگر ہندو اور سکھ مسلمانوں کے ساتھ اور مسلمان ہندو اور سکھوں کے ساتھ کاروباری لین دین اور تجارت کا سلسلہ بڑھائیں تو اقتصادی مفاد انہیں منافرت سے دُور رکھے گا۔ اور یہ اپنے اپنے مفاد کے لئے ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس کریں گے۔ اور بھائیوں کی طرح رہیں گے۔

شُنتا جا شرماتا جا

عنوان بالا کے تحت جناب رفیق غوری نے معاصر "چٹان" لاہور کی حالیہ اشاعت میں ان پاکستانی ناظرین کی کچھ باتوں کا ذکر فرمایا ہے جو پاکستان سے امرتسر کرکٹ میچ دیکھنے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ باتیں سُن تو نہیں پڑھ لیجئے۔ یہ سب باتیں پاکستانی اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں اور پاکستان کا ذی ہوش طبقہ اس ضمن میں سوچ رہا ہے کہ پاکستانی نوجوان اور عوام اپنے ملک کی عزت اور شہرت میں اگر اضافہ نہ کر سکیں تو کم از کم اسے برقرار تو رکھیں۔

۱۔ امرتسر جانے والے پاکستانیوں میں کرکٹ کھیلنے یا دیکھنے کا شوق رکھنے والے کم تھے لیکن مُفت کے سینما دیکھنے والے اور شراب کے رسیا زیادہ تھے۔ چنانچہ امرتسر پہنچتے ہی ان لوگوں نے اپنی اپنی منازلِ مقصود و مطلوب کی راہ لی! اور ندیدوں کی طرح فلموں اور بوتلوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان پاکستانی شرابیوں کے لئے چھٹی کے دن بھی شراب خانے کھلے رکھے گئے۔

۲۔ محکمہ کسٹم نے امپورٹ۔ ایکسپورٹ تجارت کنٹرول کی فری لسٹ کے مطابق حسبِ ذیل چیزوں کو لانے اور لے جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

I۔ سگار و سگریٹ پچاس روپے کی مالیت تک۔

II۔ پہننے کے کپڑے جس میں پاؤں و سر کے دیتر بھی شامل ہیں۔

III۔ کھیل و سپورٹ کا سامان جس کی مالیت ایک سو ساٹھ روپے سے زیادہ نہ ہو۔

IV۔ بچے کا بستہ V۔ گھڑی ایک عدد VI۔ فونٹین پین یا بال پین ایک عدد۔ VII۔ کیمرا مع دو عدد خالی فلم۔

VIII دوائی وغیرہ IX۔ ڈوپ شدہ فلم جو زیادہ مقدار میں نہ ہوں

X۔ کھانے پینے کی چیزیں (آٹا۔ دال) جو ۳۲ روپے کی مالیت سے زیادہ نہ ہو۔ گھی یا مکھن ایک پونڈ سے زیادہ نہ ہو۔

XI۔ جانماز ایک عدد

XII۔ نظر اور دھوپ کی عینک ہر ایک ایک صرف

XIII۔ گھریلو ضرورت کے کپڑے جس کی مالیت اسی روپے سے زیادہ نہ ہو۔

XIV۔ سگریٹ لائٹر XV۔ چھتری ایک عدد۔

XVI۔ سلور پلیٹ برتن جن کی مالیت ۱۶۰ روپے سے زیادہ نہ ہو۔

XVII۔ ہاتھ کی چھڑی ایک عدد۔

پاکستانی حضرات کو پولیس اینٹری کی ضرورت نہیں جو کہ عام ویزا کیلئے ضروری ہے

ٹکٹ :۔ ۔۔ ۵ ہزار ٹکٹیں پاکستانی حضرات کے لئے مخصوص تھیں اور [illegible] بلیک میں زرِ مبادلہ کا فرق دے کر پاکستانی کرنسی میں بکتی تھیں۔

سفر :۔ I تمام حضرات نے سڑک کے ذریعہ واہگہ بارڈر کراس کیا

II۔ سپیشل بسیں اٹاری سے سٹیڈیم اور واپسی کے لئے پنجاب کرکٹ ایسوسی ایشن کی وساطت سے میچ کے تینوں دنوں کے لئے مخصوص تھیں۔

۳۔ بارڈر صبح سات بجے سے کھل جاتا تھا۔ اور یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ سفر کرنے والے حضرات اپنی سہولت کے لئے کم سے کم سامان ساتھ لے جائیں اور امرتسر میں رات کو ٹھہرنے والے حضرات کو پہلے سے اپنی ریزرویشن کرانے کا بھی مشورہ دیا گیا۔ نیز تمام حضرات کے لئے انٹرنیشنل صحت کے سرٹیفکیٹ

اپنے ساتھ رکھنے ضروری تھے ۔ ویزا صرف پاسپورٹ پر چسپاں کیا گیا تھا تمام حضرات کو یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ تمام قانونی چارہ جوئی جو کہ پاکستان سے جانے کے لئے ضروری ہے وہ کرائی جائے ۔ حکومت پاکستان نے یہ انتظام بھی کر رکھا تھا کہ جو پاسپورٹ پر ضروری ہدایت بجائے سفیر ہندوستان پاسپورٹ آفس لاہور سے منگوالیں ۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اگر ٹکٹ خرید کرنے کے بعد کوئی یہ فیصلہ کرے کہ اب وہ نہیں جانا چاہتا تو انڈین ایمبیسی رقم واپس نہیں کرے گی ۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ کرکٹ شائقین سامان لے جانے کے قوانین سے واقفیت حاصل کر لیں ۔

اکثر پاکستانی حضرات جب بارڈر پر پہنچے تو ان کے پاس غیر قانونی طریقہ پر ہزاروں ڈالر موجود تھے ۔ شاید ہی کوئی ایسا پاکستانی ہوگا جو سٹیٹ بنک آف پاکستان کے اعلان کے مطابق ڈالروں پر اکتفا کئے ہو ۔

سرحد پر چیکنگ نام کی کوئی چیز نہ تھی ۔ پاکستان سے میچ کے نام پر جانے والے لوگ جن کی تعداد ۱۲۰۰ کے قریب تھی اپنے ساتھ غیر قانونی کرنسی کے ساتھ ساتھ غیر ملکی لنڈا اور پاکستانی فلیٹ تھانوں کے تھان اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ انڈیا میں لنڈے کے ساتھ ساتھ پاکستانی فلیٹ کافی مقبول ہے علاوہ ازیں پاکستان سے گھڑیاں ، منظر ، وافر مقدار میں برائے فروخت ہندوستان کے لئے لے جائے گئے ۔

<u>خمیر لیموں دہن بگڑا</u> : ہندوستان میں جمعہ کے دن شراب کی دوکانیں بند ہوتی ہیں ۔ مگر پاکستانی مہمانوں کی خوشی کیلئے میچ کے دوران آنے والے جمعہ کے روز شراب کی دوکانیں کھلی تھیں ۔

جہاں پاکستان کے نونہالوں نے جی کھول کر پی اور میچ کے میدان میں خوب غل غپاڑہ نشے کی حالت میں مچایا میچ کے دوران ہفتہ کی شام کئی پاکستانی واہگہ بارڈر کی راہ پاکستان آ رہے تھے ان میں سے اکثر شراب کے نشے میں بدمست ہو کر گر گر گئے جنہیں کسٹم حکام نے انڈین حکام کی منت کر کے بھارت میں روک رکھا کہ پاکستان میں اگر وہ نشہ کی حالت میں آ جاتے تو ان کو گرفتار ہونے کا خطرہ تھا ۔

<u>کشمیر کے سیب</u> : میچ کے پہلے دن گراؤنڈ میں پاکستانی ناظرین کے لئے فروٹ وغیرہ ٹوکروں میں لایا گیا ۔ یہ فروٹ ہندوستانی لڑکیاں تقسیم کر رہی تھیں اس مرحلہ پر فروٹ اور لڑکیوں کو دیکھ کر پاکستانیوں نے وہ طوفان بدتمیزی بپا کیا کہ خدا کی پناہ ۔ اس لئے دوسرے دن انتظامیہ نے فروٹ کا طریق کار بدلا اور پیکٹوں میں فروٹ وغیرہ دیا گیا ۔ ان پیکٹوں میں کشمیر کے سیب بھی تھے جن کو پیش کرتے ہوئے نو معنی جملہ استعمال کیا گیا کہ یہ کشمیر کے سیب ہیں ۔ انھیں بھی کھائیے ۔

انڈین ٹی وی کے کیمرہ مین پہ آمادہ ہو گئے تھے اور پاکستانی ناظرین اس موقع پر گراؤنڈ میں آ گئے کہ ہماری تصویریں بھی لی جائیں ۔ جس پر انتظامیہ کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا گیا کہ پاکستانی مہمان اپنے چہروں سے اشیاء کی صاف کر لیں تاکہ ان کی تصویر بہتر طور پر آ سکیں تاکہ پاکستان میں بیٹھی ہوئی ہماری بھابیاں جو کہ ٹی وی دیکھ رہی ہیں آپ کے گرد آلود چہرے نہ دیکھ سکیں

<u>مہدی حسن اور کوڑے</u> : امرتسر میں تقریباً ہر پاکستانی سے سوال کیا گیا کہ مہدی حسن کو کوڑوں کی سزا کس جرم میں دی گئی ۔ اس کے علاوہ پاکستانیوں سے پاکستان میں چینی کی کمی کے بارے میں بھی پوچھا گیا ۔ پاکستانی وہاں سے آتے ہوئے ہندوستانی چینی لے کر بھی آئے ۔ چینی لانے والوں نے کم از کم پانچ کلو چینی فی کس خریدی ۔

<u>واٹر کولروں میں شراب</u> : امرتسر میں پاکستانیوں کا قیام زیادہ تر اشوکا ہوٹل اور گرینڈ ہوٹل میں تھا ۔ جہاں چند بد طینت پاکستانیوں نے شراب کے ساتھ شباب کی فرمائش کی ۔ ایک اطلاع کے مطابق واپسی پر ایسے لوگوں نے شراب بوتلوں کی بجائے واٹر کولروں میں بھری ہوئی تھی اور اب وہ اپنے دوستوں میں بانٹ رہے ہیں ۔

<u>خرید و فروخت میں رعایت</u> : ہندوستان کی کئی دکانوں اور فرموں نے پاکستانی ناظرین کو خرید و فروخت میں رعایت کا بندوبست کیا ہوا تھا ۔ لیکن ہمارے پاکستانیوں نے اسی پر ہی بس نہیں کی ۔ بلکہ وہ ان دکانوں سے کچھ چیزیں چرا کر بھی لانے میں کامیاب ہو گئے ۔

<u>چوکا ـ چھکا</u> ۔ جب پاکستانی عوام چوکے اور چھکے پر خوش ہوتے تو وہ گراؤنڈ میں آ کر بھنگڑہ ڈالنا شروع کر دیتے اور اپنے ساتھ لے جائے گئے چھوٹے ڈھول بجانے شروع کر دیتے ۔ ایسے ہی ایک موقع پر سپیکر سے اعلان کیا گیا کہ پاکستانی ناظرین اپنی جگہوں پر بیٹھ جائیں کہ ان کے غل غپاڑے سے ہندوستان کی توہین ہوتی ہے ۔ اور لوگ کیا کہیں گے ۔ ہندوستان والوں نے اپنے مہمانوں کے لئے کرسیوں کا بندوبست بھی نہیں کیا تھا ۔ ہندوستان کے ایک اخبار ہند سماچار کے مطابق میچ دیکھنے کے بہانے جانے والوں میں تقریباً نوے فیصد لوگ فلموں کے لئے انڈیا گئے ۔ اکثر لوگوں نے تو ایسا بھی کیا کہ امرتسر کے ایک تین منزلہ سینما میں تین تین شو لگاتار دیکھے ۔ اخبار کے مطابق پاکستانیوں نے حلوہ بھی بڑے شوق سے اور جی بھر کر کھایا کہ " پاکستان میں چینی کا بحران ہے ۔ "

<u>شراب کے رسیا</u> ۔ پاکستانی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

فیروز آباد (ضلع آگرہ یو۔پی) سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں بھرتنا ہے اس گاؤں کے ٹھاکر رام سنگھ اپنے علاقہ کے ایک سرکردہ اور باعزت ٹھاکر تھے۔ بڑے ارمانوں کے ساتھ جب ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی کا وقت آیا تو ٹھاکر رام سنگھ نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ جملہ انتظامات کئے۔ بہو رانی کے لئے دل سے ہیرے کے جڑاؤ زیورات بنوائے گئے۔ جب ٹھاکر رام سنگھ دہلی سے زیورات بنوا کر رات کی گاڑی سے فیروز آباد پہنچے اور اپنے کسی واقف کار بنئے کی دکان میں قیام کیا اور اس بنئے دوکاندار سے کہا کہ صبح جلد سے جلد بہو کیلئے بہترین ساڑھیاں خریدے تاکہ دوپہر سے پہلے پہلے یہ اپنے گاؤں پہنچ جائیں اس بنئے دوکاندار کے علاوہ ٹھاکر صاحب کے ایک دوسرے واقف کار بنئے اور ایک مسلمان دوکاندار نتھے نے ٹھاکر صاحب کی خواہش کے مطابق بارہ بجے تک تمام سامان وغیرہ دلوا کر ٹھاکر صاحب کو گاؤں روانہ کر دیا۔ ٹھاکر صاحب دہلی جاتے وقت اپنی برق رفتار گھوڑی بنئے کے ہاں چھوڑ گئے تھے تاکہ واپسی پر اسی گھوڑی سے اپنے گاؤں جا سکیں۔

چلتے وقت ٹھاکر صاحب زیورات کا صندوقچہ بنئے کی دکان میں ہی بھول گئے۔ اور باقی سب سامان گھوڑی پر لاد کر اپنے گاؤں کو روانہ ہوئے۔ ابھی وہ دو کوس ہی گئے ہوں گے کہ انہیں زیورات کے ڈبے کا خیال آیا۔ اور وہ الٹے پاؤں انتہائی برق رفتاری سے گھوڑی کو دوڑاتے ہوئے بنئے کے ہاں آئے اور زیورات کا ڈبہ بھول جانے کا ذکر کیا۔ دونوں بنئے اور نتھے زیورات کے ڈبے کو چھپا چکے تھے۔ اور انھوں نے بڑی سادہ لوحی سے جواب دیا کہ ٹھاکر یہاں تو آپ کوئی ڈبہ نہیں چھوڑ گئے ہیں ٹھاکر نے جب ان تینوں کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ زیورات کا ڈبہ ان ہی کے پاس ہے اور اب یہ بددیانت ہو چکے ہیں تو ٹھاکر رام سنگھ نے ان سے کہا کہ تم بددیانت ہو چکے ہو۔ میرا ایک ہی لڑکا ہے میں اس کی اور بھگوان کی قسم کھاتا ہوں کہ آج بارات جا رہی ہے جو بھی بھگوان مجھے دے گا میں تمام زیورات اگر دو اگر تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اس وقت میری برادری میں بے عزتی نہ کراؤ اور وہ زیورات مجھے دیدو اور میں تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا تمسک نامہ لکھ دیتا ہوں تاکہ اگر میں اپنی قسم اور وعدے کے مطابق زیورات تمہیں واپس نہ کروں تو تم نالش کر کے مجھ سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ وصول کر لینا۔ مگر دونوں بنیوں اور نتھے کے دل و دماغ ہیرے کے جڑاؤ زیورات کی چکاچوند سے ماؤف ہو چکے تھے اور بددیانتی اور بے ایمانی کا غلبہ ان پر پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے پیروں پر پانی نہ پڑنے دیا اور ٹھاکر ناامید ہو کر پولیس سٹیشن گیا۔ بنیوں اور نتھے کی مثلث نے پولیس والوں کو بھی ساتھ ملا کر مثلث کو چوکور بنا لیا اور پولیس والوں نے بھی ٹھاکر رام سنگھ کی کوئی مدد نہ کی۔

ٹھاکر رام سنگھ جب مایوس ہو گیا تو اس نے ان بددیانتوں سے کہا کہ میرے لئے اب آتم ہتیا کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ میں کس منہ سے خالی ہاتھ بیٹے کو بیاہنے جاؤں گا۔ جب کہ بارات جانے میں اب صرف ایک دو گھنٹے رہ گئے ہیں۔ میں برادری میں اور اپنے سمدھیوں میں ایسی بے عزتی برداشت نہیں کر سکوں گا۔ لہٰذا تم مجھ پر رحم کرو اور زیورات مجھے دے دو اور میرے ساتھ میرے گاؤں چلو میں تمہیں اِدھر اُدھر سے نقد روپیہ کا انتظام کر دیتا ہوں۔ مگر بددیانتوں کی اس چوکڑی نے ایک نہ سُنی۔

ٹھاکر رام سنگھ نے باقی کا تمام سامان گھوڑی کی کمر پر اچھی طرح باندھ دیا اور اس پر سوار ہو کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ فیروز آباد سے باہر نکل کر گھوڑی کو تھپکی دیکر اپنے گاؤں کی طرف بھگا دیا اور خود دریائے جمنا کی طرف جا کر عین اس وقت دریائے جمنا میں چھلانگ لگا دی جبکہ بیٹے کی بارات کی روانگی کا وقت تھا۔

گھوڑی مالک کے بغیر جب گھر پہنچی تو گھر والوں اور مہمانوں نیز گاؤں والوں نے اندازہ لگا لیا کہ ٹھاکر رام سنگھ کو راستہ میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے اور وہ قتل کر دیا گیا ہوگا اور گھوڑی بھاگ کر گھر آگئی ہے ٹھاکر رام سنگھ کی لاش تیسرے دن فیروز آباد سے کافی دور جمنا کے کنارے گی ملی۔ مگر یہ راز بددیانتوں کی چوکڑی کے سوا اور کوئی نہیں

جانتا تھا۔ مگر سب کے راز جاننے والا اس سے بے خبر نہیں تھا۔

ٹھاکر رام سنگھ کی آخری رسومات پولیس کی نگرانی میں ادا ہوگئیں۔ ٹھاکر کے اکلوتے بیٹے کی شادی بھی ہوگئی۔ اور بظاہر ٹھاکر رام سنگھ کی اس خودکشی کو ڈاکوؤں کا کام ہی سمجھا گیا۔

اخلاق۔ پولیس تو ڈیڑھ لاکھ کے زیورات کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال چکی تھی مگر بھگوان کے ہاں تو بغیر رپورٹ لکھوائے ہی خود بخود مقدمہ زیر سماعت آجاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خدائی عدالت کے سمن طلبی کبھی کبھی ذرا دیر سے موصول ہوتے ہیں اور بسا اوقات فوری طور پر بھی تعمیل ہو جاتی ہے۔

دو ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک بیٹا چل بسا اس کے چند روز ہی بعد دوسرا بیٹا بھی مر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بیٹوں کی ساری اولاد یکے بعد دیگرے مر گئی اور دونوں بیٹوں کی صرف بیوائیں باقی رہ گئیں۔ ننھے کا یہ حال ہوا کہ سانس لے تو چھ انچ زبان باہر نکل آئے۔ نہ دم نکلے نہ زبان اندر جائے ہر دیکھنے والا خدا کی بے آواز لاٹھی کی اس مار کو دیکھ کر خدا سے دعا کرتا کہ اے خدا اس بیچارے کا دم نکل جائے تاکہ یہ اس عذاب سے تو نجات پائے مگر لوگوں کو اب کچھ معاملہ سمجھ میں آنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ ٹھاکر رام سنگھ کی آہوں کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے آخرکار کئی دنوں کے بعد ننھے کی جان قفس عنصری سے پرواز کر گئی تو دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کی زبان کم از کم تین فٹ انچ باہر نکلی ہوئی تھی اور شکل اتنی بھیانک ہو گئی تھی کہ دیکھنے والوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ ننھے کا بھائی بھی چند روز بعد چل بسا۔ ننھا کھاتا پیتا اور اچھا مالدار تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ننھے کے بیٹے نے جوا کھیلنا شروع کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سات مکان ہار گیا۔ ابھی حال ہی میں ننھے کی بہو روتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ کرنے والا کون اور بھرنے والا کون۔ ان ننھے کی اولاد کے پاس سر چھپانے کے لئے ایک جھونپڑا رہ گیا ہے۔ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی ہے۔ ننھے کا دلی میں بھی کاروبار تھا اور ایک سو درزی ہر وقت کپڑوں کی سلائی کرتے رہتے تھے اور ریڈی میڈ گارمنٹ بیرون ملک جاتے تھے۔ اب یہ کاروبار بھی ختم ہو چکا ہے۔ سب مشینیں فروخت ہوگئیں۔ غرضیکہ ہر طرح تباہی و بربادی کے بھوت نے ننھے کے خاندان کو گھیر رکھا ہے۔

یہ بد دیانتوں کی مثلث تو کیفر کردار کو پہنچی پولیس کے جس افسر نے ان بد دیانتوں کا ساتھ دیا تھا اور رشوت لے کر ٹھاکر رام سنگھ کی مدد نہ کی تھی۔ سنا ہے کہ وہ بھی اپنے فعل کی قرار واقعی سزا پا چکا ہے۔ مگر یہ پولیس والے اتنے بے شرم ہوتے ہیں کہ خدائی قہر کو ہونی کہہ کر اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر از خود وہ سب کچھ جانتے ہیں کہ انھیں اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے۔

ننھے کے بیٹے کی بیوی روتی ہے اور کہتی ہے کہ اے خدا جس نے کیا تو نے اسے سزا دے لی اب اس کی اولاد نے تیرا کیا بگاڑا ہے اسے کیوں سزا دے رہا ہے مگر ہندو فلاسفی تو یہی کہتی ہے کہ ماں باپ کے گناہوں اور اچھے کاموں کا پھل ان کی اولاد کو بھی ملتا ہے۔ ننھے کی پوتیوں سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا کہ کہیں شادی کرنے کے بعد ان لوگوں کی بدبختی شادی کرنے والوں پر بھی اثر انداز نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ بد دیانتوں کی اس تثلیث نے صرف اسی ہزار روپئے میں تو ایک سیٹ فروخت کیا جس میں ہیرے لگے ہوئے تھے۔ اور باقی زیورات بھی اونے پونے دلی میں فروخت کئے۔ اور پولیس کو دو تین ہزار روپیہ اس وقت رشوت دیکر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ٹھاکر رام سنگھ جھوٹ بولتا ہے اور بلیک میل کر کے ان سے کچھ اینٹھنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے بیٹے کی شادی ہے اور اسے روپیہ کی ضرورت ہے۔

فیروز آباد اور بھرتنا کے لوگ اس واقعہ کی اصلیت سمجھ گئے ہیں اور ان بد دیانتوں کا عبرتناک انجام دیکھنے کے باوجود دنیا کی ہوا کے ساتھ اڑ رہے ہیں اور وہ بھی ہر ممکنہ بد دیانتی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اور خدا ہم عقل کے اندھوں کو ٹھاکر رام سنگھ ایسے واقعہ سے بار بار خبردار کرتا ہے کہ باقی رہے نام اللہ کی۔

بقیہ صفحہ ۶ سے

ہوئے ٹولیوں میں چلتے جس سے پاکستانی ہونے کا پتہ چل جاتا۔ اکثر لوگوں کو سکھوں نے شراب کی دعوت دی جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ اکثر پاکستانی وہاں سے شراب اپنے ساتھ بھی لے آئے کہ وہاں شراب بہت سستی ہے۔ وسکی ۳۵ روپے فی بوتل، بیئر ساڑھے پانچ روپے فی بوتل

<u>ہندوستان سے واپسی</u>۔ ہندوستان سے واپسی پر پاکستانی وہاں سے دیگر بدنامیوں کے ساتھ ساتھ انڈیا کے جوتے۔ چائے۔ ادرک۔ شراب۔ انڈین فلموں کے گانے وافر مقدار میں لائے مگر کسٹم حکام نے انھیں کمال مہربانی سے یہ چیزیں پاک سرزمین میں لانے کی اجازت دے دی۔ •••

عقیل صدیقی

راولپنڈی میں بدکاری کے سب سے بڑے اڈے پر چھاپہ

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ۲۷ مجرموں کو ۳۲۵ کوڑے مارے گئے

پیرز ہوٹل پر چھاپہ اور کوڑے مارے جانے کی لمحہ بہ لمحہ کہانی، آنکھوں دیکھا حال

آج اکتوبر کی ۱۹ ویں تاریخ ہے۔ رات کی تاریکی خاصی گہری ہو چکی ہے
...نکی کی وجہ سے رات کو معروف ترین سڑک مری روڈ پر ٹریفک
...ن کم ہو گئی ہے۔ سرد ہواؤں کے باعث راولپنڈی و اسلام آباد میں
...ت ۹ بجے کے بعد ہُو کا عالم ہوتا ہے۔ شہر پر رات کے سناٹے کا
...اج ہوتا ہے۔ لیکن ادھر ایس پی ہیڈ کوارٹر مسٹر رفیع احمد
...وینے کے دفتر میں غیر معمولی نقل و حرکت دیکھنے میں آتی ہے۔ پولیس
...ئن نمبر ۱، ۶ تھانہ بی ڈویژن اور نیو ٹاؤن کی تمام نفری طلب کر لی
...اتی ہے۔ ایس پی ہیڈ کوارٹرز پولیس کی بھاری جمعیت کو ایک غیر معمولی
...چھاپہ مار ٹیم ترتیب دینے کے لئے ہدایات دے رہے ہیں۔ اس چھاپہ
...ار ٹیم میں ڈی۔ ایس۔ پی نیو ٹاؤن محمد اشرف، انسپکٹر راجہ ممتاز،
ایس ایچ او نیو ٹاؤن محمد زمان۔ ایس ایچ او بی ڈویژن محمد باقر شاہ
...نسپکٹر راجہ ممتاز۔ اے ایس آئی راؤ دلشاد۔ غلام سرور صابر
حسین، چودھری محمد امین اور رمضان افضل بھی شامل ہیں۔ اس
ٹیم میں مجسٹریٹ شفیع الزمان بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ایس پی ہیڈ کوارٹر
چھاپہ مار ٹیم کے ارکان کو ہدایات دے رہے ہیں۔ وہ ٹیم کے ارکان کو
صرف اتنا ہی بتانے پر اکتفا کرتے ہیں۔

"ہم نے اب سے تھوڑی دیر بعد "اللہ اکبر آپریشن" پر عمل کرنا
ہے۔

ہم نے مختلف ہوٹلوں پر جرائم پیشہ افراد کو پکڑنا ہے"
لیکن چھاپہ مار ٹیم کے ارکان کی اکثریت اس بات سے آگاہ نہیں
ہے کہ چھاپہ کس ہوٹل پر مارا جانا ہے کیونکہ اس سے قبل کئی بار
چھاپے اس لئے ناکام ہو گئے کہ متعلقہ ہوٹل کی انتظامیہ کو چھاپہ مارے
جانے سے قبل مخبری ہو جاتی تھی۔ بہر حال اب کی بار "آپریشن اللہ اکبر"
کی تفصیلات کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ چھاپہ مار ٹیم جسے تین گروپوں میں
منقسم کر دیا گیا۔ اس کے ذمے ہوٹل کا محاصرہ، ہوٹل پر قبضہ اور بعد
ازاں جرائم پیشہ افراد کی پکڑ دھکڑ شامل تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے
کہ یہ سب تیاریاں صرف پندرہ منٹ میں مکمل کر لی گئیں۔ چھاپہ مار
ٹیم ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔ ٹیم شہر کے چند
ہوٹلوں پر گھوم پھر کر مری روڈ پر آئی۔ تو ایس پی ہیڈ کوارٹرز نے
چاندنی چوک کے دائیں جانب مڑ جانے کی ہدایت کرتے ہیں جوں
ہی چھاپہ مار ٹیم "پیرز ہوٹل" کے سامنے پہنچتی ہے۔ ٹیم کے قائد اس
ہوٹل کا محاصرہ کر لینے کا حکم دیتے ہیں۔ اس وقت گھڑی کی سوئیاں رات
کے گیارہ بجا رہی ہیں۔ ٹیم کے تینوں گروپ اپنی اپنی ذمہ داریوں سے
عہدہ برآ ہونے کے لئے متحرک ہو جاتے ہیں۔ پولیس کی تمام نفری دیکھتے
ہی دیکھتے تین منٹ میں پیرز ہوٹل کی چھت سے لیکر ہوٹل کے چاروں
اطراف پھیل جاتی ہے۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر سب سے پہلے ایک پولیس
کا ہوٹل کے مالک پیر صلاح الدین سے آمنا سامنا ہوتا ہے۔
پولیس دیکھ کر پیر صلاح الدین کا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھتا ہے۔ پولیس
افسر لپک کر ٹیلیفون کا ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیتا ہے۔
"مجھے .... سے بات کر لینے دو" پیر
صلاح الدین پولیس کو تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے۔
"اب تم کسی کو فون نہیں کر سکتے" پولیس افسر اسے سختی
سے ڈانٹ دیتا ہے۔
"اب تمہیں دنیا کی کوئی طاقت قانون کے شکنجے سے بچا نہیں
سکتی" یہ کہہ کر پولیس افسر نے صلاح الدین کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔
پیرز ہوٹل کے مختلف کمروں سے ۱۳ عورتیں اور ۲۸ مرد
دادِ عیش دیتے ہوئے پکڑے گئے۔ ۱۳ حسینائیں جن کی عمریں ۱۴ سال
سے ۲۰ سال کے درمیان ہیں۔ دو درجن کے لگ بھگ تماشبینوں

...ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھیں۔ اس ہوٹل سے ۱۳ پکڑی جانے
...عورتوں میں گلبرگ لاہور کی ثریا شامل ہے۔ جسے کل ہی شبیر احمد
...کر آیا تھا۔ ساجدہ اور نادیہ کا عاشق ہے۔ وہ ساجدہ کو
...رقص دیکھنے کیلئے یہاں لایا تھا انہوں نے بتایا کہ انہیں مصطفےٰ
...ہوٹل میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ میں پانی لینے باہر نکلی تو غیر ملکیوں کے
...کمرے میں نیم برہنہ لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ میں نے باہر دیکھا
...ہر سو پولیس ہی پولیس ہے تو میں ایک کمرے میں گھس گئی۔ جہاں
...سے مجھے برآمد کیا گیا۔ ریحانہ اور فرزانہ بھی دونوں بہنیں ہیں۔ ان کا
...تعلق کراچی سے ہے۔ ریحانہ کا کہنا ہے کہ وہ اور اس کی والدہ چھوٹی
...فرزانہ کو لینے آئی تھیں۔ جو اپنے نوکر کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔ اس
...اطلاع کراچی پولیس کو دی گئی ہے۔ اس کی والدہ کے پاس بچہ بھی
...فرزانہ بھی ہوٹل کے کمرہ میں ہے۔ لاہور کی کوثر کا کہنا ہے کہ وہ دو
...روز قبل اس ہوٹل میں آئی تھیں۔ جسے جاوید کے کمرے میں برآمد کیا گیا
...اس کی ملاقات جاوید سے اس ہوٹل ہی میں ہوئی تھی اور جاوید نے
...بہن کہا تھا۔

فیصل آباد کی سیما نے دلچسپ انکشاف کیا۔ سیما کا کہنا ہے کہ اس
...چچا زاد بھائی جاوید عباس سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ کل رات
...لیکر آیا۔ آج صبح یہ کہہ کر فیصل آباد چلا گیا کہ شام کو آ جائے گا
...وہ نہ آیا۔ فیصل آباد کی ناہید بشیر کا کہنا ہے کہ وہ ... سے
...یہاں آئی تھی۔ لاہور کی پروین نے بتایا کہ وہ بھاٹی گیٹ لاہور کی
...والی منہ بولی بہن شہناز کے ساتھ آئی تھی۔ جب اس سلسلے
...شہناز سے استفسار کیا گیا تو کہنے لگی کہ میں پروین کو نہیں جانتی میں
...رشید کی بیوی ہوں اور وہ میرے ساتھ ہے۔ وہیں کی رہنے
...رخ مینہ نے بتایا کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ ہے۔ سکینہ نے بتایا
...وہ رخ مینہ اس کی بھابی ہے اور رخ مینہ کا شوہر شیر خان اس کا
...بھائی ہے۔

جن ۲ تماش بینوں کو حراست میں لیا گیا ہے ان میں کسٹم انسپکٹر
...بھی شامل ہے جن کے کمرے سے وی سی آر غیر ملکی کپڑا، فلموں کے
...کیسٹ اور دوسرا سامان برآمد ہوا۔ کراچی کے محمد سلیم اور اخلاق نے
...کہ وہ کراچی سے ایک برات میں آئے تھے۔ دلہن والوں کے گھر جگہ کی
...قلت تھی اس لئے وہ اس ہوٹل میں چلے آئے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ شادی

کی تین ایکسپوزڈ فلمیں لے کر آئے تھے۔ جس کا ثبوت بارات اور شادی
والے گھر سے مل سکتا ہے۔

راولپنڈی میں فحاشی کے سب سے بڑے اڈے سے گرفتار ہونے
والی عورتیں اور مرد جہاں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے طرح
طرح کی کہانیاں سنا رہے ہیں، پیرز ہوٹل سے ایک تلاشی کے دوران
خاصے دلچسپ انکشافات ہوئے ہیں۔ پولیس کو پیرز ہوٹل سے ایک
خط ملا ہے جو اس اڈے سے گرفتار ہونے والے دلال رشید کے نام
ہے۔ اس خط میں لاہور کی انور بیگم نے دلال کو لکھا کہ "میں مصروفیت
کی بنا پر آپ کے لئے دھیان نہ دے سکی۔ اب مجھے فرصت ملی ہے
میں بہت جلد مزید اعلیٰ اسٹینڈرڈ کا "مال" بھیج رہی ہوں۔

پولیس نے دلال رشید کی ایک ایسی ڈائری بھی برآمد کر لی
ہے۔ جس میں رشید نے لڑکیوں کو رقوم کی ادائیگی وصولی کا
حساب کتاب لکھا ہے۔

پیرز ہوٹل جہاں لاہور سے خاصی تعداد میں لڑکیاں منگوائی
جاتی تھیں۔ اور ایک عرصے سے فحاشی کا اڈہ بنا ہوا تھا "آپریشن اللہ اکبر"
کے پہلے مرحلے کی کامیابی کے بعد پولیس ٹیم نے عروسہ گیسٹ ہاؤس
پر چھاپہ مارا یہ گیسٹ ہاؤس بھی پیرز ہوٹل سے تین فرلانگ کے فاصلے
پر قائم ہے۔ پولیس نے اس گیسٹ ہاؤس سے کسٹم انسپکٹر خضر حیات
راجہ گلزار، عبد... ید اور بالاوش خان کو روبینہ، ناہید اختر اور نسرین
کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ پولیس نے اس گیسٹ
ہاؤس میں کسٹم انسپکٹر خضر حیات سے جہاں دوسرا غیر ملکی سامان برآمد
کیا۔ وہاں اس سے غیر ملکی شراب کی ایک بہت بڑی بوتل برآمد ہوئی
خالی بوتل کا وزن پانچ کلو سے کم نہیں ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ پیرز ہوٹل میں سپلائی کی جانے والی لڑکیوں
کی "ڈیلنگ" دلال رشید کیا کرتا تھا۔ لڑکیوں کو ہر رات سودے کی
آدھی رقم ادا کر دی جاتی۔ جب کہ آدھی رقم دلال رشید اور لاہور کی
انور بیگم لے جاتے عیاشی کے اس "مخصوص اڈے" پر لڑکیوں کے
گاہکوں کو مخصوص الفاظ کہنے پڑتے۔ جب ایک گاہک کاؤنٹر پر منیجر
آکر یہ کہتا کہ "یہاں ٹھہرنا ہے" تو اس شخص سے شب باشی کے لئے ایک
کمرے کے ڈیڑھ سو روپے وصول کئے جاتے جب کہ عام گاہک سے فی کمرہ
۴۰ روپے لیا جاتا۔ جب منیجر ہوٹل تماش بین گاہک سے مطمئن ہو جاتا

پاسے اس کی پسند، معیار کے مطابق لڑکی اور کمرہ فراہم کر دیا جاتا
تھا کو اس بات کی ضمانت دی جاتی کہ وہ رات بھر رنگ رلیاں
مناتا رہے اسے کوئی پوچھ نہیں سکتا۔
بدکاری پیشہ ملوث عورتوں کے بتلانے پر فحاشی کا کاروبار کرنے
والے گروہ کے سرغنہ فضل بخاری کو بھی گرفتار کر لیا۔ یہ بات قابل
ذکر ہے کہ فحاشی اور جسم فروشی کے بین الاضلاعی کاروبار کا کنٹرول
فضل بخاری کے پاس تھا۔ سپلائر خوبرو لڑکیوں کو راولپنڈی میں فضل بخاری
کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور فضل بخاری اپنی عینکوں کی دوکان کو کنٹرول
کنٹرول سینٹر" کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ نذر محمد عرف فضل بخاری نے
مغربی ممالک کے فحاشی کے اڈوں کی طرز پر مقامی ہوٹلوں میں باقاعدہ
ڈکن سسٹم کے تحت لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔ دوسرے اضلاع سے
آنے والی لڑکیوں کو ڈکن نمبر دے کر مخصوص ہوٹل میں بھیج دیتا تھا
اس نظام میں اسے دلال رشید کی بھی معاونت حاصل تھی۔ فضل بخاری
نے باقاعدہ ایک رجسٹر کھول رکھا تھا۔ جہاں لڑکیوں کے نام تھے اور
دوسرے کوائف درج کئے جاتے بلکہ ان بھٹکی ہوئی حوا زادیوں کو
کنٹرول سینٹر" پر لانے لے جانے کی تمام سہولتیں فراہم کرنے اور
بحفاظت ان کے گھروں میں واپس پہنچانے کی ذمہ داری لی جاتی
فضل بخاری کے قبضے سے ایسی سینکڑوں لڑکیوں کے پتے اور دیگر
کوائف ملے ہیں۔ جنہیں بخاری مختلف ہوٹلوں میں سپلائی کرتا رہا ہے
پولیس فضل بخاری کے ان چھ ایجنٹوں کو بھی تلاش کر رہی ہے۔ جو لڑکیاں
لانے، ہوٹلوں میں پہنچانے اور واپس پہنچانے کے لئے متعین تھے۔ تادم
تحریر وہ روپوش ہو گئے ہیں۔
پیرز ہوٹل اور عرفہ گیسٹ ہاؤس سے جن ۱۶ عورتوں اور ۳۲
مردوں کو فحاشی کے الزام میں گرفتار کیا گیا ان کے بارے میں نوشہرہ
پولیس سٹیشن نے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۳ اور ۳۶/۲ کے تحت
۲۴ اکتوبر کو حتمی چالان پیش کر دیا۔ اس مقدمہ کی سماعت سمری ملٹری
کورٹ کے سربراہ میجر جودت شرف اور ... محمد حنیف نے کی۔ ملٹری سمری
کورٹ میں گرفتار ہونے والی عورتوں اور مردوں کے بیانات لئے
گئے۔ آپ بھی ملٹری کورٹ میں دیئے گئے بیانات کی روداد سن لیجئے۔
انسپکٹر راجہ ممتاز نے عدالت کو بتایا کہ "پیرز ہوٹل" پر عصمت
فروشی کرنے والوں کو گرفتار کرنے کیلئے ایک پارٹی تشکیل دی گئی

۱۹ اکتوبر کو پیرز ہوٹل کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ وہاں برآمدہ میں کچھ عورتوں
کی چیخ و پکار کی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھیں۔ یہاں کچھ مرد ان کی عصمت
لوٹنا چاہتے ہیں۔ انھیں ان مردوں کے چنگل سے بچاؤ۔ مجسٹریٹ کی موجودگی
میں کمروں کی تلاشی لی گئی تو چند کمروں سے عورتیں اور مرد برآمد ہوئے
گواہ نے مزید عدالت کو بتایا کہ "عصمت فروشی کے اس کاروبار میں ہوٹل
کی انتظامیہ ملوث تھی اس کے بغیر ایسا نہیں ہو سکتا اور کافی عرصہ سے
اس ہوٹل میں شراب نوشی اور عصمت فروشی کا اڈہ چلنے کی شکایات
مل رہی تھیں۔
۲۴ سالہ کوثر بھی گواہ کے طور پر پیش ہوئی۔ اس عدالت کو بتایا "میں
لاہور ملتان روڈ کی رہنے والی ہوں۔ میں اپنی سوکن کی لڑکی کی شادی
کا کپڑا خریدنے آئی تھی۔ میرے ساتھ میری سہیلی فوزیہ بھی تھی میں پیرز ہوٹل
کے کمرہ نمبر ۲ میں ٹھہری جب کہ میری سہیلی ایک دوسرے کمرے میں ٹھہری جس
رات چھاپہ پڑا میں اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اچانک دو افراد میرے کمرے میں
آئے جن کے نام بعد میں معلوم ہوئے۔ بشیر اور مقبول نے کمرے میں داخل ہو تے
ہی بتیاں بجھا دیں۔ اور مجھ سے نازیبا حرکات شروع کر دیں میں نے شور
مچایا۔ ابھی دس منٹ گزرے ہی تھے کہ پولیس آگئی۔ اور انھیں گرفتار
کر لیا۔ ریحانہ نے عدالت میں بیان دیا "میری عمر ۱۷ سال ہے میں اپنے
شوہر کے ساتھ کمرہ نمبر ۱۱۱ میں مقیم تھی میرا بچہ بیمار تھا
اس لئے میرا شوہر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ میں کمرے میں تنہا تھی کہ دروازہ
پر دستک ہوئی میں نے نام پوچھا تو دستک دینے والوں نے اپنے نام نعیم
شاہ اور مہربان بتائے میں نے شوہر سمجھ کر دروازہ کھول دیا دونوں زبردستی
میرے کمرے میں گھس آئے اور دست درازی شروع کر دی اور میرے کپڑے
لینے شروع کر دیئے۔ میں نے شور مچایا۔ ابھی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ پولیس
آگئی۔ اور دونوں ملزمان گرفتار کر لئے گئے۔ اس موقع پر عدالت نے اس سے سوال
کیا کہ تمہارا شوہر رکشا ڈرائیور ہے اس نے کمرے کا ایک سو روپیہ کرایہ کیسے ادا
کیا۔ مجھے معلوم نہیں، یہ بات میرا شوہر ہی بتا سکتا ہے۔ ۱۷ سالہ ...
نے عدالت کو بتایا کہ میں اپنے بہنوئی اور خالہ زاد بہن کے ہمراہ ...
تھی کہ بس سے اترتے ہی تنہا رہ گئی۔ اس کے بعد کچھ لڑکے میرا پیچھا کرنے
لگے میں نے اپنی خالہ کا گھر تلاش کیا لیکن نہ ملا۔ مجھے ایک ڈرائیور شام
ساڑھے پانچ بجے ... ہوٹل چھوڑ گیا۔ ... تین افراد جن کے نام معلوم
رشید اور ممتاز ... نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی

ہی تھیں کہ دروازہ کھول تینوں میرے کمرے میں گھس آئے میرے ساتھ چھیڑ خوانی شروع کر دی انھوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جب میں نے چیخ و پکار کی تو پورا ہوسٹل لڑکیوں کی چیخ و پکار سے گونج رہا تھا فرزانہ، شہناز، ثریا کے علاوہ مجسٹریٹ قطیع الزماں ڈی ایس پی ملک اشرف، ایس ایچ او تھانہ چوہدری محمد زماں نے بھی عدالت میں بیانات قلمبند کرائے۔ تاہم دو سعودی باشندوں شعیب عبدالرحمٰن الشعیب، اور عبدالرحمٰن اللطیف نے دوسرے ملزموں اور گواہوں سے برعکس تحریری طور پر بیانات دیئے انھوں نے کہا کہ ہمیں ٹیکسی ڈرائیور ... پیرز ہوٹل میں چھوڑ گیا، ہم اپنا کمرہ دیکھ رہے تھے کہ ہم نے شور و غل کی آواز سنی تو باہر نکل کر دیکھا تو وہاں پولیس موجود تھی جس فوزیہ لڑکی کے ساتھ ہمیں دکھایا گیا ہے۔ وہ نہ تو فوزیہ کو جانتے ہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

سمری ملٹری کورٹ میں ۲۲ اکتوبر کو اس مقدمہ کی سماعت ہوئی مسلسل سماعت کے بعد ۲۴ اکتوبر کو رات گئے عدالت نے بدکاری کے الزام میں ۳۳ مردوں اور ایک عورت کو قید اور کوڑوں کی سزا سنائی پیرز ہوٹل کے مالک پیر صلاح الدین اور آپٹیکل کے مالک نذر محمد عرف فضل بخاری کو ایک ایک سال قید بامشقت سنائی گئی چونکہ ان دونوں کی عمریں زیادہ تھیں اس لئے انھیں کوڑے مارنے کی سزا نہیں دی گئی تاہم صلاح الدین کے لڑکے محی الدین، مظاہر احمد، منیجر ہوٹل محمد افضل، دلال رشید سپلائر کشر خان، جاوید اقبال، مہربان، نعیم شاہ، افتخار، اخلاق، اشرف، رشید وغیرہ کو ایک ایک سال قید سخت اور پندرہ پندرہ کوڑے کی سزا سنائی گئی دلال رشید کی بیوی نذیراں بیگم کو بھی ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔

آج ۲۵ اکتوبر ہے راولپنڈی کے شہریوں کو علی الصبح اخبارات کے ذریعے معلوم ہو گیا ہے کہ آج دو بجے بعد دوپہر سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال کی گراونڈ میں پیرز ہوٹل اور عرصہ گیسٹ میں بدکاری کے جرم میں سزا یافتہ مجرموں کو سرعام کوڑے لگائے جائیں گے۔ صبح دس بجتے ہی لوگ سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ دوپہر بارہ بجے رش کا یہ عالم تھا کہ ہر جانب انسانوں کے سروں کی فصل اگ آئی آج ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہر سڑک سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال کو جاتی ہے۔ ایک بجے تک کم و بیش ایک لاکھ افراد جمع ہو چکے ہیں۔ اور لوگوں کی آمد کا سلسلہ ابھی رکا نہیں ہے۔ مارشل لاء حکام کوڑے لگانے کے لئے ایک زیر تعمیر عمارت کی چھت کو اسٹیج کے طور استعمال کر رہے ہیں۔ اس بلند اسٹیج پر ٹکٹکی کا رخ اس کیا گیا کہ جس مجرم کو کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔ اس کا منہ پیرز ہوٹل طرف ہے۔ جو اس اسٹیج سے چند گز کے فاصلے پر ہے۔ اس کی پشت عوام کی طرف ہے دو بجے تک ایک لاکھ سے زائد لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں گراونڈ کے چاروں طرف بچوں، جوانوں بوڑھوں اور عورتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو بدکاری کے مجرموں کے عبرتناک انجام دیکھنے کے لئے کھڑا ہے پولیس کو اس بے پناہ ہجوم کو پیچھے دھکیلنے میں بار بار مداخلت کرنا پڑ رہی ہے۔

دو بجے کوڑے مارنے کی کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا اور اس کا ترجمہ سنایا گیا۔ ایک فوجی افسر کی آواز لاؤڈ سپیکر پر سنائی دیتی ہے۔ "آج کی سزائیں صرف ایک مقدمہ کے سلسلے میں مجرموں کو دی جا رہی ہیں۔ ان مجرموں کے خلاف ابھی اور مقدمات زیر سماعت ہیں۔ راولپنڈی میں مارشل لاء حکام کی یہ کوشش رہی کہ کوڑوں کی نوبت نہ آئے۔ لیکن یہ مجرم معاشرہ میں گھناؤنے اور سنگین جرم کے مرتکب ہوئے اس لئے انھیں کوڑوں کی سزا دینا ضروری ہو گیا ہے۔ ہجوم تالیاں بجا کر فوجی افسر کی تقریر کا خیر مقدم کرتا ہے۔ فوجی افسر اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ یہ اسلامی ملک ہے۔ یہاں اسلام کا دور دورہ ہونا چاہئے۔ حکومت بدکردار اور شیطانی خصلتوں کے مالک لوگوں کو جنہوں نے معاشرہ کی اخلاقی قدروں کو بری طرح پامال کیا ہے کا سختی سے محاسبہ کریگی۔ بدکار لوگ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں یا پھر وہ اپنا ناپاک وجود لے کر اس سرزمین سے کہیں اور چلے جائیں تقریر کا اختتام ہوا تو سب سے پہلے اسٹیج پر پیر صلاح الدین کو لایا جاتا ہے لاؤڈ سپیکر پر ایک فوجی افسر کی آواز گونجتی ہے " ... ہے وہ سب سے بڑا مجرم پیر صلاح الدین جسے اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ تعلیم اور ہر نعمت سے نوازا تھا بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا (صلاح الدین سابق ڈپٹی کمشنر اور سابق فوڈ سیکریٹری بھی رہ چکا ہے) لیکن اس شخص نے ابلیس کی تقلید کی یہ انتہائی سزا کا مستحق ہے لیکن اس کی عمر ۴۶ سال ہے مارشل لاء کے قانون کے تحت ۴۵ سال سے زائد عمر کے شخص کو کوڑے نہیں لگائے جا سکتے لہذا اس کی عمر اسے کوڑوں کی سزا کے آڑے آگئی اسے ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی

قحبہ خانے کو نوجوان نسل کو برباد کرنے کی یہودی نژاد اسکیم پر عمل شروع کر دیا. بہت جلد اس قحبہ خانے کی شہرت ملک کے ہر شہر کے جنسی مریضوں تک پہنچ چکی تھی اگرچہ راولپنڈی میں چھوٹے بڑے دوسرے قحبہ خانے بھی چل رہے تھے لیکن اپنی نوعیت کا یہ سب سے بڑا قحبہ خانہ تھا جہاں تماش بین بے خوف رات بھر رنگ رلیاں مناتے تھے شہریوں نے کئی بار انتظامیہ کو درخواستیں دیں چونکہ اس قحبہ خانے اور اسی نوعیت کے دوسرے اڈوں کی ماہواری آڑے آجاتی اس لئے ان کی درخواستیں مسترد کر دی جاتیں اگر خانہ پوری کے سلسلہ کوئی کارروائی کی بھی جاتی تو ہوٹل انتظامیہ کو قبل از وقت خبردار کر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کالعدم قومی اتحاد کے وزراء ایام اقتدار میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس اڈے کو بند نہ کرا سکے اس کی وجہ انتظامیہ کا عدم تعاون تھا جب سے یہ ہوٹل قائم ہوا ہے بدکاری کے ایک اڈے کے طور پر کام کر رہا ہے اور جن لوگوں نے اس اڈے کو بند کرانا تھا وہ صلاح الدین کے اثر و رسوخ اور ...... کی وجہ سے بے بس تھے لیکن جب سے مارشل لاء انتظامیہ نے سول انتظامیہ کو عملاً اپنے ہاتھوں میں لیا تو وہ قحبہ خانہ (جسے کالعدم قومی اتحاد کے وزراء آٹھ ماہ تک ختم نہ کرا سکے. مارشل لاء انتظامیہ کے متحرک ہونے سے راتوں رات ختم ہو گیا. اس قحبہ خانے کو ختم کرانے پر ایس ایم ایل اے راولپنڈی بریگیڈیئر سرفراز اور ایس پی ہیڈ کوارٹرز رفیع احمد پرویز بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پیرز ہوٹل جو کہ دھوکہ دہی سے رہائشی پلاٹ پر تعمیر ہوا ہے اگر مارشل لاء حکام اس امر کی تحقیقات کریں کہ وہ کون سے عناصر ہیں جو اس ہوٹل کے قیام کی سازش میں شریک تھے. اس تحقیقات سے کئی چہرے بے نقاب ہوں گے. چونکہ مذکورہ بالا پلاٹ پر دھوکہ دہی سے ایک ایسا قحبہ خانہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں دوسری آبادی کی راتوں کی نیندیں حرام کر دی گئی تھیں اسے الاٹمنٹ کی شرائط کے خلاف استعمال کرنے کی صورت میں الاٹمنٹ منسوخ کی جا سکتی ہے اور اس بدکاری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صلاح الدین کے خرچہ پر مسمار کیا جا سکتا ہے. رہائشی مقاصد کیلئے حاصل کردہ پلاٹ پر تجارتی عمارت تعمیر کر کے صلاح الدین نے حکومت کو کم از کم ۶ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا ہے. اگر حکومت اس تعمیر کردہ عمارت کو مسمار کرنا نہیں چاہتی تو اس عمارت کو کسی فلاحی ادارے کی تحویل میں دے دے. اس سلسلہ میں سماجی حلقوں نے مطالبہ بھی کیا ہے کہ پیرز ہوٹل کی عمارت کو معذور بچوں کی بہبود کے ادارے کے منتقل کر دیا جائے .... معلوم ہوا ہے کہ پیر صلاح الدین اور اس کے دوسرے ایجنٹوں کے متعلق دوسرے مقدمات کے فیصلے ہونے کے بعد حکومت پیرز ہوٹل کے بارے میں حتمی فیصلہ کرے گی۔ ●●●

(چٹان)

ایک ہی سُرخی ہے پورے حاشیئے پر رات کے
روشنی ہوتی ہے پیدا کھیت میں ظلمات کے
بارہا ظاہر ہوا ہے حُسنِ ظاہر کا فریب
لوگ پھر بھی چاہنے والے ہیں گورے گات کے

پھول تو اک اک نمائندہ ہے اپنی نسل کا
نسل انساں کا کوئی انساں نمائندہ نہیں
سونگھ کر دیکھو تو گُل سے آتی ہے بوئے گلاب
آدمی سے آدمی کی بُو نہیں آتی کہیں

شعور و ہوش علم و فن سبھی پہلے سے بہتر ہیں
تدبر اُلجھنوں کی روز ہی تخفیف کرتا ہے
نظر آتے ہیں پھر بھی عہدِ نو سے آدمی بدظن
گذشتہ وقت کی ہر آدمی تعریف کرتا ہے

نہ ڈر یہاں کا نہ ڈر وہاں کا خیال دل میں نہیں فدا کا
بدل گئے طورِ زندگی سب رواج مکر و ریا ہوا ہے
خلوصِ دل، جذبۂ محبت، خیالِ حق، فکرِ دین و ایماں
نئے زمانے میں رہنے والے پرانی باتوں کو ڈھونڈتا ہے

کُل ہند مُشاعرہ رُڑکی

کریم الاحسانی

اِدھر ناسازیٔ طبیعت اُدھر محترم سرور صاحب کی رڑکی میں آمد اور جناب حفیظ صاحب رڑکوی کا اصرار کہ مشاعرہ آپ ہی کا ہے لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اس مشاعرہ میں شریک ہوا یہ الگ بات کہ سرور صاحب تشریف نہ لاسکے ان کو بتلایا گیا کہ جے۔ پی نرائن کی وفات کی وجہ سے مشاعرہ کسی اور دن ہوگا اس لئے وہ نہ آسکے جس کا حفیظ صاحب ہی کو نہیں بلکہ ان کے میزبان خصوصی مسٹر نوید علیخاں صاحب ایڈوکیٹ کو بھی افسوس ہوا اور ان کی کمی کو سب ہی نے محسوس کیا۔ !

۱۳ اکتوبر ۷۹ء کی شب میں میونسپل بورڈ کے گراؤنڈ میں یہ محفل شعر و سخن منعقد ہو رہی ہے۔ جناب انیس میرٹھی صاحب صدارت کے لئے شری خوب سنگھ جی اے ڈی۔ ایم سہارنپور کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں۔ تالیوں کے شور میں اے ڈی ایم صاحب مسند صدارت پر پہنچ چکے ہیں۔ پھر انیس صاحب ہی جناب انور جلالپوری سے درخواست نظامت فرما رہے ہیں۔ انور صاحب نے حفیظ رڑکوی سے درخواست کی ہے کہ وہ مرحوم جے۔ پی نرائن کو منظوم خراج عقیدت پیش کریں حفیظ صاحب نے ایک قطعہ پیش کیا ہے۔

ایک روشن خیال تھا نہ رہا — یعنی حدِ کمال تھا نہ رہا
اس کا سب کچھ تھا ملک کی خاطر — مونس بے مثال تھا نہ رہا

اس قطعہ کے بعد حفیظ صاحب نے لوک نائیک کو نہایت موزوں الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اب انور صاحب مختصر مگر جامع تقریر فرما کر شہنشاہ صابری کو زحمت غزل دے رہے ہیں شہنشاہ صاحب یوں اپنی شہنشاہیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

میں کس سے پوچھوں کہ وہ لڑکی کون ہے جو مجھے
گلی کے موڑ پہ اکثر سلام کرتی ہے
یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ چین سے سویا ہوگا
انگڑائی کے عالم میں جس نے مجھے دیکھا ہوگا

پھر اندھیرا چھا گیا احساس آنکھوں پر مری
پھر کسی اونچے مکاں کا بلب جلتا رہ گیا

شہنشاہ صاحب تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں لیجئے انور صاحب یاد فرما رہے ہیں ثاقب نذیری بنارسی کو۔ ثاقب صاحب زلف بردوش لہراتے مائک پر آکر غزل سرا ہیں ؎

کہنے سننے کو دل ہمارا ہے
ورنہ اس پر تو حق تمہارا ہے
ان کی نظروں کا کچھ قصور نہیں
مجھکو میری نظر نے مارا ہے
مجھکو دیوانہ کہہ کے ٹھکرا دیا
کیا یہ احسان کم تمہارا ہے

ثاقب صاحب داد وصول کرتے تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اور ادھر انور صاحب سرور بارہ بنکوی کو دعوت غزل دے رہے ہیں۔ دیکھا تو ایک نوجوان دُبلا پتلا سا مائک پر آکر حضرت خمار کے ترنم کی کاپی کرنے کی نقالی کر رہا ہے اور اسے ہی کہتے ہیں پدر نتواند پسر تمام کند ؎

اہل حرم سے ذکر جی دمیکدہ کریں
باطل کو آئیے آج حق آشنا کریں
جانے یہ حُسن والے بھی ہیں کس بلا کے لوگ
جس بزم میں بھی جائیں قیامت بپا کریں
یہ حُسن یہ شباب یہ انداز گفتگو
جی چاہتا ہے آپ سے باتیں کیا کریں

داد شباب پر ہے اور دلکشی سے محفل کو لوٹتے چلے ہیں ؎

دیکھا ہے مرے دل کی طرف اک خریدنے
احباب اس غریب کے حق میں دعا کریں

پھر داد کا عالم تو پوچھئے اور میں حضرت خمار کو یاد کر رہا ہوں وہی ترنم وہی غزل میں بانکپن۔ اور کیوں نہ سرور صاحب خمار صاحب کا جو فرزند ارجمند ٹھہرے۔ سرور صاحب خوب خوب داد لوٹ کے مائک سے

جدا ہو رہے ہیں اور انور صاحب دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں محمد علی موج رامپوری کو۔ موج صاحب غزل سرا ہیں ؎

حوصلے زیست کے بڑھاؤں گا زخم کھاؤں گا مسکراؤں گا
مجھ پہ پتھر اچھالنے والے آئینہ ہوں کہ ٹوٹ جاؤں گا
لمحہ لمحہ فرار کی کوشش جیسے میں خود کو بھول جاؤں گا
سنگریزے سمیٹ کر اے موج اک نیا آفتاب اگاؤں گا

موج صاحب محفل کو گرما کر تالیوں کی جھنکار میں مائک سے کھسک رہے ہیں اور انور صاحب ایک ابھرتے غزل گو شاعر معراج فیض آبادی سے درخواستِ غزل کر رہے ہیں۔ معراج صاحب غزل سرا ہیں ؎

تم مری بیکسی کو سزا دیکھے دیکھتے
بجھتے لگی تھی آگ ہوا دیکھے دیکھتے
مجبوریوں کے دشت میں تنہا تھا ہر بشر
لیکن تم ایک رہنما دیکھے دیکھتے
نفرت سے مجھ کو دیکھنے والے بلند لوگ
میری برہنگی کو قبا دیکھے دیکھتے
سب اس کو دیکھ آئے دلہن کے لباس میں
معراج ہم فقیر تھے کیا دیکھے دیکھتے

معراج صاحب دادِ تحسین پا کر کامران پلٹ رہے ہیں اور انور صاحب اب مشاعرہ کو دو آتشہ کرنے کے لئے خوش گلو خوش رو خوش پوش شاعر ڈاکٹر ساغر اعظمی کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں۔ ساغر صاحب یوں محفل کو سرشار کرنے چلے ہیں ؎

وہ جس کے ساتھ بہت دور جانا تھا
سلوک اس کا مرے ساتھ باجرانہ تھا
اسی لئے کوئی بادل ادھر نہیں برسا
کہ اب کے اپنے لہو میں ہمیں نہانا تھا

داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور ساغر صاحب اسی جان لیوا ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

ہوا گھروں میں کہاں اتنی تیز چلتی تھی
اسے تو صرف ہمارا دیا بجھانا تھا
بس ایک تیرا مجھے انتظار تھا ورنہ
کسی درخت کا سایہ تو اک بہانہ تھا

پھر من چلے زیادہ اچھل کود کر رہے ہیں کئی بار دہرا کر ایک لے شور میں چلتے بنے اور پھر سامنے والے بلاک بازی ہوئی۔ شور و غل پہ اتر آئے ہیں۔ یہ ایک منظم سازش تھی ا[illegible] نے یہ کہہ کر کہ سانپ سانپ اور زمین پر جوتے برسانے ش[illegible] ذرا دیر کے لئے بھگدڑ مچی اور مجمع قابو سے باہر ہوا لیکن قابو پا لیا گیا اور یہ سازشی ٹولہ مات کھا گیا اور اس طرح نقدِ انور بنا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے مشاعرہ کو ناکامیاب بنا[illegible] کی اور کمینہ حرکتیں بھی کیں مگر وہ کسی بھی حرکت میں کامیاب یہ سانپ کا آخری اور فرضی حملہ تھا اور وہ سانپ ہی مر کر اردو کے ہمدرد اور شیدائی ہیں لیجئے کلیم عثمانی دیوبند[illegible] ہیں ؎

دشمنوں کے ستم کو کرم کہہ دیا دوستوں کی جفا کو وفا کہہ
کیا کروں اپنی فطرت سے مجبور ہوں اب تو جو کہہ دیا کہہ دیا

بہت ہو گیا — ایک آواز — اور کلیم صاحب چلتے۔ صاحب نے موقع کی نزاکت کو تاڑتے ہوئے راحت اندوری سخن دی ہے۔ راحت صاحب حسبِ عادت یوں گرج اور رہے ہیں ؎

آندھی مغرور درختوں کو پٹک جائے گی
بس وہی شاخ بچے گی جو لچک جائے گی
آسماں جھوٹے گا ہو جائے گا خود اندازہ
جب زمیں پاؤں کے نیچے سے سرک جائیگی

داد کا شور کم ہوا تو اسی شاہانہ شکن انداز سے فرمار[illegible]

ہر اک لمحہ سے جھونکے غزل کے آتے ہیں
اکیلی راتوں میں چلئے ٹہل کے آتے ہیں
عجیب حال ہے چہرے بدل کے آتے ہیں
جو کہہ گئے تھے کہ کپڑے بدل کے آتے ہیں

داد کا ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے اور آپ اسی طرح دہاڑ ہیں ؎

ویسے اس خط میں کوئی بات نہیں ہے پھر بھی
احتیاطاً اسے پڑھ لو تو جلا بھی دینا

دوسرے مصرع پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ داد و داد سے بے نیاز پڑھ رہے ہیں ؎

ویسے اس خط میں کوئی بات نہیں ہے پھر بھی
احتیاطاً اسے پڑھ کر تو جلا بھی دینا

پھر آہ اندازہ کا ایک شور ہے اور آپ پنڈال کو گرما رہے ہیں ؎

میں چلوں تو یہ دولت بھی ساتھ ہی رکھ دینا
مرے بزرگ مرے سر پہ ہاتھ رکھ دینا
کٹے تھا دن تو شکستہ تھا دل میرا
مجھے بھی جلتے چراغوں کے ساتھ رکھ دینا

راحت صاحب پنڈال کو ہنگامے اور ہلڑ بازی میں اتار کر تالیوں کے بے ہنگم شور میں جا رہے ہیں۔ اور اب آ رہے ہیں استاد رامپوری استاد صاحب وہی پرانے قطعات سنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا کر چلتے بنے آیئے اب جواں فکر جواں سال شاعر انور جلالپوری کو بھی سن لیجئے گا ؎

سیلاب آیا ڈوب گئی فصل دھان کی
پانی کے ساتھ بہہ گئی قسمت کسان کی

سوکھا ہوا درخت بھی کچھ کام آ گیا
خواہش تھی سخت دھوپ میں اک سائبان کی

سچائیوں کی جیت یقینی تھی دوستو
بازی مگر لگانی پڑی اس میں جان کی

اس سے یقین دور کا قائد وہی بنے
رکھے جو اس زمین پہ خبر آسمان کی

انور صاحب خوب خوب داد و تحسین وصول کئے اپنی جگہ آ کر اب جنابِ غزل کرشن بہار نور لکھنوی سے درخواستِ غزل کر رہے ہیں۔ نور صاحب نہایت سنجیدگی سے عطا فرما رہے ہیں ؎

تمام جسم ہی گھائل تھا گھاؤ ایسا تھا
کوئی نہ جان سکا رکھ رکھاؤ ایسا تھا
خریدتے تو خریدار خود ہی بک جاتے
تپے ہوئے کھرے سونے کا بھاؤ ایسا تھا
بس اس کی مانگ میں سیندور بھر کے لوٹ آئے
ہمارے اگلے جنم کا چناؤ ایسا تھا

نور صاحب ہر شعر پر داد پا کر کامراں مائک سے جدا ہوتے ہیں۔ اور اب تالیوں کی جھنکار میں ڈاکٹر بشیر بدر صاحب آ کر یوں محفل کو گرما نے چلے ہیں ؎

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی	زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی
میں سمندر کے سینے میں چٹان تھا	رات کو موج آئی بہا لے گئی
میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے	یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

اب داد کا عالم نہ پوچھئے اور مرحوم شاد عارفی یاد آ گئے ارشاد ہوا ہے ؎

چاندنی رات مجھکو جگا کر کہاں	ایک لڑکی تمہارا پتا لے گئی

بدر صاحب خوب خوب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب رنگِ محفل بدلنے کے لئے دلکش آفریدی کو دعوتِ مزاح دی جا رہی ہے دلکش صاحب ایک ہی سانس میں ایک طویل نظم سنا یہ جا اور وہ جا۔ میری درخواست پر دو قطعے ایسے بدخط یا خطِ شکستہ میں تحریر فرمائے کہ ایک قطعہ ہی بمشکل تمام سمجھ میں آیا ہے آپ بھی سن لیجئے گا ؎

آنکھ والے سے کہ اندھے سے کہ کانے سے ملے
اس کی مرضی ہے کہ وہ سارے زمانے سے ملے
بیس بچوں کی ہے اماں اسے ڈر کس کا ہے
وہ اُلا سنے سے ملے یا وہ فلانے سے ملے

دلکش صاحب محفل کو شور و غل کے سپرد کر کے چلے گئے اب اس محفل کو سنجیدگی دینے کیلئے بشیر جھنجھانوی مائک پر آ کر محفل کا جائزہ لیکر پُر وقار انداز سے عنایت فرما رہے ہیں ؎

حسنِ وفا کی ایسی جھلک چھوڑ جایئے
احباب کے دلوں میں کسک چھوڑ جایئے
رنگِ حیات زیرِ فلک چھوڑ جایئے
کردار کی زمیں پہ چمک چھوڑ جایئے
خوشبو کی طرح خود تو بکھر جایئے مگر
صحرا میں بستیوں کی مہک چھوڑ جایئے
اس دورِ کفر خیز کی تیرہ فضاؤں میں
عرفان و آگہی کی چمک چھوڑ جایئے

قبلہ بشیر صاحب خوب خوب داد لوٹتے پلٹ رہے ہیں اور اب

صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں عالم فتحپوری سے۔ عالم صاحب وہی شناسا یا کلام عنایت کر رہے ہیں سماعت فرمایئے ؎

بے وفائی بھی وفاؤں کی سزا ٹھہرے ہے
ہر خطا ان کی ہماری ہی خطا ٹھہرے ہے
دل جلاؤ کہ اندھیروں سے گذرنا ہے تمہیں
کبھی طوفانوں میں مٹی کا دیا ٹھہرے ہے

عالم صاحب بھی داد پاکر اپنی جگہ آرہے ہیں۔ اور اب آرہے ہیں نذیر عالم صاحب جو کہ یہ اسی ادا سے اردو اں ارشاد فرما رہے ہیں۔

؎

کس طرح وقت کے بدلے ہوئے تیور میں رہے
ایسے شب بھر کی شکن صبح کی بستر میں رہے
سر تو میں بھی تجھے دوں گا مگر اس شرط کے ساتھ
تیری ابرو میں جو خم ہے وہی خنجر میں رہے
پتھروں کی تو ہوئیں مجھ پہ بھی بارش لیکن
وہ مرے سر پہ لگے جو مری ٹھوکر میں رہے

قبلہ نذیر صاحب کو تبرکاً سن لیا گیا ہے اور اب انور صاحب درخواستِ غزل کر رہے ہیں آبروئے غزل خمار بارہ بنکوی سے۔ خمار صاحب اپنے مخصوص ترنم سے یوں محفل کو گرما رہے ہیں ؎

دل اگر سرکشی سے باز آئے + آدمی زندگی سے باز آئے
موت آجائے ان امیدوں کو + روز کی جاں کنی سے باز آئے
دوستوں سے ہزار بار گئے ہم + دوستی کب دوستی سے باز آئے
کچھ جیتے ہیں لوگ حیرت ہے + ہم تو اس زندگی سے باز آئے
خود کشی جرم ہے جنابِ خمار + آپ کیوں میکشی سے باز آئے

خمار صاحب کے حاضری پہ کامیاب اور لاجواب پہلا دور پونے دو بجے ختم ہو گیا دوسرا دور خلافِ توقع تقریباً چار بجے تک جاری رہا۔ ایک عرصے سے رڑکی میں مشاعرے ایک مذاق اور بدنام ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن آج کا مشاعرہ مریشہ، دانیوں اور سازشوں کے سر خوب خوب سنا گیا اور کامیاب رہا۔ اس مشاعرہ کو مالی امداد دی تھی ولز رائل سگریٹ والے تھے جن کے نام کا بلا پوسٹر لیکر اسٹیج پہ لٹکے ہوتے کپڑے تک سے نمایاں تھا تعجب ہے کہ یہ نام اردو میں کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ حالانکہ اس سگریٹ کا اعلانیہ اردو میں کامیاب رہتا۔ مگر مشاعرہ کمیٹی کی مجبوری یا مصلحت کو وہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں جن مخلصانِ اردو اور ہمدردانِ شعر و ادب نے خصوصی دلچسپی لی وہ ایک لمبی فہرست ہے۔ ہم اردو کے ناتے ان سبھی کے شکرگزار ہیں کہ شری گلابی صاحب تو آل انڈیا مشاعرہ کے اعلانات ہی جاری کرتے اور برابر تاریخیں بدلتے رہتے۔ لیکن ان حضرات نے حقیقت میں ایک مشاعرہ اہلِ رڑکی کو سنوا دیا یہ سب ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ فرمائش: ع

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

غزل

مسعودہ حیات

کوئی تو دل کی نگاہوں سے دیکھا جائے
ہماری رُوح کے کچھ غم سمیٹا جائے
کمالِ عشق تو جب ہے کہ چپ رہا جائے
زباں پہ لفظِ محبت کہیں نہ آ جائے
تمہارے ملنے کی ہر آس آج ٹوٹ گئی
تمہیں بتاؤ کہ اب کس طرح جیا جائے
ذرا تو سوچیئے اس دل کا حال کیا ہوگا
تلاش گل میں جو پتھر کی چوٹ کھا جائے
سجا کے تم کو گلوں سے، اٹھائے ہیں پتھر
زمانہ کتنا ستمگر ہے کیا کیا جائے
کریں گے کیسے حقیقت کا سامنا ہم لوگ
ہمیں تو خواب ہی کوئی دکھا دیا جائے
کسی طرح تو اندھیرے غموں کے چھٹ جائیں
مرا بجھا ہوا دل ہی جلا دیا جائے
رہِ حیات میں کانٹیں بچھیں کہ پھول کھلیں
یہ شرط ہے تری جانب وہ راستا جائے

ہرچرن چاولہ اوسلو (ناروے)

"تم اب آئے ہو۔ اب جبکہ میرے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ قصور کس کا ہے۔ بولو۔ تمہارا یا میرا۔ میں کب تک اسے سنبھال کر رکھتی یہ تو پل پل گھٹتی چیز ہے۔ میں پل پل کا تمہیں کیا حساب دوں۔ دس سال میں کتنے پل ہوتے ہیں سوچو تو ذرا۔"

یہ کون بول رہا ہے۔ ان تور نے ادھر ادھر دیکھا۔ آواز تو اس کی اپنی بیوی ان دھرلی کی تھی۔ وہ اس کی آواز کو ہزاروں آوازوں میں الگ سے پہچان سکتا ہے۔ مگر وہ تو اس کے سامنے گہری نیند میں ڈوبی کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ تو پھر کیا اس کے اپنے کان بج رہے ہیں۔

اس نے ان دھرلی کے لبوں کو دیکھا شاید وہ پھڑپھڑا رہے ہوں۔ مگر نہیں وہ تو آپس میں اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے AIR TIGHT دروازے۔ اس کے دل میں ان لبوں کو چوم لینے کا کوئی جذبہ نہیں جاگا۔ وہ پنکھڑیاں جنہیں دیکھ کر وہ مچل اٹھتا تھا۔ اب مرجھا گئی تھیں۔

کچھ ہی دیر پہلے بغیر پیشگی اطلاع کئے وہ ہوائی اڈے سے گھر پہنچا تھا اور باہر ہی بیوی سے دروازہ کھلوا کر رات ایک بجے گھر کے کسی فرد کی نیند خراب نہ کرنے کا بہانہ بنا کر وہ اس کے ساتھ بستر میں گھس گیا تھا۔ اندر ہی اندر لبستر اور کمرے کے اندھیرے میں اس نے اپنی بیوی کے سب کپڑے کسی مٹر کے چھلکے کی طرح اتار دیئے تھے اور اسے دانہ دانہ اپنے پہلو میں بکھیر دیا تھا۔ ان دھرلی چاہتی تھی کہ وہ کمرے کا بلب جلا کر اور گھر کے سب افراد کو بلا کر اس کے آنے کی اطلاع کرے مگر اس نے اسے روشنی کرنے سے منع کر دیا تھا۔ مدتوں سے وہ ان دھرلی کے جسم کا ترسا ہوا تھا۔ اور اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ان کے پیار میں مخل ہو۔ اس نے کہا تھا۔ تم کیا ہو لیے۔ صبح وہ سب سے ملے گا۔ پہلے وہ کچھ دیر اندھیرے میں کھسر پھسر کرتے رہے تھے۔ پھر وہ ڈوب گئے تھے۔ پھر وہ سو گئے تھے یا شاید ان دھرلی سو گئی تھی۔ اس کی باہوں کی پناہوں میں آج وہ کتنی گہری نیند سوئی تھی۔ ہمیشہ اسے شکایت رہتی تھی کہ اسے نیند نہیں آتی اور وہ ساری ساری رات جاگتے گزار دیتی ہے۔

رات کوئی تین بجے ان تور کی نیند ٹوٹی۔ مگر اسے نیند آئی بھی تھی یا نہیں کیونکہ خیالات ایک بند کمرے کے دھوئیں کی طرح اس کے ذہن کی دیواروں سے سر پھوڑتے پھرے تھے۔ وہ انہیں خوابوں کا نام دے یا خیالوں کا۔ اگر وہ خواب تھے تو وہ ضرور سو گیا تھا۔ مگر یہ مکالمے کس نے کہے تھے۔ اس نے تو اپنے کانوں سے سنے تھے۔

ان دھرلی کے لب خاموش تھے۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے چادر ان دھرلی کے جسم سے کھینچ کر ایک طرف ڈال دی۔ اب وہ اس کے سامنے مادر زاد ننگی پڑی تھی۔

اس نے بلب جلا کر دیکھا۔ ان دھرلی کے سر پر ساون کی گھٹائیں اب چھٹ گئی تھیں۔ اب ان میں سفید سفید بدلیاں اتر آئی تھیں۔ جو نہ آنکھوں کو طراوت بخشتی ہیں اور نہ برستی ہی ہیں۔ پیشانی کے چاند کو گرہن لگ گیا تھا۔ گالوں کے پھول مرجھا گئے تھے۔ موتیوں کی لڑیاں میلی پڑ گئی تھیں۔ لبوں کی پنکھڑیوں پر مرجھاہٹ آگئی تھی۔ اس کے سامنے کی گولائیاں جنہیں دیکھ کر وہ اپنے قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔ اب پہلی سی کشش باقی نہ رکھ پائی تھیں۔ کبھی ان دھرلی کی پتلی کمر کو وہ ڈھونڈتا ہی رہ جاتا تھا۔ اب وہ جگہ پھیلی سی اور گوار، متول ہو گئی تھی۔ اب جانے کیا کچھ کہاں گم ہو گیا تھا۔

دس سال وہ کیسے بیت جائے اور پھر ان دھرلی کا وہی رنگ روپ دیکھے۔ پہلے وہ ان ہی پر عاشق ہوا تھا۔ وہ بھی اسے دل و جان سے چاہتی تھی مگر ان دھرلی کو دیکھنے کے بعد ان میتی سے اس کا سارا عشق ہوا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے جیسے تیسے ان میتی سے پیچھا چھڑا لیا اور ان دھرلی کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ ان میتی سے اس نے اپنے ایک دور کے دوست راغ دولہ کا رشتہ کروا دیا۔ جب ان میتی کا رشتہ راغ دولہ سے اس کے ماں باپ نے قبول کیا تو ان میتی کے ماں باپ کو ہی اسے ان تور سے جدا کرنے کا ذمہ دار سمجھتی رہی۔

رو رو کر ان تُرد سے معافی مانگی ۔ بولی۔

"میں اپنا جسم ہی کسی دوسرے کو دے رہی ہوں۔ دل ہمیشہ تمہارے پاس رہے گا۔"

بولتا جسم ان دھرلی کا ۔ ہاں وہ جب اسے دیکھتا ۔ کہتا، ان دھرلی تیرا تو انگ انگ بولتا ہے ۔ بولتا نہیں شاعری کرتا ہے جب وہ اپنی غریبی کی طرف دیکھتا۔ ذرا سی زمین ۔ وہ بھی بنجر ۔ ان دھرلی اس کے ان کھیتوں میں کھانا لیکر آتی تو وہ دکھی ہو اٹھتا۔ اس طرح تو وہ میلی ہو جائے گی ۔ میں نے محلوں کی رانی کو جھونپڑے میں قید کر دیا ہے ۔ مجھے اسے آزاد کر دینا چاہیئے یا جھونپڑے کو اس کے قابل محل بنانا چاہیئے۔

یہی تھی ان دھرلی کے بول ۔ پھر تھکتے اور پُر آہنگ جسم سے دور یورپ کے ایک عظیم ملک کے ایک عظیم شہر لے گئی ۔ جہاں ہر تیسرے آدمی کے پاس کار تھی ۔ جہاں کام اتنا تھا کہ روز بدلا جا سکتا تھا ان تُرد نے وہاں بہت دولت جمع کی ۔ ان دھرلی کو بھی اتنا پیسہ بھیجا کہ وہ جھونپڑے سے محل میں منتقل ہو گئی ۔ زمین بھی واپس لے لی گئی ۔ جسے ان دھرلی دوسرے مزدوروں سے جانتی تھی۔ اور خود رانی بن کر بیٹھ گئی۔

اب وہی رانی اس کے سامنے کھڑی تھی جو جھونپڑی تھی اور وہ سوچ رہا تھا ۔ اس نے کیا کھو یا ہے ۔ کیا پایا ہے ۔ اب ان دھرلی کے بولتے جسم کی تمام زبانیں گونگی ہو گئی تھیں ۔ وہ اُٹھا ۔ کوٹ کی جیب سے ہزاروں کرنسی نوٹوں کا پلندہ کھول کر ننگی ان دھرلی پر بکھیر دیا ۔ اس طرح اس نے سمجھا کہ اس نے ان دھرلی کی خاموش طعنہ زن زبان کو بند کر دیا ہے ۔ اس سے اُسے ایک گونہ تسلی ہوئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

صبح وہ اُٹھا تو وہ خود بھی مادر زاد ننگا پڑا تھا ۔ رات کو اس نے خود ہی اپنے کپڑے اُتارے تھے ۔ مگر اب اُس پر کوئی رضائی یا کپڑا نہیں تھا ۔ بلکہ سرسراتے نوٹ تھے جو اس کے اوپر نیچے دائیں بائیں بکھرے پڑے تھے ۔ سامنے ان دھرلی بھی نوٹوں سے دبی پڑی تھی ۔ اس نے ان دھرلی کو نوٹوں سے لاد دیا تھا ۔ اور نہ جانے کب ان دھرلی نے اسے بھی نوٹوں میں دفنا دیا تھا ۔ یہ شاید اس کے بھیجے ہوئے یا ان دھرلی کے اپنی زمین کی کاشت سے کمائے ہوئے نوٹ تھے۔

اس کے جانے کے ایک سال بعد اغ دولہ بھی دو ناطے اس کے پاس یورپ پہنچ گیا تھا ۔ اب اس نے ان میتی کے ہاتھ بے شمار تحفے بھیجے تھے ۔ وہ تحفے پہنچا کے گاؤں پہنچا اور دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان میتی کے حسن ابھی تک ، بدستور تر و تازہ تھے ۔ ان میتی کے سسرال والوں نے متعلق مزید معلومات اور حالات خیریت جاننے کے لئے تین دن تک اپنے ہاں روکے رکھا ۔ وہ ان تین دنوں میں ان کے بہت قریب پہنچ گیا ۔ ایک ایسی ہی قریبی ملاقات میں اس نے ان میتی کے بھرپور اور زبان دراز برہنہ جسم کو دیکھتے پوچھا۔

"سچ بتاؤ میتی ۔ تم نے اپنے جسم کی زبان کو گونگا ہونے سے محفوظ رکھا ۔؟"

"میں نے اپنے جسم کی زبان کو زبان دے دی ۔" ان میتی نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میتی کے جسم کو اوپر سے نیچے دیکھا ۔ جیسے اپنا سوال خود اس کے جسم سے پوچھ رہا ہو ۔ ان میتی "میں نے کہا تھا نا ۔ کہ دل تمہارا رہے گا ۔ جسم کسی اور کا ہو گیا تو اور وہ اور ، اغ دولہ کی بجائے کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔ پھر جب اغ دولہ چلا ہی گیا ۔ ایک دو دن نہیں دو دس مہینے نہیں پورے نو سال کی جدائی دے کر ۔ تو میں کب تک اپنے جسم کی بولتی زبان پر ہاتھ رکھ کر اس کی زبان دبا سکتی تھی ۔

تو......"

"ہاں ۔ عورت پھول ہے تو ایک مرد کے ہاتھوں کے لمس تلے ۔ کوئی پھول کسی مالی کے ہاتھوں کی نگہبانی کے بغیر کب تک اپنا حسن اور قائم رکھ سکتا ہے ۔"

ان تُرد نے ان میتی کے دو مکالموں میں ہی جیسے اپنے تمام مسائل کا حل پا لیا ۔ اس نے چپ چاپ ان میتی کے برہنہ جسم پر چادر ڈالی اور رات کے اندھیرے میں نئی روشنی تلاش کرنے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن یہ روشنی اسے اپنے کھیتوں کی محنت اور ان کی قربت میں مل گئی ۔ اس سے دوسرے دن اس نے اپنا ہوائی ٹکٹ اور پاسپورٹ پھاڑ ڈالا۔

اصلاحِ سخن

ایک واقف کار شاعر کے کلام پر استادانہ اصلاح دینا ایک نہایت ہی مشکل اور اہم کام ہے اور اس فن سے ہر شاعر کا واقف ہونا محالات سے ہے۔ سالہا سال باقاعدہ کسی مستند استاد کی خدمت میں رہ کر ہی کچھ آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ کسی کو اپنی طرف سے کچھ بنا کر دے دینا تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ لیکن صحیح معنوں میں کسی کے کلام پر اصلاح دینا آسان نہیں۔ یہ ایک جداگانہ فن ہے۔ اساتذۂ متاخرین میں خدائے سخن جناب امیر مینائی مرحوم فنِ اصلاح میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ کی اکثر اصلاحیں اعجاز و الہام کا درجہ رکھتی ہیں۔

دنیائے شاعری کے زندۂ جاوید استاد لسان الملک جناب ریاض مرحوم خیرآبادی کے ایک شعر پر جناب خدائے سخن مرحوم نے ایک ایسی معرکۃ الآرا اصلاح فرمائی تھی کہ اس سے قبل ایسی ہی شان کی اصلاح سے دنیائے شاعری بالکل تہی دامن تھی۔ ملک کا کوئی باکمال شاعر ایسا نہیں جو اس اصلاح سے واقف نہ ہو۔ لیکن ویسی اصلاح دو کے سوا کوئی تیسرا آج تک پیدا نہ کر سکا۔ اگرچہ مرحوم معتقد مرزاپوری کی تقلید میں کتنی ہی غیر مستند اصلاحوں کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس اصلاح کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ کم و بیش اس کے تیس سال بعد بالکل ایک ویسی ہی جدت آفریں اصلاح سے ملک کا باکمال طبقہ پھر ایک مرتبہ روشناس ہوا اور وہ تھی یادگارِ امیر خاقانیِ ہند جگت استاد جناب وسیم خیرآبادی کی استادانہ اصلاح حضرت علامہ عیش فیروزپوری کے ایک مشہور شعر پر۔

اس دوسری اصلاح کے دس سال بعد پھر اسی انداز کی ایک معرکۃ الآرا اصلاح منظرِ عام پر آئی جس نے ملک کے نامی ادبا اور شعرا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ تھی امام المتغزلین حضرت علامہ عیش فیروزپوری کی اصلاح دنیائے شاعری کے نامور شاعر حضرت خانزادہ مذاق العیشی فیروزپوری (حال مقیم ملتان پاکستان) کے ایک شعر پر۔ اس تیسری اصلاح کے تقریباً پندرہ سال بعد پھر اسی انداز سے ایک اچھوتی اصلاح سے ذوقِ سلیم رکھنے والے روشناس ہوئے۔ حضرت علامہ عیش فیروزپوری مرحوم کی اس دوسری نادرِ روزگار اصلاح سے مستفیض ہونے والے خوش بخت مایۂ ناز نوجوان شاعر صاحبزادہ نذیر خاور العیشی تھے۔ اب آپ یہ اصلاحیں ملاحظہ فرمائیں۔

اصل شعر ریاض خیرآبادی — نسیم آئی ہے شمعِ مزار گل کرنے
وہ اس کے آنے سے پہلے ہی بجھ گئی ہو گی

اصلاح جناب امیر مینائی — نسیم اب آئی ہے شمعِ مزار گل کرنے
وہ اس .... الخ

اصل شعر عیش فیروزپوری — آج ہو گا مرے گھر ناز سے مہماں کوئی
اور گھر ڈھونڈھے لے اے شبِ ہجراں کوئی

اصلاح جناب وسیم خیرآبادی — آج ہو گا .... الخ
تو گھر اب ڈھونڈھ لے اے شبِ ہجراں کوئی

اصل شعر مذاق العیشی — جو موج لے کے آئی سرِ میکدہ مجھے
ہیں دونوں وقت ایک اسی موج ہی کے ساتھ

اصلاح علامہ عیش فیروزپوری — جو موج .... الخ
ہیں دونوں وقت اب ایک اسی موج ہی کے ساتھ

اصل شعر خاور العیشی — کہاں تک آپ کو آسانیاں میسر ہیں
خیال آئے گا مشکل سے میری مشکل کا

اصلاح علامہ عیش فیروزپوری — کہاں تک .... الخ
خیال اب آئے گا مشکل سے میری مشکل کا

ان اصلاحوں میں علاوہ اور خوبیوں کے یہ کیسی نئی جدت ہے کہ اصل شعر میں کوئی لفظ گھٹا نہیں بلکہ جس لفظ کی ضرورت تھی پورے شعر میں اس لفظ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور انتہائی خوبصورت انداز میں یہ اصلاحیں آپ اپنی یادگار ہیں۔ ہر استاد کا استادانہ کمال اور اس کی بالغ نظری ان اصلاحوں سے واضح ہو سکتی ہے۔ بارک اللہ

سرمد تونسوی

من کہ مکتوب الیہ

کراچی ۳۵ ۔ رئیس اکاڈمی

برادرم السلام علیکم شوق ۔ ۲۰ اکتوبر کے محبت نامے کا شکریہ بھائی میں تو پرانا نیاز مند ہوں اور آپ سے کتنا تعلق اور آپ کی ادبی صحافت نگاری سے کتنی دلچسپی ہے ؟ اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ تقریباً ایک سال سے شانِ ہند نہیں آیا۔ افسوس یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کے انتظامات بہت ابتر ہیں۔ بس انتہا ہے کہ پرچے تک کسٹم پر ہضم کر لئے جاتے ہیں۔ شانِ ہند سے محرومی اک سانحہ ہے۔ مگر اسکا علاج نہ آپ کے پاس ہے نہ میرے پاس ! میں انشاء اللہ قطعات کی دونوں جلدیں اور دوسری کتابیں ایک دوست کے ساتھ جو پندرہ نومبر کو امروہہ جا رہے ہیں۔ ضرور بھیجوں گا۔ مطمئن رہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہم نے ہندوستان و پاکستان کے عوام کے تعلقات کو عوامی سطح پر غیر سرکاری سطح پر بہتر بنانے کے لئے پاک ہند پریم سبھا کی بنیاد ڈالی ہے۔ ہندوستان میں بھی ہند پریم سبھا کی تحریک پر ، انڈو پاک پریم سبھا کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جس کے کنوینر شری جمنا داس اختر ہیں (وہ آج کل لندن میں ہیں اور ان کی قائم مقامی کے فرائض شری وشوا ناتھ طاؤس (چنڈی گڑھ) انجام دے رہے ہیں) ہندوستان کی گیارہ ریاستوں میں انڈو پاک پریم سبھا کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ اور پاکستان میں پاک ہند پریم سبھا کا پیغام تیزی سے پھیل رہا ہے۔

ہمارے مقاصد حسبِ ذیل ہیں۔

پاک و ہند میں ویزا کی امکانی سہولتیں پیدا کی جائیں۔ اور آمد و رفت کی آسانیاں فراہم کی جائیں۔

کراچی ، سندھ اور بلوچستان کے عازمین ہندوستان کے لئے کھوکھرا پار کا راستہ (ریلوے لائن) کھولا جائے۔

راجستھان اور جنوبی ہند کے عازمین پاکستان کیلئے کھوکھرا پار کے راستے آمد و رفت کی سہولت پیدا کی جائے۔

دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک کی شرح میں تخفیف کی جائے۔ ایرگرام کیلئے پچھتر پیسے ۔ لفافے کیلئے پچاس پیسے اور پوسٹ کارڈ کیلئے پچیس پیسے شرح ڈاک مقرر کی جائے۔

کتابوں ، اخباروں اور رسالوں کی تجارت میں آسانیاں پہنچائی جائیں۔

کلچرل وفود کے آزادانہ تبادلے کا بندوبست ہو۔

امید کہ آپ شانِ ہند کے ذریعے ان مقاصد کی تبلیغ کریں۔ عالمی ڈائجسٹ یقیناً بھیجا جاتا ہوگا اور کسٹم پر روک لیا جاتا ہوگا۔ اس مصیبت کا کیا علاج ؟ تقی سلام عرض کرتے ہیں۔ ہم تینوں بھائیوں (جون ایلیا۔ تقی اور یہ خاکسار) کی طرف سے حافظ محمد یوسف صاحب قبلہ کی خدمت میں آداب عرض کر دیں اور بھائی اپنی خیریتِ مزاج برابر مطلع کرتے رہیں۔

(رئیس امروہوی)

● فلیٹ ۱۱۔ فرسٹ فلور۔ "سلور آرچ" نیپئن سی روڈ ۔ بمبئی ۶ ۔ ۲۹ اکتوبر

پیارے سرور بھائی ۔ آداب

بارے آپ کا محبت نامہ ملا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ جس شدت سے میں آپ کے خط کا انتظار کرتا ہوں وہ میرا جی ہی جانتا ہے۔

یہ ۱۷ نومبر کا وعدہ .... ابھی سے تصور میں آپ کی رفاقت کے لطف سے لطف اندوز ہو رہا ہوں ۔

برادرم قتیل شفائی ۱½ ماہ سے بمبئی میں تشریف فرما ہیں خوب خوب لطفِ صحبت رہا ہے۔ غالباً تین نومبر کو دہلی تشریف لے جائیں۔ وہاں ان کے میزبان کنور مہندر سنگھ بیدی کے سوا کون ہو سکتے ہیں کل میرے ساتھ تھے۔ آپ کو بڑے خلوص سے یاد فرما رہے تھے۔ آنے سے پہلے اپنی آمد کی تصدیق کر دیجئے گا۔

بہت دنوں سے اسٹیشن کا فلیٹ فارم نہیں دیکھا۔

دیوالی پر کارڈ ارسالِ خدمت کیا تھا۔ امید کہ مل گیا ہوگا۔ گھر میں سب کو آداب ، پیار۔

آپ کا ۔ راجندر کرشن

سات دن بمبئی میں

سرور تونسوی

۱۷ نومبر کی صبح فرنٹیر میل سے بمبئی سینٹرل ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ جناب خوشتر گرامی سابق مدیر و مالک "بیسویں صدی" مع اپنے داماد کے منتظر تھے۔ ایک منٹ بعد عزیزی ضعب بھائی بھی آگئے اور خوشتر گرامی صاحب کے داماد اپنی گاڑی میں میری قیام گاہ تاز دیو سلیٹر روڈ میری منہ بولی بیٹی فریدہ کا تور کے ہاں لے آئے۔ قبلہ حافظ محمد یوسف دہلوی مدیر اعلیٰ "شمع" ۱۴ نومبر سے ہی بمبئی میں مقیم ہیں۔ انھیں بمبئی انٹرنیشنل ہوٹل فون کیا تو فرمانے لگے آج چھ بجے تک ہوٹل پہنچ جاؤں۔ کیونکہ روشن کماری کے ڈانسنگ سکول کی سالانہ تقریب ساڑھے چھ بجے شروع ہو رہی ہے۔ خوشتر صاحب شام تک میرے ساتھ ہی رہے۔ جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کو فون کیا تو فرمانے لگے کہ ساڑھے تین بجے وہ میرے منتظر رہیں گے۔ کیونکہ میں خود یہی چاہتا تھا کہ بمبئی میں کسی "نیک بخت" سے ہی پہلے ملاقات ہو۔ چنانچہ خوشتر گرامی کی ہمراہی میں سب سے پہلے بمبئی میں جناب رضا کے ہاں وقت مقررہ پر پہنچا۔ تو رضا صاحب منتظر تھے۔ میری رضا صاحب سے بالمشافہ پہلی ملاقات تھی وہ خوشتر صاحب کو دیکھکر بھی خوش ہوئے۔ رضا صاحب کم و بیش آٹھ کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ اور ہر کتاب اُردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ غالب کلیکشن کے بارے میں تو برصغیر ہند و پاک میں رضا صاحب کا کوئی ثانی نہیں۔ اگر غالب سے متعلق کسی کتاب کے ایک سے زائد ایڈیشن چھپے ہیں تو اس کتاب کے جملہ ایڈیشن موجود ہیں۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے تک رضا صاحب کی علمی۔ ادبی اور کچھ مخصوص باتوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ رضا صاحب کی اہلیہ محترمہ نے خالص پنجابی (رضا صاحب بھی پنجابی ہیں) انداز میں کھلانے پلانے میں مصروف رکھا۔ رضا صاحب کے صاحبزادے عزیز کل نے کئی تصاویر لیں۔ رضا صاحب جہاں مالی طور پر خدا کے فضل سے بے فکر ہیں وہاں بھگوان نے انھیں بیوی اور صاحبزادہ بھی ایسے عطا فرمائے ہیں جو ان کی خوش نصیبی کے برابر کے ضامن ہیں۔

خوشتر صاحب کی آنکھوں میں چونکہ موتیا اُتر رہا ہے اس لئے شام کو انھیں اچھی طرح نظر نہیں آتا۔ لہذا وہ مجبوراً اپنی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے اور میں قبلہ حافظ صاحب کے ہاں چھ بجے پہنچا تو وہ انتظار میں ہی تھے۔ تھوڑی دیر بعد روشن کماری کی گاڑی انھیں لینے کے لئے آ گئی قبلہ حافظ صاحب کے ساتھ راقم الحروف۔ عشرت نقوی اور جناب عبدالخالق عرف مامون، تیج پال ہال پہنچے۔ جہاں روشن کماری کے تربیت کلا کیندر باندرہ بمبئی کا آٹھواں سالانہ پروگرام پیش کیا جا رہا ہے۔ آیئے آپ بھی اس رنگا رنگ پروگرام کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ فرمایئے۔ تین سے چھ سال کی پانچ لڑکیاں سیما کنول۔ ونودشی۔ شبینہ بٹ۔ سشیع۔ اشارا مغل۔ گارگی داوچی تین تال سولہ ماترا کا ایسا بہترین مظاہرہ کر رہی ہیں کہ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب تین بہت ہی کم عمر بچیاں۔ چاندنہ گگوش۔ نتا شیخ اور سود بنیتا گگوش نے جھپ تال بارہ ماترہ میں اپنے کمال فن سے ناظرین کو داد دینے پہ مجبور کر دیا ہے۔

روشن کماری کے اس سکول میں صرف چھوٹی عمر کی بچیاں ہی فیض حاصل نہیں کر رہی ہیں بلکہ گھریلو خواتین بھی فن رقص سیکھتی ہیں محترمہ شیلا اروڑہ جو ایمبیسڈر ہوٹل کے جنرل منیجر جناب گلشن اروڑہ کی اہلیہ محترمہ ہیں اور دو بچوں کی ماں ہیں۔ محترمہ نیلم ریلین جو ایک بزنس مین کی بیوی اور دو بچوں کی ماں ہیں اور محترمہ امیرچی حیدرآبادی جو بمبئی کے ایک مشہور کاروباری کی اہلیہ ہیں تینوں ایک تال بارہ ماترہ میں اپنے قابلِ دید فن سے ہر دیکھنے والے کی داد پا رہی ہیں۔

اب تیرہ بہت ہی کم عمر بچیاں سٹیج پر آئی ہیں اور گجراتی فوک ڈانس گربی اس خوبی سے پیش کر رہی ہیں اور دیکھنے والے روشن کماری کو دل ہی دل میں داد دے رہے ہیں۔ اب ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی ریتا نونگالی سٹیج پر آتی ہیں اور اُستاد فقیر محمد نے اعلان کیا ہے کہ اب ادا چو تالی چودہ ماترا دیکھئے۔ ریتا نونگالی نے ایک منجھی ہوئی فن کارہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوب خوب داد پائی ہے۔ اب دو بچیاں رشمی سنگھبال اور رتیکا نندہ سٹیج پہ آئی ہیں اور انھوں نے چترنگ سولہ ماترا سے دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کہ بچیوں کو سکھانے میں روشن کماری کو کس قدر محنت کرنی پڑتی ہوگی۔ اب آٹھ چھوٹی بڑی بچیوں نے مور ناچ دکھا کر تالیوں سے

داد پائی ہیں۔ وہ دیکھئے جیسے تیج بج الملوک سے مینکا تیج پال ہال کی اسٹیج پر اتر آئی ہو۔ راجستھانی نژاد شمیم جو کچھ فلموں میں بھی اپنی اداکاری دکھا چکی ہیں روشن کماری سے گزشتہ سات سال سے کتھک ڈانس سیکھ رہی ہیں۔ مینکا کے روپ میں انھوں نے جو کمالِ فن کا مظاہرہ فرمایا وہ یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔ اب سنگیتا نائر تین تال سولہ ماترا میں انٹرول سے پہلے کی آخری آئٹم پیش کر رہی ہیں۔ یہ طالبہ رقص یقیناً نرتیہ کلا کیندر کا نام روشن کرے گی۔ انٹرول میں چکار کی نسیم بانو سے علیک سلیک ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ دلیپ کمار اور سائرہ دہلی میں ہیں کیونکہ آج انھیں مظفر نگر میں کسی تقریب میں شریک ہونا ہے اس لئے وہ اس پروگرام میں نہیں آسکے (سائرہ بانو بھی روشن کماری کی ہی شاگردہ ہے) نسیم بانو کو راقم الحروف نے ان دنوں بھی دیکھا تھا جب کہ ان کی شہرت کا ستارہ نصف النہار پر تھا۔ یعنی جب وہ پکار کی نور جہاں تھیں یہ کہنا ہی پڑے گا کہ انھوں نے ابھی تک اپنی کشش کو قائم رکھنے کی کامیاب کوششیں کی ہے۔ اگر ماں بیٹی دونوں ساتھ ساتھ کھڑی ہوں تو یقیناً نسیم بانو دیکھنے میں بہتر نظر آئیں گی۔

حکومت کی طرف سے بھی آرٹ کے مختلف ادارے کام کر رہے ہیں۔ مگر نرت کلا کے میدان میں روشن کماری کا نرتیہ کلا کیندر باندرہ بمبئی کسی بھی اس قسم کے سرکاری ادارے سے کہیں بہتر کام کر رہا ہے حکومتِ مہاراشٹر کو چاہئے کہ روشن کماری کے اس ادارے کو گراں قدر گرانٹ ہر سال دے تاکہ یہ ادارہ اپنے مشن کو اور بھی بہتر انداز میں پورا کر سکے۔ روشن کماری کی والدہ بیگم زہرہ آف انبالہ اور والد استاد فقیر محمد کی خدمات کو فراموش کرنا گناہ ہوگا۔ ان دونوں نے بھی اس نرتیہ کلا کیندر کو ملک کا ایک بہترین ادارہ بنانے میں اپنی جملہ فن کارانہ صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔

انٹرول کے بعد جہاں دیری آسٹیرز نے منی پوری ڈانس کے ذریعہ بھگوان کرشن کی مختلف لیلائیں دکھائیں وہ بہر حال یہ اس قدر گہرے فن کا مظاہرہ تھا کہ عوام اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ اگر آئندہ سال سے اس پروگرام میں روشن کماری اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ بھی شامل کر لیں تو شرطیہ طور پر بمبئی تو کیا ملک بھر میں ایسا پروگرام دیکھنے میں نہیں آئے گا

رات کے گیارہ بجے ہم سب جناب عبدالحکیم صاحب مالک نور محمدی ہوٹل کے ہمراہ ان کی گاڑی میں واپس ہوئے تو بھاٹیہ ہسپتال کے پاس حکیم صاحب کا شکریہ ادا کر کے میں اپنی قیام گاہ پر آگیا ہوں۔

بمبئی میں دو تین دن پہلے سمندری طوفان آنے کی محکمۂ موسمیات نے پیش گوئی کی تھی۔ طوفان تو بخیر و عافیت گزر گیا مگر بمبئی میں بارش خوب ہوئی اس بے موسمی بارش کے باعث بمبئی کا موسم خراب ہو گیا ہے۔ اور زکام بخار وغیرہ پھیل گیا ہے۔ قبلہ حافظ محمد یوسف دہلوی بھی اس سے اثر انداز ہوئے ہیں اور ادھر آج میں بھی بستر پہ دراز ہو گیا ہوں۔ برادر محترم جناب راجندر کرشن مشہور گیت کار میری دہلی سے روانگی کے وقت دہلی میں ہی تھے۔ انھوں نے آج بمبئی واپس پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان کے ہاں فون کیا تو وہ تشریف لے آئے تھے اور شام کو مجھے اپنے دولت کدہ پر حاضری کے لئے فرمایا ہے۔ رات کے سوا گیارہ بجے تک ان کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد تو قیام بمبئی کا اکثر وقت راجندر کرشن صاحب کے ساتھ ہی گزرا۔ اور میں فرہنگ آصفیہ سے بھی ایسے الفاظ تلاش نہ کر سکا کہ جن سے ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔ انھوں نے اور ان کی اہلیہ محترمہ نے میرے پرہیزی کھانے کا اس قدر خیال رکھا کہ شاید میں خود بھی ایسا نہ کر سکتا راجندر کرشن نے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں اپنے گھر سے اور شہر سے باہر ہوں۔

راجندر کرشن صاحب ہی مجھے روپ تارا اسٹوڈیو لے گئے جہاں مشہور کیریکٹر ایکٹر جناب اوم پرکاش صاحب سے طویل ملاقات رہی اور ریڈیو کے پروگرام کے بارے میں سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ روپ تارا سٹوڈیو میں ہی کئی ایکٹرسوں کو دیکھا۔ روپ تارا سٹوڈیو کے دفتر میں ایک خاتون جس کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ تشریف لائیں اور پوچھنے لگیں کہ ملازم جی آئینگے۔ اور یہ پوچھ کر چلی گئیں۔ راجندر کرشن صاحب کہنے لگے سرور صاحب یہ خاتون آج سے تیس بتیس سال پہلے ہیروئن بننے آئی تھیں اور پہلے ہی دن رات کو پانچ آدمیوں نے اسے اسی سٹوڈیو میں رات بھر جبراً اپنی ہوس کا نشانہ بنائے رکھا۔ صبح کو وہ پانچوں تو اپنے گھر جا چکے تھے اور یہ دماغی توازن کھو چکی تھی۔ اور آج طویل عرصہ گزر جانے کے بعد یہ ایسے ہی پاگل ہے۔ یہ ہے فلمی دنیا جس کی چمک دمک سے نہ معلوم کتنے نوجوان اور حسین لڑکیاں اپنی راتوں کی نیند حرام کئے ہوئے ہیں اور نہ معلوم کتنی لڑکیاں اس عورت کی طرح ہیروئن بننے کے لئے آئیں اور اپنی آبرو لٹا کر فلمی دنیا کی چکاچوند میں گم ہو گئیں

کر رہ گئیں۔

فلم سٹوڈیوز میں دیکھنے میں آیا کہ جمعدار سے لیکر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تک سب ہی رمی کھیلتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر یہ لوگ رمی نہ کھیلیں تو شاید زندہ نہ رہ سکیں گے۔ کوئی اپنی پاک دامنی کا کتنا ہی دعویٰ کیوں نہ کرے مگر ہماری فلمی دنیا جہنم کا ہی ایک محلہ نظر آتا ہے۔

دلی کی ایک شاعرہ بھی اچانک بمبئی میں نمودار ہوئیں۔ جنہیں دیکھ کر دلی افسوس ہوا۔ کاش کہ ان صاحبہ نے شاعری کا پیشہ اختیار نہ کیا ہوتا۔ بلکہ ایک شریف لڑکی کی طرح کسی کا گھر بسا کر آباو اجداد کی عزت کو بچایا ہوتا۔

جناب شمس کنول صاحب ایڈیٹر "گگن" کو اپنے قیام بمبئی کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ بہ نفس نفیس میری قیام گاہ (ذریعہ لوز کے ہاں) تشریف لائے۔ اور دن بھر میرے ساتھ رہے۔ انہی کے ساتھ علوی بکڈپو کے مالک جناب جوزر صاحب سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ جوزر صاحب نے اپنے نام کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ محمد یوسف زرما کو مخفف کرکے جوزر بنا لیا گیا ہے۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں اور ایک کامیاب تاجر ان کی باتیں سن کر دل چاہتا تھا کہ ان سے تجارتی گُر سیکھے جائیں۔

بمبئی میں عربوں کی یورش ہر طرف نظر آتی ہے۔ عرب عورت کے معاملے سے ابتدائے آفرینش سے بھوکا رہا ہے۔ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی دفن کر دی جاتی تھیں۔ لہذا عورتوں کا عرب میں کال رہا۔ اب جب کہ عرب ممالک تیل کے باعث دولت کو سنبھال نہیں پا رہے ہیں تو ان کی جنسی بھوک صدیوں کی کمی پوری کر رہی ہے۔

جنسیات اور جمالیات کے بارے میں کلیان جی کا "آنند رنگ" دنیا بھر میں ایک مستند گرنتھ سمجھا جاتا ہے۔ اس گرنتھ میں ایسے ایسے طریقے بتائے گئے ہیں کہ عورت کو اپنے مرد میں ۳۶ مردوں کے مختلف احساسات کا پرتو نظر آنے لگتا ہے اور اسی طرح کسی مرد کو اپنی بیوی میں ۳۶ مختلف عورتوں کی لذتِ شہوانی میسر آسکتی ہے۔

کلیان جی نے گرنتھ کے آخر میں شو جی مہاراج (جنسیات اور جمالیات کے باوا آدم) سے یہ عاجزانہ گزارش کی ہے کہ اس گرنتھ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ عیاشی یا بدچلنی پھیلانے کے نظریہ سے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ محض اس لئے کہ عورت اور مرد (CHANGE) چاہتے ہیں اور اس خواہش اور ضرورت کے پیشِ نظر بدچلنی پرورش پاتی ہے۔ اس گرنتھ کے پڑھنے سے بدچلنی نہیں پھیلے گی۔ بلکہ ہر مرد اپنی عورت سے اور ہر عورت اپنے مرد سے جنسیاتی اور جمالیاتی طور پر بطور مطمئن ہو سکیں گے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ بیچارا کلیان جی ان عربوں کے جنسی شوق اور بدکاری اور بدچلنی کے جدید طریقوں سے کوسوں دور رہا۔ ان عربوں کی جنسی بے راہ روی کا یہ عالم ہے کہ دائیں بائیں پہلو میں مادرزاد برہنہ عورتوں کے علاوہ تکیہ کے طور پر سرہانے بھی مادرزاد برہنہ عورت کو رکھا جاتا ہے۔

تہذیب اجازت نہیں دیتی کہ وہ جملہ حالات لکھے جائیں۔ جو بمبئی میں ان عربوں کی جنسی بے راہ روی نے پیدا کر رکھے ہیں۔ ہر ہوٹل میں عربوں کے پیسے کے پیسے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور ہر ہوٹل کے باہر دلالوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ بعض عرب غیر ملکی عورتوں کو بغل میں دبائے جب ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں تو یہ مناظر اس صورت حال کا پیش منظر ہوتے ہیں کہ مٹھی بھر اسرائیلیوں نے عربوں کو شکست کیوں دی۔ جب کوئی قوم دولت کی فراوانی کے باعث بدکاری اور عیاشی میں غرق ہو جاتی ہے تو اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ کاش عرب ممالک کی حکومتوں کے سفیر اپنے ممالک کی حکومتوں کو اس سے آگاہ کرتے کہ یہ عرب ہندوستان میں آکر کیا کرتے ہیں۔

ہزاروں دلال ملک بھر میں گھوم گھوم کر ان عربوں کے لئے حسین لڑکیاں مہیا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ آندھرا پردیش کے گاؤں گاؤں میں منادی کرائی جاتی ہے کہ عربوں سے شادی کرنے والی لڑکیاں درکار ہیں اور سینکڑوں لڑکیاں جو پیٹ کی بھوک کی ماری ہوتی ہیں۔ ان دلالوں کے پھندوں میں پھنس کر بمبئی آتی ہیں ان عربوں سے نکاح ہوتا ہے اور اس کے بعد انسانی ذہن میں عیاشی کی جو بھی بدترین سے بدترین ترکیب آسکتی ہے وہ عمل میں لائی جاتی ہے اور حق مہر دیکر طلاق دے دیا جاتا ہے اور اگر کوئی لڑکی زیادہ پسند آگئی تو اسے عرب لیجایا جاتا ہے۔ اور حرم میں عمر بھر کے لئے بند کر دیا جاتا ہے۔ ملک کے ہر حصہ سے عیاش اور بدقماش عورتوں نے آجکل بمبئی کو اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ حکومت مہاراشٹر نے بھی بدمعاشی اور عیاشی کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ ہزاروں لاج محض عربوں اور ان بدقماش عورتوں کے سہارے پبلک ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ اور پولیس کے سامنے سب کچھ ہوتا ہے۔

پونہ کی ریس اب کی بار ہفتہ کی بجائے جمعہ کے روز ہوئی۔ بمبئی
یں کورس میں راجندر کرشن صاحب کے ہمراہ جانا ہوا۔ میں نے پہلی
رتبہ ریس کورس کو دیکھا۔ راجندر کرشن صاحب ریس کورس کے
رینہ رسیا ہیں۔ لاکھوں گنوائے اور لاکھوں کمائے۔ ایک بار تو ۸۴
زار کی رقم بھی یکمشت ہاتھ آگئی۔ چونکہ ایک روز پہلے ریس ہو رہی تھی
س لئے ریس کے تمام رسیاؤں کو اس کی خبر نہ ہوسکی۔ اس کے باوجود
ردوں کا مجمع تھا۔ جوان۔ ادھیڑ اور بوڑھی عورتیں مردوں سے زیادہ
شائق تھیں۔ اکثر فلمی اداکار بھی کمری۔ آغا۔ محمود برادران سب
ن گھوڑوں پر قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ راجندر کرشن صاحب فرمانے
، سرور صاحب شام کے پانچ بجے تک یہاں رہنا ہے۔ اس لئے یہ طویل
ت آسانی سے کاٹنے کے لئے آپ بھی ایک ٹکٹ لے لیجئے جو پانچ
یوں پر کارآمد ہوگا چنانچہ یہ ٹکٹ خرید لیا گیا اور بڑے ہی عجیب
ریب حالات میں یہ وقت ایسے کٹا کہ یاد رہے گا۔ ریس پونہ میں
رہی تھی اور وہیں سے جملہ حالات نشر ہو رہے تھے۔ راجندر کرشن
حب کے نشان کردہ گھوڑوں پر میرا ٹکٹ متواتر تین گھوڑوں میں
متا رہا۔ مگر اپیل ہونے پر فوٹو دیکھنے کے بعد اعلان کیا گیا کہ تیسرا
ڑا جو اوّل نمبر پر مشتہر کیا گیا ہے وہ اب نمبر دو پر کر دیا گیا ہے۔
ا میرا ٹکٹ یہیں پر ختم ہو گیا۔ گو اس کے بعد چوتھا گھوڑا بھی راجندر
شن صاحب کا نشان کردہ ہی آیا اور پانچویں پر بھی وہی جھگڑا ہو گیا
نمبر ۳ پر ہوا تھا۔ ریس میں لگائے گئے روپیہ پر ۱۸ فیصدی سرکاری
ٹیکس ہے۔ مگر اس ٹیکس کی چوری اس طرح ہوتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے
ریس کا ٹیکس بالکل صحیح وصول ہو جائے تو جو ٹیکس عام طور پر وصول
ہوتا ہے کم از کم اس سے ۲۵ گنا زیادہ ٹیکس وصول ہو سکتا ہے۔
رکاری کارندے اور حکومت خود اس بددیانتی کو جانتی ہے مگر
پردہ پوشی کرنے میں ان کا بھی بھلا ہے اس لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے

قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی کی طبیعت ٹھیک ہونے
میں نہیں آرہی لہٰذا انھوں نے اپنا واپسی ہوائی ٹکٹ ۱۴ر کی بجائے
۱۱ر نومبر کا کرا لیا تھا۔ ان کا معمول ہے کہ جب بھی یہ بمبئی جاتے ہیں
ہوائی اڈہ جاتے ہوئے راستہ میں باندرہ میں روشن کماری
صاحبہ کے یہاں کھانا تناول فرماتے ہیں اور پھر ہوائی اڈے پہ
روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور روشن کماری اس دعوت میں پلنگ لازمی
طور پہ پکاتی ہیں۔ کیونکہ حافظ صاحب کی یہ پسندیدہ ڈش ہے۔ کہا
جاتا ہے کہ روشن کماری ایسے پائے کوئی دوسرا نہیں پکا سکتا۔ بدقسمتی
سے اس بار حافظ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو انھوں نے اوّل
تو کھانا کھانے سے ہی انکار کر دیا۔ روشن کماری کے اصرار پر یہ طے پایا کہ
کھچڑی کھائیں گے۔ لہٰذا پروگرام کے مطابق ۱۱ر نومبر کی دوپہر کو ہمارا
قافلہ قبلہ حافظ یوسف صاحب دہلوی کی قیادت میں روشن کماری
صاحبہ کے ہاں باندرہ پہنچا۔ کھانا تیار تھا۔ علیک سلیک کے بعد کھانے
کی میز پر جب کھچڑی سامنے آئی تو اس میں مرغ کی ٹانگیں کثرت سے
نظر آئیں۔ کھچڑی کھائی تو بے ساختہ خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے
کے ساتھ ساتھ روشن کماری کے لئے بھی تعریفی کلمات نکل گئے اور میں
نے انھیں داد دی کہ آپ نے جس انداز سے بیچاری کھچڑی کو مشرف بہ اسلام
کیا ہے۔ یہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس اسلام نوازی پر
مزید خوش ہوں گے۔ مرغ اور دوسرے سالنوں کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا
اور سب نے کھچڑی پیٹ بھر کھائی میں اب بھی اس کھچڑی کا چٹخارہ محسوس
کر رہا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کو جلد از جلد بمبئی
جانے کے لئے مجبور کریں تاکہ پھر یہ کھچڑی کی فرمائش کی جا سکے۔ روشن کماری
گلشن میں ملک بھر میں اپنی نظیر آپ ہیں مگر کھانا پکانے میں بھی وہ اتنی ہی
ماہر ہیں۔

بمبئی کی آب و ہوا اس بار راس نہ آئی اور عام طور پر میں اپنی
بیٹی فریدہ نور کے ہاں بستر پر ہی رہا میں بیٹی فریدہ نور۔ فہمیدہ اور اس
کے شوہر شعیب بھائی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے قیام بمبئی کے دوران میری
خدمت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔

روانگی بمبئی سے ایک دن پہلے جناب شمس کنول صاحب ایڈیٹر گگن
اپنے خسر جناب غازی صاحب کے ہمراہ تشریف لائے۔ غازی صاحب سے
خوب باتیں ہوئیں۔ انہوں نے بتایا بوہروں کے داعیٔ مطلق جناب مولانا...
برہان الدین صاحب کے خلاف کچھ لوگوں نے جو واویلا مچا رکھا ہے۔ حضرت
مولانا کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ ہم کسی پر جبر نہیں
کرتے۔ جس کی مرضی ہے ہمیں داعیٔ مطلق تسلیم کرے اور جس کی مرضی
نہ ہو وہ نہ کرے۔ جناب خوشتر صاحب بھی تشریف لائے اور دن
بھر میرے ساتھ رہے۔ میں خوشتر گرامی صاحب کا ممنون ہوں کہ وہ جمیوں
جیسے دور دراز مقام سے تشریف لاتے رہے۔

غزل

نصیر افسر

ندی کنارے جو بستی دکھائی دیتی ہے
مجھے حسین غزل سی دکھائی دیتی ہے
یہاں دھوپ جو پڑتی ہے سرد جھیلوں پہ
شرابِ حسن سی گرتی دکھائی دیتی ہے
مرے ہی جسم پہ آنسو ٹپک پڑے اس کے
حیاتِ شمع جو جلتی دکھائی دیتی ہے
مچل پڑے ہیں خیالوں کے نرگسی پیکر
نگاہِ یار جب اٹھتی دکھائی دیتی ہے
ہر ایک خواب میں اکثر پری صفت افسر
کسی کے روپ کی مستی دکھائی دیتی ہے

٭

غزل

ڈاکٹر لطیف اکبرآبادی

ان کی زلفوں کو کہیں چھو تو نہیں آئی ہے؟
سچ بتا بادِ صبا آج کیوں اترائی ہے؟
دل کی دنیا میں جو بھولے سے خوشی آئی ہے
اپنے ہمراہ یہ پیغامِ الم لائی ہے!
آئنہ سامنے رکھ کر وہ کھڑے ہیں لیکن
ان کو اب تک بھی وہی دعوئے یکتائی ہے
اپنے دل میں بھی بہاروں کی تمنا تھی مگر
بن کے ہر صبحِ چمن شامِ بلا آئی ہے
یہ دبا دیگی ابھی شورشِ دنیا کو لطیف
سازِ دل سے جو اک ہلکی سی صدا آئی ہے

غزل

زیڈ۔ اے۔ ہلال
ایڈوکیٹ سناوَد

اک دورِ زیست ایسا بھی پروردگار ہو
میری نگاہِ شوق پیامِ بہار ہو
اہلِ خرد بھی ہوش میں شاید ہی رہ سکیں
سازِ نفس کی لے میں اگر انتشار ہو
وہ کیا نظام جس میں ہوں دو چار فرد خوش
کثرت ہلاکِ کشمکشِ روزگار ہو
بدلوں گا ایسے ڈھنگ سے ماحولِ زندگی
ان کی تجلیوں کو مرا انتظار ہو
اس کی بہار، اس کا چمن، اس کا آشیاں
جس کو ہوائے باغِ جہاں سازگار ہو
آ امتحاں ہے تیرے ستم، میرے ضبط کا
میں خوگرِ جفا ہوں جفا بے شمار ہو
یہ دورِ انقلاب یہ ماحولِ آتشیں
تہذیبِ نو کا اس میں ہی شاید مزار ہو
ردِ عمل ہے یہ مرے شکووں کا اے ہلال
شرما کے بولے "میری طرح بے قرار ہو"

٭

غزل

امتیاز جے پوری

کیا ہوا اگر کوئی مرا نہ ہوا
پست میرا تو حوصلہ نہ ہوا
غم میں غربت میں، اور بلاؤں میں
میں کسی طرح بے وفا نہ ہوا
سب جدا ہو گئے زمانے میں
غم کا سایہ مگر جدا نہ ہوا
آدمی سے ہے آئینہ بہتر
جھوٹ کا دوست آئینہ نہ ہوا
پیٹھ پر زخم سینکڑوں ابھرے
دوستوں سے مگر گلا نہ ہوا
پھونک ڈالے مرے نشیمن کو
اتنا بجلی کو حوصلہ نہ ہوا
باز آئے نہ وہ جفاؤں سے
میرا دل بھی تو بے وفا نہ ہوا
امتیاز اس کی جستجو ہے مجھے
آج تک جس کا سامنا نہ ہوا

٭

غزل

فخر واحدی ۔ قنوج

اس پہ نظر کا یہ اثر دیکھ رہا ہوں / ہر شخص کو بے ہوش و خبر دیکھ رہا ہوں
رخسارِ ضیا بار پہ یہ کاکلِ شب رنگ / چہرے پہ ترے شام و سحر دیکھ رہا ہوں
کیا تنگ زمانہ ہے کہ انساں کا اب حال / دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
فردوس بداماں ہوئی جاتی ہیں یہ آنکھیں / جلوہ ترا بھر بھر کے نظر دیکھ رہا ہوں
سب بے پئے سرشار نظر آتے ہیں میکش / ساقی کا یہ فیضانِ نظر دیکھ رہا ہوں
سودائے تکبر سے جو خم ہو نہ سکا تھا / میں آج تہِ خاک وہ سر دیکھ رہا ہوں
ہے فخر کسی کو نہ بقا دارِ فنا میں / عبرت کا نظارہ ہے جدھر دیکھ رہا ہوں

مُجرم کون؟

عابد نقوی، لندن

اکرم جیل کی آہنی سلاخوں میں سے سُورج کو شب کی آغوش میں سمٹتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی سُورج کو ڈوبتے یا اُبھرتے نہ دیکھے گا۔ جب نئے دن کا سُورج طلوع ہوگا۔ تو اس کی زندگی کا آفتاب غروب ہو چکا ہوگا۔

کل اسے زنجیرِ حیات سے نجات مل جائیگی۔ اس کا گناہ آلود جسم تختۂ دار پر تڑپ کر ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس کی لاش پر گریہ زاری اور پیشانی پر بوسہ دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ کسی کی آنکھیں اس کے لئے نمناک نہ ہوں گی۔

وہ سوچنے لگا کہ کوئی بچہ پیدائشی مجرم نہیں ہوتا .... پھر وہ مجرم کیوں بن جاتا ہے؟ اسے اس منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ معاشرے نے اسے مجرم بننے پر کیوں مجبور کیا؟۔ اسے تنگ و تاریک کوٹھری میں پہنچانے والا کون ہے ۔؟۔ اس کے جیل میں آنے سے پہلے ان لائبریریوں کو بند کر دینا چاہیے تھا جن میں جرم پر اکسانے کے لئے کتابیں بھری ہوتی ہیں .... جاسوسی ناولوں کے مصنف سے قلم چھین لینا چاہیے ظالم بردہ فروشوں کو جلا وطن کر دینا چاہیئے .... دولت کی جھنکار پر ناچنے والے ڈاکٹروں سے ڈگریاں چھین لینا چاہیے .... جھوٹی خبریں شائع کرنے والے اور کسی مظلوم کی داستانِ بے کسی کو کہانی بنا کر چھاپنے والے اخباروں کو بند کر دینا چاہیے۔

اکرم — اپنے خیالات میں ڈوبا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی سے دُور جاکر قید خانے کے کھردرے فرش پر بیٹھ گیا۔

باہر سڑک پر میلے کچیلے۔ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ..... مستقبل کے معمار یا چور ڈاکو — خونی۔ قاتل۔ جیب کترے بے نیازی سے کھیل رہے تھے۔

وہ سوچنے لگا .... جب یہ بچے ہاتھ پھیلا پھیلا کر معاشرے سے اپنا حق مانگتے ہیں تو ان کا ہاتھ نفرت سے جھٹک دیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت کاریں سرسراتی ہوئی پاس سے گزر جاتی ہیں ... جن کے پہیوں سے اڑتی ہوئی دھول مٹی ان مستقبل کے جوانوں کے چہرے پر جم جاتی ہے اور انھیں اس دھول کے مرغولوں میں بھٹکنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے ... اور جب بڑے ہو کر یہ اپنا حق چھینتے ہیں ... تو سویا ہوا قانون ایکدم اٹھتا ہے اور مکڑی کے جالے میں انھیں ایک بار پھر جکڑ لیتا ہے۔

اکرم — بھی انھیں بچوں کی طرح ننگ دھڑنگ سڑکوں مارا پھرتا تھا۔ بھوک و پیاس سے تڑپتا تھا۔

اسے اس کی ماں بارہ سال کا چھوڑ کر مرگئی تھی — باپ نے شادی رچالی سوتیلی ماں کے رویئے کے ساتھ ساتھ باپ بھی اس کو فراموش کر بیٹھا وقت کا تیز و تُند دھارا اس کے دل کو مجروح کر ارمانوں کا خون کرتا آگے بڑھتا رہا۔

جب اسے گھر میں پیار نہ ملا وہ باہر جاکر دوستوں ہمدردوں کے ساتھ وقت گزارتا۔ ایک دن جب وہ دیر سے گھر لوٹا تو گھر کے دروازے اس پر بند ہو چکے تھے۔ وہ جاڑوں کی سرد رات کو باہر کھڑا رہا لیکن دل باپ اور سوتیلی ماں کا دل نہ پسیجا۔

اکرم نے اس رات عہد کیا۔ نئی صبح کے ساتھ وہ بھی نئی زندگی شروع کرے گا۔ ماں باپ کی پھٹکار کو پیار و محبت میں تبدیل کر دے گا۔ دل ڈ[illegible] گا۔ اور ہر حال میں حالات سے سمجھوتہ کرے گا۔

اسی سوچ میں اس نے رات گزار دی سردی اور بخار نے اسے بے چین کر دیا۔

صبح کو گھر کا دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہوا۔ لیکن سوتیلی ماں نے اس کے ساری رات غائب رہنے کی کہانی بناکر باپ کو سنادی۔ لاکھ باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ باہر سردی میں اکڑتا رہا۔ لیکن اس کی ایک نہ چلی ساتھ ہی تھپڑوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔ اور اس کے کانوں میں آواز گونجی اس گھر کی طرف کبھی رُخ نہ کرنا....

گھر کے دروازے بند ہونے کے بعد اس پر بے شمار دوسرے در کھل گئے۔ وہاں اسے شفیق باپ اور محبت کرنے والے بھائی ملے جنھوں نے اسے سکھایا کہ بے گھر اور بے مددگار بچے کس طرح معاشرے میں زندہ رہنا سیکھ لیتے ہیں۔ نہ۔ حکومت۔ نہ رفاہ عامہ کے ادارے ان بچوں کو کارآمد بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لہٰذا اسے جاسوسی دنیا کا ہیرو بن

جیب کاٹنے اور ڈاکہ ڈالنے کے فن میں ماہر ہو گیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ۔ اس کے ارادے اس کے جذبات معاشرے کی بے انصافیوں سے نفرت میں تبدیل ہونے لگے۔ وہ ایک طاقتور خوبصورت جوان تھا۔ اسے بھی ایک پیار بھرا دل مل ہی گیا۔ اکرم ایک زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔

شکیلہ ۔ اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔ اکرم کے پاس کار تھی۔ کوٹھی تھی، دولت تھی اور مچلتی ہوئی جوانی تھی۔ لیکن وہ ایک بدمعاشوں کے گروہ کا سرغنہ تھا۔ جب شکیلہ کے باپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے رشتہ سے انکار کر دیا۔ اکرم اس کو اغوا کر کے زبردستی شادی کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کا انسان جاگ رہا تھا۔ خاندان کی شرافت کا خون بھی ساتھ ساتھ رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

آخر ایک دن شکیلہ خود ہی اس کے گھر آگئی اس نے بتایا وہ اب کسی کی امانت ہو چکی ہے اس کی عزت کے ساتھ ساتھ ماں باپ اور ایک خاندان کی عزت وابستہ ہے۔

لہٰذا اب وہ اس کا خیال دل سے نکال دے۔ اکرم نے کہا۔ شکیلہ.. مجھے تم سے محبت ہے تمہیں اپنے خوابوں میں سجاؤں گا۔ اگر تم کسی کی امانت ہو تو کیا میں تمہیں تصوّر میں بھی نہیں لا سکتا؟ .... میں تمہاری پوجا کرتا رہوں گا۔ اس کے یہ الفاظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

شکیلہ چلی گئی۔

• کچھ عرصہ بعد اکرم کا ساتھی کسی جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی بوڑھی ماں جو اکرم کی بھی منہ بولی ماں تھی بیماری کا شکار ہو کر بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ اکرم اس کی تیمارداری میں لگا رہتا۔ ایک دن اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

اکرم نے ڈاکٹر کے پاس آدمی بھیجا۔ ڈاکٹر نے پہلے تو رات کے وقت کسی مریض کے دیکھنے کی ڈبل فیس طلب کی۔ اور جانے کیلئے بھی حیل و حجت کرنے لگا۔

اس نے آکر سارا قصہ اپنے استاد کو بتایا۔ اکرم جوش و غصہ میں اٹھا اور ڈاکٹر کے گھر پہنچ کر غصہ پر قابو پاتے ہوئے اس سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور چار گنی فیس دینے کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن ڈاکٹر کو نقد چاہئے اکرم نے اکو کہا کوئی ضمانت اس وقت لے لو۔ میرے پاس کیش نہیں ہے صبح تم کو اس سے چار گنا زیادہ دیدوں گا۔

ڈاکٹر نے ایک نہ سنی اور اسے دھکا دیکر باہر نکل جانے کو کہا اکرم نے انسانیت کے نام پر انسانی زندگی کی بھیک مانگی.... اس کے جواب میں ڈاکٹر نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا۔ پھر کیا تھا سویا ہوا اکرم جاگ اٹھا۔ اس نے ڈاکٹر کو گردن سے پکڑ کر سامنے رکھی ہوئی میز پر پھینک دیا۔ ڈاکٹر نے میز کی دراز سے ایک تیز دھار آلہ نکالا اور اکرم کی طرف حقارت سے بڑھا۔ اسی ہاتھا پائی میں ڈاکٹر کا تیز دھار آلہ اس کے اپنے پیٹ میں گھس گیا۔

ڈاکٹر زخموں کی تاب نہ لاکر موقع پر ہی ختم ہو گیا۔ اور اکرم بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔ لیکن اس کی ماں دوا سے بے نیاز ابدی نیند سو رہی تھی۔

• جب اکرم پر ہاتھ اٹھا کسی نے نہیں دیکھا ــــ انسانیت، فرض۔ اور قانون سو رہا تھا۔ لیکن جب دولت کے پجاری ڈاکٹر پر ہاتھ اٹھا تو ہزاروں ہاتھ نفرت سے اس کی طرف بڑھے دوسرے دن اخباروں میں خبریں شائع ہوئیں۔ ایک ڈاکٹر کا بے دردی سے قتل۔ ملزم مفرور ہے۔ پولیس تلاش میں مصروف ہے۔

ایک دن اکرم اپنے کمرے میں بیٹھا آئندہ کا پروگرام بنا رہا تھا۔ دروازہ پر دستک ہوئی ــــ اور شکیلہ سوجی ہوئی آنکھیں بکھرے بال پریشاں حال اندر داخل ہوئی۔ اس نے کمرے کے اندر آتے ہی نحیف آواز میں اکرم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ـــ

تم نے ایک دن کہا تھا میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔ لیکن اس کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا۔ اکرم اس کی حالت دیکھ کر حیران تھا۔ اور تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ تمہاری یہ حالت کیوں ہے۔؟ شکیلہ تمہاری یہ حالت کس نے بنائی ہے؟ خدا کے لئے مجھے جلدی بتاؤ۔

ہاں میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ میں زندہ ہوں میرے الفاظ زندہ ہیں۔ اس بدمعاش کا نام بتاؤ۔ تمہارا شوہر..... میں ابھی آنکھ جھپکنے کی سزا دوں گا۔ تمہارے قدموں پر اس کا سر لاکر ڈال دوں گا۔ لیکن شکیلہ بدستور روتے ہوئے بولی اکرم میں بیوہ ہو گئی۔ اب اکرم کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔

اکرم ـــ اگر تم کو مجھ سے ذرا بھی محبت ہے تو اس ظالم شخص کو جس نے میرے بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم کر دیا ہے۔ سزا دو۔ اسے پولیس کے حوالے کرا دو۔ یا میرے پاس لے آؤ میں ان ہاتھوں سے گھسیٹ کر میں اس کی گردن جکڑ لوں گی اور اسی تیز دھار آلہ سے اس کی طرف

بیٹے کا پیغام لے کر بڑھو گی۔

اکرم میں بہت بے چین ہوں جب تک میرے شوہر کا قاتل نہیں پکڑا جاتا مجھے چین نصیب نہ ہوگا۔ میری خوشی کی خاطر تم یہ کام ضرور کر دو۔ میرا شوہر ڈاکٹر تھا۔ غریبوں کا علاج کرتا تھا۔ کسی غنڈے نے رات کو گھر میں اسے قتل کر دیا۔

اگر قاتل نہ ملا تو میں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گی۔

اکرم۔ ڈاکٹر کے قاتل کو تلاش کر دو۔ میں اپنی جھولی پھیلا کر اس یتیم بچے کی زندگی کا واسطہ دیتی ہوں۔ !! اکرم کی نگاہوں میں اس رات کا منظر گھوم گیا۔ لیکن شکیلہ کی غلط بیانی پر کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے اکرم کا شانہ پکڑ کر زور سے ہلایا۔

اکرم تم نے کہا تھا میں تمہاری خوشیوں کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو۔ اکرم تھوڑی دیر کے لئے کھو گیا۔ پھر بولا۔ تم ٹھیک کہتی ہو میں تمہاری خوشی کے لئے سب کر دوں گا.... تم .... تم کل ۴ بجے پولیس سٹیشن پر آجانا.... وہ وہاں موجود ہوگا۔ اس کے حلق میں الفاظ اٹک رہے .... لیکن

کل۔ ہاں۔ کل۔

دوسرے دن جب وہ پولیس اسٹیشن پہنچی تو اکرم آہنی سلاخوں کے پیچھے موجود تھا۔

ٹن ٹن جیل کی گھڑی نے گیارہ بجائے۔۔ اکرم کو یوں محسوس ہوا جیسے خاموش کائنات بھی اس کے ساتھ آخری سانس لے رہی ہے۔

اکرم نے باہر نظر ڈالی ہر طرف سناٹا تھا۔ چند چوکیدار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اس دنیا میں اس کے چند گھنٹے اور باقی تھے۔ وہ وقت بھی پلک جھپکتے گزر گیا۔ اور تالے میں چابی گھمانے کی آواز آئی اور پولیس والوں کے ہمراہ اکرم اپنی آخری منزل کی طرف چل دیا۔

وہاں اسے ایک کاغذ اور قلم دیا گیا کہ اپنی آخری خواہش لکھ دے۔

... اس نے لکھا...

اس دنیا کے نام جس کے سینے پر اسے اور اس جیسے ہزاروں نوجوانوں کو کبھی چین نہ ملا۔ اب مر کر بھی وہ اس کی گود میں نہ سوئے گا۔

میرا جسم تجربات کے لئے وقف کر دیا جائے تاکہ دوسروں کے کام آئے۔ زندگی میں معاشرے نے مجھے اور میں نے معاشرے کو کچھ نہ دیا مرنے کے بعد جسم ہی کام آسکے گا۔

خدا کرے میں اس طرز کا آخری مسافر ہوں۔ اور مجرم کو جنم نہ دے۔ مجرم بنانا یا انسان بنانا اسی معاشرے جس کی گود میں ہزاروں مستقبل کے معمار جنم لیتے ہیں۔۔ مفلوک الحالی۔ غربت۔ بھوک۔ افلاس ان کا اوڑھنا ہے۔

یہ خود غرض معاشرے کے ٹھیکہ دار اپنے فرض کی کوتاہی کو چھپانے کے لئے دوسرے معصوم زندگیوں کو قربان کر دیتے ہیں۔

یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اسے کون روکے شاید خدا بھی نہیں۔

شکیلہ کو میرا آخری سلام۔

غزل

امین بیودوی

خدا ہی جانے وہ کس حادثے سے گزرا ہے
فلک پہ چاند بہت آج دھندلا دھندلا ہے!

دیا حیات نے کتنا حسین دھوکا ہے
مرا وجود مجھے خوشنما سا لگتا ہے

نہ تجھ سے کوئی گلہ ہے نہ کچھ شکایت ہے
مجھے تو دردِ مری کروٹوں نے بخشا ہے

جبین وقت سے کل جس نے بل نکالا تھا
وہ شخص اپنے ہی سائے سے آج ڈرتا ہے

قریب آکے جلا اب تو حسرتوں کے
اگرچہ میں نہ سہی، یہ مزار میرا

رواں ہے بحرِ تصور میں کشتیِ...
امین چہرۂ امواج یاس آ...

حضرات :- حکومت کی طرف سے اُردو کی نشو و نما کے لئے مختلف سرگرمیاں دکھائی جا رہی ہیں۔ مثلاً اردو اکاڈمیوں کی قائمی اُردو مصنفین کو نقد انعامات وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ اُردو کتب کی خریداری کے لئے لائبریریوں کو مالی امداد بھی دی جا رہی ہے۔ نیز ایسے اُردو مصنفین جو اپنی تصانیف شائع کرنے کی مالی سکت نہیں رکھتے کو اپنے تصانیف شائع کرنے کے لئے جزوی مالی امداد بھی دی جا رہی ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود جب تک اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ ہوگا۔ اُردو ترقی کی منزل پر تیزی سے گامزن نہ ہو سکے گی۔ اس لئے اُردو اکیڈمیاں اگر اپنے اپنے صوبوں میں اس کیلئے بھی کوشاں ہوں تو اُردو کے حق میں اچھا ہوگا۔ جہاں تک ہو سکے اُردو سے محبت رکھنے والے محلے کے بچوں کو مفت پڑھائیں۔

اُردو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اگر مجھے زندہ رکھنا ہے تو اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کے لئے کوشش کیجئے اپنے ہاں کی سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں کو مجبور کیجئے کہ وہ اُردو کی اچھی کتابیں منگائیں۔ کالجوں کے اُردو پروفیسر اپنے کالج کی لائبریریوں میں اُردو کی کتابیں منگانے کے لئے کوشش فرمائیں۔ یاد رکھئے جب اُردو پڑھنے والے ہی نہیں ہوں گے تو ان کتابوں کو کون پڑھے گا جن پر اُردو اکاڈمیاں انعام دیتی ہیں۔

ذیل میں ہم کچھ ایسی اُردو کی بہترین کتابوں کی فہرست دے رہے ہیں جو ہر لائبریری میں ہونی ضروری ہیں۔ آپ اپنی ذاتی لائبریریوں کے لئے بھی اپنی پسند کی کتابیں منگائیں۔

اگر آپ کی فرمائش پچاس روپے سے زائد ہوگی تو آپ کو ½ ۱۲ فیصد رعایت دی جائیگی۔

لائبریریوں کو لائبریری کمیشن دیا جاتا ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹی لائبریریوں کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی ہدایات کے مطابق کمیشن دیا جاتا ہے۔

اگر آپ اپنی فرمائش ہمیں بھجوائیں گے تو ہم آپ کی پسندیدہ پاکستانی اُردو مطبوعات فراہم کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔

(ناشر)

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
گرونانک بانی	بھائی جودھ سنگھ	۹-۵۰	میلا آنچل	مترجم سلمیٰ صدیقی	۱۸-۷۵
بابا شیخ فرید	گربچن سنگھ طالب	۷-۲۵	پریم چند کے مختصر افسانے	" رادھا کرشن	۱۳-۵۰
شری گرو ارجن دیو	مترجم اشفاق حسین	۴-۵۰	آدھی گھڑی	" ڈاکٹر سیفی پریمی	۱۵-۰۰
گرو گوبند سنگھ	گوپال سنگھ	۳-۰۰	گنگا چیل کے پنکھ	" رضیہ سجاد ظہیر	۹-۷۵
سوامی رام تیرتھ	ڈی آر۔ سود	۸-۰۰	سفر تمام ہوا	" مخمور سعیدی	۱۱-۷۵
رنجیت سنگھ	"	۲-۷۵	گنگو اگنگا ماں	" عبد الحیٔ	۱۴-۰۰
الطاف حسین حالی	صالحہ عابد حسین	۶-۵۰	برہمن لڑکی	" نارنگ	۷-۰۰
ڈاکٹر ذاکر حسین	محمد ...	۱۰-۰۰	بادل چھٹ گئے	" رضوان احمد	۱۰-۵۰
سردار ولبھ بھائی پٹیل	وشنو پربھاکر	۷-۵۰	حاتم طائی کا قصہ	" ڈاکٹر نور الحسن نقوی	۶-۵۰
خسرو شناسی	ظ۔ انصاری	۱۶-۵۰	نیل کنٹھ پاکھی کی ڈھونڈ	" راشد سہسوانی	۱۵-۰۰
پانی کی کہانی	مترجم راج نرائن راز	۹-۵۰	قصہ پنجاب	" رام اسرار انہ	۸-۵۰
زمین کی کہانی	" راشد سہسوانی	۸-۵۰	پرانوں کی کہانیاں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۸-۲۵
خلا کا سفر	" ایس۔ ایم۔ شاہ نواز	۹-۷۵	مٹتی بنتی تصویریں	مترجم رضیہ سجاد ظہیر	۵-۰۰
جدوجہد آزادی میں انجمن قانون ساز کا رول	" غلام ربانی تاباں	۱۳-۵۰	پورن کمبھ	" شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۴-۷۵
			تصویر بتاں	" عشرت سہروردی	۱۲-۷۵
آزاد ہند فوج کی کہانی	" قمر رئیس	۹-۲۵	آئینہ	" کنہیا لال گاندھی	۹-۵
جدوجہد آزادی	چمن چندر وغیرہ	۵-۵۰	یہ ہماری زندگی / آدھے چاند کی رات	" عرش ملسیانی	۱۴-۲۵
ہندوستانی یک بابی ڈرامے	مترجم محمد حسن	۱۲-۵۰			
پنجابی کے یک بابی ڈرامے	" ایس۔ ایم۔ شاہنواز	۱۲-۰۰	میں	" کشور سلطان	۹-۰۰
گجراتی کے یک بابی ڈرامے	" مظفر حنفی	۱۲-۲۵	جگ ویر راجندر	" راشد سہسوانی	۲۲-۵۰
ہندی افسانے	" نارنگ	۹-۰۰	بوند اور سمندر	امرت لال ناگر	۲۸-۷۵
پنجابی ڈرامے	" محمود جالندھری	۱۲-۰۰	ریل گاڑی	مترجم سید آل رسول	۷-۷۵
پنجابی افسانے	" محمود جالندھری	۷-۰۰	موت کے بعد	" محمود سروشی	۸-۷۵
تیلگو افسانے	" کے گوپال کرشنا راو	۱۸-۲۵	دو دو چراغ محفل	" ابو الفیض سحر	۱۶-۲۵
ملیالم افسانے	" جیلانی بانو	۸-۲۵	چار دیواروں میں	" ظفر ادیب	۷-۷۵
گجراتی کہانیاں	" مظہر الحق علوی	۱۴-۰۰	تاش کے محل	" زینت ساجدہ	۵-۵۰
راگ سندر باری	" راشد سہسوانی	۱۵-۵۰	بنگڑ و اڑی	" عرش ملسیانی	۵-۲۵
نئی فصل	" سید الابرار	۸-۶۵	لہروں کی آواز	" راج نرائن راز	۱۹-۵۰
ایشیا کی لوک کہانیاں	" سید احسان	۱۲-۰۰	سورٹھ تیرا بہتا پانی	" مظہر الحق علوی	۱۳-۰۰
فاطمہ کی بکری	" اطہر پرویز	۵-۷۵	سفید خون	" رتن سنگھ	۸-۰۰
[illegible] کے روپ	" جمیل عظیم آبادی	۱۲-۰۰	فرہنگ آصفیہ (مکمل)	چار جلدیں	۱۵۰-۰۰

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
حیاتِ جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	۲۴-۰۰
توضیحی لسانیات	مترجم عتیق احمد صدیقی	۲۳-۰۰
ہندوستان میں چھاپہ خانہ	" زیدی	۷-۲۵
قدیم ہندوستان میں شودر	" جمال محمد صدیقی	۱۴-۵۰
ہندوستان کے زمانہ قدیم وسطی کے کتب خانے	" سرتاج عابدی	۱۰-۲۵
ہندوستان کی معاشی تاریخ اول	" غلام ربانی تاباں	۱۸-۷۵
غزل اور غزل کی تعلیم	اختر انصاری	۱۰-۲۵
انقلابِ فرانس	مترجم بی جے سنگھ	۲۵-۵۰
عربی ادب کی تاریخ	عبدالعلیم ندوی	۱۳-۰۰
یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین علی	۱۴-۵۰
امراض النساء	حکیم اعظمی	۲۷-۲۵
فطری علاج	مترجم حسن الدین احمد	۶-۰۰
تاریخ شاہجہاں	" ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۱۴-۰۰
شہیدانِ آزادی حصہ اول	بی۔این۔چوپڑا	۲۴-۰۰
شہیدانِ آزادی حصہ دوم	"	۲۰-۰۰
تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	مترجم ڈاکٹر سلامت اللہ	۴۱-۷۵
ہند آریائی ہندی	" ڈاکٹر عتیق صدیقی	۱۳-۵۰
انسانی ارتقاء	" ڈاکٹر احسان اللہ	۱۳-۷۵
مفتاح التقویم	حبیب الرحمٰن خاں صابری	۲۸-۰۰
دیوانِ حسرت عظیم آبادی	ڈاکٹر اسماء سعیدی	۱۸-۰۰
امریکی ادب کا جائزہ	سلامت اللہ خاں	۹-۵۰
انیس کے مرثیے	صالحہ عابد حسین	۲۰-۰۰
تحریکِ خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	۲۰-۰۰
دکن کے بہمنی سلاطین	مترجم رحیم علی الہاشمی	۱۵-۰۰
بابر	" ڈاکٹر رفعت بلگرامی	۱۳-۲۵
تعلیمی تشکیل نو کے مسائل	خواجہ غلام السیدین	۱۲-۷۵
تاریخ جہانگیر	مترجم رحیم علی الہاشمی	۱۸-۷۵
ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات	" ماجدہ اسد	۱۷-۰۰
آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائے	۱۰-۵۰

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
ترجمان القرآن (چار جلدیں)	مولانا ابوالکلام آزاد	۸۸-۰۰
خطباتِ آزاد	"	۱۷-۰۰
غبارِ خاطر	"	۱۵-۰۰
ہماری آزادی	"	۲۵
اتھیلو	شیکسپیر	۵-۰۰
کمال اور زوال	مترجم میر حسین	۴-۰۰
ایک سو ایک نظمیں	ڈاکٹر ٹیگور	۷-۵۰
ریاست (افلاطون)	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۲-۵۰
سمن زار	مرتبہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی	۱۲-۰۰
میڈیا	یوری پیڈیز	۵-۰۰
گل موجی	ڈاکٹر ٹیگور	۷-۵۰
تین ناٹک	"	۷-۰۰
تاریخ بنگلہ ادب	ڈاکٹر سکمار سین	۲۵-۰۰
وویکا نند	مترجم احتشام حسین	۴-۵۰
گنجی کی کہانی	"	۶-۵۰
عورت	" رضیہ سجاد ظہیر	۴-۰۰
سب انسان بھائی بھائی ہیں	" ایس۔ عابد حسین	۶-۰۰
کرلی	" حسرت سہروردی	۴-۰۰
بھگوان بدھ	" پرکاش پنڈت	۷-۰۰
ہندوستانی ادب کے معمار پریم چند	" ل احمد اکبرآبادی	۴-۵۰
نارائن راؤ	" منموہن تلخ	۴-۰۰
کلیاتِ میر جعفر زٹلی	ڈاکٹر نعیم احمد	[illegible]-۵۰
شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ	"	[illegible]-۰۰
ناقابلِ فراموش	سردار دیوان سنگھ مفتون	۲۵-۰۰
جذباتِ مشرق	"	۲۵-۰۰
اقبال اور سیرتِ شبلی	ڈاکٹر سید افتخار حسین شاہ	۱۴-۵۰
فن افسانہ نگاری	سید وقار عظیم	۱۰-۰۰
آغا حشر اور ان کے ڈرامے	"	۲۵-۰۰
شبلی بحیثیت مورخ	اختر وقار عظیم	۲۰-۰۰
اطرافِ اقبال	ملک حسن اختر	۲۵-۰۰

علامۂ گنج العرش		۲—۰۰	معنی کا سوال	واجدہ تبسم	۱۰—۰۰
اسلامی تاریخی کہانیاں	عبدالمومن	۲—۵۰	کیسے سمجھاؤں	"	۷—۰۰
نثارِ نبوت	مجاز الاعظمی	۲—۵۰	شہر ممنوع	"	۱۲—۰۰
گنجینۂ عملیات	صوفی محمد عزیز الرحمٰن	۱۲—۰۰	بند دروازے	"	۱۵—۰۰
حیات المسلمین	مولانا اشرف علی تھانوی	۳—۰۰	اُردو املا	رشید حسن خاں	۲۴—۰۰
مغلانی بیگم کا نعمت کدہ	مغلانی بیگم	۱۵—۰۰	میرے لہو کی آگ	نشتر خانقاہی	۱۰—۰۰
لہریں	شفیق الرحمٰن	۲—۷۵	شام میکدہ	یکتا الوری	۸—۰۰
[illegible]	سعید امرت	۴—۰۰	نگارِ حیات	ریاست علی تاج	۱۰—۰۰
عشق بلاخیز	مترجم سید قاسم محمود	۷—۰۰	[illegible] اعظم	حافظ عبدالرزاق	۷—۰۰
حاجی مراد	قیسی رامپوری	۶—۰۰	آئینہ	حیرت بدایونی	۱۵—۰۰
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	۴—۲۵	سحر نغمہ	ساحر ہوشیارپوری	۱۵—۰۰
[illegible]	رئیس احمد جعفری	۷—۰۰	گردشِ رنگ	مختار ہاشمی	۱۰—۰۰
[illegible]	انیس مرزا	۵—۵۰	کفرستان	کرشن موہن	۲۰—۰۰
[illegible]	رئیس احمد جعفری	۷—۰۰	گیان مارگ کی نظمیں	"	۱۰—۰۰
[illegible]	رازداں	۳—۲۵	کوئے ملامت	"	۱۰—۰۰
[illegible]	کرشن گوپال عابد	۵—۵۰	روزنِ خواب	حفیظ نسیمی	۱۰—۰۰
ہزار داستان	فراق گورکھپوری	۳—۰۰	عروجِ آدم	رفعت سروش	۱۰—۰۰
سنگِ قدیم	ہاجرہ نازلی	۵—۵۰	عکس آئینے کے	ہرچرن چاولہ	۸—۰۰
[illegible]	اختر عادل روپ	۲—۵۰	اُجالے	کالی داس گپتا رضا	۱۰—۰۰
[illegible] نور دھواں	م۔م۔ راجندر	۳—۰۰	خواب بیداری	صغریٰ بیگم	۳—۰۰
آہٹ	ستیہ پال آنند	۵—۰۰	کتاب کا کفن	کرشن چندر	۷—۰۰
بہشتِ نظر	رتن پنڈوری	۱۵—۰۰	مطالعۂ داغ	ڈاکٹر زیدی	۲۴—۰۰
اندازِ نظر	"	۱۰—۰۰	عشق پر زور نہیں	"	۵—۰۰
تاریخ ادبِ اُردو	جمیل جالبی	۶۰—۰۰	ریگِ سیاہ	زکاء الدین شایاں	۵—۰۰
ارسطو سے ایلیٹ تک	"	۴۰—۰۰	مشاہدات	ڈاکٹر راج کھنہ دایا	۷—۰۰
ایلیٹ کے مضامین	"	۲۵—۰۰	مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام کالی داس گپتا	کالی داس گپتا	۱۹—۰۰
اُترن	واجدہ تبسم	۴۰—۰۰	احسان اللہ عباسی حیات اور کارنامے	قمر مرزا احمد	۸—۰۰
نتھ کا بوجھ	"	۳۰—۰۰	ہندوستانی مشرقی افریقہ میں	کالی داس گپتا رضا	۱۰—۰۰
آیا بسنت سکھی	"	۲۰—۰۰	یادوں کے سائے	ممتاز مرزا	۴۰—۰۰
پھول کھلنے دو	"	۱۲—۰۰	پربت اور پنکھ	محمد یوسف تشنگ	۸—۰۰
زخمِ دل اور مہک اور مہک	"	۲۰—۰۰	گلبانگ	حضرت علامہ سحر عشق آبادی	۵—۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
فلسفۂ غالب	احمد رضا	۶ــ۰۰
جمالیات اور ادب	ڈاکٹر ثریا حسین	۱۵ــ۰۰
ادب میں جمالیاتی اقدار	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۰ــ۰۰
کلام فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	۲۰ــ۰۰
اردو ڈراما کا ارتقاء	عشرت رحمانی	۴۰ــ۰۰
اردو ڈراما: تاریخ و تنقید	”	۲۰ــ۰۰
یونانی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	۲۰ــ۰۰
آغا حشر اور اردو ڈراما	انجمن آرا	۳۰ــ۰۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۱۲ــ۰۰
اردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۷ــ۵۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۷ــ۵۰
مثنوی گلزار نسیم	ظہیر احمد صدیقی	۵ــ۰۰
مثنوی سحر البیان	”	۵ــ۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۱۲ــ۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	”	۱۰ــ۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	قمر رئیس	۱۲ــ۰۰
نمائندہ مختصر افسانے	محمد طاہر فاروقی	۵ــ۰۰
نیا افسانہ	وقار عظیم	۱۵ــ۰۰
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	ڈاکٹر نور الحسن نقوی	۲۰ــ۰۰
ارمغان علی گڑھ	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۲۰ــ۰۰
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۴ــ۵۰
تنقیدیں	پروفیسر خورشید الاسلام	۲۰ــ۰۰
تنقیدی تناظر	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰ــ۰۰
ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	۲۵ــ۰۰
نثر، نظم اور شعر	ڈاکٹر منظر عباس نقوی	۷ــ۵۰
فسانہ سا چہرے	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵ــ۰۰
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	۱۵ــ۰۰
مضامین نو	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۵ــ۰۰
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	”	۳۰ــ۰۰
میں رہم اور ادب	ابن فرید	۲۰ــ۰۰
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	۱۸ــ۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
اسلوب	سید عابد علی عابد	۳۰ــ۰۰
تنقید اور احتساب	وزیر آغا	۱۵ــ۰۰
اردو شاعری کا مزاج	”	۴۰ــ۰۰
تخلیقی عمل	”	۱۵ــ۰۰
انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	۱۰ــ۰۰
ستارہ یا بادبان	”	۱۵ــ۰۰
آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۶ــ۰۰
بجنگ آمد	کرنل محمد خاں	۱۴ــ۰۰
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۱۵ــ۰۰
اکبر کی طنزیہ و ظریفانہ شاعری	محمد زاہد	۱۵ــ۰۰
شاعری اور شاعری کی تنقید	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۵ــ۰۰
جدید شاعری	”	۲۵ــ۰۰
غزل اور درس غزل	اختر انصاری	۸ــ۰۰
حالی اور نیا تنقیدی شعور	”	۵ــ۰۰
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۷ــ۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ از وحید قریشی	۷ــ۵۰
تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	۳ــ۵۰
باغ و بہار	سلیم اختر	۱۰ــ۰۰
شعاع ادب	شرافت حسین مرزا	۶ــ۰۰
نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی	فرحت اللہ بیگ	۲ــ۵۰
اُجالا	قیسی رام پوری	۹ــ۵۰
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	۵ــ۰۰
برجیس	قیسی رام پوری	۶ــ۰۰
جذبۂ دل	معین شاہد	۶ــ۰۰
ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	۳ــ۵۰
ہزار راتیں	ش۔ مظفر پوری	۴ــ۰۰
افسانہ لکھ رہی ہوں	خوش باش	۴ــ۰۰
بیراگ		۵ــ۰۰
ستیم شوم سندرم	جتیندر جین	۵ــ۰۰
رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۵ــ۰۰
نغمۂ جمہور	کریمی الاحسانی	۸ــ۰۰

کہنے لگا: "کیا تم چمپون کے متعلق جانتے ہو؟"

میں اس کی داستان سننے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس کی یہ مداخلت ناگوار گزری۔ چنانچہ میں نے بیزاری سے جواب دیا۔ "میں نے اس کا نام سنا ہے۔ لیکن آج تک اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔"

"یہ بنکاک میں ایک نایاب قسم کا پھول ہے مگر جنوبی صوبوں میں عام پایا جاتا ہے۔ خصوصاً تائی پیانگ میں یہ کثرت سے اگتا ہے۔ یہ چمپاک خاندان کا پھول ہے۔ یہ بظاہر چمپی کے پھول کی مانند دکھائی دیتا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جب یہ کلی کی شکل میں ہوتا ہے تو اس کے گرد ایک مخملی سا پردہ ہوتا ہے۔ اور یہ مخملی پردہ اس کی پنکھڑیوں کو اپنے اندر کی طرف لپیٹے ہوتا ہے۔ پہلے پہل یہ مخملی حصہ پھوٹتا ہے اور اس کے بعد پنکھڑیاں کھل اٹھتی ہیں۔ تب اس کی تیز خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے اس کی پنکھڑیوں کی شکل موم کے مشابہ ہوتی ہے جو کھردری اور سخت ہوتی ہے۔ ان پنکھڑیوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ چمپی کے پھول کی طرح مرجھاتی نہیں ہیں اس کے پھوٹنے کے چند دنوں بعد چمپون کا پھول پوری طرح کھل جاتا ہے۔ اس کی خوشبو دیگر تمام پھولوں پر چھا جاتی ہے اور یہ خوشبو بڑی تیز اور مسحور کن ہوتی ہے۔

اس موقع پر تم حیران ہو گے اور اسے اتفاق سمجھو گے "ناؤ کی سان جو بڑا متعصب چینی تھا اس کی اکلوتی لڑکی کا نام چمپون تھا۔ انیس برس کی عمر میں چمپون ایک خوبرو وشنگ حسین اور بڑی دلکش لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کے دلکش نقوش چمپون کے پھول کی خوشبو کی طرح اپنی طرف کھینچنے کی بے پناہ قوت رکھتے تھے۔ درحقیقت چمپون ایک مسحور کن، پرکشش اور انسان کے حواس پر چھا جانے والی لڑکی تھی جو ارادہ کر لیتی پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ جو اس کے جی میں آ کرتی تھی اور کسی کو اسے ٹوکنے کی جرأت تک نہ تھی۔ غرض باپ کے لاڈ پیار نے اسے بہت مغرور بنا دیا تھا۔

چمپون سوکیٹ پی کے سکول میں داخل کی گئی جب اس کی عمر بارہ برس ہوئی تو باپ نے اسے سکول سے نکال لیا۔ اب وہ چمپون کو چینی معاشرے کے مطابق گھر رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت کے شائستہ اور مہذب گھرانوں میں یہ دستور تھا کہ وہ لڑکی کو بارہ برس کی عمر کے بعد گھر میں بٹھا دیتے تھے اور چوکھٹ سے باہر قدم رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ چمپون کو بھی اسی عمر میں سکول سے باہر نکال لیا گیا۔ وہ اس وقت تائیم کے درجہ چار میں تھی۔ اور ایک تھائی لڑکی کی طرح باہر کی کافی آزادی دیکھ چکی تھی۔ اس لئے وہ باپ کی رائے کے برعکس ابھی سے گھر میں محصور ہونے پر رضامند نہ ہوئی۔ "ناؤ کی سان اگرچہ ایک پختہ اور سخت ارادے کا آدمی تھا۔ لیکن وہ بھی چمپون کی بات کو رد نہ کر سکا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ چمپون ابھی کچھ عرصہ اور پینانگ کے مشنری سکول میں اپنی تعلیم جاری رکھے۔ دراصل ناؤ کی سان اپنی لڑکی کو تھائی طرز زندگی سے دور رکھنا چاہتا تھا جس میں کافی آزادی تھی۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی کسی تھائی سے کرنے پر بالکل تیار نہ تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد چمپون نے سکول کی زندگی کو خیرباد کہہ دیا اور گھر واپس چلی آئی وہ اپنے تعلیمی دور میں کچھ آزادی پسند ہو گئی تھی۔ اس لئے گھر میں باپ سے اس کی اکثر ان بن رہتی۔ "ناؤ کی سان چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اب گھر کی چار دیواری کے اندر ہی محصور رہے۔ اور باہر قدم نہ رکھے۔ لیکن چمپون کی آزاد طبیعت کے لئے یہ بات ناقابل قبول تھی۔ کبھی کبھی وہ باپ کی بات مان کر گھر کے سامنے والے حصہ کی طرف نکلنے سے گریز کرتی جہاں پر عورت کا نکلنا چینی روایات کے خلاف تھا۔ پھر بھی جب کبھی چمپون اپنے کسی ارادہ پر اڑ جاتی تو باپ کی پرواہ نہ کرتی۔ "ناؤ کی سان کا مکان گاؤں سے ایک طرف ہٹ کر واقع تھا اور مکان کا پچھواڑہ جنگل کے کنارے کو چھوتا تھا۔ چینی گھروں میں جوان لڑکیاں مکان کے سامنے والے حصہ میں شاذ و نادر ہی دیکھی جاتی تھیں اگرچہ چمپون اس قسم کی روایات کے سخت خلاف تھی تاہم وہ مکان کے سامنے والے حصہ میں کبھی کبھی نکلتی وہ زیادہ تر گھر ہی پر گھریلو کام کاج اور مطالعہ میں مصروف رہتی۔ وہ ان کتابوں کے مطالعہ کی بے حد شوقین تھی جو اسے پینانگ اور بنکاک میں بھیجی جاتی تھیں۔ چمپون کبھی کبھی مکان کے پچھواڑے سے جنگل کی طرف بھی نکل آتی جہاں وہ سیر کرتی تھی۔

میری اس سے پہلی ملاقات اسی جنگل میں اتفاقیہ طور پر ہوئی اور جلد ہی ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ گویا ہمارا دیوتا پہلے سے ہی ہماری محبت تجویز کر چکا ہو۔ ہماری محبت اگرچہ اچانک اور اتفاقیہ حالات میں ہوئی لیکن بڑی گہری اور پرجوش تھی۔ ہماری تمام تر کوشش یہی تھی کہ ہماری محبت ایک راز ہی رہے اور کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ مگر چھپانا [illegible] ناممکن نظر آتا تھا لیکن اسی جذبہ کی وجہ سے ہماری محبت زیادہ تر اور شدید ہوتی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ "ناؤ کی سان مجھ سے گہری پرخاش رکھتا ہے اور [illegible] مجھے اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ اپنی لڑکی کو

گھر میں ۔ ان صاحب نے ایسی ڈوب جانے والی نگاہوں سے دیکھا کہ میں کانپ کر رہ گئی، نگاہوں میں محرومی، بھوک کی شعلے سے لپکے اور میں ہڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ آخر یہ کیا حماقت تھی۔ میں سر راہ ایک نامحرم شخص سے یوں محو کلام تھی گو یا کوئی بات ہی نہ ہو۔ مگر میں نے از راہ اخلاق بات شروع کی تھی۔ میرا مقصد ——— اس کے سوا ۔ اور اس کے بعد میں نے اس شاپ سے بس پکڑنا چھوڑ دیا ۔

لیکن ایک روز میں چھٹی ہونے پر سکول سے باہر نکلی تو وہ صاحب گیٹ پر کھڑے تھے ۔ وہ دیکھ کر کچھ آگے بڑھے اور بڑے تپاک سے بولے ۔

آپ نے چھٹی لے رکھی تھی ۔ میں روزانہ آپ کا شاپ پر انتظار کرتا رہا ۔

جی میں گڑبڑا گئی ۔ اور حیران سی نظروں سے انھیں دیکھنے لگی مجھے تو یہ توقع ہی نہ تھی کہ وہ اتنے بے ضابطہ قسم کے انسان ہیں۔ مجھے غصہ سا آگیا اور میں پہلے والے شاپ کی طرف چلنے لگی ۔ شاپ پر کافی لوگ کھڑے تھے ۔ میں ایک طرف کھڑی ہو گئی ۔ وہ صاحب جو میرے ساتھ ہی آتے تھے ۔ میرے پاس ہی کھڑے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔

لاحول ولا قوۃ ۔ کیا واہیات ماحول بن گیا تھا ۔ مجھے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی ۔ وہ شخص ذرا بھی کم عقل ، فلمی عاشق یا مسخرہ نہیں تھا ۔ انتہائی معقول ۔ نہایت شریف ، بے حد سنجیدہ اور دلکش شخصیت تھی ، چہرے پر کسی قسم کے اخلاقی جرم کے چھینٹے نہیں تھے بلکہ عجب قسم کا اناڑی پن اور معصومیت تھی ۔ بالکل انجان بچے کی سی ۔ مگر نظریں ، نظروں میں قتل کرنے والی ایک روح پھر رہی تھی جسے دیکھ کر مجھے خوف سا آتا تھا ۔ اور میں سمجھتی تھی کہ یہ جذبۂ قتل کسی محرومی خیال کی بنا پر ہے ۔ اسی محرومی کی وجہ سے نگاہوں میں بھوک پیدا ہو جاتی ہے ۔ خواہ یہ بھوک دیکھنے والے کے دل میں نفرت ابھرے یا ہمدردی ۔ اس لئے میں ذرا معقول قسم کی بات سوچ رہی تھی کہ یکایک میں نے مزاج کا سہارا لیا اور کہا ۔

معلوم ہوتا ہے آپ کو میری بدتمیزی ابھی تک نہیں بھولی ۔

کیسی بدتمیزی ! حسن صاحب کھل اٹھے ۔

وہی جو میں نے آپ کا پاؤں کچل دیا ——— لیکن اب ایسا نہیں ہوگا ۔

مگر میں نے یہ سوال تو نہیں کیا تھا ۔ ان صاحب نے اپنا موڈ نہیں بدلا تھا ۔

کیا سوال کیا تھا آپ نے ؟ میں نے پوچھا یہی کہ آپ اتنے روز شاپ پر کیوں نہیں آئیں ۔ اس لئے اس شاپ پر جو بس ملتی ہے وہ بڑی دیر سے آتی ہے ۔ میں ذرا چل کر دوسرے شاپ پر چلی جاتی ہوں تو بہت سی بسیں مل جاتی ہیں ۔ وہاں میں شاپ ہے نا ۔

اچھا ! میں سمجھا ۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں نا ۔

واہ صاحب ناراض ہونے کی کیا بات ہے ۔ کہئے آپکے بچوں کا کیا حال ہے ۔ نام بھی تو بتائیے ۔ مجھے ناموں سے بڑی دلچسپی ہے ۔ اور پھر لڑکوں کے میں نے ہنستے ہوئے کہا ۔

نام بتاؤں انھوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا ۔ پہلے آپ اپنی لڑکیوں کے نام بتائیے ۔

میں بتاؤں ۔ بڑی والی کا نام ہے عامرہ ۔ چھوٹی کا نام گل رخ اور تیسری کا شہلا ۔ میں نے بڑے اہتمام سے نام بتائے ۔

اچھا ۔ بڑے پیارے نام ہیں ۔ مگر قافیہ نہیں ملتا ۔ میں نے عامرہ کا سن کر سمجھا کہ دوسری کا نام ناصرہ ہوگا ۔ اور تیسری کا شاکرہ ہوگی ۔ حسن صاحب ہنستے ہوئے بولے ۔ جی نہیں مجھے اس انداز غزل سے ڈر لگتا ہے ۔ صاحب میں نے سوچا تھا کہ عامرہ سے ملتا جلتا نام رکھا تو لائن لگ جائے گی لڑکیوں کی اور پھر اس غزل کا مقطع کبھی نہ ہوگا ۔ اس لئے بدل بدل کر نام رکھتی رہی ۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ ہاں اب آپ بتائیے کیا نام رکھے ہیں ۔

نام ۔ ابھی چھوڑیئے ۔ دراصل ابھی کوئی نام تجویز نہیں کئے بچے بڑے ہو کر خود ہی رکھ لیں گے ۔ خود ہی رکھ لیں

اتنی بے نیازی ——— اور پھر بس آگئی ۔

اب تو کہانی بدل گئی تھی ۔ گھر پہنچی تو عامرہ اور گل رخ اپنی اپنی گڑیا کو نہلا رہی تھیں ۔ شہلا پالنے میں بڑی گہری نیند سو رہی تھی میرے شوہر اپنے خط پاس رکھے گھر تلاش کرنے اسی جلتی ہوئی دوپہر میں سائیکل لئے میرا انتظار کر رہے تھے ۔ ان کی آنکھوں میں وہی انتشار تھا وہی کسک تھی ۔ جو معاشی بے چینی کو دل میں چھپانے سے پیدا ہوتی

"لیکن اس میں اور حامد میں زمین آسمان کا فرق ہے خالدہ نے فخر سے کہا، میں جانتی ہوں، حامد تو بہت ہی اونچا انسان ہے۔ بہت ہی بہت ہی..." سکینہ کہنے لگی۔

سکینہ کتنی اچھی لڑکی ہے خالدہ نے سوچا لیکن اچھی لڑکیاں مظلوم ہی ہوا کرتی ہیں کاش میں اپنی سہیلی کے لئے کچھ کر سکتی!

"خالدہ کاش میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی" اسی روز سکینہ کہہ رہی تھی۔

مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میں تمہارے متعلق ہمیشہ اپنے حالات کے آئینہ میں سوچتی ہوں اور جب دیکھتی ہوں کہ حامد ایک مرد ہے تو میرے جسم میں آگ سی لگ جاتی ہے ایک الاؤ سا جلنے لگتا ہے لیکن کبھی کبھی مجھے حامد پر ترس بھی آتا ہے اس بچارے کا کیا قصور ہے۔ شاید قدرت کا یہ اصول ہے کہ ایک انسان کی غلطی کا خمیازہ دوسرے کو بھگتنا پڑتا ہے خالدہ مرد کبھی بھی اس قابل نہیں ہوا کہ اسے پیار دیا جائے۔ وہ عورت کی زندگی کو ہمیشہ روگ لگاتا رہا ہے وہ عورت کو اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھاتا رہا ہے اس سے اس کی خوشیاں چھین کر اسے محرومیوں اور ناکامیوں کی گود میں ڈال دیتا ہے میں نہیں کہتی کہ حامد بھی ایسا ہی ہوگا لیکن میں تمہیں یہ کس طرح بتاؤں کہ جب تم حامد کو اپنا نہیں سکتیں، جب حامد تمہارا ہو نہیں سکتا، تمہیں بیاہ کر لے جا نہیں سکتا تو پھر تم اس کھیل کو طول کیوں دے رہی ہو۔ یہ کھیل جتنا طویل ہوگا، تمہاری خوشیوں میں اتنی ہی کمی آئے گی۔ تمہاری راتیں اتنی سمٹ جائیں گی۔ حتیٰ کہ تم اپنے آپ کو پہچان تک نہ سکو گی۔ جس طرح میں اپنے آپ کو پہچاننے سے عاجز ہوں، تم پچھتاؤ گی اور ہمیشہ پچھتاؤ گی بلکہ حامد کے لئے بھی ایک ایسی تاریکی پھیلاؤ گی۔ ایک ایسی سیاہی گھول دو گی جس کو وہ کبھی بھی نہ پھاند سکے گا۔ حامد سے کہہ دو کہ میں تمہیں نہیں چاہتی بلکہ میں تمہیں چاہ ہی نہیں سکتی۔ ابھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

اسے سکینہ پر غصہ آ رہا تھا وہ مسلسل چار گھنٹوں سے حامد کا انتظار کر رہی تھی اس نے جھوٹ کے روز حامد کا دل دکھایا تھا اس نے غلط کہا تھا کہ وہ حامد کو نہیں چاہتی۔ بلکہ وہ اسے چاہ ہی نہیں سکتی۔ حامد کے سوا اس دنیا میں اس کا اور ہے ہی کون؟ حامد اس کا ہے اور اسی کا رہے گا۔ اگر اس کا جسم کسی اور کے حوالے کر بھی دیا گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ حامد اور اس کا رشتہ تو روحانی ہے اور روحانی رشتوں میں کبھی خلا نہیں آیا کرتے۔ حامد ایک بار آ گئے میں اس سے معافی مانگ لوں گی اس سے کہہ دوں گی کہ میں تو تم سے مذاق کر رہی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ تمہیں اس انکشاف سے کتنا صدمہ پہنچتا ہے تم کتنے غمگین ہوتے ہو۔ تمہاری آنکھوں سے کتنے آنسو ٹپکتے ہیں۔

اس کی نظریں حامد کو ڈھونڈ رہی تھیں کتنے لوگ اس سے آنکھیں بچا بچا کر دیکھتے گزر گئے کتنے سٹوڈنٹ لڑکے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی راگ چھیڑ گئے۔ کوئی بھی سکوٹر والا گزرتا تو اس پر ایسے نظر ڈالتا جیسے اس نے برقع تو پہن ہی نہ رکھا ہو، بسیں آتی رہیں اور گزرتی چلی گئیں وہ وہیں اسی امید پر کھڑی تھی کہ حامد ضرور آئے گا۔ وہ خوف زدہ تھی کہ حامد کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ کاش کہ وہ حادثہ اسے پیش آ جاتا۔ کتنے وہم تھے جو اس کے خیال میں گھس آئے تھے کتنی تاریکی تھی جو سہ پہر کی روشنی میں بھی اسے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ دعا مانگ رہی تھی ایک بار صرف ایک بار حامد آ جائے۔

اس کی دعا قبول ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس سے ذرا پرے ایک رکشہ آ کر رکا ہے اور سواری برقع میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی اچانک باہر آئی .... اور حامد بھی اس کے پیچھے اترا اور اسٹاپ پر کھڑی ہوئی لڑکی کو کسی نہایت ہی گھٹیا انسان کی طرح تاکنے لگا۔ خالدہ نے سکینہ کو پہچاننے میں ذرا بھی دھوکا نہ کھایا

ہے اس کے خلاف ابھی اور مقدمات زیر سماعت ہیں اس کے ساتھ ہی ایک پولیس افسر آگے بڑھ کر صلاح الدین کے منہ پر بُرش سے سیاہ رنگ مل کر منہ کالا کر دیتا ہے ہجوم خوشی سے تالیاں بجاتا ہے پھر ہجوم اظہار نفرت کے طور پر شرم شرم کے نعرے بلند کرتا ہے اس کے بعد نذر محمد عرف فضل بخاری سٹیج پر لایا جاتا ہے اس کا بھی منہ کالا کیا جاتا ہے لاؤڈ سپیکر پر وہی افسر عوام کو بتاتا ہے کہ "اس مجرم کی بدکاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ یورپ میں علم و ہنر حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں تاکہ واپس آکر ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔ لیکن یہ شیطان خصلت آدمی یورپ سے بدکاری کے اڈوں کا معائنہ کرتا رہا اور واپس آکر پاک سرزمین پر اسلامی معاشرہ کو تباہ کرنے کیلئے بدکاری کا مکروہ دھندا شروع کر دیا پہلے وہ یہ کاروبار ایک محلہ میں کرتا تھا۔ لیکن غیرت مند اہل محلہ نے اسے مار پیٹ کر اس محلہ سے نکال باہر کیا جس کے بعد اس کے بعد بدکاری کے لئے ایک اور جگہ کا انتخاب کیا اور عینک سازی کی آڑ میں بدکاری کا گھناؤنا کاروبار دوبارہ شروع کر دیا یہ بدکردار شخص عورتوں کو باقاعدہ ٹوکن جاری کر کے انہیں مختلف ہوٹلوں میں بھیجا کرتا تھا اس کی عمر ۶۷ سال ہے۔ اسے بھی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے کوڑے نہیں مارے جا رہے اسے بھی ایک سال کی قید سخت کی سزا دی گئی ہے عوام اس کا بھی منہ کالا کرنے پر تالیاں بجاتے ہیں اور پھر شرم شرم کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اس وقت دوپہر کے سوا بج رہے ہیں کوڑے مارے جانے کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ نمبردار قیدی جو قتل کے مقدمات میں عمر قید کی سزا بھگت رہے ہیں بشارت اور زمرد نے سُرخ اور سنواری رنگ کے لنگوٹے کس رکھے ہیں۔ تیل میں بھیگے ہوئے کوڑوں کو ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ پیر صلاح الدین کے لڑکے پیر محی الدین مظاہر کو سب سے پہلے کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ محی الدین اپنے باپ کے مکروہ دھندے میں شریک تھا۔ محی الدین پہلا کوڑا لگنے پر بلند آواز میں اللہ اکبر کہتا ہے۔ چھٹے کوڑے پر پانی مانگتا ہے۔ بارہویں کوڑے پر چلا اُٹھتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مجھے معاف کر دیں تاہم آخری کوڑے پر وہ نڈھال ہو گیا۔ اس کے بعد عورتوں کے سپلائر رشید کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اس کے بعد کوڑے مارنے کی کارروائی روک دی گئی سول لائنز کے مولانا عبداللہ نے ایک قرآنی آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ تھا۔ زانی عورت اور زانی مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائیں اور اللہ کے دین کے ضوابط پر قائم رکھنے کے سلسلے میں ہمیں سزائیں دیتے وقت رحم نہیں کھانا چاہئے۔ بہر حال ۲۷ مجرموں کو ۳۴۵ کوڑے لگائے گئے۔ پونے چھ بجے یعنی چار گھنٹے میں مجرموں کو کوڑے مارے جا سکے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں ایک جگہ مجرموں کو کوڑے مارے گئے۔ ایک لاکھ سے زائد نفوس کے اس مجمع میں جہاں لوگوں کے لئے عبرت کے مناظر تھے وہاں عادی چور اور جیب تراش بھی اپنا ہاتھ دکھا گئے کار نمبر آر آئی سی ۵۸۳ اور ایک سائیکل چوری ہو گئی۔ کئی افراد کی جیبیں کٹ گئیں۔ بہر حال آج کا منظر "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" تھا

قارئین کرام! پیرز ہوٹل سیٹلائٹ ٹاؤن کے رہائشی علاقے میں لڑکیوں کے ہاسٹل کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے۔ بلاک سی کا پلاٹ نمبر ۴۸ پیر صلاح الدین کو رہائشی بنگلہ کی تعمیر کے لئے الاٹ کیا گیا تھا۔ شرائط الاٹمنٹ کے مطابق مذکورہ پلاٹ صرف رہائشی مقاصد کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس پلاٹ پر تجارتی نوعیت کی عمارت تعمیر نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن پیر صلاح الدین نے اس پلاٹ پر بدکاری کا اڈہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۷۵ء میں انجمن شہریان وفاق کے صدر حبیب الوہاب الخیری ایڈووکیٹ نے اس ہوٹل کی تعمیر پر اعتراض کیا اور اس کی تعمیر میں ہونے والی بے قاعدگیوں کے خلاف تحریری شکایت پر محکمہ ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ کے سیکرٹری نے تحقیقات کا حکم دیا۔ پیر صلاح الدین جو کہ سابق ڈپٹی کمشنر رہ چکا ہے نے اپنے اثر و رسوخ اور محکمہ کے بدعنوان افسروں کی ملی بھگت سے تحقیقات کو کھڈے لائن لگوا دیا بلاک سی کے رہائشی پلاٹ پر ایک تجارتی عمارت کی تعمیر پر لوگوں نے واویلا بھی کیا لیکن راشی اور بدعنوان افسروں نے ان کی احتجاج کا کوئی نوٹس نہ لیا صلاح الدین سے جب بھی اس ہوٹل کی تعمیر کے متعلق جواب طلب کیا جاتا وہ ٹال جاتا اپنے اثر و رسوخ سے وہ مسل ہی غائب کرا دی حکومت کے استفسارات کے باوجود کبھی جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی البتہ فریب کے ذریعے رہائشی پلاٹ پر تجارتی عمارت کا نقشہ منظور کرا کر عمارت تعمیر کرائی۔

صلاح الدین نے اپنے ہوٹل کا افتتاح قحبہ خانے کے طور پر کیا صلاح الدین جو قادیانی فرقے کا مبلغ ہے اس سے ہا کنال کے اس

بُلبُل چہ گفت؟
گُل چہ شُنید؟
و صبا چہ کرد؟

کیا یہ بددیانتی نہیں؟

سلامت علی مہدی نے مظلومین جمشید پور کے نام پر ملک بھر سے روپیہ فراہم کیا اور اس وعدے کے ساتھ کہ

(۱) جمشید پور کے اُن ۲۵ خاندانوں کو مکان بنوا کر دوں گا جو محلہ بھالو بار سا میں کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔

(۲) میں ان کو گھریلو ضروریات کا سامان خرید کر دوں گا۔

(۳) ان کے لئے بستر اور لباس کا بندوبست کر دوں گا اور ان کو معمولی کام شروع کرنے کے لئے کچھ نقد رقم دونگا۔ تاکہ ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا آسان ہو جائے کیوں کہ آج ان کے پاس نہ مکان ہے نہ دوکان نہ روٹی ہے نہ روزی۔ ان کے آگے پیچھے صرف تاریکی ہے

(۴) میں جمشید پور کے ان ۲۵ خاندانوں کے لئے بارش سے قبل مکان بنوا دینا چاہتا ہوں۔

تقریباً چار ماہ ہو گئے مگر سلامت علی مہدی نے اپنے ان وعدوں میں سے ابھی تک ایک وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔ ہاں انھوں نے ایک ہفت روزہ "بنیاد" ضرور جاری کر لیا ہے۔ غالباً ان کے نزدیک مظلومین جمشید پور کے لئے مزید روپیہ فراہم کرنے کیلئے ایک اخبار کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ کوئی دوسرا اخبار تو ان کی اپیلوں کو شائع کرنے سے رہا اور خطوط کے ذریعہ یہ دھندہ زیادہ دنوں چل نہیں سکتا تھا۔

سلامت علی مہدی نے اپنے اخبار "بنیاد" میں جمع شدہ روپیہ کی فہرست شائع کی ہے۔ مگر وصول شدہ روپیہ کی تفصیل شائع کر دینے سے کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روپیہ جمع کرنے والے نے جس مقصد کیلئے روپیہ فراہم کیا ہے اسے اُس مقصد کیلئے صرف بھی کیا گیا ہے۔ اگر سلامت علی مہدی نے یہ روپیہ مندرجہ بالا مقاصد کیلئے صرف نہیں کیا تو یہ یقیناً امانت میں خیانت ہے اور ہر وہ شخص جس نے مندرجہ بالا مقاصد کیلئے سلامت علی مہدی کو ایک پیسہ بھی بھجوایا ہے حساب فہمی کا حقدار ہے اور اگر سلامت علی مہدی نے اس روپیہ میں سے اپنی ذات پر یا "بنیاد" اخبار پر روپیہ صرف کیا ہے تو اس خیانتِ مجرمانہ کو عدالتِ فوجداری میں لے جایا جا سکتا ہے

ہم اُن مسلم اداروں سے درخواست کریں گے جو مظلومین جمشید پور کی فلاح و بہبود کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس ضمن میں وہ سلامت علی مہدی سے حساب فہمی کریں اور جو روپیہ جس مقصد کے لئے عوام سے فراہم کیا گیا ہے اُسے ہر نوع اُسی مقصد پر صرف کرایا جانا چاہئے اس وقت تک سلامت علی مہدی نے اپنے اخبار "بنیاد" میں مظلومین جمشید پور کے لئے فراہم شدہ روپیہ کی جو تفصیل شائع کی ہے۔ اس کے بارے میں سلامت علی مہدی اگر اپنے اخبار میں یہ اعلان بھی فرما دیں کہ یہ رقم کس بینک میں کس کھاتے میں جمع ہے تو اور بھی مناسب رہے گا۔ اور اگر انھوں نے اس رقم میں سے اپنی ذاتی ضروریات یا اخباری ضروریات پر روپیہ صرف کیا ہے تو یہ نہ صرف قوم اور ملک سے غداری ہے بلکہ مظلومین جمشید پور کے ساتھ کھلواڑ بھی۔ ہم شاہی امام جامع مسجد جناب سید عبداللہ بخاری صاحب سے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے اثر سے کام لیں اور مظلومین جمشید پور کے نام پر جمع شدہ روپیہ اصل حق داروں تک پہنچانے کی کوئی ترکیب کریں۔

دیانت داری کی زندہ مثال

انجمن ترقی اردو ہند کے ہیڈ کوارٹر "اردو گھر" کے دفتر میں ایک صاحب اپنی کارکردگی دیانت داری کا رنگ کافی دنوں سے جمائے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنی لن ترانی کو طول دے رہے تھے تو راقم الحروف نے انجمن کے انچارج جناب انیس اعظمی سے دریافت کیا کہ ان کی تعریف۔ فرمانے لگے۔ کیا آپ انھیں نہیں جانتے؟ [illegible]